رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲
ٹیلیفون نمبر ۵۰۳۵۲۵

زندگی آمیز و زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

۱۲۰
جنوری ۱۹۷۶ء

مُدیر

محمد طفیل

ادارہ فروغِ اُردو (ایبک روڈ انارکلی) لاہور

قیمت موجودہ شمارہ
۲۵ روپے

سالانہ چندہ
۳۵ روپے

ترتیب

افسانے

تفصیلی مطالعہ

بہ سلسلہ ممتاز مفتی

بہ سلسلہ مہندر ناتھ

ماتمِ یک شہرِ آرزو

مقالے

تبصرے

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو، لاہور سے شائع کیا

طفیل کسی قدر جز رس بلکہ کنجوس بھی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں جب وہ لاہور سے دلّی میرے ہاں آیا تو میرے گوجرانوالہ کے مالٹوں کی ایک پیٹی لایا۔ حالانکہ احمد ندیم قاسمی کو لا سکتا تھا۔ میرزا ادیب کو لا سکتا تھا۔ عبدالمتین عارف کو لا سکتا تھا یا کو لا سکتا تھا۔ حامد علی خاں، صلاح الدین احمد اور نذیر چودھری کو لا سکتا تھا اور راسے کو نامی کیا تھا۔ ان سب دوستوں کو جن کے میں نام لئے اور اُن تمام احباب کو جن کے میں نے نام نہیں لئے ان سب کو گٹھڑی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے لے آتا۔ نہ کسٹم کا نہ ویزا کا خوف۔ یہاں آ کر ہم منتر پڑھتے، ڈبیا کھولتے تو وہ سب لوگ ہم میں موجود ہوتے، وہ ہم نفسانِ رفتہ اور یارانِ دل گرفتہ اور وہ کہ جو ہمارے دل کے پیارے ہیں اور وہ سب جو خدا کو پیارے ہوئے اور وہ سب جن کو ہم نے گویا صدیوں سے نہیں دیکھا، ان سب سے ہم گلے مل لیتے۔ طفیل سے اتنا بھی نہ ہوا۔ اس لئے کہ وہ جب میرے گھر کے آنگن میں مجھ سے بغل گیر ہوا تو اتنی دیر تک نہ صرف اس کے سینے بلکہ لاہور کے دوسرے تمام احباب کے سینوں کی حرارت مجھ تک پہنچتی رہی اور جب میں نے اس سے اکیلے آنے کا سبب پوچھا تو اپنے مخصوص نیم سنجیدہ اور نیم شریر لہجے میں وہ بولا۔ کس کس کو ساتھ لاتا۔ بھئی وہ سب تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا۔ جھوٹ مت بولو لاہور میں رہ کر کوئی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا سدا بہار ہنگامہ پرور فانوس بدن شہر اپنی لافانی جوانی کے لئے مشہور رہے۔ اس شہر رہ کر اگر کوئی بوڑھا ہوتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دے اور منڈی بہاؤالدین، بستی چھپڑاں والا اور چک نمبر چار سو بیس میں جا سکونت اختیار کرے مگر لاہور کے نام کو بٹہ نہ لگائے۔ اس پر وہ مجھ سے قہقہہ لگاتے ہوئے پھر بغل گیر ہوا اور بولا۔ نہیں! میرے سب دوست جوان ہیں اور خوش ہیں اور خیریت سے ہیں اور اس مالٹے کی پیٹی میں ان سب کے خلوص کی خوشبو بھری ہوئی ہے۔

مجھ پر کبھی کبھی جھک چڑھتی ہے تو بمبئی چھوڑ کر دلّی چلا آتا ہوں۔ اس لئے کہ لاہور تو جا نہیں سکتا۔ سوچتا ہوں کہ ہمیشہ کے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دوں گا اور اپنے آپ کو ادب کے لئے وقف کر دوں گا۔ کبھی چھ مہینے اور کبھی سال بھر دلّی میں رہتا ہوں لیکن وہاں کے پبلشر مجھ سے اوبھ جاتے ہیں۔ وہ میری تہی دستی اور میں اُن کی بالادستی کا قائل ہونے لگتا ہوں اور پھر دلّی چھوڑ واپس بمبئی کی فلمی دنیا میں لوٹ آتا ہوں۔ ایسا دو تین بار کر چکا ہوں۔

اب کے جو طفیل سے دلّی میں ملاقات ہوئی تو میں بے حد تفریحی موڈ میں تھا۔ طفیل مسز ممتاز مرزا کے ہاں ٹھہرے تھے مگر اُن سے ہر روز ملاقات رہتی تھی۔ وہ نو دس دن ایسی ہماہمی میں گزر گئے کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اُن نو دس دنوں میں میں لاہور میں رہا اور دلّی میں رہے۔ اور ایک ایک کر کے انہوں نے اپنے تمام دوستوں کو ڈھونڈھ نکالا اور اپنی خرابیٔ صحت کے باوجود اُس نے ہم سے بڑی دعوتیں کھائیں۔ معلوم نہیں کیا بات ہے جو مزا زبردستی کی دعوت میں ہے وہ اُن ملاقاتوں اور دعوتوں میں بھی نہیں ہوتا جہاں خود ا سے بلائے اور مدعو کئے جاتے ہیں۔ شام کو اکثر ہم کہیں نہ کہیں کسی بہانے اکیلے بیٹھ جاتے۔ دن کو تو میں انہیں گھومنے کا موقع نہ دیتا تھا مگر شام ہوتے ہی انہیں پکڑ لیتا اور پھر یاروں کے گھنے گلزار میں ہم دوستوں کے جھرمٹ آباد کرتے اور محبت اور خلوص کے اُن حسین لمحوں کو یاد کرتے جن کی نشیلی چھاؤں میں اُردو ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں نے ادبی تخلیقات کے کیسے کیسے حسین تراشے ہیں۔

طفیل احساس کی نازکی کو بہت سمجھتے ہیں۔ خود بھی جلدی آزردہ خاطر اور زود رنج ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ طفیل صرف ایک پبلشر



یہ تصویر اُن دنوں کی ہے کہ جن دنوں کو
کرشن چندر نے یاد کیا ہے ۔

ہی نہیں ہے بلکہ ادیب بھی ہے۔ "محترم" ان کا ایک مشہور سفرنامہ ہے جو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس پر جانے کے بعد لکھا گیا۔ مگر طفیل بالخصوص اپنے نازک خاکوں کی تخلیق کے سلسلے مشہور ہیں۔ جن میں انہوں نے جگر مراد آبادی سے لے کر اختر اور نیوی جیسی متعدد شخصیتوں کے قصر تعمیر کئے ہیں۔ یہ سب کے سب خاکے ان کی کتابوں میں شامل ہیں۔ جن کے نام بالترتیب یہ ہیں۔ نمبر ایک "صاحب" نمبر دو "جناب" نمبر تین "آپ" ان کے بعد دو اور مجموعے ان کے آنے چاہئیں اور نمبر چار "آپ جناب" نمبر پانچ "ااپ شناپ" موخر الذکر مجموعہ طفیل کے دشمنوں کے متعلق ہوگا یا ایسے مضمون نگاروں کے متعلق جن کی تخلیقات کسی وجہ سے نقوش میں شامل نہیں ہو سکیں۔

طفیل کے یہ خاکے بڑی بے باکی سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں خاصلے بھی ہیں اور قربتیں بھی، دوریاں بھی ہیں اور طرفداریاں بھی مگر کہیں کیچڑ اچھالنے کی کوشش نہیں ہے گو چھینٹے ضرور اُڑا ئے ہیں۔ طفیل ان خاکوں میں اُس بچے کی طرح ہے جو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ہے اور بار بار دوسروں پر چھینٹے اُڑاتے جاتا ہے اور جب کوئی دوسرا نہیں ملتا تو اپنے آپ پر ہی چھینٹے اُڑانے لگ جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل کا بچپن کیسا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے وہ ابھی تک بچپن کے عہد سے باہر نکلا ہی نہیں۔

سنا ہے آج کل طفیل دھڑا دھڑ ٹیکسٹ بک چھاپ رہا ہے اور نقوش سے آج کل اس لئے بیزار ہے کہ اس کے دوست اس کے رسالے کے لئے اس کی پسند کی چیزیں نہیں بھیجتے۔ یہ جتے جتے چلتے میں نے طفیل کی ایک بُرائی تو پکڑ لی۔ طفیل بھائی! تم بیشک ٹیکسٹ بک کے انبار لگا دو چھاپ چھاپ کر، لیکن تمہارے نقوش کا صرف ایک شمارہ ان سب پر بھاری رہے گا۔ علم و ادب دونوں کے اعتبار سے!

آؤ گلے ملو، جھوٹے کہیں کے، ہر سال آنے کا وعدہ کرتے ہو اور کبھی نہیں آتے!

اِس شمارے میں

یہ شمارہ خاصی تاخیر سے حاضر ہو رہا ہے۔ تاویلیں اور دلیلیں پیش نہیں کرتا۔ سیدھی بات معذرت خواہ ہوں۔ بہرحال یہ عرصہ بھی چند سابقہ نمبروں کی ازسرِنو ترتیب و تدوین میں گزرا۔ چونکہ پرانے نمبروں کی مانگ ہے۔ اُدھر بال بھی سفید ہو رہے ہیں۔ قدرت بھی کب تک مہلت دے گی۔ سوچتا ہوں کہ وہ کام جو رواروی میں کیے تھے۔ انھیں کامل سکون اور زیادہ سلیقے کے ساتھ پیش کر جاؤں۔

خواہشیں بہت سی ہیں۔ اُن میں ایک خواہش یہ بھی ہے کہ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں اپنے کام سے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ جتنا کما کر کے میں نے نقوش پر ڈھیروں خرچ کیا ہے۔ صرف اس لیے کہ میری پہچان ہو سکے۔ میں نے دنیاوی سکوں سے زیادہ ادبی دنیا سے یارانہ رکھا۔ کیونکہ دنیاوی سکے جمع کرنا اگر واقعی کوئی بڑی بات ہوتی تو آج اَن گنت لوگوں کا نام زندہ ہوتا۔ مگر نام کس کا زندہ ہے؟ سعدی کا، حافظ کا، میر کا، غالب کا، حالی اور اقبال کا' — دھن دفن ہوگیا۔ ادب زندہ رہ گیا۔

بات مجھے اس شمارے کی کرنا چاہیے تھی۔ جا نکلی دوسری طرف! بہرحال عرض ہے کہ پچھلے شمارے میں عصمت چغتائی کا افسانہ گھونگھٹ شائع ہوا تھا۔ شانِ نزول اُس افسانے کی یہ تھی کہ میرے ایک جاپانی دوست جاپان جا رہے تھے۔ راستے میں وہ بمبئی رکنا چاہ رہے تھے۔ چنانچہ میں نے انھیں ایک چٹھی آپا کے نام دی۔ جس میں یہ لکھا۔ ہو سکے تو اب کے افسانہ ضرور عنایت فرمائیں۔ وہ دور ڈاک کی بندش کا تھا۔ خیال تھا کہ عصمت آپا اگر افسانہ عنایت فرما دیں گی تو وہ براستہ جاپان مجھ تک پہنچ جائے گا۔ جب مسٹر کتاڈوکا نے میری چٹھی آپا کو دی تو انھوں نے پوچھا۔ "آپ کب جا رہے ہیں؟" — مسٹر کتاڈوکا کا جواب یہ تھا۔ "کل!" — آپا اس جواب پر خاصی پریشان ہوئیں مگر انھوں نے کہا۔ "میرے پاس لکھا ہوا تو کوئی افسانہ موجود نہیں لیکن میں طفیل صاحب کی خاطر، جاگ کر بھی آج رات افسانہ لکھ لوں گی" — چنانچہ دوسرے دن جب مسٹر کتاڈوکا آپا کے ہاں پہنچے تو انھوں نے "گھونگھٹ" نامی افسانہ ان کے حوالے کر دیا تھا۔ جو کہ سابقہ شمارے میں چھپ چکا ہے۔

اس شمارے میں عصمت چغتائی کا افسانہ "مغل بچہ" شامل ہے۔ آپا نے مجھے لکھا۔ "ایک بات بتاؤ بھئی کہ گھونگھٹ نامی افسانہ تو مجھے رات بھر میں لکھنا پڑا تھا۔ اب میں نے اُسی افسانے کو قدرے اطمینان سے لکھا ہے۔ لہٰذا نظرِ ثانی شدہ افسانے کے بارے میں کیا رائے ہے؟" — میں نے جواب میں لکھا۔ "آپا وہ افسانہ مجھے ہی بھیج دیں۔ اس لیے کہ جس طرح غالب کی پہلی کوشش کے بعد، اس کے نظرِ ثانی شدہ کلام کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ اُسی طرح سے آپ کے افسانے کی بھی اہمیت ہوگی۔" چنانچہ انھوں نے وہ افسانہ بھی مجھے بھجوا دیا۔ جو کہ زیرِ نظر شمارے کی زینت ہے۔

در اصل یہ صفحہ بعض صراحتوں اور بعض وضاحتوں کے لیے مختص ہے۔ اس لیے اس شمارے میں شامل مندرجات کے بارے میں کھل کر باتیں نہیں کی جا سکتیں ورنہ بات ہر مضمون پر ہو۔ مضمون چھوڑ بلکہ ایک ایک صفحے اور ایک ایک سطر پہ بات ہو۔ مختصر یہ کہ نقوش میں جو کچھ پیش ہوتا ہے۔ وہ اس عہد کا بہترین ادب ہوتا ہے۔

بعض اہلِ قلم کے بارے میں اس شمارے میں وافر مواد ملے گا۔ آج اگر ہم چند ادیبوں کے بارے میں چند ایک مضمون چھاپ رہے ہیں تو کل کلاں کو انہی کے بارے میں کتابیں لکھی جائیں گی۔ کیونکہ قلم سے زیادہ باوفا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ جس کسی نے بھی قلم سے پیار کیا وہ زندہ جاوید ہوگیا۔

ایک خبر یہ بھی ہے کہ پاکستان کے ادیبوں نے مجھے رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری جنرل چُن لیا ہے — میں اُن کا شکر گزار ہوں۔

محمد نقوش

بولو

راجندر سنگھ بیدی

"بولو"۔ انسپکٹر گپتے نے عاجز ہو کر کہا۔

اُس کی آواز اب ایک بازگشت ہو کر رہ گئی تھی، بلکہ تھیٹ مُلاقی ہوئی۔ جب اُس نے ملزم سے پوچھا "کون تھا اِس قتل کے پیچھے؟"

ملزم وناّئی (وِنائیک) بدستور خاموش تھا۔

گپتے اور اُس کے ساتھی اجگاؤنکر وغیرہ نے وناّئی پر تیسری ڈگری کے سب گُر استعمال کیے تھے۔ اور اب وہ ڈر گئے تھے کہ کہیں مار کے نشان ملزم کے بدن پہ رہ گئے تو وہ خود دھر لیے جائیں گے۔ ریمانڈ کے چودہ دنوں میں سے صرف تین دن باقی تھے۔ جبکہ انھیں وناّئی کو چارج شیٹ کے ساتھ میٹرو پالیٹن مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا تھا۔ جو خود شکل ہی سے قاتل معلوم ہوتا تھا۔ قتل کے پیچھے سازش کا ثبوت فراہم کرنے کے سلسلے میں گپتے اور اجگاؤنکر کی ہر تفتیش اندھی کالی راہوں سے ٹکرا کر خاک و خون اُڑاتی، روتی، چلاتی، وناّئی ہی پر لوٹ لوٹ آتی تھی۔

پیلا چوکی کا یہ پولیس اسٹیشن راجدھانی کے معمار لیوٹس نے نہیں، کسی مقامی ہوتی نے بنایا تھا، اور اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کہیں ہوا کا رُخ حوالات کی طرف نہ ہو۔ فضا میں کی رطوبت اُس کی سیلن کا باعث ہے۔ پھر اور باتیں —— تادیب، تھرڈ ڈگری وغیرہ۔ اب تک اِن دیواروں پر ہیبت کے نقشے بن چکے تھے۔ انسان کے اندر کا ڈر باہر آ کر دیواروں پر مصوّر ہو گیا تھا۔ اِن تجریدی تصویروں کے سامنے چینی۔ جاپانی ڈریگن، تبتی مہاکال، افریقی بیہولا وغیرہ کچھ بھی نہ تھے۔ چھت پر جو شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر تو کوئی معصوم سے معصوم بھی چلّا اٹھتا——

"گگّو کو میں نے مارا ہے، حسن توبہ کا قتل میں نے کیا ہے۔ توبہ . . . ."

کرسی جس پر گپتے بیٹھا ہوا تھا، اُس کا ایک بازو غائب تھا۔ اور جہاں اجگاؤنکر براجمان تھے، اُس کے دونو . . . . وہ دونو بازو، دایاں اور بایاں، یا تو وناّئی پہ استعمال ہوئے تھے اور یا پھر ملکی سیاست میں حصہ لینے چلے گئے تھے۔ اُوپر ہزار واٹ کا بنڈہ اور ایسی کچھ اور چیزیں جھومر کی طرح تو تھیں۔

حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے حبس باہر جھانک رہا تھا، جہاں ہال میں ڈیوٹی آفیسر تین چار غنڈوں کا بیان لے رہا تھا۔ وہ عادی مجرم ایک عجیب قسم کی بے نیازی سے بیٹھے پورے انسانی جُرم سے مُنکر ہو رہے تھے، گویا وارداتیں اُنھوں نے نہیں، ہمزادوں نے کی ہیں۔ ایک تو بار بار اپنا ہاتھ ران پہ مارتا تھا، جیسے پہلوان لوگ اکھاڑے میں اُترنے سے پہلے چیلنج کے

اندازیں مارتے ہیں۔ کوئی ننگا ہو اور اپنی برہنگی کا احساس رکھے تو ہر آتا جاتا اُسے دیکھتا ہے، لیکن اگر وہ اپنی اس صورت پر شرمائے نہ لجائے، اُلٹا ڈھٹائی سے دوسروں کو دیکھتا جائے تو سب کی نظر نیچی ہو جاتی ہے۔ کانسٹیبل، میٹروپالیٹن بمبئی کے نیلے بھرت، انگیا کے پس منظر میں بیکار، صرف حکم کے منتظر تھے۔ ان کا بس چلتا تو ہر شہری کے ہاتھوں میں وہ لوہے کا زیور پہنا دیتے۔ محرر کا قلم جسے ہر وقت خارش رہتی تھی، دوات میں ڈوب رہا تھا اور وہ خود بیکار بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ اور ایف آئی آر کا رجسٹر ان سب لوگوں کے کرم خوردہ مسوڑھوں اور جبڑوں کی طرح سے کھلا سامنے میز پر پڑا تھا۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔ بیکار کی کن من، کن من، کن من......

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بغیر کسی وجہ، کسی سازش کے ونائی ایک خوب صورت نوجوان عورت کا قتل کر دے؟ ایشے (ایشودا) اسکے گلے میں منگل سوتر، ناک میں پھلی، باہنوں میں چوڑیاں جوں کی توں موجود تھیں۔ کارونر کی رپورٹ میں جبر تو ایک طرف کسی چھیڑچھاڑ کا بھی اندراج نہ تھا۔ کوئی نئی یا پرانی دشمنی بھی ثابت نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ ایشے وڈالہ کے نمک والے، بیرک نما کوارٹروں میں اپنے شوہر ناراین اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی، جبکہ ونائی اس سے فرسنگ پر ہے — ورلی کے کولی واڑے میں، جہاں بُومِلی مچھلی کی بُو چوبیس گھنٹے انسان کے جسم و ذہن کا احاطہ کئے، اُس کے پور پور میں بس جاتی.... ونائی کی محبوبہ سکو وڈالے کے پاس رہتی تھی البتہ — اینٹوپ ہل کے نیچے، ہاربر برانچ کی ریلوے لائن کے بازو میں، جہاں بے شمار جھونپڑیاں برسات اور تڑاکے کے بیل بوٹوں سے جیسے اپنے آپ اُگ آئی تھیں۔ مگر اس کا ایشے سے کیا تعلق؟

ایشے اور اس کا میاں براہمن تھے، سکو اور اُس کے ماں باپ کولی، جو ڈاکٹر امبیدکر کی شہ پہ بدھ ہو گئے تھے۔ بس یہ بھی نہایت ہی زوال پذیر ہندو سماج انھیں عزت سے بلانے کی بجائے 'بدھو' کہتا تھا۔ موقع پڑتے ہی اُن کی جھونپڑیاں تک جلا ڈالتا۔ انھیں جسمانی اور روحانی عذاب پہنچاتا۔ گویا بدھ ہو جانے پر بھی یہ لوگ اچھوت کے اچھوت ہی رہے۔ حالانکہ تاریخ کے دھندلے ادوار میں انہی کولی، ماہی گیر لوگوں کی ایک حسینہ مکس گندھا نے پانڈوؤں کے باپ سے شادی کی تھی۔ اور آج جن لوگوں کے سامنے ہمیں سر جھکانا پڑتا ہے، اُن کی ماں بنی تھی.... پھر ناراین کا رقیب بھی نہ تھا کوئی۔ البتہ الزام ہی لگانا، قانون کو پڑا ناہو تو ہر آدمی اُس مرد کا رقیب ہوتا ہے جس کی عورت ایشے ہو!

ایشے معمول کی طرح گنپتی وسرجن کے لئے مرد عورتوں کے ساتھ سیوڑی والے ساگر کی طرف گئی تھی۔ بھوکے، ننگے لوگ۔ .... پیٹ میں پائی نہیں، تن پہ چیتھڑا نہیں۔ مگر جا رہے ہیں۔ ناچ اور گا رہے ہیں، چاہے سوکھا ہو چاہے برسات، وہ خود نہیں، بیوڑہ انھیں گھسیٹے لئے جا رہا تھا شاید۔ اور یا پھر مذہبی جوش، جو بیچ میں جنون ہو اُٹھتا تھا۔ جب وہ کسی کی بھی بے عزتی کر دیتے۔ اندر کی کسی جلن سے کاروں کے شیشے توڑ دیتے اور کسی کی مجال نہ تھی انھیں کچھ کہنے کی۔ کیسے کہتے۔ کیونکہ پوری قوم، قومیت تھی اُن کے پیچھے اور شوسینا... جیسے محرم میں تعزیہ نکالنے والوں کے پیچھے پوری شیعہ قوم نہیں ہوتی؟ آٹھ بازوؤں والی درگا کے پیچھے بنگالی نہیں ہوتے؟ چاہے وہ گھاس ہوں یا نکسل باڑی؟ ایسے ہی جیسے بیوڑہ بنانے اور بیچنے والوں کے پیچھے انڈر ورلڈ ہوتی ہے، مافیا ہوتا ہے۔ ایک معمولی سے ٹریفک کانسٹیبل کے پیچھے پوری سرکار ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ونائی کے پیچھے صرف ونائی ہی ہو؟

ایک نئے آرزو، غیر مامون جذبے تلے گنپتی وسرجن والے مورتی لے جاتے، ناچتے گاتے ہوئے جا رہے تھے ۔ گنپتی بابا موریا، پڑچے ورشی لوکر آ۔ یعنی کہ اگلے برس جلدی آ۔ مگر یہ پرارتھنا تو پچھلے اور اس سے پچھلے برس میں بھی کی تھی اُن لوگوں نے ۔ پھر گنپتی بٹنے والے گنپتی بابا نے کیا دیا تھا انھیں؟ کس کس کے گھر بھر دیے تھے؟ اُلٹا اُس کی لمبی سونڈ اور پھیلی ہوئی توند کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے سب کے حصے کا دودھ وہی کھا گیا ہے۔ ایرانی ہوٹل والے راشٹر پتی کی سفارش سے پاؤ دیتے تھے۔ شکر بازار سے یونہی غائب رہتی تھی۔ کھاسلیٹ کے لئے میل میل، ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے کیو لگتے تھے۔ اس کی نایابی کی وجہ سے گھروں میں چولھے جلنے بند ہوگئے تھے۔ کوئی زمانہ تھا کہ عورت سونے کی کوئی چیز یا اچھی سی ساڑھی دیئے جانے پر اپنا سب کچھ دے بیٹھتی تھی، لیکن اب وہ کھاسلیٹ کے چھوٹے سے ٹن پر اُتر آئی تھی.....

گنپتی بابا موریا کے ورد سے یہ لوگ تھک جاتے تو کسی زُلی تافیے پہ چلے آتے، جو پوری زندگی ہو گیا تھا۔ پاؤڈر والے دودھ کی ملائی مارگنی یا ادھر مارگنی کی مناسبت سے وہ اس کی بے شمار گندی گردانیں کرتے ہوئے چلتے۔ بھیگی ہوئی چھوکریوں کے نمایاں پچھواڑوں پر چٹکیاں لیتے، اپنے اور اُن کے اکار سے مشتعل کرتے...... ایلشے بھی اُن کے ساتھ تھی۔ اُس کا بدن جو ایک ہی مرد کے مسلسل مماس سے سو گیا تھا، جاگ جاگ اُٹھتا۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ پچیس برس تو ایک طرف، پچیس پل بھی ونائک کا رامپوری چاقو اُس کے آر پار ہوگا اور یہ انوکھا مماس اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دے گا اور اس غریب کا اپنا وسرجن پانی کی بجائے آگ میں ہوگا۔ سگرمن کا ٹیروائل کہتا ہے۔ آگ پانی سے بھی بڑی ہے۔ کیا معلوم؟

بائیس یا چوبیس[۱] کی ہوگی ایلشے۔ یعنی اُس عمر کی جس میں کہ ہر عورت اپنے وجود ہی سے کھٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں ہوں۔ مغربی گھاٹ کی پیداوار ہونے کی وجہ سے سب ناریل اور اُن میں کا سارا کھوپرا اُس کے بدن کو بنانے میں لگ گیا تھا۔ پھر کیا سیا گولائیاں، بالائیاں چلی آتی تھیں اُس پہ۔ اوپر کچھ ولندیزیوں، عربوں کا خون مل گیا تھا جو بھارت کے پچھمی ساحل پہ تجارت کرنے کے لئے آتے تھے۔ اُن کے کارن نہ صرف ایلشے کا رنگ سرخ و سپید تھا، جلد ریشمیں، بلکہ آنکھیں بھی عرب ساگر کی طرح سے زمردیں ہوگئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جب نارائن کو اُس کی لاش ملی تو وہ اُسے پینے بک والے کوارٹروں میں لے آیا۔ سب تماشائیوں کو نکال کر اُس نے ایلشے کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور قریب ڈیڑھ دو گھنٹے اُس کے ساتھ اکیلا رہا۔ جب دروازہ کھلا تو لوگوں نے دیکھا۔ ایلشے دلھناپے کا کاشٹا لگائے پڑی ہے، اُس کی ناک میں نتھ کی بجائے کھڑا ہے، پاؤں کی انگلیوں میں بچھوا......

کتنا پیار کرتا تھا نارائن اُس سے۔ شادی کے بعد ایک بار جب ایلشے مائیکے گئی تو کسی نے پوچھا ــــ کے دن رہ گئے بہو کے آنے میں؟ نارائن نے ترنت جواب دیا ــ بیس دن اور اکیس[۲] راتیں!

جب نارائن مسکرا بھی نہ رہا تھا.....

ـــــ اب ایلشے کی ارتھی نکلی تو وہ رو بھی نہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے آنسو کہاں چلے گئے تھے، یہ میں پھر بتاؤں گا۔ ابھی اتنا ہی کافی ہے، کہ وہ سب اڑوس پڑوس کی آنکھ سے بہہ رہے تھے۔ اپنے سرخ کاشٹے، کفن میں ایلشے اور بھی گوری چٹی لگ رہی تھی۔ وہ

ایک ایسی نیند سو رہی تھی۔ جو شبِ زفاف میں دلہن چار چھ بار نکل جانے کے بعد سوتی ہے۔

ارجن اٹھ جانے کے بعد اُن سے پوچھے — ناتھو اور شیلا بار بار پوچھتے تھے —

"آئی کیسے!" (ماں کہہ رہی ہے) اور ایک دانشمند مہاشی جواب دیتا۔ آئی تو گئی..... ایسی معمولی سی ترکیب وضع کر لینے سے اس کی نسائی شہوت تسکین کو پہنچ جاتی۔

صرف دو دن رہ گئے تھے ریمانڈ میں۔ جبکہ انسپکٹر مکھیجے نے وٹانی کو تفتیش کا آخری تھپڑ مارا۔ وٹانی اپنی حجت چل بیا۔ اُس کے ہونٹ تھوڑا بھینچ کر فوراً ہی معمول کے ہو گئے۔ ایک ٹھنڈے غصے میں جانے وہ کیا کچھ پی گیا۔ گرم غصے میں آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور شریانوں کی کاتھمیں ان میں سرخ ہو جاتی ہیں۔ تن کا دباؤ ایکا ایکی تیز ہو جانے سے تنفس گھوڑ چال ہو جاتا ہے، نتھنے پھولنے لگتے ہیں۔ ہونٹوں پہ کف چلی آتی ہے۔ بدن کی رگیں اور پٹھے تن جاتے ہیں، کوئی اور ٹھکن وار اپنے اوپر لینے کے لئے۔ مگر وہ —— وٹانی، رنگ کا کالا، بدن کا کھردرا، جات کا کولی، جیسے گوشت پوست سے نہیں، کسی عقیدے کی فولاد سے بنا تھا۔ جسمانی یا روحانی مار کا اُس پہ کوئی اثر ہی نہ تھا۔ اِس سارے سلسلے میں یا تو وہ آگے کی بہت سی صدیاں گن گیا تھا اور یا پیچھے کی۔ وہ نرس چھتیروں کے ساتھ فلرٹ کرتا تھا اور کبھی کبھی شیو سینا کے رسالے 'مارمک' میں کسی دوسرے نام سے لکھتا بھی تھا۔ اس وقت وہ تخفیف کے انداز میں کھڑا تھا۔ جیسے کوئی بھگت سنگھ، بس کی آزادی کے لئے پھانسی لگنے جا رہا ہو —— اُلٹا اُس کی آنکھیں کچھ اور سپاٹ ہو گئیں تھیں۔ کفن کی تہوں میں چھپی ہوئی نیلاہٹ اُمڈ آئی تھی جن میں ساگر ڈوب رہے تھے۔ اپنے اندر پوری ارکائی کا دمرجن لئے ہوئے۔ اُس کا غصہ اوپر اور اوپر، لاشعور کی تہوں میں جا چھپا تھا۔ جہاں ساری خدائی ملتی ہے اور درد —— غصہ، کسی ایک فرد کا ہو کر رہ جانے کی بجائے پورے اجتماع کا ہو جاتا ہے.....

تب وہاں، اوپر، لاوجود شستوں میں کیا کیا بے منطق فیصلے ہوتے ہیں: جن سے خدا بھی ڈر کر انصاف کی کرسی چھوڑ دیتا ہے اور ڈر سے کانپتا ہوا نیچے آ کر کسی اپنے خدا کے سامنے دست بدعا ہو جاتا ہے۔

باہر آج بھی بارش ہو رہی تھی اور انسان کے نفس، اُس کی سائیکی کا بیڑہ غرق کر رہی تھی۔ کہاں تو پورے جولائی اور اگست کے مہینے خالی گئے تھے اور کہاں اب ستمبر کے آخر میں یوں لگ رہا تھا، جیسے ورن دیوتا بیئر کے کیگ کے کیگ پی کے دُنیا کو اپنی چھوٹی حاجت کا نشانہ بنا رہا ہے۔ خریف کی فصل تباہ ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا فارسی نہ جاننے کی وجہ سے ربیع اور خریف کے معنی نہ سمجھتا تھا۔ فصلوں میں اسے کوئی تمیز نہ رہی تھی۔ وہ تھوڑا بہت، تھوڑی سنسکرت اور عربی میں شُد بُد رکھتا تھا اور بس۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُسے ایک ہی زبان آتی ہے، جس کا نام ہے —— آہ!

جب سرکار کے میٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ، خدا کے نمائندے بنے، ایک بلیٹن شائع کر دیتے۔ خلیج بنگال میں ایک طرف ایک کونڈ پیدا ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ طوفانی فوری بن کر اڑیسہ کے بے شمار گاؤں کو تباہ کرتا ہوا ذہن کیمل کے ضلع کی طرف نکل جائے۔ جہاں کھاد کا کارخانہ ہے، اور یا پھر مدھیہ پردیش سے مراٹھواڑہ، ممبئی کی طرف چلا جائے۔ کچھ علاقوں کو تو وہ باڑھ سے برباد کر گیا۔ اور کئیوں میں سوکھا ہو گیا۔ اور لوگوں کو اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے چھوڑ گیا کہ اُن کے لئے بھوک کا مرنا اچھا ہو گا یا ڈوب کر جان دینا۔ بجائے

طرف ہاؤ ہو کا نقارہ بج رہا تھا — بے زبان، بے ثمر، بے تال۔

—— اور وتانی چپ تھا۔ جب صابر جابر کے سامنے تن جائے تو بڑے بڑوں کی گاف بند ہو جاتی ہے۔ سازش کی تفتیش کے سلسلے میں گپتے اتنا تنگ آ گیا تھا کہ اُس کا جی چاہتا تھا کہ پیٹی، پتلون اُتار کر وتانی کے سامنے لیٹ جائے ...... اسے ریمانڈ کے پہلے چند دن یاد آ رہے تھے، جب اُس نے وتانی سے پوچھا تھا ——

"تم نے ایشتے کو کیوں مارا؟"

وتانی نے یونہی سا سر ہلا دیا — جس کا مطلب تھا — ایسے ہی۔

"اس لیے کہ وہ اونچی جات والی تھی؟"

"نہیں۔"

"امیر عورت تھی؟"

"نہیں۔"

"خوب صورت اور جوان تھی؟"

"نہیں، نہیں، نہیں۔" وتانی نے قدرے برافروختگی سے کہا "شکو اس سے کہیں زیادہ سندر، کہیں زیادہ جوان ہے۔"

"شکو؟" گپتے نے اپنی کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے کہا "وہ کالی کلوٹی، کوڑی کچھو کری، جو آٹھ آٹھ آنے میں ——"

اس سے پہلے کہ گپتے اپنی بات پوری کرتا، وتانی ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا "باسٹرڈ! ...... تمہاری بہن سے اُس کا ریٹ زیادہ ہے ......"

یہ وہ وقت تھا، جبکہ گپتے نے وتانی کو پہلا اور بھرپور تھپڑ مارا۔ اُس کی انگلیاں اس نوعمر، کم سن لڑکے کے گالوں میں کُھب گئیں۔ وہ ہل نہ سکتا تھا کیونکہ حولدار اور کانسٹیبل لوگ مضبوطی سے اُسے پکڑے ہوئے تھے۔ وتانی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، نہ ہی انگلیوں کے نشان آئے۔ آخر کالے رنگ پر نیلا کتنا دکھائی دیتا ہے؟

گپتے نے اپنے سینیئر اجگاؤنکر کی طرف دیکھا۔ وتانی بولتا چلا گیا ——"دُنیا کے ناینٹی نائن پرسینٹ لوگ اگر ایک ٹکے میں بکتے ہیں تو آپ لوگ آدھے میں ...... وہ سب اونچی جاتی کے ہیں — رنگ کے کالے، پر صحت والے ......"

اور وتانی نے دایاں بازو اُبھار کر کے بائیں سے اپنے بائی سیپ چھوئے اور اکڑ کر بولا "تم سب کی مائیں بہنیں اس کا زور دیکھنا مانگتی ہیں۔"

جبھی گپتے نے کرسی کا بازو کھینچا اور پے در پے وتانی پر برسانا، اُسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد وتانی لڑکھڑایا اور بے ہوش ہو کر سب کے سامنے ڈھیر ہو گیا۔ اور یوں اِس تفتیش کا پہلا سیشن ختم ہوا۔

رات مرہم پٹی ہو جانے کی وجہ سے وتانی ہوش میں آ چکا تھا۔ پوری رات وہ سیلے فرش پر پڑا رہا۔ کپڑے پھٹ جانے کی وجہ سے وہ ننگ دھڑنگا، کچھ ننگا۔ مغربی گھاٹ کا کوہ پیالا کو بُرا معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے فرش پر رات کی دو سوکھی روٹیاں پڑی تھیں جو اب تک پاپڑ ہو گئی

تھیں۔ وہاں کے کٹورے میں مارورغ قسم کی ایک سفید سی تھیں چلی آئی تھی۔ چاول چیونٹے سے گئے تھے اور جب وہ ختم ہوئے تو ونائی کو کاٹنے لگے۔ چیونٹوں نے جب دیکھا کہ اُسے کاٹنے سے وہ خود ہی مرنے لگے ہیں تو بھاگ کر چیفونیئر میں دبک گئے۔

انسپکٹر لوگ آئے۔ اُن کے چہروں کی رگیں اور پٹھے کچھ ارادوں سے تنے ہوئے تھے۔

"ونائی" اجگاؤنکر نے پکارا۔

ونائی اُٹھ گیا۔ پھر اُٹھا اور اپنا کوبڑی پھرتی سے اٹھا کر اجگاؤنکر کو درست کرنے لگا۔ "ونایک راؤ.... ونایک راؤ۔"

"او کے.... او کے" اجگاؤنکر نے اپنے بید کو بغل میں اُڑستے ہوئے کہا۔ "مسٹر ونایک راؤ...."

"THAT'S RIGHT" ونائی نے کہا۔ اُس کے چہرے پر اب نفرت کا ایک احساس تھا۔ بازو کے ایک جھٹکے سے اُس نے گردن پر لگا ہوا رات کا پسینہ پونچھا اور اجگاؤنکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

اجگاؤنکر نے پوچھا۔ "تم ہوٹل برنج کے پروپرائٹر کو جانتے ہو؟"

"نہیں" ونائی نے جواب دیا۔ "ہاں ایک بار کھانا کھایا تھا اُدھر"

"تم جانتے ہو۔ جوزف پریرا اس کا پروپرائٹر ٹاون کونسلر کلگرنی اور وڈالے کے کچھ بنیوں کے ساتھ مل کر جوا اور نیتی چلاتا ہے۔ گو اُسے سیرو منگواتا ہے اور ان سے سکاتی؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کا دھندہ کم از کم ہفتہ کھلائے بغیر دو دن بھی نہیں چل سکتا...."

اجگاؤنکر تلملا کر رہ گیا۔ بات ٹھیک تھی مگر یہ بات ڈوک تو کمشنر نے بھی نہیں کی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ سے ماتھے پر کا پسینہ پونچھا اور پھر گپتے کی طرف اشارہ کیا کیونکہ یہ کیس دراصل اُسی کا بے بی تھا۔ یہ ایسے ہی تھا، جیسے کورٹ میں استغاثہ جب اپنی جرح ختم کر لیتا ہے تو وکیل صفائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے — "یور کیس...."

گپتے نے کہا۔ "راؤ صاحب.... آپ کے نالج میں ہے، جوزف پریرا ایلیشے پر آنکھ رکھتا تھا؟"

"آنکھ رکھتا تھا کہ ٹانگ رکھتا تھا...." ونائی نے جواب دیا۔ "کون، کسے، کتنے دھکے لگاتا ہے۔ میں کیا اس کا اکاؤنٹ رکھتا ہوں؟"

"تمھیں پتہ ہے پریرا اور علاقے کے دادا اکرم نے وادرا دریپل کے کہ اس روڈ پر جہاں جابر جی کا مندر ہے، ایلیشے کو چھاتی سے پکڑ لیا تھا؟"

"ہوں"

"پھر شور مچ جانے پر پریرا بھاگ گیا، مگر اکرم پکڑا گیا۔ لوگوں نے اُسے مارا؟"

ونائی نے اس بات پر سر ہلایا اور بولا۔ "اس لئے مارا کہ سالوں میں خود ہمت نہیں تھی چھاتیاں پکڑنے کی"

ونائی ہنس رہا تھا۔

"اس سے پریرا کی بے عزتی ہوئی" گپتے نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایلیشے کا دھندہ چوپٹ ہو گیا"

"تب ؟"

چیتے نے آواز کو بند کیا۔ "تب ، پلہ بیٹے کے نے اس نے ایک اجیر، ایک بانہ ٹنگ رکھا ؟"

"ہوں "

"اور وہ —— تم تھے . . . . تم . . . تم . . . . "

اس سے پہلے کہ ونائی جواب دیتا اجگاؤنکر نے گویا چھت ہی پھاڑ دی۔ "کے روپوں میں فیصلہ ہوا؟ . . . . بولو . . . . "

"بولو" چیتے اس کے ساتھ ہی گرجا۔

ونائی خاموش رہا۔ انسان ہمیشہ اس لئے خاموش نہیں رہتا کہ وہ مجرم ہے . . . . . وہ تھک بھی جاتا ہے۔

یہ وہ وقت تھا۔ جب آدمی اس قدر بھاشن بھاشن کرتے ہوئے خاموشی کے سامنے نہ صرف بے بس ہو جاتا ہے، بلکہ کانپنے لگتا ہے۔ نامردی میں، غصے میں چیتے نے دوسری کرسی کے بار ونائی پر لوٹ ٹوٹ گئے۔ وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ اب وہ مفتوح ذبیح تھا۔ اس کی ناک ہی سے نہیں، کان سے بھی خون بہنے لگا تھا، جو دماغ سے جریان کی علامت ہے۔ چیتے اور اجگاؤنکر دونوں کی چھٹی ہو گئی۔

"ڈھوکے" چیتے نے گھبرائی ہوئی آواز میں حوالدار سے کہا۔ "بھاگو . . . . . ناکے پہ جاؤ اور برف لاؤ۔"

حوالدار ڈھوکے نے "ہو" کہا اور سیلوٹ کے تکلف میں پڑے بغیر باہر کی طرف لپکا۔ پیچھے سے چیتے نے تاکیدی آواز دی —— "پوری سِل لانا۔"

. . . . دو روز بعد تیسرا سیشن ہوا۔ ونائی بچ گیا، جبکہ چیتے، اجگاؤنکر اور کچھ لاٹھیوں والے کر ونائی کے جیل کر گرنے اور ... حسی ہو کر مر جانے کا پنچ نامہ تیار کرنے کی فکر میں تھے۔ تیسرے دن ڈاکٹر آئی۔ آئی۔ گلاٹی کی مدد سے انہوں نے ونائی کی زبردستی فیڈنگ کی۔ طاقت کے انجکشن دیئے تاکہ اُسے تندرست بنائیں اور پھر ماریں ——

یہ دیکھ کر کہ اس وقت اذیت ٹھیک نہیں ہے۔ چیتے اور اجگاؤنکر نے پینترہ بدلا۔ ونائی کے پاس آتے ہوئے اجگاؤنکر نے کہا۔

"ونے . . . . "

ونائی چوکنا ہو گیا۔ کسی نئی حرام زدگی کے لیے تیار۔

"تم میرے بھائی ہو ——"

"ہوں"

"تمہارا گاؤں اڑوت اجگاؤں ہی کے پاس ہے"

"ہوں"

اس سے پہلے کہ اجگاؤنکر اپنا ہاتھ کسی مصنوعی میلان سے ونائی کے کندھے پر رکھتا ونائی نے پوری قوت سے یوں جھٹک دیا کہ وہ اجگاؤنکر کی پیٹھ سے جا لگا اور اسے موچ آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ چیتے، حوالدار ڈھوکے اور دوسرے کانسٹیبل حیران تھے کہ

اتنا سب کچھ ہو جانے، بھروں بھوکا رہنے کے باوجود اس چھوکرے میں اتنی طاقت کہاں سے چلی آئی؟!

"ہاں تمہاری مار سہہ سکتا ہوں۔" ونائی بولا۔ "پیار نہیں۔"

صاف دکھائی دیتا تھا کہ ونائی کی آنکھوں میں آنسو آمڈ رہے ہیں اور کتنی محنت اکتنی مشقت سے وہ انہیں کہیں اوپر کھینچ رہا ہے۔ مگر چونکہ آنسو اور جذبہ ہم زلف ہوتے ہیں۔ اس نے کسی رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے جو بولا ہے، سچ بولا ہے۔"

"سچ کہتے ہو۔" گپتے نے نرمی سے کہا۔ "اس گھات کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ نہیں؟"

"نہیں۔"

اور پھر ونائی اپنے آپ شروع ہو گیا۔ جیسے کوئی صفائی یا تزکیہ چاہتا ہو۔ "میں اسے جانتی امت بھید کے لیے مارتا تو بدلہ لینے کی بات ہوتی، پیسے کے لیے مارتا تو چوری بیری، لوٹ مار کی۔ شریر کے لئے مارتا تو پاپ کی . . . . ."

"ہوں . . . . ہوں . . . ." گپتے اور اجگاؤنکر نے ایک ساتھ کہا اور کرسیاں آگے سرکالیں۔ وہ یک زکنی الفاظ وناں ہی کا ٹھیکہ نہ تھے۔

"میں نے ایشے کو اس لئے مارا۔" ونائی نے گرمجھ سے کہا۔ "گنپتی وسرجن کے پورے کراوڑ میں وہی تھی، جس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ جو بہت خوب صورت لگ رہی تھی، اور را تو سنیٹ۔"

پھر تھوڑی دیر کے لئے وہ رک گیا۔ جیسے وہ رکا تھا، ویسے ہی شروع بھی ہو گیا۔ "میں کسی ایسے کو قتل کرنا چاہتا تھا، جو ایک دم سوم ہو، ولوی ہو، دیوتا ہو . . . ."

گپتے اور اجگاؤنکر کے چہروں پہ ابتری پھیل گئی۔ اب جو انہوں نے کہا وہ الفاظ کی مُشت زنی تھی۔ "تمہیں پتہ تھا، ایشے کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ نا سمجھ سُلبھا؟"

"اور صرف ایک پتی۔" ونائی نے جیسے پورے عمرانی نظام پہ چوٹ کی۔

کچھ دیر خاموشی حکومت کرتی رہی۔

"تم ولت پنیتھر ہو؟" آخر اجگاؤنکر نے اس سکوت کو توڑا۔ قانون شکنی کی۔ ونائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوال کو جواب کے قابل نہ سمجھتا تھا۔

"کرانتی کار؟" گپتے نے تضحیک کے انداز میں کہا۔ "بلیک پنیتھر؟ چے گوارا کے پیرو؟ الفتح . . . . ."

"میں ان سب کا باپ ہوں۔" ونائی نے ایک دم ایکسائیٹ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایک بے قصور کو مارا ہے۔" او پھر آدم بولا۔ "ان کا باپ اور تمہارا پوتنا (داماد)"

گپتے اچھل گیا، مگر اجگاؤنکر نے اپنی مضبوط بانہوں سے اسے دبا دیا۔ اور بولا۔

"جانتے ہو تمہارے جرم کی سزا موت ہے؟"

ونائی نے سر ہلایا۔ "اسی لئے تو یہ سب میں نے کیا ہے . . . . تم مجھے مارنا چاہتے ہو اور میں مرنا چاہتا ہوں۔ بولو، جیت

دو نو بیٹ کس کی ہوئی ؟ ... بکواس یہ ہے کہ اب تم میت ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی مارنا چاہتے ہو۔ جیسے ایک آدمی کے مارنے سے تمہارے نواتوں کی تکمیل پوری نہیں ہوتی ۔"

اور یہاں سے ونانی کا ٹھنڈا غصہ ایک واضح شکل اختیار کر گیا کیونکہ اس کا چہرہ بے رنگ تھا کسی قسم کے تاثر سے عاری ۔ جبکہ گھنٹے نے ہنسی لی اور نادانی میں ایک نہایت ہی مضحک بات کی ۔" مر گئے تو پتہ چلے گا مرنا کیا ہوتا ہے ؟"

"WHAT A DONKEY ?" ونانی نے ہنستے ہوئے کہا ۔

گھنٹے اور اجگا ڈنجو نے اُوپر سے ہزار واٹ کے بلب کی روشنی ونانی پر پھینکنا شروع کر دی ۔ اور بھی بہت سی چیزیں تھیں پڑھنے کی خاطر کے لئے ۔ مگر اُس وقت انہوں نے ایک ڈنڈے پر مرچیں لگا کر اسے ملزم کی مقعد میں ٹھونس دیا تھا ۔

دُنیا کے کسی نہ کسی حصے پر ہر سال ہر وقت برف پڑتی ہے ۔ ابھی وہ پگھل بھی نہیں پاتی کہ اُس پر اور برف پڑ جاتی ہے اور وقت کو منجمد اور توسل بنا دیتی ہے ۔

ونانی کی دنیا کا نقطۂ انجماد اسی دن سے بسیط ہونا شروع ہو گیا تھا ، جبکہ وہ کولی ماں باپ کے گھر پیدا ہو گیا ۔ وہ ساڑھے چار سال کا تھا جبکہ اس کا باپ ، رتناکون ، ریڈ سگنل کے باوجود اپنی ناؤ لے کر سمندر میں نکل گیا ۔ اُسی شام چاند اور بپھری موجوں نے مل کر نہ جانے کیا سازش کی کہ رتنا کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا ۔ وہی مچھلیاں جنھیں رتنا کولی کھانا ، پکانا اور بیچنا جانتا تھا ، مل کر اسے ہی کھا بیٹھیں اور بیچ گئیں ۔ ماں ایک بیوپاری کے ساتھ بھاگ گئی اور کچھ برسوں کے بعد ونانی کے لئے تین بہنیں اور دو بھائی لے کر لوٹ آئی ۔ ونانی ایکالش آرفینج میں پڑھا ہوا ہے جس کا آرفینج — اناتھ آلیہ ہے ۔ مگر اس میں صرف اناتھ ہی پڑھ سکتے ہیں ۔ ونانی اگر وہاں پڑھا تو یہ فادر کرنانیس کی مہربانی تھی ۔

وہ نقطہ اسی سال ہمشناسی شروع ہو گیا ، جبکہ لوگوں نے گنپتی کی مورتی گھر میں استھاپت کی اور پھول پھول اس کی سیوا میں بھینٹ کرنے لگے ۔ اُس دن ونانی اینٹروپ ہل کے دامن میں شکو سے آخری بار ملا ۔

شکو ہاتھ میں گولڈ فلیک کا ایک ٹین تھامے کھڑی تھی اور بے حد پریشان نظر آ رہی تھی ۔ اُس کی زلفیں وہم کی طرح سے لمبی ، آنکھیں گمان کی طرح سے دُھندلی اور بدن یقین کی طرح سے سخت تھا ۔ گویا اینٹروپ ہل کے ادھر آنچوں سے بنی ایک اپسرا تھی اور آدھی فولاد سے بنی ہوئی اپسرا — ٹرانسپورٹ کاری ایکٹر ۔ یہ میں ہری ایکٹر کی مناسبت سے کہہ رہا ہوں کہ شکو کا پورا بدن ایک بریتا تھا ، جس کی کنی کنی یورینیم تھی اور نس نس کوبالٹ ۔ وہ معدنیات کی ایک کان تھی ، جسے کسی نے ابھی تک پراسپیکٹ نہیں کیا تھا ۔ وہ دھاتوں کا خزانہ ، اسے ایک ہی دھات چاہئیے تھی اور وہ بھی صرف ونانی سے .... اسے تشبیہ ہو گیا تھا کہ یہ وہ مرد ہے جس کی وجہ سے اپنا آپ کم پڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے

جب شکو نے بتایا کہ وہ اور اُس کے ماں باپ رات سے بھوکے ہیں ، کیونکہ گھاسیٹ کے نہ ہونے سے چولہا نہیں جلا تو ونانی نے اپنے اسی بے رُکنی انداز سے کہا — " ہوں "

" ہُوں کیا ؟ " شکو نے اداسے پوچھا ، جس کے جواب میں ونانی نے پھر وہی " ہوں " دُہرا دی جو آواز پہلی ہوں سے مدہم تھی ، کیونکہ وہ سمجھ سے تعلق رکھتی تھی ۔

تبھی اُسے نَدوانی روڈ پر مانگا ساہین کی طرف جاتا ہوا ایسو کمپنی کا ایک ٹینکر دکھائی دیا جس میں گھاسلیٹ تھا ۔ نیچے اس کی ٹونٹی

سے مٹی کا تیل قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

زنائی نے شکو کے ہاتھ سے گولڈ فلیک کا ٹین جھپٹ لیا اور ٹینکر کے پیچھے دوڑا۔ سامنے ایک ٹرک کے آہستہ مڑ جانے سے ٹینکر کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ زنائی اُچک کر اُس کے پیچھے لٹک گیا۔ ایک ہاتھ سے اُس نے سیڑھی تھامی اور دوسرے سے ٹین کو ٹونٹی کے نیچے کر لیا۔ وہ چاہتا تو پھرتی دکھا کر ایک ہی سیکنڈ میں وہ چھوٹا سا ٹین بھر لیتا مگر اُس نے سوچا وہ صرف وہی تیل لے گا، جو گر کر سڑک پہ ضائع ہو رہا ہے ......

شکو کلیجے پہ ہاتھ رکھے کھڑی دور سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

سگنل موافق نہ ہونے سے ٹینکر تھوڑا آنا کے پڑکا اور پھر جھٹکے کے ساتھ دائیں طرف مڑ کر سائن ماٹنگا روڈ پہ ہو لیا۔ ریل کا پل پار کرتے ہی زنائی کا ٹین بھرنے لگا۔ تبھی راشن کی ایک دوکان پہ گھاسلیٹ کے لئے لیے کیو میں لگے ہوئے لوگوں نے اُسے دیکھ اور شور مچا دیا ۔۔۔ چور چور ...... زنائی کا ہاتھ سلپ ہو گیا اور وہ نیچے سڑک پر گر گیا۔ ٹینکر رکا۔ لوگ لپکے اور زنائی کو پکڑ کر اُسے مارنا شروع کر دیا۔ ٹینکر کا ڈرائیور اور اُس کا کنڈکٹر ساتھی اُسے گھسیٹتے ہوئے پاس ہی کے پولیس اسٹیشن کی طرف لے جانے لگے۔ زنائی کو صرف ایک ہی چوٹ آئی تھی اور وہ یہ کہ ٹین کے ساتھ گھاسلیٹ بھی نیچے گر گیا تھا ۔۔۔

زنائی نے نہیں مگر جانے کس نے شکو کا نام لے دیا۔ اُس دن بہت گرمی تھی کیونکہ بادل تنے تھے، مگر چھینٹا نہیں پڑ رہا تھا۔ تبھی پولیس کا ایک آفیسر جیپ لئے اینٹوپ ہل کی جھونپڑی میں پہنچ گیا ۔۔ تفتیش کے لئے۔ اُس نے شکو اور اُس کے ماں باپ کو بتایا کہ زنائی حوالات میں ہے۔ اُس پہ چوری، ڈاکے ۔۔ بائی وے رابری کے دوش لگے ہیں۔ شکو ایک تو پہلے ہی بھوکی تھی۔ اس پر زنائی کے پکڑے جانے کی بات سن کر وہ کانپنے لگی۔

"اُسے مارا تو نہیں؟" وہ بولی۔

آفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے پیاس لگی تھی۔ اس کی وجہ گرمی تھی یا شکو، یہ نہیں معلوم۔ لیکن جب شکو نے گھڑے سے پانی نکال کر اُسے دیا۔ تو اُس نے پینے سے انکار کر دیا۔ شکو نے سوچا، کوئی بات نہیں ...... اونچی جات کا ہو گا۔ آفیسر نے بتایا زنائی رہا ہو سکے گا، جب کوئی اس کا ضامن بنے گا......

شکو نے چھاتی پہ ہاتھ رکھا اور بولی۔ "جامن میں ہوں گی"۔

"تم؟" شکو کے باپ نے کہا۔ "تمہارے ......؟"

جب تک شکو غلیل کے گلے کی طرح سے باہر چھوٹ گئی تھی۔ آفیسر اُٹھا اور شکو کے باپ کو دلاسا دیتے ہوئے بولا "گھبراؤ نہیں کاکا شخصی۔ پرسنل ضمانت بھی ہو سکتی ہے ....."

اور وہ باہر کھڑی جیپ کی طرف چل دیا۔

بوڑھے نے وتسلا شکو کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں شک تھے۔ مگر وتسلا بنی بولی۔ "کوئی بات نہیں، جامنی نہ ہوئی تو آ جائے گی شکو......"

ونائی حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے ڈیوٹی آفیسر کو دیکھ رہا تھا۔
"میں نے کوئی چوری نہیں کی انسپکٹر...... کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا۔ چینکر سے کھاسیٹ نیک رہا تھا، سڑک پر گر کر ویسٹ ہو رہا تھا......"

ڈیوٹی آفیسر بنئے کی طرح کسی امیر گاہک کی طرف متوجہ تھا۔

پولیس آفیسر کی جیپ پہلے آگئی۔ بس سے اتر کر وہ پولیس اسٹیشن کے پیچھے چلا گیا۔ جہاں راستہ کوارٹروں کی طرف جاتا تھا۔
ونائی نے شنکو کو دور سے آتے دیکھا۔ وہ بھاگ رہی تھی اور اس کی گھنگھور زلفیں پیچھے کی طرف اڑ رہی تھیں، کہیں برسنے جا رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد ایک کانسٹیبل نے حوالات کا دروازہ کھولا اور کہا "ونائیک راؤ...... باہر۔"

ونائی جو اس ارتقائے سے تیار ہی نہ تھا، بولا۔ "کیا مطلب؟..... کیوں؟ کیسے؟"

باہر آیا تو اس نے شنکو بائی کو ڈیوٹی روم میں نہ پایا۔

"میری ضمانت کس نے دی ہے؟...... کس نے بیل آؤٹ کیا ہے مجھے؟" اس نے ڈیوٹی آفیسر سے پوچھا، جس نے باہر کی طرف اشارہ کیا ——

ونائی نے دیکھا شنکو پولیس اسٹیشن کے احاطے سے باہر جا رہی ہے اور وہ اپنی نہیں کسی اور ہی کی چال چل رہی ہے......

اس سے پہلے کہ وہ باہر لپکتا، ڈیوٹی آفیسر نے اُسے روکا اور ایک کاغذ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "سہی کرو........ ۴ اکتوبر کو باندرا کورٹ میں حاضر ہونا مانگتا، سمجھا؟"

ونائی نے جلدی سے کاغذ پر دستخط کئے، اس کی نقل ہاتھ میں پکڑ کر اور پھر باہر کی طرف بھاگا۔ سڑک سے اُدھر ٹریفک سگنل کے سامنے ہی ونائی نے شنکو کو آ لیا۔

"شنکو"۔ ونائی نے کہا......

شنکو کچھ نہ بولی۔ وہ رو رہی تھی اور نہ ہنس رہی تھی۔ وہ اس عالم میں تھی جس میں انسان دیکھتا ایک چیز ہے اور سوچتا دوسری۔ اور سوال کرنے والے کی طرف مڑ کر صرف اتنا سا کہتا ہے۔ ایں؟

ونائی نے شنکو کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ "کیا ہوا شنکو؟"

"کچھ نہیں" شنکو نے جواب دیا۔

ونائی اس کے پیچھے ہو لیا، اور کچھ نہیں تو ٹریفک سے اُسے بچانے کے لئے۔ سگنل کے پاس پہنچ کر ایک بار ونائی نے مڑ کر پیچھے پولیس اسٹیشن کی طرف دیکھا، جس کی دیواریں ٹھوس کنکریٹ سے بنی تھیں۔

سگنل کے دوسری طرف سڑک پر رک کر ٹریفک ابھی راستہ نہ دے رہی تھی۔ وہ دونوں پراپٹ پر کھڑے تھے۔ جبکہ ونائی

نے پھر پوچھا۔ "شنکر! بول تو سہی کیا ہوا؟"
شنکر نے ایک زہریلی نظر سے ونائی کی طرف دیکھا۔
"تم نے میری ضمانت دی ہے؟" ونائی نے پوچھا

"———— ————"

"کیسے دی ہے؟ تمہارے پاس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟"

شنکر نے حقارت کی نظر سے ونائی کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں زبان سے زیادہ ناطق تھیں جو کہہ رہی تھیں —— مرد کی جات گئے کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اگر اپنی زبان کو شرمندۂ الفاظ کرتی تو ونائی کہتا —— کتے کی نہیں بھیڑیئے کی۔ مگر وہ وہی بیگانی چال چلتی ہوئی سڑک پار کر گئی اور قدوائی روڈ کی پٹری پہ ہو لی۔ ونائی نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور بولا۔ "شنکر!"

شنکر پلٹ کر الٹ کر ونائی سے آ لگی۔ یوں معلوم ہوا جیسے وہ اُس کی چھاتی پہ اپنا سر رکھ کر اپنا دکھ رو لے گی، سُکھ پا لے گی۔ مگر نہیں شنکر نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اسے ونائی سے نفرت تھی، اپنے آپ سے نفرت تھی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چل دی!

ونائی بھونچکا کھڑا رہ گیا اور شنکر کو جاتے دیکھنے لگا۔ جس نے اپنے کلشٹے کا پلو منہ میں ٹھونس لیا تھا اور جا رہی تھی۔ سامنے بائیں ہاتھ پر وڈسل، بار بر براؤن کی ریلوے لائنیں اور انٹوپ ہل کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

ونائی سب جان گیا تھا۔ سب سمجھ گیا تھا۔ وہ کتنا کہنا چاہتا تھا شنکر، تم نردوش ہو، کنواری ہو ۔ ۔ ۔ انہی حالات میں سبزی بیچنے والی شنکر کو اُس کے پتی نے گھر سے نکال دیا تھا اور آج وہ فارس روڈ کی جنگو بائی کے قحبہ خانے میں رہتی دھندہ کرتی ہے۔ روز رات چھ سات مرد اُسے روندتے دلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اس سے کم ہوں تو نہ وہ میڈم، نہ دلال کے پیسے دے سکتی ہے اور رات پھیری والے کی سوکھی روٹی اور مرچ کھانی پڑتی ہے۔ لیکن وہ کنواری ہے کیونکہ اسے اپنے گاہکوں سے محبت ہے۔ نہ اپنے پتی سے تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ کنوارپن ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب مردوں کی سازش ہے تاکہ عورت جان ہی نہ پائے کہ مرد کیا ہوتا ہے ایک اور دوسرے میں کیا فرق ہے؟ مگر اس کا کیا علاج جبکہ عورت خود ہی اس سازش میں شامل ہو گئی ہے؟

ونائی کا خیال تھا شنکر آخر اسے بلائے گی، لوٹ کر آئے گی۔ مگر نہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو اب ونائی کے قابل نہ سمجھتے ہوئے جا چکی تھی۔ ونائی نے آخری بار اسے اپنی نظروں کی سرحد پر دیکھا اور چلا اُٹھا —— "میں ۳ اکتوبر نہیں آنے دوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ میں تین اکتوبر نہیں آنے دوں گا ۔ ۔ ۔ ۔"

اور اسی عالم میں وہ بھاگتا ہوا ماٹنگا کی بھاری ٹریفک میں کہیں گم ہو گیا ۔ ۔ ۔ (تمام!)

مغل بچّہ

عصمت چغتائی

فتح پور سیکری کے سنسان کھنڈروں میں گوری دادی کا مکان پرانے سوکھے زخم کی طرح کھٹکتا تھا۔ ککیا اینٹ کا دو منزلہ گھٹا گھٹا سا مکان ایک مار کھائے روٹھے ہوئے بچے کی طرح لگتا تھا۔ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا وقت کا بھونچال اس کی ڈھٹائی سے عاجز آکر آگے بڑھ گیا اور شاہی شان و شوکت پر ٹوٹ پڑا۔

گوری دادی سفید جھک چاندنی بچھے تخت پر سفید بے داغ کپڑوں میں ایک سنگ مرمر کا مقبرہ معلوم ہوتی تھیں۔ سفید ڈھیروں بال، بے خون کی سفید دھلی ہوئی ململ جیسی جلد، ہلکی کرنجی آنکھیں جن پر سفیدی رینگ آئی تھی پہلی نظر میں سفید لگتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں جیسے پسی ہوئی چاندنی کا غبار ان کے گرد معلق ہو۔

نہ جانے کب سے جئے جا رہی تھیں۔ لوگ ان کی عمر سو سے اوپر بتاتے تھے۔ کھلی کھلی گم صم بے نور آنکھوں سے وہ اتنے سال کیا دیکھتی رہی تھیں، کیا سوچتی رہی تھیں، کیسے جیتی رہی تھیں۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں وہ میری اماں کے چچا دادا سے بیاہی تو گئی تھیں مگر انہوں نے دلہن کا گھونگھٹ بھی نہ اٹھایا۔ کنوارپن کی ایک صدی انہوں نے انہی کھنڈروں میں بتائی تھی۔ جتنی گوری بی سفید تھیں اتنے ہی اُن کے دولہا سیاہ بھٹ تھے۔ اتنے کالے کہ اُن کے نام سے چراغ بجھے! گوری بی بجھ کر بھی دھواں دیتی رہیں۔

سرِ شام کھانا کھا کر جھولیوں میں سوکھا میوہ بھر کے ہم بچے لحافوں میں دبک کر بیٹھ جاتے اور پرانی زندگی کی ورق گردانی شروع ہو جاتی۔ بار بار سن کر بھی جی نہ بھرتا۔ اوبدا کر گوری بی اور کالے میاں کی کہانی دہرائی جاتی۔ بچارے کی عقل پہ پتھر پڑ گئے تھے کہ اتنی گوری گوری دلہن کا گھونگھٹ بھی نہ اٹھایا۔

اماں سال کے سال پورا لاؤ لشکر لے کر میکے پر دھاوا بول دیتیں۔ بچوں کی عید ہو جاتی۔ فتح پور سیکری کے پراسرار شاہی کھنڈروں میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے جب شام پڑ جاتی تو کھوئی کھوئی سرمئی فضا سے ڈر لگنے لگتا۔ ہر کونے سے سائے لپکتے۔ دل دھک دھک کرنے لگتے۔

”کالے میاں آ گئے۔“ ہم ایک دوسرے کو ڈراتے گرتے پڑتے بھاگتے اور ککیا اینٹ کے دو منزلہ مکان کی آغوش میں دبک جاتے۔ کالے میاں ہر اندھیرے کونے میں بھوت کی طرح چھپے محسوس ہوتے۔ بہت سے بچے مرنے کے بعد حضرت سلیم چشتی درگاہ پر ماتھا رگڑا تب گوری بی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک گوری بی بڑی ضدی تھیں۔ بات بات پر اٹوائی کھٹوائی لے کے پڑ جاتیں۔ بھوک ہڑتال کر دیتیں۔ گھر میں کھانا پکتا، کوئی منہ نہ جھٹاتا۔ جوں کا توں اٹھوا کر مسجد میں بھجوا دیا جاتا۔ گوری بی نہ کھائیں تو اماں باوا کیسے نوالہ توڑتے۔

بات اتنی سی تھی کہ جب منگنی ہوئی تو لوگوں نے مذاق میں چھینٹے کسے۔

گوری دلہن کا لا دولہا۔

مگر مغل بچے مذاق کے عادی نہیں ہوتے۔ سولہ سترہ برس کے کالے میاں اندر ہی اندر گھٹتے رہے جل کر منڈا ہوتے رہے۔

"دلہن میلی ہو جائے گی خبردار یہ کالے کالے ہاتھ نہ لگانا۔"

"بڑے نازوں کی پالی ہے تمہاری تو پرچھائیں پڑی تو کالی ہو جائے گی۔"

"بڑا تیہا ہے ساری عمر جوتیاں اٹھواتے گی۔"

انگریزوں نے جب مغل شاہی کا اختتام سنگسار کیا تو سب سے بری مغل بچوں پر بیتی کہ دہی زیادہ عہدے سنبھالے بیٹھے تھے جاہ و جاگیر چھن جانے کے بعد لاکھ کے گھر دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئے۔ بڑی بڑی ڈھنڈار حویلیوں میں مغل بچے بھی پرانے سامان کی طرح بابڑے۔ بھونچکے سے رہ گئے جیسے کسی نے پیروں تلے سے تختہ کھینچ لیا۔

تب ہی مغل بچے اپنے غرور اور خودداری کی تار تار چادر میں سمٹ کر اپنے اندر ہی اندر گھستے چلے گئے۔ مغل بچے اپنے غرور سے کچھ کھسکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کھرے مغل کی یہی پہچان ہے کہ اس کے دماغ کے دو چار پیچ ڈھیلے یا ضرورت سے زیادہ تنگ ہوتے ہیں۔ عرش سے فرش کی طرف لڑھکے تو ذہنی توازن ڈگمگا گئے۔ زندگی کی قدریں خلط ملط ہو گئیں۔ دماغ سے زیادہ جذبات سے کام لینے لگے۔

انگریز کی چاکری لعنت اور محنت مزدوری کسرِ شان، جو کچھ اثاثہ بچا اسے بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔ ہمارے ابا کے چچا روپیہ پیسہ کی جگہ چچی کے جہیز کے پلنگ کے پایوں سے چاندی کا پتر اکھیڑ لے جاتے تھے۔ زیور اور برتنوں کے بعد ٹکے جوڑے نوچ نوچ کر کھائے۔ پان دان کی کلھیاں سل بٹے سے کچل کر ٹکڑا ٹکڑا بیچیں اور کھائیں۔ گھر کے مرد دن بھر پتنگ کی اوائیں توڑتے شام کو پرانی گدڑی اجلی پہنی اور شطرنج پچیسی کھیلنے نکل گئے۔ گھر کی بیبیاں چھپ چھپ کر سلائی کر لیتیں۔ چار پیسوں سے چولہا جل جاتا۔ یا محلہ کے بچوں کو قرآن پڑھا دیتیں تو کچھ نذرانہ مل جاتا۔

کالے میاں نے دوستوں کی چھیڑ خانی کو جی کا گھاؤ بنا لیا۔ جیسے موت کی گھڑی نہیں ٹلتی ویسے ہی باپ ماں کی طے کی ہوئی شادی نہ ٹلی۔ کالے میاں سر جھکا کے دولہا بن گئے۔ کسی سرپھری نے عین آرسی مصحف کے وقت اور چھیڑ دیا۔

"خبردار جو دلہن کو ہاتھ لگایا کالی ہو جائے گی۔"

مغل بچہ چوٹ کھائے ناگ کی طرح پلٹا، سر سے بہن کا آنچل نوچا اور باہر چلا گیا۔

ہنسی میں کھسی ہو گئی۔ ایک ماتم برپا ہو گیا۔ مردانہ خانہ میں اس ٹریجڈی کی خبر ہنسی میں اڑا دی گئی بغیر آرسی مصحف کے رخصت ایک قیامت تھی۔

"بخدا میں اس کا غرور رکھ کر دور کردوں گا کسی ایسے ویسے سے نہیں مغل بچے سے واسطہ ہے۔" کالے میاں پھنکارے۔

کالے میاں شمشیر کی طرح پوری مسہری پر دراز تھے۔ دلہن ایک کونے میں گٹھری بنی کانپ رہی تھی۔ بارہ برس کی بچی کی بساط ہی کیا؟

"گھونگٹ اٹھاؤ!" کالے میاں نے کہا۔

دلہن اور گٹھری بن گئی۔

"ہم کہتے ہیں گھونگٹ اٹھاؤ۔" کہنی کے بل اٹھ کر بولے۔

سہیلیوں نے تو کہا تھا دولہا ہاتھ جوڑے گا، پیر پڑے گا، پر خبردار جو گھونگٹ کو ہاتھ لگانے دیا۔ دلہن جتنی زیادہ مدافعت کرے اتنی ہی زیادہ پاکباز۔

"دیکھو جی تم نوابزادی ہوگی اپنے گھر کی۔ ہماری تو پیر کی جوتی ہو۔ گھونگٹ اٹھاؤ۔ ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔"

دلہن پر جیسے فالج گر گیا۔

کالے میاں چیتے کی طرح لپک کر اٹھے۔ جوتیاں اٹھا کر بغل میں دابیں اور کھڑکی سے پائیں باغ میں کود گئے۔ صبح کی گاڑی سے وہ جودھپور روانہ ہو گئے۔

گھر میں سناٹا پڑ گیا تھا۔ ایک اکا دکا جو دلہن کے ساتھ آئی تھیں جاگ رہی تھیں۔ کان دلہن کی چیخوں کی طرف لگے تھے۔ جب دلہن نے کمرے سے چوں بھی نہ کی تو اُن کے تو پیروں کا دم نکلنے لگا۔ ہے ہے کیسی بے حیا لڑکی ہے۔ لڑکی جتنی معصوم اور کنواری ہوگی اتنا ہی زیادہ ہنگامہ مچائے گی۔ کیا کچھ کالے میاں میں کھوٹ ہے۔ جی چاہا کنوئیں میں کود کے قصہ پاک کریں۔

پیچھے سے کمرے میں جھانکا تو جی سن سے ہو گیا۔ دلہن جیسی کی تیسی دھری تھی اور دولہا غائب!

بڑے غیر دلچسپ قسم کے ہنگامے ہوئے۔ تلواریں کھنچیں۔ بڑی مشکل سے دلہن نے جو بیتی تھی کہہ سنائی۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ خاندان میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک کالے میاں کی، دوسری گوری بی کی طرفدار۔

"وہ آخر خدائے مجازی ہے۔ اُس کا حکم نہ ماننا گناہ ہے۔" ایک پارٹی جمی ہوئی تھی۔

"کہیں کسی دلہن نے خود گھونگٹ اُٹھایا ہے؟" دوسری پارٹی کی دلیل تھی۔

کالے میاں کو جودھپور سے بلا کر دلہن کا گھونگٹ اٹھوانے کی ساری کوششیں ناکام گئیں۔ وہ وہاں گھوڑ سواروں میں بھرتی ہو گئے اور بیوی کو نان نفقہ بھیجتے رہے جو گوری بی کی اماں سمدھن کے منہ پر مار آتیں۔

گوری بی کلی سے پھول بن گئیں۔ ہر تہوار پہ ہاتھ پیروں میں مہندی رچاتی رہیں اور بندھنی کے دوپٹے اوڑھتی رہیں اور جیتی رہیں۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ باوا کی مرن گھڑی آ پہنچی۔ کالے میاں کو خبر گئی تو نہ جانے کس موڈ میں تھے کہ بھاگے آئے۔ باوا موت کا ہاتھ جھٹک کر اُٹھ بیٹھے۔ کالے میاں کو طلب کیا۔ دلہن کا گھونگٹ اٹھانے کی باریکیوں پر مسکوٹ ہوئی۔

کالے میاں نے سر جھکا دیا۔ مگر شرط وہی رہی کہ حشر ہو جائے مگر گھونگٹ تو دلہن کو اپنے ہاتھوں اٹھانا پڑے گا۔ "قبلہ و کعبہ میں قسم کھا چکا ہوں۔ میرا سر قلم کر دیجیے مگر قسم نہیں توڑ سکتا۔"

مغل بچوں کی تلواریں زنگ کھا چکی تھیں۔ آپس کی مقدمہ بازیوں نے سارا کس بل نکال دیا تھا۔ بس [illegible]۔ ہو گئی تھیں ایک

انہیں کر پیچھے سے لگائے بیٹھے تھے۔ کسی نے کالے میاں سے نہ پوچھا تم نے ایسی احمقانہ قسم کھائی ہی کیوں کہ اچھی بھلی زندگی عذاب ہو گئی۔

خیر صاحب گوری بی پھر سے دلہن بنائیں گئیں۔ اینٹ والا مکان پھر پھولوں اور شمامۃ العنبر کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ اماں نے سمجھایا "تم اس کی منہ دکھائی ہو جانے دو جان۔ گھونگٹ اٹھانے میں کوئی عیب نہیں۔ اس کی ضد پوری کر دو مغل بچہ کی آن رہ جائے گی۔ تمہاری دنیا سنور جائے گی۔ گوری بی بھی پھولی پھلی رہیں گے۔ اللہ رسول کا حکم پورا ہو گا۔"

گوری بی بھی جہلے سے سنی رہیں۔ پچی کلی سات سال میں نوخیز قیامت بن چکی تھی۔ حسن و جوانی کا ایک طوفان تھا جو ان کے جسم سے پھوٹا نکلتا تھا۔

غیرت کالے میاں کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ سارے حواس اسی ایک نکتہ پر مرکوز تھے۔ مگر ان کی قسم ایک میخ دار آہنی کولے کی طرح ان کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔ ان کے تخیل نے سات سال آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ انہوں نے سیکڑوں گھونگٹ نوچ ڈالے زندگی کی ہر بازی بٹیر بازی کبوتر بازی مرغ بازی کوئی بازی نہ چھوڑی مگر گوری بی کے گھونگٹ کی چوٹ دل میں پنجے گاڑے رہی۔ جو سات سال سہلانے کے بعد زخم بن چکی تھی۔ اس بار انہیں یقین تھا ان کی قسم پوری ہو گی۔ گوری بی ایسی عقل کی کوری نہیں کہ جینے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیں۔ دو انگلیوں سے ہلکا پھلکا آنچل ہی تو ہے ہٹانا ہے کوئی پہاڑ تو نہیں ڈھونا۔

"گھونگٹ اٹھاؤ" کالے میاں نے بڑی لجاجت سے نباہ با امر معلیٰ دبدبہ غالب آ گیا۔

گوری بیگم غرور سے تمانی سناٹے میں بیٹھی رہیں۔

آخری بار حکم دیتا ہوں۔ گھونگٹ اٹھا دو۔ ورنہ اسی طرح پڑی پڑی سڑ جاؤ گی، اب جو گیا پھر نہ آؤں گا۔"

مارے غصے کے گوری بی لال بھبوکا ہو گئیں۔ کاش ان کے سلگتے رخسار سے ایک شعلہ لپکتا اور وہ منحوس گھونگٹ خاکستر ہو جاتا۔

خنجر کی طرح کالے میاں کو رہائے سانپ کی طرح جھومتے رہے۔ پھر جوتے بغل میں دبائے اور پائیں باغ میں اتر گئے۔

اب وہ پائیں باغ کہاں؟ ادھر پچھواڑے لکڑیوں کی ٹال لگ گئی۔ بس دو جامن کے پیڑ رہ گئے تھے اور ایک جھاڑی بیلے چنبیلی کی رہ گئیں۔ گلابوں کے جھنڈ شہتوت اور انار کے درخت کب کے لٹ پٹ گئے۔

جب تک ماں زندہ رہیں گوری بی کو سنبھالے رہیں ان کے بعد یہ ڈیوٹی خود گوری بی نے سنبھال لی۔ ہر جمعرات کو مہندی پیس کر پابندی سے لگائیں دوپٹہ رنگ چن کر ٹانکتیں اور جب تک سسرال زندہ رہی تہوار پہ سلام کرنے جاتی رہیں۔

اب کے جو کالے میاں گئے تو غائب ہی ہو گئے۔ برسوں ان کا سراغ نہ ملا۔ ماں باپ رو رو کر اندھے ہو گئے، وہ نہ جانے کن جنگلوں کی خاک چھانتے پھرے کبھی خانقاہوں میں ان کا سراغ ملتا کبھی کسی مندر کی سیڑھیوں پر پڑے ملتے۔

گوری بی کے سنہری بالوں میں چاندی گھل گئی۔ مرت کی جھاڑو کام کرتی رہی آس پاس کی زمینیں مکان کوٹھیوں کے مول بکتے گئے کچھ پرانے لوگ زبردستی ڈٹ گئے۔ کنجڑے قصائی آن بسے، پرانے محل ڈھے کر نئی دنیا کی بنیاد پڑنے لگی۔ پرچون کی دکان، ڈسپنسری ایک مرگھلا سا جنرل اسٹور بھی اگ آیا۔ جہاں المونیم کی پتیلیاں اور پیتل چائے کی پڑیوں کے ہار لٹکنے لگے۔

ایک مفلوج منحوس کی دولت بہہ کر بکھر رہی تھی۔ چند مختاط انگلیاں سمیٹنے میں لگی تھیں۔ جو کل تک ادوائین پر بیٹھتے تھے جھک

جھک کر سلام کرتے تھے آج ساتھ اٹھنا بیٹھنا کسرِ شان سمجھنے لگے۔

گوری بی کا زیور آہستہ آہستہ لالہ جی کی تجوری میں پہنچ گیا۔ دیواریں ڈھے رہی تھیں، چھتیں جھول رہی تھیں۔ پچاس پچپن بچے افیون کا استعمال کر کے پتنگوں کے پیچ لڑا رہے تھے، تیتر بٹیر سدھا رہے تھے اور کبوتروں کی دموں کے پر گن گن کر ہلکان ہو رہے تھے۔ نفاست مزاج جو کبھی شان اور دبدبے کی علامت سمجھا جاتا تھا مذاق بن رہا تھا۔ اور بیوی کولہو کے بیل کی طرح زندگی کے چکر میں اپنے محور پر گھومے جا رہی تھیں۔ ان کی کرنجی آنکھوں میں تنہائیوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔

ان کے لیے طرح طرح کے افسانے مشہور تھے کہ ان پر جنوں کا بادشاہ عاشق تھا۔ جونہی کالے میاں ان کے گھونگھٹ کو ہاتھ لگاتے، چٹ تلوار سونت کر کھڑا ہو جاتا۔ ہر جمعرات کو عشا کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتی ہیں تب سارا آنگن کوڑیالے سانپوں سے بھر جاتا ہے۔ پھر سنہری کلغی والا سانپوں کا بادشاہ اژدہا پر سوار ہو کر آتا ہے۔ گوری بی کی ذات پر سر دھنتا ہے۔ پو پھٹتے ہی سب ناگ رخصت ہو جاتے ہیں۔

جب ہم یہ قصے سنتے تو کلیجے اچھل کر حلق میں پھنس جاتے اور رات کو سانپوں کی پھنکاریں سن کر سوتے میں چونک کر چیخیں مارتے۔

گوری بی نے ساری عمر کیسے کیسے ناگ کھلائے ہوں گے۔ کیسے ایسی نامراد زندگی کا بوجھ ڈھویا ہوگا۔ ان کے رسیلے ہونٹوں کو کبھی کسی نے نہیں چوما۔ انہوں نے جسم کی پکار کو کیا جواب دیا ہوگا؟

کاش یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی۔ مگر قسمت مسکرا رہی تھی۔

پورے چالیس برس بعد کالے میاں اچانک آپ ہی آن دھمکے۔ انہیں قسم قسم کے لاعلاج امراض لاحق تھے۔ پور پور سڑ رہی تھی، روم روم رس رہا تھا۔ بدبو کے مارے ناک سڑی جاتی تھی۔ بس آنکھوں میں حسرتیں جاگ رہی تھیں جن کے سہارے جان سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔

"گوری بی سے کہو مشکل آسان کر جائیں۔"

ایک کم ساٹھ کی دلہن نے روٹھے ہوئے دولہا میاں کو منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مہندی گھول کر ہاتھ پیروں میں رچائی۔ پانی سمو کر پنڈا پاک کیا۔ سہاگ کا چکٹا ہوا تیل سفید لٹوں میں بسایا۔ صندوق کھول کر بور بور ٹپکتا جھڑتا بری کا جوڑا نکال کر پہنا اور ادھر کالے میاں دم توڑتے رہے۔

جب گوری بی شرماتی لجاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے سرہانے پہنچیں تو جھلنگے پر چیکٹ تکیے اور گودڑ بستر پر پڑے ہوئے کالے میاں کی مٹھی بھر ہڈیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ موت کے فرشتے سے جوجھتے ہوئے کالے میاں نے حکم دیا۔

"گوری بی گھونگھٹ اٹھاؤ۔"

گوری بی کے ہاتھ اٹھے مگر گھونگھٹ تک پہنچنے سے پہلے گر گئے۔

کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔

وہ بڑے سکون سے اکڑوں بیٹھ گئیں، سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں اور رنڈاپے کا سفید آنچل ماتھے پر کھینچ لیا۔

کارِ جہاں دراز ہے

(دوسری قسط)

قرۃ العین حیدر

فصلِ سوم

بابِ نیچری فوج

چوگوشیہ ٹوپی اوڑھے بوسیدہ فرغل میں ملبوس، نحیف نزار بوڑھا پھونس قصہ گو اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ مقبرۂ مبارز خاں کے گنبد اور میر بندے علی ترمذی کے پھاٹک کے سائے طویل ہو چلے۔ دہشت زدہ ہو کر جھیل پار شہرِ خموشاں پر نظر ڈالتا ہے۔ اس کے قدر دان محوِ خواب ہوئے۔ اوروں نے دنیا سنبھال۔ اپنے بھی اب اجنبی سے نظر آتے ہیں —— یہ پیر مرد اس جہانِ گذراں سے ایک مختصر سے دور یعنی صرف بارہ سو (۱۲۰۰) سال کی ایک کہانی سنا رہا تھا لیکن دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ نئے لوگ اس سے اکتا گئے۔ کسی کو اس کی حکایات کی مطلق ضرورت نہیں۔ لہٰذا کرم خوردہ شجروں کا بستہ لپیٹ کر عدم کی تاریکی میں لامکاں میں داخل ہو جائے گا جہاں نہ گفتگو ہے نہ جستجو۔

یہ دل شکستہ فاقہ کش بوڑھا دوبارہ کبھی نظر آئے گا کہ صورتیں، شخصیتیں اور انجمنیں اسی طرح مٹتی ہیں۔

محلہ سادات، حکیماں، رسولداراں، تیرگراں وغیرہ وغیرہ کے کھنڈروں پر نئی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے نصب کئے ہوئے لیمپ ٹمٹماتے ہیں مگر کہیں کہیں اکا دکا مشعل اب بھی جل رہی ہے۔

فصلِ اوّل میں اس قصبہ نہٹور ضلع بجنور کے دو بھائیوں میر بندے علی ترمذی و میر احمد علی کا قصہ مع ان کے بزرگوں کی داستان کے بیان کیا گیا۔ غدر میں میر احمد علی کالوں کی باغی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ پھانسی کی سزا ملی۔ جان بخشی ہوئی احمد علی کے بیٹے جلال الدین حیدر نے اپنے لڑکوں کو ان کے بچپنے ہی میں نیچری فوج میں بھرتی کر دیا کہ زمانے کا تقاضا یہی ہے۔ کول کی نئی چھاؤنی میں یہ فوج تعینات ہے۔ اس کے سالارِ اعلیٰ نے چالیس سال قبل میر احمد علی اور ان کے رفقا کی زبردست مخالفت کی تھی۔ وہ بھی وقت کا تقاضا تھا۔ مورخین۔ نقاد۔ سیاست داں۔ اہلِ بصیرت اپنے اپنے فیصلے بعد میں صادر کریں گے
اکبر نے فرمایا:۔

علی گڈھ کو شرف بخشا ہے اقبالِ نصاریٰ نے
کہ ہر مسلم اٹھا شوقِ ترقی میں یہیں آیا

اس صورتِ حال میں مجبوری اور تضاد یہ ہے کہ لسان العصر خود بھی خان بہادر اور جج ہیں۔ اپنے بیٹے کو گویا سوپا خدا!

پدرم کے والد

خان بہادر سید جلال الدین حیدر

وفات

۱۹۰۹ء

بحوالہ فصل سوم باب ۹

"اپنے دشت کا ایک ابدال"





سید ظہور حسنین رضوی

بحوالہ

فصل چہارم باب ۵

"دربارِ شاہ ولایتؑ"



ایم اے او کالج یونین (کرسیوں پر دائیں
سے بائیں) ضیاء الدین خان۔ سید سجاد حیدر
وائس پریزیڈنٹ لیولین ٹپنگ (انڈین ایجوکیشنل
سروس سینئر پروفیسر و پرووسٹ تھیوڈور
بیک (پریزیڈنٹ) سید حسین کرکٹ کپتان (؟)
پچھلی قطار: یلدرم کے منجھلے بھائی سید نصیر الدین
حیدر (ٹپنگ کے عین پیچھے) ان کے پیچھے
آخری صف وسط میں ابوالحسن۔ مولانا
محمد علی بھی شاید اسی گروپ میں موجود ہیں مگر
ان کی شناخت نہیں ہو سکی۔

شناخت از پروفیسر ہارون خان شیروانی (حیدرآباد، انڈیا)
بحوالہ فصل سوم باب "پکی بارک کے چار درویش"



یلدرم بغداد میں
۱۹۰۶ء
یہ تصویر مخزن میں "خیالستان" کے
پہلے باب کے ساتھ شائع
ہوئی
غالباً جون ۱۹۰۶ء۔
بحوالہ
فصل سوم باب ۴
"غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد"
یا
بحوالہ فصل چہارم باب ۹
"دل انگشتِ رخ ترکانہ داری!"



میں لارڈ بیجوز ... بنگلہ جس کے برآمدے میں بیٹھ کر
سرسید احمد خان
نے ایام غدر میں رات رات بھر ہوشیار
اس بنگلے کے ...
ڈپٹی کمشنر مسٹر بیجوز سامنے کھڑے ہیں
بحوالہ فصل اول باب
"غدر ۱۸۵۷ء"
تصویر قرۃ العین حیدر



بجلی چوری کے سامنے
سید جلال الدین حیدر صاحب کی
... کا صدر دروازہ۔
اس مکان کو انصاری صاحبان نے
کسٹوڈین سے نیلام میں خرید کر اس
پاور لوم کا کارخانہ قائم کر لیا ہے
بحوالہ فصل سوم باب
"اپنے وطن کا ایک ابدال"



بسنت ہال مسوری کی وہ کوٹھی جس میں
امیر یعقوب خان
سابق والئی افغانستان کو نظر بند رکھا گیا تھا
آج سے چند سال قبل تبت کے
دلائی لامہ
بھی اسی کوٹھی میں مقیم رہے۔
بحوالہ فصل سوم باب
"افغان باقی! کہسار باقی!"

خان بہادر سید نذر الباقر رضوی
لندن ۱۹۱۵ء -
(دائیں طرف)
غلام حسین سیالکوٹی - ملازم
(بائیں طرف)
نامعلوم

بحوالہ فصل چہارم باب ۱
فلائنگ آفریدی





پدرم مصر میں
فروری ۱۹۱۱ء -
"زیارت قاہرہ" تمدن دہلی جولائی ۱۹۱۱ء اور اسکندریہ میوزیم
میں چند گھنٹے"
غالباً اس کے بعد شائع ہوا -
بحوالہ
فصل چہارم باب ۹
" دل انگشتِ رخ ترکانہ داری"

ہے مدرسے بھیجنے کے بجائے نرسری میں پڑھوا رہے ہیں۔

کہ غم کے سے کہ دوں ہیں نرمی جسے متاثر

اکبر موجودہ ایسے سے قصے گریا یونانی کورس ہیں۔ سماجی شعور بھی رکھتے ہیں۔ شیخ جی۔ بدھو۔ قوم۔ وفاقی اور بھائی کھاتے ہیں۔ گورنر۔ کیمو۔ ڈنر۔ مس۔ کیسا۔ بشپ۔ آنر۔ پائنیر اخبار۔ کونسل۔ چندہ۔ بینڈ۔ مال روڈ۔ ہوٹل۔ ٹی الٹنک علامتیں ہیں ہر شعر پر دل خون ہوتا ہے۔

چند سال بعد زمانہ ایک اور دیوزاد کے ذریعے گرج کے پوچھے گا۔ اگر نہ تھا تو شریک محفل۔ وغیرہ اور وہ دیوزاد بھی دانشوروں کی مانند مشرق کے اس اجتماعی نوسٹیلجیا کا شکار رہتا۔

ایک بات پوچھوں۔ سب مغل۔ مرہٹے۔ سکھ۔ یورپین۔ فوجی ماہرین سے اپنے لشکروں کی تربیت کرواتے میں جٹ گئے۔ تاکہ مزید ایک دوسرے کا خون نچوڑ کر سکیں۔ کسی کو روس کے پیٹر اعظم یا مصر کے محمد علی کی مانند یورپ کی یونیورسٹیوں اور جدید صنعتوں سے فائدہ اٹھانے کی کیوں نہ سوجھی۔ اب جو مارلین۔ براؤن ہک۔ آرنلڈ۔ ایونگ وغیرہ صاحبان کمک، امپیریلسٹ مشنری آپ کی ہونہار اولاد کو بیٹی پڑھا رہے ہیں۔ ان پر اعتراض کیوں۔ صاحب بات یہ ہے گستاخی معاف۔ آپ کے محترم اجداد کو محض جاہ پرستی۔ ملوکیت اور اقتدار سے دلچسپی تھی۔

کہنے لگے وہ تحقیر مولوی نہ کرائیے گریجویٹ۔"

مگر صاحب معاف فرمائیے گا آج کی دنیا مولوی کے بس کا روگ نہیں۔

کشور ہند یک بیک قرونِ وسطیٰ سے نکل کر دورِ جدید میں داخل ہو چکا ہے۔ سید اور اُس کے ساتھی رنگیلے سب جدید مولوی ہیں اور نئی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان نئے مولویوں کی عظمت کا اندازہ آج سے نصف صدی بعد ہی ہو سکے گا۔ علاوہ ازیں اگر آپ صاحبان ابھی غدر سے پہلے کی دنیا لیے بیٹھے ہیں آج ۱۸۹۰ء کے برٹش انڈیا کے انڈر گریجویٹ نوجوانوں کے ذہنوں ان کے دلوں اور دلچسپیوں کا اندازہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

۱۸۴۰ء کے لگ بھگ نوجوان میر بندے علی ترمذی بیل تانگے میں سوار ہو کر نہٹور سے دلی مدرسہ فتحپوری میں درسِ نظامیہ کی تکمیل کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

بوڑھا قصہ گو ۱۸۹۰ء کی ایک رات لالٹین ہاتھ میں لے کر اس کچے راستے پر چلتا نہٹور سے روانہ ہو کر دلی کے نواح میں کول پہنچا ہے۔

دونوں وقت مل رہے ہیں۔ کالج کی مسجد سے ابھی اذان کی صدا بلند ہوگی۔ میدان میں کرکٹ کھیلنے کے بعد لڑکے اپنے اپنے کمروں کی طرف جا چکے ہیں۔ لالٹین کی لو ذرا اونچی کرو تو سامنے کچی بارک ہے۔ ایک اور علامت۔ علامتوں سے بچ نکلنا تک ہیں۔ جب مرہٹے دلی کے حاکم تھے۔ سندھیا کی فوج یہاں تعینات تھی۔ اب مرہٹے پونا اور بمبئی کے نئے کالجوں میں سر جھکائے وہی انگریزی نصاب پڑھنے بیٹھے ہیں جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں پڑھایا جا رہا ہے۔ میرے عزیزو۔ اس نکتے پر بھی غور کرو

اور سر دھنو۔

بارش ابھی ابھی رکی ہے۔ سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں طاری ہے۔ کالج کی عمارتیں اندھیری رات میں برساتی جگنوؤں کی طرح مدھم مدھم جھلملا رہی ہیں۔ جب سید گزشتہ برس کرائے گھر گھر جا کر بھیک مانگی تب یہ چند گھروندے جا کر کھڑے کئے۔

پیر مرد ماچیک نژاد بیوقوف نہیں۔ میکالے کا نام سن چکا ہے۔ عصا ٹیکتا سیدھا لائبریری پہنچتا ہے۔ جہاں لیمپ روشن ہیں۔ ایک میز پر بیٹھ کر قلم اٹھاتا ہے۔ بستے سے پیلے کاغذات نکالتا ہے۔ اچانک غصے سے ان کو نیچے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ پھر ذرا کی ذرا توقف کرتا ہے۔ ممکن ہے حاشیوں کے لئے ان قدیم ملفوظات شجروں، حکایتوں، عجائب القصص کی حاجت ہو۔ جھک کر لرزاں ہاتھوں سے وہ کاغذ چنتا ہے۔ واپس داخلِ دفتر کر دیتا ہے۔ جب تک زندہ ہے انھیں حرزِ جان بنائے رہے گا۔ گو خراسان کے قدیم داستان طراز مسل کی طرح جان گیا ہے کہ اس کا زمانہ ختم ہوا اور اب کوئی ابوالقاسم فردوسی طوسی اس کی ترجمانی اور ہمنوائی کے لئے نہیں آئے گا۔

لیکن یہ کہن سالہ قصہ گو جس کا دوسرا نام وقت ہے بڑا کائیاں ہے۔ فرنگیوں کے بنائے ہوئے اس کتب خانے میں داخل ہو کر اسے معلوم ہو چکا ہے کہ اندازِ بیان، موضوع اور اسالیب بدل گئے۔ یہ بھارت ورش ہے نہ ہندوستانِ جنت نشان۔ یہ برٹش انڈین ایمپائر ہے اور وہ خود اب وکٹورین انگلستان کے باسی نباسی اسالیب کی نقل کرنے والا ایک کونیل ادیب۔

چنانچہ اب وہ "بطرزِ جدید" ناول لکھے گا۔

باب ۲

پکّی بارک کے "چہار درویش"

ع بیا اے خامۂ نیرنگ پرواز

ـــــــ آہا ہا مہتابِ عالم تاب نے اچانک زمین و آسمان منوّر کر دیے۔ ہوا لطیف و خوشگوار۔ دل میں عجیب مسرت و فرحت پیدا کر رہی ہے۔ ہمارا ناولسٹ دوست مناظرِ فطرت سے لطف اندوز ہوتا لائبریری سے نکل کر صحن چمن سے گذرتا ایک بورڈنگ ہاؤس کی سمت روانہ ہوتا ہے۔ چہار طرف زمین زمرد رنگ، کوہ زمرد کے ہم سنگ۔ تبارک اللہ یہ باغ جنان ہے یا روضۂ رضواں۔ در و دیوار ندرت بار۔ مشاطۂ صبا گلکار۔ سلیمانی ٹوپی پہن کر ہمارا ناولسٹ دوست ایک بلڈنگ کے ورانڈے میں پہنچ کر کمروں کمروں جھانکتا ہے۔ ہر روم کے اندر نوجوانانِ چمن مصروفِ مطالعہ ہیں۔ ایک دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکتا ہے۔ اندر کا سین دیکھتا ہے سلیٹوں کا فرش، سیلی ہوئی دیواروں کے نزدیک تین چارپائیاں، سرہانے بے روغن کی میزیں، ایک ایک کرسی، کھونٹیوں پر کپڑے۔ ٹرکش کوٹ، ترکی ٹوپیاں، چارپائیوں کے نیچے ٹرنک اور ڈاسن کے بوٹ۔

پچھلے سال ترکی اور یونان میں پھر جنگ چھڑی۔ ادہم پاشا یونانیوں کو شکستِ فاش دے چکے ہیں۔ بارہ تیرہ سال قبل جنگِ روس و ترکیہ نے ہندی مسلمانوں کے لئے بہت ہیرو سپلائی کئے تھے۔ اس وقت وہ دیکھئے۔ دیوار پر جنرل ادہم پاشا کی تصویر فریم میں مسکرا رہی ہے۔ یہ وہ

بدبخت زمانہ ہے جب ہندوستان ۱۸۵۷ء کے سورماؤں کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ ان پر فخر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ترکی بہرحال سلطنت عثمانیہ کا بہترین جذباتی نعم البدل ثابت ہوا ہے۔

اسی تصویر کے نیچے ایک تپائی پر بڑا لیمپ روشن ہے۔ اس کے چینی گلوب پر انگور کے خوشے بنے ہیں اور ایک قدیم یونانی حسینہ بربط بجا رہی ہے۔

برسات کی رات پتنگے اور اللہ میاں کی بھینسیں یعنی بیٹل (انگریزی نام) لیمپ کے طواف میں مصروف۔ فرش پر لال بیگ یعنی کاکروچ (انگریزی نام) رواں ہیں۔

سچ پوچھئے تو بڑا خستہ حال سا ماحول ہے۔ مگر ایک نادار قوم نے اپنے نونہالوں کے لئے یہی میسر کر لیا غنیمت ہے۔
اسی سال چند ماہ قبل ہمارے قابلِ فخر محسنِ قوم ایجوکیشنسٹ آنریبل سر سید احمد خاں نے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تین نوجوان جنٹلمین اپنی اپنی چارپائیوں پر نیم دراز اسٹڈی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ آئیے ذرا نزدیک جا کر دیکھیں کیا پڑھ رہے ہیں؟ ادھر ہونہار، شکیل سرخ و سفید خوبرو نوجوان کون ہے۔ ہو نہ ہو یہی ہمارا ہیرو ہے۔ یعنی مسٹر ایس ایس حیدر۔ ہاتھ میں ایک ناول ہے جو کسی اجنبی زبان میں لکھا ہے۔ حروف مانوس نہیں کیسی زبان نہ عربی نہ فارسی، آہاہا۔ کیا خوب یاد آیا ؎

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی
یہ تاریخ لکھی ہے کسی تُرکی

تو شاید یہ ترکی ہے۔ خیر جو بھی ہے ابھی ہم اس کا پتہ چلا لیں گے۔

دوسرا ینگ جنٹلمین پائنیر اخبار پڑھ رہا ہے۔ شکل سے بہت جوشیلا اور ذہین معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اس کا نام محمد علی جوہر ہے۔ تیسرا نوجوان البتہ ہم نہ پہچان سکے۔ محمد علی ان سے مخاطب ہوتے ہیں۔

ا سنیں تو سہی یہ علی گڑھ کے کھلنڈرے کیا باتیں کر رہے ہیں[1]

محمد علی: (پائنیر اخبار زمین پر پھینک کر) بھائی سجاد کیوں نہ اب سویا جائے۔

سجاد: ضرور۔ لیمپ بجھا دو۔

محمد علی: (دوسرے نوجوان سے) میاں صاحبزادے لیمپ بجھا دیجئے۔

وہی نوجوان: آپ خود بجھا دیجئے۔ ہم سو رہے ہیں۔

محمد علی: لیمپ بجھا دو میاں صاحبزادے۔

نوجوان پھر اپنی بات دہراتا ہے۔ محمد علی زقند بھر کر میز کے قریب پہنچتے ہیں لیمپ اُٹھا کر لڑکے کے پاس لے جاتے ہیں۔ یا اصرار کرتے ہیں۔ وہ انکار۔ پھر چشم زدن میں وہ بھی پلنگ سے کودتا ہے اور کمرے سے باہر۔ محمد علی لیمپ ہاتھ میں لے کر اس کے

---

[1] یہ قصہ پدرم نے مجھے خود سنایا تھا۔ (ق ح)

پیچھے۔ سجاد حیدر ان دونوں کے تعاقب میں تینوں کا جلوس صحن میں پہنچتا ہے۔ دوسرے کمروں سے لڑکے نکل کر جلوس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لڑکا سب سے آگے۔ چراغ بکف محمد علی نعرہ لگاتے اس کے پیچھے۔

اس نوع کے چند اور چٹکلے، لطائف و ظرائف اس دور کے علی گڈھ کی اسٹوڈنٹ لائف کے قابلِ شنید ہیں مگر چونکہ اس قصے کے پلاٹ کا تعلق ہمارے ینگ ہیرو سجاد حیدر سے ہے جو ہمارے اولڈ ہیرو میر احمد علی ترمذی کے پوتے ہیں لہٰذا کیوں نہ ہم ان کے ہم صفیران چمن سے درخواست کریں کہ وہ اپنے دوست کے بارے میں نوا پیرا ہوں۔

ہمارے یہ ذکی و فہیم و خوش رو ہیرو جو ۱۸۸۰ء (قمری حساب سے غالباً ۱۲۹۸ھ) میں بمقام نہٹور پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم شہر بنارس میں حاصل کی جہاں اُن کے والد ماجد بحیثیت ڈی ایس پی و کوتوال شہر تعینات تھے۔ ۱۸۹۴ء میں نویں جماعت میں مدرستہ العلوم میں شامل ہوئے۔ سید کے کالج کے ذہین ترین اور سب سے خوش پوش طلباء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ فی الوقت بی اے میں پڑھ رہے ہیں حیدر حسن، محمد حیات، رضا علی اور سجاد حیدر "چہار درویش" کہلاتے ہیں۔

رضا علی ایف اے میں سجاد حیدر کے منجھلے بھائی نصیر الدین حیدر کے ہم جماعت ہیں۔ سب سے چھوٹے بھائی وحید الدین حیدر کے ایک ہم جماعت اور یارِ غار سید محمود رحمۃ اللہ علیہ ابھی سے "محمودِ قوم" کہلا رہے ہیں۔

اب ہم آپ کو مسٹر ایس رضا علی سے انٹروڈیوس کراتے ہیں۔ یہ بلند اقبال صاحبزادے کندرکھی ضلع مراد آباد سے آئے ہیں اور اُس ماحول کے پروردہ ہیں جس کا نقشہ فصل دوم کے ابواب میں کھینچا گیا۔ لہٰذا راوی اب چلنی کے مرزی گلوب والا لیمپ محمد علی جوہر کے ہاتھ سے لے کر سید رضا علی کے سامنے رکھتا ہے۔ ع

مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما

سید رضا علی: میری پہلی ملاقات سجاد حیدر سے جولائی ۱۸۹۸ء میں ہوئی حیدر حسن اور سجاد حیدر بڑے بذلہ سنج تھے۔ محمد حیات کی شگفتگی مزاج کا اظہار خاص خاص دوستوں میں ہوتا تھا۔ یہ تینوں بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ سجاد حیدر انگریزی اور اردو دونوں بڑی اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انشاپردازی کی سنہری لڑیوں میں موقع محل سے لطافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے۔ انگریزی زبان کا اچھا ناول شاید ہی کوئی پڑھنے سے بچا ہو۔ نصیر الدین حیدر کے دوست محمد ادریس، عبدالوہاب (اے۔ ڈبلیو) زبیری اور محمد سبطین تھے نصیر کا بھی انٹرنس کے امتحان میں سارے صوبے میں دوسرا نمبر تھا مگر علی گڈھ کے ماحول میں پڑھنے والوں کی قدر نہ تھی۔

محمد ادریس کے بڑے بھائی محمد ابراہیم سجاد حیدر کے دوست تھے۔ ایک قصہ سناؤں جس سے معلوم ہوگا کہ اس دور کے علی گڈھ کا کیا رنگ تھا۔ ۱۸۹۸ء کی بات ہے۔ ادریس ابھی علی گڈھ پہنچے ہیں۔ سجاد حیدر کے کمرے میں آکر بیٹھے ہیں۔ کچھ اور طالب علم بھی وہاں موجود ہیں۔ جن میں گورکھپور کے شاکر علی بھی ہیں جو بعد میں بیرسٹر ہوئے۔ شاکر بڑے نٹ کھٹ تھے۔ ادریس سے پوچھا۔

"آپ کا نام؟"

ادریس نے جواب دیا "محمد ادریس"۔

کہنے لگے "یہ بجا ہے"۔ کوئی دو منٹ تک خاموش رہے۔ اس کے بعد ایک چپت غریب ادریس کو رسید کیا۔ ادریس نے کوئی دو منٹ غور کیا کہ اس تواضع کا جواب زبان سے دوں یا ہاتھ سے۔ اگر تشدد کا جواب تشدد سے دیا تو شاکر کا کچھ نہ بگڑے گا۔ ان سے یہاں سب واقف ہیں۔ بدنامی میری ہوگی کہ آتے ہی ہاتھا پائی شروع کر دی۔ بگڑ کر کہا: "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ مجھ سے آپ کی بے تکلفی نہیں ہے۔" شاکر کا خیال صحیح نکلا۔ اس دن سے دونوں بے تکلف دوست ہو گئے۔

"ظفر عمر تی بارک میں رہتے تھے۔ فٹ بال خوب کھیلتے تھے۔ بارہ بنکی کے چودھری نعمت اللہ اور پنجاب کے ملک زمان مہدی ہم سے تین درجہ اوپر تھے۔ سید ابو محمد بھی اسی زمانے میں تھے وہ بعد میں خان بہادر اور ممبر یو۔ پی پبلک کمیشن ہوئے۔ بارہ بنکی کے ولایت علی بمبوق بھی ہم عصر تھے۔ انہوں نے بمبوق کلب قائم کیا۔ تحریر میں بلا کی شوخی تھی۔ بعد میں کامریڈ میں طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھتے رہے۔ عین جوانی میں انتقال کیا۔ مسعود الحسن (مسعود ناصح) بھی جوان سال مرے۔ مراد آباد کے محمد یعقوب (بعد میں سر یعقوب) سردار محمد حیات سجاد حیدر کے دوسرے ساتھی تھے۔

"محمد حیات خاں، مشتاق احمد زاہدی اور حیدر حسن مرحوم بھی اس زمانے کے علمی ذوق رکھنے والے طلبا میں سے تھے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد مشتاق احمد نے علی گڑھ چھوڑ دیا مگر دوستوں سے ملنے اکثر علی گڑھ آتے تھے۔ یہ سب حضرات علی گڑھ کی زندگی کے گہرے نقاد تھے۔ علی گڑھ میں اس وقت تک کوئی ایسا انتظام نہ تھا کہ کوئی ہونہار طالب علم کسی خاص مضمون میں کمزور ہو تو اس کمزور مضمون کی طرف اساتذہ خاص توجہ کرتے۔ سجاد حیدر ریاضی سے بہت گھبراتے تھے۔

نواب حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاؤلی، سر سید کے بے حد مخلص اور روشن خیال دوست تھے۔ اُن کے والد ہجرت کر کے مکے چلے گئے تھے۔ جو اس زمانہ میں دولتِ عثمانیہ میں شامل تھا۔ وہیں نواب اسمٰعیل خان نے ترکی پڑھی جو عربستان کی سرکاری زبان تھی۔ ترکی کے دلدادہ بن کر ہندوستان لوٹے۔ سر سید کے ڈرامے "تماشائے عبرت" میں ترک کا پارٹ انہوں نے ہی ادا کیا۔ یلدرم ابھی ایف اے کے طالب علم تھے جب نواب اسمٰعیل خاں کے سکریٹری بن گئے۔ ان کو انگریزی پڑھاتے اور خود ان سے ترکی سیکھتے۔

نواب اسمٰعیل خاں اردو اور فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور علی گڑھ سے ایک رسالہ نکالتے تھے جس کا نام "معارف" تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر سجاد حیدر۔ مولوی صاحب اور محمد علی نے سب سے پہلے اردو داں اخبار بین حضرات کو سیاسی مسائل کے سادہ دسترخوان پر ادب کی چاشنی کی لذت سے آشنا کیا۔

سجاد حیدر معارف[1] میں خود بھی مضمون لکھتے تھے اور انگریزی رسالوں کے اعلیٰ مضامین کا ترجمہ بھی کرتے تھے۔ ۱۸۹۶ء سے

---

[1] مقالہ "ناول نویسی" معارف یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء میں انگریزی ناولوں کا تذکرہ کرنے کے بعد یلدرم نے لکھا: "اس بیس تیس برس کے عرصہ میں ہر اخبار ہر رسالہ ہر چھاپہ خانہ اور اگر مبالغہ نہ ہو تو ہر دماغ ناولوں سے بھر گیا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے تسلط کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ مرحوم "تہذیب الاخلاق" پرچے کو بھی اس جبروت حاکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور غالباً یہ فخر بھی ہندوستان ہی کو حاصل ہے کہ باوجودیکہ کل ملک اس طرف ڈھل پڑا ہے پھر بھی اعلیٰ درجہ کے ناول نویس پیدا نہ ہوئے۔ اعلیٰ درجے کے تو کیا معمولی اور ادنیٰ درجے کے بھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس وقت اردو میں ناول لکھنے والے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

۱۸۹۹ء تک "معارف" میں سجاد نے چند طبعزاد افسانے لکھے۔ علی گڑھ کا پہلا دور ۱۸۷۵ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۵ء میں ختم ہوا۔ دوسرے دور کا آخری سال ۱۹۱۵ء اور تیسرے کا ۱۹۳۵ء سمجھنا چاہیے۔

"دوسرے دور کے طلباء میں سجاد حیدر کا مرتبہ بلحاظِ علمی قابلیت بہت بلند تھا۔ مطالعے کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ہماری قومی زندگی میں جن نئے خیالات کو مفید سمجھتے تھے ان کی زبردست تائید تحریر و تقریر کے ذریعے کرتے تھے۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ دوسرے کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بڑے خوش خلق اور سادہ مزاج تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے زبردست حامی تھے کھیل کود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مسٹر تھیوڈور بیک کے چہیتے طلبا سب کھلاڑی جن کو علمی مذاق سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انگریز کی پالیسی تھی کہ علی گڑھ کے لڑکوں کو سنجیدہ علمی مذاق سے دُور رکھا جائے اور کھیل کود کا شوقین بنایا جائے۔ مسٹر بیک کہتے تھے کہ رنجیت سنگھ اور جام صاحب نوانگر کرکٹ کے کھلاڑی دادا بھائی نوروجی ممبر برطانوی پارلیمنٹ سے زیادہ اہم ہیں۔ جو انجمن الفرض" کے لئے زیادہ چندہ جمع کرے اس کی بھی قدر کی جاتی تھی۔

محمد علی کی قدر اس وجہ سے تھی کہ وہ کرکٹ کے کپتان تھے۔ مسٹر بیک کی زبردست شخصیت نے اس مذموم رجحان کو یہاں تک پھیلایا کہ ذوقِ ادب اور کھیل کی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے مبحث پر شوکت علی نے پنجاب ابزرور میں ایک مضمون لکھا تو بجائے اپنا نام لکھنے کے اپنا ادبی لقب بڑے فخر سے "مسٹنڈا وحشی" مضمون کے آخر میں درج کیا۔

"اس ماحول میں سجاد حیدر کتاب کے کیڑے تھے۔ ادبی ذوق رکھنے والے طلبا کی موجودگی روا رکھی جاتی تھی مگر قابلِ تحسین نہ سمجھے جاتے تھے۔ خواجہ غلام الحسنین موردِ عتاب رہے۔ مسٹر ماریسن نے ایک حد تک اور نواب محسن الملک نے طلبا کی قدر ان کی علمی قابلیت کے موجب کی۔

"بقول پروفیسر آرنلڈ سجاد حیدر کا شمار کالج کے ہونہار ترین طلبا میں تھا اور وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے معاصرین میں ممتاز تھے۔ سجاد حیدرؔ انجمن اخوان الصفا کے ممبر تھے جو پروفیسر آرنلڈ نے قائم کی تھی۔ پروفیسر صاحب موصوف عربی عبا پہن کر کالج کے جلسوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے جو چوٹی کے شمار کئے جاتے ہیں وہ افسوس کہ نصف درجن سے بھی کم ہیں۔

"ایک اور بات ہے جس کی طرف ہمارے ناول نویسوں نے توجہ نہیں کی یعنی یہ کہ ناول کے ہیرو کے لیے تعلیم یافتہ اور امیر ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔ غریب اور غیر تعلیم یافتہ بھی تو اچھا ہیرو ہو سکتا ہے نیکی اور دوسری صفات کچھ علم اور امارت کے ساتھ ہی وابستہ نہیں مگر ہمارے ناول نویسوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہیرو کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک نہایت ہی اعلیٰ خاندان کا ہو۔ نواب زادہ یا شہزادہ ہو۔ ابھی تک اردو میں غربت کی زندگی کا قصہ کھینچا جانا باقی ہے یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے جس پر اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ (مزید) "ہمارے ناول نویس ہر باب کا تین چوتھائی حصہ ایسے مقام کی سینری بیان کرنے میں لگتے ہیں جسے انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ترکی کے تمام ناول بھی اردو میں لائے جائیں مگر وہ ناول نہیں جو خود بھی ترکی میں تمام فرنچ سے آئے۔ مصر اور شام کے عربی ناولوں سے بھی اردو خواں پبلک کو آشنا کرنا چاہیے۔" یہ مضمون لکھتے وقت مصنف کی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی اور وہ بی اے فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔

شرکت کرتے تھے۔ اسی سال یعنی ۱۸۹۸ء میں سر طامس آرنلڈ لاہور چلے گئے جہاں وہ اقبال کے استاد بنے۔ ۱۸۹۹ء میں پروفیسر تھیوڈور بیک کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ سر تھیوڈور مارِیسن (بعد میں لارڈ مارِیسن) کالج کے پرنسپل ہوئے۔

"لیڈی مارِیسن نے چند طلبا کو ستھرے مذاق کی خطوط نویسی سکھانے کے لئے مدرسہ کھولا۔ سجاد حیدر، ابو محمد، اعجاز علی، محمد ظریف اور میں موصوفہ سے درس لیتے تھے۔ طریقہ تعلیم یہ تھا کہ ہم ہفتہ میں ایک دن لیڈی صاحبہ کے بنگلے پر جمع ہوتے۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ لیڈی صاحبہ بجائے شائستہ خطوط نویسی کی تعلیم کے یہ درس دے رہی ہیں کہ ہندوستانی جب انگریز کو خط لکھے تو کیا طرز اختیار کرنی چاہیے۔

"ہماری اس بدگمانی کی ایک وجہ یہ تھی کہ موصوفہ کے مزاج کی افتاد شاہانہ واقع ہوئی تھی۔ تھیں تو وہ پرنسپل کی بیوی مگر چاہتی تھیں کہ طلبا ان کے ساتھ وہی برتاؤ کریں جو اس زمانے کے رئیس، کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع کی میم کے ساتھ کرتے تھے۔ ساتھ ہی اس زمانے میں جو جلیل القدر انگریز علی گڑھ آتے اکثر سر تھیوڈور کے مہمان ہوتے اور پرنسپل صاحب ان سے اپنے خاص طلبا کو ملواتے۔

"سجاد حیدر کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں جو نظمیں اور مضامین انہوں نے لکھے وہ بڑے پُر لطف ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر زمانہ چین سے بیٹھنے دیتا تو وہ ملک و قوم کی عظیم الشان ادبی خدمت انجام دیتے۔ "مرزا پھویا"[2] سجاد نے ۱۹۰۰ء میں لکھی۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ سر سید احمد خاں کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کی امداد کے لئے سر سید میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔ محسن الملک نے ملک کا دورہ کیا اور بہت سے شہروں میں جلسے کر کے تقریریں کیں کہ قوم کا فرض ہے کہ اپنے کالج کی امداد کرے اور اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجے۔ مرزا پھویا بڑے ناز و نعمت میں پلے تھے۔ گھر سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ محسن الملک کی سحر بیانی کا یہ اثر ہوا کہ باپ نے مرزا کو علی گڑھ بھیجنے کا تہیہ کر لیا۔"

مشتاق احمد زاہدی نے مرزا پھویا کے شانِ نزول کے متعلق بتایا ہے کہ جس دن پہلی دفعہ یہ حضرت یکّے سے اُتر کر بورڈنگ میں داخل ہوئے ہیں تو ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں پان دان۔ اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یار لوگوں نے ان پر خالہ اماں کی پھبتی کہہ دی جو ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ گئی مگر سید صاحب نے اپنی نظم میں ان کو 'مرزا پھویا' کا خطاب دے کر ان کے حلیے کو بدل دیا۔

یہ موہان ضلع کانپور سے آئے ہوئے ایک صاحبزادے تھے جو آگے چل کر مولانا حسرت موہانی بنے۔

زاہدی صاحب سے اب مزید قصہ سنئے۔

مسٹر مشتاق احمد زاہدی[1]:- سید سجاد حیدر سے میری دوستی کی ابتدا ۹۷-۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ ہم دونوں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں ایف اے میں پڑھتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے ساتھ بہت سے جماعتی تھے جنہوں نے اپنے اپنے فن میں بہت نام پایا۔ مسٹر محمد علی جو بعد میں مسٹر

---

[1] چچا زاہدی یلدرم کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے پرنسپل رہے۔ مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں دلی سے پاکستان ہجرت کی۔ ۱۹۶۰ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

[2] "مرزا پھویا" سب سے پہلے علی گڑھ کالج کے ایک دو ورقی اخبار میں چھپی جو تفنن طبع سے خفیہ طور پر دستی یا چھپا ہوا نکلتا تھا۔

محمد علی، آحسن اور مولانا نے اپنی قابلیت و قوم پرستی میں شہرۂ آفاق ہوئے۔ مقصود علی خاں اور ملک زماں مہدی اگرچہ ذہین تھے مگر کتابی کیڑے ہی تھے۔ سجاد اِدھر اُدھر کی کتابوں کا مطالعہ تو بہت کرتے تھے۔ مگر امتحان والی کتابوں کو محض ضرورتاً پڑھ لیتے تھے۔ باوجود اس کے جب ایف اے کا نتیجہ آیا تو معلوم ہوا کہ سجاد صاحب انگریزی اور فارسی میں تمام الٰہ آباد یونیورسٹی میں اوّل مگر ریاضی میں صفر۔

محمد علی کا وقت بھی کرکٹ کھیلنے والوں کی صحبت میں ضائع ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ عبداللہ کرکٹ کپتان کے ساتھ رہتے تھے۔ تاہم محمد علی بہت ذہین تھے۔ اس لئے امتحان میں پاس تو ہو گئے۔ مگر نمبروں میں سجاد کا لگّا بھی نہ کھا سکے۔ محمد علی کی قابلیت آکسفورڈ میں عیاں ہو رہی تھی۔ سجاد کی خاموش قابلیت و طبعی انکساری کی وجہ سے کالج والے ان کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کے ریاضی میں فیل ہو جانے سے ہر شخص اس مضمون کے موجد کو بد دعا دیتا تھا۔ ریاضی نے ان کا بہت قیمتی وقت ضائع کر دیا جس کی وجہ سے وہ ساری عمر نہ پنپ سکے اور ملازمت کی دوڑ میں مقصود علی خاں اور زماں مہدی سے پیچھے رہ گئے۔ مگر طالب علمی کے زمانے میں ان باتوں پر کوئی غور نہیں کرتا اور باوجود اس ناکامی کے سجاد کی ہر دلعزیزی اور شہرت میں کوئی کمی نہ آئی۔ بلکہ طلبا اور پروفیسروں کو سجاد سے ہمدردی اور زیادہ ہو گئی۔ کہ افسوس ایسا قابل شخص ریاضی کی وجہ سے رہ جائے۔ چنانچہ جب بی اے میں ریاضی سے پیچھا چھٹا تو سجاد تمام الٰہ آباد یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر پاس ہوئے۔

یونین میں تقریر کرنے کا شوق سجاد کو اسکول کے زمانے سے تھا۔ اخبار بینی کا بھی مرض تھا۔ اس لئے یونین کے سب اعزازی عہدے ان کو حاصل ہو گئے۔ یعنی وہ سلیکٹ کمیٹی کے ممبر ہوئے پھر لائبریرین ہو گئے۔ پھر سکریٹری مقرر ہوئے تقریر کرنے کا انعام اور کیمبرج پرائز حاصل کیا۔

مضمون نگاری ایف اے سے بھی قبل شروع کی۔ انگریزی انشا پردازی میں بھی سجاد بی اے کرنے سے پہلے ہی اپنے ہم عصروں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ کالج کے طلبا اس زمانے میں انگریزی اچھی ہونے کا معیار یہ سمجھتے تھے کہ "پانیر" میں مضمون چھپ جائے[2]۔ اکثر طلبا نے جی کو اپنی انگریزی پر نازاں تھا سعی لاحاصل کی مگر سب سے پہلے سجاد کا ہی ایک مضمون شائع ہوا۔ ان کے بعد جن صاحب کا مضمون شائع ہوا وہ محمد علی تھے جو ان کے کلاس فیلو تھے۔ اس کے کئی سال بعد سید رضا علی کے خطوط جو اچھے طویل ہوتے تھے چھپنے لگے"۔

راوی —— سجاد حیدر کی والدہ سعیدہ بانو بنت سید سے علی ترمذی کا انتقال ہو چکا تھا تعطیلات میں سجاد حیدر اور ان کے چھوٹے بھائی اکثر مع محمد علی جوہر کے اپنے چچا خان بہادر سید کرار حیدر کے ہاں جاتے۔ ۱۸۹۸ء میں ڈاکٹر صاحب رائے بریلی میں تعینات تھے۔ جہاں جولائی کے مہینے میں گھوڑے سے گر کر جان بحق تسلیم ہوئے۔ صرف ۳۵ سال عمر پائی۔ خان بہادر جلال الدین حیدر نے بھائی کی یاد میں طے کیا فرزندِ اصغر میاں وحید کو بھی لاہور میڈیکل کالج بھیجیں گے۔ جہاں جوانمرگ کرار حیدر مرحوم نے پڑھا تھا۔

لاہور اس وقت کالجوں، ادیبوں، صحافیوں، اخباروں اور رسالوں کا عہد آفریں اور ہنگامہ پرور شہر بن چکا تھا۔ اس زمانے میں

---

[1] مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا خیال ہے کہ غالباً سب سے پہلے "اودھ اخبار" میں انگریزی مختصر افسانہ کے تراجم شائع ہوئے اور بعد میں خود ان کے چلائے "معارف" میں جس میں سید سجاد حیدر نے کچھ افسانے لکھے اس لحاظ سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس طرح دنیائے مغرب میں پو کو مختصر افسانہ نویسی کا موجد کہا گیا ہے۔ سید سجاد حیدر اردو زبان میں طرزِ جدید کے مختصر افسانے لکھنے والے پہلے شخص ہیں"۔ (شمس العلما تاجور نجیب آبادی)

[2] دیکھو چھپے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا بہرِ خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے (اکبر الٰہ آبادی)

ہمارے ایک اور قابلِ قدر اور لائق دوست شیخ عبدالقادر چند روز کے لئے لاہور سے علی گڑھ آتے ہیں اور ہمارے ہیرو کی لائف کی ایک جھلک آپ کو دکھاتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر:

"میرے دوست سید سجاد حیدر یلدرم کا غلغلہ بعد میں یلدرم کے نام سے ادبی دنیا میں بلند ہوا ابھی یلدرم نہیں بنے تھے اور نہ میں مدیر مخزن تھا۔ جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی، میں کالج سے نکل کر انگریزی اخبار "آبزرور" کا اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا اور وہ علی گڑھ میں بی اے کر رہے تھے اور اپنے اوقات فرصت میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ کے سکریٹری کا کام کرتے تھے۔ ایک دن میں علی گڑھ میں حاجی صاحب سے ملنے گیا تو سجاد حیدر ایک کونے میں علیٰحدہ میز کرسی لگائے بیٹھے کام کر رہے تھے۔ حاجی صاحب نے ان سے میری ملاقات کرائی۔ جب میں حاجی صاحب سے بات کر کے فارغ ہوا تو سجاد میرے پیچھے پیچھے آئے اور کہنے لگے "آیئے میں آپ کو ایک دلچسپ چیز دکھاؤں۔"

"آپ شبلیؔ غمزدہ کو مشقِ سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر کیسے اور کہاں"

انہوں نے کہا "ابھی اور یہیں"

مولانا شبلیؔ اس وقت حاجی صاحب کے ہاں مہمان تھے۔ اور اس بنگلہ کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سجاد مجھے ایک کمرے کی طرف لے گئے۔ جس کا ایک دروازہ کھلا تھا۔ مولانا شبلیؔ دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم دروازے کے آئینوں میں سے جھانک کر انھیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کا قلم کبھی کاغذ پر چلتا تھا اور کبھی قلم کا ایک سرا منہ سے قریب ہوتا تھا۔ جیسے فکرِ سخن میں ہیں۔

"معلوم نہیں ہم دونوں کا مولانا کا اس طرح دزدیدہ دیکھنا کہاں تک مناسب یا جائز تھا۔ مگر مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا کہ ہم نے یہ حرکت کی۔ مجھے تو انھیں مصروفِ سخن دیکھنا ایسا دلچسپ معلوم ہوا کہ مدتوں نہیں بھولا۔ اور سجاد حیدر کا یہ جذبہ مجھے بہت بھایا کہ مولانا کو فکرِ سخن کرتے دیکھنے سے انھیں جو لطف آیا اس میں انہوں نے مجھے بھی شریک کرنا ضروری سمجھا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہم کس قدر ہم مذاق ہیں۔

"مولانا شبلیؔ اپنے شاگردوں میں "شبلیؔ غمزدہ" کے نام سے مشہور تھے کیونکہ وہ اپنے نام کے ساتھ "غمزدہ" لکھا کرتے تھے۔ زمانہ طالبعلمی میں ایسے استاد فن کو دیکھنا اور اس سے سجاد حیدر کے مذاق کو مستحکم اور تیز بنانے کا باعث ہوا۔

"ایک واقعہ مجھے خاص طور پر یاد ہے کیونکہ اس سے ان کی طبیعت کے ایک میلان کا پتہ چلتا ہے جس سے میں پہلے بے خبر تھا۔ وہ اس وقت تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو آزادیٔ نسواں کا بہت حامی تھا اور کسی عورت میں آزادی کا شوق دیکھ کر بہت متاثر ہوتا تھا، اور اس شوق کی بے حد تعریف کرتا تھا ۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کراچی میں ہو رہی تھی جس کے صدر اس سال مولانا حالیؔ تھے۔ ان کے نام کی کشش مجھے بھی وہاں لے گئی اور سجاد حیدر بھی اس میں شریک تھے۔

"ایک دن جب جلسہ دوپہر کے کھانے کے لیے برخاست ہوا اور میں اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد صاحب آتے نظر آئے مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک دو چکر اپنے گرد لگائے۔ جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں اور مجھ سے کہنے لگے "کچھ نہ پوچھئے کہ میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔"

"میں نے پوچھا کچھ تو بتایئے کیا دیکھا ہے کہ طبیعت اس طرح زوروں پر ہے۔" کہنے لگے "ایک ایسی عورت[1] سے باتیں کر کے آرہا ہوں جو آزادی کی حامی اور خود بھی آزادی پر عامل ہے۔"[2]

یہاں پر اب ہم کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس وقت ہماری نیشن کی معزز پردہ نشین لیڈیوں کا کیا حال تھا۔ آہ۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہماری بیبیاں اس زمانے میں ظالم سماج کے جور و ستم کا شکار تھیں اور زیور تعلیم سے محروم رکھی جاتی تھیں۔ آئندہ باب میں مشتاق احمد زاہدی اور شیخ محمد عبداللہ بانی گرلز کالج علی گڑھ آپ کو بتلائیں گے کہ ان تمام نوجوانوں نے تحریک تعلیم نسواں کے سلسلے میں کس طرح جد و جہد کی۔

باب ۳

بیچلرز لاج کی "خاتون"

مشتاق احمد زاہدی داستان جاری رکھتے ہیں۔ "بی اے کے بعد سجاد راجہ اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہو کر ناگپور گئے۔ مگر بعد میں گورنمنٹ نے راجہ صاحب کو علی گڑھ کالج بھیج دیا۔ ایک کوٹھی کرایہ پر لی گئی۔ اس میں دو کمرے قانون کے طلبا کے لئے مخصوص کئے گئے۔ سجاد کی کوشش سے مجھے اور مرحوم انعام الحق کو (جو بعد میں گورنمنٹ آف انڈیا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے انڈر سکریٹری ہوئے۔) جگہ ملی۔ ساری کوٹھی ہم تین دوستوں کے قبضے میں آگئی۔ راجہ صاحب بے چارے شاگرد تھے، علیحدہ کونے میں پڑے رہتے۔

"کوٹھی کا نام بیچلرز لاج رکھا گیا۔ ہم تینوں کنوارے تھے اور یہ خیال زیر بحث رہتا تھا کہ دنیا میں ترقی کرنے اور آرام سے رہنے کے لئے متاہل زندگی موزوں نہیں۔

"اس خیال کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگوں کو نئی تہذیب بہت چڑھ گئی تھی۔ مسلمان عورتیں انگریزی تعلیم سے محض نابلد تھیں۔ اردو لکھنا پڑھنا بھی کسی کسی کو آتا تھا اور مغربی طرز زندگی سے سارے ہندوستان میں سوائے چند خواتین کے کسی کو واسطہ نہ تھا۔ ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ بیچلرز لاج میں جس طرح ہم صاحبانہ زندگی بسر کرتے ہیں ہماری رفیقۂ حیات بھی اس کی اہل ہو اور چونکہ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی، اس لئے یہ خیال دلنشین ہو گیا تھا کہ جب تک اس قسم کی بیوی نہ ملے شادی کرنی ہی نہیں چاہیے۔

"ہم لوگ عورت کی بہت عزت کرتے تھے اور مسلمان ہندی عورت کو تعلیم کے ذریعہ بتدریج معراج ترقی تک پہنچانا ہم نے اپنا مقصد زندگی قائم کیا تھا۔

---

[1] عطیہ فیضی

[2] "میرے احباب" از سر عبدالقادر، لاہور سے براڈ کاسٹ ۱۹۴۹ء مطبوعہ "آہنگ" ریڈیو پاکستان، کراچی۔

"ڈگری پانے کے بعد ہم لوگ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ قانون کی کلاسیں محض علی گڑھ کالج سے وابستہ رہنے کا ایک بہانہ تھا۔ سوائے نئی دنیا بنانے کے کسی قسم کا فکر نہ تھا۔ کالج کے نئے اور پرانے ہر بیا آور دہ طلبا کو ہر ہفتے کھانے یا چا پر مدعو کیا جاتا۔ قوم کی کوئی مقتدر ہستی کالج کے ملاحظے کے لئے علی گڑھ میں موجود ہوتی ان کے فیضانِ صحبت سے استفادہ حاصل کیا جاتا۔

"تعلیم نسواں، پردہ، مغربی طرزِ معاشرت، احکامِ شریعت، اسلام بحث کے موضوع ہوا کرتے تھے۔ سجاد ان مباحثوں میں پیش پیش ہوتے۔ جو تجاویز وہ پیش کرتے اس وقت وہ ناقابلِ عمل معلوم ہوتی تھیں مثلاً اُن کا خیال تھا کہ نماز دیسی زبان میں ہوا کرے۔ اور قرآن شریف کا ترجمہ بغیر عربی عبارت کے شائع کیا جائے۔ مسجدوں میں ایسے غسل خانے بنائے جائیں جن میں کوٹ پتلون اور ہیٹ استعمال کرنے والے مسلمانوں کو وضو کرنے میں سہولت ہو۔ اگر جوتوں سمیت نماز پڑھی جائے تو بوٹ پر چڑھانے کے لئے غلاف موجود ہوں۔ اسلامی قانونِ وراثت میں وہ حتیٰ کہ خاندان کے طرز پر تبدیلی چاہتے تھے۔ اُردو قرآن شریف، اُردو نماز اور تقسیم وراثت پر سجاد کے مضامین رسالوں میں شائع ہوئے۔ اُن کے خلاف بہت کچھ لے دے ہوئی۔

"شیخ محمد عبداللہ کے رسالے "خاتون" کے پہلے نمبر میں ہمارے کنوار گروپ کے ممبر نعمان الحق نے حقوقِ نسواں پر ایسا مضمون لکھا کہ جس کی دھوم ہو گئی اور ہم تینوں ہمیشہ اس رسالے میں لکھتے رہے۔"[1]

(شادی کا بیان یہاں ختم ہوا۔)

"شیخ محمد عبداللہ ایک کشمیری نوجوان سجاد حیدر سے چند سال سینیر تھے اور سرسید کے منظورِ نظر طالب علم رہ چکے تھے۔ کسی کا سرسید اور بک صاحب پرنسپل کے یہاں مقرب ہونا آسان نہ تھا۔ تاہم عبداللہ اپنی ہوشمندی اور قومی دردمندی کے سبب سے سرسید کے حاضر باش اور بک صاحب کے عزیز شاگرد رہ چکے تھے۔ قانون کی تعلیم کے دوران لائبریرین اور پرنسپل بک کے سکریٹری رہے۔ بانیٔ کالج کے انتقال کے بعد "سرسید میموریل فنڈ" اور "ون روپی فنڈ" کے سکریٹری بنے۔[2]

شیخ عبداللہ علی گڑھ میں وکالت شروع کر چکے تھے۔ جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے انھیں شادی کی راہ دکھائی ۱۹۰۲ء میں دلی کے ایک مغل گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی وحید جہاں بیگم بنتِ مرزا ابراہیم بیگ سے شادی ہوئی۔ بارات میں نواب محسن الملک، آفتاب احمد خاں، نواب صدر یار جنگ، مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی، نواب سر سلطان احمد خاں اور خواجہ عبدالمجید کے والد خواجہ محمد یوسف وغیرہ شامل تھے۔ دلی میں شمس العلما مولوی ذکا اللہ، حکیم اجمل خاں وغیرہ نے تقریب میں شرکت کی اور شیخ عبداللہ "اعلیٰ بی" کو بیاہ کر علی گڑھ لائے۔

اب خود شیخ صاحب آپ کو قصہ سنائیں گے۔[2]

"اس وقت قوم کے بزرگوں میں مولوی سید کرامت حسین، پروفیسر قانون، علی گڑھ کالج، جسٹس سید امیر علی اور بدرالدین طیب جی

---

[1] محمد مقتدیٰ خاں شیروانی کے ایک مضمون سے اقتباس۔

[2] "سوانح عمری عبداللہ بیگم" از شیخ محمد عبداللہ مرحوم۔ طبع ثانی باہتمام و نگرانی محمد مقتدیٰ خاں شیروانی۔ علی گڑھ ۱۹۵۴ء

اور نوجوانوں سید سجاد حیدر اور اُن کے چند ساتھیوں کے علاوہ تعلیمِ نسواں کا کوئی حامی نہ تھا۔ سر سید لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف تھے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا شعبۂ تعلیم قائم ہوا تھا مگر اس نے کچھ نہ کیا۔

"سنہ ۱۹۰۲ء میں ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاجپوشی کے موقع پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا جس کے پریسڈنٹ آغا خاں اور علیا حضرت سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال تشریف لائیں۔ ایک شام میں نے دوستوں کو جمع کیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نواب سلطان احمد خاں، سید سجاد حیدر اور دوسرے اولڈ بوائز سے میں نے کہا کہ میں شعبۂ تعلیمِ نسواں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صاحبوں سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس کا سکریٹری مقرر کر دیجئے۔ سب نے بالاتفاق رائے مجھے سکریٹری مقرر کیا۔

"عبداللہ بیگم نے بیبیوں کا جلسہ منعقد کیا۔ اس میں مسز رضا اللہ (شمس العلماء ذکاء اللہ کی بہو) اور سعید احمد بیگم نے نمایاں حصہ لیا۔ میں نے اخبارات میں تعلیمِ نسواں پر مضمون لکھنے شروع کئے۔ بیحد مخالفت کی گئی۔

"سنہ ۱۹۰۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا اور پہلی بار عورتوں کو پردے کے پیچھے سے کانفرنس کی تقریریں سننے کا موقع دیا گیا۔ کانفرنس میں طیب جی خاندان کی عطیہ اور زہرا فیضی شریک ہوئیں۔ شمس العلماء مولوی ممتاز علی اور مولوی محبوب عالم اڈیٹر "پیسہ اخبار" بھی موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ لاہور میں زنانہ نارمل اسکول جاری کریں مگر انہوں نے لاہور واپس جاکر اطلاع دی کہ اسکول جاری کرنے کا کوئی حامی نہیں۔ اس کے بعد میں نے اور عبداللہ بیگم نے طے کیا کہ علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا جائے۔

"مجھ کو ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کے لئے لکھنؤ جانا تھا۔ اس وقت تک مدرسہ جاری کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ میں بہت پریشان تھا لیکن ۲۰ دسمبر کو ڈاک کے ذریعے بھوپال سے ایک سرکاری لفافہ ملا۔ علیا حضرت مرحومہ منفورہ نے کمال آشنائی سے میری ناچیز درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور مدرسے کیلئے سو روپے ماہوار کی مستقل امداد کا اعلان فرمایا۔ میں عطیہ نامہ لیکر لکھنؤ پہنچا اور مجھے امید تھی کہ نواب محسن الملک ضرور اس سے خوش ہوں گے۔ میں نواب صاحب سے راجہ سر تصدق رسول خاں صاحب مرحوم کی کوٹھی پر جاکر ملا۔ نواب صاحب اس وقت کسی بات پر ناخوش بیٹھے تھے۔ بہت سے احباب ان کے پاس موجود تھے۔ میں نے نواب صاحب مرحوم سے بھوپال کے عطیے اور علی گڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ جاری کرنے کا ذکر کیا۔ نواب صاحب مرحوم نے اپنے غیظ و غضب میں یہ سنتے ہی اپنی ترکی ٹوپی سر سے اُتار کر چبوترے پر پھینک دی اور کہا 'اب میرا علی گڑھ میں رہنا دشوار ہے۔ لوگ یوں ہی کالج کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اب نہ جانے کیا کہیں گے۔ راجہ صاحب نے مجھے سمجھانا شروع کیا 'آپ نوجوانوں کو مناسب نہیں ہے کہ بڈھوں کی مرضی کے خلاف کوئی کام کریں۔ آپ کو پہلے نواب صاحب سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا،' میں بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر چبوترے پر سے نواب صاحب کی ٹوپی اٹھا کر لایا اور اُن کے سامنے میز پر رکھ دی۔ نواب صاحب اسی غصے کی حالت میں اُٹھ کر گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ میں نے ان سے کہا 'گو پُرانے خیال کے لوگ تعلیمِ نسواں کے خلاف ہیں لیکن جدید نسل کے خیالات کا آپ نے بالکل کوئی لحاظ نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ دل سے تعلیمِ نسواں کے حامی ہیں'۔ نواب صاحب مسکرانے لگے اور فرمایا جو کچھ میں نے کہا وہ بھی ٹھیک تھا اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ بھی ٹھیک ہے۔ اپنا کام کئے جاؤ۔[1]

---

[1] مدرسۂ نسواں علی گڑھ ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا۔

"۱۹۰۴ء ہی میں میں نے ارادہ کیا کہ تحریک تعلیم نسواں میں جان ڈالنے کے لئے ایک رسالہ جاری کرنا چاہیے۔ سید سجاد حیدر، سید ابو محمد، احتشام الحق اور انعام الحق نے مجھ سے اتفاق کیا۔ رسالے کا نام غالباً سید سجاد حیدر یا خان بہادر ابو محمد نے تجویز کیا کہ "خاتون" ہونا چاہیے۔ خاتون کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔"

"۱۹۰۴ء ہی میں علی گڈھ میں پہلی زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی جس کے بانی شیخ عبداللہ تھے۔ بھلپر زلاج والے نازلی صاحب فرماتے ہیں کہ ہم تینوں نے اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ کانفرنس ہمارے لئے کئی معنوں میں دلچسپ اور نرالی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں عطیہ فیضی جیسی ترقی یافتہ خواتین اور آبرو بیگم جیسی مشرقی علم و فضل میں یگانہ روزگار مستورات موجود ہیں۔ حامیانِ طبقۂ نسواں کو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

"اسی زمانے میں پروفیسر تھیوڈور مارلین (بعد میں لارڈ مارلین) پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج کے پاس بطانوی قونصل اور پولیٹیکل ریذیڈنٹ بغداد کے ہاں سے ترجمان کی مانگ آئی۔ بہت سے طلبا نے درخواستیں دیں۔ جن میں سے بعض ایسے تھے جن کا کام روزانہ پرنسپل کو سلام کرنا تھا اور جو عربی کے ایم اے تھے۔ سجاد نے بھی درخواست دی۔ گو سجاد محض بی اے تھے اور پرنسپل مارلین سے کبھی ملتے بھی نہ تھے مگر مارلین نے سب سے زیادہ سجاد کی سفارش کی۔ نیز ان کو ترکی بھی آتی تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں کے خیال میں غیر متوقع طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔ ان کے بغداد جانے سے بھلپر زلاج کا خاتمہ ہو گیا۔"

باب ۴

بابِ عالی

"۲۶ر مارچ ۱۹۰۴ء کو ہم کولار جہاز کے ذریعے کراچی سے روانہ ہوئے۔ ۱۵ر اپریل کو مسقط پہنچے۔ پہاڑ ہی پہاڑ جن پر درخت کیا سوکھی گھاس کے پتے کا نشان نہیں اور اس پر مسقط کو دعوے سلطانی ہے۔ ۸ر اپریل کو بوشہر۔ دوربین سے شہر کو دیکھا اور کچھ اچھا نہ پایا۔ ۹ر اپریل ۸ بجے صبح۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ ہم کس خطے میں جا رہے ہیں۔ رات بھر میں کیا طلسم ہوا۔ دو طرفہ خرمے کے درختوں کی مسلسل قطاریں۔ گلاب۔ نارنگی اور انار کے درخت۔ ہمارا سفینہ دجلہ و فرات کے مجموعہ پانی پر چل رہا ہے۔ ایک طرف ساحل ترکی ہے۔ دوسری طرف ایران۔ یہ سرسبز سلسلہ یہاں سے بغداد چار سو میل تک جاری رہے گا۔

"یہ سمجھنا کہ یا سوڈان کے خرمے کے درخت نہیں کہ چار پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں۔ اردگرد سینکڑوں میل تک ریت کا چٹیل میدان۔ یہ عراقین کے نخلستان اور بوستان ہیں جن کے سایہ میں ہر قسم کے پھل اور پھول موجود ہیں۔

"محمرہ کے بعد بصرہ کے مضافات شروع ہو جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ۔ امرائے بصرہ کے مکانات۔ حسین یہودی، ارمنی اور خال خال ترک عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں دوڑ دوڑ کر لبِ دریا آتے ہیں۔ ہم دوڑ دوڑ کر ڈک کے کنارے ان کو دیکھے جاتے ہیں۔ مگر وہ تو ایک دو گھنٹے ہی میں جہاز بصرہ پہنچ گیا اور وہاں سے سرکاری کشتی میں بٹھا کر ہم قرنطینہ پہنچا دیئے گئے۔

زنداں کو چلے مچل مچل کر"

سید حیدر کے ایک مضمون سے اقتباس۔

اب وجد بارہ سو سال قبل مدینہ، کوفہ اور دمشق سے نکل کر افتاں و خیزاں دجلہ کے کنارے پہنچے تھے کشتیوں میں سوار ہو کر عجم کی راہِ فرار اختیار کی تھی۔ دشتِ لوط کے اُس پار، ماوراء النہر جیحون کے اُس پار داغستانِ قراپیل[1]۔ جاگیری دور میں مدتِ مدید تک جہاں از گنگ تا شگند[2] اجداد کا تسلط رہا۔

چھپن سال قبل دِلّی دروازہ، خونی دروازہ بنا۔ ترکوں میں وکٹوریہ گیٹ تعمیر ہوا۔ اس کی محراب کے نیچے سے کئی راستے نکلے ان پر چلتے ترکی ٹوپی فراک کوٹ پہنے نئے رہرووں نے نئی دنیا میں قدم رکھا۔

اجداد کی قدیم دنیا اب برطانوی کولونیل آفس کی نئی اصطلاح "مڈل ایسٹ" اور محمد فاتح اور سلیمان اعظم کی سلطنت لارڈ کرزن کے "ایسٹرن کوئسچن" میں تبدیل ہو چکی تھی۔

دجلہ و فرات وہی ہیں۔ وہی سواحلِ عراقین۔ زوالِ بغداد کو آٹھ سو سال گزر چکے۔ لیکن دیکھو سلطان المعظم کا پرچم ہوالی بندرگاہ پر کس شان سے لہرا رہا ہے۔ برطانوی جہاز پر ضابطے کے مطابق یونین جیک کے ساتھ عثمانی نشان لگا دیا گیا ہے۔ ترک کسٹم افسر جہاز پر آ گئے ہیں۔ قرنطینہ کی عمارت میں رپ رپ پھر رہے ہیں۔

بابِ عالی[3] کے حکام۔ بابِ عالی کا نام سُن کر ہی پھریری سی آتی ہے۔ جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ چوق یشا[4] خلیفۃ المسلمین، چوق یشا دولتِ عثمانیہ۔

لیکن وہ بھی دیکھو جہاز کے ڈک پر مدمغ برطانوی افسر، سیاح، مشنری سولا ہیٹ اوڑھے، سفید کوٹ پتلون میں ملبوس کرنیل۔ فارس میں گرمی شروع ہو گئی ہے۔ اکڑے مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں۔ جانتے ہیں سارا عالمِ اسلام اب ان کا ہے۔

اے رودِ دجلہ، اے رودِ دجلہ

ہندی نوجوان مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا گریجویٹ، نیا ادیب، سُرخ و سفید رنگ، سیاہ سوٹ، بغیر فریم کی عینک، برطانوی کونسل صاحب کا ہونہار سپوت۔ کارپٹ بیگ ہاتھ میں لئے قرنطینہ کی عمارت سے نکل کر بصرے سے روانہ ہو۔ ہارون الرشید کے شہر میں داخل ہوتا ہے۔ گھوڑا گاڑی سڑک پر سکون سے رواں ہے۔ دونوں طرف نیم یوروپین وضع کے مکانات، اوائل بیسویں صدی کا بغداد۔ ترکی ناولوں کے کردار اکا دکا نظر آ جاتے ہیں۔ حکمران طبقے کے یوروپین ترک، نوکیلی شاندار مونچھیں، نیلی آنکھیں۔ بابِ عالی کے بانکے افسر۔ ان کی مہ جبیں نقاب پوش خانمیں۔ زہرا، حمرا، خالدہ۔

گاڑی برطانوی قونصل خانے کے پھاٹک میں داخل ہوتی ہے۔

---

[1] سلسلہ جبالیہ۔

[2] روسی کمنڈ کا شمالی علاقہ۔

[3] امپیریل حکومت ترکیہ کے لئے یورپین اصطلاح۔ —— SUBLIME PORTE

[4] زندہ باد۔

صرف سو سال قبل تک عثمانیوں کی شان و شوکت و سطوت و جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ وہ برطانیہ، فرانس، روس اور دوسرے مغربی ممالک میں اپنے سفیر متعین کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔

قونصل خانے میں شاہ ایڈورڈ ہفتم اور ملکہ الگزینڈرا کی تصویر کے نیچے خرانٹ قونصل جنرل میتھائیل نون پروائٹ ہال سے بات کر رہا ہے۔ پھر نو وارد نوجوان ہندوستانی ڈریگومین کے ذریعے مغرور عثمانی افسروں سے گفتگو کرتا ہے جو صرف فرنچ یا ترکی بولتے ہیں اور دل میں استہزا سے سوچتے ہیں۔ ابے سالے تاجر و ہم غازی لوگ خدا کے پیارے۔ بندے سات سو برس سے جہانبانی اور کشور کشائی میں مصروف تھیا۔ چھ سو برس ہم نے تم تک چڑھے گوروں کو یورپ میں زیر نگیں رکھا۔ بحیرہ روم ہمارے لئے محض ایک ترکی جھیل تھی۔ ہم تم نو دولتوں کو بھلا کیا خاطر میں لائیں گے۔

برطانوی قونصل جنرل ایڈورڈین مونچھوں کے نیچے مسکراتا ہے۔ مرد بیمار پر عالم نزع طاری ہے مگر میں نہیں جاتی۔

بغداد کی گلیوں میں درویشوں، بھکاریوں اور فاقہ کش تماوں کی ریل پیل ہے۔ کربلا میں امام حسینؑ اور جناب عباسؑ اور بغداد میں غوث الاعظمؒ کے روضوں میں ہندی اور ایرانی زائرین کا جمِ غفیر۔ مسلمان محض دعاؤں اور عظمتِ رفتہ کے خوابوں کے سہارے جی رہا ہے۔ نئی دنیا اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کربلائے معلیٰ، نجفِ اشرف، مشہد مقدس سے حسبِ معمول گریہ و زاری کا شور بلند ہو رہا ہے اور بغداد طہران، قاہرہ کے یوروپین کلبوں میں آرکسٹرا بجتا ہے تو کہنے لگے مستقبل کے علامہ اقبال کہ

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سُن

اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

ارے صاحب ہم تو جانتے کب سے معصومۂ قمؑ کے روضۂ مقدسہ کی ضریحِ مبارک سے لپٹ کر چیخ رہے ہیں السلام علیک یا بنتِ رسول اللہؐ۔ السلام علیک یا بی بی یا خواہر امامؑ۔ یا معصومہؑ۔ فریاد ہے۔ کوئی فریاد ہی نہیں سنتا۔ طہران کے کاخِ گلستان میں خسرو کجکلاہ مظفر الدین شاہ قاچار جلالتہ الملتہ والدین کا نازنینوں کی طرف حسبِ معمول کمال استغراق ہے اور صاحب لوگ، مشنری لوگ، فوجی، سویلین اور تاجر پی اینڈ او کے جہازوں پر سوار جبل الطارق اور سویز سے گذرتے مراکش سے لے کر افغانستان تک بادیہ نشینوں کے خیمے لوٹنے میں مصروف ہیں۔ مشرق میں ہر سمت سوا جہالت سوا پسماندگی، درماندگی، غلامی، ناداری، تباہی اور کیا نظر آتا ہے السلام علیک یا معصومہؑ یا بنتِ رسول اللہؐ

چھ سو برس قبل ابنِ بطوطہ نے رپورٹ کیا تھا کہ کنارِ فرات شہر حلہ میں مسجد کے دروازے پر حریر کا پردہ لگا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام مہدی قائمِ آلِ محمدؐ اسی مسجد میں داخل ہو کر مستور ہوئے۔ روز شام کو غروب آفتاب کے وقت شیعہ وہاں جمع ہو کر گریہ و بکا کرتے ہیں۔ اخرج یا صاحب الزمان۔ اخرج یا قائم المنتظر ——— رات گئے تک رونے چلّاتے رہتے ہیں۔ حریر کا پردہ اسی طرح ساکت رہتا ہے۔ پھر وہ مایوس ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

مگر آج اسے پاشاؤ۔ شریفو۔ آغاؤ۔ سیّدو۔ خان بہادرو۔ آج سارا دارالسلام سرنگوں ہے۔ سب مل کر پکارو۔ اخرج یا صاحب الزماں۔ اخرج یا حجت اللہ۔ یا قائم المنتظر۔

خفیہ کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ جگہ جگہ چھپکے چھپکے میٹنگیں کی جا رہی ہیں۔ طہران، استانبول، قاہرہ، بغداد کے قہوہ خانوں میں سازشیں ہو رہی ہیں۔ زمانہ نازک ہے اور دیکھو کل کی بات ہے جب بنی اُمیّہ کے خلاف، بنی عباس کے خلاف، بنو فاطمہ کے خلاف کیا کیا خفیہ میٹنگیں نہ ہوئیں۔ یہی کوچہ و بازار یہی دشت و صحرا۔ یہی انسان۔ ان کے اب وجد۔

آج شاہانِ قاچار اور آلِ عثمان اور خاندانِ رامنوف اور را ولادِ وکٹوریہ کی باری ہے۔

طہران، استانبول، سینٹ پیٹرزبرگ، ماسکو۔ باکو۔ لندن۔ پیرس۔ کلکتہ ہر شہر میں سرپھرے نوڈسے خفیہ مسکوٹ کر رہے ہیں۔ زمانہ خطرناک ہے۔

مستقبل کی محراب پہ حریر کا پردہ اسی طرح ساکت ہے۔ اور نوجوان ایشیا و افریقہ اس کے سامنے کھڑا چلا چلا کر پکار رہا ہے۔ اخرج یا صاحب الزماں۔ اخرج یا روحِ انقلاب۔

باب ۵

"نوجوانِ ترک"

۲۱ جولائی ۱۹۰۵ء۔ نماز جمعہ کے بعد سلطان المعظم مسجد سے نکل رہے تھے کسی نے بم کا گولہ ان پر پھینکا ۲۴ آدمی ہلاک ہوئے سلطان المعظم بال بال بچ گئے چہرے سے کسی قسم کا خوف و اضطراب ظاہر نہ تھا۔ سلطان المعظم کے بچنے کی خبر پہ لاہور میں مسلمانوں نے بعد نماز جمعہ شکرانے کے نفل پڑھے۔ اور بارگاہِ حق تعالےٰ میں ان کی صحت اور سلامتی کے لئے دعائیں مانگیں۔ تہذیبِ نسواں لاہور۔

"نوجوان عثمانیوں" کی خفیہ جماعت علی پاشا کے دور میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۸۸۲ء میں جب سلطان عبدالحمید دوئم نے پریس پر مکمل پابندی عاید کر دی ترک انقلابیوں نے یورپ میں بکھر کر وہاں سے رسالے اور کتابچے شائع کرنا شروع کئے جو ترکیہ اسمگل کئے جاتے حکومت نے جاسوسوں کا جال پھیلا دیا۔ نامق کمال اور ضیا بے پیرس فرار ہوئے۔

"انجمنِ اتحاد و ترقی" "نوجوان عثمانیوں" کی جانشین جماعت تھی۔ یورپ کی ترک انقلابی انجمنیں اس سے منسلک ہوئیں نوجوان ترکوں کا پہلا اجتماع پیرس میں ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد یہ جماعت بھی انڈر گراؤنڈ ہو گئی۔

نوجوان ترکوں کو اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایڈورڈ ہفتم اور زار نکولس دوئم نے ایک خفیہ معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے برطانیہ اور روس دولتِ عثمانیہ کو آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی مصطفےٰ کمال اور چند جوشیلے نوجوان فوجی افسروں نے ایک اور خفیہ جماعت قائم کی جس میں انور بے نیازی بے اور جمال بے شامل تھے۔

مصطفےٰ کمال مع ساتھیوں کے پکڑ لئے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں قید سے رہا ہوئے کرد بغاوت فرو کرنے کے لئے اپنی رجمنٹ کے ساتھ انھیں صوبہ شام روانہ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں عصمت بے (مستقبل کے عصمت انونو) ملٹری کالج استانبول سے نکلتے ہی "نوجوان ترکوں" میں شامل ہو گئے۔

مصطفےٰ کمال کا فوجی دستہ دمشق میں تعینات تھا۔ یہاں انہوں نے ۱۹۰۶ء میں ایک اور خفیہ جماعت "وطن و حریت" کی بنا ڈالی

اس کی شاخیں یروشلم، جیفہ اور بغداد میں قائم کی گئیں۔

بغداد میں ڈیرگو میں سجاد حیدر کا وطیرہ یہ تھا کہ دوپہر کے بعد قہوہ خانے کے کمرہ جانے کے بجا [illegible] اور ادیبوں کے ساتھ وقت گزارتے۔ نہایت شستہ و رواں ترکی اور عربی بولتے تھے انگریزی کے ماہر اور فر[illegible] سے واقف ترکی زبان و ادب کے عاشق علمی نام یلدرم نوجوان ترکوں کے حامی اور ان میں مقبول نہایت ولولہ انگیز زمانہ تھا۔ یلدرم نے علی گڑھ میں جو خواب انقلاب کے دیکھے تھے ان کی تعبیر یہاں کچھ کچھ نظر آرہی تھی۔

مصطفےٰ کمال کی انجمن وطن و حریت کی شاخ بغداد کا پہلا جلسہ یلدرم کے مکان پر ہوا۔ یہ ایک تاریخ ساز خفیہ میٹنگ تھی۔ بابِ عالی کے جاسوسوں کے خوف سے یلدرم نے اپنا عرب ملازم مکان کے دروازے پر بٹھا دیا تھا۔ اس کے بعد ہر ہفتہ وار یا فوری میٹنگ کے مواقع پر بے حد احتیاط برتی جاتی کہ جان جوکھوں کا معاملہ تھا۔

یلدرم کے بھانجے سید عثمان حیدر ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۳ء تک بسلسلہ ملازمت ایران و عراق و فلسطین و ترکی میں مقیم رہے۔ بغداد میں ایک مرتبہ سخت بیمار پڑے اور بغرض علاج ترکی گئے جہاں دیار بکر میں ترکی کی نئی جمہوری حکومت نے بہت بڑا شفاخانہ تعمیر کروایا تھا۔ سید عثمان حیدر لکھتے ہیں۔

"خوش قسمتی سے انہی دنوں غازی عظمت پاشا یعنی عصمت انونو وزیراعظم ترکی نے ماسکو جاتے ہوئے دو دن کے لیے دیار بکر میں قیام کیا۔ دوسرے سرکاری اداروں کا معائنہ کرتے ہوئے اس ہسپتال میں بھی تشریف لائے۔ سب مریضوں سے مصافحہ اور مزاج پرسی کرتے میرے پلنگ کے نزدیک آئے۔ میرے سینے پر میرے نام اور ملک کا کارڈ لگا تھا۔ ڈاکٹر زبانی ہر مریض کا تعارف کرا تا جارہا تھا۔ میرا نام معلوم کر کے عصمت انونو نے فرانسیسی تلفظ کے ساتھ انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔

DO YOU KNOW YILDIRIM SAJJAD HYDER?

YES, YOUR EXECE LLENCY.

HOW? ARE YOU RELATED TO HIM?

YES, YOURS EXECELLENCY. HE IS MY UNCLE.

REAL UNLCE?

YES, YOUR EXCELLENCY. MY MOTHER, S BROTHER.

DO YOU WRITE TO HIM?

YES YOUR EXCELLENCY, I DO.

FINE. WHEN YOU WRITE TO HIM NEXT DO CONVEY MY SALAM ALEIK.'

اس کے بعد چند منٹ مزید باتیں کیں اور آگے بڑھ گئے۔ دوسرے ہی دن میں نے یہ واقعہ ماموں جان کو علی گڑھ لکھ بھیجا جس پر انہوں نے جواب میں مجھے لکھا تھا کہ عصمت پاشا کو انہوں نے اس بندہ نوازی پر شکریہ کا خط لکھا ہے۔

؎ مشاہدات بلادِ اسلامیہ۔ از محمود عثمان حیدر [illegible] ۱۹۶۲ء میں دوبارہ شائع کی ہے

کمال اتاترک کی مشہور تقریر

SEVEN DAYS SPEECH BY GHAZI MUSTAFA KAMAL PASHA.

اس زمانے میں انگریز بہادر نے ہندوستان میں یوں کر رکھی تھی دوسرے ممالک میں بھی جہاں برطانوی تسلط تھا اس بات کی کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی کہ ہندوستانی اسے ہاتھ نہ لگا پائیں۔ بغداد میں ایک مرتبہ ہمت کرکے میں ترکی سفارت خانے کے فرسٹ سیکریٹری سے ملا اور ان سے اظہار مدعا کیا۔ (اس وقت عراق میں انگریز کا اتنا دبدبہ تھا کہ وہ کتاب وہاں بھی بازار میں کہیں نہ بکتی تھی لوگ آکر ترکی سفارت خانے سے خرید لیا کرتے تھے۔ فرسٹ سیکریٹری نے جاکر سفیر سے یہ کتاب لینی چاہی (جو ان کی تحویل میں رہتی تھی)۔ چنانچہ مجھے سفیر صاحب کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ موصوف نے بڑے اخلاق سے فرمایا کہ جب آپ ہندوستانی ہیں تو یہ جرأت کیسے کر رہے ہیں۔ اتنے میں فرسٹ سیکریٹری نے میرا ملاقاتی کارڈ جو ان کے ہاتھ میں تھا۔ سفیر صاحب کے سامنے رکھ دیا ان کا مطلب شاید یہ رہا ہوگا کہ میں برطانوی سفارت خانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور وہاں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہوں لیکن سفیر موصوف نے کارڈ پر میرے نام کے ساتھ حیدر پڑھ کر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ اور وہی عصمت انونو والا سوال دہرایا۔

میرا وہی جواب کہ "یس یور ایکسیلنسی۔"

پوچھا "آپ کے رشتہ دار ہیں؟"

میرا وہی جواب کہ "میرے سگے ماموں ہیں۔"

سفیر صاحب نے بڑے جوش سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور چائے کا حکم دیا۔ میرے متعلق بہت کچھ دریافت کیا۔ پھر کہنے لگے "آپ ہماری جدید حکومت کے ایک محسن کے عزیز ہیں۔ میں آپ کو یہ کتاب بطور تحفہ دوں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ پڑھ کر مجھے واپس کر دیں۔ آفندی یلدرم اس زمانے میں جب کہ ہم لوگوں کا شمار غداروں میں ہوتا تھا اور وہ برطانوی سفارت خانے میں بحیثیت مترجم ملازم تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتے رہے اور رؤف پاشا سے جو ابھی کچھ دنوں قبل تک ہماری جمہوریہ کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ ان کے بے حد گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ آج سے آپ ہم سب کے بھانجے ہیں۔"

"میں تو کتاب لے کر اور ان کا شکریہ ادا کرکے چلا آیا مگر وہ مجھے نہ بھولے (افسوس کہ ہزار کوشش کے باوجود ان کا نام یاد نہیں آ رہا۔) کسی ڈپلومیٹک دعوت میں سامنا ہو جاتا تو خود آگے بڑھ کر مجھ سے بڑی شفقت سے ملتے۔ دو مرتبہ گھر پر مدعو کیا میرے ہاں مع فیملی کے آئے۔ جب میں تبادلے پر فلسطین جانے لگا تو ہم دونوں کی دعوت کی اور کتاب واپس کرنے پر بڑی شاباش دی اور شکریہ ادا کیا وہ مجھے اب مستقل بھانجے آفندی کے لقب سے پکارتے تھے میں ان ملاقاتوں کے متعلق برابر ماموں جان کو لکھتا رہتا تھا۔ اور ماموں جان نے ایک مرتبہ ترکی زبان میں سفیر صاحب کو بھی شکریہ کا خط لکھا تھا اور ان کی فرمائش پر ان کو اپنی تازہ تصویر بھی بھیجی تھی۔ جو سفیر صاحب نے بہت خوش ہو کر ماموں جان کے خط کے ساتھ مجھے دکھائی۔"

صاحبان۔ پی اینڈ او کا جہاز کب سے کھڑا بھونپو بجا رہا ہے اب تک اس پر سے کتنی نسلیں چڑھیں اور اتر گئیں۔ کتنی مسافتیں طے ہو لیں آئیے اس پر سوار ہو کر ۱۹۰۷ء کے بغداد واپس چلیں۔

باب ۶

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

سید سجاد حیدر سے قبل محمد حسین رامپوری نے دو ترکی ناول انگریزی سے اردو میں منتقل کئے تھے سجاد حیدر نے زمانہ طالب علمی میں ایک ناولٹ "زہرا"، "مطلوب حسیناں" اور "ثالث بالخیر" ترکی سے براہ راست ترجمہ کیے وقت بہت تیزی سے گذرتا ہے۔ یہ آج سے بہتر برس قبل کی بات ہے کہ ۲۲ سالہ سجاد حیدر نے "ثالث بالخیر" کے دیباچے میں لکھا۔

"میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں۔ ... ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویریں اردو میں اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آرہا ہے وہ انھیں بھی پیش آچکا ہے۔ سو میں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔ ترجمہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا معلوم ہوگا مگر ترکوں کا طرز ادا مجھے کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے اور مغربی اور ایشیائی طرز تحریر کا ایسا معقول میل ہے کہ میں نے لفظی ترجمے کی کوشش کی ہے گفتگو تو ضرور انوکھی ہے۔ لیکن سنیے تو سہی۔ ع

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد"

شیخ عبدالقادر نے "مخزن" ۱۹۰۱ء میں جاری کیا تھا اسی سال جولائی میں سجاد حیدر کی پہلی افسانہ نما نگارش "فطرت جوانمردی" اس تاریخ ساز رسالے میں شائع ہوئی۔ یہ ترک ادیب مفاخر بے کے ایک افسانے کا ترجمہ تھا۔

ایک پاکستانی محقق اور نقاد سید معین الرحمٰن نے خیالستان کا نیا اڈیشن نئی ترتیب کے ساتھ اُردو مرکز لاہور سے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔ مرتب نے کتاب کے مقدمے میں یہ ثابت کیا ہے کہ پریم چند کے بجائے یلدرم اردو کے پہلے باقاعدہ افسانہ نگار تھے۔ پریم چند کا پہلا افسانہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ "دنیا کا سب سے انمول رتن" پریم چند کے افسانوں کے پہلے مجموعے "سوز وطن" ۱۹۰۹ء کا پہلا افسانہ ہے۔ اسی کو پریم چند نے اپنی پہلی کہانی قرار دیا ہے۔

ترک ادیب خلیل رشدی کے افسانے "نشے کی پہلی ترنگ" کا ترجمہ سجاد حیدر نے معارف اکتوبر ۱۹۰۰ء میں شائع کیا تھا لیکن سجاد حیدر کے طبع زاد افسانے "غریب وطن" اُردوئے معلی علی گڑھ اکتوبر ۱۹۰۶ء "دوست کا خط" مخزن ۱۹۰۶ء اور "حضرت دل کی سوانح عمری" دسمبر ۱۹۰۶ء میں لکھے گئے۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک سجاد حیدر بغداد اور استانبول میں مقیم تھے بقول مولانا سلیمان ندوی سرکاری ملازم ہونے کے باعث انہوں نے اپنا نام یلدرم

لہ ترکی یورال التائی زبان ہے۔ اور انڈو یورپین اور سامی لسانی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی گو عہد عثمانیہ میں عربی اور فارسی الفاظ داخل ہوئے۔ یہ عثمانی یا مغربی ترکی آذربائیجان اناطولیہ اور بلقان میں رائج ہے۔ اور وسط ایشیا کی مشرقی چغتائی ترکی سے مختلف ہے۔

رکھا جو مشہور ترک سلطان بایزید اول (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) کا لقب تھا۔ کیونکہ وہ اپنے دشمنوں کی بے خبری میں ان کے سروں پر بجلی کو سی تیزی سے آ گرتا تھا۔

بقول نیاز فتح پوری "اس لفظ کے معنی پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے یلدرم کے معنی گرج کے ہوں گے۔ نہ کہ محض برق کی چمک کے۔ اگر اس کے معنی گرج لئے جائیں تو سجاد کے نام کے ساتھ یہ ہرگز موزوں نہ تھا کیوں کہ وہ خیالات کی بارش تو کرتے رہے مگر کبھی گرجے نہیں"۔

ترکی ادیب، شاعر اور صحافی "تازہ ترین فرانسیسی ادبی اور سیاسی تحریکوں سے اس وقت وابستہ تھے جب ہمارے ہندوستان کا بیچارہ کولونیل ادیب والٹر اسکاٹ اور شیکسپیئر کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ہمارے غلام نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے "مدر کنٹری" کے دارالسلطنت لندن یا آکسفورڈ اور کیمبرج جاتے تھے اور زیادہ تر برطانوی سامراجی روایات سے سرشار ہو کر واپس لوٹتے تھے۔

لیکن یہ کیفیت اردو والوں کو باہر کی ہوا لگ چکی تھی۔ 'مخزن' کا آئینہ دور اس نئی خوش آئند سماجی تبدیلی کا عکاس ہے۔ مثال کے طور پر صرف ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء کے فائل دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ متعدد نوجوان ادیب اور شاعر بیرونی ممالک سے اپنی تخلیقات بھیج رہے ہیں شیخ محمد اقبال اور سید علی بلگرامی (بعد میں شمس العلماء) کیمبرج سے محمد علی آکسفورڈ سے سجاد حیدر یلدرم بغداد سے مدیر رسالہ شیخ عبدالقادر استانبول سے لالہ لاجپت رائے (جی ہاں لالہ لاجپت رائے) روم سے مشرف الحق اڈنبرا سے وغیرہ وغیرہ۔ مدیر مخزن نے یورپ سے لکھا:

بخت آزمانے نکلو، جنگل بسانے نکلو

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!

ہمت والا پنجابی کسان زرکار دباری امریکہ اور کینیڈا تک میں جا بسا تھا۔ 'مخزن' میں ایک مضمون کسی سید حاکم شاہ کا جزائر کینری سے آیا۔

یہ آج سے تقریباً ستر برس قبل کی باتیں ہیں۔ 'مخزن' کے دوسرے مضمون نگار فصیح الملک داغ دہلوی، خواجہ حسن نظامی، شاد عظیم آبادی حسرت موہانی، سرور جہان آبادی، ونائک پرشاد۔ طالب بنارسی، وحشت کلکتوی، ناظر کاکوروی، ذوالفقار علی گوہر، اکبر الٰہ آبادی عزیز لکھنوی، غلام بھیک نیرنگ، احسن لکھنوی، لالہ سری رام، مرزا محمد سعید، محمد اکرام، راشد الخیری، ڈپٹی لال گم، آغا شاعر قزلباش، آغا حشر کاشمیری وغیرہم اور ایک پردہ نشین نوعمر خاتون مس نذر الباقر تھیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

سجاد حیدر جو "مخزن کے نورتنوں" میں شمار کئے جاتے تھے ایک خوش شکل گلیمرس اور ہر دلعزیز نوجوان ادیب تھے اور ایک CHARISMATIC شخصیت کے مالک تھے۔ "مخزن" میں تصویر کیا چھپی تہلکہ مچ گیا۔ سید نظام الدین شاہ دلگیر نے ایک نہایت رقت خیز نثر پارہ لکھا۔ "تصویر سجاد کو دیکھ کر" اس کا عنوان تھا "سجاد۔ سجاد کون سجاد۔ وہی فطرت شناس سجاد آزاد سجاد ظرافت پسند سجاد جس کی تصویر ہنستی بولتی اکتوبر کے "مخزن" میں شائع ہوئی ہے۔ دلوں کو اپنی طرف بے طرح کھینچتی ہے۔ وہی روشن خیال سجاد جس کے مضامین کی نسبت بجا طور سے کہا جا سکتا ہے۔

عطا کیا طبع نکتہ رس نے تیرے قلم کو سخن وری میں خیال انوکھا، بیان اچھوتا، زمین نئی اور روش نرالی" وغیرہ وغیرہ (مخزن فروری ۱۹۰۸ء)

قیام بغداد کے زمانے میں یلدرم نے سلطنت عثمانیہ اور اس کے یورپین صوبوں کی سیاحت کی جو ہندوستانی نوجوان بار ہا جاتا ہے اس کا کم از کم ایک سنجیدہ رومانس ایک غیر ملکی لڑکی سے برحق ہے یلدرم نے ترک خواتین کو پہلے سے آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ راوی کہتا ہے کہ استانبول کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون نے ان سے اصرار کیا کہ شادی کر کے ترکیہ میں سکونت اختیار کر لیں لیکن ترکی سے شدید عشق کے باوجود یلدرم ترک وطن پر راضی نہ ہوئے۔ وہ خانم علامت ان ہند میں آکر رہنے پر تیار نہ تھیں۔

نومبر ۱۹۰۸ء میں یلدرم ہندوستان واپس آئے تو ان کے مرحوم بھی ایک بے تکلف دوست قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی (مصنف شاہد رعنا) نے رسالہ "اردو بولنے" میں لکھا۔

آگئے سجاد حیدر آگئے ۔۔۔ آئے قند مکرر آگئے
چھوڑ آئے اپنی ترکی کو وہاں ۔۔۔ رکھ کے وہ سینے پہ پتھر آگئے

ان کے دوست اور پولیٹیکل مشتاق احمد زاہدی لکھتے ہیں سجاد حیدر بغداد میں کئی سال اپنے فرائض منصبی نہایت شرافت اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ شرافت میں نے اس لئے کہا کہ سیاسی کاموں میں بہت کچھ لگائی بجھائی کرنی پڑتی ہے اور اپنے ہم مذہب اور ہم قوم لوگوں کے گلے کاٹنے پڑتے ہیں مگر یہ کام سجاد حیدر نے نہیں کیا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس اہم عہدے کے باوجود ان کو کوئی خطاب نہیں ملا۔ اور نہ یہ عہدہ ان کی ترقی کا زینہ بن سکا۔"

غالباً اسی سال کراچی میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس سوکنا خاں کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں۔ "جب جلسہ دوپہر کے کھانے کے بعد برخاست ہوا اور میں اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد صاحب آتے نظر آگئے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک دو چکر اپنے گرد لگائے۔ جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں۔ اور کہنے لگے۔ کچھ نہ پوچھئے۔ اس وقت میرا دماغ آسمان پر ہے اور میں زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔"

"میں نے پوچھا کچھ تو بتائیے کیا دیکھا کہ طبیعت اس طرح زوروں پر ہے۔ کہنے لگے ایک ایسی خاتون سے مل کر آرہا ہوں جو آزادی کی جان اور خود بھی اس پر عامل ہے۔"

یہ خاتون عطیہ فیضی تھیں جنہوں نے سروجنی نائیڈو کی طرح اس زمانے میں بہت سارے ذہن پرست نوجوانوں کو گرویدہ کر رکھا تھا۔ نوجوانوں کے علاوہ ان کے پرستاروں میں چند سنجیدہ جاذری بزرگ بھی شامل تھے۔

'مخزن' میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ خیالستان کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ علامہ اقبال نے اسے پنجاب یونیورسٹی کے بی۔ اے کے نصاب میں شامل کروایا۔ اقبال سے یلدرم کی دوستی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہوئی تھی۔ اپنے اولیں دور

---

[1] انڈین پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اسی محکمے میں یلدرم کے دو دوست شاہ عبدالنعام الحق دہلوی پیلونج والے اور مرزا سکندر علی بیگ ملازم تھے۔ موخر الذکر جنرل اسکندر مرزا کے نام سے چند سال پاکستان کے گورنر جنرل رہے۔

میں اقبال اپنا تازہ کلام اشاعت سے قبل یلدرم کے پاس بھیجا کرتے تھے[1]

پینتیس سال بعد سید احمد شاہ بخاری پطرس نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں یلدرم کی وفات کے بعد لکھا:۔

"...... یہ واقعہ کہ ان کی موت پر اتنی خاموشی رہی المناک ضرور ہے اردو ادب پر ان کا اثر بہت عظیم تھا ۔ بڑی شوخی اور بڑے لطف کے ساتھ انھوں نے اُردو زبان و ادب کے بوڑھے چہرے کو جوانی اور تازگی بخشی اور گو ان کے تجربے کی جسارت کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے رنگ روپ کی بہت سی لطافتیں جو انہوں نے پیدا کیں ابھی باقی ہیں ۔ ...... خیالستان اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اردو کی ایسی مقبول تصنیف بن گیا جو بڑی رغبت سے بار بار پڑھی گئی[2] آج ہم اس سے ایک سنگِ میل کی حیثیت سے واقف ہیں اور جب ادبی فیشن بدلے گا اور شاید لوگ خیالستان کے شستہ اور شائستہ حسن کی طرف متوجہ نہ ہوں گے، اس وقت بھی ہمیں ادبی مطالعے کی خاطر اس کتاب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور ہمیں ان خصوصیات کا سراغ ملے گا جنہوں نے بڑی حد تک اردو کو اس کا دم خم اور روپ بخشا ہے ۔

"...... یلدرم مسلمانوں کی نئی خود آگہی کے دھارے میں شامل تھے وہ اس دور کی پیداوار بھی تھے اور تکمیل بھی انہوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور ساری دنیا میں ان کو نہایت فخر کے ساتھ اس دل پذیر گروہ میں شامل سمجھا گیا جس نے اس مرکز کے باہر آ کر ایک نئے طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کی تزئین کی ۔ ابھی ہم اس عہد سے اتنے قریب ہیں کہ غالباً آسانی سے یہ نہیں جان سکتے کہ اس تحریک و تزئین کی قدر و قیمت کیا ہے ۔ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے مؤرخ کو اس اولین دور میں اس قومی وجاہت اور امید کو دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا ضرور کارفرما نظر آئے گی جو سلطنتِ مغلیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنی زندگیوں میں کھو چکے تھے ۔

" اقتدار کی خواہش بعد کے عہد میں پیدا ہوئی ۔ اور اس میں سجاد حیدر اور ان کے ہم عصر شریک نہ تھے ۔ لہٰذا عمرانیات کے لحاظ سے اقبال کے برعکس سجاد حیدر موجودہ دور سے تعلق نہیں رکھتے اقبال دونوں ادوار میں شامل تھے ۔ چنانچہ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ لوگوں کی زبانوں پر رہے ....

" سجاد حیدر اس نسل کے فرد تھے جس نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک ترکیب نو پیدا کرنا چاہی ۔ اس کے اجزائے ترکیبی قدیم و جدید مغرب و مشرق سائنس اور مذہب عربی اور انگریزی پر مشتمل تھے یہی نظریہ تھا جس نے علی گڑھ کالج کے لیے "اینگلو اورینٹل" کا نام اختراع کیا۔ اس نظریے کے چند مظاہر نے اکبر الٰہ آبادی جیسے لوگوں کو بہت ملول کیا مگر وقت آگے بڑھتا گیا اور جدید مدنیت کے پیغمبر اپنے مشن میں کامیاب رہے ۔

" اس جدید مدنیت اور شائستگی کے لئے سجاد حیدر نے ایک متناسب اور مناسب طور پر ترکی پسندانہ نگارش جس سے اُردو زبان کو روشناس کیا ترکی ٹوپی، مغل شیروانی اور انگریزی پتلون میں ملبوس نوجوان ادیبوں کی ایک پوری نسل اس طرزِ تحریر کی طرف جوش و خروش سے لپکی گویا صرف یہی چیز تھی جس کا وہ اب تک انتظار کر رہے تھے ۔ اور یہ واقعہ بھی تھا ۔ اس طرزِ تحریر میں وہ سب کچھ تھا جس کی انھیں آرزو تھی ۔ ..... الفاظ عربی اور فارسی کے تھے لیکن اسے دیکھئے ۔ پل کی پل میں ان کی سختی اور بھاری پن غائب ہو گیا ۔ گویا کسی

---

[1] سجاد حیدر یلدرم ۔ از امتیاز علی تاج ۔ تہذیب نسواں ۲۹ مئی ۱۹۴۳ء۔
[2] اگلے پندرہ برسوں میں خیالستان کے سولہ ایڈیشن شائع ہوئے ۔

نے ملتن کے زورِ بیان میں آسکر وائلڈ کے رنگ کی آمیزش کر دی ہو۔

"قومی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ تجدید ماضی کے خواہش مند نوجوان نے اس نئے انداز تحریر کو بڑے غرور اور پیار سے اپنایا۔ ان کو مسرت اس بات کی تھی کہ یہ نفیس ترقی پسند نرم و نازک اور آزاد خیال تھا۔ مغرور اس وجہ سے تھے کہ یہ انداز بیان قوم کے شاندار ماضی سے بھی وابستہ تھا، مشرقی تھا۔"

اس مضمون میں پطرس نے ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے[1]: "یلدرم کی بیشتر کہانیاں اور ڈرامے تراجم ہیں۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اصل تصانیف سے ان تراجم کا مقابلہ کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس لئے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سجاد حیدر نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مترجم کی ہی حیثیت سے پیش کیا ہے یا یہ محض ان کا حسن بیان ہے یا محض انکسار جو انھیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر برتنا پڑا۔ چند داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے شبہ ہے کہ تراجم در اصل تقریباً طبعزاد تخلیقات ہیں اور جیسا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں۔ ان کی ترغیب سجاد حیدر کو ترکی کے پس منظر نے دلائی۔ کیوں کہ جدید مدنیت یورپین کی بجائے ترکی لیبل کے ساتھ کہیں زیادہ دل آویز نظر آسکتی تھی . . . . . .

"انہوں نے ایک ترکی قلمی نام یلدرم اختیار کیا جس نے قلمی نام اختیار کرنے کے نئے فیشن کی بنا ڈالی۔ یہ تفصیل گو غیر اہم ہے۔ بکسی اپنی جگہ پر ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔"

پطرس مرحوم نے یہ مضمون ۴۳ء میں لکھا تھا۔ دنیا اس وقت سے بھی اور بیس برس آگے نکل گئی۔ اردو ادب میں ان بیس برسوں میں مزید انقلاب آچکے ہیں۔

باب ۷

افغان باقی! کہسار باقی!

جنوری ۱۹۰۸ء میں سجاد حیدر یلدرم نے امیر یعقوب خان سابق شاہ افغانستان کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے ڈیرہ دون میں نجف علی خان[2] سے اپنے نئے عہدے کا چارج لیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ انگریز تھا۔ اس کا تعلق براہِ راست برٹش فارن آفس سے تھا۔

---

[1] سید سجاد حیدر یلدرم از پطرس بخاری۔ روزنامہ سٹیٹسمین۔ نئی دہلی۔ مئی ۱۹۴۳ء تلخیص و ترجمہ۔ ق۔ ح)

[2] نجف علی خان غالباً پنجاب کے باشندے تھے۔ ان کی نواسی رود اف سجاد حیدر عصمت کی مضمون نگار ہیں۔ سجاد حیدر صاحب پاکستان فارن سروس کے سینئر ڈپلومیٹ ہیں۔ کچھ عرصہ نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہ چکے ہیں۔

تیسری اینگلو افغان جنگ اور امیر یعقوب خان کی معزولی یلدرم کی پیدائش سے پہلے کے واقعات تھے[1] مگر آج ۲۷ سالہ سجاد حیدر ان بوڑھے شیروں کے انچارج بنا کر دہرہ دون بھیجے گئے تھے۔ برطانیہ کا اقبال عجیب و غریب کرشمے دکھا رہا تھا۔ موسم گرما میں وہ قیدی خرزندستان چھ ماہ کے لیے مع اہل و عیال دہرہ دون سے مسوری منتقل کر دیا جاتا۔

مسوری میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی سرکاری کوٹھی کا نام (BELLEVUE) تھا۔ جو ایک آدھ ادیب مسوری آتا اس کا اڈہ بن گئی۔ نیاز فتح پوری بھی بسلسلہ ملازمت مسوری میں مقیم تھے۔ اتوار کا دن اکثر یلدرم کے ہاں گزارتے۔ ابوالکلام آزاد آئے۔ چند روز کے لئے قاری سرفراز حسین دہلوی آئے اور اس صحبت میں شریک ہوئے۔ نیاز صاحب فرماتے ہیں "میرے مخصوص ادبی ذوق کو اُبھارنے میں یلدرم کا بڑا ہاتھ تھا۔ رومانی افسانہ نگاری میں ان کی حیثیت یقیناً ایک موجد کی سی ہے اور میری مقلد کی سی۔ سلطان حیدر جوش کا مقصد چاہے کچھ رہا ہو لیکن تھے وہ یلدرم کے مقلد۔ مسوری ہی میں تھا کہ جوش کا افسانہ "مخزن" میں شائع ہوا۔ جب یلدرم سے اس کا ذکر آیا تو وہ صرف یہ فقرہ کہہ کر خاموش ہو گئے "!

یلدرم روزانہ صبح کو پولیٹیکل افسر کے دفتر جاتے شام شاہی قیدیوں کے ساتھ گزارتے کام وام کرنے کو کچھ خاص تھا نہیں سابق امیر شہزادوں اور سرداروں کے ساتھ فر فر فارسی بولا کرتے شعر و شاعری پر گفتگو رہتی جس نے بیشتر اسلامی سلطنتوں کو اکھاڑا۔

بغداد کے جاندار انقلابی ماحول کے بعد یہ عجیب غیر حقیقی سا وقت تھا۔ امیر کابل کی کوٹھی کے نیچے گہرا نیلے پہاڑوں پھیل جاتا۔ شہر کے بل کھاتے راستوں پر گیس کی روشنیاں ٹمٹماتیں بارش ہوتی تو لاؤنج کے شیشے دھندلا جاتے۔ آتش دان میں آگ کی روشنی زیادہ پُر معلوم ہونے لگتی نفیس قالینوں اور دبیز مخملیں پردوں سے آراستہ کوٹھی میں نظر بند شاہی قیدیوں کے لئے ہر موسم یکساں تھا۔ دوست محمد کا پوتا بوڑھا یعقوب خان مسند پر نیم دراز اکثر دن بھر چپ چاپ دیوان حافظ پڑھا کرتا۔

سہ پہر کو اندھیرا پڑے اکثر نوجوان اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر تیز تیز ہلکے پھلکے قدموں سے زینہ چڑھتا اوپر آتا علیک سلیک ہوتی مارے ادب کے ہندی نوجوان بزرگ امیر کابل کے سامنے سگریٹ نہ پیتا امیر کا قلیان تازہ کیا جاتا خشک میوے اور تازہ پھلوں کے طشت کشمیری تپائیوں پر رکھے ہوتے۔ نقرئی سماوار آتشدان کے شعلوں کی روشنی میں جھلملاتا۔ بغیر دودھ کی چائے اور قہوے کے فنجانوں کا دور چلتا رہتا۔

ایک سردار سابق امیر کے سامنے شطرنج کی بساط پھیلاتا۔ ہاتھی دانت کے صندوقچے میں سے مہرے نکالے جاتے یعقوب خاں اور یلدرم اپنی اپنی چال سوچنا شروع کر دیتے اکثر سوچتے سوچتے بوڑھا بادشاہ عقابی نظروں سے دریچے کے باہر دیکھتا۔ حد نظر تک پہاڑ

---

[1] نومبر ۱۸۷۸ء میں برطانیہ نے افغانستان پر حملہ کیا۔ امیر شیر علی نے کابل سے فرار ہوئے چند ماہ بعد المناک حالات میں وفات پائی۔ ان کے فرزند و جانشین امیر یعقوب خان کو درہ خیبر، وادی کرم پشین سبی اور بہت سا قبائلی علاقہ برطانیہ کے حوالے کرنا پڑا۔ افغان امور خارجہ بھی برطانیہ کے سپرد کئے گئے۔ ستمبر ۱۸۷۹ء میں کابل کے عوام اور فوجیوں نے ریذیڈنسی پر حملہ کر کے برطانوی ریذیڈنٹ کو قتل کیا۔ ۱۲ اکتوبر کو جنرل رابرٹ نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ امیر یعقوب خان تخت و تاج سے دستبردار ہوئے مع خاندان برٹش انڈیا جلاوطن کئے گئے۔ دہرہ دون اور مسوری میں نظر بند رہے۔

[2] سلطان حیدر جوش کا یلدرم سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔

تھے۔ ان پہاڑوں کے آخری سلسلے کے اُس پار مغرب میں افغانستان تھا۔ پختونوں کا دیس۔ خوشحال خاں کے اشعار اس وقت کتنے صحیح معلوم ہوتے تھے۔ جلاوطنی کا اتنا بڑا ناقابلِ عبور فاصلہ کہ نہ بادِ صبا کوئی سحاب رواں وہاں سے کرب ناک یادوں کے علاوہ کوئی پیغام ہی نہیں لا سکتے۔ جلال آباد۔ کابل۔ قندھار۔ اپنا وطن۔ دادا کا قلعہ۔ وہ عظیم صفت دادا جس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ساتھ اور تنہا انگریزوں کو ناک چنے چبوا دیئے تھے۔

وہ نیم تاریک ایوان۔ روشن صحن۔ مٹی کی فصیلیں سکھ اور برطانوی جنگوں کی یادگار۔ ڈھالیں اور ہتھیار زنگ خوردہ توپیں۔ ناکامی اور شکست۔ ان چنار کے درختوں سے گھرے آبائی قلعوں کے نزدیک اب برطانوی فوجیں خیمہ لگائے رہتے تھے۔ ۱۸۸۰ء آج کی بات معلوم ہوتی ہے وہ سارا لرزہ خیز المیہ اکثر رات کو خواب میں دہرایا جاتا ہے۔ جنرل رابرٹ کی دہشت ناک آمد۔ برطانوی فوج کی یلغار۔ گھوڑوں کی ٹاپیں۔ میدان جنگ میں اللہ اکبر کے نعرے۔ کس طرح برطانوی کیمپ میں پناہ لی۔ ان بدبخت کاغذات پر لرزتے ہاتھوں سے دستخط کئے۔ کس وقت زنانیوں کا کاروان درۂ خیبر کی سمت روانہ ہوا۔ جلاوطنی کے اٹھائیس سال۔

اٹھائیس سال گزر گئے جب انگریزوں نے دوست محمد خان کے دوسرے پوتے عبدالرحمان خان کو اپنا مطیع امیر کابل تسلیم کیا۔ عین وہی زمانہ تھا جب امیر بخارا۔ امیر خیوا۔ امیر خوقند سب کی روسی جنرل کاف مین چھٹی کر رہا تھا۔

برادر ایوب خان نہ مانا۔ لڑتا رہا۔ انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اپنی خستہ حال فوج کے ساتھ کس بے جگری سے لڑا۔ آخر دوست محمد کا پوتا تھا۔ مگر ہندوستانی شاعر حالی نے جس کے اشعار ترجمہ کر کے ہندی سیدزادہ اکثر سناتا ہے ٹھیک کہا ہے۔ گھٹا ادبار کی زبردست چھا رہی ہے۔ برادر ایوب کو بھی جنرل رابرٹ کے آگے ہار ماننا پڑی۔ غلامستان ہند جلاوطن کیا گیا۔

امیر عبدالرحمان خان کی وفات کو بھی سات سال ہو چلے۔ اخباروں میں چھپا ہے کہ حبیب اللہ خان کچھ اصلاحات نافذ کرنے میں مشغول ہے۔ "اصلاحات" کی ہوا سارے مشرقِ وسطیٰ میں چل پڑی ہے۔ پچھلے سال برخوردار حبیب اللہ خان علی گڑھ کالج آیا تھا۔ بے حد پرجوش اس کا استقبال کیا گیا۔ ہندی مسلمان مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں پر فدا ہوا جاتا ہے۔ مستقل افغانوں ترکوں عربوں ایرانیوں کا غم کھاتا ہے ان کی ترقی سے خوش اور ان کی ہزیمت سے پژمردہ ہوتا ہے۔ ان کے لئے روتا۔ مسجدوں میں دعائیں مانگتا اور چندے جمع کرتا ہے۔ عجیب بات ہے۔ ہم مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں نے کبھی ان کے متعلق سوچا بھی نہیں۔

اس دلچسپ سعادت مند ہندی سیدزادے نے اپنا تخلص ہی ترکی رکھ لیا ہے۔ بے حد جوش و مسرت سے ترک انقلاب کے قصے سناتا ہے۔ کہتا ہے یہ ۱۹۰۸ء ترک انقلاب کا سال ہے ابھی ۲۳ جولائی کو خلیفۃ المسلمین سلطان اعظم نے نوجوان ترکوں کے مطالبات منظور کر لیے۔ عوام کو دستوری حقوق عطا فرمائے۔

دستوری حقوق کیا شے ہے عجیب نئی نئی اصطلاحات اس نئی پود نے ایجاد کی ہیں۔ بہت خون خرابہ اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں ہمارے ہمسائے مظفر الدین شاہ قاچار نے بھی اپنی رعایا کو کچھ حقوق عطا کیے ہیں۔ برادر زادہ حبیب اللہ خاں کابل میں انگریزی کالج کھول رہا ہے۔

شہ —
شہ —
ات —

شطرنج کی دوسری بازی شروع ہوتی ہے۔ نوجوان سید زادہ اچھا کھلاڑی ہے۔ اگر اتنا منکسر المزاج شرمیلا اور قناعت پسند نہ ہوتو زندگی میں آئندہ بہت ترقی کرے گا۔ یا شاید نہ کر سکے۔ اسے زمانہ سازی نہیں آتی۔

سردار عمر خان اندر آتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں خاصہ تیار ہے۔ بوڑھا امیر اللہ کا نام لے کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مسند سے اٹھتا ہے۔ دوسرے کمرے میں دستر خوان بچھا ہے۔ بھاپ اٹھتی ہوئی تابیں اکر سامنے رکھی جاتی ہیں۔ افغان ہمیشہ سے جمہوری رہا ہے۔ دستر خوان پر بوڑھا بادشاہ ان کے بھائی بھتیجے رشتے دار اور خدام ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔

بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرتے ہیں۔ خداوند تعالےٰ جس حال میں رکھے اس کا شکر ہے۔

افغان باقی اکسا باقی!
الحکم للہ! الملک للہ!

باب ۸

اپنے وقت کا ابدال

۲۹ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو پدرم کے والد خان بہادر سید جلال الدین حیدر کا انتقال ہوگیا۔ سید رضا علی نے اعمالنامہ میں لکھا ہے۔ "وہ بڑے نامور کوتوال تھے۔ مجھے پہلی دفعہ ۱۹۰۰ء میں بنارس جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت تک سید جلال الدین حیدر کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے۔ چھوٹے طبقے کی عورتیں ان کے گیت بھی گاتی تھیں"۔

"۱۹۰۰ء کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیونکہ سید صاحب بنارس میں ۱۹۰۵ء تک رہے۔ اس زمانے میں لکھنو، بنارس، بریلی اور شیدمرادآباد (یا الہ آباد) قمار بازی کے عظیم الشان اڈے تھے۔ ان کی آمدنی میں کوتوالِ شہر کا حصہ مقرر تھا۔ کوتوالِ بنارس کا حصہ ایک

---

[1] امیر یعقوب خان کے انتقال کے بعد بھی جلاوطن شاہی خاندان پدرم کا اسی طرح پرستار رہا۔ راقم الحروف کے بچپن میں دہرہ دون میں مقیم افغان شہزادے اور شہزادیاں جن میں سردار عمر خان مجھے اب تک یاد ہیں) اور شہزادیاں ہمارے یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں میری ملاقات لاہور میں ایک افغان شہزادی سے ہوئی جو دہرہ دون میں نظربند رہ چکی تھیں۔ وہ پدرم کا نام لیتے ہی رونے لگیں۔ موصوفہ کے بیٹے سردار شاہ نواز خان ایران میں سفیر رہ چکے ہیں اور بیٹی ڈاکٹر مس محبوب شاہ زمان خان نے جو پہلے کالج آف ہوم سائنس لاہور کی پرنسپل تھیں اب امریکہ میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ امیر یعقوب خان کے خاندان کے دوسرے افراد بھی پاکستان میں رہتے ہیں۔ کچھ دہرہ دون میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔

لاکھ سالانہ تھا۔

رنجیت سنگھ ہیڈ کانسٹیبل جو مسلمان ہو کر رنجیت خاں کہلاتا تھا اور خان بہادر صاحب کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھا۔ ایک بار ہمارے ہاں لکھنؤ آیا۔ بوڑھا پھونس ہو چکا تھا۔ دوپہر کو نیم تلے کھاٹ پر بیٹھکر حقہ گڑگڑاتا اور ہم نونہالانِ چمن کو داداجان مرحوم کے پُر اعتقول قصے سنایا کرتا۔

"اجی وہ کوئی بندہ بشر تھا اپنے وقت کا ابدال تھا۔"

"ابدال کون ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی ہوتے ہیں۔ چُپ رہو۔ ہاں۔ رنجیت خاں پھر کیا ہوا؟" ایک کزن نے اشتیاق سے پوچھا "ابا جان نے گیند دور پھینک دی۔ پھر کیا ہوا۔؟ گیند گم گئی تو ابا جان رونے لگے۔ پھر کیا ہوا؟"

"بس پھر وہیں لونڈے نے ہاتھ بڑھایا۔ اتنا لمبا کہ وہیں کھڑے کھڑے ایک کر دوسرے گھاٹ پر سے گیند اٹھالی۔ جن کا لونڈا تھا۔ دادا تمہارے سے قرآن پاک پڑھنے آیا کرتا تھا بس اس دن کے بعد سے نہ آیا۔ تمہارے ابا چچا سب حیران کہ لونڈا جو روز آکر ان کے سنگ گیند کھیلے تھا کہاں کو غائب ہو گیا۔"

ہم سب دریائے حیرت میں غوطہ زن ہوئے۔ رنجیت خاں نے آنکھیں نیم وا کرکے کہنا شروع کیا۔ "اجی ان ہاتھوں سے اشرفیوں کی تھیلیاں چھن چھن کرتی ہم نے اٹھائی ہیں۔ خان بہادر صاحب کے حکم سے سب واپس۔ ایک لاکھ سالانہ ان کے نام بندھا اگر لیتے۔ مگر حق حلال کی کمائی صرف ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ نوّے روپے مہینہ تم سب کے باوا چچاؤں کی تعلیم کے لیے علی گڈھ بھیج دیتے تھے۔ ساٹھ روپے میں تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ کوتوالی کیا تھی خانقاہ تھی۔"

درست۔ پدرم ہمیشہ وظیفے حاصل کرکے یا حاجی اسمٰعیل خاں کا ٹیوشن کرکے کالج میں پڑھے۔ گو یہ خوش سلیقگی کالج کے سب سے زیادہ خوش پوش طلبا میں شمار کئے جاتے تھے۔

"ایک لاکھ روپیہ کتنا ہوتا ہے رنجیت خاں؟" میں نے سوال کیا۔

"اوہ۔ اگر دادا جان مرحوم لے لیا کرتے سال کے سال تو حساب لگاؤ۔ ہم لوگوں کے حصے میں کتنی خطیر رقوم آتیں۔ روسائے کرام ہوتے ہم سب کے سب۔" ایک کزن نے کہا۔

"توبہ کرو میاں توبہ" رنجیت خاں نے دفعتاً غصے سے کہا۔ "دادا اولیا اللہ اور پوتے کے خیالاتوں کا یہ حال۔ رشوت کی کمائی کی لالچ۔"

ہم سب منہ لٹکا کر بیٹھ گئے۔

"مہاراجہ بنارس آن مرحوم کا چیلا تھا۔ ہر تقریب میں پہلے ان کا ہاتھ لگاتا۔ ہندو کی برات کوتوالی کے نیچے سے گذرتی۔ دولہا گھوڑے سے اتر کر پیدل چلتا تعظیم کی خاطر۔"

درست، مگر وہ ایک لاکھ روپے والی بات زیادہ دلچسپ تھی۔ اچھا فرض کرو۔ اے کاش ——

خان بہادر جلال الدین حیدر ۱۹۰۵ء میں بنارس سے ریٹائر ہوئے۔ رخصتی جلسے میں پنڈتان بنارس نے بزبان سنسکرت قصائد پڑھے۔ عوام نے طشت ہائے زریں و نقرئی اور مہاراجہ بنارس نے بندوق گراں بہا و شمشیر با قبضہ مطلا مع سرپیچ مرصع و دیگر اشیائے نفیس نذر کیں۔" (تذکرہ سادات نہٹور)

ان میں سے ایک طشت نقرئی اس فقیر حقیر راقم الحروف کے حصے میں آیا ہے۔

جب ۱۸۰۵ء میں سنبھل کے باشندے سردار امیر خاں نے مع لشکر غارت گراں نہٹور پر حملہ کیا ہے اس وقت جان بچانے کے لئے اخوند سید امام بخش ترمذی مع اپنی حاملہ بی بی اور بچوں کے محلہ سادات سے ایک میل دور جنگل میں مقبرہ مبارز اللہ خاں کے اندر جا چھپے تھے۔ وہیں رات کے وقت مشعل کی روشنی میں اُن کے فرزند (یادش بخیر) میر بندے علی ترمذی پیدا ہوئے۔ زمانے کے داؤ پیچ ملاحظہ کیجیے۔ لارڈ لیک نے سردار امیر خاں کو ریاست ٹونک کا نواب بنایا۔ سو سال بعد ان میر بندے علی کے بھتیجے اور داماد جلال الدین حیدر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریزی عملداری کے عہدے سے سبکدوش ہو کر کہاں بلائے گئے؟ سردار امیر خاں کے پڑپوتے نواب ٹونک کے۔ وہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور آئی۔ جی رہے۔ خواص و عوام میں مقبول رہے۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خاں سید صاحب کے متعدد چشم دید واقعات کشف و کرامات کے راوی ہیں۔

وفات کے متعلق علی گڑھ کے بزرگ معلم سید محمد ٹونکی[1] فرماتے ہیں: "اس وقت میری عمر نو دس برس کی تھی۔ صرف دو باتیں یاد ہیں۔ شاید ابتدائی سردی میں مغرب کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی وفات کی اطلاع دی اور کہا مرحوم نے وصیت کی تھی کہ مولوی سید حیدر علی کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اس لئے اجازت چاہیے۔

"خبر سن کر گھر والوں پر سناٹا چھا گیا۔ بچے بوڑھے سب غمزدہ تھے۔ جیسے کوئی اپنا چلا گیا۔ شہر میں عوام و خواص مرحوم کے خلوص نیکی اور نرم دلی کے تجربے بیان کرتے اور روتے۔ جنازے میں ہندو مسلمان ہزاروں شریک تھے۔

"۱۹۱۷ء میں سید الطاف حسین مرحوم ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ چند لڑکوں کی حرکتوں سے سخت ناراض ہوئے کلاس میں تقریباً دو گھنٹے اچھائی اور برائی پر لیکچر دیا۔ نیک لوگوں میں جلال الدین حیدر صاحب مرحوم کی مثال دی اور فرمایا کہ پولیس کا محکمہ ظلم اور رشوت کے لیے بدنام ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس خصوصاً بے رحمی کے لئے مشہور ہیں لیکن جلال الدین حیدر اپنی مثال آپ تھے۔ سزا سے زیادہ اصلاح کا خیال کرتے۔ اور ڈنڈے کے بجائے نرم زبان استعمال کرتے۔ جب ان کا انتقال ہوا سارے شہر ٹونک میں کہرام تھا۔ بیوائیں۔ یتیم۔ غریب۔ بوڑھے لاوارث اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے جیسے اُن کا بزرگ اُٹھ گیا۔ سید صاحب مرحوم کی شرافت مری نہیں زندہ ہے۔ شریفوں کی شرافت زندہ رہتی ہے اور دوسروں کو شریف بناتی ہے۔"

جلال الدین حیدر صاحب مرحوم کے متعلق میری ایک تھیوری ہے۔ موصوف کے اندر کسی پرکھ ولی اللہ کی روحانیت عود کر آئی تھی۔ جیسا کہ اس تذکرے کے آغاز میں واضح کیا گیا ہے پہلے ہمارے ہاں صرف فقراً پیدا ہوا کرتے تھے۔ عادت ان کی یہ تھی۔

۱۔ سید محمد ٹونکی مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۵ء تک ہیڈ ماسٹر تھے۔ ۴ ستمبر ۱۹۷۴ء میں علی گڑھ میں انتقال فرمایا۔

جھولا لٹکا۔ ڈنڈا اسٹیمل کھڑاؤں پہن چل کھڑے ہوئے۔ جہاں مرتبہ ملا۔ کھڑے ہو کر آج کے عیسائی پادریوں کی طرح تبلیغ شروع کر دی اور دن رات دستے وظیفے پر وظیفہ چلتے۔ رزے۔ گذر اوقات کا ذریعہ فتوح یعنی بن مانگا نذرانہ ہو وگ رسے دیں۔ شاہی حکام اور امراسے اجتناب۔ فتوح میں سے جو بچا اسے تقسیم کرنا واجب۔

کبھی کبھی بادشاہ وقت بنجر زمینوں پر کاشت کی اجازت دے دیتا تھا۔ پوچھو بنجر زمین پہ کاشت ہو سکے ہے؟

اسی قطع سے جد بزرگ میر کمال الدین ترمذی ترمذ سے ہرود کی مشنری ٹریننگ منر سے فارغ التحصیل ہو کر ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ ان کی اولاد میں چند پشتوں تک فقیری چلی۔ جب درگاہیں بنیں۔ فقیری سرمایہ داری میں تبدیل ہوئی یا ان کی اولاد سلاطین کی حاشیہ بردار ہوئی۔ جاگیریں ملیں گویا پیری کی برکت سے پیری پائی۔ غرض ذہنی کلکٹر ہوئے یا میونسپٹی۔

اگر اپنے اجداد کی تصانیف ملفوظات کتابیں اور الدر المنظوم کو غور سے پڑھتے یہ نوبت نہ آتی جو اس وقت ہے۔

بہر حال سید جلال الدین حیدر تو اس بازار خود فروشی میں سے اپنا دامن بچا لے گئے۔

دوسری تھیوری یہ ہے کہ خان بہادر صاحب اپنی نیکی اور شرافت میں منفرد نہ تھے۔ اس معاشرے پہ مذہب روحانی اور اخلاق اقدار کا گہرا اثر ابھی باقی تھا۔ عموماً ہندو دھرم کرم کے پابند اور عموماً مسلمان ایماندار اور شریف ہوتے تھے۔ کرپشن دور حاضرہ خصوصاً آزادی کے بعد کے حالات کی دین ہے۔

قصہ کوتاہ سید صاحب کی رحلت کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے ہٹور میں ایک مکان چھوڑا ہے جو اپنے والد میر حمد علی ترمذی کے ترکے کے روپے سے ۱۸۹۷ء میں بنوایا تھا اور چند ایکڑ آبائی زمین جو غدر کی ضبطی سے بچ رہی تھی اور صرف پانچ سو روپیہ نقد۔ "بلکہ دولت بنام آل حیدر می زند" کہاں سے ہوتا۔ چاروں بیٹوں کے لئے ایک عدد منظوم نصیحت نامہ البتہ تصنیف کر گئے تھے۔

چاروں لڑکے جنھیں وہ اپنے چار گاؤں کہا کرتے تھے۔ برسر روزگار تھے سید اعجاز حیدر فرزند اکبر متاہل تھے اور کچھ عرصے نواب احمد سعید خاں نواب چھتاری کے سکریٹری رہے۔ سجاد حیدر مسوری میں تعینات تھے۔ میاں نصیر یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ نسبت پھوپھی کی لڑکی وحیدہ بیگم سے ہو گئی تھی۔ سب سے چھوٹے میاں وحید کا بیاہ اپنے ماموں سید اکرام حیدر ترمذی کی لڑکی سے ہو چکا تھا۔ رہے میاں سجاد تو وہ سمندر پار ہو آئے تھے۔ شادی کو منع کریں تھے۔ اب ادھر سننے میں آ رہا ہے کہ ایک انگریزی پڑھی لکھی لڑکی جو اخباروں تک میں چھپے ہے لوگ باگ اس کے لیے کوشش کریے ہیں۔ ان کا خاندان ہے تو کھرا سید۔ یو۔ پی کا۔ مگر ہیں شیعہ اور رہتے ہیں کالے کوسوں دور صوبہ سرحد میں۔ اب پتہ نہیں وہاں کے نقشے کیا ہیں۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔

ا۔ ملفوظات ...

فصل چہارم - باب ۱

فلائینگ آفریدی

نوشہرہ چھاؤنی ضلع پشاور میں دریائے کابل کے کنارے واقع ہے - یہ سرد اور پرفضا خطہ عمرانی لحاظ سے افغانستان و توران سے قریب اور وادیٔ گنگ وجمن سے اتنا دور ہے کہ شمال مغرب کے چاق و چوبند قوی ہیکل باشندے ستلج پار کے باسیوں کو "کالے ہندوستانی" اور "پوربیے" کہتے ہیں - فرحت بخش ہوائیں، ترکستانی اونٹوں کے قافلے، سرد چشمے، برف پوش پہاڑ، آسمان پر اُڑتے باز۔ ہمیں ضرور جاننا چاہیے کہ اقبال نے اپنی امیجری کہاں سے حاصل کی -

ہر سمت وہ میدانِ کارزار پھیلے ہیں جہاں سنو سال سے شاہیں صفت افغان اور پختون برطانوی افواج کا مقابلہ کر رہا ہے - مردان - درہ ملاکنڈ - علی مسجد - سفید کوہ -

درہ خیبر کے اس پار سبزوار، دشت لیلی - نادِعلیؒ - چہل زینہ - دلآرام - درہ بوم - شہر بہلول - بالا مرغاب - قزل قلعہ تخت پُل وادی سرخاب - شہر ضحاک - وادی پنج شیر - کوہ پہلوان - شہر غلغلہ ایک ایسی دنیا آباد ہے جس کے افسانے قبائلی داستان گو، تاروں بھرے آسمان کے نیچے الاؤ کے گرد بیٹھ کر سناتے ہیں -

افغانوں اور انگریزوں نے خون کے کئی دریائے سرخاب یہاں بہائے - ملاکنڈ - چک درہ - اٹک - قلعہ جمرود - پشاور کے بازار قصہ خوانی میں بخارا اور سمرقند اور قندھار اور جلال آباد اور کاشغر اور مشہد سے کارواں آکر اب بھی اُترتے ہیں - چائے خانوں میں سماوار گرم کئے جاتے ہیں -

موسم سرما میں پوندے اپنے گلے کے پہاڑوں سے اُترتے ہیں اور صوبہ سرحد کی وادیوں میں بکھر جاتے ہیں ماہ مارچ میں اچانک بہار آ جاتی ہے -

صوبہ سرحد کی چھاؤنیاں اپنی خوب صورتی اور شادابی کے لئے ساری برٹش ایمپائر میں مشہور ہیں - صاحب اپنی جان ہتھیلی پر لئے ان قلعہ بند بنگلوں میں بیٹھا ہے مگر باغبانی اور حسن کاری سے باز نہیں آتا -

لیکن نوشہرہ چھاؤنی کے اندر کھپریل کی ڈھلوان چھتوں اور نازک کھمبوں والے بنگلوں میں سے ایک کے پھاٹک پر S.M. BAKAR کی جو تختی چمک رہی ہے کسی انگریز کا نام ہرگز نہیں - امام باڑہ لاکھڑی ضلع مرادآباد کے ذاکر آغا کربلائی اگر زندہ ہوتے تو آپ کو بتاتے کہ یہ سید نذر الباقر رضوی کی انگریزی ہجے ہے اور ان ہی کی پردہ نشین صاحبزادی مس نذر الباقر "نے عصری اردو ادب کے بازار قصہ خوانی سے ملحق ایک شہر غلغلہ آباد کیا ہے -

چپراسی دریا پار سے ڈاک لے کر روز صبح گیارہ بجے مسٹر باقر کے بنگلے پر پہنچتا ہے - نوعمر سیالکوٹی ملازم غلام حسین پلندہ لے کر اندر جاتا ہے - زمانے کے عمر عیار نے نیا کرشمہ دکھایا ہے - اس زنبیل میں سے ایڈیٹروں کے خطوط برآمد ہوتے ہیں اور رسالوں کے پیکٹ

مخزن۔ النّاظر۔ البشیر۔ پیسہ اخبار۔ تہذیبِ نسواں۔ تمدّن۔ شریف بی بی۔ خاتون۔ مس نذر الباقر جو چھپے برآمدے میں بیٹھی پوشیدہ ہیم کا دیا ہوا "ہوم ورک" کر رہی ہیں۔ ایک لفافہ کھولتی ہیں :

جناب بیگم صاحبہ تسلیم!

اس ایک ماہ کے عرصے میں ہم کو خاتون کے دو مین پرچے تیار کرنے ہیں کیونکہ ہمارا مقصد ہے کہ خاتون اب وقت پر نکلا کرے اس لئے آپ کے پاس لکھتے ہیں کہ آپ کوئی عمدہ اور بڑا مضمون بھیج کر اس کام میں ہماری امداد فرمائیں۔ آپ کی آنکھوں کی شکایت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تکلیف دہی نازیبا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس تکلیف دہی کو آپ معاف فرمائیں گی۔

مورخہ ۱۷ مئی سنہ ء	فقط نیاز مند
بخدمت بنت نذر الباقر صاحبہ	شیخ محمد عبداللہ
نوشہرہ چھاؤنی	ایڈیٹر خاتون علی گڈھ

ہم مس نذر الباقر کی ڈاک یہیں چھوڑ کر سینما لینٹرن کے ذریعے ۱۹۰۵ء کے سیالکوٹ کا ایک بہترین سین سینریوں والا بائیسکوپ لیڈیز اور جنٹلمین کو دکھلاتے اور گراموفون آلے کے ذریعے گم شدہ آوازیں سنواتے ہیں۔

سنیے۔ مسٹر ایس۔ این بیجر کے پردادا میر معصوم علی چکلہ دار اودھ کے بیٹے خان بہادر میر تراب علی سی۔ آئی۔ ای کو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے اجازت تھی کہ سارے صوبے میں بیشک جس جگہ چاہیں اپنا اجلاس کریں۔ جس وقت آپ نے بمقام گورداسپور ۱۸۷۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا فرزند اُن کے میر مظہر علی سیالکوٹ میں تحصیلدار تھے (تحصیلدار اس زمانے میں میونسپلٹی کا چیئرمین ہوتا تھا۔ انکم ٹیکس لگاتا تھا اور مجسٹریٹ درجہ اوّل کا کام کرتا تھا)

قدیم اسلامی مدارس اور خانقاہوں کا یہ شہر اس گئے گذرے زمانے میں بھی مردم خیز تھا۔

شمس العلماء مولوی میر حسن اور ایک کشمیری نژاد صوفی منش بزرگ شیخ نور محمد ایک چودھری خاندان جن کے آبا سکھ سے مسلمان ہوئے تھے اور خواجہ غلام محمد حاضر کے بزرگ جو چائے خانے اور سرائے کے مالک تھے۔ میر صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل تھے شیخ نور محمد کا لڑکا محمد اقبال میر صاحب کے فرزند اصغر میر ظہور حسنین کا ہم عمر تھا۔ میر صاحب کے تینوں لڑکے فیض العسکری، نذر الباقر اور ظہور حسنین مع اقبال بستے اٹھائے روز صبح اسکاچ مشن اسکول کا رُخ کرتے اور پادریوں سے انگریزی اور مولانا میر حسن سے عربی فارسی پڑھتے۔

میر فیض العسکری (ولادت ۱۸۵۸ء)، سادات لانگڑی کے پہلے جوان تھے جنھوں نے انٹرنس پاس کیا۔ بعدازاں تحصیلدار "لگ"

---

[1] فصل دوم باب ۴ "منگو متی"

[2] یہ اجازت نامہ امروہے میں پروفیسر سید مختار حسین نقوی کے پاس محفوظ ہے۔

[3] ملاحظہ ہو فصل دوم باب ۶ "رادی"۔

[4] چودھری سر ظفر اللہ خاں کا کنبہ

گئے میر نذر الباقر نے آٹھویں کلاس سے اسکول چھوڑ سیالکوٹ چھاؤنی میں سپلائی ایجنٹ کا کام شروع کر دیا۔ تب اس شمع بارگاہ مرتضوی میر حسن نے کہ سر سید کے رفقا میں سے تھے۔ میر مظہر علی کو مشورہ دیا۔ آپ کے دونوں بڑے لڑکوں نے آگے پڑھ کر جو ہم کم از کم میاں ظہور کو علی گڑھ بھیج دیں۔

۱۸۹۲ء میں میر ظہور حسین انٹرنس کے بعد مدرسۃ العلوم روانہ کئے گئے۔ آپ سے قارئین پچھلے ابواب میں سرسری کر چکے ہیں۔

۱۸۹۵ء میں شیخ محمد اقبال اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے کر کے لاہور آ گئے۔ اس کے بعد پڑھتے گئے۔ بے حد پڑھا۔

میر مظہر علی کے خاندان والے "پنجاب کے ہندوستانی" ہیں۔ آج ۱۹۰۷ء میں نصف صدی ہونے آئی یہاں قیام مجال ایک لفظ پنجابی کا زبان پر آ جائے۔ بیبیاں بدستور گھر سواں فرشی پائجامے پہنتی ہیں۔ "یہ صوبہ ہنوز" پردیس "ہے" راولا کنبے میں ہوتی ہیں اور دوسری اہم تقاریب کی مانند مراد آباد جا کر منعقد کی جاتی ہیں۔ وہیں میر مظہر علی کی سالی اشرف جہاں مرتضائی اور مصطفائی میر فیض العسکری اور میر نذر الباقر سے بیاہی گئیں۔ ان لڑکیوں کے بھائی میر فضل علی کا عقد میر مظہر علی کنیز عباس عرف اکبری بیگم سے ہوا۔

اشرف جہاں بیگم کے شوہر میر مہدی علی قصور ضلع سیالکوٹ میں تحصیلدار تھے جہاں مصطفائی بیگم اور نذر الباقر کی لڑکی نذر میں پیدا ہوئیں۔ میاں نذر الباقر فوجی آدمی فلائنگ آفریدی بنے جگہ جگہ اڑے پھرتے تھے۔ مصطفائی بیگم سیالکوٹ میں ساس سسر رہتیں۔ میر مظہر علی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاڈلی تین سالہ پوتی کو شجاع خانی ریشم کا سرخ برقعہ اڑھا گھوڑے پر اپنے سامنے بٹھا صبح صبح ہوا خوری کے لئے ہوا ہو جاتے۔ ماہر شہسوار تھے لیکن اجل بھی گھوڑے پر آئی۔ سیالکوٹ سے ملتان تبادلہ ہوا۔ ۵ ہے۔ ایک روز تحصیل لودھراں میں گھوڑا اڑاتے ایک سائیس ساتھ کئے جنگل سے گذر رہے تھے، ایک جاٹ سکھ کی وجہ سے دشمن ہو گیا تھا درخت کی آڑ سے بندوق چلا دی۔ گولی سر میں لگی۔ زمین پر گرتے ہی جاں بحق تسلیم ہوئے۔ قصبہ لودھراں کے گئے۔ ۱۸۳۸ء میں بعہد محمد علی شاہ بادشاہ اودھ شہر لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ مٹی کہاں سے کہاں کھینچ لے گئی۔

ملتان اس برصغیر کا سب سے بڑا گورستان اور قبر پرستی کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ سوئم کے روز میر صاحب مرحوم و مغفور پر اسرار شکلوں والے قلندر چلم پیتے آن بیٹھے۔ ہفتے بھر میں باضابطہ تکیہ قائم ہو گیا۔ شاہ صاحب خلد آشیاں کی کرامات کا تذکرہ شروع۔ قبر پر سبز جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ سرہانے بیری کی ٹہنیوں میں دھجیاں اور کلاوے بندھ گئے۔ والد ماجد میر قائم علی شاہ سے آڑ مزار پر بمقام گورداسپور برسوں سے سالانہ عرس ہو رہا تھا۔ لودھراں ضلع ملتان میں "مظہر علی شاہ پیر" کے مدفن پر جمعرات شروع ہو گئیں۔

والد کی وفات کے وقت میر نذر الباقر سیالکوٹ چھاؤنی میں VITLING AGENT تھے فوجی گوداموں سے سپلائی یونٹ کو روانہ کرتے تھے۔ طبیعت دار نوجوان تھے۔ بے تحاشا روپیہ کماتے اور اڑاتے چند سال بعد سیالکوٹ سے

ہندوستان کی اہم ترین چھاؤنیاں اسی پُرخطر علاقے میں واقع تھیں۔ حکومتِ برطانیہ کے لیے سنٹرل ایشین کو یسچین کا یہ نازک ترین دور تھا۔ جیحون پار روسی ریچھ غراتا تھا۔ سرحدی پٹھان اُونٹوں کے ذریعہ امیر کابل حبیب اللہ خان کی امداد کے لیے خانہ ساز بندوقیں سمگل کرنے میں مصروف تھے۔ ملا سرتور فقیر اعلانِ جہاد کر چکے تھے۔ چھاؤنیوں کے طعام خانوں میں جنرل رابرٹ کے معرکوں کے مناظر کی روغنی تصاویر کے نیچے کھڑے ہو کر فتح کے جام لنڈھانے کے بعد انگریز افسر پختونوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلتے اور گرجا گھروں میں لگی مقتولین کے ناموں کی برنجی تختیوں میں اضافہ کرتے تھے۔ جاہل سرپھرے ایماندار مجاہدوں سے مقابلہ تھا جو میدانِ جنگ میں جاتے وقت اپنے گھر کا سارا اثاثہ بطور امانت کسی پیر کے مزار پر رکھ جاتے اور اسے کوئی نہ چُراتا۔

مسلح گوروں سے لدی "فلائنگ آفریدی" ٹرین جمرود اور پشاور کے درمیان بھک بھک دھواں اُڑاتی چلتی رہتی تھی۔

میر نذر الباقر خالصہ فوج والے دادا کرنل نور الدین شاہ (دیکھیے فصل دوم باب گومتی) کی مانند ایک مہم جُو اور جری انسان تھے۔ گورے چٹے۔ بلند قامت وجیہہ۔ مورثِ اعلیٰ نیشاپور سے چار سو برس قبل آئے تھے۔ لیکن میر صاحب چہرے مہرے سے ہنوز خراسانی آغا معلوم ہوتے تھے پشتو اور افغان فارسی اور پنجابی میں پرتق اور نفیس انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ ہندو مسلمان سکھ اور انگریزوں کا وسیع حلقہ احباب رکھتے تھے۔

۱۹۰۰ء میں ادھر دور دراز چین میں جنگ باکسر چھڑی، اُدھر نوشہرہ چھاؤنی میں طبل جنگ بجا۔ بی بی بچوں کو برادرِ بزرگ میر فیض العسکری کے پاس تحصیل پنڈ دادن خان ضلع جہلم پہنچا کر میر صاحب امام ضامن کی ضامنی اور گوڈ سیو دی کوین کی گت پر رائل انڈین سپلائی کور کے ہمراہ عازم کینٹن ہوئے۔ سال بھر بعد بیش بہا نوادر کا انبار ساتھ لے کر واپس آئے۔ قدیم چینی تصاویر جدید کے ظروف منقش چوبی صندوق اطلس کے پردے اور لبادے اور سیاہ بانات کی ایک وسیع اسکرین جس پر کارچوب سے قد آدم چینی کڑھے تھے۔

میر صاحب کی دریا دلی اور شاہ خرچی ضرب المثل بن چکی تھی۔ چینی تحائف کا بیشتر حصہ دوستوں میں بانٹ کر کچھ عرصہ بعد بوئر جنگ کے لیے جنوبی افریقہ روانہ ہو گئے وہاں سے آکر بسلسلۂ جنگ پوشانی برما تشریف لے گئے۔

میر صاحب کے جود و سخا نے ایک آفت مچا رکھی تھی۔ نصف صدی بعد راقم الحروف نے ایک شناسا کے ہاں لاہور میں ایک طویل و عریض ایرانی قالین دیکھا انہوں نے برسبیل تذکرہ بتلایا کہ ان کے والد کو کوئی نہال بہار نذر الباقر صاحب صوبہ سرحد میں تھے انہوں نے تحفتاً دیا تھا۔

چینی اسکرین نہ جانے کس طرح بچ گئی۔ اماں بتاتی تھیں کہ کوہاٹ کے بنگلے میں ڈرائنگ روم کے ایک سرے پر کھڑی رہتی تھی۔ اس کے مقابل میں آتش دان کے اوپر میر قائم علی کی رنگین تصویر آویزاں تھی جس میں وہ باضابطہ لکھنؤ کے شاہی زمانہ کا لباس پہنے بیٹھے تھے۔ لاہور کے کسی فرنگی مصور نے بنائی تھی۔ مینٹل پیس کے وسط میں میر مظہر علی کا فوٹو گراف تھا جس میں وہ دوپلی ٹوپی انگرکھے اور بے حد چوڑے عرض کے پائجامے میں جلوہ افروز تھے۔ دائیں جانب ان کے فرزندِ اکبر میر فیض العسکری طرے دار سرحدی صافہ کلاہ شلوار فراک کوٹ کے ساتھ ٹائی باندھے کھڑے تھے۔ بائیں جانب میر نذر الباقر انگریزی فوجی وردی میں اور میر ظہور حسنین ایم اے او کالج کے یونیفارم میں۔ یہ پانچ تصویریں گویا تین نسلوں کی تہذیبی تاریخ کی عکاس تھیں۔

دو نادر چینی اسکرین راقم الحروف نے بچشم خود دیکھیں۔ غازی پور تک ہمارے یہاں موجود تھیں۔ بانات میں کیڑوں نے سوراخ کر دیئے تھے لیکن کار چوبی چینی اسی طرح چٹیاں لٹکائے مونچھیں جھکائے آستینوں میں ہاتھ دیئے کنفیوشس کے فلسفے میں مستغرق تھے۔ اماں اکثر کہا کرتی تھیں فلاں چیز جو پاپا چین سے لائے تھے۔ یا" جب پاپا چین گئے تھے ۔۔۔"

پاپا پیدائشی روشن خیال تھے۔ ایک عدد یوریشین بڑھیا میم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ملازم رکھی تھی۔ بڑی لڑکی نذر زہرا کو ڈاکٹری پڑھوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

بہن ان کی اکبری بیگم غیر معمولی طور پر ذہین اور لکھنے کی خدا داد صلاحیت رکھتی تھیں۔ مگر لکھیں تو چھپوائیں کہاں۔ زنانہ تحریر اور نام تک کا پردہ تھا۔ میر صاحب نے ان سے کہا "بھینا تم فکر نہ کرو۔ اس کا بندوبست بھی کرتا ہوں۔" لاہور سے اخبار "تہذیب نسواں" جاری ہو چکا تھا۔ اس کے ناشر مولوی سید ممتاز علی کو خط لکھ کر بہن کے نام پرچہ جاری کروا لیا۔ اکبری بیگم کی عید ہو گئی۔

اکبری بیگم کے شوہر میر فضل علی لاہور میں ملازم تھے۔ دیور تفضل علی لاہور میڈیکل کالج میں پڑھ رہے تھے۔ پنجابی مہم پسندی اور اولوالعزمی کی وجہ سے لاہور نے دلی اور لکھنؤ کے مقابلے میں جدیدیت زیادہ سرعت سے قبول کی تھی۔ کالجوں، ادیبوں اور صحافیوں کا نیا مرکز بن چکا تھا۔

کہاں بے چارہ مراد آباد جو بادِ قیس بخیر صوبیدار رستم خاں اور سید بڑے کے عہد سے چند سال ہی آگے بڑھا تھا۔

۱۹۰۳ء میں میر نذر الباقر اکبری بیگم اور سارا کنبہ ایک بار پھر وطن پہنچا جہاں اکبری اور میر فضل علی کے پانچ سالہ بیٹے میر افضل علی کی سنتوں کی تقریب منائی جانے والی تھی۔

باب ۲

محلسرا

میر قائم علی کے پرنواسے میر مہدی علی کے پوتے میر فضل علی کے سپوت جائے میر افضل علی کی سنتوں کی تقریب کے لئے نائی نائین محلے محلے "نوتل"[1] پھیر آئے۔ سقے نے کاوے میں آم کے پتے پرو کر قائم علی کی "محلسرا" کے صدر دروازے پر بندر وار باندھی۔ سامنے چوک میں شہر کے نامی بھانڈ اور نقال جمع تھے۔ ڈیوڑھی پر چوپہلے، پالکیاں ڈولیاں لا لا کر رکھی جا رہی تھیں۔ اندر صحن میں کلاونت بچیاں[2] گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں اہلی گہلی پھر رہی تھیں۔ صدر دالان میں رشتے دار بیبیاں پنجاب سے آئی ہوئی مہمانوں کو حیرت سے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرنے میں مشغول تھیں۔ "مصطفائی بھابی کی لونڈیوں نے جو پہن رکھا ہے۔ کیا کہلاوے ہے؟"

"گون اور جاکٹ۔"

---

[1] نوید ۔ [2] میراثنیں ۔

"بال چھنکائے ہوڑنیاں جیسی۔"
"کنواری بالیاں مانگ کاڑھنے لگیں۔"
"بوقندازوں کی طرح کمر کس کے پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔"
"پردیس میں رہ کر کرشاں ہوگئے۔"

باہر کچھ فاصلے پر صوبیدار رستم خاں کی مسجد سے متصل میر قائم علی کی کوٹھی میں مردانہ تھا۔ بار بار شور مچتا۔ بھائی فلاں آگئے چچا میاں تشریف لائیے۔ آخاہ کنور صاحب۔ مزاج شریف۔

پھاٹک پر گھیسوں کا ہجوم۔ ایک راجہ صاحب باقاعدہ ہاتھی پر چڑھ کر آئے تھے۔

محلسرا کی ڈیوڑھی پر محمود پور کا ہاتھی کھڑا کان پھٹپھٹا رہا تھا۔ افضل میاں کی سواری کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ملازم اور محلے کے فالتو لونڈے لاڑے شور مچا رہے تھے۔ اسے میاں شہزادے چلے آئے ہو منہ اٹھائے دیکھ کے چلو پیارے۔

اماں دیکھ رہا ہوں کیا نقشے ہو رہے ہیں۔

سید خاں کے گھر سے سواریاں آگئیں۔ اترو الو۔

پیر غیب والے آگئے۔

تکیہ گل شہید۔ قاضی کی املی

اتنے میں غل مچا۔ محمود پور والے آگئے۔

نواب سید محمد علی خاں کی بگھی کوٹھی کے پھاٹک پر رکی۔ پیادوں اور علم برداروں کے جلو میں دو بہلیاں آگے بڑھ کر محلسرا کی ڈیوڑھی سے لگ گئیں۔ بال بال گنج موتی پروئے نواب صاحب کی بیٹیاں ولایتی بیگم، حیدری بیگم صدر دالان میں داخل ہوئیں۔ بارہ سالہ ندرِ زہرا تصویرِ حیرت بنی ان مغل تصاویر جیسی بہنوں اور بھاوجوں کو دیکھا کیں جن کے باپ اور شوہر اپنے علاقے کے مجرموں کو سزائے موت دینے کا استحقاق رکھتے تھے (ہاں بیٹیا ملکہ نے ہمیں ایک خون معاف کر رکھا ہے۔ ایک روز حیدری بھابی نے بتولی کو بتایا) شہر مراد آباد گھسٹ گھسٹا کر انیسویں صدی تک آپہنچا تھا۔ دوسرے رجواڑوں کی مانند محمود پور ابھی بڑے اطمینان سے اٹھارویں صدی میں موجود تھا۔

رات گئے نواب سید محمد علی خاں کے پھوپی زاد بھائی ڈپٹی آلِ نبیؐ اور ندر الباقر اندر آئے۔ اپنے چچازاد بھائی آلِ نبی کو دیکھ کر اکبری بیگم کو اس غیر حقیقی ماحول میں اچانک بڑی تقویت سی محسوس ہوئی۔ سارے خاندان میں صرف وہی اکبری بیگم اور ندر الباقر کے ہم خیال تھے۔ ایک بوڑھا پھولس انگریز مشنری ملازم رکھا تھا جو پردے کے پیچھے سے ان کی اکلوتی بیٹی آلِ زہرا کو انگریزی پڑھاتا تھا۔ آلِ زہرا کا بیاہ اکبری بیگم کے علی گڑھ والے بھائی ظہور حسنین سے ہوا تھا۔ سید حسین اور نند سے کم ذہین نہ تھیں۔ طب بھی پڑھ رہی تھیں۔

ندرِ زہرا اور ثروت یعنی بوٹی پہلی بار پنجاب سے مراد آباد آئی تھیں۔ جب اسٹیشن سے محلسرا پہنچیں سامنے ہی صحنچی میں آلِ زہرا بچی بالکل پری بنی ہیرا کنی کا دوپٹہ اوڑھے پلنگڑی پر بیٹھی بلیک ووڈ میگزین پڑھ رہی تھیں۔

تقریب میں پانی کی طرح روپیہ بہا، اکبری بیگم کی مجال نہ تھی کہ فضول خرچی، لغو ریت رسوم اور اوہام پرستی کے خلاف احتجاج کریں۔ اُن کے دیور میر تفضل علی کا کچھ عرصہ قبل لاہور میں انتقال ہوا تھا۔ کہا جا رہا تھا۔ پرانے تھے دکھیا کو تو وہ غارت گئے جنات اُٹھا لے گئے۔

خود ان مرحوم کو بھی وہم ہو گیا تھا کہ دو جن ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میڈیکل کالج لاہور کے آخری سال میں تھے۔ جنات ضلع گورداسپور میں بھی نازل ہو جاتے جہاں ان کے والد میر مہدی علی تعینات تھے۔ پچھلے بڑے دن کی چھٹیوں کے بعد تفضل میاں گورداسپور سے لاہور واپس جا رہے تھے۔ ریلوے پلیٹ فارم پر اچانک بولے بھابی جان دیکھئے دونوں آ پہنچے کہہ رہے ہیں۔ اب ہم تین ہو جائیں گے۔ لاہور پہنچتے ہی نمونیہ میں مبتلا ہوا اللہ کو پیارے ہوئے۔

یہاں محلہ لاکڑی والان میں میر مہدی علی کے آبائی مکان کے زینے پر ایک جن کا قیام تھا۔ جب کبھی میر صاحب پنجاب سے آکر اس مکان میں ٹکتے وہ پابندِ صوم و صلوٰۃ بندۂ آتشیں فجر کے وقت زینے پر سے للکارتا "مہدی علی اُٹھو نماز پڑھو۔"

اکبری بیگم کو جس وقت یہ قصہ سنایا گیا وہ اسی مکان کے صحن میں کھاٹ پر بیٹھی تھیں۔ جھنجھلا کر بولیں "دھرا تھا جن" لو ہوا فوراً ان کے کان کا بالا کسی نے نوچ لیا۔ کیا دیکھتی ہیں سامنے کھونٹی پر لٹک رہا ہے۔

اکبری بیگم نے اپنی ننہیال چوکتیوں کی حویلی میں سب سے بڑی خالہ حمیدہ بیگم کو دیکھا، اس وقت اسی برس کا سن تھا۔ غدر سے قبل نکاح ہوا تھا۔ عین برات کے دن ایک جن عاشق ہوا، رخصت نہ ہونے دی۔ آج تک مصلے پر بیٹھی اللہ اللہ کر رہی تھیں۔[1]

مالیخولیا۔ ہسٹریا۔ تپِ دق۔ سل پردہ نشین عورتوں کے عام امراض تھے۔ باہر دیوان خانوں میں چوسر اور گنجفے کی بازیاں جمتی تھیں۔ مراد آباد اس وقت ہندوستان کا وی آنا کہلا رہا تھا نامی گائیک، بینکار اور رباب جلسوں میں بلائے جاتے۔ مقدمہ بازی محبوب مشغلہ تھا۔ اکثر جائداد بسلسلۂ فضول خرچی مہاجن کے ہاں رہن تھیں۔

چوک لاکڑی والان میں نیم کے درخت کے نیچے ایک کنواں ہے۔ اس کی کرامت یہ تھی کہ خاندان کے جس نونہال نے اس کا پانی پیا میٹرک سے آگے پڑھ کر نہ دیا۔

اکبری بیگم پنجاب واپس گئیں۔ اپنے ناولوں "گلدستۂ محبت"، "شعلۂ پنہاں"، "عفتِ نسواں" اور "گودڑ کا لال" کے لئے وافر مسالہ ساتھ لیتی گئیں۔

"گلدستۂ محبت" ان کا پہلا ناول تھا۔ چونکہ عورتوں کے نام تک کا پردہ تھا مصنفہ نے اسے "عباس مرتضیٰ" کے فرضی مردانہ نام سے پبلک پریس مراد آباد سے چھپوایا۔ اب نایاب ہے۔ ایک نسخہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

"گودڑ کا لال"[2] غالباً ۱۹۰۷ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ چھپتے ہی دھوم مچ گئی۔ بہت جلد اس نے نئی مڈل کلاس مسلمان عورتوں کی بائبل کی حیثیت اختیار کر لی۔ لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا۔ اس کے قارئین کو نہ یہ معلوم تھا کہ "والدۂ افضل علی" کون ہیں اور نہ یہ کہ انہوں

---

[1] (دیکھئے فصلِ دوم باب ۵ "رام گنگا")

[2] نسیم بکڈپو لکھنؤ نے چند سال ہوئے اس کا غیر قانونی اڈیشن شائع کیا ہے۔ (ق۔ح)

نے اس ناول کا پس منظر اور کردار کہاں سے حاصل کئے ہیں۔

باب ۳

"چُپ کی داد"

یکم جولائی ۱۸۹۸ء ایک اہم تاریخ ہے۔ اس روز لاہور سے شمس العلما مولوی سید ممتاز علی[1] نے زنانہ ہفتہ وار اخبار "تہذیب نسواں" جاری کیا۔ ان کی بی بی محمدی بیگم (والدہ سید امتیاز علی تاج) نے اخبار کی ادارت سنبھالی۔

بہت جلد "تہذیب" سارے ہندوستان کے پڑھے لکھے گھرانوں میں پہنچنے لگا۔ اس کی وجہ سے معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشین خواتین میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے دیکھتے انہوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ناول لکھنے شروع کر دیئے جو تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے آج ستر برس بعد لکھے جانے والے بیشتر عام ناولوں سے کسی طرح کم نہیں۔

مخالفین کے اعتراضات کی وجہ سے نام کا پردہ ضروری تھا۔ چنانچہ "تہذیب" کے سرورق پر چھپا تھا: "تہذیب النسواں جو کہ ایک شریف بی بی کی ادارت میں ہر ہفتہ شائع ہوتا ہے۔" اکبری بیگم نے "والدہ افضل علی" اور نذر زہرا نے "بنت نذر الباقر" یا "مس نذر الباقر" کے نام سے لکھا۔ مردانہ اخباروں میں یہ بحث بھی شروع ہوئی کہ کیا شریف مسلمان لڑکیوں کا خود کو انگریزی لقب "مس" سے یاد کرنا مناسب ہے یا سخت بیہودہ بات ہے۔

اصلاح لباس کی تحریک شروع ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں "تہذیب" میں یہ سوال اُٹھایا گیا کہ ہم کیا پہنیں۔ "کھنواں پاجامہ جس کی رسم اُٹھتی جا رہی ہے یا شلوار۔ سب بہنیں اپنے اپنے لباس سے آگاہ کریں۔"

آمنہ بیگم ہمشیرہ ابوالکلام آزاد بمبئی سے لکھتی ہیں: "میرے والد چالیس سال مکے میں رہے۔ سولہ سال قبل کلکتہ آئے۔ کلکتہ کی معزز خاتونوں کا لباس ساڑھی اور شلوکہ ہے۔ میں دہلوی لباس کے مقابلہ میں عربی لباس کی سفارش کرتی ہوں۔"

راحت خاتون یعنی بیگم بدرالدین طیب جی بھی اس بحث میں حصہ لیتی ہیں۔ زہرا فیضی کی والدہ امیر النساء رقمطراز ہیں: "میں آپ کو اپنی چھوٹی لڑکی عطیہ خانم کے لباس کی تصویر بھیجوں گی۔ زبیدہ خانم لندن گئی تھیں وہاں اُن کے لباس کی بہت تعریف ہوئی۔"

اکبری بیگم اور نذر زہرا بیگم نے گھر سوان بھاری پاجامے اور بھاری زیورات ترک کئے، ہلکے پھلکے غرارے اور "گاؤن" مع دوپٹے کے خود ڈیزائن کر کے پہننے شروع کئے جو فیشن ایبل طبقے میں رائج ہوئے۔

نذر زہرا بیگم نے جدید طرز کا برقعہ ایجاد کیا۔ اس کا ذکر پھوپھی نے ناول "گودڑ کا لال" میں کیا۔

---

[1] مولوی سید ممتاز علی دیوبند سہارنپور کے رہنے والے اور سرسید کے گہرے دوست تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں لاہور آ کر پنجاب ہائی کورٹ کے مترجم مقرر ہوئے، ۱۸۹۱ء میں رفاہ عام پریس قائم کیا۔ "دربار اکبری" اپنے پریس سے شائع کی۔

۱۹۰۵ء سجاد حیدر یلدرم کی پھوپھی زاد بہنیں یعنی خان بہادر صفیہ حسین کی لڑکیاں حمیدہ بیگم، وحیدہ بیگم چھوٹے چھوٹے مضامین "تہذیبِ نسواں" میں لکھتی ہیں۔ یلدرم کی چچا زاد بہن نثار فاطمہ بنتِ خان بہادر ڈاکٹر کرار حیدر "نصیحتِ منظوم" میں فرماتی ہیں :

شکر اللہ کا کہ ہم علم سے ہیں بہرہ مند
اس سے بڑھ کر نہیں دولت مری پیاری بہنو
اچھا کرتی ہو منگاتی ہو جو "تہذیب" اخبار
اس سے بڑھتی ہے لیاقت مری پیاری بہنو

ل۔ ف نہٹور ضلع بجنور

یٹول سے ایک بی بی نے لکھا "تہذیب" سے ہمیں بہت فائدے ہو رہے ہیں۔ پیشتر دنیا کے حالات کی خبر نہیں تھی۔ اب سب خبریں معلوم ہو رہی ہیں۔ یہ مضمون میں نے بہت کوشش کر کے لکھا ہے اگر اس میں کچھ غلطی نظر آئے تو آپ اور دوسری بہنوں سے معافی مانگتی ہوں۔"

مزید: "یہ میرا پہلا مضمون ہے جو بعد اصلاح برادرِ معظم کے روانہ کرتی ہوں۔ میری بہنو میں ایک شریف باشندۂ بھوپال کی لڑکی ہوں۔"

بنتِ نذر الباقر اور چند اور خواتین نے زنانہ کانفرنس قائم کرنے کی تحریک شروع کی۔ ایک بی بی معترض ہوتی ہیں "کوئی شخص سیڑھیاں طے کئے بغیر اچک کر نہیں چڑھ سکتا۔ ہم عورتیں پہلے ڈولی میں بیٹھتی ہیں۔ پھر گاڑی میں، پھر ریل میں۔ ہماری تعلیم ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ ہم ابھی اپنے آپ کو پڑھے لکھوں میں نہیں گن سکتے۔ ہماری چند بہنوں نے زنانہ کانفرنس کے سبب سے مردانہ رسالوں میں مضمون لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم پہلے زنانہ انجمنیں ہر شہر میں بنائیں۔"

عورتوں کی دلچسپیاں بدل رہی ہیں۔ اڈیٹر صاحبہ ایک نوٹ میں لکھتی ہیں۔ "ورزش اور تفریحِ طبع کے لئے کھیلوں کو دریافت کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ ہماری بہنوں کے تجربے میں جو کھیل آ چکے ہیں ان کی ترکیبیں ہمیں لکھیں۔ غالباً ہماری مسیحی بہنیں اس بارے میں بہتر لکھ سکیں گی۔ ایک کھیل مجھے پسند آیا ہے اسے پن پان کہتے ہیں۔ انگریزی کھیل ہے۔" برج کماری نہرو اور دوسری کشمیری برہمن اور کایستھ خواتین بھی اکثر مضمون لکھتی ہیں۔

۱۴؍ اپریل شالیمار باغ لاہور میں زنانہ جلسہ ہوا۔ باغبان پورے کی بیگمات اور اڈیٹر محمدی بیگم نے شرکت کی۔ دلی سے سلطانہ بیگم[1] آئی تھیں۔ کئی یورپین لیڈیاں بھی تھیں۔ ایک بہن فونوگراف لائی تھیں۔ اکثر لیڈیوں نے بیڈمنٹن کھیلا اور فونوگراف سنا۔

فاطمہ بیگم ہمشیرہ آبرو بیگم اطلاع دیتی ہیں کہ "آبرو بیگم کی شادی ہونے والی ہے اور انہوں نے اشارۃً مجھے سخت تاکید کر دی ہے کہ رسوم پر روپیہ برباد کرنے کے بجائے تعلیمِ نسواں پر خرچ کیا جائے۔"

۱۹۰۷ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے ڈائس پر مولانا الطاف حسین حالی کھڑے "چُپ کی داد"

---

[1] شمس العلماء ذکاء اللہ کی بہو۔ مزید تذکرہ آگے آئے گا۔

پڑھ رہے تھے۔ "اے ماؤ بہنو بیٹیو ——— دنیا کی زینت تم سے ہے۔"

باب ۴

چاند رات

اکبری بیگم اور ان کی نوعمر بھتیجی نذر زہرا دھاچوکڑی کے ماتم سے اجتناب کرتی تھیں۔ اب انہوں نے توہمات، بدعتوں، قبر پرستی اور تعزیہ پرستی کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا" اے بی۔ یہ ذوالجناح کو جلیبی کھلا کر اس کے کان میں بات کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ ذرا عقل سے کام لو بی بیو۔ بے چارہ گھوڑا امام حسینؑ کو تمہاری درخواستیں کس طرح پہنچائے گا؟" (شیعوں سے خطاب)

"اے بی یہ دریاؤ پری اور شیخ سدو کون چیز ہیں؟ بی شادی۔ دال چپاتی۔ میاں شاہ دریا۔ ماموں اللہ بخش۔ شاہ سکندر پیر ہٹیلے۔ پیر غیب؟ ہوش کی دوا کرو۔" (سنیوں سے خطاب)

خوش قسمتی سے اس خاندان میں تبرے کا رواج نہیں تھا اور سوگ سوئم کے روز اتار دیا جاتا تھا۔ ۹ ربیع الاوّل تک کا سوگ بہت بعد میں اہلِ لکھنؤ نے رائج کیا۔

اصلاح پرستی کے ساتھ ساتھ اکبری بیگم اور نذر زہرا بے حد شیعہ اور عاشقانِ حسینؑ بھی تھیں۔ پنجاب یا سرحد کے جس شہر یا چھاؤنی میں یہ خاندان مقیم ہوتا۔ گھر میں اربعین تک کے لیے امام باڑہ سجایا جاتا۔ نقرئی علَم اطلسی پٹکے۔ جو شاہجہانی کے لکھنؤ اور بکڑ دادا میر معصوم علی ناظم اودھ کے زمانہ کی یادگار تھے اور جنہیں پردادا میر قاسم علی ساتھ لے کر لکھنؤ سے نکلے تھے سال بھر صندوق میں محفوظ رہتے جہاں جہاں میر نذر الباقر کا تبادلہ ہوتا وہ منقش چرمی صندوق قدیم عبرانیوں کے آرک کی مانند ساتھ ساتھ چلتا (عرصہ گذرا شاہ غازی الدین حیدر کے لکھنؤ کی یادگار یہ علَم پنجے، نقرئی ضریح جناب عباس کی نقرئی مشک، شمعدان گلاب پاش وغیرہ وغیرہ، محرر ایں سطور نے نانا ظہور حسین کے مکان مراد آباد میں دیکھے۔)

چاند رات سے اس عارضی امام باڑے کی دہلیز پر بیٹھ کر اشرف جہاں بیگم، مرتضائی، مصطفائی اور اکبری بیگم سیاہ ململ کے دوپٹوں میں منہ ڈھانپ زار و قطار رونا شروع کرتیں۔

وا محمدا ——— کشتہ شد حسینؑ ———

چار سو برس قبل ان کی لکڑ دادیاں، نانیاں جو دورِ صفویہ کے نیشاپور میں روضہ خوانی اور شبیہ خوانی کرتی تھیں اور جنہوں نے موضع لاکھڑی ضلع مراد آباد پہنچ کر سید بڑے کے بنوائے ہوئے امام باڑے کے کچے فرش پر بیٹھ کر اس پہلی چاند رات رونا شروع کیا تھا ان خراسانی خانموں اور انیسویں صدی کی پردہ دار ان ٹھیٹھ ہندوستانی بیگمات کے شدتِ گریہ میں رتی بھر جو فرق آیا ہو۔

وا محمدا ——— کشتہ شد حسینؑ ———

گورے پردیس میں مراد آباد سے بارہ بیتھر باہر اچھے ذاکر اور سوزخوان کہاں سے جڑتے۔ ضلع ہزارہ کی چند سرحدی اور پنجابی شیعہ بیبیوں کو بگھی اور تانگے بھیج کر شہر سے چھاؤنی بلوایا جاتا۔ وہ دھوتال پٹھانیاں یا قزلباش خواتین ایسا قیامت خیز دھماکے کا ماتم کرتیں کہ دل دہل جاتے۔ فارسی، پشتو اور پنجابی میں دل دوز نوحے پڑھتیں۔ "ویر مسافر شام دی ویلا" یہ جو چاند رات کو شمروں کی

روشنی میں پڑھا جاتا تھا خصوصاً بے انتہا رقت ہوتی۔

یو۔پی کے شیعہ گھرانوں کی عورتیں مرثیہ خوانی کی بدولت عموماً تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور اسی وجہ سے ذوقِ سخن بھی رکھتی تھیں، میرانیسؔ گھٹی میں پڑے تھے۔ اشرف جہاں، مرتضائی، مصطفائی سب اردو داں تھیں۔ مرتضائی بیگم کا خط بہت پختہ تھا۔ مصطفائی نوحے بہترین پڑھتی تھیں۔ اکبری بیگم تو خیر ایک عالم فاضل بی بی تھیں ان کی حدیث خوانی خاندان بھر میں مشہور تھی۔

ساتویں تاریخ سے پردے کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھ کر میرزا باقر مصائب کا بیان پڑھتے اور رومال آنکھوں پہ رکھ کر خوب خوب روتے۔

ہر سال مصطفائی بیگم یہ تمنا کرتی تھیں کہ اس بار تو نہ ہو سکا، زندگی بخیر اگلے سال انشاء اللہ لکھنؤ میں محرم کروں گی اور چُپ تعزیے کی زیارت کر کے ہی لوٹوں گی۔

میرزا باقر کے ڈرائنگ روم میں بھونپو والا آرفوٹوگراف مع قوالیوں نعتوں تھیٹر کی "چیزوں" اور غزلوں کے ریکارڈوں کے انبار کے موجود تھا۔ "یہ پلیٹ" جن کو عام نیٹو "توا" کہتا تھا، صرف مردانہ دعوتوں کے موقعوں پر بجائے جاتے تھے۔ کنواری بالیوں کو تھیٹر کی چیزیں اور غزلیں سننے کی ممانعت تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول پڑھو اور نعتیہ قوالیاں سنو۔ متعدد ریکارڈ انگریزی موسیقی کے بھی تھے جیسے "انگریزی باجا" "انگریزی رقص موسیقی" یہ لڑکیوں کے لئے جائز تھے کہ ان کو سننے سے انگریزی کی استعداد بڑھتی تھی۔

ایک توے میں قوال گاتا تھا کہ اے مسلمانوں - مومنو - جو مسلمان بے نمازی مرے پڑھنا نہ اُس کے جنازے پر تم نماز۔ خاصا دہشت ناک توا رہا ہوگا۔ نوجوان مصطفائی بیگم جب یہ ریکارڈ سنتیں خوب روتیں کیونکہ اکثر علالت کی وجہ سے پنج وقتہ نہ پڑھ پاتی تھیں۔ کیا بھلی، جنّتی بیبیاں تھیں۔

باب ۶
نانی اشرف جہاں بیگم

ایک وقت تھا کہ اشرف جہاں بیگم جو کنویں کی حویلی میں محفوظ و مامون بیرونی دنیا کی خبر نہ رکھتی تھیں ۱۸۵۷ء میں بھائی کے حکم پر پانچوں بہنیں چہروں پہ توے کی کالک مل، باؤلی کی سیڑھیوں پر مستعد بیٹھ گئی تھیں۔ حملہ آور گورے چڑیلیں سمجھ کر الٹے پاؤں واپس بھاگ جائیں گے۔ آگے بڑھے باؤلی میں کود کر جان دے دیں گی۔ ۱۸۶۰ء میں لالکرتی والان کے دہلوی حکیموں کے ہاں میر مہدی علی سے بیاہ ہوا۔ اس وقت شمالی ہند میں ریل چل چکی تھی۔ روز نماز کے بعد دعائیں مانگتیں یارب العزت مرادآباد میں دھوئیں کی گاڑی آنے سے پہلے اس بندی کو دنیا سے اٹھا لیجیو۔ سن ۱۹۲۰ء تک زندہ رہیں جب پختونوں پر بم گرانے والی چیل گاڑیاں گڑگڑاتی ہوئی صوبۂ سرحد میں اُن کے سر کے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔

نانی اشرف جہاں بڑی خوددار اور طنطنے والی بی بی تھیں۔ انقلابِ زمانہ کو بڑے وقار کے ساتھ قبول کر چکی تھیں لیکن جوان

اولاد کی موت نے انھیں ہیبت زدہ کر دیا۔ پہلے کڑیل جوان تفضّل علی کو دشمنوں نے ہڑپ لیا۔ اللہ جنت نصیب کرے میاں کو بہتیرا منع کیا تھا بچے کو عیسائیوں کے نرغے میں لاہور مت بھیجو۔ جو پہلے ہی انگریزی ڈاکٹری حکمت پڑھا دو۔ دلّی کے طبیبوں کا پتہ دیا۔ پردادا قلعے میں سلاطینوں کے معالج۔ پوتے پر یہ وقت پڑا کہ فرنگیوں نے اس سے لاشوں کی چیر پھاڑ کروائی۔ کفر کفر استے تو جانے میرے لال کے سامنے کھڑے دانت کھوستے تھے۔ کوئی بد اروح نیچے سے پیٹ گئی۔ اپنی جان سے گیا۔ ان فرنگیوں کا حشر اللہ شمر یزید کے ساتھ کرے۔ لاٹ صاحب کی بھٹی میں نے کھائی۔ قطامہ ملکہ کی بھٹی میں سنے کھائی ——

دراصل اشرف جہاں بیگم غدر سے قبل کی نسل والے مسلمانوں کی مانند انگریزوں کو کسی طرح معاف نہیں کر سکی تھیں۔

بی مصطفائی کے مرنے کے بعد اشرف جہاں باؤلی سی ہوگئیں "فلاں کی بھٹی میں سنے کھائی" تکیہ کلام بن گیا۔

کچھ عرصے بعد نانی کو چپ لگ گئی۔ سر جھکائے تلے دانیاں اور تکیے چاروں طرف بکھیرے محرّم کا گوٹا رکھنے کے لئے رنگ برنگے گوٹے اور علم ٹکے سیا کرتیں یا انگشتِ شہادت گھما گھما کر زیرِ لب دعائیں اور وظیفے دہرائیں۔ چاند رات سے امام باڑے کی چوکھٹ سے لگ کر ساکت و صامت بیٹھ جائیں۔ بڑی بیٹی مرتضائی جو امرگ بہن کے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے نوشہرہ آ گئیں۔ بی مرتضائی لاولد تھیں۔ انہوں نے اور ان کے میاں تایا فیض عسکری نے ننھی زہرا بیگم کو بیٹی بنایا تھا۔ تایا صوبہ سرحد میں دو مربّع پا کر کے صاحبِ اولاد ہو چکے گر بھتیجی پر بدستور جان چھڑکتے تھے۔ خالہ[1] اپنی بھانجی کو دیکھ کر جیتی تھیں۔

نوشہرہ چھاؤنی خطرناک آفریدی علاقہ میں واقع تھی۔ راتوں رات سوتی ہوئی میموں کو پٹھان اٹھا لے جاتے۔

میر نذر الباقر عموماً دورے پر رہتے تھے۔ مزید حفاظت کے خیال سے کنٹونمنٹ کا بنگلہ چھوڑ کر لال کرتی بازار میں مکان لیا گیا RED COATS کے زمانے میں چھاؤنیوں کے اندر یہ بازار آباد کئے گئے تھے۔ لال کرتی نوشہرہ کے ذوجی کو توال متوسّطان اپنایے کے باشندے تھے۔ میر صاحب کے کنبے کی ان کے گھرانے سے بہت گہری چھنتی اور اب تک چھن رہی ہے۔ میر صاحب بچوں کے لاڈ پیار میں زیادہ تندہی سے مصروف ہو گئے۔ لڑکیوں کی ہر فرمائش اِلّا نذر بیگم کے شوقِ فوٹو گرافی کے کہ اس میں بے پردگی کا احتمال تھا انہوں نے پوری کی۔ دونوں لڑکیاں صحن کے اندر لیڈی سائیکل چلایا کرتیں۔

ننھی بی یعنی نذر زہرا بیگم کی آنکھیں بہت کمزور تھیں۔ ڈاکٹر کے حکم سے پڑھائی بند کی گئی۔ اب مضمون نگاری اور خط و کتابت کے لئے فرصت وافر تھی۔

مجلسی گفتگو کی مانند خط و کتابت ایک مہذب فن اور مشغلہ تھا۔ (انگریز خواتین بھی دن بھر ایک دوسرے کو "چٹھیں" بھیجا کرتی تھیں) خط لکھنے کے لئے علیحدہ دن مقرر تھے۔

---

[1] مرتضائی بیگم کا انتقال ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ نصف صدی بعد ان کی بھانجی نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو بعارضہ نمونیہ بمبئی میں رحلت کی۔ ۱۸ کی رات سے بیہوشی طاری ہوئی لیکن چند گھنٹوں بعد دفعتاً آنکھیں کھول کر آواز دی۔ خالہ — خالہ — خالہ آئی ہیں — پھر COMA میں چلی گئیں۔ اسی حالت میں صبح آکسیجن ٹینٹ میں انتقال کیا۔

چھوٹے بھائی سید مصطفیٰ باقر کے رخسار میں ناسور ہوا۔ آپریشن کے لئے سارا خاندان بون مروان فوجی ہسپتال گیا۔ نوشہرے سے ایک بی بی روزانہ خط لکھتیں۔ چونکہ بات تانگے پر بیٹھ کر روزانہ آت کو دیا بار مروان جاتا اور خط دے کر آتا۔ ان بی بی کے خطوط نصیحت آمیز اور فارسی اشعار سے پر ہوتے تھے۔ جواب جلد نہ دینے کی شکایت کا ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

رنجیدۂ رنجیدۂ از من گناہ چہ دیدۂ
دانم گناہ بخشیدۂ از من چرا رنجیدۂ

شعر و شاعری ہو رہی تھی۔ مولانا سید محمد مرتضیٰ ادیب نے بنت نذر الباقر کا ایک ابتدائی شعر کہیں درج کیا ہے ؎

حسنِ صورت چند روزہ حسنِ سیرت مستقل
اُس سے خوش ہوتی ہیں آنکھیں اس سے خوش ہوتا ہے دل

ایک بی بی ثروت آرا یعنی ثروبی کو لکھتی ہیں "تم نے جو شعر زہرا خانم کے لئے بنایا۔ اس سے میں بہت خوش ہوئی کہ خدا نے خوب موزوں طبیعت دی ہے۔ شعر بنانے کی تعریف زہرا خانم کریں گی کہ بڑی شاعرہ ہے۔ تمہاری باجی تو مضمون نویسی پر مائل ہوگئی ہیں اور تم شعر پر۔ چہرہ درخشاں اور حسن دقت بمبئی جاؤگی موٹر کار پر۔ تو آپ کی قدر شاعری پر ہوگی اور باجی کی قدر مضمون نویسی پر۔"

خاتون آگیا۔ سب مضمون میں کچھ آپ کا مضمون مجھ کو پسند آیا۔ باتیں مفید مطلب ہیں۔ "جب بچے کو بخار ہے تو آپریشن کیوں کرایا جا رہا ہے۔"

خط کیا ہے ٹیلیفون پر بات کی جا رہی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں سہیلیوں سے گھنٹوں اسی قسم کی گفتگو فون پر کرتی ہیں۔

انہی دنوں ننھی بی یعنی مس نذر الباقر کے ایک مضمون کا ترجمہ ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے ہفتہ وار رسالے میں کہ اب السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کہلاتا ہے شائع کیا گیا۔ اس پر مہارانی بڑودہ نے سونے کا تمغہ عنایت کیا۔

علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال نے (جو مسلم نشاۃ ثانیہ کی ایک عظیم قائد تھیں اور اب کیمبرج فراموش کی جا چکی ہیں) بنتِ نذر الباقر کو اپنا سکریٹری بنانے کی خواہش کی۔ میر نذر الباقر نے منظور نہیں فرمایا۔

۱۹۰۹ء میں مولوی سید ممتاز علی نے بچوں کا ہفتہ وار اخبار "پھول" جاری کر کے بنت نذر الباقر کو اس کا اعزازی مدیرہ مقرر کیا۔ اخبار نوشہرے میں ایڈٹ ہو کر دار الاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مس نذر الباقر نے

---

[1] زہرا فیضی۔

[2] مولانا حالی نے اپنی عہد آفرین نظم "چپ کی داد" میں فرمایا تھا ؎

گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا | پر حل ہر اک مشکل یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
جو حق کے جانب دار ہیں بس ان کے بیڑے پار ہیں | بھونچال کی جانب سے ہاتف کی یہ آواز آئی ہے
ہے جو مہم درپیش دستِ غیب ہے اس میں نہاں | تائیدِ حق کا ہے نشاں امدادِ سلطانِ جہاں

بچوں کے لئے باتصویر کتابیں "سلیم کی کہانی" "پھولوں کا ہار" "دکھ بھری کہانی" "سچی رضیہ اور اس کی بکری" وغیرہ لکھیں اور پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے ان کتابوں کو اسکولوں کے اردو نصاب میں شامل کیا۔

"پھول"[1] اور دارالاشاعت پنجاب نے بچوں کے لئے اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کیا۔ محمدی بیگم مرحومہ کی "امتیاز تختیں" "امتیاز تیسیں" اور حسن نذر الباقر کی "سلیم کی کہانی" اور "پھولوں کا ہار" وغیرہ گھر گھر پڑھی جاتی تھیں۔ یہ ساری کتابیں اب نایاب ہیں۔

مصنفہ کا پہلا اور مقبول ترین ناول "اختر النساء بیگم" دارالاشاعت پنجاب لاہور نے ۱۹۱۱ء میں شائع کیا۔ "آہ مظلوماں" بھی شاید اسی سال چھپا۔[2] اس وقت اردو کے اکابر علامہ راشد الخیری، ڈاکٹر اقبال، شیخ عبدالقادر، سجاد حیدر یلدرم اور بنت نذر الباقر سمجھے جا رہے تھے۔[2]

لیکن ایک مخلص نقاد یعنی مصنفہ کے چچا سید ظہور حسنین نے فرمایا:۔

کابون ہسپتال، الہ آباد

۱۰ اپریل ۱۹۱۱ء

پیاری بی بی

تیرا خط ملا۔ بچوں کی طرف سے سخت فکر ہے۔ اوس لاٹ صاحب کی بچی سے کہدے کہ بس اب اچھی ہو جائے۔ بہت لاٹ صاحب کی بچی تو بنے۔

تو نے اپنی کتابوں کے متعلق پوچھا ہے۔ تو سُن "آہ مظلوماں" کی زبان میں پنجابیت بہت سرایت کئے ہوئے ہے اور "اختر النساء بیگم" بھی اس سے پاک نہیں ہے۔ اختر النساء کا پلاٹ ابھی موجودہ ہندوستان کے قابل نہیں ہے بعض بعض جگہ صاحبیت بہت بڑھی ہوئی ہے۔ بہرحال دونوں کتابیں اچھی ہیں اور میں تیری محنت کی داد دیتا ہوں۔

میں خدا کے شکر سے اچھا ہوں مگر ابھی اسپتال سے نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

والدعا

تیرا چچا ظہور

۱۹۰۸ء میں حیدرآباد دکن کی موسیٰ ندی میں قیامت خیز طغیانی ہوئی۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا، سروجنی نائیڈو، لیڈی اکبر حیدری

---

[1] "پھول" ایک ادیب ساز اخبار تھا۔ متعدد نامور ادیبوں نے بچپن میں اسی میں لکھنا شروع کیا۔ بعد کے دور میں امتیاز علی تاج، چراغ حسن حسرت، غلام عباس، حفیظ جالندھری اور احمد ندیم قاسمی اس کے مدیر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد پھول اور تہذیب دونوں بند ہو گئے۔ (ق۔ح)

[2] "دی حیدرز" از خلیل عزیزی۔ السٹریٹڈ ویکلی آف پاکستان ۸ اکتوبر ۱۹۵۱ء یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ مصنفہ نے شروع سے آخر تک اپنی کسی کتاب کا معاوضہ یا رائلٹی نہیں لی جو ایک انتہائی حماقت کی بات تھی۔ (ق۔ح)

اور نواب عماد الملک کی بہو مسز طیبہ خدیو جنگ نے حیدر آباد میں ریلیف کا کام شروع کیا۔ سارے ہندوستان میں چندہ جمع کیا گیا پنجاب سرحد کے لئے مس ندا لباقر منتخب ہوئیں۔ موصوفہ سر سید میموریل فنڈ اور مسلم یونیورسٹی فنڈ کے لئے صوبہ جات پنجاب و سرحد کی پراونشل سکریٹری بھی تھیں۔

اس سلسلے میں سید ظہور حسنین نے لکھا:

مراد آباد

۴ رفروری ۱۹۰۹ء

بی بی تمہارے سر سید میموریل فنڈ کے کاغذات تو پہنچ گئے ہیں مگر مجھے اون کے دیکھنے کی ابھی مہلت نہیں ملی۔ بہر حال مجھے تیری خوشی منظور ہے۔ جو کچھ تو کہے گی۔ دیدوں گا۔ مگر کہہ دینا کس طریقے سے دوں اس لئے کہ وہ تو بڑا قصہ ہے۔ جیسا بتا دے۔ ویسا کروں۔ دوسرا پرچہ بند کا بند بڑی بھابی جان کو دے دو خبردار جو دیکھا۔

والدعا

ظہور

مزید دو خط:

بلگرام ہاؤس، حیدر آباد دکن

۱۱ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ

جناب بیگم صاحبہ تسلیم

آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ بی بی کی صحت ایک عرصے سے ناساز تھی۔ لیکن ایک مہینہ قبل بہت بگڑ گئی۔ اب تک پلنگ سے اترنے اور چلنے پھرنے کی اونہیں اجازت نہیں ملی ہے۔

مسلم یونیورسٹی فنڈ کتاب رسید نمبر ۹۱۹۹ھ جو آپ نے روانہ فرمائی تھی اوس میں سے جس قدر (؟) لئے گئے ہیں مذکورہ کے ملاحظہ سے معلوم ہو جائے گا۔

رقومات جو وصول ہوئیں:

بیگم صاحبہ نواب سر آسمان جاہ مرحوم	ایک ہزار
بیگم صاحبہ نواب ارسطو یار جنگ بہادر	ایک سو
بیگم صاحبہ خدیو جنگ بہادر	ایک سو

لے طیبہ بیگم (مسز خدیو جنگ) ہندوستان کی پہلی مسلمان گریجویٹ خاتون اور اس دور کی مشہور ناول نگار تھیں۔ ان کی اولاد میں نواب علی یاور جنگ سابق سفیر ہند در فرانس و ریاست ہائے متحدہ امریکہ و موجودہ گورنر مہاراشٹرا) اور معصومہ بیگم نے نام پایا۔

بیگم صاحبہ مولوی سید ہمایوں مرزا صاحب	ایک سو
بیگم صاحبہ مولوی اعجاز حسین صاحب وکیل گلبرگہ شریف	ایک سو
بیگم صاحبہ مولوی سید امیر حسن	پچیس
بیگم صاحبہ میرزا مہدی خان	پچیس
نادر النسا بیگم	پچیس
بیگم صاحبہ مولوی میر اصغر علی صاحب	دس
بیگم صاحبہ میرزا (؟) صاحب	دس
	۱۸۹۵

یہ جملہ رقوم بذریعہ بنک آف بنگال شاخ آگرہ کو یونیورسٹی فنڈ میں روانہ کر دی گئیں ۔

بہت کچھ رقوم کا وعدہ ہوا ہے لیکن بوجہ طاعون بالفعل وصول ہونا ناممکن ہے ۔ بہرحال چونکہ آپ کو کتاب اور حسابات کی تعجیل ہے ۔ لہٰذا کتاب بذریعہ رجسٹری روانہ کی جا رہی ہے ۔ بنک کے اصل رسائد میں نے اپنے پاس رکھے ہیں ۔ لیکن آپ کو اگر ان کی ضرورت ہو تو روانہ کر دوں گا ۔ زیادہ کیا تکلیف دوں ۔

خاکسار
خدیو جنگ

حیدر آباد دکن
۲۸ اگست ۱۹۱۱ء

جناب ہمشیرہ صاحبہ معظمہ و مکرمہ

تسلیم ۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت اب بفضلہ بہتر ہے اور دورے پڑ گئے ہیں ۔ میں نے چندے کی فہرست آپ کی خدمت میں ارسال کر دی ۔ مگر ابھی بہت سا اس میں سے وصول ہونا باقی ہے ۔ یہاں آسانی سے روپیہ جمع نہیں ہو سکتا ۔ میں تو حتی الامکان کوشش کر رہی ہوں ۔ روپیہ جو میں نے بھیجا ہے وہ بانک میں علی گڑھ کے نام بھیج دیا ۔ اس کی رسید بھی باقاعدہ آگئی ۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ نو برس آگئے ہیں نے ایک اسوسیاشن قائم کیا تھا اور چندہ جمع کر کے علی گڑھ بھیجا تھا ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ون روپی فنڈ قائم ہوا تھا اور میں نے کہا تھا کہ اگر سو بیبیاں ممبر ہوں گی تو سوا روپیہ مہینہ ہوا ۔ اس طرح سے اگر ہندوستان کے کل شہروں سے سو سو روپیہ بھیجا جائے تو کتنے سو ہو جائے گا ۔ اس مہینے میں مسز امیر حسن صاحبہ نے ۲۵ روپیہ دیا ، اور مسز حاکم الدولہ صاحبہ نے سو روپیہ کا وعدہ فرمایا اور مسز سعد جنگ نے ۱۲۵ کا وعدہ فرمایا مگر ذی قعدہ کے قبل نہیں دیں گی ۔

تہذیب پہلے میرے پاس آتا تھا ۔ جب اس کی اڈیٹرس کا انتقال ہو گیا وہ بھی موقوف ہو گیا ۔ آپ اس کو میرے نام پر

جاری کرا دیجئے۔ ایڈیٹر بھرا دیجئے گا جس میں آپ نے میری کاروائی چھپوائی ہے۔
آپ کا رسید کا پاکٹ مجھ کو ملا

خاکسار
حلیمہ بیگم

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا۔ اسلامیان ہند جن کا سوز و ساز اسلامیان مشرق اوسط و شمالی افریقہ کے سوز و ساز سے از حد وابستہ تھا حسب معمول غم و غصے سے بیتاب ہوئے۔ طرابلس کے زخمیوں کے لئے چندے جمع کئے گئے۔ اقبال نے شاہی مسجد لاہور میں ہزاروں کے مجمع کے سامنے ؎

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

والی نظم پڑھی، تہلکہ مچ گیا۔ سامعین خون کے آنسو روئے۔ اس نظم کا ایک ایک شعر اسی وقت "نیلام" کر کے روپیہ طرابلس فنڈ میں بھیجا گیا۔ سال بھر بعد جنگ بلقان چھڑ گئی۔ بنت نذر الباقر اور دوسری جدید خواتین نے طرابلس اور بلقان کے لئے خوب خوب چندے جمع کئے۔ مرہم پٹی کا سامان اکٹھا کر کے ترکی بھیجا۔ بہت جوش و خروش اور ہنگامہ رہا۔

ان جدید خواتین میں بمبئی کے طیب جی خاندان کی لڑکیاں زیادہ خوش قسمت تھیں کہ بے پردہ گھومتی تھیں اور آئے دن انگلستان جاتی رہتی تھیں۔

نذرِ زہرا بیگم کی کھینچی ہوئی زہرا فیضی کی ایک تصویر میں نے دیکھی ہے (جو موصوفہ نے شادی کے بعد ایوانِ رفعت بمبئی میں کھینچی تھی) کہ جاپانی پنکھیا نزاکت سے سنبھالے۔ گاؤن میں ملبوس صوفے کے پاس کھڑی چھت کو تک رہی ہیں۔ عجیب افسانوی زمانہ تھا۔ وہی خاتون ۱۹۱۰ء میں نذر زہرا بیگم کو لکھتی ہیں:

بے راج باغ ۔ وارڈن روڈ
بمبئی ۔ ۱۲ ر دسمبر ۱۹۱۰ء

میری عزیز اور لائق بہن سلامت

تسلیم۔ آپ کا خیریت نامہ موصول ہوا۔ میری صحت نے دغا دیا اور اب تک روئے صحت پوری طرح ہویدا نہیں لیکن کچھ افاقہ ہے۔

ہزار شکر کہ آپ کی نسبت ایسے پڑھے لکھے نوجوان سے ہو گئی ہے اور اُن کی طبیعت اس قدر آزاد ہے۔ خدا آپ کو آئندہ زندگی میں مسرور رکھائے۔ آمین۔

الہ آباد اگر نمائش[۲] پر میں ڈرتی ہوں کہ نہ جا سکوں گی۔ کیونکہ اب تک علیل ہوں گو حضور نواب صاحب جنجیرہ میرے بہنوئی اور

---

[۱] نواب خدیو جنگ بہادر

[۲] بڑی دھوم دھام کی نمائش تھی۔ طیارے کی پرواز بھی دکھائی گئی تھی۔ لاہور سے شیخ عبدالقادر نمائش دیکھنے گئے۔

بھتیجا آصف[1] ۸ دسمبر کو الہ آباد رخصت ہو گئے۔ وہ لوگ ۱۵ دسمبر تک قیام کر کے بنارس چلیں گے۔ پھر لکھنؤ۔
امید ہے آپ کی ہمشیرہ خیریت سے ہیں۔ اور خالہ صاحبہ بھی۔ آپ کی شادی کی تاریخ سے جلد مطلع کیجئے۔

(تلخیص شدہ) آپ کی بہن زہرا

جن پڑھے لکھے نوجوان سے بنت نذر الباقر کی نسبت طے ہو رہی تھی وہ بھی بڑا قصہ تھا۔ سال بھر سے قبل شمس العلماء[2] مولوی سید ممتاز علی کے ذریعے پیغام آیا تھا۔ "لڑکے" کی جو تصویر قیام بغداد کے زمانے کی "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔ نانی اشرف جہاں کو دکھلائی گئی۔ اس وقت وہ ہنکارا بھر کے حسب معمول چُپ سادھے رہی تھیں۔ لیکن جب سلسلۂ جنبانی آگے بڑھا نانی دفعتاً دنیا میں واپس آ گئیں۔ لوگوں کی کھیتی کھانا القصہ۔ بیٹے اور بیٹی کی موت کا غم بھول نواسی کے جوڑوں کی ماہرانہ سلائی ٹکائی میں منہمک ہو گئیں۔

میر نذر الباقر مع خاندان نوشہرے سے تبدیل ہو کر سیالکوٹ اور پھر کوہاٹ چھاؤنی آ گئے۔ نانی نے ایک سے ایک حسین خوان پوش سی سی کر گھر بھر دیا مگر نگوڑا سلسلۂ جنبانی ختم ہونے ہی میں نہ آوے۔ ایک روز جھنجھلا کر انہوں نے اپنے داماد سے پوچھا "میرے لال۔ میرے چاند۔ دیوبندی مولوی کا کوئی خط آیا؟

میر نذر الباقر ساس کو جو اُن کی سگی خالہ بھی تھیں بہت چاہتے تھے اور اکثر انہیں چھیڑا کرتے تھے۔ ان کے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے مصنوعی سنجیدگی سے بولے۔ "خالہ جانی۔ دیوبندی مولوی یوں فرماتے ہیں کہ لڑکے کی دو شرطیں کڑی ہیں۔ اول یہ کہ نانی اشرف جہاں رُخصتی سے پہلے بغداد جاویں۔"

"اس بچے کے منہ میں شکر گھی۔ مجھ نہ بھاگی کو مولا جلد بلا دیں۔"

"مولا نہیں خالہ لڑکے کی شرط ہے کہ نانی پہلے بغداد جا کر بڑے پیر[3] کے مزار پر حاضری دیں۔ اس کے بعد۔"

نانی کا منہ اُتر گیا۔ چُپ رہیں۔ پان بنانا شروع کیا۔ پھر اچانک غصے سے بولیں۔ "میاں مجھ سے آنا کانی تو کرو نہیں میں جانوں بُرا چیتنے والوں نے بھانجی مار دی۔ میاں لونڈیوں کو دو حرفی پڑھانا تم نے سکھایا، کافر کُرتی انھیں پہنائی۔ ڈاکٹری پڑھنے تم بھیجے دو تھے۔ باجی بیگم کا خط آیا ہے کہ تمہارے دشمن دوبارہ چھائیں پھوٹیں یوں طوفان جوڑتے ہیں کہ سید نذر الباقر کی بیٹیاں کلب گھر جا کر گوروں کے ساتھ بڑا کھانا[4] کھاویں ہیں۔ اللہ بُری گھڑی سے بچاوے۔"

میر صاحب بھی ذرا متفکر نظر آ رہے تھے۔ مگر ساس کا دل رکھنے کے لئے بیٹھے ہنسا کیے۔

"بیٹا ایک سے ایک اچھے پیغام آئے تم نے رد کئے۔ باجی بیگم کا نواسہ اللہ رکھے کیا بُرا تھا۔ تم باپ بیٹیاں ہی اکبری

---

[1] آصف اے۔ اے۔ فیضی نامور عالم اسلامیات و سابق سفیر ہند برائے مصر۔ بمبئی میں رہتے ہیں۔
[2] شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی دیوبند کے رہنے والے تھے۔
[3] اہل تشیع سید عبدالقادر جیلانیؒ سے عقیدت نہیں رکھتے۔
[4] انگریزوں کا "گرینڈ ڈنر"

سب کے سب ہنس ہنس کر باؤلے ہوگئے۔ اسے میں پوچھوں ہوں اُس میں خامی کیا تھی۔ ڈیوڑھی پر ہاتھی۔ اندر باہر نوکروں اصیلوں کی پیٹن۔ کہنے لگے گھر میں خرگیری بھرتی ہے۔ پوچھو اس گئے گزرے وقت میں بھی ان کے ہاں حبشی حبشنیں ملازم ہیں۔ کہنے لگے لکھنو کا چھیلا ہے۔ لمبے لمبے پٹے رکھے ہے۔ انگریز فیل ہے۔ مرغ لڑاتا ہے۔ اے اللہ کا فضل ہے۔ مرغے لڑا دے ہے۔ رئیس زادہ ہے اور کیا کرے۔ سگا رشتے دار۔ دیکھا بھالا۔ چلو خیر۔ پھر وہ آگرے شاہ گنج والے آل نبیؐ بالسٹر کا رقعہ آیا۔ بیلے والے وزیر خلیفہ کا رقعہ آیا۔ وزیروں کا خاندان امیر کبیر۔ مگر میاں تم تو اس سُنّی لڑکے پر لٹو ہوگئے۔ کہنے لگے "منشوری گھرے سید ہیں۔" ہوں گے۔ بہت قابل ہے۔ بہت اچھے افسانے لکھے ہے۔ بیٹا ہمارے ہاں تو افسانے دکھیا اللہ بخشے آغا کر بلائی سنایا کریں تھے۔ اب لاڈو بھی افسانے لکھ رہی ہیں۔ بھینا بھی اللہ مارے ناول لکھ لکھ کر گھر بھر رہی ہیں۔ ہماری تو مجال تھی کہ چہاردہ معصومینؑ کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا ہو۔ خیر وہ بھی ہوا مگر اب ان دیوبندی مولوی صاحب نے جو اشتعلہ چھوڑا ہے بس اللہ ہی خیر کرے۔ تم تو میاں بیٹھے ان عالم فاضل صاحبزادے کے افسانے ہی پڑھتے رہنا۔

اشرف جہاں بیگم پر اب جلال آ چکا تھا۔ وہ پلنگ سے اُٹھ کر گئیں سیدھی نماز کے تخت پر مصلّے پر بیٹھ کر بڑبڑاتے ہوئے فی الفور اللہ میاں سے لَو لگائی۔

اللہ میاں شاید اشرف جہاں بیگم کی ٹکسالی گفتگو خوب سمجھتے تھے۔ ان عفیفہ ضعیفہ نے نہ جانے کون سا وظیفہ پھینکا کہ چند منٹ کے اندر غلام حسین کمرے میں وارد۔ ہاتھ میں ڈاک کا پلندہ۔ میر صاحب جو ساس کی پلنگڑی پر گاؤ تکئے کے سہارے نیم دراز تھے فوراً اُٹھ بیٹھے۔ ڈاک غلام حسین کے ہاتھ سے لی۔ "دیوبندی مولوی" کا لفافہ مع "لڑکے" کے تازہ ترین خط کے موجود' جو مولوی صاحب نے میر صاحب کے نام لاہور سے ری ڈائرکٹ کیا تھا۔

لیکن مولوی سید ممتاز علی اور جدید فیشن کے صاحبزادے بلند اقبال کی خط و کتابت از اوّل تا آخر بہت دلچسپ ہے۔ ناظرین اس کا مطالعہ فرماویں تو ہرگز کوئی مضائقہ نہ ہوگا بلکہ فائدہ ہوگا۔

باب ۷

مناظرہ مابین مولینا و مسٹر

یلدرم بنام شمس العلما مولوی سید ممتاز علی صاحب

دہرہ دون

۱۴ اپریل ۱۹۰۹ء

مکرمی و معظمی!

آداب عرض ہے۔ میں اولڈ بوائز ڈنر میں شریک ہونے کی غرض سے علی گڈھ گیا تھا۔ آج صبح یہاں واپس پہنچا اور آپ کا خط اس ڈاک میں پایا جو یہاں جمع ہو رہی تھی۔ حسب وعدہ مفصل عریضہ تقدیم کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے اضلاع جن میں آپ کا وطن سہارن پور بھی شامل ہے کس قدر قدامت پرست ہیں۔ میرا قصبہ اس

معاملے میں اپنے ہمعصر تعصبوں سے بڑھا ہوا ہی ہے ۔ گھٹا نہیں ۔ اور اگرچہ میرا خاندان PROGRESSIVE CONSERVATION کا مدعی ہے مگر افسوس کہ اس وقت تک REACTIONARY CONSERVATION کا پابند ہے ۔ قسمت نے مجھے جو اپنے خیالات میں ریڈیکل ہے ایسے ماحول میں پیدا کیا جہاں میں جیسی لڑکی چاہتا تھا اس کا ملنا عسیر الحصول ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ناممکن الحصول ہے ۔ چنانچہ جب میں نے کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں شادی کا نہیں ہے تو میں نے اپنے مرحوم والد اور مرحومہ والدہ کی نافرمانی کی (اور افسوس ہے کہ) ان کو رنج دیا لیکن اپنی ضد پر قائم رہا ۔

جب سے میں قسطنطنیہ سے واپس آیا ہوں اہل خاندان کی مجھ پر از سر نو یورش ہے ۔ لیکن میں جس لیاقت کا طالب ہوں جو جگہ آپ نے تجویز فرمائی ہے ۔ (آپ کے فرمانے کے مطابق) وہاں موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اس تجویز سے موافقت رکھتا ہوں لیکن غیر جگہ میں صورت و شکل اور مزاج اور طبیعت کا حال ہمیشہ SECOND HAND ملتا ہے ۔ مجھے خوف ہے کہ یہ THIRD HAND نہ ہو ۔

علاوہ ازیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ سید حامد حسین[1] صاحب وزیر اعظم پٹیالہ نے بھی اس جگہ اپنے لئے پیغام بھجوایا ہے ۔

میں اپنے ذاتی حالات عرض کئے دیتا ہوں —

۱ ۔ میری عمر اس وقت تیس سال ہے ۔

۲ ۔ ہم چار بھائی ہیں اور ایک بہن ۔ مجھ سے بڑے بھائی سید اعجاز حیدر متاہل ہیں ۔ اور صاحب اولاد ۔ وہ میرے سوشل خیالات کے مخالف ہیں ۔ انہوں نے انٹرنس تک تعلیم پائی ہے ۔ مجھ سے چھوٹے بھائی سید نصیر الدین حیدر بی ۔ اے بارہ بنکی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں ۔ ۲۸ برس کی عمر ہے ۔ وہ میرے خیالات کے ایک حد تک موافق ہیں لیکن پردے کے مؤید ۔ نصیر الدین حیدر سے چھوٹے بھائی سید وحید الدین حیدر میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتے ہیں ۔ ان کی عمر ۲۴ برس ہے ۔ یہ متاہل ہیں ۔ خیالات میں زیادہ لبرل ہیں ۔

۳ ۔ میری ملازمت پانچ برس کی ہے ۔ ترقی کی بہت امید ہے ۔ ہم بھائیوں کو ترکے میں ایک بڑا مکان ملا ہے ۔ اور کچھ آبائی اراضی ۔ میرے والد خان بہادر سید جلال الدین حیدر کوتوال بنارس تھے اور بعد میں سپرنٹنڈنٹ پولس رہے ۔ انہوں نے بیحد

---

[1] خلیفہ سید حامد حسین کے والد مشیر الدولہ ممتاز الملک خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاریؒ کی نسل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو سامانہ پٹیالہ میں آباد ہو گئی تھی ۔ اس خاندان کے بزرگ مہاراجگان پٹیالہ کے طبیب اور اتالیق رہے تھے ۔ اس وجہ سے خلیفہ کہلاتے تھے ۔ خلیفہ محمد حسین کے بڑے بھائی وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ محمد حسن مصنف "اعجاز التنزیل" و مترجم سیاحت نامہ ڈاکٹر برنیر سر سیدؒ کے دست راست اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۵ء منعقدہ علی گڑھ کے صدر رہ چکے تھے ۔ ان دونوں روشن خیال شیعہ بھائیوں نے علی گڑھ کالج میں شیعہ اور سنی مساجد الگ الگ بنانے کی شدید مخالفت کی تھی ۔ مئی ۱۹۰۸ء میں خلیفہ محمد حسین کے انتقال پر "مخزن" میں ایک دلچسپ مرثیہ شائع ہوا جس کے شروع میں لکھا تھا ۔ حضور وائسرائے و جملہ حکام و رئیسوں کے چہیتے تھے ۔ مدبر ہند سمجھے جاتے تھے ۔ بسمارک یا ابوالفضل فیضی تھے ، وہ اپنے وقت کے گویا نظام الملک طوسی تھے ۔

ایمانداری سے کام کیا اور سوائے اس کے کہ اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دلائیں اتنا پس انداز نہ کیا کہ خود جائیداد بناتے۔ میرے بڑے چچا خان بہادر سید کرار حیدر اسسٹنٹ سرجن تھے۔ ۴۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ پھوپھا خان بہادر سید صغیر حسین ڈپٹی کلکٹر اور ماموں خان بہادر سید ابو الحسن ڈپٹی کلکٹر بہت بڑی زمینداریوں کے مالک ہیں۔ دوسرے عزیزوں کے عہدوں زمینداریوں وغیرہ کے متعلق مزید تفصیلات اگر آپ چاہیں تو بھیج دوں گا گو میں اس کی مطلق ضرورت نہیں سمجھتا۔

۵۔ صحت میری بہت اچھی نہیں۔ اور اسپورٹس وغیرہ کی طرف میں نے کبھی توجہ نہیں کی۔ میرا وقت میز پہ اکثر گذرتا ہے۔

آپ یہاں تشریف لانا چاہتے ہیں۔ اس کا مجھے شکریہ ادا کرنا ہے۔ لیکن آپ کیوں اس قدر دور دراز کے سفر کی تکلیف گوارا فرماتے ہیں۔ میں آپ کے خطوط کے جواب جلد جلد دے رہا ہوں۔ بہرحال اگر آپ تشریف لانا چاہتے ہیں تو سیدھے دہرہ دون تشریف لائیے۔ میں ۲۸، ۲۹ تک تو یہاں یقینی ہوں۔ اس کے بعد معلوم نہیں۔ غالباً دورے پر چلا جاؤں۔ مگر دورے پر بھی آپ آسانی سے مجھ سے مل سکیں گے کیونکہ میں جہاں ہوں گا وہاں کے قریب کے اسٹیشن پر آپ اتریں۔ میں سواری ہاتھی وغیرہ کا انتظام کر دوں گا۔ اور آپ کیمپ میں تشریف لے آئیں۔

آخر میں پھر بصراحت عرض کئے دیتا ہوں کہ میں آپ کی اس تجویز کو بحالت موجودہ منظور کرتا ہوں۔

خاکسار

سید سجاد حیدر

دہرہ دون

۲۲/ اپریل سنہ

مکرمی!

آداب عرض ہے۔ پرسوں مجھے آپ کا دوسرا خط ملا۔ اور حسب الامر میں نے تین خط میر نذر الباقر صاحب، میر فیض العسکری صاحب اور میر ظہور الحسنین صاحب کے نام لکھے۔ گو آپ نے فرمایا تھا کہ اپنے سنی ہونے کا ذکر نہ کرتا۔ مگر میں نے لکھ دیا ہے کہ گو میں سنی ہوں مگر ہمارے خاندان میں شیعہ سنیوں میں آپس میں رشتے ہوتے ہیں۔ کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ میرے بہت سے عزیز شیعہ ہیں۔ علاوہ ازیں میرے خاندان کا سنی ہونا چھپ تو سکتا نہیں۔ ہر شخص کو معلوم ہے۔ رہا خود میں سو میں اپنے ذاتی خیالات سے نہ سنی ہوں نہ شیعہ۔ کیونکہ خلافت کے معاملے کو محض ایک ACADEMIC INTEREST. کی چیز سمجھتا ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں (برخلاف جمہور اہل سنت) کہ حضرت عثمان رض کی خلافت اسلام کے لئے مفید نہ تھی۔ اور ان کا انتخاب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ساتھ ہی میں حضرت عمر رض کا شدت سے مداح ہوں۔ بحیثیت ایک سید کے میرا دل ضرور یہ چاہتا ہے کہ حضرت علی خلیفہ ہوتے اور ہمیشہ خلافت سیدوں ہی کو ملتی۔

نذر الباقر صاحب اس قدر لبرل ہیں کہ وہ اس مہمل اور بے معنی بات کو کہ ہر شخص کو مذہب کے بارے میں CATECHISE کرتے پھریں بالکل ناپسند کرتے ہیں۔

مذہب کے بارے میں (با ہمارے آجکل کے مخالفین کی اصطلاح میں) یوں ہی سمجھ لیجیے کہ پکا نیچری ہوں۔ آگے چل کر قبر پرست

یا پیرپرست بن جاؤں تو خیر نہیں۔
ایک مذہب رواجی ہوتا ہے اور ایک مذہب و عقیدہ قلبی۔ میں دشمنانِ اہلبیت کو دشمنانِ اسلام سمجھتا ہوں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک شخص جسے آلِ رسولؐ ہاشمی ہونے کا فخر حاصل ہو اس سلسلے میں کوئی دوسرا عقیدہ کیسے رکھ سکتا ہے۔

اوپر کے جملوں کو پڑھ کر خود مجھے ہنسی آتی ہے۔ معاملہ تو شادی کا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ دیکھا جائے کہ میری طبیعت مس باقر کی طبیعت سے میل کھا سکے گی یا نہیں۔ اور بجائے اس کے کہ یہ تحقیقات کی جائے کہ مس باقر مجھ سے نفرت تو نہیں کرتیں۔ (الفت کا تو نام بھی لینا فضول ہے) بحث یہ کی جاتی ہے کہ تم حضرت علیؓ کو خلیفہ بلا فصل مانتے ہو یا نہیں۔

ان تمام باتوں کا خیال کر کے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کو اختیار کامل دے دوں۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

خاکسار
سجاد حیدر

لیکن اس اثنا میں یہ افواہ اڑ گئی کہ بنت نذر الباقر کی آنکھیں اتنی کمزور ہو گئی ہیں کہ اب وہ تقریباً نابینا ہیں۔
یلدرم نے مولوی ممتاز علی کو لکھا:

بل ویو۔ مسوری
۵ مئی ۱۹۰۹ء

مکرمی۔ آداب عرض ہے۔
سامی ناموں کا شکریہ! جس شخص کو میں قول دے چکا ہوں کہ اس کا نام ظاہر نہ کروں گا اس کا نام آپ کو کس طرح لکھ سکتا ہوں۔ شاید آپ خود اسے پسند نہ کریں گے۔ اس شخص نے خدانخواستہ اندھا ہونا تو نہیں لکھا تھا جو آپ فرماتے ہیں کہ بھلا اندھے بھی مضمون لکھا کرتے ہیں۔ معاف فرمائیے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی بات کی پچ ہے۔
میں اب مسوری آگیا ہوں۔ اکتوبر تک یہیں رہوں گا۔

خاکسار
سجاد حیدر

BLLEVUE
MUSSOORIE
27-5-09

مکرمی و معظمی
سامی نامے کا شکریہ عرض ہے اور دوسرے سامی نامے کا بھی جو ابھی ملا۔
آپ کی ناسازیٔ طبیعت کا حال سن کر تعلقِ خاطر ہے۔ رخصت اتفاقیہ کے لئے بھی مجھے دقتیں پیش آتی ہیں یعنی اگر پولیٹیکل ایجنٹ[1]

---

[1] میجر۔ ڈبلیو ڈذہم جو پہلے سردار محمد ایوب خاں کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے بعد میں سردار محمد یعقوب خان سابق امیر کابل کے انچارج بنائے گئے۔ یلدرم اس وقت اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔ امیر کابل کے انتقال کے بعد میجر ڈذہم ریاست جودھپور میں برطانوی ریذیڈنٹ مقرر ہوئے۔

صاحب یہاں ہوں تو میں جتنے دن کی چاہوں رخصت لے لوں۔ لیکن ان کی غیر حاضری میں میں کہیں نہیں جا سکتا۔ ایجنٹ صاحب آج کل ڈلہوزی گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے میرا یہاں سے ٹلنا دشوار ہے۔

آپ تبدیلِ آب و ہوا کے لئے ضرور ادھر فوراً تشریف لے آئیں۔ مکان سرکاری ہے۔ اور اس میں کافی جگہ ہے۔ اس تحریک دعوت میں میری خود غرضی بھی شامل ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ اس خط کے جواب میں مجھے آپ کی روانگی کا تار ملے۔

خاکسار سجاد حیدر

مسعدی
۲۳ رجون ۱۹۰۹ء

مخدومی و مکرمی۔ آداب عرض ہے۔ عنایت نامہ پرسوں شام کو پہنچا۔ میں اسی وقت جواب دینا چاہتا تھا مگر برادر وحید کی طبیعت پھر اس قدر ناساز ہو گئی ہے اور لکھنؤ سے (جہاں ڈاکٹر عبدالرحیم کے پاس اس کا علاج کرایا جا رہا ہے) ایسی متوحش خبریں آ رہی ہیں کہ میں سخت پریشانی میں ہوں اور کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑتا۔ خدا اسے صحت عاجل و کامل عطا فرمائے۔

اگر خدا کو یہ منظور ہے کہ میرا ان کا ساتھ ہو تو میرا ارادہ ہے کہ وہ پردے میں نہ رہیں[1]۔ اس وقت ہر شخص انھیں دیکھے گا۔ مگر ستم دیکھئے کہ مجھے اس وقت نوتوں کی طرف سے بھی ناامیدی ہے۔ اگر نذر الباقر صاحب کوہاٹ جائیں گے تو ظاہر ہے کہ گھر کے لوگ کچھ دنوں کے لئے مراد آباد آئیں گے۔ اس وقت میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی چچی اور بھابھی کو ان سے ملنے کے لیے بھیجوں۔ وحید کی بیوی بہت فہیم اور سنجیدہ مزاج ہیں۔ وہ بھی ساتھ ہوں گی۔

خاکسار

سجاد حیدر

دہرہ دون
۲۷ راگست ۱۹۰۹ء

مکرمی۔ گرامی ناموں کا شکریہ۔ ہز آنر لفٹیننٹ گورنر یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ تو اپنے کار منصبی کی وجہ سے مشغول رہا اور کچھ اس وجہ سے کہ مجھ پہ مفت کا کام پڑ گیا ہے کہ دہرہ دون میونسپلٹی کا ممبر ہوں[2]۔

آپ کے دونوں عنایت ناموں کا جواب عرض کرتا ہوں۔

میں اپنے تئیں کسی طرح بھی خلیفہ حامد حسین کے مقابلے میں قابلِ ترجیح نہیں پاتا۔ دولت میں عزت میں وہ مجھ سے بدرجہا بڑھ کر ہیں۔

---

[1] یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ۱۹۰۹ء میں آج سے پچھتر سال قبل جب مسلمان خواتین کی بے پردگی کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا یلدرم کی ترقی پسندی اور روشن دماغی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو بے پردہ اور بے نقاب رکھنا طے کر چکے تھے۔

[2] دہرہ دون میونسپلٹی میں پرنسپل امپریل فارسٹ کالج اور اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ برائے امیر کابل کو لفٹیننٹ گورنر یوپی کی طرف سے نامزد کیا جاتا تھا۔ (ق۔ ع)

وہ شاید پڑھنے لکھنے کا شوق مجھے زیادہ ہے انہیں اتنا نہیں۔

فوٹوگراف دکھلانے کا قاعدہ اب خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں جاری ہو چلا ہے۔ اسی وجہ سے میرا خیال تھا کہ آپ لوگوں کو تصویر دکھانے میں عذر نہ ہوگا۔

خاکسار

سجاد

رفاہ عام پریس

لاہور ۱۸ ستمبر ۰۹ء

مکرمی معظمی۔ آپ کا عنایت نامہ شدید انتظار میں ملا۔ میں اپنی لڑکی کو لے کر سیالکوٹ پہنچا۔ ہمشیرہ کو بھی بلوایا اور ہر روز کئی کئی بار پہروں تک دیکھا اور اس میں کوئی بات وہم و شبہے کی نہ رہنے دی۔ میری ہمشیرہ معظمہ بھی عزیزہ کو دیکھ کر بار بار اپنی حیرت ظاہر کرتی تھیں کہ ہمیں ان آنکھوں پر کوئی اعتراض کرتا تھا۔

زیادہ مشکل یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ کے دل میں شک ڈالا ہے کوئی ایک شخص خاص ہے جس نے عزیزہ کو کبھی نہیں دیکھا۔ آپ مخبر کا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے یقیناً مخبر کی ہدایت سے ہوا ہوگا۔

اب آپ کسی عورت کو بھیج دیں وہ ایک دن میں آپ کو مطمئن کر دے گی۔ عزیزہ وحید[1] میو ہاسپٹل میں ہی ہیں۔ وکٹوریہ ونگ میں مریضان چشم رکھے جاتے ہیں۔ وہاں یوروپین نرسز آنکھوں کے کام پر متعین ہیں۔ ان کو وحید ضرور جانتے ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو بھیج دیں۔ ان سے بہتر کون دیکھ سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا جو بھی شبہ ہوا ہیں اس کے دور کرنے اور پورا اطمینان دلانے کے لئے تیار ہوں۔ یوروپین نرس دیسی معمولی عورت۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی جسے بھیجیں اس کے لئے وہاں تک رسائی پیدا کر سکتا ہوں۔

چونکہ آپ نے مجھے اکتوبر اور مارچ دونوں وقت کا اختیار دے دیا تھا اس لئے میں نے اپنی طرف سے اکتوبر کا مہینہ مقرر کر دیا تھا۔ سید ظہور حسنین کو اطلاع دے دی تھی انھوں نے رخصت کی درخواست کر دی ہے۔ ایک دوست دوسرے دوست کو خبر کرنا چاہتا ہے۔ اب آپ براہ عنایت تار سے اطلاع دیں اور اپنے بڑے بھائی صاحب کو لکھ بھیجیں کہ میں نے اطمینان کر لیا ہے۔ آپ تاریخ مقرر کرائیں۔

سید ظہور حسنین الہ آباد سے آتے ہوئے میرے پاس ٹھہر کر سیالکوٹ جائیں گے۔

جواب کا منتظر اور نہایت مضطرب ——— ممتاز

رام باغ

۲۷ ستمبر ۱۹۰۹ء

مخدومی و مکرمی۔ آداب عرض ہے

مکرمت نامہ مسوری سے واپس ہو کر مجھے آج یہاں ملا۔ میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید میں دسمبر یا جنوری میں ملازمت سے

---

[1] وحیدہ بیگم (لیڈی محمد یعقوب مرحومہ)

[2] یلدرم کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید وحید الدین حیدر۔

استعفا دے کر ہندوستان ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں۔ اور میں سوچتا ہوں کہ اپنے مصائب میں کسی دوسرے کو کیوں شریک کروں۔

خاکسار

سجاد

مولوی ممتاز علی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ سمجھ گئے کہ صاحبزادے بدک گئے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ایک اور ٹکنیک استعمال کی اگلے خط میں لکھتے ہیں کہ ہمدرد، ہمدم، رفیقۂ حیات انسان کے لئے کتنی ضروری ہے۔ فرماتے ہیں۔

"میں ۱۸۹۲ء میں سخت بیمار ہوا اور موت کے کنارے جا لگا۔ میرے والد ماجد بھی زندہ تھے۔ کئی بھائی بھی بہنیں بھی (پہلی) بیوی بھی تھی۔ آہ میں کس طرح اس رفیق کی شب بیداریاں اور خدمت گذاریاں بیان کروں۔ منہ سے آہ نکلی اور وہ بستر سے اٹھی کروٹ بدلی اور اس نے سوال کیا کہ کیا بے چینی ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھلانا پلانا۔ دوا دینا۔ میں سو دل تو نگہبان بن کر جاگنا۔ نماز پڑھ کر اللہ سے دعائیں مانگنا۔ ڈاکٹر کے لئے نوٹس لکھنا۔ چارٹس تیار کرنا۔ ایک بات ہو جو میں بتاؤں۔ میں مرض سے بچ گیا۔

"ٹامس آرنلڈ[1] کو آپ جانتے ہیں۔ میری ان سے بہت دوستی تھی۔ وہ ایک شام میرے پاس زیادہ دیر تک ٹھہرے۔ اور کھانے کے مقررہ وقت پر کچھ منٹ گذر گئے مجھ سے کہا کہ مسز آرنلڈ اب مجھے ڈانٹیں گی۔ آپ میرے ہمراہ چلئے۔ میں ہمراہ گیا۔ انہوں نے تمام واقعہ بیان کیا کہ انھیں مرض ٹیوبرکلوسس ہو گیا تھا مسز آرنلڈ نے کس طرح ان کی خدمت اور نرسنگ کر کے انھیں بچایا۔ مسز آرنلڈ نے مجھ سے کہا کہ میں ان کی بیوی ہی نہیں دوست بھی ہوں اور رفیق بھی۔"

(تلخیص شدہ)

خاکسار

ممتاز علی

---

[1] سر ٹامس آرنلڈ ایم اے او کالج میں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ اقبال کے اُستاد رہے۔ ۲۳ مئی ۱۹۰۲ء کو انھوں نے یلدرم کو جو سرٹیفکیٹ گورنمنٹ کالج لاہور سے بھیجا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یلدرم گو اسپورٹس سے بے نیاز تھے مگر شہسواری کیا کرتے تھے۔ سر ٹامس آرنلڈ، جو بعد میں انڈیا آفس لندن سے منسلک ہوئے، فرماتے ہیں " سجاد حیدر نے ۱۸۹۸ء سے تین سال تک مجھ سے انگریزی ادب پڑھا۔ اپنے معاصر طلبا میں سب سے زیادہ نامور اور غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ میرے کالج چھوڑنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں انہوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن ارباب کالج نے ان کے بارے میں مجھے جو اطلاعات بھیجیں ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوعمری کے زمانے میں ان سے جو امیدیں وابستہ کی گئی تھیں ان کو انہوں نے بخوبی پورا کیا ہے۔ ان کی اعلیٰ سیرت و کردار اور کالج کے پرنسپل کے ان پر اعتماد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھیں سنٹرل پروونسز کے ایک محمڈن راجہ کا اتالیق منتخب کیا گیا ہے۔ سجاد حیدر ایک تندرست و صحت مند نوجوان ہیں اور روزانہ باقاعدہ شہسواری کے عادی ہیں۔

ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ

پروفیسر آف فلاسفی

گورنمنٹ کالج لاہور

ناگپور کے ان "محمڈن راجہ" اعظم شاہ کا تذکرہ فصل سوم باب ۴ "بیچلرز لاج کی خاتون" میں کیا جا چکا ہے۔ (ق۔ ح)

مسوری
۱۰ راکتوبر ۰۹ء

مخدومی و کرمی

میں نے ANNFIELD TEA ESTATE سے جہاں میں گیا ہوا تھا آپ کو ایک خط لکھا تھا - اس کے دوسرے روز ہی آپ کا تار پہنچا میں ANNFIELD میں یکم اکتوبر تک رہا - ہز آنر لفٹیننٹ گورنر کو وہاں ایک پنچ دیا گیا تھا اور میری اس پنچ میں شرکت ضروری تھی - مجھے اطلاع ملی ہے کہ خان بہادر سید آل نبیؐ کے ساتھ رشتہ کر دیا جائے گا - اور یہ کہ محض آپ کے اصرار سے میری طرف خیال ہوا تھا - میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میرا ابھی یہی خیال ہے کہ میں خان بہادر صاحب کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہوں - وہ ماشاء اللہ خان بہادر - نامور وکیل معزز و محترم اور قبیلہ ! مجھ جیسے کس مپرس آدمی کے (مجھے یہ عرض کرنے میں شرم نہیں کہ غدر ۵۷ء کے بعد سے ہمارا خاندان مزدور دن یعنی نوکری کرنے والوں کا خاندان ہے) پاس کیا ہے -

دارم دلے اما چہ دل   صد گونہ حرماں در بغل

زیادہ زیادہ والسلام مع الاکرام

خاکسار
سجاد حیدر

رفاہ عام پریس لاہور
۲۴ راکتوبر ۰۹ء

مکرمی و معظمی تسلیم

میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میر نذر الباقر کے گھر پورا ہندوستانی پردہ ہے - اور سادات بارہہ کی بچیوں کی تصویریں کھینچنا اب تک معیوب سمجھا جاتا ہے - میر نذر الباقر لڑکیوں کی تصویر اتروانا ناجائز سمجھتے ہیں تصویر دینا تو جدا بات ہے - میں نے کبھی سنا تک نہیں کہ مس باقر یا ان کے گھر میں کسی لڑکی کا بھی فوٹو لیا گیا ہو - ہاں بعض اوقات ڈاکٹروں نے مثلاً ڈاکٹر بھگت رام سول سرجن کشمیر نے لڑکیوں کو بیماری میں دیکھا اور ان سے باتیں بھی کیں -

عزیزہ بنت نذر الباقر کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی - اور اس نے بہت شوق سے اخبار "تہذیب نسواں" خریدنا شروع کیا تھا - اس وقت سے میں اس عزیزہ کو اپنی حقیقی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتا رہا - اس بے چاری کا بڑا بھائی رضا باقر مر گیا تھا - وہ مجھے رضا باقر کی جگہ سمجھنے لگی - اس تعلق خاطر کی وجہ سے جو مجھے اس بچی سے ہے میں نے اس رشتے کی کوشش کی - اور اب کہ صرف تعین تاریخ کا فیصلہ ہونا باقی رہ گیا تھا آپ کی فرمائش فوٹو کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں - میں خود فوٹو کا قائل نہیں - بعض تصویریں خوب صورت معلوم ہوتی ہیں - صاحب تصویر بدصورت نکلتا ہے - مدت کی بات ہے میں نے مولوی چراغ علی صاحب حیدرآبادی کی تصویر دیکھی تھی اور ان کو خوب صورت نوجوان سمجھتا تھا - دیکھا تو شکل برعکس پائی -

اس اثنا میں لوگوں نے یہ بھی مشہور کر دیا ہے آپ کی اس سے نسبت طے ہو چکی ہے - عزیزہ کے پاس مسز اقبال[1]، مسز عبدالقادر[2]، مس محبوب عالم[3]

---

[1] علامہ اقبالؒ کی بیگم - [2] شیخ عبدالقادر ایڈیٹر "مخزن" کی بیگم یعنی لیڈی عبدالقادر مرحومہ - [3] فاطمہ بیگم بنتِ مولوی محبوب عالم ایڈیٹر "پیسہ اخبار" -

وغیرہ کی طرف سے مبارکباد پہنچی ہیں اور یہ چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ ان غلط فہمیوں کی بنا پر یہ نسبت ٹوٹ گئی تو میں میر صاحب کو منہ بھر منہ نہ دکھا سکوں گا۔ اور وہ میری ذلت و رسوائی ہوگی کہ خدا کسی کو نہ دے۔ میں اپنی پریشانی کی کوئی انتہا نہیں پاتا ہوں۔ اگر ضرورت ہو تو میں خود آپ کے پاس آؤں۔

جواب ذرا تار سے عنایت ہو۔

جواب کا منتظر اور نہایت مضطرب

ممتاز علی

میر ظہور حسنین بنام مولوی سید ممتاز علی صاحب

بدایوں

۲۹ اکتوبر ۵۸ء

مکرم بندہ۔ تسلیم

مسز ظفر عمر[۱] مجھ سے دریافت فرماتی تھیں کہ بنت نذر الباقر کی بصارت کی کیا کیفیت ہے۔ ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بات میں سجاد حیدر صاحب نے کچھ اُن سے استمداد چاہی ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے یہ فرمایا کہ میں اوسے مراد آباد بلواؤں تاکہ اُن کی گھر میں سے جا کر بچشم خود اطمینان کر لیں۔ میں نے صاف صاف لفظوں میں اُن کو لکھ دیا کہ آنکھوں میں کسی قسم کا نقص نہیں ہے۔ کمزور ضرور ہیں۔ اور وہ بچی مراد آباد نہیں آئے گی۔

میں نے ظفر عمر صاحب پر ظاہر کر دیا کہ حقیقتاً خاندان والے اس رشتے پر آمادہ نہ ہوتے اور خان بہادر سید آل نبی وکیل آگرہ کو ترجیح دیتے ہیں جو شیعہ مذہب ہیں اور اُن سے خاندانی تعلق ہے لیکن بھائی صاحب قبلہ میر نذر الباقر کو یہ رشتہ پسند ہے۔

آخر یہ کیا معنویت ہے کہ میں لڑکی کو مراد آباد بلا کر مسز ظفر عمر کو ملاحظہ کراؤں میں صرف آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ کل الہ آباد واپس جا رہا ہوں۔

آپ کا نیاز مند

ظہور حسنین

میر نذر الباقر بنام سید سجاد حیدر یلدرم

سیالکوٹ

۲۷ اکتوبر ۰۹ء

برادر گرامی قدر سلمہٗ، السلام علیکم

عرصے سے مجھے اتفاق تحریر خط نہیں ہوا۔ آپ کے محبت نامے کا جواب بھی نہ دے سکا۔ کچھ مکروہات زمانہ۔ کچھ مقام سے غیر حاضری۔ وغیرہ وغیرہ۔

۱۔ یلدرم کے دوست، مصنف "نیلی چھتری"، "بہرام کی گرفتاری" وغیرہ، مشہور جیگ اور پولیس افسر جنھوں نے سلطانہ ڈاکو کو گرفتار کیا تھا۔ مرحوم کے صاحبزادگان عمر سنز پاکستان کے مشہور انڈسٹریلسٹ ہیں۔

بالعموم زمانہ میں شرفا کی آبرو اور ناموس ایک ہی ہوتی ہے۔ خواہ وہ کسی رشتہ و قرابت سے منسلک ہوں یا کوئی تعلق مابین نہ ہو۔ مگر ایک زبردست تعلق شرافت، حفظِ ناموس و پاسِ آبرو کا رہتا ہے۔ میرا اور آپ کا خون ان بزرگوں کے خون سے پیوستہ ہے جن کی اولاد ہونا ہمیں سربلند کرتا ہے۔ میں نے مولوی ممتاز علی صاحب قبلہ کی خدمت میں تحریر کیا تھا کہ بقاعدہ قدیم آپ کی طرف سے کوئی بزرگ خاتون یا مرد تشریف لاویں اور اس رشتے کی تکمیل کر جاویں۔ جس کی غرض یہی ہوتی ہے کہ بہت سے شکوک رفع ہوں اور قبل از تعلق قرابت و یگانگت دونوں خاندانوں میں پیدا ہو جاوے۔ مگر مولوی ممتاز علی صاحب قبلہ نے بھی باستصواب آن برادر گرامی قدر ہمیشہ یہی لکھا اور اس پر مصر رہے کہ کسی بزرگ خاتون اور بزرگ خاندان کا اتنی دور آنا دشوار ہے۔ اور سید سجاد حیدر صاحب ان فضولیات کے پابند بھی نہیں ہیں۔ مولوی صاحب اس تحریک کے دوران سیالکوٹ تشریف لائے۔ ان کی صاحبزادی بندہ زادی سے ملنے آئی۔ اور محض بزرگانہ محبت اور مروت سے کسی طرح کا ہم لوگوں کو شک تک نہ آنے دیا کہ کیا غرض و غایت اس سفر کی ہے۔ اس کے بعد جیسا مولوی صاحب قبلہ نے فرمایا بسر و چشم منظور کر لیا۔ بعد طے ہونے اُن سب مراحل کے اب یہ کس قدر گرانبار خاطر ہے۔ چند معزز بے لگام خواتین نے لڑکی کی تصویر کے حصول کی کوششیں بھی کیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون شریف کلام مجید پر اعتقاد رکھنے والا ہوگا جو اپنی مستورات کی تصاویر کھنچوائے۔ العظمۃ للہ۔

میں امید کرتا ہوں کہ میری تحریر کی بے ربطی اور زبان کی بے ضبطی کا برا نہ مانیں گے۔ دل کو صدمہ پہنچا۔ عرض حال کر دیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا تحمل و بردباری اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ میری یہ شکستہ قلمی اور پریشان گوئی آپ کو رنجیدہ کرے۔

دعاگو

نذر الباقر

یلدرم بنام مولوی سید ممتاز علی صاحب

دہرہ دون۔

۲ جنوری ۱۹۱۰ء

مخدومی و مکرمی

میں ایک ہفتے کی رخصت لے کر دہلی اور میرٹھ گیا تھا۔ واپسی پر آپ کے عنایت نامے ملے۔ یہ محض غلط ہے کہ میں نے ظفر عمر سے کہا کہ مسز ظفر عمر جا کر بنت نذر الباقر کو دیکھیں۔ یہ تجویز علی گڑھ کے چند دوستوں کی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خلیفہ حامد حسین سے صرف اس بات پر ناراضگی ہوگئی کہ انہوں نے خفیہ طور پر ایک عورت کو دریافت حالات کے لئے بھیجا تھا۔

بہر حال۔ ملتجی ہوں کہ آنریبل[1] خان بہادر سید آل نبیؐ کی جانب سے جو سلسلہ چھیڑا گیا ہے وہ آگے بڑھایا جائے۔

خاکسار

سجاد حیدر

---

[1] آنریبل سید آل نبیؐ مرحوم وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے کراچی میں نامور سرجن ہیں۔

قصہ کوتاہ۔ پدرم اپنی ہٹ پر قائم رہے کہ تصویر دکھاؤ (واقعہ یہ تھا کہ بنت نذرالباقر غیر معمولی طور پر حسین و جمیل خاتون تھیں) اور ان کے بزرگوں نے یہ سند آخر تک پوری نہیں کی۔ لیکن صاحب نظر میر نذرالباقر پدرم کے غائبانہ طور پر اس قدر مداح تھے کہ انہوں نے آنریبل آل نبی امعتمد پر اعظم پٹیالہ خلیفہ حامد حسین دونوں کے پیغامات مسترد کر کے نوجوان ادیب کو اپنے ہاں سیالکوٹ مدعو کیا۔ اپنے دونوں بھائی اور قریبی عزیز آئے جو پدرم سے مل کر ان کے گرویدہ ہوئے۔ مگر اب صاحبزادے نے الٹی میٹم دے دیا کہ لڑکی شادی کے بعد پردہ نہیں کرے گی۔

آخر مصالحت اس پر ہوئی کہ لڑکی جدید طرز کا ترکی برقعہ اوڑھے گی۔ سب کی جان میں جان آئی۔ نانی اشرف جہاں نے فوراً جناب عباس کی نذر دلوائی۔

۱۹۱۱ء میں پدرم نے چھ ماہ کی رخصت لی اور حسبِ عادت قسطنطنیہ اور قاہرہ از جمہور ہو گئے۔ اپریل ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس لوٹے تو اپنے ساتھ ایک نہ دو جدید وضع کا ترکی برقعہ لائے۔ جس میں چہرہ کھلا رہتا تھا لیکن حسب ضرورت باریک نقاب ڈال لی جاتی تھی۔ یہ برقعہ انہوں نے دلی میں اپنے عزیز ترین دوست مشتاق احمد زاہدی کے پاس امانتاً رکھوا دیا۔

مئی ۱۹۱۲ء میں ایک روز مسوری سے زاہدی صاحب کے پاس تار آیا کہ برقعہ فوراً پارسل کر دو معلوم ہوا شادی بالآخر طے ہو گئی۔

باب ۸

دربار شاہ ولایتؒ

سارا قصبہ امروہہ ایک وسیع جھیل پر منعکس ہے۔ موسم بہار کی شفاف دھوپ میں قصبے کی قدیم مساجد، مقابر اور دو منزلہ مکانات کے گنبد، مینارے اور گلدستے نیگوں سطحِ آب پر مغل اسکول کے کسی خوش رنگ لینڈ اسکیپ کی مانند جھلکتے ہیں۔ جاڑوں کے کہرے اور گرما کے گرد و غبار میں جھیل کے اس پار سے شہر کا یہی منظر وکٹورین انڈیا کا ایک میلا لیتھو گراف معلوم ہوتا ہے جو کسی سنسان سرکٹ ہاؤس کے برآمدے میں آویزاں ہو۔

قصبے اور اس کے نواح میں پرانی عمارتوں کے علاوہ آج ۱۹۷۵ء میں ٹیوب لائٹ، لاؤڈ اسپیکر اور رنگ کاریوں سے مزین نئی مساجد کی افراط ہے۔ یہ مساجد نئی نویلی سفیدی سے پیلی پیلی دھوپ میں جگمگاتی آج کل یو۔پی کے گاؤں گاؤں اور شہر شہر نظر آ رہی ہیں اور مسلم اہلِ حرفہ اور سبز انقلاب ۱۹۶۰ء کے بعد سے مسلم کاشتکاروں کی نسبتاً خوشحالی کی مظہر ہیں۔ ان کے برعکس صوبے کے مسلم فیوڈل طبقے کا زوال ان کے کھنڈروں سے ہویدا ہے۔ ان میں سے چند ایک جو سمجھدار ہیں جدید آلات و مشین ہا کے ذریعے خود کاشت کر کے اپنی بگڑی حالت سنوار چکے ہیں۔ خصوصاً بریلی و رامپور میں انہوں نے نئی صنعتیں قائم کی ہیں۔ جنگلات کے ٹھیکے لیتے ہیں۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد ایک بار پھر دولت کی فراوانی ہے بلکہ پہلے سے زیادہ ہے تو از سرِ نو عیش و عشرت اور سیاست کے میدانوں میں کود پڑے ہیں جو مسلمان رئیسوں کے ہمیشہ سے محبوب مشاغل ہیں۔

لیکن امروہہ جو پہلے اپنے اہلِ علم و دانش کی وجہ سے مشہور تھا اب لوگ اسے چند نامور فلمی شخصیتوں کی وجہ سے جانتے ہیں۔

اسی طرح بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم خلد آشیانی کا نام اب کسی کو یاد نہیں۔ البتہ شرمیلا ٹیگور کہ بحیثیت عائشہ سلطان، موجودہ بیگم بھوپال کی بہو ہیں۔

جھیل کے پیش منظر میں وہ شاہراہ ہے جو دلی سے نکل کر نہٹور اور امروہے سے گذرتی مراد آباد جاتی ہے۔ اسی قدیم سڑک کے کنارے جو اب نیشنل ہائی وے ۲۴ ہے۔ سید شرف الدین نقوی شاہ ولایتؒ کی سفید درگاہ آم کے گھنے باغ میں پوشیدہ ہے۔ اندر احاطے میں معتقدین کی بھیڑ جمع رہتی ہے جو ۱۹۷۳ء کے مسائل کے حل کی امیدیں شاہ ولایتؒ کے ان شیدائی کراماتی بچھوؤں کو بڑے دھیان سے دیکھتے ہیں جو مجاور، نذرانے وصول کرنے کے بعد ایک چبوترے پر رینگنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ غالباً مولانا ابوالکلام آزاد نے کہیں ذکر کیا ہے کہ جب بخارا کی فصیلوں پر حملہ کر کے زارِ روس کی افواج فتحیاب ہو رہی تھیں امیر بخارا جامع مسجد میں ختم خواجگان کروانے میں مشغول تھے تاکہ اس کی کرامت سے روسی فی الفور واپس بھاگ جائیں۔

شاہ ولایتؒ کے مزار کے سرہانے ایک جالی دار مرمریں حجرہ ہے۔ اس کے اندر آسیب زدہ "لڑکیوں پر" حال" آتا ہے۔ تو وہ اپنے لمبے لمبے بال سنگِ موسیٰ کے فرش پر پٹکتی ہیں۔ حجرے کے سیاہ طاق میں پنجے کے سیندوری نشان کے سامنے گھی کا چراغ جلتا ہے۔ کیسا نشان ہے۔ اور چراغ کیوں جلتا ہے۔ اور موت و حیات کے اسرار کھوجنے والوں کو کون جانے گا۔

مزار کے پائنتی ایک سایہ دار برگد صدیوں سے اسی طرح کمزور عوامی عقائد کے گورکھ دھندوں اور باطنی احوال کی بھول بھلیوں کی پاسبانی کر رہا ہے اس بزرگ اور عاقل برگد کی پیچیدہ جڑوں کے نیچے بی بجّوؒ کی قبر ہے۔ بی بجّوؒ شاہ ولایتؒ کی صاحبزادی نے بادشاہ وقت کا پیغام نامنظور کر دیا تھا اور احوالِ باطنی کی بھول بھلیاں میں گم رہی تھیں۔ صبح سے شام تک ان پہنچی ہوئی بی بی کے مزار پر منت ماننے والی برقعہ پوش عورتوں کے سائے ڈولتے رہتے ہیں۔

سائے کے اوپر سائے۔

ہلاکو کے حملے سے تباہ شدہ بغداد کے ریفیوجی سید شرف الدین نقوی ہندوستان پہنچ کر ٹکے تو کہاں ٹکے۔ مغربی دوآبہ کے اس سرسبز گاؤں میں جس کے باغوں کے آم اور اس جھیل کی روہو مچھلیاں انھیں ازحد پسند آئیں۔ (امروہہ کی وجہ تسمیہ!) اُن علیہ الرحمتہ کی اولاد جہاں آباد ہوئی وہ دربار شاہ ولایتؒ اور عرف عام میں لکڑا محلہ کہلاتا ہے۔

لاکڑی والوں کی لکڑا محلہ والوں سے قرابت داریاں دیرینہ ہیں۔

۱۹۷۳ء۔ محلے سے متصل قبرستان میں کاسنی اور سفید خودرو پھولوں کی جھاڑیوں کے درمیان بکریاں چرتی ہیں۔ پگڈنڈی پر سے سائیکل رکشائیں آ رہی ہیں جن پر سوار بَل بوٹم پائجامے پہنے برقعہ پوش لڑکیاں کالجوں کی طرف رواں ہیں۔ گلیوں میں سفید پوش نقوی اپنی اعلیٰ نسبی اور عسرت کا بوجھ کاندھوں پر اٹھائے سر جھکائے شکستہ در و بام کے نیچے سے گذر رہے ہیں۔ زمین و آسمان زندہ رہتے رہتے تھک گئے۔

مئی ۱۹۱۲ء۔ سید ظہور حسنین رضوی مراد آبادی کچھ عرصے سے بغرض علاج امروہے میں فروکش ہیں۔ چند سال سے بیمار چلے آتے

ہیں۔ اس وقت دربار شاہ ولایتؒ کے ایک ڈھنڈار مکان میں ماندہ اور مضمحل پلنگ پر لیٹے نجانے کیا سوچتے ہیں۔ ہر انسان کا ذہن اس کا اپنا دربار شاہ ولایتؒ ہے جس کے اندر کراماتی عقرب رینگتے ہیں۔ فرشتے اترتے ہیں۔ اندھیرا چھاتا ہے۔ انوار کی بارش ہوتی ہے اور ہر انسان کے سر پر موت کے بوڑھے برگد کا سایہ ممتد ہے۔ جو کیا جانیے کس لمحے اس کی زندگی کو اپنی مہیب پیچیدہ جڑوں کے اندر کھینچ لے۔

اور ہر انسان کے دل میں ایک اندرونی محلسرا ہے جس کی ڈیوڑھی کے باہر دنیا کا شور و غوغا جاری رہتا ہے۔ لیکن اس محلسرا کے اندر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے ڈھنڈار بارونق وسیع تنگ صحن میں فکروں امیدوں خواہشوں مستقبل کے اندیشوں مسرتوں آلام ایقان شکوک خوف اور از سر نو امید کی ریل پیل رہتی ہے۔ فکر فردا۔ یاد ماضی۔ لیکن ماضی ہی کتنا لمبا چوڑا ہے عمر صرف انتالیس سال ابھی ساری زندگی سامنے پڑی ہے مرض تشویشناک اور تکلیف دہ۔ مگر ممکن ہے اللہ بچا لے۔

پلنگ کے سرہانے میز پر دواؤں کی شیشیاں۔ کتابیں۔ کامریڈ کے پرچے۔ لڑکے جو ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں کہ ان کے راستے دنیا میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ وہ سیالکوٹ والا ہم مکتب لنگوٹیا یار کشمیری نژاد پنجابی لڑکا اقبالؔ آج زمین آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ سن سن کر جی خوش ہوتا ہے۔ علی گڑھ کے ہم مکتب دونوں رام پوری بھائی لیڈری پر اتر آئے ہیں۔

لیکن اس وقت کامریڈ میں مولانا محمد علی کا تازہ ایڈیٹوریل پڑھنے کے بجائے میر ظہور حسین[2] ڈاکیے کے منتظر ہیں۔ علیگڈھ کے ساتھی سجاد حیدر نے بھی خوب نام پیدا کیا لیکن ان کا پیغام مناکحت جو لاڈلی بھتیجی کے لیے آیا اس کے شاخسانے بہت پریشان کن ہیں اس سلسلے میں اپنے محکمہ پولیس اور علی گڈھ کے ساتھی ظفر عمر سے بدایوں میں مچیٹا ہوا۔ لاہور میں مولوی ممتاز علی سے بحثا بحثی رہی۔ بڑے بھائی زیرک ہیں مگر مرنجاں مرنج میر ظہور حسین پولیس کے آدمی ہیں۔ اور بے حد دبنگ۔ مجال ہے کوئی بیجا بات کہے اور وہ اس کی طبیعت نہ صاف کر دیں۔ لیکن اس بیماری نے لاچار کر دیا۔

کروٹ بدل کر تازہ کامریڈ اٹھایا۔ پھر رکھ دیا۔ اخبار کے نیچے صحیفہ کاملہ[1] نظر آئی۔ ادب سے ہاتھ میں لی۔ اصل کامریڈ عابد بیمار امام زین العابدینؑ تھے۔ صدر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈاک کا وقت ہے۔ نجانے کوہاٹ سے بھائی جان قبلہ کا خط نذرو کے بیاہ کے فیصلے کے متعلق کیا آتا ہے۔

اگست سنہ ۱۹۱۳ء۔ شاہ ولایتؒ کی اولاد پروفیسر سید مختار حسین نقوی لکڑا محلے کے اندر اپنی آبائی حویلی میں رہتے ہیں۔ بصارت زائل ہو چکی ہے۔ ان کی بیوی بی بی منظور زہرا بیگم بنت سید ظہور حسین رضوی کی عمر بھی بیالیس[3] گذر گئے۔ دوسری بی بی سلطان آرا بیگم۔ رڈو رابرٹ کی پھوپی بہن کی پوتی ہیں۔

مکان کی ایک بغلی کوٹھڑی میں تاریخ سادات امروہہ کی پرانی جلدوں کے انبار میں سلطان آرا اصفہانی کی انگریز دادی کے بیٹے کا البم بھی کہیں پڑا ہے۔ فاتح افغانستان فیلڈ مارشل ارل رابرٹ کے اس خاندانی البم کی جلد پر سنہرے حروف میں لندن ۱۸۷۵ء منقش ہے

---

[1] امام زین العابدینؑ کی دعاؤں کا مجموعہ۔

امپیریل برطانیہ اور ادیکٹوریہ ایڈورڈ کے لندن کے اس خوش مرقع میں حسین وجمیل برطانوی امیرزادیوں اور امرا اور نواب مظفر جنگ اور پیرو سلطان کے انوف کی نایاب تصاویر اس عہد پر ریسرچ کرنے والے کسی برطانوی یا امریکن مورخ کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ مگر دو نیم ہندوستانی بیگم سلطان آرا زمانی کو لارڈ رابرٹ اور اپنی شادی[1] کے خاندان یا اس دور کے امپیریل برطانوی معاشرے سے رتی بھر دلچسپی نہیں۔ "اسے بھول گئے کوئی ہم سے مطلب؟"

البم میں ایک ایک انتہائی خوبرو وکٹورین حسینہ کی تصویر کے نیچے "قاہرہ" لکھا ہے۔ یہ سلطان آرا زمانی کی پھوپھی تھیں جنہوں نے کسی مصری پاشا سے شادی کی تھی۔ ان کا بھی کچھ پتہ نہیں کہاں گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف دھندلی تصویریں باقی رہ جاتی ہیں۔

سلطان آرا زمانی لکھنؤ کی وثیقہ دار بیگم ہیں اور امروہہ ان کی سسرال اور وطن ثانی ہے۔ اکثر شام کو چراغ جلے وہ پڑوس کے قبرستان جا کر منظور زہرا بیگم مرحومہ اور سید ظہور حسنین رضوی مرحوم کے مزاروں پر فاتحہ پڑھتی ہیں۔ نابینا شوہر کی دیکھ بھال، نانی پوتوں کے لاڈ پیار، جمعرات کی مجالس اور مہمانداری میں مشغول رہتی ہیں۔

مختار حسین خالو کی عمر اب ماشا اللہ اسی برس کی ہے۔ پنشن لینے سے قبل یو۔ پی کے مختلف گورنمنٹ کالجوں کے پرنسپل تھے اور فارسی کے استاد ہیں۔ پچھلے برس گرمیوں کی ایک سہ پہر جب باہر لو چل رہی تھی (اور نیچے گلی میں چند غم زدہ لڑکے مینا کماری کی ٹریجک موت کے متعلق کمال امروہی کے تازہ اخباری بیانات پر جوش و خروش سے تبصرہ کرتے ہوئے گذر رہے تھے) مختار ماموں نے مجھے بتایا۔ "۱۹۱۲ء کے موسم گرما کی ایک سہ پہر اسی گلی میں دفعتاً غل مچا کوئی انگریز آیا ہے۔ کورٹ صاحب کا مکان ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔" ہم سارے لڑکے بلبلے باہر بھاگے۔ پھاٹک پر ایک لمبا تڑنگا نوکیلی مونچھوں والا فوجی انگریز تانگے سے اتر رہا تھا۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا کورٹ صاحب کی ڈیوڑھی کی سمت چلا گیا۔

لڑکوں کا غول اس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ "صاحب" مردانے میں داخل ہوا۔ دالان میں سامنے ہی کورٹ صاحب بستر پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔" انگریز صاحب" لپک کر آگے بڑھا اور پلنگ پر جھک کر کورٹ صاحب سے لپٹ گیا۔

یہ نوبچا نذر آلباقر تھے جو نذر باجی کے رشتے کے متعلق اپنے چھوٹے بھائی ظہور حسنین سے صلاح مشورہ کرنے کوہاٹ سے آئے تھے۔

تین چار روز بعد میر نذر الباقر صوبہ سرحد روانہ ہوئے۔ چھوٹے بھائی جو قدیم تہذیب کے مطابق اپنے بڑے بھائیوں کے سامنے ہمیشہ سر جھکا کر بات کرتے تھے بڑے میر صاحب کو رخصت کرنے کے لیے بستر سے اٹھ بھی نہ سکے۔ بڑے بھائی رومال سے اپنے آنسو پونچھتے برادر خورد کو اللہ حافظ کہہ کر ڈیوڑھی سے باہر آئے۔ میر ظہور حسنین کا پلنگ صدر دروازے کے سامنے بچھا تھا وہاں سے گلی نظر آتی تھی۔ ان کے اکلوتے بیٹے گیارہ سالہ سید آل حسنین بڑے ابا کو اسٹیشن پہنچانے کے لیے تانگے پر بیٹھے۔ دیکھتے دیکھتے تانگہ دیا۔

---

[1] لکھنؤ اور کلکتے کے نواب سید احمد علی نے لندن میں جنرل رابرٹ کی حقیقی بہن سے شادی کی تھی۔ وہ کچھ عرصے ہندوستان آکر رہی تھیں۔ ان سے فرزند نواب یوسف سلطان آرا بیگم کے والد تھے۔

شاہ ولایت[۲] کی گلی سے نکل گیا۔

چند روز بعد کوہاٹ سے خط آیا۔ میر ظہور حسنین نے تکیے کے سہارے بیٹھ کر اس کا جواب لکھا۔

امروہہ
۹ جون ۱۹۱۲ء

جناب بھائی صاحب مخدوم و مکرم دام ظلکم۔ بعد آداب و تسلیمات دست بستہ کے عرض یہ ہے کہ میری علالت کے مدنظر اگر مذکر کی رخصتی کچھ دنوں کے لیے ملتوی ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو برائے مہربانی مجھے فوراً اطلاع دیجیے۔ آپ اپنی جان کو ہرگز تردد اور فکر میں نہ ڈالیں بہت طوالت ہوگی۔ وہ سامان جہیز لاد کر ٹھوڑ نہ مسہری لائیں۔ لڑکی کا اصل گھر مراد آباد ہے اور سامانِ جہیز اس کو یہاں سے دیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں فریقین کی آسانی ہے۔

بھابھی صاحبہ سے میری طرف سے دست بستہ عرض کر دیجئے کہ وہ جملہ سامان کی جو دنیا مقصود ہو ایک فہرست لکھ کر مجھے بھیج دیں۔ میں یہاں پڑا پڑا ہی انشاءاللہ جیسے ممکن ہوگا سب انتظام کر لوں گا۔ میں نہیں عرض کر سکتا کہ اس موقعے پر علیل ہونے، اور آپ کی خدمت نہ کر سکنے اور آپ کا ہاتھ نہ بٹا سکنے کا مجھ کو کس قدر صدمہ ہے۔ مگر مشیت ایزدی میں چارہ کار نہیں ہے۔ زیادہ حد ادب

خادم
ظہور حسنین

امروہہ شہر کا مٹیالا لیتھوگراف یک بخت زیادہ دھندلا ہو جاتا ہے۔

باب ۹

"دلِ انگلش رُخ ترکانہ داری!"

لو بیوی۔ یہ بھی سن لو۔ نمبوری سانچق کیا لائے ہیں۔ ایک عدد ترکی برقعہ۔ اور اللہ رکھے نوشہ میاں کی کتابوں کا سنہرا مجلد سیٹ۔ آگے آیت۔ ساڑھے چار عدد براق ــــ اللہ رکھے نوشہ کے بڑے بھائی۔

---

[۱] برادر بزرگ میر فیاض العسکری کی بیوی مرتضائی بیگم۔

[۲] سید اعجاز حیدر مرحوم۔

مشرقی ۔ ایک وہی دیوبندی مولوی صاحب اور ایک مولوی صاحب کا جھنڈا بچھ گیا

خاک پڑی اصلاح معاشرت نہ ہوئی عذاب جان ہوگئی تھوان جہیز سے دونوں لڑکیوں کی پیدائش کے وقت سے تیار کیے جا رہے تھے سب منقل کر کے الگ رکھ دیے گئے ۔ دلہن بیگم نے سفید چینیا سلک کا غرارہ پہنا ہے ۔ جاکٹ اور گلابی دوپٹہ ۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر چڑھی بیٹھی ہیں ۔

مثلاً پوچھوں ہوں مولوی مجتہد کیوں آئے ہیں ۔ کسی پریشین چمر پادری کو بلوا لیا ہوتا ۔

جہیز دکھانے کی بھی مناہی ہے ۔ اسے بی یوں بھی مرادآباد میں ہنسنے والے کہہ رہے ہیں میرزا لبا قرنے پردیس میں دنیا کی شادی بیاہ بطل میں مدنا چاکس نے دیکھا ۔

لیکن ایک بار پھر نانی اشرف جہاں بیگم نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ۔ جتنی دیر اندر باہر زنانہ مردانہ ڈنر ہوئے وہ مصلے پر بیٹھی دعا صدود میں مشغول رہیں ۔ اسی وقت دولہا کا نام آفتاب زنشہ تجویز کیا ۔

باہر لان پر لوگوں کا جم غفیر تھا ۔" اہل کوہاٹ پدرم کو دیکھنے کے بے چینی سے مشتاق تھے ۔ علاوہ ان لوگوں کے جو شادی کے کھانے پر مدعو کیے گئے تھے ۔ بہت سے لوگ بن بلائے آگئے ۔ جس وقت وہ لوگ پہنچے کھانا ہو رہا تھا ۔ وہ لوگ خاموشی سے باغیچے میں ٹہلتے رہے پاپا جانوں کی ترانش میں مصروف تھے ۔ اس لیے ان کی نظر اس مجمعے کی طرف نہ گئی ۔ جب کھانا ختم ہوا اور سب لوگ باغ میں آکر بیٹھے تو پاپا دیکھ کر حیران رہ گئے ۔ وہاں ساٹھ ستر صاحبان موجود تھے جن میں سے پاپا کسی کو پہچانتے بھی نہیں تھے ۔ ان میں سے ایک صاحب نے (جو پدرم کے زمانے کے علیگ اور بیرسٹر تھے) پدرم سے کہا ۔ زہے نصیب کہ آپ کوہاٹ تشریف لائے ۔ جس طرح آپ کو زیارت قاہرہ کی کشش مصر سے گئی تھی ہم کو زیارت پدرم کی کشش بنتوں اور ہنگو سے کوہاٹ لے آئی ۔"

" پھر ان نو وارد صاحبان کی قطار نے آگے بڑھ کر پدرم کو اپنے حلقے میں لے لیا ۔ اس وقت ذرا اندھیرا ہو چکا تھا ۔ اور ان لوگوں کو پدرم کی شکل اچھی طرح دکھائی نہ دے رہی تھی ۔ بیرسٹر صاحب نے قریب سے ایک گیس کی لالٹین اٹھا کر چہرے کے برابر کر دی مد بآواز بلند کہا " اے مشتاقانِ دیدارِ پدرم ۔ دیکھیے ۔ دل انگشس رخ ترکانہ داری !"

یہ سنتے ہی وہ سب ایک ایک کر کے سجاد صاحب کے سامنے آتے گئے اور زیارت کرتے گئے ۔ بیرسٹر صاحب جلدی لالٹین

سید برہان حیدر مرحوم ۔

شمس العلما مولوی سید ممتاز علی مرحوم ۔

سید امتیاز علی تاج مرحوم ۔

دیسی عیسائی مشنری جو چھکڑوں پر سوار گلی گلی گاؤں گاؤں گھوم کر تبلیغ کرتے پھرتے تھے اگلے وقتوں کے لوگ انھیں " چمر شین " (بروزن پریشین) چمر پادری " یا کالا پادری کہتے تھے ۔

سید سجاد حیدر پدرم " از نذر سجاد حیدر ۔ مطبوعہ غالباً ماہِ نو کراچی ۔

پدرم دو ماہ قبل ہی مصر سے واپس آئے تھے اور ان کا مضمون " زیارت قاہرہ " شائع ہو چکا تھا ۔

بغل میں لئے کھڑے رہے ۔ بادامی رنگ کے جاپانا سوٹ میں ملبوس بے سہرے کے دولہا کا ایک تماشا بن رہا تھا ۔ پاپا داماد کی ایسی شاندار قدردانی سے خوش ہو کر قریب کھڑے مسکرا یا کیے ۔ بھائی ممتاز علی بھی وہیں موجود تھے ۔

اس ڈرامائی واقعے کے بعد پاپا نے ان تمام مہمانوں کو کھانا کھلوایا ۔"

" محترمہ بنت نذر الباقر صاحبہ کی شادی کتخدائی سید سجاد حیدر صاحب بی اے (علیگ) اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر (کرم مسوری کا) سے ہو گئی اور ۱۸ ماہ حال کو وہ کوہاٹ سے رخصت ہو کر مسوری چلی گئیں ۔

یہ تقریب پوری شرعی سادگی اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ عمل میں آئی کوئی گانا بجانا آتش بازی یا بیہودہ رسوم کا نام نہ تھا مولوی سید محسن علی صاحب لاہوری نے خطبہ نکاح پڑھا ۔ خطبہ نکاح اس قدر لطیف تھا کہ ہمارا دل اسے اخبار میں چھاپنے کو چاہتا تھا مگر افسوس ہم اسے لکھ نہ سکے ۔

" اگرچہ آج کل سخت گرمی کا موسم ہے مگر حسن اتفاق سے نکاح کے روز تمام دن ابر رہا ۔ شام کو عقد کے وقت پُر لطف ابر تھا ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھی ۔ کوہاٹ کے پہاڑوں پہ بجلی چمک چمک کر بارش کی آمد کی خبر دے رہی تھی ۔

" بعد نماز مغرب عقد ہونے کے بعد نہایت تکلف سے جلسہ ضیافت ہوا ۔ میرزا الباقر صاحب کثیر الاحباب اور نہایت با اخلاق بزرگ ہیں ۔ لاہور ۔ گجرات ۔ راولپنڈی ۔ نوشہرہ ۔ پشاور وغیرہ اطراف سے بہت سے احباب ہندو اور مسلمان آئے تھے ۔ خاکسار راقم لاہور سے سجاد حیدر صاحب کے ہمراہ ہو لیا تھا ۔ ضیافت نہایت پُرتکلف تھی ۔ ہندو دوستوں کا جدا انتظام کیا گیا تھا اور نہایت قابل تعریف تھا ۔

" ایک بزرگ سفید ریش قزلباش پیر مرد مسٹر سجاد سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ان سے سردار محمد یعقوب خاں (سابق امیر کابل حال مقیم مسوری) کے حالات پوچھتے رہے اور رخصت کے وقت ہمارے دوست نوشہ کو سورہ اخلاص کی یہ دعائیہ رباعی پڑھ کر سنائی ؎

اے بہر کارے رفیقت قل ہو اللہ احد
وائے نگہبان تن و جانِ تو اللہ الصمد
لم یلد یارت دلم یولد بہر جا دست گیر
لم یکن ناصر ترا برسر لہ کفواً احد

" ایک نوجوان مسٹر احمد جان بنگو ضلع کوہاٹ سے خاص طور پر مسٹر سجاد سے ملنے آئے تھے ۔ نوعمر آدمی ہیں اور کچھ عرصہ سرحد ترکی و ایران پر رہ چکے ہیں ۔ کبھی انگریزی بولتے کبھی فارسی ۔ کبھی پشتو کبھی پنجابی ۔ وہ اس قدر دلچسپ آدمی تھے کہ مسٹر سجاد انھیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے اور میں اپنی طرف رات کو سوتے وقت ان کی چارپائی کے پاس ایک طرف مسٹر سجاد کا پلنگ بچھا ۔ ایک طرف میرا ۔ اب یہ مشکل کہ میری طرف کروٹ لے کر مجھ سے باتیں کریں یا مسٹر نوشہ سے ۔ آخر میں نے یہ ترکیب نکالی کہ مسٹر سجاد کے کسی اور دوست کو سمجھا دیا کہ وہ مسٹر سجاد کو اپنی باتوں میں مشغول کر دیں ۔ میں مسٹر احمد جان سے افغانستان کی تعلیم نسواں معاشرت وغیرہ کے حالات پوچھتا رہا ۔

"اگلے دن میں اور مسٹر سجاد حیدر اور ان کے بہنوئی سید برہان حیدر کوہاٹ کے باغات اور چشموں کی سیر کو نکلے اور اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے جس کی دوسری طرف یاغستان ہے۔ یہاں سرکار انگریزی کا ملک ختم ہو جاتا ہے۔ ہم میں اتنی ہمت نہ تھی نہ اتنا وقت تھا کہ اوپر چڑھ کر خود مختار زمین کا نظارہ دیکھتے۔ لیکن میں نے اور مسٹر سجاد نے ایک چشمہ کے کنارے بیٹھ کر سرزمین حریت سے آتا ہوا پانی پیا۔

شام کو سات آٹھ بجے کے درمیان ہم سوار ہوئے اور ریل پر پہنچے۔ وہاں بہت سی تہذیبی بہنیں ویٹنگ روم میں جمع تھیں جو بنت تدرا لباقر صاحب کو رخصت کرتے ریل پر آئی تھیں۔

"نو بجے کے قریب ہماری گاڑی روانہ ہوئی۔ راہ میں راولپنڈی۔ گجرات۔ لاہور۔ امرت سر وغیرہ میں بھی بعض تہذیبی بہنیں اسٹیشن پر ملنے آئیں۔ بعض نے کھانا بھیجا بعض نے چائے بھیجی بعض تحائف لائیں۔

"لطیفہ: راستے میں کھانا کھاتے وقت ایک مزیدار لطیفہ ہوا۔ کسی اسٹیشن پر نوکر آ کر ہمیں کھانا دے گیا اور پانی کی صراحی بھی رکھ گیا۔ ہم نے کھانا کھانا تو شروع کر دیا مگر برف لینے کا خیال نہ رہا۔ ٹرین میں برف تو موجود نہ تھی۔ اسٹیشن دور تھا۔ میرا لڑکا کھانے میں شریک تھا۔ اس نے کہا پچاس روپے دو آنے میں ایک سیر برف ابھی اسی لحظہ مل سکتی ہے۔ میں اس کا مطلب نہ سمجھا مگر مسٹر سجاد فوراً سمجھ گئے۔ اور بچے کو شاباش دی۔ میں اس کو پہیلی قرار دے کر تہذیبی بہنوں سے اس کی بوجھ پوچھتا ہوں۔ اتا پتہ یہ ہے کہ جس درجے میں ہم سوار تھے وہ سکنڈ کلاس کا درجہ تھا۔

"آخیر میں میں اپنے عزیز دوست مسٹر سید سجاد حیدر اور اپنی عزیز بہن نذر زہرا کے حق میں اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں میں اس اتحاد کو نہ صرف قران السعدین قرار دیتا ہوں بلکہ قوم کے لیے مبارک فال سمجھتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ اتحاد تہذیبی گروہ کی تقویت مدد اور ترقی کا موجب ہوگا اور وہ دونوں تعلیم نسواں کی خدمت میں آفتاب و مہتاب کی طرح چمکیں گے۔

جو بہنیں ان سے خط و کتابت کرنا چاہیں وہ لفافہ پر یوں پتہ لکھیں:

مسز این۔ سجاد بیگم دفتر اسسٹنٹ پولٹیکل افسر

مسعودی ضلع دیرہ دون۔

خاکسار سید ممتاز علی[1]"

تہذیب نسواں[2]۔ ۲۲ جون ۱۹۱۲ء

کوہاٹ

۱۸ جون ۱۹۱۲ء

ہمشیرہ مکرمہ معظمہ۔ آداب عرض اگرچہ مسافر کے پیچھے انتظام سفر سے پیشتر خط لکھنا ہندوستانی خیال کے مطابق ٹھیک نہیں سمجھا جاتا

---

[1] سید امتیاز علی تاج مرحوم [2] بشکریہ ڈاکٹر آغا رضا بیدار۔ ڈائریکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

لیکن اس خیال سے کہ مسوری پہنچتے ہی آپ کو دوسرے روز یہاں کی خیریت مل جائے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔
ابھی تک آپ راولپنڈی سے تو نہ گذری ہوں گی۔ وہاں بھائی بیلی رام[1] آپ کو ہر طرح سے مدد دیں گے۔
بے حیا پریشان باجی کا پرفشان افضل[2]

راولپنڈی

۲۰ جون ۱۹۱۲ء

میری پیاری ہمشیرہ

خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ دعا دیتا ہوں۔ امید ہے آپ اس دور دراز سفر کو طے کر کے بخیریت تمام مسوری پہنچی ہوں گی۔ افسوس یہ ہے کہ میری پیاری بہن میرے اسٹیشن سے گذر گئے اور میں اس کی کچھ خدمت نہ کر سکوں لیکن یہ امر مجبوری تھا اگر میں پہلے سے موجود ہوتا تو ضرور آپ کی سیوا کا فخر حاصل کرتا۔ بڑھیا نے مجھے خط دینے کے بجائے لالہ برج لعل تھاپڑ کے حوالے کیا جس نے پڑھ کر پھر مجھے واپس کیا۔ میں آپ کے اسباب کی بلٹی کرنے ٹکٹ وغیرہ لینے میں مشغول رہا ایک حرف بھی لکھ کر آپ کی سیوا میں پیش نہ کر سکا۔ امید ہے معاف فرماؤ گی۔

بہن۔ آپ کی رخصت کے وقت کو ہاٹ میں آپ رو رہی تھیں ادھر میرا کلیجہ بھی پاش پاش تھا اور آنسو برابر جاری تھے کیونکہ اس خادم کو آپ کے کنبے کے ساتھ غیر معمولی محبت ہے۔ میں میر صاحب کو اپنا جی پاپا سمجھتا ہوں۔ اور آپ میری دو بہنیں ہیں اور چھوٹے میاں خدا سلامت رکھے میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بھابھی جی سرگباش ہو چکی ہیں وہ میری والدہ تھیں۔ جو مجھے ہر وقت یاد آتی ہیں۔ اور میں سچے دل سے پرارتھنا کرتا رہتا ہوں کہ اس دیوی کو خدا سورگ نصیب کرے۔ میرا سہارا یا تو خدا پر یا میرے پاپا میر صاحب پر ہے۔ اس دنیا میں میں اکیلا صرف آپ لوگوں کے بھروسے پر جی رہا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر بھائی سجاد حیدر صاحب سے عرض کریں کہ وہ بھی اس دھرم کے رشتے کو نبھائیں۔ میں آپ لوگوں کا تا عمر خادم ہوں۔

آئندہ مارچ کو میرا ارادہ ہردوار آنے کا ہے۔ اگر حالات نے اجازت دی تو آپ کے درشن کو مع اپنی بیوی کے حاضر خدمت ہوں گا۔ بہن جی اگر کسی چیز کی ضرورت ہوا کرے تو بلا تکلف مجھے لکھ دیا کریں میں اپنی سینھا شکتی کے انوسار اس کی تعمیل کروں گا۔ میں دعا گو ہوں کہ آپ کی تمام زندگی ہمیشہ خوشی میں گذرے جس کی ٹھنڈی ہوا مجھے بھی آتی رہے۔

بہن جی اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر روز شام کو بھائی سجاد حیدر کے ہمراہ ہوا خوری کے لیے ضرور تشریف لے جایا کرنا۔ آپ کی طبیعت چونکہ کمزور ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چلنے پھرنے سے اچھی صحت ہوگی۔ ویسے میں آپ کے پرائیویٹ سسٹم میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ میری ناقص عقل نے یہ محسوس کیا ہے۔

بھائی سجاد حیدر صاحب کو دست بستہ آداب عرض کریں۔

آپ کا عزیز بھائی بیلی رام

---

[1] یہ صاحبزادے آگے چل کر پنجاب کے نامور ڈاکٹر بیلی رام بنے۔ بیلی رام بلڈنگ اور دواخانہ لاہور میں غالباً اب تک موجود ہے۔

[2] اکبری بیگم مصنفہ گودڑ کا لال کے صاحبزادے (مصنف تخیلات) بعمر پندرہ سال۔

گڈا محلہ، امروہہ، ضلع مراد آباد

۲۳ جون ۱۲ء

میری پیاری بیٹی

تمہارے پاپا کے خطوط قریب قریب ہر دوسرے تیسرے روز اس عرصے میں آتے رہے۔ خدا کی شان ہے کہ اس موقعے پر اور ہیں میل۔
بہرحال اوس کا شکر ہے کہ تو بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ گئی۔ بیٹی دنیا کا یہی قاعدہ ہے۔ کون کب تک ماں باپ کے ساتھ رہا ہے کہ تو رہتی۔
تیری چچی مراد آباد ہی میں ہیں اون کی دادی اور مصفی بی بی وغیرہ ہوگی پوڑے[1] سے جا کر چادریں چڑھائیں گی اور منیا بوا کو اس کی لونڈیا ریقیہ کا پرسا دیں گی۔

تو نے اپنے نئے گھر کا حال تو کچھ لکھا ہی نہیں مفصل لکھ کیسا مکان ہے اور تو نے اپنی تقسیم اوقات کیا کر رکھی ہے۔
ہاں تجھ سے تو میں نے مکان کو پوچھا اور اپنے مکان کا کچھ حال نہیں لکھا۔ سنو۔ میرا مکان کوئی دو سو برس کا بنا ہوا ہے۔ مکان کے پچھم کی طرف کھیت ہی کھیت ہیں صحن بہت بڑا۔ ہماری مراد آباد کی محلسرا سے زیادہ چوڑا۔ مکان کی چھت میں کوئی تختہ سلامت نہیں۔ مگر اللہ کی شان ہے کہ برسات کے زمانے میں ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکتا کواڑوں کا نام نہیں اس لیے ہوا دار خوب ہے۔ میں دن بھر اکیلا پڑا پڑا کڑیاں گنتا رہتا ہوں۔ کاتمریڈ یا کوئی اور اخبار آ گیا تو دیکھ لیا۔ بیماری کی وجہ سے اب بصارت بھی کمزور ہو گئی ہے۔ آل حسنین سلمہٗ میرے ہمراہ ہے۔ اوسے کل ہی معلوم ہوا کہ تیری شادی ہو گئی۔ بھائی جان کو اوس نے بڑا لمبا چوڑا خط شکایت کا لکھا ہے۔ اور کہتا تھا کہ میں باجی کو لکھوں گا۔ اونھوں نے بلا میرے کیسے شادی کر لی۔ جب اس سے کہا بیٹیاں کہیں کہا کرتی ہیں تو بولا کہ بی بی کے بیاہ کے رقعے تو باجی نے لکھے تھے۔

والدعا

تیرا چچا ظہور حسنین

۱۹ مارچ ۱۹۱۳ء

لاہور سے مراد آباد جانے والی ٹرین کے پلیٹ فارم پر وردی پوش میر نذر الباقر اور برقعہ پوش بہن اکبری بیگم مبہوت بھونچکے کھڑے ہیں۔ اینگلو انڈین گارڈ جھنڈی دکھاتا ہے۔ اکبری بیگم گھبرا کر زنانہ درجے میں سوار ہو جاتی ہیں۔ اتنے میں اشکبار لالہ بیل رام مسافروں کی بھیڑ چیرتے دوڑتے ہوئے آکر " پاپا" سے لپٹ جاتے ہیں۔ پرسوں ان کے پیارے " چاچا ظہور" بھی سرگباش ہوئے۔

امروہے کی ہڑواڑہ میں ایک نیا کتبہ:

سید ظہور حسنین رضوی

پیدائش : ۱۸۷۳ء

وفات : ۱۳ مارچ ۱۹۱۳ء

---

[1] ایک شیعہ زیارت گاہ - ضلع بجنور۔

۱۸ / مارچ ۱۹۱۳ء

ڈاکیہ دربار شاہ ولایت عرف لکڑا محلہ کے ایک سنسان مکان کے صدر دروازے کی زنجیر کھٹکھٹاتا ہے۔ گلی میں خشک پتے اور کوڑے اڑ رہے ہیں۔ چند منٹ بعد ایک اداس صورت کمسن لڑکا نیکر اور چپل پہنے اندر سے دروازہ کھولتا ہے۔

"لو بھیے۔ تمہارے نام خط۔" ڈاکیہ رنجیدہ آواز میں کہتا ہے۔ رسید پر دستخط کرنے کے لیے کان کے پیچھے سے مختصر سی مٹیالی پنسل نکالتا ہے۔ (زندگی کی ہر چیز مٹیالی گرد آلود بے رنگ بے جان کیوں ہے)۔

بچہ بڑی احتیاط اور احساس ذمے داری کے ساتھ دستخط کرنے کے بعد ذرا حیرت سے اپنے نام کا لفافہ کھولتا ہے جس پر گورنمنٹ ہاؤس الہ آباد کا طغرہ بنا ہے۔ اندر ہز آنر لفٹیننٹ گورنر یو۔ پی کا تعزیت نامہ سید آل حسنین کے نام ـــــ

"عزیز بیٹے۔ تمہارے پیارے والد کی بے وقت موت کی وجہ سے گویا برٹش گورنمنٹ کا ایک ستون گر گیا ـــــ"

---

۱۵ / ستمبر ۱۹۷۳ء محترمہ اندرا گاندھی کو اپنا قیمتی ووٹ دیجیے۔

امروہے کے در و دیوار پر چسپاں اندرا کانگریس اولڈ کانگریس۔ بی کے ڈی۔ آل انڈیا مسلم مجلس، آل انڈیا مسلم لیگ بھارتیہ جن سنگھ۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ـــــ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کے پوسٹروں، مشاعروں، عرسوں قوالیوں، فلموں اور شیعہ سنی، اہلحدیث مقلد غیر مقلد بریلوی غیر بریلوی کے تنازعی جلسوں کے اشتہارات کے سامنے سے دلی اور لکھنؤ سے آنے والی شاہراہ پر یو۔ پی روڈویز کی بسیں لگاتار گذر رہی ہیں۔ جھیل، قبرستان اور درگاہ شاہ ولایت کے سامنے سے گذرتی ان بسوں میں امروہے کے تابعین اور مراد آبادی برتنوں کے سنئے متمول مسلمان ایکسپورٹر اور کاریگر کھچا کھچ بھرے ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ مخملیں ٹوپیاں۔ مخملیں واسکٹیں۔ انداز میں روایتی ٹیں اور بانکپن۔ جس شستہ اور شگفتہ ٹکسالی اردو میں ضلع جگت اور جنسی مذاق یا بحث مذاکرے میں آپس میں مشغول ہیں وہ آج صرف ان اضلاع ہی میں سنی جا سکتی ہے۔

شاہراہ پر سے اکا دکا فوجی گاڑی زوں سے گذر جاتی ہے۔ جنرل لارڈ رابرٹ کا پرنواسہ جمہوریہ ہند کی فوج کا میجر بنگلہ دیش کے محاذ سے دربار شاہ ولایت واپس آ کر والدین سے ملنے کے بعد اپنی چھاؤنی پر جا چکا ہے۔ اماں جنرل رابرٹ کو تو رکھو طاق پر۔ ان کے بنائے ہوئے نقشے تو کب کے تلپٹ ہوئے۔ مگر صرف پچیس سال اُدھر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے جو نئی لکیریں کھینچی تھیں وہ بھی تو غتر بود ہو گئیں۔

شام ہوتی ہے۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد ماموں اندازے سے چلتے مردانے صحن میں بچھی آرام کرسی پر آن بیٹھتے ہیں اور تسبیح ان گڑگڑانے لگتے ہیں۔ مو نبات اب انھیں نظر نہیں آتی لیکن خوب نظر آتی ہے۔

قریب کی تاریخی مسجد سے عشا کی اذان کی صدا بلند ہوتی ہے۔ سلطان آزاد کھانے کی سینی ماموں کے سامنے لا کر رکھتی ہیں اور کہتی ہیں "نوش جان کیجئے۔" رات گہری ہوتی ہے۔ پڑوس کے مکان میں چھپائی کے کارخانے کا مالک پاکستانی قوالی کا ریکارڈ جو وہ کویت سے لایا ہے۔ بار بار بجا رہا ہے۔ سر لامکاں جو طلب ہوئی ـــــ کوئی حد ہے ان کے عروج کی ـــــ

کوئی حد ہے ۔۔۔ بلغ العلیٰ بکمالہٖ ۔ صلو علیہ و آلہ ۔۔ سدرۃ المنتہیٰ وہ چلے نبیؐ ۔۔۔
اور پولس لائینز میں بگل بجتا ہے ۔

سید ظہور حسنین رضوی مشہدی مراد آبادی علیگ کلف دار کڑکڑاتی وردی پر جگمگاتے کنگز پولس میڈل اور نیلسن میڈل اور قیصر ولیم میڈل (جو انھیں ایک جرمن شہزادے نے عنایت کیا تھا) لگا کر بنگالی ڈاکے[1] سے وائسرائے ہند کو محفوظ رکھنے کے لئے کلکتے میں بڑے لاٹ صاحب کے جلوس میں چلا کرتے تھے ۔ ان کی شکستہ قبر پہ اور ان کی جوان بیٹی منظور زہرا کی شکستہ قبر پر جس کے کتبے پر خود زہرا بیگم کے لکھے ہوئے المناک اشعار کندہ ہیں ۔ جھاڑ جھنکار اُگ آئے ہیں ۔ قبروں سے متصل سترھویں صدی کے کسی مغل سپہ سالار کی بنوائی ہوئی مسجد میں سے کچھ دیر بعد فجر کی اذان کی آواز بلند ہوگی ۔ کیونکہ وہ رب ذوالجلال حیّ و قیوم ہے ۔۔۔

" دل انگشتِ ریخ تر کانہ " والا کلیرس نوجوان ادیب ، ننھی بیگم ، فرنگی نما نذر الباقر ، نوعمر میر افضل علی ، خضر صورت سید ممتاز علی ، ہونہار امتیازعلی تاج دور دراز قبرستانوں میں جھاڑ جھنکاڑ ، بیری کے درختوں سفید اور کاسنی خودرو پھولوں کی خاموشی میں کب کے کھو گئے ۔ اور اللہ رسے سناٹا آواز نہیں آتی ۔

درگاہ شاہ ولایتؒ کے مرمریں حجرے میں آسیب زدہ لڑکیوں پر بدستور حال آ رہا ہے ۔ طاق میں نیچے کے سیندوری نشان کے نیچے گھی کا چراغ جلتا ہے ۔

پنجاب کے صوفی شاہ حسین نے کہا تھا ۔" خاموش رہو ۔ دنیا قابلِ ذکر جگہ نہیں ۔"

(مسلسل)

---

[1] بنگال کے دہشت پسند انقلابی گروہ بھی ۱۹۰۷ء سے بہت پہلے سرگرم رہے اور انگریز پریس اور عوام میں بنگالی ڈاکہ کہلائے ۔

ڈائری کے چند اوراق

مسعود مفتی

[قیامِ مشرقی پاکستان]

نوٹ: [میں ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء کو لاہور سے ڈھاکہ کے لئے روانہ ہوا۔ تقریباً اسی وقت سے ڈائری کا آغاز کیا۔ اور سقوطِ ڈھاکہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔
جون کے آخر میں لاہور آنے کا اتفاق ہوا۔ تو اسی وقت تک کی لکھی ہوئی ڈائری یہیں چھوڑ گیا۔ مگر اس کے بعد موقعہ نہ ملا کہ یہ تحریر یہاں پہنچا سکتا۔ اس لئے آخری نو ماہ کی لکھی ہوئی تحریر میرے پاس ہی رہی۔ جو ایک نیلی جلد والی کاپی میں تھی۔

سولہ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہمارا گروپ غیر جانبدار علاقے (ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل) میں پناہ گزین ہوا۔ اس وقت صاف عیاں تھا کہ مشرقی پاکستان کا آخری وقت آن پہنچا ہے اور کوئی اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ بعد ازاں ہمارا کیا حشر ہوگا۔

اسی لئے ہوٹل میں پہنچتے ہی مجھے اپنی ڈائری کے متعلق سخت تشویش ہوئی۔ ایک تو میں اسے کسی نہ کسی طرح مغربی پاکستان پہنچانا چاہتا تھا۔ اور دوسرے اسے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں پڑنے سے بچانا چاہتا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں ایک ایرانی تاجر مسٹر ابراہیم کاشانی کے پاس گیا۔ جو اسی ہوٹل میں پناہ گزین تھے اور ڈھاکہ کے قیام کے دوران میں ان سے چند مرتبہ مل چکا تھا۔ انھیں درخواست کی کہ وہ اسے اپنے سفارت خانے میں رکھوا دیں تاکہ ہندوستانیوں کے ہاتھ سے بچ جائے اور پھر جب بھی انھیں موقع ملے۔ اسے پاکستان بھجوا دیں۔ چاہے یہ موقع کئی مہینوں یا کئی برسوں بعد ہی کیوں نہ ملے۔ اگر وہ کسی وقت محسوس کریں کہ اسے ہندوستانیوں سے بچایا نہیں جا سکتا تو اسے جلا کر تلف کر دیں۔

کاشانی صاحب بہ کمال مہربانی راضی ہو گئے۔

مگر حالات ایسے تھے کہ مجھے قطعاً یقین نہ تھا کہ ڈائری آسانی سے پاکستان پہنچ سکے گی۔ اس لئے ان کے سپرد کرنے سے پہلے میں نے احتیاطاً اس کے پہلے اور آخری صفحے پر نوٹ لکھ دیئے کہ اگر یہ ڈائری کسی کو ملے تو اسے فلاں فلاں پتے پر بھجوا دیا جائے۔ ایک پتہ میری بیگم کا تھا۔ اور دوسرا طفیل صاحب مدیرِ نقوش کا تھا۔ کاشانی صاحب سے زبانی درخواست کی تھی کہ اگر میں زندہ ہوں تو یہ میری بیگم کو بھجوا دیں۔ بصورتِ دیگر طفیل صاحب کو بھجوا دیں۔

ڈائری ان کے سپرد کرنے کے بعد حالات اس تیزی سے چل رہے تھے کہ میں اسے جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن اگر ڈائری کی شکل میں لکھتا اور وہ ہندوستانیوں کے ہاتھ پڑ جاتی، تو وہ یقیناً مجھ سے پوچھتے کہ پچھلی ڈائری کہاں ہے۔ اسی حالت میں اس کی برآمدگی کا خطرہ تھا۔

چنانچہ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے میں نے ایک ادبی رپورتاژ بعنوان "چہرے" شروع کی۔ جس میں گرد و پیش گھومنے والے چہروں کے تاثرات کے ذکر کے پردے میں حالات کا ریکارڈ تھا۔ "چہرے" اب کتابی شکل میں شائع ہو گئی ہے۔

اٹھارہ دسمبر کی دوپہر کو کاشانی صاحب سے آخری ملاقات ہوئی۔ جب ہمیں اطلاع دی گئی کہ تھوڑی دیر بعد ہمیں قیدی بنا کر چھاؤنی لے جا رہے ہیں کاشانی صاحب اور ان کی بیگم نے آبدیدہ آنکھوں اور پُرخلوص دعاؤں سے مجھے رخصت کیا۔ اس انداز سے کچھ اور ڈھارس بندھی کہ میرے کاغذات محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔

اگلے دو سال کے لئے دشمن کی سرزمین میں ہم ہر قسم کی ہمدردی سے محروم تھے۔ ان دنوں یہ پُرنم آنکھیں بہت یاد آئیں۔ جن کی اصل تفسیر اس دن ہوئی جب قریباً آٹھ ماہ بعد جنگی قیدیوں کے کیمپ میں مجھے اپنی بیگم کا خط ملا جس کے متن میں ایک چھوٹا سا فقرہ بھی تھا "آپ کی نیلی کتاب مل گئی ہے"۔

دشمن کی دو سالہ قید میں کئی لمحے ایسے بھی آتے تھے۔ جن میں یقین سا ہو جاتا تھا کہ شاید ہم کبھی بھی زندہ وطن نہ جا سکیں گے۔ ان کربناک لمحوں کا واحد سہارا یہی تسلی تھی کہ میری ڈائری تو پہنچ چکی ہے۔

آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اس کے وہ حصے حذف کر دیئے ہیں جو بہت ہی ذاتی نوعیت کے ہیں]

ہفتہ، ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء (لاہور سے روانگی)

جہاز کی پرواز پُرسکون اور متوازن ہے۔ کھڑکی سے باہر بوئنگ ۷۰۷ کے دیو ہیکل بازو دو انجنوں کا ناگوار سا بوجھ اٹھائے فضا میں معلق ہیں۔

اور اپنے عظیم حجم کے باوجود بھی کبھار پیپل کے پتوں کی طرح ہلکی ہوا سے لرز سے جاتے ہیں۔ کھڑکی کا اوپر والا ایک چوتھائی حصہ نیلے آسمان سے ڈھکا ہوا معلوم ہوتا ہے جس کی نیلاہٹ سہ پہر کی دھوپ میں اڑے ہوئے غازے کی مانند لگتی ہے۔ باقی حصہ دھند سے آلودہ ہے۔ کہیں کہیں سفید بادلوں کے مرغولے دھنیے کے ارد گرد اڑنے والی روئی کے گالوں کی طرح معلق ہیں۔

اندر کی فضا بالکل مختلف ہے۔ لاہور کے پی آئی اے سٹاف کے آخری تحفے کے طور پر میں فرسٹ کلاس میں بیٹھا ہوں اور جان بوجھ کر آخری سیٹ کا انتخاب کیا ہے تاکہ میں زیر مشاہدہ آنے کی بجائے سب کو، دوسروں کو دیکھ سکوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اعصاب کو ذرا سکون دے سکوں جو پچھلے دو ہفتوں سے کئی قسم کے کھچاؤ اور بوجھ تلے دبے رہے ہیں۔ میں کسی سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کر کے اپنے اندر ہی اندر غوطہ لگانا چاہتا ہوں۔ اور ان تمام تجربوں کے تھپیڑوں کو ایک ایک کر کے یاد کرنا چاہتا ہوں جو پچھلے دنوں بھرپور تیزی سے مجھے مصروفیت اور عجلت کے سمندر میں غوطے دیتی رہی ہیں۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کتنی ہی دیر تک آنکھیں بند کئے دم سادھے ڈھیلے جسم سے ٹیک لگائے رکھتا ہوں اور جہاز کی گھمبیر گرج میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہوں۔ اب ایک گھنٹے کا سفر گزر چکا ہے اور میں اس ڈائری کے آغاز کے طور پر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

اتوار، ۲۴ مارچ ۱۹۷۱ء

۱ بجے بعد دوپہر کراچی سے صبح لونیجے بوئنگ پر روانہ ہوا۔ اس طیارے میں خالد محمود بھی ہیں جو اب کمشنر چاٹگام لگ ہوں گے اور سید محمد حسن بھی جو گورنر کے سکرٹری ہوں گے۔ مجھے بھی اپنی پوسٹنگ کا پتہ چل گیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں سکرٹری امور تعلیم ہوں گا اس پر دل میں کچھ خوشی، کچھ جوش اور کچھ اطمینان سا پیدا ہوا تھا کہ کام مشکل ہوگا۔ ہمت کی ضرورت ہوگی اور ملک کی خدمت ہوگی۔ تعلیمی اداروں کو ملک دشمن عناصر کے تسلط سے پاک کرنا۔ نصاب میں قومی رنگ کو چوکھا کرنا۔ اور ساری تعلیم میں نظریہ پاکستان کو اجاگر کرنا ایسے کام ہیں جو موجودہ حالات میں جہاد سے کم نہیں۔ کئی بنگالی اس کی مخالفت کریں گے۔ اور ہندوستان کے ایجنٹ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اسے ناکام کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے اس کام میں چیلنج ہوگا، خطرات ہوں گے۔ سازشیں ہوں گی اور مشکلات پیش آئیں گی، اسی لئے یہ مجھے پسند ہے۔

طیارے میں لوگ آپس میں بے تعلق ہیں۔ سوائے ہم تینوں کے جو کبھی کبھار ایک دوسرے کے پاس جا بیٹھتے ہیں۔ بارہ بجنے کے کچھ منٹ بعد طیارہ ہندوستان کی راس کماری سے گزر کر لنکا کے اوپر سے گزرتا ہے۔ نیچے بڑے بڑے پہاڑ دانوں کی مانند نظر آتے ہیں۔ زمین کے لق و دق خطے دونوں طرف سے سمندر کی وسعتوں میں گھرے ہیں۔ بادلوں کے کئی ڈیزائن سینکڑوں میلوں میں تانے بانے بنتے نظر آتے ہیں۔ نیلے سمندر اور نیلے آسمان کے ملاپ میں کہیں بھی افق نظر نہیں آتی۔ بلکہ چکرا دینے والا روشن سا اندھیرا ہے جس میں سب کچھ نظر آتے ہوئے بھی خلا میں نظریں گم ہو جاتی ہیں اور انسان حیران ہونے لگتا ہے کہ اس سے آگے کیا ہے۔

اس سے بھی حیران کن بات یہ ہے کہ اتنی عظیم وسعتوں میں موہوم سا ذرہ جو انسان کہلاتا ہے۔ بالکل کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مگر جب یہی انسان پاگل پن میں خون بہانے پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ تو یہ سارا پھیلاؤ بھک سے اڑ جاتا ہے۔ اور وہ پاگل ذرہ

اپنے ہی خون کے چند سرخ چھینٹوں سے اتنی عظیم کارگاہ کو نفی کی دھند سے ڈھک دیتا ہے۔

چھ بجے شام :- سوا تین بجے طیارہ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کی طرف جھپٹا۔ تھوڑی کو ایک گھنٹہ آگے کرتے ہوئے میں نے نیچے میلوں لمبی سڑکوں پر نگاہ دوڑائی۔ تو ان پر اکا دکا راہگیر تھے اور کسی بوڑھے کے اکیلے دکیلے دانتوں کی طرح ایک آدھ رکشا یا کار نظر آئی۔ جب فضا نیچے ہوئے تو مکانات خاموش تھے اور مکین بہت کم تھے۔ عجیب بات ہے۔ ادھر تو سنتے تھے کہ سب نارمل ہے۔

اڈے پر قادر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جو آب یہاں ڈیوٹی پر تھے۔ گلے ملے تھپکی دی۔ حیرت اور خوشی سے دوہرے ہو گئے۔

ایک دو کشادہ سی سٹاف کاریں موجود تھیں۔ ان پر بیٹھ کر سنٹرل سرکٹ ہاؤس پہنچے۔ مظفر اور ہمایوں سے ملاقات ہوئی جو تین روز پہلے پہنچ چکے تھے۔ مگر ابھی تک چارج نہ لے سکے تھے۔ مظفر بنیادی جمہوریت کے سکرٹری تھے۔ اور ہمایوں اطلاعات کے۔ ان کو گلہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی حکومت کی طرف سے رکھائی اور اکتاہٹ کا اظہار تھا۔ حسن ظہیر کوئی ہفتہ بھر سے یہاں تھے مگر چارج نہ ملا تھا۔ حالانکہ وہاں سے گورنمنٹ نے سب کو بھاگم بھاگ پہنچنے کو کہا تھا۔ یہاں معاملہ بالکل الٹ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بھی نہ تو ہماری حفاظت کے موڈ میں تھا۔ اور نہ ہمیں کوئی اور سہولت دینے بلکہ اس وجہ سے تقریباً سبھی بجھے بجھے تھے۔ سوائے نسیم کے جو شام کو ملے اور مزے میں تھے وہ میرے ساتھ متفق تھے کہ ناسازگار حالات میں عام حالات سے زیادہ خوش و خرم رہنا بہت ضروری ہے۔

رات کھانے پر مختلف خبروں کا تبادلہ ہوتا رہا کہ تین مارچ سے پچیس مارچ تک شیخ مجیب الرحمٰن کے حامیوں نے غیر بنگالیوں پر کیسے کیسے ستم ڈھائے۔ اختر حمید خاں صاحب جن کو PROPHET OF COMILLA کہا جاتا ہے۔ آج کل کراچی میں ہیں۔ اور سرپیٹ رہے ہیں۔ کہ کبھی بنگال واپس نہیں جاؤں گا............ اختر حمید خاں صاحب نے ۱۹۴۲ء میں سول سروس سے اس لئے استعفا دیا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق اس وقت کا قحطِ بنگال مصنوعی طور پر انگریز کا پیدا کردہ تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ساری عمر بنگال کی خدمت میں صرف کی۔

ایسی بھی خبریں سنی گئیں کہ جو لوگ برسوں کے ہمسائے تھے۔ اور ان کے بچے ایک دوسرے کو چچا ماموں کہہ کر پکارتے تھے۔ وہاں ان بھانجوں اور بھتیجوں کو ذبح کر کے ان کی ماؤں کی گود میں ڈال دیا۔ جن سے بعد میں زنا بالجبر کئے گئے۔ حیرت ہوتی ہے تمام قصے سن کر۔

سوموار۔ ۱۴ مئی ۱۹۷۱ء

دس بجے رات :- آج صبح دفتر پہنچے۔ چارج لیا۔ سٹاف کے ساتھ چائے پی محکمے کا چکر لگایا۔ چیف سکرٹری مسٹر شفیع الاعظم سے ملے۔ شام کو ڈھاکہ چھاؤنی میں میجر شجاع (کرکٹ والے) اور کرنل شفقت بلوچ سے ملے۔ شفقت بلوچ بر ۱۹۶۵ء کی جنگ

سے بیرو ہیں۔ مصلے پر بیٹھے شام کی نماز کے لئے وقت کر رہے تھے۔ بعد میں گفتگو بھی ہوئی تمام حالات پر پرجوش اور باایمان مجاہد سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔

دفتر میں جن لوگوں سے بھی واسطہ پڑا۔ ان کے چہرے کسی قسم کے تاثر سے خالی تھے۔ دفتروں میں حاضری تقریباً قریباً مکمل ہے وہ جو پانچ دس فی صدی لوگ ابھی نہیں آئے۔ ان کے آنے کی اب توقع نہیں ہے۔ ہمیں دیکھ کر نہ خوشی کا اظہار ہوا۔ نہ ناخوشی کا۔ بے تاثر اور سنجیدہ چہرے ہماری مسکراہٹ اور غصے کو ایک جیسے انداز میں جھیلتے رہے۔ سرِ شام ہی ڈھاکہ کی تمام دکانیں بند تھیں۔ اور سڑکیں خالی خالی تھیں۔ رونق صرف صبح کے وقت اور دوپہر تک ہوتی ہے۔ جب اکثر دکانیں بھی کھلی ہوتی ہیں۔

منگل وار ۲۵ مئی ۱۹۷۱ء

گیارہ بجے رات:۔ آج تھوڑا وقت دفتر میں رہے۔ لوگوں نے حسبِ معمول چہروں پر غیریت کے نقاب پہنے تھے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو گلہ تھا کہ فوج والے اس کے چند ملازمین کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ جس سے سارا سٹاف ہراساں اور خوفزدہ ہے میرا جواب سیدھا تھا کہ مارشل لاء کے حالات میں ایسا ہوتا ہی ہے اور ان کو چاہیے کہ اپنے سٹاف کو سمجھائیں کہ اگر ان کے ہاتھ آلودہ نہیں ہیں۔ تو انھیں خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جواب تو میں نے اوپر سے دے دیا مگر اندر سے تسلی نہ ہوئی۔ بعض اوقات احساس ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد جو ذہنی کیفیت دہلی کے لوگوں کی تھی۔ وہی کیفیت آج کل ڈھاکہ کے لوگوں کی ہے۔

کملا گرلز کالج کی پرنسپل ڈاکٹر حفیظ آئیں۔ بڑی شستہ اردو بولتی ہیں۔ فارسی میں P.H.D ہیں۔ کلکتہ کی رہنے والی ہیں۔ اور ہر لحاظ سے بنگالی بنتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود مارچ کے پاگل پن میں مجیب کے حامیوں نے ان کے بھائی کو صرف اس لئے مار ڈالا کہ وہ اردو اچھی بولتا تھا۔ اور اس کے بھانجے کو بھی چھرا گھونپا۔ مگر وہ بچ گیا۔

وہ خوفزدہ تھیں کہ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ سب کالجوں کا سٹاف یکم جون کو ڈیوٹی پر حاضر ہو تاکہ دو اگست کو کالج کھل سکیں۔ مگر ان حالات میں وہ کالج میں اکیلی کیسے رہ سکیں گی۔

.. ..

.. ..

سرکاری اطلاعات کے مطابق آج بھی مشرقی پاکستان میں چند واقعات ہوتے رہے۔ اکا دکا فائرنگ اندرون صوبہ میں ہوئی چونکہ مواصلات پوری طرح بحال نہیں ہوئے اس لئے باغیوں اور شرپسندوں کو شرارت کا موقع مل جاتا ہے۔ ریلوے لائن نصف سے زیادہ اکھاڑی جا چکی ہے۔ اکثر پل توڑے جا چکے ہیں۔ سڑکیں بھی جگہ جگہ سے تباہ ہیں۔ اس لئے صرف دریا استعمال ہو رہے ہیں۔ جن میں کانوائے فوج کی حفاظت میں چلتے ہیں۔ لیکن اگر حفاظتی دستہ کم ہو۔ تو ادھر ادھر سے فائر ہوتے ہیں۔ پولیس کے اکتیس ہزار (۳۱۰۰۰) لوگوں میں سے ابھی تک صرف گیارہ ہزار حاضر ہوئے ہیں۔ مگر اس زمانے میں تو یہ تعداد صرف چھ ہزار تک رہ گئی تھی۔ وہ بھی صوبہ بھر

میں گڑبڑ ہوئی۔ کہیں ایک سپاہی، کہیں دو دو اور کہیں چند مٹھی بھر لوگ۔ آج ہی نور رضا رتی صاحب کو مغربی پاکستان بھیجا گیا ہے کہ وہ وہاں سے پانچ ہزار سپاہیوں کی ترسیل کا بندوبست کریں۔

ابھی تک لاہور میں جو باتیں سنی تھیں۔ ان پر یقین کم تھا مگر اب لوگوں سے صحیح اور مستند باتیں پتہ چل رہی ہیں۔ صوبائی عصبیت نے جس انداز میں ظلم کئے ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے کہیں آگے ہیں۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑے گئے۔ بچوں کو ماؤں کے ساتھ بدفعلی پر مجبور کیا گیا۔ ایک کیپٹن کو ایک مجمع نے صرف مکوں، گھونسوں اور تھپڑوں سے مار ڈالا۔ ایک اور آدمی کو قتل کرنے کے لئے پہلے اس کے دونوں ٹخنوں پر گولیاں ماری گئیں، پھر دونوں گھٹنوں پر۔ پھر دونوں کندھوں پر۔ اور اسے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ کئی ہسپتالوں سے خبریں ہیں۔ کہ وہاں غیر بنگالیوں کا سارا خون نلکی کے ذریعے نکال لیا گیا۔ انسان یہ باتیں سن کر حیران رہ جاتا ہے۔ بنگلہ دیش کا تقاضا تو سمجھ میں آتا ہے۔ مگر غیر بنگالیوں کا قتلِ عام سمجھ میں نہیں آتا۔ خصوصاً جبکہ ان میں وہ لوگ ہیں جو بنگال کے علاوہ اور کسی جگہ رہے ہی نہیں۔

.. ..

.. ..

رات کو اکبر صاحب کے ہاں کھانا کھایا۔ اور بعد ازاں چند شاعروں کے بڑے اشعار سنے یعنی مرے پہ سو درّے۔

<u>بدھوار۔ ۲۶ رمئی ۱۹۷۱ء</u>

<u>ساڑھے گیارہ بجے رات</u>:۔ عام سا دن۔ صبح دفتر۔ دوپہر آرام۔ شام بارش میں پیج میں گپ شپ، اور باقی حصہ رات کو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں دعوت۔

صبح ہی صبح دفتر سے لاہور بشریٰ کو کال بک کی۔ جو بعد از خرابیٔ بسیار ساڑھے بارہ بجے ملی۔ بشریٰ ٹھیک ٹھاک تھی۔ ہنو نے بھی دو چار جملے بولے۔ بشریٰ نے بتایا کہ بچے بہت اداس ہیں۔ انھیں ابھی میرا خط نہیں ملا۔ مگر یہاں سے جانے والوں نے انھیں فون پر میرے پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔

آج دفتر میں جلال الدین صاحب سے ملاقات ہوئی جو سنٹرل گورنمنٹ میں منسٹری آف انفرمیشن میں DIRECTOR OF FILM PUBLICATINS ہیں۔ وہ پچھلے چار ہفتوں سے گھوم پھر کر فلم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کئی جگہ فوٹو گرافی کی۔ اور کئی لوگوں سے انٹرویو کئے۔ جن میں سے بعض تو خود شکار ہوئے تھے۔ اور بعض عینی شاہد تھے۔ ان کی بات چیت کی ریکارڈنگ کوئی آٹھ گھنٹے کی تھی۔

انہوں نے بتایا کہ وہ پہلے بھی آئے تھے۔ اس وقت تاریخ پندرہ مارچ تھی۔ اور مجیب کی "حکومت" تھی۔ صوبائی گورنمنٹ کے تمام لوگوں نے انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ مشکل اپنے علاقے سے باہر نکل سکتے تھے۔ (وہ کرمی ٹولہ میں ٹھہرے تھے) دس دن کے بعد نامراد واپس لوٹ گئے تھے۔

اب پھر آئے تھے۔ مجیب کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ اس دفعہ وہ فوج کے ہمراہ ہی نکل گئے تھے۔ شتے ۔ ندوار سے کچھ پرچند قصے سنائے جو بالکل مصدقہ ہیں۔ اس لئے کہ ان مقامات کی فوٹو بھی ساتھ ہوتے تھے۔ ان میں ادھ سڑی لاشوں، گدھوں اور کتوں کی تصویریں بھی تھیں اور تازہ قبروں کے منظر بھی تھے۔

میمن سنگھ کے محلہ شانتی پاڑا کو ایسٹ پاکستان رائفلز اور مجیب کے حامیوں نے گھیر لیا۔ اس محلہ میں سبھی غیر بنگالی تھے۔ پہلے مردوں کو گولیوں سے قتل کیا گیا۔ پھر ان کی بیویوں بہنوں اور ماؤں سے کہا گیا کہ ان کی قبریں کھود دیں۔ آپ یہ سے بارش ہو رہی تھی اور مائیں اپنے بچوں کی قبریں کھود رہی تھیں ـــــ کسی کی آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ کسی کے بازو کاٹ دیئے گئے تھے۔ کسی کا سر غائب تھا۔ اور اس سارے کام کی نگرانی مسلح لوگ کر رہے تھے ـــ قبریں کھد چکیں۔ تو جیل کے دروازے کھول دیئے گئے اور اندر سے قیدیوں کو ان عورتوں پر چھوڑ دیا گیا۔ جنہوں نے جی بھر کر بدفعلی کی۔ اور گھروں کو لوٹا۔ پھر ان سب کا قتل عام کیا گیا ـــ چند عورتیں جو باقی بچ گئیں۔ آج ڈھاکہ کے ریلیف کیمپ میں اپنی کہانی سنانے کو موجود ہیں۔ جہاں صوبائی حکومت کے بنگالی کارندے مارشل لا کے باوجود ان سے بُرا سلوک کر رہے ہیں، مگر مخیر غیر بنگالی لوگ ان کی مدد کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہ عورتیں تھیں جو ایک مسجد میں چھپ جانے کی وجہ سے بچ سکیں۔ اس گاؤں کے اوپر اب بھی گدھ منڈلا رہے ہیں اور فرشوں پر جہاں لوگوں کو گھسیٹا گیا تھا گوشت کے گلے سڑے چیتھڑے لگے ہیں۔ تعفن سے سارا علاقہ خراب ہے۔ اور کوئی گھر ایسا نہیں جس کے صحن میں قبریں نہ بنی ہوں۔

راج شاہی سے چالیس میل دور ساناہار (SANTA HAR) قصبہ ہے۔ جس کی ۵۰ ہزار کے قریب آبادی تھی۔ اس میں بیس ہزار کے قریب غیر بنگالی تھے اور باقی بنگالی تھے۔ غیر بنگالیوں میں سے صرف تین ہزار زندہ بچے۔ باقی سب کو مار ڈالا گیا۔ عورت اور بچے کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔ کسی لاش کو دفنایا نہ گیا۔ کئی دن بعد جب پاکستانی فوج وہاں پہنچی۔ تو انہوں نے کوئی چھ ہزار لوگوں کو دفنایا۔ مگر ابھی بھی لاشیں کھلی فضا میں گل سڑ رہی ہیں۔ ان کے کئی ایسی فوٹو لئے گئے ہیں جن میں عورتوں کی چھاتیاں کاٹی ہوئی ہیں۔ اور پرائیویٹ حصوں کو چاقو سے پھاڑا گیا ہے۔ شیر خوار بچوں کے پیٹ آر پار کاٹے ہیں اور کئی لاشیں ایسی تھیں جن کو صرف شاہ رگ سے ذبح کیا گیا ہے تاکہ وہ تڑپ تڑپ کر مریں۔ ایسا ہی ایک آدمی ہسپتال میں ہے۔ جو نہ کھا سکتا ہے۔ اور نہ ہی تک بول سکتا ہے۔ وہ زیر علاج ہے۔

چٹاگانگ میں ذرا سائنٹفک طریقے سے موت کا تماشا دکھایا گیا۔ عوامی لیگ کے کارکن غیر بنگالیوں سے تقاضا کرتے تھے کہ بنگلہ دیش سے وفاداری کے اظہار میں خون کا عطیہ بلڈ بنک میں دیں۔ کسے انکار کی مجال تھی۔ وہاں جب خون دینے گئے تو کرسی پر بٹھا دیا۔ اور رسی سے باندھ دیا۔ اور بازو سے نلکی لگا کر سارا خون بہہ جانے دیا۔ اس طرح خون کے کتنے ہی ڈرم اکٹھے کئے گئے۔ اور وہ لوگ کرسی ہی جکڑے جکڑے مرجاتے۔ اس تماشے کے ایک شاہد کا انٹرویو لیا گیا۔ جو ایک گٹر (GUTTER) میں چار دن چھپا رہا اور آہستہ آہستہ مرنے والوں کی چیخیں سنتا رہا۔

جلال الدین ہی نے بتایا کہ سترہ مئی کے لندن ٹائمز میں پیٹر ہیزل ہرسٹ (PETER HAZEL HURST) کا مضمون ہے۔

اس نے کتی باہینی کے ایک سیکٹر کمانڈر میجر چوہدری کا انٹرویو شائع کیا ہے۔ جس میں میجر چوہدری نے غیر بنگالیوں کے قتل کی ضرورت کا فلسفہ بیان کیا ہے وہ یہ کہ جتنے لوگ غیر بنگالی ہیں ان کی ہمدردیاں مغربی پاکستان کے ساتھ ہیں۔ اس لئے خالص بنگلہ دیش میں ان کا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔

کرنل عبدالحیٔ جو ایک ڈاکٹر تھا اور جس نے شین گن سے اپنے افسر کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ڈائری حال ہی میں پکڑی گئی ہے۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ ہمارے لئے سب غیر بنگالیوں کو مارنا ممکن نہیں۔ مگر ان کے دل میں دہشت پھیلانا ممکن ہے۔ اس لئے جو قابو میں آئیں انہیں اتنی اذیت دے دے کر مارو کہ باقی سب غیر بنگالی خوف اور دہشت سے بھاگ جائیں۔

ایسی کہانیاں قدم قدم پر بکھری ہیں۔ یہ بذاتِ خود افسوسناک ہے۔ مگر جو حقیقت اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ وہ یہ کہ آج بھی مشرقی پاکستان کے کئی لوگ اس بربریت کی مذمت کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو اس کے باوجود مظلوم گردانتے ہیں۔ سیاسی سطح پر نہیں بلکہ تشدد کی سطح پر بھی ——— چند لوگوں نے اسے ضرور بُرا بھلا کہا ہے مگر بہت بڑی تعداد صوبائی تعصب سے اتنی اندھی ہو گئی ہے کہ ان کو یہ کوئی ظلم نظر نہیں آتا۔ بلکہ اُلٹا فوج کو ملعون کرتے ہیں کہ انہوں نے ظلم کیا۔ . . . .

. . . .

آج صبح سے ایک سوال میرے ذہن میں بار بار اُٹھ رہا ہے۔ کیا یہ بربریت جس کا مظاہرہ بنگالی قومیت کے نام پر کیا گیا۔ محض ایک وقتی جذبہ تھا یا اس کا مغربی پاکستان کے لوگوں کے کردار سے کوئی مستقل تعلق ہے؟ اور پھر جس طرح پاکستان کو توڑ کر بنگال کو ہندوستان کے مطیع کرنے یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کی سازش کی گئی۔ کیا یہ بھی ایک عارضی جذبہ ہے یا اس کی بھی گہری جڑیں جذبات یا نفسیات میں ملتی ہیں۔

اس سوال کے مناسب جواب کے لئے مشرقی پاکستان کے خطے کی پرانی ہسٹری کا سنجیدگی سے گہرا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ ویسے اپنی زندگی میں مجھے تین مثالیں ملی ہیں۔

سب سے پہلے ۱۹۴۷ء کے فسادات تھے۔ جب پورے برِعظیم میں ہندو مسلم فسادات پھیلے تھے تو سب سے زیادہ بربریت کا مظاہرہ بنگال اور بہار کے فسادات میں ہوا تھا۔ (اخباری خبروں کے مطابق) خصوصاً نواکھالی میں۔ پھر تین سال پہلے جب صدر ایوب کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ تو امریکہ کے اخباروں نے فوٹو شائع کئے تھے جن میں چند لوگوں کو عوام دشمن قرار دے کر درختوں کے تنوں پر میخوں سے گاڑ دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مقامی اور غیر مقامی کا سوال نہ تھا اور مرنے والے خالص بنگالی تھے۔ اور اب ۱۹۷۱ء میں یہ سب کچھ اس شدت سے ہوا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب نہ صرف یہ کہ مسلمان نے مسلمان کو مارا۔ بلکہ بنگالی قومیت کے نام پر مسلمان نے ہندو کے ساتھ مل کر مسلمان کو مارا۔ اور ہندوستان کی وزیرِاعظم مسز اندرا گاندھی نے اعلان کیا کہ بنگلہ دیش اور ہندوستان کی آپس میں کوئی سرحد نہیں ہے۔

نفرت کے اُبال میں قتل و غارت ہوتا آیا ہے۔ اور قابلِ فہم بات ہے۔ مگر قتل کرنے کے عمل میں ایک لذت حاصل کرنا قابلِ فہم نہیں خصوصاً جب اس لذت کی خواہش کا اظہار ربع صدی میں تین موقعوں پر ہوا۔

اس خطے کی تاریخ دوبارہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً میر جعفر کے زمانے کی . . . .

. . . .

جمعرات ۲۷، مئی ۱۹۷۱ء

سات بجے شام:۔ صبح دفتر۔ سہ پہر آرام۔ اور اب ڈائری۔ ہمایوں سے کہہ کر روزنامہ THE PEOPLES کی فائل نکلوائی۔ یہ عوامی لیگ کا ترجمان پرچہ گنا جاتا تھا۔ اس فائل میں یکم مارچ ۱۹۷۱ء سے پچیس مارچ ۱۹۷۱ء تک کے پرچے ہیں۔ پرچے کیا ہیں۔ آپس میں ملی ہوئی سیڑھیاں ہیں۔ جن پر قدم بہ قدم چڑھتے ہوئے بنگال نے علیحدگی کا مسلک اختیار کیا۔

کل رات ڈیڑھ بجے تک میں یہ اخبار دیکھتا رہا۔ جن سے لحظہ بہ لحظہ پاکستان کی وحدت کے پرخچے اڑتے دکھائی دیئے۔ حتیٰ کہ پچیس اور چھبیس کی درمیانی رات کو فوج نے بالکل لغو، طور پر بنگال کو دوبارہ فتح کر کے پاکستان کا حصہ بنایا۔

جن لوگوں کا خیال ہے کہ مجیب علیحدگی پسند نہیں تھا۔ اور بنگال بھی آزاد نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ صرف ۲۳ مارچ کے شمارے کے پہلے صفحے پر ایک نظر ڈال لیں تو انہیں کوئی شک نہیں رہے گا۔ من جملہ دیگر چیزوں کے ایک خاص چیز بنگلہ دیش کا جھنڈا ہے جس کی تصویر دو کالم پر پھیلی ہے۔ اس کے نیچے درج ہے:

"A NEW FLAG IS BORN TODAY — A FLAG WITH A GOLDEN MAP OF BANGLA DESH IMPLANTED ON A RED CIRCLE PLACED IN THE MIDDLE OF A DEEP GREEN RECTANGLE BASE. THIS IS THE LATEST FLAG ADDED TO THE TOTAL LIST OF THE FLAGS REPRESENTING VARIOUS STATES AND NATIONS OF THE CONTEMPORARY WORLD. THIS IS THE FLAG FOR INDEPENDANT BANGLADESH. THIS IS THE FLAG THAT SYMBOLISES THE EMANCIPATION OF 75 MILLION BANGALESE"

جو الفاظ مجیب نے اپنے لب سے نہیں کہے وہ اس کے ترجمان نے بانگ دہل نشر کئے۔ کیا اس اعلان کے بعد بھی ۲۵ مارچ کا ایکشن غلط اور بے معنی کہا جا سکتا ہے؟: دنیا کی کس قوم نے کس زمانے میں اپنے کس صوبے کے خلاف ایسے اعلانات کے بعد ایکشن نہیں لیا؟ دراصل ہماری قوم تاثرات کی ٹانگوں پر چلتی ہے۔ اور نعروں کے شور پر پلتی ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے کوائف اکٹھے کر کے اُن سے منطقی نتائج اخذ نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے کبھی خرد کو جنون کہہ اٹھتی ہے۔ اور کبھی جنون کو خرد بنا جاتی ہے

مگر یہ بے چاری قوم کرے بھی کیا؟ کس حکومت نے کبھی عوام کو پورے کوائف بتائے ہیں؟:۔ کوئی منچلا کہہ اٹھے گا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ بات یہ بھی ٹھیک ہے۔

اس فائل کے اخبار اس امر کی شہادت ہیں کہ کس طرح لوگ ایک ایک کر کے بنگلہ دیش کے نعرے میں شریک ہوئے۔

بالکل ایسے لوگوں کی طرح جو ہجوم کے سامنے اپنے آپ کو بے بس دیکھ کر اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مختلف تجارتی فرموں نے اشتہارات میں نئی قوم۔ نئے ملک اور بنگلہ دیش جیسی اصطلاحوں کا استعمال شروع کیا ہے۔

۱۲، مارچ کے پرچے کے پہلے صفحے کے ایک چوتھائی حصّے پر ایک بنک کا اشتہار ہے۔ انگریزی کے اخبار میں اشتہار کا متن بنگالی میں ہے اور بنگلہ دیش کے بہت بڑے نقشے پر سورج طلوع ہوتا دکھایا گیا ہے۔

۲۳، مارچ کے صفحہ پانچ پر آدھا ہی بڑا اشتہار ہے۔ مشرقی پاکستان کے بہت بڑے نقشے پر مجیب کا فوٹو ہے۔ اور جلی قلم میں لکھا ہے

"DEDICATED TO THE DEVELOPMENT OF BANGLADESH"

.. ..

.. ..

فوج نے ایکشن ۲۵، مارچ اور ۲۶، مارچ کی درمیانی رات کو کیا۔ مگر اس سے چوبیس گھنٹے پہلے جو اخبار چھپا ہے۔ وہ ۲۵ مارچ کی صبح کو مندرجہ ذیل ایڈیٹوریل کے ساتھ آتا ہے۔

"AFTER THEIR SHAMELESS AND MONSTROUS PEREORMANCE IN THE FIRST WEEK OF MARCH IT WAS EXPECTED THAT THE IRRESPONSIBLE AND WORTHLESS MEMBERS OF THE ARMY WOULD DESIST FROM FURTHER ACTIVITIES OF THE ATROCITIES. WE THOUGHT SO BECAUSE OF TWO SPECIFIC REASONS; FIRSTLY BECAUSE THE NOTORIOUS ARMY OF PAKISTAN WHICH WON ONLY TWO BATTLES i.e. DEFEATING THE DEMOCRACY IN 1958 AND IN 1969, HAD AT LAST FOUND ITS WATERLOO AND TRAFALGAR AT DACCA AND VARIOUS OTHER PLACES OF BANGLA DESH IN 1971 THROUGH THE INDOMITABLE SPIRIT AND UNFORESEEN RESISTANCE FROM THE PEOPLE OF BANGLA DESH ....

اور یہ ایڈیٹوریل اس لئے لکھا گیا کہ ایک دن پہلے چھاؤنی کے علاقے میں فوج نے کالے جھنڈے کاروں سے اتروائے تھے۔

چند اور جھلکیاں

۲۴، مارچ کا اخبار۔ بہت بڑی سرخی۔

DAWN OF A NEW ERA IN BANGLA DESH

ایک اور سرخی :-

A FLAG OF FREEDOM IS BORN WITH
STAINS OF MARTYRS BLOOD

اس خبر کا متن یوں ہے۔

"A NEW NATION IS BORN. AND WITH IT HAS BORN A NEW FLAG WITH STAINS OF MARTYR'S BLOOD—THE FLAG OF SHAWDHIN BANGLA. IN THE SERENE CALM OF THE DAWN OF MARCH 23 RD THE NEW FLAG HOISTED ATOP ALL PUBLIC AND PRIVATE BUILDINGS ...."

اس خبر کے پہلو میں صفحے کے اوپر کارٹون ہے جس میں سارے شہر پر بنگلہ دیش کے جھنڈے ہیں۔ صرف قلعے میں صدر یحییٰ اور بھٹو کھڑے ہیں۔ اور ان پر پاکستان کا جھنڈا ہے۔ قلعے سے توپیں جھانک رہی ہیں۔ بھٹو دوربین سے دیکھنے کے بعد صدر سے کہہ رہے ہیں:

SIR, I DO NOT SEE ANY SIGN OF PAKISTAN ANYWHERE ELSE

اس کے نیچے ۲۳ مارچ کی تاریخ ہے۔

اسی صفحے پر ایک بڑی تصویر ہے جس میں طلبا بنگلہ دیش کے جھنڈے کے نیچے سیلوٹ لے رہے ہیں JA YO BANGLA BAHINI کا سیلوٹ اس اخبار کے آخری صفحے پر ہے۔

RESISTANCE DAY IN PICTURES

یہ ۲۳ مارچ کی تصویریں ہیں۔ جو پاکستان کا قومی دن ہے مگر اس اخبار نے اسے RESISTANCE DAY کے طور پر پیش کیا ہے۔

ان تصویروں میں شیخ مجیب الرحمان بنگلہ دیش کے جھنڈے کے نیچے سلامی لے رہے ہیں .. ..

آج شام لطف الرحمان (ہمارا بنگالی دوست) کے ہاں چائے پر گئے۔ یہ بہت بھلا آدمی ہے۔ جس کی شخصیت سے خلوص اور نیک دلی کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ سچا پاکستانی ہے۔ اس شخص کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں ہماری اجنبیت کا احساس کچھ کم ہوا۔
پچھلے ہفتے ڈھاکہ میں دس جگہ بم وغیرہ پائے گئے تھے۔ اور چند ایک پھٹ گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں فوج نے کل ایک علاقے کو گھیرے میں لے کر کچھ لوگوں کا صفایا کر دیا۔

جمعہ، ۲۸ مئی ۱۹۷۱ء

شام پانچ بجے :- آج صبح چیف سکریٹری کے پاس میٹنگ تھی۔ اس کے بعد کیمپ دیکھنے گئے۔ جو ان غیر بنگالی لوگوں پر مشتمل ہے۔ جو علیحدگی پسندوں اور ہندوستانی ایجنٹوں کے جنون کا نشانہ بنے۔ محمد پور کے علاقے میں ایک سکول میں مین کیمپ بنایا گیا ہے۔ اور ساتھ دو چھوٹے کیمپ ہیں۔ وہیں ایک ہسپتال بھی ہے۔ ویسے تو یہ کیمپ سرکاری نگرانی میں ہے۔ مگر عام شکایت یہ ہے کہ صوبائی حکومت جو ۹۹ فی صد بنگالیوں پر مشتمل ہے جان بوجھ کر تساہل سے کام لے رہی ہے۔ مگر دہلی مہاجرین نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ اور ہر قسم کی ایسی مدد مہیا کی۔ جو یہاں کا بنگالی ریلیف کمشنر، سنٹرل گورنمنٹ کی فیاضانہ پیش کش کے باوجود نہیں دیتا۔ انجمن مہاجرین کے صدر دیوان وراثت علی ہیں۔

ہمارے پہنچنے کے وقت کیمپ کی آبادی درج ذیل تھی:-

محمد پور کیمپ	۲۲۸۰ افراد	(۶۳۹ گھرانے)
میرپور کیمپ	۶۲۶ افراد	(۱۵۵ گھرانے)
بالغ مرد	۶۱۶	
بالغ عورتیں	۱۲۱۶	
نابالغ لڑکے	۴۲۵	
نابالغ لڑکیاں	۴۵۱	
شیر خوار بچے	۲۷۱	
یتیم	۲۷	(۱۶ لڑکیاں، ۱۱ لڑکے)

دیوان وراثت علی ساٹھ سال کے بزرگ ہیں اور نحیف ہونے کے باوجود بڑے حوصلے اور جذبے سے کام کر رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیوان صاحب نے بتایا چٹاگانگ میں بہت تباہی ہوئی۔ میں کافی دن بعد وہ ریسٹ ہاؤس دیکھنے گیا جو MISKAH ہوٹل کے سامنے ہے۔ اور شہر کے سترہ ذبح خانوں میں سے ایک تھا۔ ذبح خانے سے مراد وہ جگہ تھی۔ جہاں غیر بنگالیوں کو بے جا کر قتل کیا جاتا تھا۔ وہاں فرش پر خون کی پپڑیاں جمی تھیں اور مکھیوں کے ہجوم بھنبھنا رہے تھے۔ نظارہ اتنا دلدوز اور دہشت انگیز تھا کہ میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔

انجمن کے اراکین سے بات چیت کے بعد ہم کیمپ میں گئے۔ بے چارگی اور کس مپرسی کی ایسی انتہا تھی کہ الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ ایک ایک کمرے میں پندرہ پندرہ بیس بیس عورتیں بچے اور مرد اپنے ناکافی لباس میں فرش پر بسیرا کئے تھے۔ نالیوں میں چونے اور ان کا تکا مہتروں کے باوجود صفائی کی حالت تسلی بخش نہ تھی۔ مگر ہم زیادہ گھوم نہ سکے۔ کیونکہ عورتوں کی نظروں میں سوال تھے۔ مردوں کی آنکھوں میں طعنے تھے۔ اور مجھے کچھ احساس گناہ سا ہونے لگا کہ ان کی مصیبت کا تماشہ دیکھنے آئے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی سے اس کی داستان

پوچھنے کی بھی ہمت نہ پڑی۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر پکے پھوڑے کی طرح پھٹ پڑنے کو تیار تھے۔

ایک کمرے میں چند معصوم بچے تھے۔ جن کا اب کوئی سہارا نہ تھا۔ ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن سب مارے گئے تھے۔ بچوں کی عمریں چار ماہ سے پانچ چھ سال تک تھیں۔ چند نیک دل عورتیں ایک دو بچوں کو دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بچے اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ نہ تو کوئی رو رہا تھا اور نہ ہنس رہا تھا۔

ہسپتال کا حال بھی غیر تسلی بخش تھا۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق زیادہ تر SERIOUS کیس تو ٹھیک ہو کر جا چکے تھے۔ مگر ابھی کئی بری حالت میں تھے، چند لوگوں نے زیادہ متاثر کیا تو میں نے کیمرے سے ان کی تصویریں بھی لیں۔ مثلاً

۱۔ رابعہ مہراب بازار کی خاتون ہے۔ جوان عمر ہے۔ کوئی ۲۵ برس کی۔ کندھے پر کلہاڑی کے زخم اور ہنسلی کی ہڈی ٹوٹی ہوئی۔ زخم تو اب ٹھیک ہو رہے تھے۔ مگر بھرے پرے گھرانے کے مرے ہوئے لوگ اب کہاں سے واپس آئیں گے۔

۲۔ مہراب بازار ہی کے چار بھائی تھے۔ ماں باپ دونوں مارے گئے تھے۔ ایک شدید زخمی تھا۔ عمریں تین سال سے آٹھ نو سال تک کی ہوں گی۔

۳۔ میمن سنگھ کے عزیز الحق کے ہاتھ کی ساری انگلیاں ٹوکے سے کاٹ دی گئی تھیں اور کمر پر چھروں کے تیرہ نشانات تھے۔ اس کے بھی سارے گھر والے مارے گئے تھے۔

۴۔ بارہ سالہ شمیم بھی میمن سنگھ کا تھا۔ سر پہ گہرا زخم پٹی میں چھپا تھا۔ اور اس کے اندر وہ دماغ تھا جو اب چل گیا۔ لڑکا صدمے سے نیم پاگل تھا اور باپ لاپتہ تھا۔

کیمپ سے واپسی پر میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ صوبائی عصبیت میں بنگال کے لوگ انسانیت بلکہ حیوانیت کی حدوں کو بھی پھلانگ گئے اور قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ یہ اس چیز پر نادم نہیں۔ بلکہ ان کی آنکھوں میں کچھ اور کرنے کی دبی دبی تمنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ موقع ملتے ہی یہ پھر وہی کچھ کریں گے۔ ان کے اندر کا جذبہ صرف سویا ہے۔ مرا نہیں۔

میں سوچتا ہوں ہندو کتنا ہوشیار اور چالاک نکلا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اس کی تلواریں ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ تو اس نے اس کامیابی سے علاقائی تعصب اور صوبائیت کا بیج بویا کہ مسلمان خود مسلمان کا گلا کاٹنے لگ گیا۔ اور وہ انسان دوستی کا نعرہ لگا کر اب ہم پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ مغربی پاکستان والے ابھی تک ہندو کی چال سے سبق نہیں لے سکے۔ بلکہ جو کچھ آج سے پانچ سال پہلے یہاں ہوتا رہا ہے وہی اب وہاں بھی ہونے لگا ہے اور جو آج یہاں ہو رہا ہے۔ خدانخواستہ پانچ سال ادھر نہ ہونے لگے۔ اور یہ بعید از قیاس اس لئے نہیں کہ ہم نے اپنی نئی نسلوں کو کبھی یہ بتانے کی کوشش نہ کی کہ پاکستان بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہی نسلیں جب بڑی ہوتی ہیں تو ہندو کے اس پروپیگنڈے میں پھنس رہی ہیں کہ تقسیم ہند غیر ضروری تھی اور پاکستان کا بننا غیر ضروری تھا۔

آج کا نظارہ ایک عبرت آموز سبق تھا کہ نظریاتی احساس رکھنے والی قوم کا یقین متزلزل ہو جائے۔ تو وہ اپنے ہاتھوں اپنا

چاک گریبان کرتی ہے۔ اور دامن دریدہ کرتی ہے۔ اور اُس کے دشمن۔ نہ صرف اُسی پر ہنستے ہیں بلکہ گلی کے آوارہ لڑکوں کی طرح پتھر مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔

آٹھ بجے شام شام کو اظہر کے ہاں گئے (جو بنگالی ہے۔ اور ہماری سروس کا ہے) کافی لوگ چائے پر مدعو تھے۔ اور ادھر اُدھر کی باتوں سے وقت ٹال رہے تھے کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس سانحے پر بات کرتا جو اس ملک اور قوم پر نہ صرف گزرا ہے بلکہ گزر رہا ہے۔

ہماری قوم کی پرانی عادت ہے کہ حقیقتوں سے گریز کرتی ہے۔ حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتی۔ میدانِ جنگ میں بہادر ترین قوم ہونے کے باوجود عام زندگی میں بزدل ترین قوم ہے۔ جو سچ کہنے اور سچ سننے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ اور اخلاقی جرأت سے ایک دم خالی ہے۔

ہفتہ ۲۹ رمئی ۱۹۷۱ء

صبح بارہ بجے تک گورنر ہاؤس میں ہفتہ وار میٹنگ میں مصروف رہا۔ شام کے قریب انجمن مہاجرین کے صدر دیوان وراثت علی ملنے آئے۔ (ساتھ ان کا لڑکا بھی تھا۔ جو جگن ناتھ گورنمنٹ کالج میں اردو کا لیکچرر ہے) اور جنرل سکرٹری عبدالودود بھی تھے۔ .. ..

.. .. مشرقی پاکستان میں اکا دکا واقعات ہو رہے ہیں۔ کہیں بم۔ کہیں سرکاری خوراک کی لوٹ مار۔ کہیں ریلوے کے ڈبوں کی چوری اور کہیں فائرنگ وغیرہ۔ چار روز پہلے ڈھاکہ میں جو بم حبیب بنک کی بلڈنگ میں پھٹا تھا۔ وہ بنک کے ڈرائیور نے رکھا تھا۔ غالباً اسے کوڑوں کی سزا ملے گی۔

اتوار۔ ۳۰ رمئی ۱۹۷۱ء

کوئی دس بجے کے قریب دو اصحاب ملنے آئے۔ تعارف کرایا۔ کہ دیوان وراثت علی نے بھیجا ہے۔ جن سے میں نے درخواست کی تھی کہ میں ایسے لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں جو اس قتل و غارت کے عینی شاہد ہوں۔

یہ دونوں حضرات کیمپ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

نثار احمد صاحب پچاس برس کے دھان پان مہاجر ہیں۔ یوپی سے ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان آئے۔ اور اب میمن سنگھ میں اپنی چھ لڑکیوں اور دو لڑکوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ریلوے گارڈ تھے۔ ان کی کالونی میں صرف دو گھر بہاریوں کے تھے۔ مگر ذرا فاصلے پر نیو کالونی NEW COLONY تھی۔ جس میں پندرہ بیس بہاری گھرانے تھے۔

نثار صاحب نے بتایا۔

"نیو کالونی میں میری بھانجی کا شوہر رہتا تھا۔ مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران ہم سب لوگوں کی خواہش اور کوشش تھی کہ

بنگالیوں میں ان ہی کا حصہ بن کر رہیں۔ میری دونوں لڑکیوں نے دسویں کا امتحان بھی بنگالی میڈیم سے دیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ ہمارے کسی کام نہ آیا۔

"فروری ہی میں جلوس نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کے انداز خوفناک ہوتے۔ ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتے تو نعرہ لگاتے "بنگلہ چھوڑ دو" اس وقت ہمارے ہمسائے اور دوست بھی غیر جانبدار بنے رہتے۔ شہر کے پرلے کنارے پر ایک سڑک کے قریب فوجیوں کا پڑاؤ تھا۔ یہ جلوس وہاں تک جاتے اور ان کی بے عزتی کرتے۔ مگر وہ خاموش رہتے۔

"۱۶ اپریل کی بات ہے۔ بہت تناؤ تھا۔ ہم سہمے ہوئے تھے۔ میں نیو کالونی میں اپنی بھانجی کے خاوند کے پاس مشورہ کرنے گیا۔ تو دور سے گولیوں کی آواز سنی۔ ہم خوش ہوئے کہ شاید فوج آگئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد امن کمیٹی کے لوگ آ گئے اور انہوں نے بتایا کہ محلہ تسا کی پاڑا (بہاریوں کی کالونی —— آبادی آٹھ ہزار) پر حملہ ہوا ہے۔ آدھی آبادی صاف ہو گئی ہے۔ اور تھوڑی دیر میں باقی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لئے آپ لوگ بھاگ جائیں۔

انہوں نے بتایا کہ فوج کی بھی ناکہ بندی کر کے ان کا راشن بند کر دیا گیا ہے۔"

"میں بھاگ کر اپنے کوارٹر میں آیا۔ اور سب ماجرا گھر والوں کو سنایا۔ بچے رونے لگے۔ کوئی دعا کرنے لگا۔ کوئی قرآن پڑھنے لگا۔ مگر رات کو ہم کہاں جا سکتے تھے۔ بہت پریشانی میں جوں توں کر کے رات کاٹی۔ صبح ہم نے بنگالی ہمسایوں کی منت کر کے مدد مانگی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی پناہ دینے کو تیار نہ تھا۔ حیرت اس بات کی تھی کہ ان میں سے بھی بیشتر اپنے بیوی بچوں کو شہر سے باہر گاؤں وغیرہ میں بھجوا رہے تھے۔

"صبح دس بجے پھر گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم لوگ دعا مانگتے رہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ اور کچھ کر نہ سکتے تھے۔ مدد دینے کو کوئی تیار نہ تھا۔ نکل کر کہیں جا نہ سکتے تھے اس کے علاقے میں ہم بھاگ بھی کہاں سکتے تھے۔

"ایک دفعہ سجدے میں گرا دعا مانگ رہا تھا۔ تو اچانک خیال آیا کہ جن بنگالیوں نے اپنے بچوں کو باہر بھجوا دیا ہے۔ ان کے کوارٹر خالی پڑے ہیں۔ کیوں نہ وہاں جا کر چھپ جائیں۔ اگر چپکے سے بھاگ کر وہاں پہنچنے تک کامیاب ہو گئے۔ تو شاید فوج کے آنے تک بچ سکیں۔

"میری چھوٹی بچی چار سال کی تھی۔ اس کو رونے سے روکنے کے لئے ہم نے روٹیاں اٹھائیں۔ اور چپکے سے قریب کے ایک کوارٹر تک پہنچ گئے۔ یا تو کسی نے ہمیں جاتے ہوئے دیکھا نہیں۔ اور اگر دیکھا تو ترس کھا کے چپ ہو رہا ہوگا۔

"ہم اپنی پناہ گاہ میں سے ایک سوراخ سے دیکھ سکتے تھے۔ گولیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ اور ساتھ مرنے والوں کی چیخیں بھی سنائی دیں۔ تو ہم سوراخ میں سے دیکھنے لگے۔

"اتنے میں سینکڑوں آدمی بندوقیں۔ رام داؤ۔ بلم اور بانس وغیرہ اٹھائے آئے اور ہمارے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ کوارٹر کا دروازہ توڑ دیا۔ جی بھر کر ہماری آنکھوں کے سامنے لوٹا۔ اور پھر دوسرے مہاجر کے مکان کی طرف چلے گئے۔

"اب ہم میں دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ نہ ہی معلوم ہو سکا کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوا۔ ویسے ابھی تک کسی کیمپ میں یا ڈھاکہ میں

نظر نہیں آئے ۔ یقیناً مارے گئے ہوں گے ۔

" جہاں ہم چھپے ہوئے تھے ۔ وہاں سامنے ایک میدان تھا ۔ جس میں دو آدمی مشین گن لگا کر جم گئے ۔ اور باقی سامنے والے سیدھے راستہ پر چلے گئے ۔ مشین گنوں کا رخ بھی اسی راستے کی طرف تھا کہ اگر لوگ وہاں سے بھاگ کر آئیں تو انھیں مشین گن سے گولی ماری جائے ۔ یہ راستہ ایک بہاری کالونی کو جاتا تھا جو ٹکیا پاڑا (TIKIAPARA) کہلاتی تھی ۔

" تھوڑی ہی دیر بعد اس کالونی سے تواتر گولیوں کی آوازیں آنے لگیں کبھی کبھار ہوا کے چلنے سے چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دیتیں ۔ فائرنگ تین گھنٹے تک جاری رہی ۔ پھر ہم نے دیکھا کہ وہ لوگ بہت سی عورتوں کو مویشیوں کی طرح ہانک کر لائے اور میدان میں بسوں میں بٹھا کر کہیں لے گئے ۔

" شام ہوئی ۔ بھوک پیاس سے برا حال تھا ۔ مگر خاموشی سے چھپے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا ۔ رات اسی طرح کانٹوں پر کاٹی ۔

" اگلے دن بھی مسلح گروہ اس میدان میں بار بار آتے رہے اور مختلف اطراف میں جتھوں کی شکل میں جاتے رہے ۔ ہم دن بھر سانس روک کر انھیں دیکھتے رہے اور اندر ہی اندر لرزتے رہے ۔ اگلی رات بھی ویسی کٹی ۔

" رات کو بھوک پیاس سے دو تین دفعہ بچی روئی ۔ جسے ہم نے بڑی مشکلوں سے خاموش کرایا ۔ مگر لوگوں کو شک پڑ گیا ۔ اور وہ صبح سے وقت مختلف کوارٹروں میں تلاش کرتے رہے ۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ہماری پناہ گاہ تک بھی پہنچے ۔ اور باہر کھڑے ہو کر آپس میں مشورے کرتے رہے ۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہمارے کوارٹر میں نہیں آئے ۔ اور دوسری طرف چلے گئے ۔

" دن جوں توں کر کے کاٹا ۔ اور رات کے وقت ہم اسی کالونی کے ایک اور خالی کوارٹر میں چلے گئے ۔ جو کسی بنگالی کا تھا ۔ میری لڑکیوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ سب خودکشی کر لیں ۔ مگر میرے سمجھانے پر رک گئیں ۔ لیکن اس شرط پر کہ ہم لوگ وہاں سے کہیں اور چلے جائیں ۔ اور عورتیں رہیں یہیں ۔ کیونکہ ابھی تک یہی دیکھا تھا کہ وہ صرف مردوں کو مار رہے تھے ۔ اس لئے مردوں کا جان بچانا ضروری تھا ۔

" چنانچہ عورتوں کو وہیں چھوڑ کر ہم باپ بیٹے رات کی تاریکی میں چل دیئے ۔ اور قریب ہی دوسرے کوارٹر میں جا کر چھپ گئے ۔

صبح تک پیاس سے برا حال تھا ۔ حالانکہ گندے نالے کا پانی اوک سے پیتے رہے تھے مگر پھر بھی اس وقت پیاس نے بیتاب کر دیا ۔ تو ہم اسی کالونی کے ٹیوب ویل پر پہنچ گئے ۔ وہاں جا کر ہمیں غلطی کا احساس ہوا مگر اب کچھ نہ ہو سکتا تھا ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پچاس ساٹھ لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے ۔ مگر وہ مسلح نہ تھے ۔

خوش قسمتی سے ان میں سے ایک بنگالی ہمارا جاننے والا تھا ۔ وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر مجمع سے باہر لے آیا ۔ اور تھوڑی دور مسجد میں لے گیا ۔ پھر ہماری درخواست پر وہ کالونی میں واپس گیا ۔ اور کوئی دو گھنٹے بعد ہمارے گھر کی عورتوں کو بھی مسجد میں لے آیا ۔

مسجد میں سینکڑوں لوگ تھے ، وہیں میری بیوی کے بھائی کے بیٹے ملے ۔ بھائی مارا گیا تھا ۔ اسی طرح نیو کالونی میں میری بھانجی کا خاوند بھی مارا جا چکا تھا ۔ مگر وہاں وہ حشر کا عالم تھا کہ کوئی کسی کو تسلی نہ دے سکتا تھا ۔ اور ہر شخص آنے والے لمحات کے خوف میں غرق تھا ۔

کئی ایک دن بنگالی لوگ مسجد میں کھانے کی چیزیں بھجوا رہے تھے ۔ اور بنگالی امام مسجد بڑی جانفشانی سے لٹے پٹے لوگوں کی

خدمت کر رہا تھا۔ کئی بنگالی غنڈے وہاں بھی پہنچے اور امام مسجد کو دھمکایا کہ ان لوگوں کو مسجد سے باہر نکال دے۔ مگر وہ نیک مسلمان تھا اور اس نے ہر بار انکار کر دیا۔ بلکہ وہ یہاں تک ڈٹا رہا کہ چاہے اسے مار دیں مگر وہ ان بے سہارا لوگوں کو لقمۂ اجل بننے کے لئے باہر نہیں نکالے گا۔

" ۲۴ تاریخ کو فوج آنے کی اطلاع ملی۔ تو ہم نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ شور سن کر فوج ادھر پہنچ گئی اور ہمارا حال دیکھ کر بہت سے فوجی بے اختیار رو پڑے پھر انہوں نے بندوبست کیا اور تین تاریخ کو بذریعہ ریل ہم لوگ ڈھاکہ پہنچے۔

" جن دنوں ہم مسجد میں تھے تو وہاں آپس میں بات چیت سے پتہ چلا کہ شانتی پاڑا میں ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس والوں نے قتلِ عام کیا تھا۔ ہندو بھی ان کے ساتھ تھے۔ اور ادھر اُدھر بھی ہندو نشان دہی کرتے تھے کہ فلاں جگہ بہاری رہتا ہے۔

" میری بیوی کا بھائی مولوی آدمی تھا۔ اس کے گھر میں ایک دم دو سو کے قریب ایسٹ پاکستان رائفلز کے فوجی گھس آئے۔ گھر میں پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے تھے جن میں سے ایک بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

" باپ کو بیوی بچوں کے سامنے گولی ماری۔ وہ زخمی ہو کر گر پڑے اور کلمہ پڑھنے لگے تو ایک ہندو بولا " سالے یہ کیوں پڑھتا ہے۔ بولو مجیب الرحمان زندہ باد "

" پھر دوسرے لڑکے کو بھی سب کے سامنے مار ڈالا۔ اور عورتوں سے کہا کہ تم مسجد میں جاؤ۔

نثار احمد صاحب کی بات ختم ہوئی تو وہ لمبا سانس لے کر نڈھال سے ہو گئے۔ اور کرسی کی ٹیک پر تقریباً گر پڑے۔ میں ان کی سخت جانی پر حیران ہوا اور اپنی سنگ دلی پر نادم ہوا کہ ان کی داستانِ مصیبت کو بغیر آنسو گرائے رقم کر رہا ہوں۔ پھر خیال آیا جب کسی خطے میں عناصر کی ترتیب یوں اُلٹ جائے کہ زندگی گراں اور موت ارزاں ہو جائے تو روایتی جذبات کے دھارے بھی کند ہو جاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں جب اخوت نے نفرت کا چولا بدلا۔ اور رحم اور رواداری اللہ کو پیارے ہو گئے تو حالات کا جائزہ لینے والی آنکھ کو بھی خشک ہی رہنا چاہیے۔ اگر وہ نمناک ہوئی تو منظر دھندلا جائے گا۔ اور صحیح حالات قلم بند نہیں ہو سکیں گے۔

اس عذرِ گناہ سے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے کے بعد میں دوسرے صاحب کی طرف متوجہ ہوا یہ اعجاز احمد خان صاحب تھے۔ عمر انیس برس۔ پولی ٹیکنیک میمن سنگھ کے طالب علم۔ مگر والد بہراب بازار میں سکونت پذیر تھے۔ جہاں وہ ریلوے میں FUEL CHECKER کا کام کرتے تھے۔ اور ان کی اولاد دو لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ سکول بند ہونے کے باعث اعجاز صاحب بھی بہراب بازار میں ہی اپنے والدین کے پاس تھے۔

اعجاز احمد خان نے بتایا۔

" بہراب بازار میں دو جنوری ۱۹۷۱ء سے ہی جلوس نکلنے لگے تھے۔ جس سے دل بدن کھچاؤ پیدا ہوتا گیا۔ ہماری ریلوے کالونی میں پانچ سو کے قریب کوارٹر تھے۔ جن میں سے تین سو ۳۰۰ اردو بولنے والے گھرانے تھے اور باقی دو سو کے قریب بنگالی خاندان تھے جیسے جیسے جلوسوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اور ان کے موڈ میں شدت ہوئی۔ ہماری کالونی میں کھچاؤ بڑھتا گیا۔ ہم لوگ زیادہ تر سہمے ہوئے تھے۔ کہ ہم میں سے کافی کے پاس ہتھیار وغیرہ تھے۔

" ۲۵ مارچ کو گنگ جارج ششم ریلوے پل پر رنگ و روغن ہو رہا تھا کہ وہاں کام کرنے والے مزدور عوامی لیگ کے لیڈروں کے

اکسانے پر اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے ہماری کالونی پر حملہ کر دیا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ حملہ ایک خاص مقصد کے تحت تھا۔ اور اس سے ان کا ارادہ قتل و غارت نہ تھا۔ وہ ایسے معلوم ہوا کہ جن لیڈروں نے ان کو اکسایا تھا۔ وہی ہمیں بچانے آ گئے اور ہمیں مشورہ دینے لگے کہ ایسے حملوں سے بچنے کے لئے آپ لوگ کیمپ میں منتقل ہو جائیں۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہماری غیر موجودگی میں یہ ہمارے گھروں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم نے انکار کر دیا۔"

"اگلے دن پھر حملہ ہوا اور حملہ کرنے والوں میں اکثریت رام داؤ۔ بلم اور کلہاڑیوں سے مسلح تھی۔ انہوں نے ایک شخص کو مار دیا۔ مگر مزید نقصان سے پہلے عوامی لیگ کے لیڈر پہنچ گئے اور کہا کہ اگر آپ لوگ کیمپ میں نہیں جائیں گے تو یہ لوگ آپ کو مار ڈالیں گے اور ہم آپ کی حفاظت نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ مجبوراً ہم لوگ مان گئے۔

"کیمپ پانچ عمارتوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سے ایک عمارت یونائیٹڈ بنک کی تھی اور دوسری مسلم کمرشل بنک کی۔ دونوں بنکوں کو پہلے ہی لوٹ لیا گیا تھا۔ کیمپ میں کوئی سولہ سو لوگوں کی نفری تھی جس میں پانچ چھ سو مرد تھے۔

"کیمپ میں ہمیں باہر گھومنے پھرنے کی خاصی آزادی تھی۔ ہم شہر بھی جا سکتے تھے۔ اپنے گھروں سے جا کر چیزیں بھی لا سکتے تھے اور بعض لڑکے چھپ چھپا کر سینما بھی دیکھ آتے تھے۔ عوامی لیگی لیڈر ہمیں تسلیاں دیتے تھے کہ آپ لوگ فکر نہ کریں۔ کچھ نہ ہوگا۔ آپ دیکھ لیں آپ کے گھروں کی بھی ہم حفاظت کر رہے ہیں۔ پولیس کے اوسی نے ایک بنگالی کو رائفل دے کر ہمارا چوکیدار مقرر کیا تھا۔ اور ہم سب لوگ اسے پانچ روپے روزانہ دیا کرتے تھے۔"

"چودہ اپریل کو دو ہوائی جہاز نیچی پرواز کرتے ہوئے ہماری بستی کے اوپر سے گزرے تو نیچے سے ایسٹ پاکستان رائفل والوں نے مشین گنوں سے ان پر فائرنگ کی۔ اسی دن ہمارا چوکیدار غائب ہو گیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ عوامی لیگ کے تمام کارکن اور لیڈر بھی چپکے سے غائب ہو گئے ہیں۔

"شام چھ بجے کے قریب عوامی لیگ کے چند لیڈر آئے اور کہا کہ پاک آرمی قریب آ گئی ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو ہم یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے استفسار پر انہوں نے کہا کہ آپ کو آشو گنج منتقل کرنا چاہتے ہیں جو قریب ہی ہے۔ مگر ہم نے انکار کر دیا۔ اور دل میں خوش ہوئے کہ پاک فوج کے آنے سے ہماری مصیبت ختم ہو جائے گی۔

"لیکن تھوڑی دیر بعد ہی بہت سے لوگ رائفلوں، مشین گنوں اور برین گنوں سے مسلح ہو کر آ گئے۔ ان میں ہمارے جانے پہچانے لوگ بھی تھے۔ اور کئی ایک تو ہمارے کلاس فیلو تھے۔ ان کی قیادت وہی عوامی لیگی لیڈر کر رہے تھے۔"

انہوں نے کہا کہ آپ کو جانا پڑے گا۔ باقی چار کیمپوں سے لوگ روانہ ہو چکے ہیں اور اگر آپ ہماری بات نہیں مانیں گے تو ہم سب کو قتل کر دیں گے۔

"مجبوراً ہم سب لوگ چل دیئے۔ عورتیں بچے بھی ساتھ تھے۔ ہمیں دریا کے کنارے لے گئے۔ یہاں بڑی بڑی لانچیں کھڑی تھیں۔ چلتے چلاتے رات ساڑھے نو بج گئے۔ اور جب سفر شروع ہوا تو آشو گنج کو چھوڑ کر لانچیں آگے نکل گئیں۔ ہم نے احتجاج کیا تو عوامی لیگ والے گالیاں دینے لگے اور کہا کہ اپنے منہ بند رکھو۔

" سات دو بجے کے قریب ہمیں پانی شہر کے قریب اتارا۔ اور پھر انہیں ترنو لانچوں میں سوار کر دیا، مگر ایسے کہ مردوں کو ایک لانچ میں اور عورتوں کو دوسری میں۔ ہماری لانچ میں پانچ چھ سو مرد اور لڑکے تھے۔ اور کوئی پینتیس کے قریب مسلح عوامی لیگی تھے۔

" ہم لڑکوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ عوامی لیگی تھوڑے سے ہیں۔ ان کو قابو کر کے بے بس کر دیا جائے اور ان کے ہتھیار لے لئے جائیں۔ مگر بزرگوں نے منع کر دیا۔ اور اس وجہ سے ہم رہ گئے۔ ویسے ہم سب لوگ بالکل نہتے تھے۔

" وہاں سے سات اڑھائی بجے کے قریب واپس روانہ ہوئے۔ اور صبح پانچ بجے آشو گنج پہنچ گئے۔ انہوں نے ہمیں لانچوں سے اتارا اور سب کو پیدل چلا کر ریلوے سٹیشن لے گئے۔ وہاں جا کر ٹرین میں بٹھا دیا۔ مگر ایسے کہ عورتیں الگ ڈبوں میں اور مرد الگ ڈبوں میں۔

" ہم نے دیکھا کہ سٹیشن کے دونوں طرف بہت سے مورچے بنے تھے اور مسلح لوگ بہت زیادہ تعداد میں گھوم رہے تھے۔

" وہیں افواہ سنی کہ بھراب بازار میں پاک فوج پہنچ گئی ہے۔ اور ہمیں امید بندھ چلی کہ شاید وہ یہاں جلدی پہنچ جائیں۔

" اب ہماری گاڑی میں ایسٹ پاکستان رجمنٹ اور بنگال رجمنٹ کے لوگ بھی بیٹھ گئے اور صبح ساڑھے چھ بجے گاڑی چل دی۔ ان لوگوں نے وردیوں کے نیچے سویلین کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ساڑھے دس بجے کے قریب جب ہماری گاڑی برہمن باڑیہ کے سٹیشن پہ کھڑی تھی اور یہ لوگ پلیٹ فارم پر تھے۔ تو جیٹ ہوائی جہازوں کی آواز سن کر انہوں نے فوراً وردیاں اتار کر چھپا دیں۔ ہوائی جہاز گزر گئے تو انہوں نے دوبارہ وہی وردیاں سویلین کپڑوں پر پہن لیں۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ اصل فوجی نہیں ہیں۔ بلکہ ہندوستانی ہیں۔ جو اس طرح وردیاں پہن کر دھوکا دے رہے ہیں۔

" اس سارے عرصے میں جب یہ ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں کچھ بھی کھانے کو نہیں دیا۔ بلکہ کہیں نل ہوتا تو پانی بھی نہیں پینے دیتے تھے۔ اس وجہ سے صبح کے وقت بہت سے بچے اور عورتیں ایسی تھیں جن کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ہمیں ساڑھے تین بجے تک برہمن باڑیہ رکھا۔ مگر اس اثنا میں سٹیشن پر سے کسی خوانچے والے کو قریب نہیں آنے دیا۔

" چار بجے کے قریب سب مسلح لوگ جو ایسٹ پاکستان رائفل کی وردی میں تھے چلے گئے اور جاتے ہوئے لوگوں سے کہہ گئے کہ وہ ہندوستان جا رہے ہیں۔ اب ان کی جگہ بہت سے لوگ عام پبلک کے آگئے۔ ان کی تعداد تین چار سو سے بھی زیادہ ہوگی۔ اور ہم نے دیکھا کہ انہوں نے کپڑوں میں ہتھیار چھپائے ہیں۔ ویسے کئی لوگ کھلم کھلا بھی بندوقیں اٹھائے تھے۔

" اب ہماری گاڑیاں پلیٹ فارم سے دور شادی گنج اور سٹیشن کے غیر آباد حصے میں جہاں سامان وغیرہ لادا جاتا ہے۔ گاڑی کھڑی کر کے انجن روانہ کر دیے۔

" اب ان لوگوں نے گاڑی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اور حکم دیا کہ سب کھڑکیاں دروازے بند کر دیں۔ بعد از ان ایک کمپارٹمنٹ کھلا اور لوگوں سے کہا کہ نیچے اتریں۔ سب سے پہلے ایک حافظ قرآن بزرگ نیچے اترے۔ دو چار آدمیوں نے آگے بڑھ کر انہیں گرایا اور مشکیں کس لیں۔ پھر ایک آدمی نے آگے بڑھ کر بکرے کی طرح انہیں ذبح کر دیا۔

" اس کے بعد یہ ایک ایک کر کے لوگوں کو گاڑی سے اتارتے۔ اور کسی کو گولی مار دیتے۔ کسی کو بانسوں سے مار دیتے۔ کسی کو رام داؤ یا کلہاڑی سے قتل کر دیتے۔ چاروں طرف لوگوں کا گھیرا تھا۔ جو بھاگنے کی کوشش کرتا اسے گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

"جب ہمارے ابا نے سب بچوں کو الوداعی بوسہ دیا اور نیچے اترنے کی تیاری کرنے لگے تو مجھ سے اور دوسرے برداشت نہ ہو سکا۔ ہم نے ابا سے کہا کہ اس طرح مرنے سے کیا فائدہ۔ کیوں نہ ہم مل کر ان پر حملہ کریں اور کوشش کر کے چھین لیں۔ اگر مریں گے تو چند ایک کو تو مار کر مریں گے۔"

"اور لڑکوں نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی۔ اور ہم چند جوان لڑکے حملہ کرنے کے ارادے سے گاڑی سے نیچے اترے۔ زمین پر پاؤں رکھتے رکھتے پہلی گولی میرے کان کے پیچھے لگی اور میں گر پڑا۔ دوسری کندھے سے چھیلتی ہوئی گئی۔ پھر ساتھی بھی کود پڑے۔ تو انہوں نے سٹین گن سے باڑھ مار دی۔

"گولیوں کی اس بارش میں ایک اور گولی میری کلائی میں لگی۔ اور میں بے ہوش ہو گیا۔

"تھوڑی دیر بعد ہوش آیا تو گولیوں کی آواز کوئی نہ تھی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو اٹھ نہ سکا۔ اس وقت مجھے پانی پینے کی ہوئی۔ تو مجبور ہو کر وہ خون پیا۔ جو میرے بازو کے قریب زمین کے نشیب میں اکٹھا ہوا تھا۔ اس میں یقیناً میرا اپنا خون بھی ہوگا، عزیز و اقارب کا بھی۔

"اب وہ لاشیں کھینچ کھینچ کر ایک جگہ اکٹھی کرنے لگے اور پھر ڈھیر بنانے لگے۔ مجھے بھی اسی ڈھ دیا گیا اور میں نیچے دب سا گیا۔ تنگ آ کر میں نے خودکشی کی کوشش کی۔ مگر ہاتھ کام نہ کرتا تھا۔ اور پڑا رہا۔

"تھوڑی دیر بعد ان کا ارادہ بدل گیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ڈھیر کی بجائے ان لاشوں کو تالاب میں پھینک دیں۔ اٹھا کر ادھر پھینکنے لگے۔ جب میری باری آئی تو انہیں شک پڑا کہ میں زندہ ہوں۔ مجھے ٹٹولا۔ کچھ کے دیسے تو یقین ہو گیا کہ مر ایک نے کہا کہ اسی طرح سسک کر مر جانے دو۔ مگر دوسرے نے مذاق میں میرے کان کے پاس بندوق کی نالی رکھ کر د کر دیا۔

"میں دہل کر جو اچھلا۔ تو وہ بانسوں سے مجھے پیٹنے لگے۔ میرے منہ سے خون بہنے لگا۔ اور میں بے ہوش ہو گیا۔ مردہ سمجھا اور تالاب میں پھینک دیا اور اوپر دھان کے توشوں سے ڈھک دیا۔

"رات دو بجے کے قریب مجھے ہوش آئی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ میں نے گولیوں یا باتوں کی آواز سننے کی کوشش کی نہ پڑا۔ البتہ اتنا اندازہ ہو گیا کہ میرے چاروں طرف کتے منڈلا رہے ہیں۔ اور لاشوں کو کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"میں نے آواز دی کہ کوئی زندہ ہے؟"

"حیرت کی بات ہے کہ جواب میرے والد صاحب نے دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تمہاری آواز پہچان لی ہے طاقت ہے تو یہاں سے چلے جاؤ۔

"میں نے ان کی حالت پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ دو گولیاں لگی ہیں۔ ایک گردن میں اور ایک گلے میں۔ اس کے ع بھی ہوئی ہے۔

وہ غالباً یہ باتیں کرتے کرتے ہی فوت ہو گئے۔ کیونکہ میں بہت دیر تک آواز دیتا رہا۔ مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

" ایک اور آواز البتہ آئی۔ یہ بھی جوان سے لڑکے کی تھی جس نے بتایا کہ اس کا نام قیوم ہے۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ دونوں مل کر بھاگ چلیں۔

" مگر مجھ میں ہمت نہ تھی۔ اس سے پہلے دو تین بار میں نے اٹھ کر والد صاحب کے پاس جانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہر دفعہ نقاہت سے گر پڑا تھا۔

" تھوڑی دیر بعد قیوم رینگتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور کافی دیر بیٹھا رہا۔ پھر وہ مجھے اٹھا کر دو فرلانگ تک لے گیا۔ مگر مجھ میں نہ تو ہمت تھی۔ نہ خواہش۔ اس لئے میں گھسٹتا ہوا واپس آ گیا۔ اور گھر والوں کی لاشیں شناخت کر کے ان کے پاس لیٹ گیا۔

"میرے گھر والوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا — مرد۔ عورتیں اور بچے سب ختم ہو گئے۔

" تھوڑی دیر بعد قیوم پھر واپس آ گیا۔ اور اس کے سمجھانے کے بعد ہم دونوں بہراب بازار کی طرف چل دیئے۔ ہمارے کپڑے بالکل پھٹ کر چیتھڑے بن گئے تھے۔ اس لئے انہیں پھینک کر اب ہم صرف انڈر ویئر پہنے ہوئے جا رہے تھے۔

" آشوگنج کے قریب پاک فوج مل گئی۔

" انہوں نے ہمیں ہینڈز اپ کرنے کو کہا۔ میرے ساتھی نے تو کر دیئے۔ مگر میں ہاتھ اٹھا نہ سکتا تھا۔ پاک فوج کو دیکھ کر ہمیں جتنی خوشی ہوئی تھی۔ اتنی ہی اب مایوسی ہوئی۔ کیونکہ وہ ہمیں ایسٹ پاکستان رائفلز کے آدمی سمجھ رہے تھے اور ہمارے بار بار کہنے کے باوجود ان کا شک دور نہ ہوتا تھا۔

" وہ ہمیں ایک جھونپڑی میں لے گئے۔ وہاں ایک میجر بیٹھا تھا۔ ہم نے اسے بھی اپنی دکھ بھری داستان سنائی۔ مگر وہ کہنے لگا یہ سب بہانہ سازیاں ہیں۔ اور ہمیں قید کرنے کا حکم دے دیا۔

" رات بھر ہم قید رہے۔ ہم نے پانی مانگا۔ مگر پاک فوج کو خود پانی راشن میں مل رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے ہمیں پانی دینے سے انکار کر دیا۔

" ان کے پاس ڈاکٹر بھی نہ تھا۔ چنانچہ صبح ان کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے ہم لوگ آشوگنج آئے۔ وہاں انہوں نے ہم سے مفصل پوچھ گچھ کی۔ تو ان کا شک دور ہوا اور پہلی دفعہ انہوں نے ہمیں بستر پہ لٹایا۔ دوسرے دن ان کے سٹاف نے مجھے ATS کا ٹیکہ لگایا۔

" بالآخر سترہ تاریخ کو فوج نے مجھے رہا کر دیا۔ میں پیدل بہراب بازار گیا۔ وہاں سے ریلوے سٹیشن گیا۔ وہاں پر پاک فوج کے ایک ڈاکٹر مل گئے۔ جنہوں نے پہلی دفعہ مجھے پٹی باندھی اور اس طرح میں ۱۹ تاریخ کو پھر اسی کیمپ میں واپس پہنچ گیا جس میں پہلے بنگالیوں نے رکھا تھا۔ مگر اس وقت اور اس وقت میں کتنا فرق تھا۔

" اس ساری ٹرین میں ہم دو جوان لڑکے (قیوم سمیت) اور سترہ بچے بچ سکے تھے۔ جن کی عمریں سات سال سے کم تھیں۔ باقی سب مارے گئے تھے۔"

اعجاز احمد خاموش ہو گئے۔
مگر جب وہ بول رہے تھے تو غالب کے مصرعے کے مطابق ہر بن مو سے دم ذکر خوناب ٹپکنے والا معاملہ تھا۔ اور اب
ہوئے تو سکوت بھی چیخ اٹھا کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سوموار، ۳۱ مئی ۱۹۷۱ء

تین بجے بعد دوپہر۔ دفتر سے واپسی پر ابھی آرام کرنے کے لئے لیٹ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ معلو
وراثت علی نے دو اور اصحاب بھیجے ہیں۔ ایک محمد ادریس ہے۔ جو سراج گنج میں بی اے فائنل کا طالب علم تھا۔ اور دوسرا انور عا
جو اس کا کلاس فیلو تھا۔ انور پہلے سرگودھا کیڈٹ کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔ بعد ازاں ایئر فورس میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر کسی وجہ سے
اب معاملہ صدر مملکت کے پاس اپیل کی شکل میں زیر غور تھا۔ دریں اثنا اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔
محمد ادریس ضلع پبنہ میں سراج گنج میں رہتے تھے۔ ان کے والد محمد اسلام صاحب ریلوے میں ملازم تھے۔ جن کی کل
اور دو لڑکیاں تھیں۔ اپنے بیان کے دوران وہ بار بار شدت جذبات سے رک جاتے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔
کا بیان کتنے ہی وقفوں بعد مکمل ہوا۔

محمد ادریس صاحب نے بتایا۔

"میرے ایک بھائی شہداکی میں ریلوے میں ملازم تھے۔ ایک شادی شدہ بہن دیناج پور میں تھی اور ایک راج شاہی م
بھی شادی شدہ تھے جن کی بیویاں ہمارے ہی پاس سراج گنج بازار میں تھیں۔ سراج گنج میں ہمارا کنبہ والدین۔ پانچ بھائیوں۔ آ
دو بہوؤں پر مشتمل تھا۔

"ہم لوگ ریلوے کالونی میں رہتے تھے۔ جہاں سات سو گھروں میں سے صرف پچاس گھر غیر بنگالیوں کے تھے۔ با
تھے۔ ہمارے ہاں فروری اور مارچ کے مہینے بغیر کسی بڑے واقعے کے گزر گئے۔ مگر کھچاؤ بہت تھا، اور بنگالیوں اور غیر بنگا
گالی گلوچ بھی ہو جاتی تھی۔

"پچیس مارچ کے بعد مارشل لا والوں نے حکم دیا کہ سب لوگ ہتھیار جمع کرائیں۔ اس حکم کی پابندی مقامی حکام
سے تو نہ کرائی۔ البتہ تمام غیر بنگالیوں کو بار بار کہنا شروع کیا کہ وہ اپنا اسلحہ پولیس کے حوالے کر دیں۔ بالآخر مسٹر شمس اا
مجسٹریٹ نے پولیس کو حکم دیا کہ ان کا اسلحہ لے کر مکتی بھاہنی کو دے دیا جائے۔ اور ریڈر مارشل لا کے حکم کی تعمیل
جاری کیا گیا۔ پولیس نے تلاشیاں لے کر اسلحہ لیا اور کھلم کھلا مکتی بھاہنی کے لیڈروں کو دے دیا۔ تلاشی کے دوران باورچ
چھریاں۔ ریڈیو اور گھڑیاں تک لے گئے۔ ہم نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ممکن ہے ان گھڑیوں میں وائرلیس یا ٹرانسمٹ

"۲۹ مارچ تک پولیس کے مختلف گروپ ہماری تلاشیاں لیتے رہے۔ اور جب ہماری سب چیزیں لے چکے تو

لوگوں کو حفاظت کی ضرورت ہے کیونکہ آپ نہتے ہیں۔ اس لئے اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ کیمپ میں آ جائیں۔ ہمارے انکار کے باوجود انہوں نے ہمیں زبردستی مجبور کر دیا اور بالآخر ۲۹ کی شام کو انہوں نے ہمارے غیر بنگالی پچاس گھرانے ریلوے کلب میں منتقل کر دیئے شہر کے باقی حصوں سے بھی غیر بنگالی وہیں ہانک کر لائے جاتے رہے۔ اسی طرح ساڑھے پانچ سو کے قریب مرد، عورتیں اور بچے وہاں اکٹھے ہو گئے۔

" اسی رات ساڑھے گیارہ بجے ریلوے کلب سے روانہ کر کے ہمیں صالحہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں لے گئے۔

" تیس تاریخ کا دن بہت بے چینی سے گزارا۔ کیونکہ ہر طرف پراسرار سے مشورے ہوتے نظر آتے تھے مگر ہمیں کوئی نہ بتاتا تھا کہ ہمارے ساتھ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

" اکتیس مارچ کو لوگوں نے باقاعدہ بغاوت کر کے جیل سے سب قیدیوں کو رہا کرا لیا اور پھر سب مل کر اڑھائی بجے سہ پہر کے قریب ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوئے۔ یہ ہجوم کوئی بیس ہزار لوگوں کا تھا۔ جن میں سے زیادہ تر رام داؤ۔ بم۔ لاٹھی اور بندوقیں اٹھائے ہوئے تھے۔

" انہوں نے پانچ چھ لوگوں کو مار ڈالا۔ اور بیس پچیس کو زخمی کیا۔ ابھی ان کا جنون اور بھی بڑھ رہا تھا کہ ایک ہوائی جہاز کافی نیچی پرواز کرتا ہوا ادھر آیا۔ اور اس نے دو ایک چکر شہر کے لگائے۔ اس پر وہ سب بھاگ گئے۔ اور چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ کیمپ میں کسی کے پاس وائرلیس ہے اور اس نے ہوائی جہاز کو بلا لیا ہے۔

" شام کو عوامی لیگی آ گئے اور کہا کہ ہم راضی نامے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاکہ آپ کی اور بنگالیوں کی صلح ہو جائے اور اسی چیز کے انتظام کے لئے انہوں نے ہمیں جیل میں منتقل کرنا شروع کیا۔ ساری رات یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اور اگلے دن صبح چار بجے تک جاری رہا۔

" بارہ تاریخ تک ہم سب لوگ وہیں رہے۔ اس عرصے میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ ہم لوگ طرح طرح کی افواہوں سے گھبرائے رہتے تھے۔ اور بنگالی جان بوجھ کر یہ افواہیں چھوڑ جاتے تھے تاکہ ہم پریشان ہوتے رہیں۔

" تیرہ تاریخ کی رات کو گیارہ بجے انہوں نے اعلان کیا کہ چونکہ شہر میں امن ہے اس لئے آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم واپس ریلوے کالونی کو روانہ ہوئے۔

" مگر جب کالونی میں پہنچے تو ہمارے بنگالی ہمسائے ہمیں اپنے گھروں میں جانے نہ دیتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ ہم واپس جا کر عوامی لیگ کے لوگوں سے آرڈر لے کر آئیں کہ ہم گھروں کو جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ساری رات ہم نے میدان میں کاٹی۔ بالآخر صبح پانچ بجے کے قریب اجازت ملی۔ اور ہم گھروں میں گئے۔

" مگر گھروں کا حلیہ ہی عجیب تھا۔ وسیع پیمانے پر لوٹ پڑ چکی تھی اور اتنی صفائی کی تھی کہ فرش پر تنکا تک نہ تھا۔ جن گھروں پر ٹین کی چھتیں تھیں۔ وہ بھی اتار لی تھیں۔

" پندرہ تاریخ کو رات کے آٹھ بجے سارے شہر میں ہر غیر بنگالی کے گھر پر حملہ ہوا۔

" ہمارے گھر کوئی دو سو بنگالی گھس آئے۔ وہ سب مسلح تھے۔

" ہمارے بھائی اور بھابیاں ادھر ادھر دوسرے گھروں میں چھپی ہوئی تھیں۔ صرف امی اور ابا گھر تھے اور ان کے پاس صرف ایک

صندوق تھا جو جیل سے ہم لوگ واپس لائے تھے۔ وہ لے لیا۔ مگر انہیں قتل نہیں کیا اور چلے گئے۔ مگر دوسرے گھروں میں انہوں نے دل کھول کر قتل و غارت کیا اور یہ قتل عام صبح دس بجے تک جاری رہا۔ جس میں نصف سے زیادہ بہاری مارے گئے۔

"صبح دس بجے پھر عوامی لیگی لیڈر آگئے اور کہنے لگے کہ آپ لوگ یہاں محفوظ نہیں۔ اس لئے جیل کی بلڈنگ میں واپس چلے چلو۔ جو کچھ رات بھر ہمارے ساتھ ہوتا رہا تھا۔ اس کے بعد ہمیں بھی اس میں عافیت نظر آئی کہ وہاں چلے جائیں۔ چنانچہ سولہ اپریل کو ہم ادھر چلے گئے۔

"میرے علاوہ گھر کے سب لوگ چلے گئے۔ اور میں ایک بنگالی دوست کے گھر چھپ گیا۔ ویسے میں اکیلا ہی نہیں تھا کئی نیک دل بنگالیوں نے دوسرے لوگوں کو بھی چھپایا۔ اور اس کوشش میں اپنی جان گنوائی۔ کیونکہ اگر کوئی بنگالی کسی غیر بنگالی کو پناہ دیتا ہوا پکڑا جاتا تو مکتی باہنی والے غیر بنگالی کے ساتھ بنگالی کو بھی مار ڈالتے۔"

"چھبیس اپریل کو مکتی باہنی والوں نے خزانہ لوٹا۔ اور پھر ایک ہجوم جیل کی طرف گیا۔ وہاں جاکر بہاریوں پر بہت زیادہ مقدار میں گیس پھینکی گئی جس سے زیادہ تر لوگ نیم بے ہوش ہو گئے۔

"پھر وہ مردوں کو قتل کرنے لگے۔ عورتوں اور بچوں کو قتل تو نہیں کیا۔ مگر جیل کے کنوئیں میں پھینکتے گئے۔ پھر ان پر پٹرول ڈالا اور زندہ لوگوں کو آگ لگا دی۔ مردوں میں سے بھی بعض مرے نہیں تھے بلکہ گھائل پڑے تھے جب وہ نڈھال تھے تو کمرے کی دیواروں پر اور فرش پر پٹرول ڈال کر آگ لگا دی۔ شام چھ بجے آگ لگائی اور دس بجے تک سب کو مار ڈالا۔

"یہ محض ایک معجزہ تھا کہ دو مرد اور دو چار عورتیں بچ گئیں۔ ان ہی میں سے ایک میرا بھائی محمد اختر ہے۔ جو بری طرح جھلس گیا تھا۔ اور اب ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ اسی طرح میری والدہ بھی بچ گئیں۔ مگر وہ بھی آگ میں بری طرح جل گئی ہیں اور زیر علاج ہیں مگر اب امید نہیں کہ زیادہ دن زندہ رہ سکیں۔

"اسی رات کو ساڑھے چار بجے پاکستانی فوج وہاں پہنچی۔ مگر اس وقت تک سب کام ختم ہو چکا تھا۔ اسی رات وہ نیشنل بینک بھی لوٹ چکے تھے۔

"میری دیناج پور والی بہن کا خاوند بھی وہیں مارا گیا تھا۔ اب اپنے کنبے میں سے بچنے والے ہم تین ہی افراد ہیں۔ جن میں سے دو ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔"

ادریس صاحب کی داستانِ الم ختم ہوئی۔ تو میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اب مشرقی پاکستان میں بہاریوں کا مستقبل کیا ہے۔ خون کے رشتے دو قسم کے ہیں۔ ایک خون ملانے والے جن سے انسانیت پروان چڑھتی ہے۔ دوسرے خون بہانے والے جن سے صرف نفرت ابھرتی ہے۔ چوبیس سال میں پہلی قسم کے رشتے نہ بن سکے۔ مگر چار پانچ سال میں دوسری قسم کے رشتے اس شدت سے قائم ہوئے کہ اب بہاریوں کے لئے

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

ہر بہاری کی داستان اس فقرے پر ختم ہوتی ہے کہ پھر پاکستانی فوج آگئی اور نجات ملی۔ ان کے خیال میں سیلاب بلاخیز ختم ہو چکا ہے۔ مگر کیا واقعی ختم ہو چکا ہے؟

نوکِ سناں کے نیچے تڑپنے والے اس کی چبک ما نند پڑتے ہی خوش ہو گئے۔ مگر اس ہاتھ کو نہیں دیکھتے جس نے ہتھیار تھاما تھا۔ ملک دشمن عناصر اور ہندوستان کی ملی بھگت کہاں خاموش بیٹھے گی۔ خصوصاً اگر چاہتے ہوں یہ تیل نہ ہوا۔

دوسرے صاحب انور سلطان قادری تھے۔ یہ بھی سراج گنج کے تھے اور بی اے فائنل ایر کے طالب علم تھے۔ انہوں نے پاکستان ائیرفورس سکول سرگودھا سے ۱۹۶۵ء میں سینیئر کیمبرج کیا تھا۔ اور پھر رسالپور میں PAF اکیڈمی میں کیڈٹ بھی تھے۔ اب سراج گنج کالج میں نیشنل کیڈٹ کور کی تنظیم کر رہے تھے۔

اِن کی کہانی سولہ مارچ سے شروع ہوتی تھی۔ جب یہ سب ڈویژنل مجسٹریٹ کی کچہری کے پاس سے گزر رہے تھے۔ وہاں کچھ لوگوں کا ہجوم تھا جن میں زیادہ تر ہندو تھے۔ اس ہجوم نے کچہری پر سے پاکستان کا جھنڈا اتارا۔ اس پر تھوکا۔ پاؤں تلے روندا اور پھر جلا دیا۔

انور سلطان قادری نے اعتراض کیا تو ان سے جھگڑا ہو گیا اور یہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگے۔ اس دن کے بعد شر پسند عناصر اور خاص طور پر ہندو ان کی جان کے دشمن بن گئے۔ مگر عوامی لیگ کے چند لیڈروں نے انہیں اپنے گھر میں پناہ دی اور یہ محفوظ رہے۔

اس واقعہ سے چند ہی روز پہلے ایک اور واقعہ بھی ہوا تھا۔ ایک دکان پر قائداعظم کی بڑی سی تصویر لگی تھی اور مارچ کے شروع کے دنوں میں ایک ہندو لڑکے نے وہ تصویر اتار کر سرِ بازار پھاڑی اور پھر پاؤں تلے روندی۔ قادری صاحب کو خبر ملی تو انہوں نے جا کر اُس ہندو کی پٹائی کی۔ اس پر مسلمان بنگالی لڑکوں نے قادری صاحب کو زدوکوب کیا۔

انور سلطان قادری نے ان واقعات کی تصدیق کی جو ادریس صاحب بتا چکے تھے اور کہا۔

"جب شہر کے سب بہاریوں کو جیل کی بلڈنگ میں لے گئے تو میں بھی انہی میں تھا۔ مجھے انہوں نے پاور ہاؤس کی بلڈنگ سے لیا تھا۔ جہاں میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے بھائی بجلی گھر میں ملازم تھے۔ اور وہاں کے ملازمین میں تین خاندان بہاریوں کے تھے۔ جن کے کل افراد چھبیس تھے۔ واقعہ کے روز چار سو کے قریب مسلح لوگوں نے ہمارے گھروں کا محاصرہ کر لیا اور زبردستی ہمیں جیل لے گئے۔

"میں چونکہ کیڈٹ کور کی تنظیم کر رہا تھا اس لئے میں نے وہاں مردوں اور جوان لڑکوں کو خفیہ انداز میں منظم کرنا شروع کیا تاکہ ہم ان کا مقابلہ کر سکیں اور مرنے سے پہلے چند ایک کو مار بھی سکیں۔ مگر ہم میں سے کسی نے ان کو اطلاع کر دی۔ آپ جانتے ہیں مسلمانوں میں غداروں کی کمی کبھی بھی نہیں رہی۔

"مگر اس اطلاع کا فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے سب کو رہا کر دیا اور جب چند دن بعد دوبارہ لوگوں کو جیل کی عمارت میں لے گئے تو مجھے دانستہ نہیں لے گئے۔ بلکہ چھوڑ گئے۔

"ہم تینوں خاندان بجلی گھر کے احاطے میں ہی چھپے رہے۔ اور ان کے ہجوم ہم تک آنے کی جرأت نہ کرتے تھے کیونکہ ہم نے پاور ہاؤس کے اردگرد گیارہ ہزار کلوواٹ والی بجلی دوڑا دی تھی۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پاور ہاؤس کے باقی بنگالی ملازمین بھی سچے پاکستانی تھے اور ہماری ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ ہمارے وہ کلاس فیلو جو کالج میں ہمارے خاص

دوست تھے۔ اب ہجوم کے ساتھ آتے تو ہمارے جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں ان کے شر سے محفوظ رہا۔"

منگل وار۔ یکم جون ۱۹۷۱ء

نو بجے رات: مارشل لاء حکام نے نیا ضابطہ M.L.O ۲۲ نافذ کیا ہے۔ جس کے تحت کوئی بھی سرکاری ملازم پاکستان کے کسی بھی حصے میں یا پاکستان سے باہر ملازمت کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

آٹھ بجے دفتر جاتے ہی میں نے ایک نوٹ لکھا کہ اس آرڈر کا اطلاق یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکینڈری بورڈوں پر بھی کیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ تعلیم کے میدان میں وطن دشمن عناصر کا زور توڑا جائے۔ جن لوگوں کے خلاف شرارت کی شہادت موجود ہے۔ ان کے خلاف تو باضابطہ کارروائی ہو سکتی ہے۔ لیکن جن کی سرگرمیاں تو قابلِ اعتراض ہیں اور شہادت ناکافی ہے۔ ان کو مغربی پاکستان تبدیل کر دیا جائے۔ ویسے میں نے اپنے نوٹ میں یہ مقصد نہیں لکھا۔ صرف یہی درخواست کی تھی کہ اس کا اطلاق SEMI-AUTONOMOUS BODIES پر کر دیا جائے .. ..

.. ..—

سہ پہر کو واپس آیا تو بریگیڈیئر قادر صاحب کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ جن سے صبح فون پر بات ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پہنچ گئے ....—

بریگیڈیئر قادر صاحب پندرہ اپریل کو مشرقی پاکستان آئے تھے۔ اور پھر ادھر اُدھر گھوم کر حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ وہ کہنے لگے

"جب میں نے چٹاگانگ دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مارچ کے شروع میں اصفہانی جوٹ مل کی کلب میں عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔ وہاں میں نے خون کے چھینٹے دیکھے۔ ایک دیوار پر بچے کا سر پٹخنے کے نشانات دیکھے۔ کیونکہ کھوپڑی کے اندر سے مغز نکل کر دیوار پر چپکا تھا۔ عورتوں کے تار تار برقعے دیکھے۔ ایک چھوٹی بچی کا نیا پراندہ دیکھا جسے وہ شاید ابھی تک استعمال بھی نہ کر سکی تھی اور بالآخر ایک بچے کی کتاب دیکھی جس میں ہرن کی تصویر تھی۔ یہ وہی کتاب تھی جو میرا بچہ لاہور میں اپنے سکول میں پڑھتا ہے۔ میں نے کتاب اٹھائی تو اس پر مجھے خون کے دھبے نظر آئے۔ مجھے یوں لگا۔ کہ یہ میرے اپنے بچے کا خون ہے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

"قادر صاحب کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اجمل آ گئے۔ کراچی سے آئے تھے۔ بشریٰ سے ایک روز پہلے فون پر بات کر چکے تھے۔ بتایا کہ اسے میرا خط مل گیا تھا۔

بدھوار۔ ۲ جون ۱۹۷۱ء

آج صبح: دفتر گئے تو صبح ہی صبح چیف سیکرٹری کی طرف سے فائیل ملی جس میں میرا کس والا نوٹ تھا۔ انہوں نے گورنر کو فائیل بھجوانے

کی بجائے مجھ سے سوال کیا تھا کہ اس تجویز کی کیا ضرورت ہے۔

میرے دل میں تو آیا کہ خوب کھول کر صاف صاف لکھ دوں کہ مشرقی پاکستان میں ملک دشمن عناصر کو جو فروغ ملا وہ زیادہ تر ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں ہی کی وجہ سے ہے۔ جہاں بنگالی قوم پرستی پر غیر ضروری زور دے کر پاکستان دشمنی اور ہندوستان دوستی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جہاں حقائق کو موڑ توڑ کر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کا سمندر پھیلا دیا گیا۔ کیونکہ مغربی پاکستان نے خود کبھی حقائق کو صحیح انداز میں پیش کرنے کی زحمت نہیں کی۔

اب ان اداروں کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق از سر نو منظم کرنا چاہیے۔ اور چند لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔

لیکن پھر سوچا کہ چیف سیکرٹری خود بنگالی ہیں اور مسٹر شفیع الاعظم، زیادہ کھری وضاحت سے چڑ کر کہیں اس تجویز کی ہی مخالفت نہ کر بیٹھیں۔ اس لئے یہی چیزیں ذرا دھیمے انداز میں لکھیں اور ساتھ یہ بھی اضافہ کر دیا کہ مارشل لا کے احکام کے تحت تمام اساتذہ تعلیمی اداروں میں یکم جون سے آئے تھے۔ ابھی تک کی اطلاع کے مطابق واپس آنے والوں کی تعداد ساٹھ فی صد سے پچاس فی صد کے لگ بھگ ہے۔ ممکن ہے اگلے چند روز میں اور بھی لوگ آ جائیں۔ مگر یہ یقینی ہے کہ کافی تعداد پھر بھی غیر حاضر رہے گی۔ اسی پروگرام کے مطابق دو اگست سے کلاسیں شروع ہوں گی۔ اس عرصے میں پبلک سروس کمیشن کی طرف سے نئی بھرتی کی امید کم ہے۔ کیونکہ زندگی کی مشینری بری طرح بگڑی ہوئی ہے۔ اس لئے تعلیمی اداروں کی بدنظمی دور کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہاں سٹاف پورا ہو۔ چنانچہ عارضی طور پر ملک کے دوسرے حصوں سے بھی ان آسامیوں کو پر کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کی باتیں لکھ کر میں نے فائل واپس بھجوا دی۔

مارشل لا کے احکام کے مطابق تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو یکم جون سے حاضر ہونا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے مسلمان سٹاف میں سے تو کافی غیر حاضر ہیں مگر تمام ہندو پروفیسر جن کی تعداد پچیس کے قریب ہے واپس آ گئے ہیں۔ اور آتے ہی وائس چانسلر سے مطالبہ کیا ہے کہ ان کی خاطر خواہ حفاظت کے لئے مناسب بندوبست کئے جائیں۔ کچھ ایسی ہی صورت میمن سنگھ کی زراعتی یونیورسٹی میں بھی پائی جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عام تاثر کے برعکس فوج کے اقدام اتنے سخت نہیں کہ ہندو ہراساں ہو۔ بلکہ وہ اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے اور پاکستان کو ڈبونے کی پوری کوشش کرے گا . . . .

. . . .

آج بشریٰ کا پہلا خط ملا . . . .

. . . .

جمعرات، ۳ جون ۱۹۷۱ء

آج ڈھاکہ کی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے خیال آ رہا تھا کہ یہی ڈھاکہ آج سے بارہ برس پہلے قریباً اسی موسم میں دیکھا تھا۔ اب بھی

بادل اسی طرح جھوم کر آتے ہیں۔ بارش بھی ویسے ہی چھاجوں برستی ہے ۔ وہی پانی مٹی اور مساموں میں گھسنے والی وہی نمی۔ مگر ان تمام چیزوں کے باوجود ؎

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج

یہ ڈھاکہ اب وہ ڈھاکہ نہیں ۔ خدوخال وہی ہیں مگر روح بدل گئی ہے ۔ فضائیں ان دیکھے کھچاؤ سے بوجھل ہیں ۔ افق بے یقین ہے ۔ لوگوں کے چہرے سپاٹ ہیں۔ اگر کچھ ہے تو غیریت کی نقاب جس کے آر پار دیکھنا فی الحال ناممکن ہے ۔ ذہنی فاصلے جغرافیائی فاصلوں سے بھی زیادہ ہیں اور پاکستان کا تصور کراہ کر سوچتا ہے ؎

اتنا سناٹا ہے اپنا نام یاد آتا نہیں

مگر میرے خیال میں صورتِ حال ایسی نہیں کہ درست نہ ہو سکے ۔ مناسب طرزِ عمل سے ابھی صبح کا بھولا گھر واپس لایا جا سکتا ہے ۔ جس طرح مارچ والی بدترین صورتِ حال درست ہو گئی تھی جس میں اندرونی غداروں نے ہندوستان کے ساتھ مل کر بنگلہ دیش کی آزادی کا نعرہ لگایا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ پچیس مارچ کو جو حل کیا گیا تھا ۔ وہ ہر وقت لاگو نہیں ہو سکتا ۔ اور محدود فوجی ایکشن کے بعد جو نتائج حاصل ہوئے تھے ۔ ان کو سیاسی انتظامی طور پہ مستحکم کرنے کی ضرورت تھی ۔ مگر یوں لگتا ہے کہ اس نقطے کو سمجھا نہیں گیا اور اگر اسے نہ سمجھا گیا تو جو بچے کھچے غیر بنگالی ہیں ان کو چند ماہ تک دوبارہ خون میں نہانے کے لئے تیار رہنا چاہیے ۔

دفتر میں آج مولانا عبدالمنان سے ملاقات ہوئی ۔ بظاہر بڑے سرگرم پاکستانی نظر آتے ہیں۔ کسی زمانے میں صوبائی مسلم لیگ کے سکرٹری تھے ۔ پھر اسلامک اینڈ ڈائرکٹری کمیٹی کے ممبر بنے ۔ اس ضمن میں علامہ علاؤالدین صدیقی سے اپنی رفاقت کا ذکر کر رہے تھے پھر جب صوبائی اسمبلی کے ممبر بنے تو تین برس ۱۹۶۲ سے ۱۹۶۵ تک محکمہ تعلیم کے پارلیمانی سکرٹری بھی رہے ۔ آج کل مدرسہ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں ۔

ان کے خیال میں پاکستان کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کے میدان میں بنیادی اصلاحات کی جائیں ۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ تعلیمی اداروں کو ہندوؤں سے پاک کیا جائے ۔ اس کے علاوہ اور بھی دو تجویزوں پہ زور دیا ۔

۱۔ مدرسہ کی تعلیم کو سکول کی تعلیم میں شامل نہ کیا جائے ۔ بلکہ حسبِ سابق علیحدہ رکھا جائے ۔ اور عام تعلیمی سسٹم کی طرح اتنا ہی مضبوط بنایا جائے ۔ مارچ کی بغاوت میں مدرسہ کے پڑھے ہوئے طلبا ہر حالت میں پاکستان کے ساتھ رہے اور کئی بنگالی طلبا اس کوشش میں اپنی جانیں بھی گنوا بیٹھے ۔

۲۔ مدرسہ میں ذریعہ تعلیم حسبِ سابق اردو رہنا چاہیے ۔ اور اس بنگالی کو نہیں ٹھونسنا چاہیے ۔ عوامی لیگ کا تقاضا یہ تھا کہ مدرسہ کے تعلیمی سلسلے میں بھی ذریعہ تعلیم بنگالی کر دینا چاہیے ۔

دوپہر کے کھانے پہ اجمل بھی تھا اور سہ پہر تک ساتھ رہا ۔ شام کو کیپٹن سرور آ گئے ۔ جو پچھلے اڑھائی سال سے مشرقی پاکستان میں ہیں ۔ اور کوئی ڈیڑھ برس سے ڈھاکہ میں ہیں ۔ ان کے ساتھ ہم شیخ مجیب الرحمان کا مکان دیکھنے گئے ۔

یہ دریا نے سائز کی صاف ستھری کوٹھی ہے ۔ جس کا شاید ایک آدھ شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور ان تمام خبروں کا کوئی ثبوت نہ ملا کہ گھر کو

سمجھا کہ دیا گیا تھا اور لڑائی میں کئی لوگ مارے گئے تھے ....

....

....

شام کو اجمل کے ساتھ کرنل اسلم کے ہاں گئے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر آ گئے۔ واپسی پر دیکھا کہ راستے میں بعض مقامات پر طیارہ شکن توپیں نصب کی جا رہی ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی طرف سے جنگ کی دھمکیوں اور تیاریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

جمعہ۔ ۴ر جون ۱۹۷۱ء

آج دوپہر ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں کھانا تھا۔ سنٹرل انفرمیشن سکریٹری مسٹر روئیداد خان آئے تھے۔ اور ان کی طرف سے یہ دعوت تھی۔ وہاں سے واپس آ کر ذرا دیر کے لئے لیٹا۔ اور پھر بشریٰ کو خط لکھ رہا تھا کہ دیوان وراثت علی کی طرف سے ایک اور صاحب تشریف لائے۔ ان سے بیٹھ کر جو بات چیت کی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

یہ محمد احسان الحق صاحب تھے۔ جو سٹینڈرڈ بنک کے سب منیجر تھے اور ڈھاکہ میں مقل ٹوری برانچ میں کام کرتے تھے۔ ان کی عمر کوئی پینتالیس برس کے لگ بھگ تھی۔

انہوں نے بتایا:

"میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈھاکہ میں ہی رہتا تھا۔ ہمارے باقی عزیز دیناج پور میں رہتے تھے۔ ان کی طرف سے آخری خط مجھے ۱۲ مارچ کو ملا جس کے مطابق وہ سب خیریت سے تھے۔ وہاں میرے کل عزیزوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔

"چند دنوں بعد ہنگاموں اور قتل و غارت کی خبریں ملنے لگیں۔ سب سے پہلے چٹاگانگ کے قتلِ عام کی اطلاع ملی۔ پھر میمن سنگھ کی۔ اور بعد ازاں دیناج پور کے مظالم کی اطلاع پچیس چھبیس اپریل کو ملی۔ دراصل دیناج پور میں ساری تباہی ۲۸ مارچ اور ۱۳ اپریل کے درمیان ہوئی۔

"میں یکم مئی کو میڈیکل ریلیف کی ایک ٹیم کے ساتھ شامل ہو کر گیا تھا تاکہ اپنے عزیزوں کی خبر لے سکوں۔ ہم لوگ رنگ پور تک سپیشل ٹری ٹرین میں گئے۔ وہاں سے آگے ایک ٹرک میں سید پور تک گئے اور وہاں سے دیناج پور پہنچے۔

"شہر سے ایک میل دور چہل غازی درویش کا مزار ہے۔ وہاں ہم دو چار لوگ احتراماً ٹرک سے اتر گئے کہ فاتحہ پڑھ لیں۔ اس مزار کے ارد گرد جنگلات اور باغات ہیں ہم نے دیکھا کہ ان میں تین عورتیں اور درجن بھر چھوٹے بچے گھوم رہے تھے جن کی عمریں دس سال سے کم ہوں گی۔ ہمیں دیکھ کر وہ خوفزدہ سے ہو کر جنگل کے اندر کی طرف بھاگے۔ مگر ہم نے اردو میں پکارا تو رک گئے۔ اور پھر چند بچے ہمارے پاس مزار میں آ گئے۔

"ہمارے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ شہر نہیں جا سکتے۔ اس لئے یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ جو چار خاندان پرسوں مارے گئے ہیں۔ ہم ان کے بچے کھچے لوگ ہیں اور دو روز سے بھوکے ہیں۔ جب کبھی مزار کے مجاور کے پاس کچھ کھانے کو ہوتا ہے۔ یہ ہمیں دے دیتا ہے۔

مگر اب اس کے پاس بھی کچھ نہیں۔

" ہم نے انھیں نقدی اور کھانے کا سامان دیا۔

" تھوڑی دیر بعد شہر پہنچے تو وہ بالکل ویران تھا۔ حالانکہ وہاں پچیس تیس ہزار تو بہاری ہی تھے اور بنگالی آبادی اس کے علاوہ تھی۔ کہیں کہیں بوڑھی عورتیں اور بہت چھوٹے چھوٹے بچے جنگلی جانوروں کے غول کی طرح ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ عجیب دردناک انداز میں آہ و زاری کرتیں۔ مگر ہم ان کے لئے کیا کر سکتے تھے۔ ان کے جو گھر والے قتل کر دیے گئے تھے ان کو دوبارہ لانا کسی کے بھی اختیار میں نہ تھا۔

" ہم لوگ سرکٹ ہاؤس میں گئے جہاں پاکستانی فوج تھی۔ وہاں میجر قمر الزماں انچارج کو ریلیف کے سامان کی اطلاع دی اور ہسپتال دیکھنے گئے جہاں سید پور سے بھی رضاکار آ کر زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ سید پور دیناج پور سے بیس میل دور ہے اور وہاں بھی کافی بہاری تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہاں بھی کئی ہزار کے ہجوم نے بہاریوں پر حملہ کیا تھا مگر پنجاب رجمنٹ کے پچاس سپاہیوں کی وجہ سے بچ گئے۔ کیونکہ ان لوگوں نے ایسٹ پاکستان رائفل کے فوجیوں کو حملے کی مہلت نہ دی اور خود پہلے حملہ کر دیا۔ ان کے انچارج کیپٹن اسی مقابلے میں مارے گئے۔ مگر ان کی قربانی کی وجہ سے نہ صرف ایسٹ پاکستان رائفلز کے لوگ بھاگ گئے بلکہ بہاریوں کا قتلِ عام بھی بچ گیا۔

" ایسٹ پاکستان رائفلز کے یہی لوگ جو سید پور سے بھاگ کر آئے تھے۔ دیناج پور والوں کے لئے آفت ثابت ہوئے۔ اور انہوں نے یہاں کے قتلِ عام میں بھرپور حصہ لیا۔

" دیناج پور میں کنچن ندی کے کنارے ایسٹ پاکستان رائفلز کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان میں کچھ لوگ پنجاب رجمنٹ کے بھی تھے۔ جو بلڈنگ کی پہلی منزل پر رہتے تھے۔ اٹھائیس مارچ کو EPR والوں نے شام چار بجے کے قریب ان پر اچانک حملہ کر دیا اور اکثریت کو قتل کر دیا۔ مگر ان میں سے چند لوگ بھاگ کر جانیں بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور وہ نیو ٹاؤن آ گئے۔

" اس کے بعد ایسٹ پاکستان رائفلز نے شہر کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ اور سول انتظامیہ بھی ان کے ساتھ مل گئی۔ تیرہ اپریل تک یہ شہر ان کے قبضے میں رہا۔ ان دنوں وہاں ہندوستانی فوجی اور سویلین کھلم کھلا آتے تھے۔ اور ہندوستانی کرنسی بھی چلتی تھی۔

" ایک دن ہندوستانی فوجیوں نے پڑھے لکھے بہاریوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ یہاں سب کو امن امان سے رہنا چاہیے۔ اسی مقصد کے لئے آپ امن کمیٹیاں بنائیں۔ اس سلسلہ میں ڈپٹی کمشنر کے پاس جائیں۔ تقریباً تینتیس لوگ ڈی سی کے پاس گئے۔ جو EPR کے ہیڈ کوارٹر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس نے ان کو EFR کے سپرد کر دیا۔ وہ ان تمام لوگوں کو کنچن ندی کے پاس لے گئے۔ اور سب کو گولی مار دی۔ تین دن بعد یہ خبر شہر میں پھیلی تو بہت خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ مگر پھر شہر میں ڈھنڈورا دلوایا گیا کہ بہاری بنگالی بھائی بھائی ہیں۔ آپ لوگ اطمینان سے اپنا اپنا کاروبار جاری رکھیں۔

" دو چار روز اسی طرح گزرے تو پھر ڈھنڈورا ہوا کہ مغربی پاکستان کی فوج قریب آ رہی ہے۔ اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اسلحہ چاہیئے۔ اس لئے سب لوگ اپنا اپنا اسلحہ جمع کرا دیں۔ اگر لوگ ان کی نیت پر شک کرتے تو وہ قرآن پر قسمیں کھاتے اور آہستہ آہستہ کبھی دلیل سے اور کبھی دھمکا کر سارا اسلحہ لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اسلحہ خریدنے کے بہانے تاجروں اور دیگر بہاریوں سے بلینک چیک

(BLANK CHEQUE) پر دستخط کروا لیتے۔ اور اگر کوئی پس و پیش کرتا تو کسی بہانے اسے کیخن ندی کے پاس لے جا کر قتل کر دیتے۔

" میں کافی دنوں بعد وہاں پہنچا تھا۔ یعنی یہ واقعات مارچ اور اپریل کے تھے اور میں چار مئی کو گیا تھا۔ مگر اس وقت بھی کیخن ندی کے پاس (ڈیڑھ میل) کے علاقے میں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ جس کنارے پر ایسٹ پاکستان رائفلز کا ہیڈکوارٹر تھا۔ وہ لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ دوسرے کنارے پر بھی لاشیں پڑی تھیں۔ مگر نسبتاً کم تھیں۔ اور لوگوں نے بتایا کہ جو نیا گروپ قتل کرنے کے لئے لاتے اس سے پچھلے گروپ کے قتل شدہ لوگوں کی قبریں کھدواتے اور پھر ان کو مار ڈالتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ باقاعدہ کرفیو لگایا گیا۔ تاکہ لوگ گھروں سے باہر نہ نکل سکیں۔ اور پھر فرداً فرداً بہاریوں کے گھر جا کر وہاں سے لوگوں کو نکال کر کیخن ندی تک لے جاتے۔ اسی طرح پہلے پٹھانوں اور پنجابیوں کو ختم کیا اور بعد میں بہاریوں کو۔

" آخری دنوں میں بہت تیزی سے قتل کئے۔ اور جن گھروں کے مرد مار دیتے ان کی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح سڑک پر ادھر ادھر گھماتے رہتے۔ کئی ہندو بھی ہندوستان سے آئے ہوئے تھے۔ اور وہ بھی ایسٹ پاکستان رائفلز کی وردیاں پہنے ہوتے رہتے اور یہ عورتیں ان کو عیاشی کے لئے پیش کر دی جاتیں۔

" بارہ اپریل کو آخری دن تھا۔ اس لئے اس دن انہوں نے سب سے زیادہ قتل عام کیا اور ہمارے گھر والے بھی اسی میں مارے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے خاندان کے چھبیس[۲۶] افراد مرے تھے۔ اور اب پینتالیس[۴۵] مارے گئے۔

" کیخن ندی پر ایک تنگ سا پل تھا۔ وہ لوگ عورتوں اور بچوں سے کہتے کہ اس پر سے گزرو۔ جب وہ گزرتے۔ تو دور سے گولی مارتے جیسے پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ اور وہ تڑپتے ہوئے ندی میں جا گرتے۔ اس ساری تباہی میں ہندو اور مارواڑی پیش پیش تھے۔ ہمارے پاکستانی علاقے میں ہندوستانی فوج نے کیمپ بنا رکھے تھے۔ جہاں بہاری عورتیں لے جا کر ان کو پیش کر دیتے۔

" کیخن ندی کی ریت سفیدی مائل ہے۔ میں چار مئی کو وہاں پہنچا۔ اس عرصے میں کئی دفعہ بارش ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی ریت پر ی کئی گز پر بڑے بڑے خون کے نشان تھے اور کئی لاشیں گڑھوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ لاشوں پر گدھ منڈلا رہے تھے۔ اور کتے کھا رہے تھے۔ بے شمار کھوپڑیاں ادھر اُدھر پڑی تھیں۔ میں نے کئی جگہ دیکھا کہ عورتوں کے ہاتھ مٹی میں سے باہر جھانک رہے ہوتے ن کی کلائیوں میں ابھی تک چوڑیاں پڑی تھیں۔

" میں اگلے دن سائیکل پر سارے شہر میں گھومتا رہا۔ اقبال ہائی سکول میں خندقیں عورتوں، بچوں اور مردوں کی لاشوں سے اَٹی ی تھیں۔ اور زمین پر جا بجا خون کے دھبے تھے۔

" میری بہن اور ان کے دو بچے مجھے دیناج پور کے نیو ٹاؤن کیمپ کے بلاک نمبر ۲ میں ملے۔ میری بہن کے سسر حاجی ین الحق اسی برس کے ہیں۔ جب ان کے بیٹے کو ان کے سامنے قتل کیا گیا تو انہوں نے کہا ظالمو مجھے کیوں چھوڑتے ہو۔ مجھے بھی رڈالو۔ مگر E P R والوں نے کہا کہ تمہیں بھی مار دیا تو ان کو روئے گا کون۔

" بربریت کی ایسی ایسی کہانیاں سننے میں آئیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کسی آدمی کو گولی مارتے۔ وہ زخمی ہو کر ا اور کلمہ پڑھتا تو گالیاں دیتے اور کہتے " بولو جے بنگلہ" اگر وہ نہ بولتا تو منہ پر پیشاب کرتے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ پر کودتے کہ

پہلے اندر والے کو ماریں گے۔ پھر ہمیں ماریں گے۔ لاشوں کو رسیاں باندھ کر گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے۔

"واپسی پر میں دوسری جگہوں بھی گھومتا رہا۔ رنگ پور میں جانی نقصان زیادہ نہیں ہوا۔ مگر گھروں کو دل کھول کر لوٹا گیا۔ گاؤں میں بھی بہاریوں کو ختم کر دیا۔ ستاب گنج میں تین ہزار کی بہاری آبادی میں سے صرف پچیس ۲۵ لوگ زندہ بچے۔ وہاں ہسپتال میں مجھے ایک بچہ ملا۔ جو چار دن تک لاشوں میں دبا رہا۔ ضلع دیناج پور میں صرف پاربتی پور جنکشن نسبتاً محفوظ رہا۔ وہاں پاکستانی فوج کے آنے سے پہلے بہاریوں نے نو گھنٹے تک EPR کا مقابلہ کیا۔ وہاں صرف تیس بہاری مارے گئے جن میں ایک ہمارا بھی عزیز تھا۔

"مجھے ایک آدمی سراج گنج بازار کا بھی ملا۔ اس نے بتایا کہ پانچ چھ سو کے قریب لوگوں کو جیل میں بند کر کے ان پر پٹرول پھینکا اور پھر آگ لگا دی۔ جل کر مرنے والوں میں ڈاکٹر، انجینئر اور تاجر وغیرہ سبھی قسم کے لوگ تھے۔

"جب میں دیناج پور گیا تو وہاں بازاروں میں سب اشیا ہندوستان کی بک رہی تھیں۔ اور ہندوستانی کرنسی بھی عام استعمال میں تھی۔ پاکستان کے ایک روپے کے عوض ہندوستان کے چار آنے ملتے تھے۔ یہ بھی سنا کہ پچھلے دنوں ہندوستانی آ کر کئی کئی گھنٹے فلمیں بھی دیا کرتے تھے۔

"بنگالیوں نے دس بارہ روز پہلے اپنے بیوی بچوں کو شہر سے باہر بھیج دیا تھا۔ اور جب شہر میں پاکستانی فوج کے داخلے میں تھوڑی دیر تھی تو مختلف حصوں میں جیپ اور کاریں لوگوں کو اس طرح اکٹھا کر رہی تھیں جیسے سکول کے بچوں کو بسیں گھروں سے لیتی ہیں۔ پھر یہ سب لوگ ہندوستان چلے گئے۔"

احسان صاحب بڑی مشکل سے اپنی داستانِ غم ختم کر سکے۔ وہ اکثر گلوگیر ہو جاتے۔ بعض دفعہ کئی کئی منٹ بول نہ سکے۔ اور وہ ایک دفعہ بھیانک یادوں کے بوجھ تلے اپنے آپ پر ضبط کرنے کی کوشش میں کانپتے رہے۔

آج سرکاری خبروں سے پتہ چلا کہ کومیلا، چاند پور اور باریسال کے علاقوں میں شر پسندوں کی حرکات تیز ہو رہی ہیں۔ ایک جگہ پولیس سٹیشن کو آگ لگائی اور تھانیدار سمیت پوری نفری کو اٹھا کر لے گئے . . . .

. . . .

کل سے مغربی پاکستان سے پولیس فورس آنے لگی ہے۔ ہر روز دو سو آدمی ہوائی جہاز سے اتر رہے ہیں . . . .

. . . .

یہ بھی کیا دن ہیں۔ نہ صرف یہ کہ پاکستان بہت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ بلکہ بقول کسے جنوب مشرقی ایشیا کی "تاریخ کروٹ لے رہی ہے۔ ایسے موقع پر ہم لوگوں کا عین مرکز میں موجود ہونا قسمت کی خاص مہربانی لگتی ہے . . . .

. . . .

بدھ - ۹ر جون ۱۹۷۱ء

پچھلے چار دن سے ڈائری نہیں لکھ سکا۔ جب سے یہاں آیا ہوں۔ خطوط لکھنے کی رفتار بہت کم تھی۔ چنانچہ ہفتہ اور اتوار کو

کچھ خطوط لکھے۔ بعد میں نصیر فاروقی سے ملاقات ہوئی۔ جو AFROASIAN BOOK CLUB کے روحِ رواں ہیں . . . .

. . . .

پچھلے چار دن کے واقعات میں خاص چیز وہ میٹنگ تھی جس میں یہ اعداد و شمار ملے کہ مارچ کی بغاوت کے دوران اور بعد میں نو ہزار کے قریب قیدی جیلوں سے بھاگ گئے۔ اور دو ہزار کے قریب حوالاتی غائب ہوئے۔ اسی طرح پچاس کروڑ کے قریب روپیہ سرکاری خزانوں سے لوٹا گیا۔

اتوار کی شام ریڈیو سے اعلان ہوا کہ سو روپے اور پانچ سو روپے والے نوٹ ختم ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تمام نوٹ جن پر بنگلہ دیش یا جے بنگلہ کسی زبان میں بھی لکھا ہو۔ قانونی کرنسی شمار نہیں ہوں گے . . . .

. . . .

سوموار کی رپورٹ سے پتہ چلا کہ تعلیمی اداروں میں طلبا کی حاضری کم ہو رہی ہے۔ ابھی تک مدرسہ نظام کے اداروں میں اساتذہ کی حاضری ۹۰ فی صد اور طلبا کی ۴۴ فی صد تھی۔ دوسرے سکولوں میں اساتذہ کی تعداد ۶۰ سے ۹۰ فی صد تک ہے۔ اور طلبا کی ۱۲ فی صد سے ۲۵ فی صد تک۔ عام طور پر یہ ۲۰ فی صد سے کم ہی ہے) آج سابق پارلیمانی سکریٹری برائے تعلیم سے دفتر میں ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ یہ صورتِ حال منظم پروپیگنڈے کے تحت ہو رہی ہے۔ شر پسند عناصر نت نئی افواہوں سے لوگوں کو ہراساں کر رہے ہیں اور بدقسمتی سے سرکاری سوچ لوگوں تک نہ تو روایتی ذرائع ابلاغ سے پہنچتی ہے اور نہ ہی سینہ بہ سینہ خبروں سے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملک دشمن عناصر بڑی کامیابی سے محض افواہوں کے ہتھیار کو مؤثر طریقے سے استعمال کر رہا ہے۔

مثال کے طور پر یہ افواہیں بچوں کے والدین تک اس شکل میں جاتی ہیں کہ فوج والے بچوں کو اٹھا کر لے جائیں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ آیا آپ کے والدین حکومت کے ساتھ ہیں یا نہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ بچوں کو سکول نہ جانے دیا جائے۔ اساتذہ سے کہتے ہیں کہ سکولوں پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے اور اساتذہ کو اس لئے ڈیوٹی پر بلایا جا رہا ہے کہ انہیں گرفتار کرنے میں آسانی ہو۔

مولانا عبدالمنان کا کہنا تھا کہ ہم بڑی عجیب قوم ہیں، کانا پھوسی اور افواہوں کے ماہر اور غلط فہمیوں کے دانستہ شکار۔ پہلے اپنے دل میں وسوسے پیدا کرتے ہیں پھر ان کو اپنے ہی ذہن میں اتنا گھنگالتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے وسوسے شیر اور ہاتھی سے بھی بڑے ہو جاتے ہیں اور پھر ان کو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ چنگھاڑتے ہوئے ان کی طرف جھپٹ رہے ہیں۔ . . . .

. . . .

آج صبح دورے پر نکلے۔ مشرقی پاکستان میں یہ میرا پہلا دورہ ہے۔ کمشنر ڈھاکہ سید علمدار رضا اور انسپکٹر جنرل پولیس ایم۔ اے۔ کے چوہدری بھی ساتھ ہیں۔ کوئی پچاس سپاہیوں کی جمعیت بھی دو گاڑیوں میں ہمراہ ہے۔ اب شام کے وقت میں میمن سنگھ کے واپڈا ریسٹ ہاؤس میں بیٹھا ہوا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔

شام کے سات بجے ہیں۔ بارش ابھی تھمی ہے۔ درختوں کے خاکے ہر لحظہ گاڑھے ہوتے اندھیرے میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہوا میں خنکی ہے۔ اور ریسٹ ہاؤس کے سامنے بہنے والا دریائے برہم پتر خاموشی سے رینگ رہا ہے۔

آج صبح ڈھاکہ سے چلے تو ٹونگی انڈسٹریل ایریا میں داخل ہوئے۔ یہ علاقہ بہت وسیع ہے اور نرائن گنج کی دوسری انڈسٹریل اسٹیٹ (INDUSTRIAL ESTATE) ہے۔ یہ ساری ترقی پاکستان کی بدولت ہے۔ جب پچھ برس میں مشرقی پاکستان کے بعض لیڈر شور کر رہے تھے کہ ہمارا استحصال ہو رہا ہے۔ تو مرکزی حکومت نہ جانے کن مصلحتوں کی رہی۔ اور یہ نہیں بتایا کہ مشرقی پاکستان کے ترقیاتی کاموں کے اعداد و شمار کیا ہیں۔ اس مجرمانہ خاموشی کا نتیجہ آج ہم بھگت رہے پاکستان کے لوگ ہم سے بدظن ہیں۔ اور ہماری اچھی بات کو بھی شک سے دیکھتے ہیں۔

آگے چلے تو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ چند سال پہلے بنی ہوئی سڑک بھی بہت اچھی ہے اور جگہ جگہ پل بنا کر کا مناسب انتظام کیا گیا ہے۔ یہ سڑک ہر جگہ کھیتوں کی سطح سے دس بارہ فٹ اونچی تھی۔ اور دونوں طرف جو ہڑوں میں نیلے پھولوں کی بہتات سے اور بھی سج گئی تھی۔ کسان کندھوں کے آر پار پھیلے ہوئے کونے ہیٹ (HAT) پہنے چاول کا یا پٹ سن کاٹنے میں مصروف تھے۔ فصلوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ اور اس دفعہ بھی اس کا بیشتر حصہ مکمل ہو کر کٹتے نہ چلا گیا کی حالت تسلی بخش رہنی چاہیے۔ اس دن گورنر کی کانفرنس میں بھی محکمہ زراعت کی طرف سے اس خیال کا اظہار کیا گیا اور آج ہرے سبز کھیت مسکرا مسکرا کر اس بات کی تائید کر رہے ہیں۔

منگاپل تک کوئی پل نہ ٹوٹا تھا۔ اور نہ ہی کسی کا دن ہیں ج کی ہینہ زیادتیوں کے نشان نظر آئے۔ زندگی نارمل انداز میں رواں دواں تا شتکار قصبوں کے قریب لاری پر چڑھنے والوں کا ہجوم قصبوں کے شروع اور آخر میں دکانوں پہ بیکار گپ بازوں کا مجمع وغیرہ وغیرہ منگاپل سو دا پڈا ریسٹ ہاؤس میں تھوڑی دیر میٹنگ کی جس میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر، ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز اور (KUMUDINI) کالج کی خاتون پرنسپل شامل تھیں۔ پھر ان سب کے ہمراہ کالج دیکھنے گیا۔ جو آج کل بند پڑا ہے۔ کالجوں کا سٹاف یکم جولائی کو آئے گا۔ مگر طلباء کی کلاسیں ۲ اگست کو سبھی کالجوں میں اکٹھی شروع ہوں گی۔

یہ کالج ایک ہندو MR K.P. SHAHA (رانودہ پرشاد شاہا) کی ٹرسٹ نے شروع کیا تھا۔ مسٹر شاہا ٹرسٹ کا مینیجنگ ڈائرکٹر ہے۔ اس نے مرزاپور میں ایک ہسپتال اور سکول بھی قائم کئے ہیں۔ پرنسپل نے بتایا کہ چودہ سٹا سے دو سٹاف ممبر ہندو ہیں۔ دو بدھ مت کے ہیں اور باقی مسلمان کچھ عرصہ پہلے شاہا صاحب نے ایک خاتون کو پرنسپل ہندوستانی شہریت رکھتی تھیں۔ مگر کافی تگ و دو کے بعد مقامی ایس ڈی او مسٹر قادری انھیں بالآخر نکالنے میں کامیاب کی بیوی اب بھی ہندوستانی شہری ہے گو رہتی مرزاپور میں ہے۔

وائس پرنسپل نے بتایا کہ مسٹر شاہا نے لاکھوں روپیہ عوامی لیگ کو دیا ہے اور بہت طاقتور آدمی ہے۔ پبلک عرصہ سے تقاضا ہے کہ اس کالج کو گورنمنٹ لے لے کیونکہ حالات ناگفتہ بہ ہیں مگر شاہا صاحب اپنے اثر و رسوخ پورا نہیں ہونے دیتے۔ کالج کی حالت دیکھنے میں بھی کافی خراب تھی۔ کمروں کی دیواریں گھاس پھونس کی اور چھتیں ٹین کی تھا حال پچھلے پچیس برس سے ایسی ہی ہے۔ سٹاف کو پچھلے کئی ماہ سے تنخواہیں نہیں ملیں اور ان کی تنخواہیں بھی عام سکیل سے کم ہا پرنسپل نے بتایا کہ اسے ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں۔ بلکہ ٹرسٹ کے دو ہندو نمائندے شیو شنکر دا

سارے اخراجات کو کنٹرول کرتے ہیں۔

وہاں سے فارغ ہو کر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کا دفتر دیکھنے گئے۔ کیونکہ رپورٹ یہ ملی تھی کہ شرپسندوں نے اسے بالکل تباہ کر گئے ہیں جس کی مرمت کے لئے گورنمنٹ کو تقریباً سات ہزار روپے کا تخمینہ بھیجا گیا تھا۔

وہاں جاکر دیکھا تو دفتر بالکل ٹھیک تھا۔ چند دروازوں کی چٹخنیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔ لوہے کی تین الماریوں کے دروازے اتار دیئے گئے تھے۔ اور فولاد کی ایک سیف توڑی گئی تھی۔ چند فائلیں اور نئی سٹیشنری غائب تھی۔

جب میں لسٹ سے پڑتال کرنے لگا تو اندازہ ہوا کہ تخمینہ کافی بڑھا چڑھا کر لگایا گیا ہے۔ واس میں ایسی چیزیں بھی شامل کی گئی ہیں جو بالکل بیکار تھیں۔ مثلاً ایک جگہ گوند کی خالی شیشی کا نقصان بھی لکھا تھا............................

وہاں سے فارغ ہو کر میں شہر کا چکر لگانے نکلا۔ ایک سڑک پر دیکھا کہ ڈسٹرکٹ فیملی پلاننگ بورڈ کی عمارت کے ساتھ والی عمارت بالکل سرنگوں پڑی تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ اسے فوج نے ڈائنامائیٹ سے اڑایا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسد الزمان (ASAD UZ ZAMAN) کا گھر ہے جو فنانس ڈیپارٹمنٹ میں جوائنٹ سکرٹری تھا۔ میں نے وہاں اس کے دو فوٹو بھی لئے۔

ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تو مسٹر بدیع الزماں سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملاقات ہوئی۔ جو بنگالی ہیں اور ان ہنگاموں میں کافی تکالیف سے دوچار رہے۔ ان کی کہانی درج ذیل ہے۔

" دو مارچ سے ۲۵ مارچ تک یہاں روزانہ مظاہرے ہوتے رہے۔ مگر عام طور پہ حالات قابو میں رہے۔ ۲۵ مارچ کو ایسٹ پاکستان رائفلز نے بغاوت کر کے اپنے انچارج میجر کو سرکٹ ہاؤس میں قید کر دیا۔ انور محمود ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جان بچا کر میرے گھر آگیا۔ لیکن یہاں سے بھی حالات کے مخدوش ہونے کے سبب نکلنا پڑا۔ اس کے بعد وہ کبھی میرے ہاں قیام کرتے اور کبھی ڈپٹی کمشنر کے ہاں۔ بالآخر حالات کو غیر محفوظ پا کر ہم سب لوگ ستائیس اور اٹھائیس مارچ کی رات کو ساڑھے تین بجے گھر سے نکلے۔ ہمارے گروپ میں انور محمود۔ ڈپٹی کمشنر جلال (بنگالی) مع بیوی بچوں کے اور میرے بیوی بچے شامل تھے۔ ہم سب لوگ ناگ باڑی گاؤں میں چلے گئے جو یہاں سے پندرہ میل دور ہے۔ مگر اٹھائیس کی صبح کو ایسٹ پاکستان رائفلز والے وہاں پہنچ گئے اور ہم تینوں کو گرفتار کر کے تنگائیل لے آئے۔

" تنگائیل میں EPR والوں نے بتایا کہ یہاں اعلان ہو چکا ہے کہ بدیع الزمان ایم پی اے تنگائیل کے کمانڈر ان چیف ہیں۔ اور اسد الزمان جائنٹ سکرٹری فنانس ڈیپارٹمنٹ ان کے ایڈوائزر ہیں۔ اب ان کے علاوہ تنگائیل میں کوئی حکم نہیں چلے گا۔ اور ان احکام کی تعمیل ایسٹ پاکستان رائفلز والے کروائیں گے۔ مقامی پولیس بھی ان کے ماتحت ہوگی۔

" انہوں نے ہمیں ایک پرانی سی بیرک میں قید کر دیا۔ اور انور محمود کو قتل کرنے لگے کیونکہ وہ مغربی پاکستانی تھا مگر ہم دونوں نے بہت منت خوشامد کی۔ اور ہمارے اصرار پر وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ اور اسے ناگ باڑی واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ مغربی پاکستان واپس چلا گیا ہے۔ مگر مجھے صحیح علم نہیں۔

" دو تین روز بعد انہوں نے ہمیں ایک اور گھر میں منتقل کر دیا۔ عام طور پر ہمیں باہر نہیں نکلنے دیتے تھے۔ اور سخت پہرہ رکھتے تھے۔ مگر کبھی کبھار ناگ باڑی لے جاتے تھے تاکہ ہم اپنے بچوں سے مل سکیں۔

" اتنے میں ڈھاکہ میں فوج کے ایکشن کی تفصیلات ملنے لگیں۔ مگر اس سے بہت پہلے ایسٹ پاکستان رائفلز والے اپنے کمانڈر میجر کو قتل کر چکے تھے۔ چنانچہ اب ان خبروں کے بعد وہ ادھر ادھر گھوم کر اپنے آپ کو اور لوگوں کو پاکستانی فوج کے مقابلے کے لئے تیار کرنے لگے۔ وہ جہاں جاتے ہمیں ساتھ رکھتے اور ہمارے نام کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر لوگوں سے کئی احکامات کی تعمیل ڈی سی اور ایس پی کے نام سے کرواتے۔

" وہ میمن سنگھ۔ جمال پور، شیر پور اور گوپال پور (اسدالزماں کا گاؤں) گئے ہر ہر جگہ ان کے ساتھ تھے اور ۲۸ مارچ سے ۱۲ اپریل تک ان کی قید میں رہے۔ آخری دن ہم سراج گنج میں تھے اور اسدالزماں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان کی موجودگی کی وجہ سے اس دن کوئی پہرے دار ہمارے اوپر تعینات نہ تھا

" اتنے میں خبریں آنے لگیں کہ پاکستانی فوج قریب آ گئی ہے اور اسدالزماں اور ان کے خاندان کی تلاش میں ہے۔ اس پر اسدالزماں گھبرا کر اپنی فیملی کے ساتھ فرار کی تجاویز میں مشغول ہو گیا اور ہم دونوں موقعہ پا کر باہر نکل آئے۔ وہاں کے منتظمین کو تاثر یہ دیا کہ ہم گھر والوں سے ملنے ناگ باڑی جا رہے ہیں۔ اور انہی کی وساطت سے ایک کشتی کا بندوبست کر کے گھاٹ پر پہنچے۔

" مگر جب کشتی میں سوار ہو رہے تھے تو کہیں سے چار پانچ ہزار لوگوں کا ہجوم نمودار ہو گیا۔ وہ بہاریوں کی تلاش میں تھے اور انہیں قتل کر رہے تھے۔ ہماری اپنی بہت خستہ حالت تھی۔ داڑھیاں بڑھ گئی تھیں۔ کپڑے میلے تھے۔ اور بعض جگہ سے پھٹ بھی گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے سمجھا کہ یہ بہاری بھاگ رہے ہیں۔ چنانچہ گرفتار کر کے انصار کیمپ میں لے گئے۔ ہمیں اندر بند کر کے وہ باہر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے کہ شکار ہاتھ آ گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اکٹھا کیا جائے تاکہ وہ ان کی موت کا تماشا دیکھیں۔

" ہم دونوں اندر بیٹھے یہ تقریریں سن رہے تھے۔ جب دیکھا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے تو مجبوراً ہم نے اپنے آپ کو ظاہر کیا اور بتایا کہ ہم یہاں کے آفسران ہیں۔ مگر انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر میرے اصرار پر ہمیں فون کرنے کی اجازت دی۔

" میں نے پولیس تھانہ میں فون کیا اور وہاں کا آفیسر انچارج ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ہمیں شناخت کیا۔ اس کے علاوہ انصار کے ایڈجوٹینٹ نے ہمیں شناخت کر لیا۔ اور اس کی درخواست پر ہم دونوں کو اسی کے حوالے کر دیا گیا۔

" ایڈجوٹنٹ نے ہمارے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ دو تین دن اپنے پاس رکھا۔ اور پھر ایک کشتی دی جس میں ہم لوگ ناگ باڑی پہنچ گئے۔ دو تین روز وہاں رہے۔ اور پھر ٹنگائیں واپس پہنچ گئے۔

" ہم یہاں پہنچے تو شام کو تھے۔ مگر غلطی یہ کی کہ فوج کو فوری طور پر اطلاع نہ دی کہ ہم آ گئے ہیں اور ایسے حالات میں سے گزرے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سمجھا کہ ہم باغیوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اور رات کے وقت ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔

" گرفتاری کے بعد ہمیں ڈھاکہ چھاؤنی بھیجا گیا۔ جہاں تفصیل کے ساتھ پوچھ گچھ ہوئی۔ مگر جب کچھ ثابت نہ ہو سکا۔ تو ہمیں واپس جانچ پر بھیج دیا گیا۔

" دریں اثنا ان حالات سے تنگ آ کر میری بیوی اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوئی مگر کشتی میں ایک دن کا سفر چودہ دن میں طے

کھسکے وہاں پہنچ سکی۔

"اس تمام عرصے میں کم از کم پانچ مواقع ایسے تھے جب ہم اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ اور یہ محض خدا کا کرم ہے کہ آج ہم زندہ ہیں۔"

سنگائیل سے اڑھائی بجے کے قریب چلے۔ راستے میں مدھوپور بازار کا پل دیکھا جو شر پسندوں نے اڑا دیا تھا۔ یہ کنکریٹ کا کافی بھاری پل تھا جو درمیان میں اڑایا گیا تھا۔ اب اس کی مرمت ہو رہی تھی اور دونوں طرف درختوں پر مچان بنا کر مسلح فوجی جوان کام کرنے والوں کی حفاظت کر رہے تھے۔

اس پل کے ساتھ ہی مدھوپور گاؤں تھا۔ جس کے کچھ حصے پاکستانی فوج نے تادیبی کارروائی کے تحت جلائے تھے۔ میں نے اس کی فوٹو بھی لی۔

آگے چلے تو مدھوپور جنگل میں داخل ہوئے جو آج کل گوریلوں کی پناہ گاہ بھی ہے اور ان کا مرکز بھی ہے۔ عام خبر یہ ہے کہ ہندوستانی فوجی بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر ہندوستانی فوج کے انجینئر جو دراصل خود پل وغیرہ اڑاتے ہیں مگر نام بنگالی گوریلوں کا ہوتا ہے۔ سڑک چالیس میل تک اس گھنے جنگل سے گزری اور کوئی ساڑھے چار بجے ہم میمن سنگھ پہنچ گئے۔ وہاں ریسٹ ہاؤس کے ساتھ وہ دریا دیکھا جس میں سترہ اپریل کو تشانگی پاڑا کے بہاری مسلمانوں کی لاشیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈالی گئی تھیں۔ اور پاکستانی فوجیوں کو بھی قتل کر کے پھینکا گیا تھا۔

شام کو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بتایا کہ آج سرحد کے قریب دو پل ڈائنا مائیٹ سے اڑائے گئے ہیں۔ اس کا کہنا بھی یہی تھا کہ نام تو بنگالی گوریلوں کا ہے۔ مگر جس ماہرانہ انداز میں یہ کام ہو رہا ہے۔ اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی فوج کے انجینئر یہ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ایک پل کو اس وقت اڑایا گیا جب ایک فوجی جیپ اس پر سے گزر رہی تھی اور ایک پاکستانی فوجی افسر اس میں مارا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور خبر ملی کہ مغربی پاکستان سے جو پولیس آئی ہے۔ ان میں سے ایک گروپ کا پہلا مقابلہ کالو کھیت کے پاس ہوا۔ جس میں باغیوں کا ایک آدمی مارا گیا۔

رات کا کھانا ڈپٹی کمشنر حسن احمد کے گھر پر تھا۔ وہیں ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تسنیم اور سب ڈویژنل پولیس آفیسر خالد مسعود سے بھی ملاقات ہوئی۔ گفتگو زیادہ تر انہی واقعات پر ہوتی رہی جو چند ہفتے پہلے اس علاقے میں پیش آئے تھے۔

خالد مسعود لاہور کا رہنے والا ہے۔ اور جمال پور سب ڈویژن (ضلع میمن سنگھ۔ جمال پور شہر، میمن سنگھ شہر سے تیس میل دور ہے) میں سب ڈویژنل پولیس آفیسر تھا۔ اس نے چند باتیں سنائیں جو میں اب درج کر رہا ہوں۔

خالد مسعود نے بتایا۔

"مارچ کے مہینے میں مظاہرے ہوتے رہے۔ مگر کوئی بدنظمی نہیں ہوئی۔ پچیس اور چھبیس کی رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب پولیس انسپکٹر نے فون کیا کہ وائرلیس پر بڑی پریشان کن خبریں مل رہی ہیں۔ اور میں گھر پر ہی آ کر زبانی بتانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اسے بلا لیا۔

"اس نے گھر آ کر بتایا کہ پولیس کے وائرلیس پر سنا گیا کہ فوج کے چالیس ٹرک ڈھاکہ چھاؤنی سے نکلتے ہوئے دیکھے گئے ہیں اس وقت شہر میں سے گولیوں کی آوازیں آ رہی ہیں تھوڑی دیر بعد ڈھاکہ والے وائرلیس آپریٹر نے کہا کہ گولیاں میرے بالکل قریب آ گئی ہیں ــ اور میں سیٹ بند کر کے جا رہا ہوں ـ یہ باتیں بتا کر انسپکٹر واپس چلا گیا۔

"اگلی صبح کچھ طلبا ہمارے گھروں کے قریب آئے۔ اور چپکے سے ہمارے ٹیلی فون کاٹ دیئے ـ تھوڑی دیر بعد ہمیں پتہ چلا کہ میری اور ایس ڈی او کی جیپ بھی چلا کر لے گئے ہیں پھر انہوں نے شہر میں ڈھنڈورا دیا کہ صدر یحییٰ خاموشی سے ڈھاکہ سے چلے گئے ہیں اور اب آپ پر بمباری ہوگی۔ سب لوگ تیار ہو جائیں ـ

"اسی دن فیلڈ انٹیلی جینس کے پانچ چھ فوجی جو ہمارے علاقے میں تعینات تھے میرے پاس آئے اور خوف ظاہر کیا کہ لوگ انھیں مارنے کے لئے ڈھونڈ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے انھیں تھانے بھجوا دیا"

میں اب یہ باتیں کھانے سے واپسی پر لکھ رہا ہوں ـ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں بعض باتیں ذہن سے اتر گئی ہیں صرف وہی لکھی ہیں جو واضح طور پر یاد ہیں ـ اب سونا چاہیے ـ ویسے میں نے کل خالد مسعود کو یہاں بلایا ہے تاکہ ان کی موجودگی میں ان سے باتیں سن سن کر ریکارڈ کرتا جاؤں ـ ساتھ ہی تسنیم صدیقی ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر بھی ہوں گے جو ان دنوں یہاں تعینات تھے ـ مگر اب تبدیل ہو کر سندھ جا رہے ہیں ـ وہ کل ہمارے ساتھ ہی ڈھاکہ جائیں گے ـ کیونکہ ہمارے ساتھ پولیس فورس ہے ـ

جمعرات ـ ۱۰ر جون ۱۹۷۱ء

صبح آنکھ کھلی۔ نیند سے جلدی تھی اور میں اور سونا چاہتا تھا ـ مگر ہوا میں ایسی تازگی تھی کہ بستر میں لیٹنا اچھا نہ لگا۔

دریچہ سے جھانکا تو سامنے پرانا برہم پتر بہہ رہا تھا ـ خاموش ـ پُرسکون اور پھیلا پھیلا ـ برسات کی وجہ سے رنگ گدلا تھا ـ مگر اوپر نیلے آسمان اور نیچے افق تک پھیلے ہوئے سبزے میں اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی پُرسکون سطح سے اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ چند ہی ہفتے پہلے اس میں سسکتے ہوئے ادھ موئے انسانوں کو گیندوں کی طرح اچھال اچھال کر پھینکا گیا ہے ـ اس کی لہریں ان کھوپڑیوں اور بازوؤں کو میلوں دور بہا کر لے گئی ہیں ـ جن کے وارث اسی کنارے پر زخموں سے تڑپ رہے تھے ـ پھر کوئی دوسرے گروہ آتے تھے تو ان تڑپتے ہوئے جسموں سے چند اور اعضا کاٹ کر اس دریا میں پھینک دیتے تھے ـ جس طرح قصائی کی دکان پر لٹکے ہوئے بکروں کا سیر سیر پاؤ پاؤ گوشت اتارا جاتا ہے۔

اس دریا نے وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب یہ شہر مومن شاہی کے نام سے بسایا گیا اور بعد ازاں وہ دن بھی دیکھا جب راجپوت ہندوؤں کے زیر اثر اس کا نام میمن سنگھ ہو گیا ـ اس شہر کے بازاروں میں جو بورڈ آویزاں ہیں ـ ان پر مومن شاہی اور میمن سنگھ شانہ بشانہ موجود ہیں بعض لوگوں نے شہر کا نام مومن شاہی لکھا ہے ـ اور بعض نے میمن سنگھ مگر یہ معاملہ بورڈ تک ہی محدود نہیں ـ بلکہ اذہان کی بھی نشاندہی کر رہا ہے اور آج کسی ذہن پر مومن شاہی کا بورڈ ہے اور کسی پر میمن سنگھ کا ـ

جب بیس فی صدی ہندو آبادی نے کچھ مسلمانوں کے ساتھ مل کر باقی مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا تو یہ گویا پھر وہی عمل

دہرایا جا رہا تھا جس کے نتیجے میں ماضی میں مومن شاہی کا نام بدل کر میمن سنگھ بنا دیا گیا۔ آج اردو بولنے والا مسلمان اس وجہ سے مارا گیا کہ وہ بنگالی نہیں جانتا۔ مگر اردو بولنے والا ہندو قابلِ مواخذہ نہ سمجھا گیا۔ سترہ تاریخ سے تیئیس تاریخ تک یہ شہر پاکستان کا حصہ نہ تھا بلکہ ہندوستان کا حصہ تھا۔ جس میں چاند تارے والا جھنڈا لہرانا غداری سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ پرچم ترا اسی سکون سے یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ جس انداز میں یہ آج پھہر رہا ہے۔

میں آٹھ بجے صبح میمن سنگھ کی زراعتی یونیورسٹی پہنچا . . . .

. . . .

یونیورسٹی سے واپسی پر میٹنگ کی . . . .

. . . .

میٹنگ کے بعد گورنمنٹ کالج دیکھنے گیا۔ جس کے متعلق سنا تھا کہ شرپسندوں نے ساری لیبارٹری تباہ کر دی ہے اور مرمت کے لئے ساٹھ ہزار روپے طلب کئے گئے تھے۔ وہاں جا کر دیکھا تو چند شیشیاں اور چند دوائیاں غائب تھیں اور تباہی کا کہیں نشان بھی نہ تھا۔

وہاں سے لڑکوں کے ٹیچرز ٹریننگ کالج گئے۔ جو ایک ہندو جاگیردار کے گارڈن ہاؤس میں واقع ہے۔ اردگرد وسیع باغ ہے جس میں سلیقے سے پھولوں کی کیاریاں سجی ہیں۔ اعلیٰ صناعی کے بت کھڑے ہیں۔ جن میں سے چند اب توڑ دیئے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر دکھ سا ہوا۔

جاگیردار کا نام ششی کانت تھا۔ مگر یہ اپنے علاقے میں مہاراجہ کہلاتا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ اور پاکستان بننے پر اس کے لڑکے یہ شہر چھوڑ کر کلکتے چلے گئے۔

بعدازاں خواتین کا ٹیچرز ٹریننگ کالج دیکھنے گیا۔ یہ مہاراجہ ششی کانت کے اصل گھر میں واقع ہے۔ جو اچھا خاصا محل ہے کالج چونکہ ابھی بند تھا۔ اس لئے گھوم پھر کر سارا گھر دیکھا۔ اور مہاراجہ کے ذوق کی داد دی۔ گذشتہ چوبیس برس میں اس عمارت کو نہ تو مرمت نصیب ہوئی۔ نہ جالوں کی صفائی ہوئی۔ اور نہ ہی چیزیں چرانے والوں کی دست برد سے نجات ملی۔ اس کے باوجود جو کچھ باقی ہے وہ جاگیردار کے ذوق کی داد طلب کرنے کے لئے کافی ہے۔ سنہری فریموں میں یورپ کے ماہرین فن کی بڑی بڑی تصاویر جن پر کائی جم رہی تھی۔ کٹ گلاس کا خوب صورت کام چھت پر خوبصورت صناعی۔ بیش قیمت جھاڑ فانوس گرد کے غلاف کے اندر سے ماضی کی شہادت دے رہے تھے۔ سامنے بھی کھلا لان تھا۔ اور پچھواڑے کے لان میں دو خوبصورت بارہ دریاں تھیں۔ جن کے ساتھ بہت بڑی جھیل تھی۔ اس کے کنارے جاگیردار نے اپنی بیوی کے لئے چھوٹا سا خوبصورت مکان بنایا تھا۔

اس جگہ کو دیکھ بہت افسوس ہوا کہ اتنی خوبصورت چیزیں اس انداز میں ضائع ہو گئیں۔ اور تاریخی شواہد کے طور پر قائم نہیں رکھی گئیں

ساڑھے بارہ بجے بھاگم بھاگ واپس ریسٹ ہاؤس آیا۔ کیونکہ تسنیم صدیقی ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر اور خالد مسعود کو وقت دیا تھا کہ ان کے ساتھ جا کر شانکی پاڑا کی بستی دیکھیں گے۔

ان کے ساتھ وہاں پہنچا تو دل دہل گیا۔

شانکی پاڑا میمن سنگھ کا ہی ایک حصہ ہے جس میں صرف غیر بنگالی رہتے تھے۔ کئی ہزار کے قریب آبادی تھی۔ یہ صاف ستھری

آبادی تھی - جو سرکار نے سستے داموں کی سکیم کے تحت بنوائی تھی - صاف ستھری کھلی سڑکیں اور گلیاں اور بیچ میں چھوٹے بلاک سے مکان ہم کوئی ایک بجے کے قریب وہاں پہنچے - اور وقت کی کمی کی وجہ سے ساری آبادی تو نہیں دیکھ سکے - مگر ایک حصے میں اچھی طرح گھوم پھر کر جائزہ لیا -

دوپہر کے وقت بھی وہاں ہو کا عالم تھا - نہ آدم - نہ آدم زاد - بالکل موہنجوداڑو کے کھنڈرات کا سماں تھا - فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کھنڈرات کی بجائے مکمل عمارتیں تھیں - ان مکانوں کے بیشتر مکین مرے بے لے کر قتل کئے گئے تھے - ہتھیار ان سے چند دن پہلے لئے جا چکے تھے - اور نہتے لوگ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے مسلح اور ٹرینڈ لوگوں کے سامنے بے بس تھے - خصوصاً جبکہ مقامی افسران بھی وہاں موجود تھے - اور موسلا دھار بارش میں قتل و غارت کا یہ ڈرامہ چھ گھنٹے تک جاری رہا -

قریباً ہر دوسرے تیسرے مکان کے ساتھ تازہ بھرے ہوئے گڑھے تھے - تسنیم نے بتایا کہ یہ مشترکہ قبریں (MASS GRAVES) ہیں جو وہ خود فوج کے ساتھ ۳۰ اپریل کو یہاں آئے تھے - تو تعفن سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا - کوے - گدھ - کتے اور بلیاں جوق در جوق گھوم رہے تھے -

کافی لاشیں امام مسجد نے دفن کر دی تھیں - مگر پھر بھی دو تین سو کے قریب کھلی پڑی تھیں - زیادہ تر مردوں کی - مگر ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے - کسی گھر میں ایک لاش - کسی میں دو تین - کہیں گلی میں چار چھ لاشوں کا انبار - کوئی کھڑکی سے باہر لٹکا ہوا - کوئی دروازے کی دہلیز کے آر پار - حشر کا سماں لگتا تھا - خود تسنیم نے اپنے ہاتھوں سے چند ایک لاشوں کو ایسے گڑھوں میں ڈالا - جن میں پہلے بھی لاشیں پڑی تھیں مگر ابھی گنجائش باقی تھی -

اب ان قبروں کا نشان مندمل ہو رہا تھا - مگر بعض جگہ اب بھی صاف طور پر دیکھا جا سکتا تھا - کیونکہ مسلسل بارش سے وہاں مٹی بیٹھ گئی تھی - اور تسنیم اپنے طور پر بھی شناخت کر سکتے تھے -

وہیں میں نے ایک دو قبروں کی فوٹو بھی لی -

شانتی پاڑا سے لوٹے تو سراج الحق سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہاں کھانے پر گئے - مگر طبیعت اتنی خراب ہو رہی تھی کہ کھانا بھی نہ کھایا گیا - اور ہم ریسٹ ہاؤس آ گئے -

اب ڈھاکہ کے لئے روانہ ہونا تھا مگر ابھی تسنیم صدیقی نہیں لوٹے تھے جو یہاں سے تبادلے پر لوگوں سے رخصت ہونے گئے تھے - سب لوگ ان کی انتظار میں بیٹھے تھے - میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا - اور خالد مسعود کو اپنے کمرے میں لے گیا - جہاں ان کی کہانی قلم بند کرنا شروع کی -

خالد مسعود کے بیان کی کچھ باتیں کل کی ڈائری میں درج ہیں - یہ سلسلہ اس سے آگے ہے -

خالد مسعود نے بتایا -

"............... (چونکہ اس بیان میں ان متعدد بنگالی افسران کا نام آتا ہے - جنہوں نے ان کی مدد کی - اس لئے فی الحال ان بنگالی افسران کے نام کا شائع کرنا مناسب نہیں) ....

خالد مسعود کا قصہ یہاں تک پہنچا تھا کہ نیچے سب لوگ چلنے کو تیار ہو گئے - اس لئے میں بادلِ نخواستہ روئیداد کو نامکمل چھوڑ

کرسی اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے بنگالیوں کو اندازہ ہو کہ میں اس انداز میں حالات جمع کر رہا ہوں۔

....

میمن سنگھ سے روانہ ہوئے تو تسنیم صدیقی کو میں نے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ جب کار ان کے اپنے گھر کے سامنے سے گزری۔ تو تسنیم کے محلے کے دس پندرہ لوگ سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔

میں نے تسنیم سے پوچھا کہ ان دنوں ان کا رویہ کیسا تھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کے سارے ملازم ان کے ساتھ بہت اچھے رہے۔ ان میں سے اکثر کو پتہ تھا کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ مگر انہوں نے کسی کو نہیں بتایا۔

اس سے پہلے خالد مسعود نے مجھے بتایا تھا۔ ان کا شاف بہت وفادار ثابت ہوا۔

اب ہماری کار شہر سے نکل کر اس بڑی بلڈنگ کے سامنے سے گزر رہی تھی جس پر C. A. F لکھا تھا یعنی CIVIL ARMED FORCE یہ وہ نئی تنظیم ہے جو اب E.P.R کی جگہ بنائی گئی ہے۔

"یہ E. P. R کا ہیڈ کوارٹر تھا۔" تسنیم نے بتایا۔ "اور یہ دیکھیے دیواروں پر گولیوں کے نشان ہیں۔"

گاڑی ذرا آگے گئی۔ تو انہوں نے اشارہ کیا۔

"یہ کیپٹن قمر عباس کا مکان تھا۔ اور آگے چل کر وہ جگہ بھی بتاؤں گا۔ جہاں اسے قتل کیا گیا۔"

دائیں ہاتھ ایک ریسٹ ہاؤس آیا جس میں ان دنوں ایک بنگالی میجر اور بنگالی کرنل ٹھہرے ہوئے تھے اور ڈھاکہ سے آئے تھے۔ اس ریسٹ ہاؤس سے ذرا آگے سڑک ریلوے لائن کو کراس کرتی ہے۔ ان دونوں کے سنگم کے بائیں طرف اسے قتل کیا گیا۔ اور قریب والے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے کرنل اور میجر سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

"قمر عباس میرا دوست تھا۔" تسنیم کی آواز غمگین تھی۔ "اکثر شام کو میرے گھر آتا تھا۔ آخری شام بھی وہ میرے ہاں تھا۔ اور ہم کتنی ہی دیر بیٹھ کر ملک کی حالت کا تجزیہ کرتے رہے۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے تسلی دی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہو۔ تو تم میرے پاس E. P.R کے ہیڈ کوارٹر میں آجانا۔ وہاں میرا ایک سالا بھی آیا ہوا ہے جو میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے۔"

"اس کا کیا بنا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دونوں اکٹھے ہی مارے گئے تھے ——— تین چار دن لاشیں اسی جگہ پڑی رہیں۔ اور پھر سڑک کے پار دوسری طرف پھینک دی گئیں۔ قریباً ایک مہینہ بعد جب چوبیس اپریل کو پاکستانی فوج آئی۔ تو انہوں نے قمر عباس کی مسخ شدہ لاش کو پہچانا اور دفنایا۔"

گاڑی چلتی گئی۔ تسنیم خاموش تھے۔ جب یادوں سے نکلے تو میں نے انھیں پورا قصہ سنانے کو کہا۔

تسنیم نے بتایا۔

"مارچ کا مہینہ جلوسوں کا مہینہ تھا۔ طلباً اور ہجوم جو چاہتے۔ سو کرتے۔ آہستہ آہستہ نواحی علاقوں کے لوگ بھی ان میں شامل ہوتے گئے۔ ۲۷ مارچ کی صبح کو وہ فہرستیں ہاتھوں میں لئے گھر گھر گھوم رہے تھے اور لوگوں سے اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ یہ فہرستیں ان لوگوں

کی تھیں جن کے پاس اسلحہ کے لائسنس تھے اور انہوں نے یہ فہرستیں تھانوں سے اور ڈی سی کے دفتر سے حاصل کی تھیں۔ جس کسی کے گھر یہ پہنچ جاتا۔ اس کے لئے مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوتا اور وہ اپنا ہتھیار ان کے حوالے کر دیتا۔

"ستائیس مارچ کی شام کو کیپٹن قمر عباس میرے پاس بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ ان دنوں E.P.R کا ونگ کمانڈر چھٹی پر گیا تھا۔ اور کیپٹن قمر عباس اس کی جگہ کام کر رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں سو گیا۔

"رات تین بجے کے قریب میری آنکھ گولیوں کی آواز سے کھلی۔ میں اٹھا۔ ادھر ادھر سے خبر لینے کی کوشش کی مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اتنے میں ـــــ آیا اور مجھے کہنے لگا کہ حالات کا کچھ اندازہ نہیں۔ فائرنگ بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ معلوم کیا ہونے والا ہے۔ بہتر ہوگا کہ صحیح صورتِ حال معلوم ہونے تک ہم سب لوگ کلب میں چلے چلیں۔

"ہم کلب میں پہنچے تو ڈپٹی کمشنر۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سول سرجن مع بیوی بچوں کے وہاں موجود تھے۔

"صبح پانچ بجے تک ہم وہیں رہے پھر ـــــ نے بتایا کہ اب کوئی خطرہ نہیں اور ہم واپس آ گئے۔ میں گھر آتے ہی سو گیا۔

"صبح اٹھا تو اردلی نے بتایا کہ رات E.P.R میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں لڑائی ہوئی ہے۔ اور کیپٹن قمر عباس مارا گیا ہے۔"

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ڈپٹی کمشنر نے بھی تائید کی ـــــ C.A.F کی عمارت پر گولیوں کے جو نشانات میں نے آپ کو بھی دکھائے تھے یہ اسی رات کی لڑائی کے تھے۔ پانچ مغربی پاکستانی سپاہی تیسری منزل میں گھر گئے۔ انہوں نے وہیں سے لڑائی کی۔ ان کے باقی ساتھی تو رات کو ہی مارے گئے اور کیپٹن قمر عباس کو صبح سات بجے مارا گیا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اور اگلے دن شام پانچ بجے تک اوپر سے فائرنگ کر کے مقابلہ کرتے رہے۔ سڑک پر سینکڑوں لوگوں کا مجمع کھڑا ہو کر یہ لڑائی دیکھتا رہا۔ جب کوئی مغربی پاکستانی زخمی ہوتا۔ تو یہ "جے بنگلہ" کا نعرہ لگاتے مگر جب کوئی E.P.R والا زخمی ہوتا تو یہ اسے اٹھا کر ہسپتال لے جاتے۔

"بالآخر شام پانچ بجے ان سپاہیوں کا بارود ختم ہو گیا۔ اور انہوں نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر لوگوں نے انہیں مارا تو نہیں مگر جیل بھیج دیا۔ یہاں ان کو ۱۷ اپریل کو قتلِ عام کے دوران قتل کر دیا۔

سیکنڈ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے تین افسر ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے میجر نور الاسلام (بنگالی)۔ لفٹیننٹ عثمان (بنگالی) اور ایئر فورس کا فلائٹ لفٹیننٹ صفی مصطفیٰ (بہاری) یہ تینوں ستائیس اور اٹھائیس مارچ کی درمیانی رات ریسٹ ہاؤس سے غائب رہے اور صبح واپس لوٹے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ فوج ان کے قابو میں نہیں تھی اس لئے یہ گاؤں چلے گئے تھے۔ واپسی پر یہ سارا دن ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں بیٹھے رہے۔ کھانا بھی وہیں کھایا اور اگلی رات بھی وہیں سوئے۔

"اٹھائیس مارچ کی شام کو میں اپنے دوست رضا کے ساتھ ـــــ کے گھر چلا گیا۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ مسلح لوگ اب غیر بنگالی افسروں کو مارنے ان کے گھروں میں آئیں گے۔

"۲۹ مارچ کی صبح کو میں نے ـــــ کے گھر سے دیکھا کہ فوج کا ایک بہت بڑا کالم آ رہا ہے۔ خیال ہوا کہ شاید پاکستانی فوج پہنچ گئی۔ مگر ان گاڑیوں پر بنگلہ دیش کے جھنڈے تھے۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ یہ لوگ سیکنڈ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے ہیں جو بغاوت

کرکے آئے ہیں اور ۲۷ میل کا علاقہ بہاریوں سے صاف کرکے آئے ہیں۔ تب میجر نوران سلام اور لفٹیننٹ منان کھلم کھلا ان سے مل گئے۔ اور میجر نور نے ٹریننگ کالج میں اپنا ہیڈکوارٹر قائم کیا یعنی مصطفیٰ کے متعلق متضاد خبریں ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے پہلے ہی دن مار دیا تھا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بعد میں مارا۔ مگر مجھے کوئی قابلِ اعتبار خبر نہیں ملی۔

"نیا ہیڈکوارٹر بنا تو لوگ ہار لے کر ان کے پاس جاتے رہے اور پھر میمن سنگھ کی ریاست کا اعلان کر دیا گیا۔ اب شہر مکمل طور پر مکتی بھاہینی کے قبضے میں تھا۔ انہوں نے ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مجسٹریٹ کو رہا کیا۔ ان کو تحریری حکم بھی دیئے۔ اور لاؤڈ سپیکر پر شہر والوں کو بھی سنائے۔

"پھر پتہ چلا کہ مکتی بھاہینی والے ڈھاکے پر حملہ کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک سپیشل ٹرین تیار کی گئی۔ جس پر سوار ہونے سے پہلے شہر میں جلوس نکالا گیا یہ بھی سنا کہ اس جلوس میں کیپٹن قمر عباس کی لاش کو جیپ کے انجن پر رکھ کر گھمایا گیا۔

"۳۱ مارچ اور یکم اپریل کی رات کو مکتی بھاہینی والے مع افسران کے چلے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ لوگ ڈھاکہ نہیں گئے۔ بلکہ برہمن باڑیہ گئے ہیں۔ کیپٹن عزیز جو سرحد پار کرکے ہندوستانی فوج سے رابطہ قائم کرنے گیا تھا۔ واپس آ گیا۔ اور اس نے اطلاع دی کہ ہندوستانی فوج جلد آنے والی ہے۔ اس بات پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔

. . . .

. . . .

"۳ اپریل کو پاکستانی فوج ٹنگائیل پہنچ گئی تھی اور خیال تھا کہ چند ایک روز میں میمن سنگھ پہنچ جائیں گے۔ اس پر بہت سے لوگ شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ بلکہ ایک دن تو یہ اعلان بھی ہوا کہ گھروں پر سے بنگلہ دیش کے جھنڈے اتار لئے جائیں۔ مگر جب پاک فوج کے آنے میں دیر ہوئی تو افواہیں پھیلنے لگیں کہ پاک فوج ہار رہی ہے۔ اس سے ان لوگوں کا اعتماد پھر سے بحال ہونے لگا۔ اور بھاگے ہوئے لوگ واپس آنے لگے۔

"۹ اپریل کے قریب افواہوں کا سیلاب آ گیا۔ تمام افواہوں کا مرکزی خیال یہ تھا کہ پاکستانی فوج نے کئی لاکھ بنگالی مارے ہیں اور بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ ۹ اپریل ہی کو تھرڈ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے چالیس لوگ جمال پور کے راستے ہوتے ہوئے میمن سنگھ آئے۔ وہ شمالی بنگال سے آئے تھے اور جمال پور میں انہوں نے اسّی نوّے غیر بنگالیوں کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو جیسور والے کرنل عبدالحئی کا قصہ سنا کر گرم کیا۔

"اب نئی نئی افواہیں جنم لینے لگیں۔ سب سے مشہور قصہ کرنل خلیل کا تھا جو مبینہ طور پر مغربی پاکستان میں بنگالی افسر تھا۔ اور اپنی جان بچا کر ہندوستان کے راستے مشرقی پاکستان پہنچا تھا۔ اس نے لوگوں کو بتایا تھا کہ مغربی پاکستان میں بنگالیوں کا بے دریغ قتلِ عام ہوا ہے۔ کرنل خلیل سے کوئی شخص ذاتی طور پر واقف نہ تھا۔ نہ ہی کوئی اس سے ملا تھا مگر ہر روز اس سے نت نئے قصے منسوب کئے جاتے تھے۔

"شہر میں بہت کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ تھرڈ بنگال رجمنٹ کے لوگ شہر کے لوگوں سے امتیاز جاوید سب ڈویژنل آفیسر اور خالد مسعود سب ڈویژنل پولیس آفیسر کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ میری تلاش اس لئے نہ تھی کہ میرے متعلق پہلے ہی مشہور ہو چکا تھا کہ میں مارا

گیا ہوں . . . .

. . . .

"سترہ کی شام کو گولیوں کی آوازیں تسلسل سے آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ پولیس بھی E.P.R کے ساتھ مل گئی ہے اور اب سیکنڈ اور تھرڈ بنگال رجمنٹ کے لوگ شہر میں جیپوں پر گھوم رہے ہیں اور بہاریوں کی جتنی آبادیاں ہیں۔ ان کو ختم کر رہے ہیں۔ (شہر میں بہاریوں کی چار بڑی آبادیاں ہیں) ہم نے اپنی کمین گاہ کی کھڑکی میں سے ڈی سی کی جیپ جاتے دیکھی . . . .

. . . .

"ہم ساری رات گولیوں کی آواز سنتے رہے۔ شانتی پاڑا ہماری پناہ گاہ کے قریب ہی تھی۔ وہاں سے بھی آوازیں آئیں۔ بعد میں دور سے بھی گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم آواز کے اونچا یا مدھم ہونے سے فاصلے کا اندازہ لگاتے۔ تب ہمیں یقین ہو گیا کہ سارے شہر میں بہاری کالونیوں پر حملہ ہو رہا ہے۔

"١٨ اپریل کو دوپہر کے بعد ہم نے روشندان سے دیکھا کہ کوئی دو ہزار عورتوں اور بچوں کا جلوس جا رہا ہے۔ وہ روتے چلاتے چیختے۔ گرتے پڑتے جا رہے تھے اور مشکل سے چل سکتے تھے۔ عوامی لیگ کے رضاکار اور طلبا سفید کپڑوں میں ملبوس رائفل لٹکائے ان کو مارتے ہوئے ہنکا کر لے جا رہے تھے۔ یہ وہ بدقسمت تھے جن کے گھر والوں کو بہاری کالونیوں میں تہ تیغ کر دیا گیا تھا۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ان کو پہلے گورنمنٹ ہائی سکول میں رکھا ہوا تھا اور اب کسی اور جگہ لے جا رہے تھے۔" . . . .

. . . . (تسنیم صدیقی کی داستان کا باقی حصہ بھی اس خیال سے حذف کیا جا رہا ہے کہ ان کی مدد کرنے والے بنگالیوں کے ناموں کا مشتہر ہونا فی الحال مناسب نہیں) . . .

. . . . "

تسنیم صدیقی کی داستان مکمل ہوتے ہوتے ہم ٹنگائل پہنچ گئے۔ وہاں ریسٹ ہاؤس میں چائے کے لئے رکے اور شام سات بجے ڈھاکہ پہنچے۔

اس دورے میں جو باتیں ہوئیں ان سے اندازہ ہوا کہ میمن سنگھ میں بنگالیوں کی بہت بڑی تعداد ایسی تھی جو مغربی پاکستانیوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتی تھی مگر وہ E.P.R اور E.B.R کی مسلح غنڈہ گردی کے سامنے بے بس تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ میمن سنگھ کے ایک پولیس مین نے چوہدری صاحب کو بتایا کہ میرے دو لڑکے مارے گئے۔ وہ تو میں نوشتۂ تقدیر سمجھ کر برداشت کر لیتا ہوں مگر افسوس یہ ہے کہ میرے بنگالی دوستوں اور پیشہ وروں میں سے کوئی بھی تعزیت کے لئے نہ آتا تھا کیونکہ ان کو E.P.R کا خوف تھا۔ مشرقی پاکستان کا یہی المیہ ہے کہ یہاں پرشور اور بدنیت اقلیت کے سامنے وفادار اکثریت بے بس ہوئی ہے اور مغربی پاکستان والے سمجھتے ہیں کہ ساری بنگالی قوم ہمارے مخالف ہے۔ حالانکہ یہ انتہائی غلط تاثر ہے۔

شام کو سرکٹ ہاؤس ڈھاکہ میں کھانا کھا رہے تھے تو ہمایوں نے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل سے واپسی پر اطلاع دی کہ وہاں آٹھ بج کر دس منٹ پر تین دستی بم پھینکے گئے۔ یہ بم کسی نے سڑک سے پھینکے تھے۔ جو پورچ میں آ کر گرے۔ دو کاریں تباہ ہوئیں اور ہوٹل کے تین بڑے شیشے ٹوٹ گئے۔ دو آدمی زخمی ہوئے۔ کاریں سٹیٹ بنک آف پاکستان کی تھیں۔

ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں پرنس صدرالدین آغا خان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جو U.N.O کی طرف سے ریلیف کمشنر کا کام کرنے آئے ہیں۔

نیلی ساڑھی

خواجہ احمد عباس

بمبئی: چونتیس کم عمر لڑکیاں تین رنڈی خانوں سے پچھلے ہفتے برآمد کی گئیں ——
ان میں سے ایک کے چہرے کو ایذا پہنچانے کے لئے تیزاب سے جلایا
گیا تھا —— پولیس نے پانچ عورتوں کو رنڈی خانوں کو چلانے اور طوائفوں
کی آمدنی پر رہنے کے جُرم میں گرفتار کر لیا ہے۔

—— ایک خبر

حضور۔ میں سچ کہوں گی، سب سچ کہوں گی، اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گی۔ مگر وقت ہے آپ کے پاس اور آپ کے سماج کے پاس یہ سب باتیں سُننے کے لئے؟

میرا نام سلیمہ ہے۔

میرے والد کا نام —— خدا انھیں مغفرت کرے —— کریم بخش تھا۔

میرے والد کیا کرتے تھے؟ سچّی بات یہ ہے، حضور، کہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ کسی زمانے میں زمیندار تھے۔ بعد میں جب زمینوں پر سیلنگ لگیں تو ان کے بدلے میں جو معاوضے کے کاغذات ملے اُن کو بیچ کر کھاتے رہے۔

میری جائے پیدائش شکوہ آباد کی ہے۔

شکوہ آباد یوپی کا ایک پُرانا قصبہ ہے۔ آگرے کے قریب۔

قصبہ کیا ہے۔ پُرانے کھنڈر جیسے مکانوں کا ایک مجموعہ ہے۔

ان ہی میں سے ایک کھنڈر جیسے مکان میں میرا جنم ہُوا تھا۔

میری ماں میری پیدائش کا بوجھ برداشت نہ کر سکیں۔ میرے پیدا ہوتے ہی مر گئیں بیچاری۔

پھر میرے والد نے دوسری شادی کر لی۔

میری سوتیلی ماں کا نام کریمن تھا۔ وہ ذات کی نائن تھی۔ مگر صورت شکل کی ذرا اچھی تھی۔ جب ہی تو میرے والد صاحب نے بیوی کے مرنے کے دو مہینے بعد اُس سے نکاح پڑھوالیا۔ محلّے والے یہ بھی کہتے تھے کہ اُن کا معاملہ کریمن کے ساتھ پہلے سے چل رہا تھا۔

کریمن میری سوتیلی ماں ضرور تھی۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے، حضور، کہ اُس نے کبھی سوتیلی ماں جیسا سلوک نہیں کیا مجھ سے۔ اُس کی

اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ اُس نے مجھے سکول پڑھنے بھیجا، وہ مجھے ہمیشہ سینما ساتھ لے جاتی تھی اور ہر طرح کے ناز اٹھاتی تھی۔

جب تک میں پندرہ برس کی ہوئی تو سینما کی پکی شوقین بن چکی تھی۔ سچ بات یہ ہے کہ شکوہ آباد جیسے مردہ قصبے میں اور کوئی تفریح کی جگہ بھی تو نہیں تھی۔ جب تک میں کوئی فلم دیکھتی رہتی تو ایسا لگتا کہ میں کسی دوسری دنیا میں ہوں۔ ایک رنگین رومانی دنیا۔ جس میں سب مرد خوب صورت تھے —— نہ صرف ہیرو بلکہ ولین بھی —— اور سب عورتیں اور لڑکیاں حسین تھیں اور سب نے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ فلموں سے میں نے بہت کچھ سیکھا، حضور، مگر خاص طور سے یہ سیکھا کہ اپنی زندگی کی کٹھنائیوں اور محرومیوں سے سینما کے اندھیرے میں کیسے بچا جا سکتا ہے۔ اور کچھ بھی سیکھا۔ مثلاً ہیروئنوں کی طرح کے کپڑے پہننا، اُن کے جیسے بال بنانا یا کٹوانا۔ اُس زمانے میں سادھنا نئی نئی "لو اِن شملہ" میں آئی تھی۔ اُس کی طرح کی "فرنج" میں نے بھی بنالی کہ میرا ماتھا بھی بڑا تھا اور "فرنج" یعنی کٹے ہوئے بالوں کی جھالر میرے چہرے پر بھی اچھی لگتی تھی۔

اگلے دن ہی میرے خالہ زاد بھائی محمود علی جو مجھ سے عمر میں چار پانچ برس بڑے ہوں گے آئے تو انہوں نے پہلی جھلک ہی میں پہچان لیا کہ میں نے "لو اِن شملہ" دیکھ کر اپنے بال کاٹے ہیں۔ اس لئے وہ ہلکے سے مذاق میں کہنے لگے "کیوں سلیمہ۔ لو اِن شملہ تو دیکھا۔ لو اِن شکوہ آباد کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

اتنی بے شرمی کی بات سن کر میرا سارا چہرہ گلابی ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دوں۔ میں جلدی سے وہاں سے بھاگ گئی۔ محمود بھائی بھی دو چار پھبتیاں کس کر وہاں سے چلے گئے۔ ہاں جاتے جاتے اتنا کہہ گئے کہ دو دن کے بعد وہ علی گڑھ جا رہے ہیں کسی کو سینما چلنا ہو اُن کے ساتھ تو وہ کل چل سکتا ہے۔ میں نے اماں سے پوچھا —— میں کریمن کو اماں ہی کہتی تھی۔ چلو گی اماں؟ مگر اماں نے کوئی بہانہ کر دیا۔ ابا تو سینما جانے کو ہی تیار نہیں تھے۔ اماں نے کہا۔ اپنے گھر کا ہی لڑکا تو ہے۔ تو اُس کے ساتھ چلی جائیو برقعہ اوڑھ کر۔

اگلے دن میں محمود بھائی کے ساتھ سینما ہو لی۔ رات کا وقت تھا۔ وہ بھی آخری دسمبر کی رات۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ تانگے میں بیٹھی تو محمود بھائی پاس بیٹھے۔ اُن کا ہاتھ نہ جانے کس طرح میرے برقعہ کے اندر آ گیا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔ "اوفوہ۔ تمہارے ہاتھ تو بالکل ٹھنڈے برف ہو رہے ہیں۔" اور اپنے ہاتھوں کی گرمی مجھے پہنچاتے رہے۔ تھوڑی دیر میں میرے ہاتھ بھی اُن کے ہاتھوں کی طرح جلنے لگے۔

سینما آ گیا تو وہ تانگہ والے کو پیسے دے کر مجھے سینما میں لے چلے۔ میں حیران رہ گئی جب میں نے دیکھا کہ انہوں نے ایک "باکس" ریزرو کر رکھا تھا۔ یہاں ہم دونوں اکیلے تھے۔ اس لئے سینما شروع ہونے پر محمود بھائی نے میرا برقعہ اتار دیا۔ اور آہستہ آہستہ اُن کا بازو میرے گرد حمائل ہو گیا۔ فلم کافی بکواس تھی مگر ہیرو، ہیروئن کی محبت کے بہت سے سین تھے۔ جو میرے لئے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔

جو نکتے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے محمود بھائی کا ہاتھ میری تربیت کرتا رہا۔ ایک سین تھا جس میں ہیروئن گر پڑتی ہے۔

ہیرو گھبرا کر بھاگتا ہے اور زمین پر بیٹھ کر پوچھتا ہے۔

"چوٹ لگی ہے؟"

ہیروئن منہ بنا کر کہتی ہے "بہت لگی ہے۔"

"کہاں؟" ہیرو پوچھتا ہے۔

"یہاں!" وہ ٹخنے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیتی ہے۔

وہ ٹخنہ دبانے لگتا ہے۔

پھر وہ کہتی ہے "یہاں" اور گھٹنے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

وہ گھٹنہ دبانے لگتا ہے۔

پھر وہ کہتی ہے "نہیں وہاں نہیں . . . . یہاں"

"کہاں؟" وہ پوچھتا ہے۔

وہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیتی ہے "یہاں"

ہیرو کے ہاتھ بے اختیار سینے کی طرف بڑھتے ہیں . . . . بڑھتے ہیں — پھر ایک دم رک جاتے ہیں۔

مگر محمود بھائی کا ہاتھ نہیں رکا۔ اور میں نے لذت بھرے درد کو محسوس کر کے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں....

اگلے دن محمود بھائی تو علی گڑھ چلے گئے اور میں اُن کی یاد کو سینے سے لگائے سکول چلی گئی۔

سکول سے لوٹی تو دروازے ہی میں برقعہ اُتارا اور اندر گھس رہی تھی کہ بندو سقے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

وہ اندر سے خالی مشک کندھے پر لٹکائے باہر نکل رہا تھا اور میں اندر جا رہی تھی۔ ہم دونوں کا معانقہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دو پل کے لئے ہم ایک دوسرے کے مقابل ٹھٹک کر رہ گئے۔ میں نے دیکھا کہ سقے کا لونڈا جو مجھ سے ذرا ہی بڑا تھا اور جس کے ابھی مونچھیں بھی نہ نکلی تھیں منہ پھاڑے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ میں بھلا سقے کے لونڈے کو کب خاطر میں لانے لگی تھی پھر بھی گھبراہٹ میں میں بھی دکھنی کی دکھنی رہ گئی۔ پھر بھی بندو کو جلدی ہوش آیا اور وہ دفعتاً کنی کاٹ کر میرے پاس سے گذر گیا۔ صرف اُس کی مشک کی اور اُس کے بدن کی بو رہ گئی۔ میں بھی چونکتی ہو کر اندر چلی گئی۔ اور یہ واقعہ دوپہر کے سناٹے میں کھو یا رہا کسی نے ہم کو دیکھا نہیں تھا۔ لیکن نشۂ حسن میں ڈوبی ہوئی میری خوشی کا کیا ٹھکانہ۔ کل محمود بھائی جس صورت پہ مر مٹے تھے آج اسی صورت کو دیکھ کر ایک سانولا سلونا سقے کا لونڈا گھن چکر ہو گیا تھا۔

سقے کے لونڈے کو میں کب منہ لگانے والی تھی مگر مجھے بڑا اچھا لگتا تھا کہ میرے حسن کے پجاریوں میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد جب بھی مجھے موقع ملتا میں کسی نہ کسی بہانے سے بندو کے سامنے آ جاتی یا اُسے اپنی ایک جھلک دکھا کر فوراً پردہ کر لیتی۔ جیسے غلطی سے سامنا ہو گیا ہو۔ وہ بیچارہ یہ تو اُمید ہی کبھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ معاملہ آگے بڑھے گا — ایک شریف زادی سے چھیڑ چھاڑ

کی پاداش میں آیا اُسے مار مار کے ادھ مُوا نہ کر ڈالتے ۔ مگر اِس انا کانی میں مجھے بہت مزا آتا ۔ وہ مرے یا جئے مجھے کیا غرض!

گرمیوں کی چھٹیوں میں محمود بھائی پھر سکرہ آباد آئے ۔

کبھی خالہ اماں کے گھر جانے کے بہانے ہم اُن کے ہاں ملتے ۔

کبھی کچھ نہ کچھ بہانہ نکال کر ہمارے ہاں آجاتے ۔

کبھی سینما ہم اماں کو ساتھ لے کر چلے جاتے ۔

اور کبھی کبھی سینما ہم دونوں ہی جاتے ۔ اُس دن میں نیلی ساڑھی پہنتی ۔ نیلا میرا محبوب رنگ تھا ۔ اور محمود کو بھی بہت پسند تھا ۔
اور تب "باکس" میں بیٹھ کر ہی پکچر دیکھتے ۔ بلکہ پکچر برائے نام ہی دیکھی جاتی! —

ایک بار سقّے کا لونڈا بندو ہمیں وہاں مل گیا اور میں نے محمود بھائی سے کہہ دیا کہ یہ بیچارہ بھی میرا شکار ہو گیا ہے ۔

"بہت خوب!" محمود بھائی بولے ۔ "تو شادی کر لو ۔"

"اُس سے شادی کرے میری جوتی!"

"پھر کس سے شادی کرو گی؟"

"آپ کو معلوم ہے!" میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بالکل ہیروئنوں والے انداز میں کہا ۔

"پھر تو اماں سے بات کرنی ہی پڑے گی!" وہ ہنس کر بولے ۔

اور میں نے اُن کے بازو میں گھس کر کچھ کھسر پھسر کیا ۔

"سچ! پھر تو دیر نہیں کرنی چاہیے ۔"

"ہاں محمود ۔ ورنہ میں مر جاؤں گی ۔"

"ارے مریں تمہارے دشمن!"

"اُس سے تیسرے دن محمود ہمارے گھر آیا اور اَبا کو بیٹھک میں دیکھ کر اور اماں کو سوتا پاکر مجھ سے آہستہ سے بولا ۔" اماں انکار کر رہی ہیں؟"

"کیوں؟ مجھ میں کیا برائی ہے؟"

"تم میں کچھ برائی نہیں ہے ۔ مگر اماں کہتی ہیں کہ خالہ کریمن نائی خاندان سے ہیں ۔ سقّے نائیوں میں پٹھان لوگ شادی کرنا نہیں چاہتے ۔"

"سقّے نائیوں کا ذکر کیوں کیا؟"

"آہستہ بولو ۔ اماں اٹھ جائیں گی ۔ سقّوں میں شادی کرنے کے تم بھی خلاف ہو ۔ ہو نا؟"

"ہائے اللہ اب کیا ہوگا مجھے تو ابھی سے ابکائیاں آنے لگی ہیں ۔ نہ جانے کب بھانڈا پھوٹ جائے!"

"فکر کیوں کرتی ہو، میری جان ۔ ہم تو ابھی نہیں مرے ۔ بس دو چار دن انتظار کرو پھر میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں!"

اور وہ چلا گیا۔

اس کے بعد میں اس سے کبھی نہیں ملی۔

تین دن بعد بندو جب پانی کی مشک ڈالنے آیا تو نظر بچا کر ایک لفافہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے ڈال گیا۔

اس کی یہ ہمت؟ میں نے سوچا۔ مگر خط کے اوپر پتہ محمود کی لکھائی میں تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے لفافہ کھولا۔ اندر بس تین سطریں تھیں:-

"جانِ من۔ آج تم آدھی رات کے بعد کی ٹرین سے آگرہ آ جاؤ۔ میں
وہاں تمہیں ملوں گا۔ وہاں میں نے قاضی کا انتظام کر رکھا ہے!
تمہارا محمود

نوٹ۔ نیلی ساڑھی پہننا۔"

میں نے خط کو کئی بار پڑھا بالکل "مسلم سوشل" کی فلمی سچوایشن تھی۔

میں نے بھی ویسی ہی تیاری کی جیسی مسلم سوشل کی ہیروئن کرتی ہے۔

دو تین جوڑے کپڑے نکالے جو بھی میرے پاس بہترین تھے۔ کاٹن کی نیلی ساڑھی رات کو پہننے کے لئے نکالی۔ جو زیور بھی میرے پاس تھے اُن کو اٹیچی میں رکھا اور سر درد کا بہانہ کر کے سویرے سے لیٹ رہی۔

گرمی کی راتیں تھیں۔ اوپر چبوترے پر میرے والد اور والدہ سو رہے تھے۔ میں نیچے صحن میں اپنے پلنگ پر پڑی تھی۔ پاس ہی بڑھیا فتو اپنی کھاٹ پر بیہوش پڑی تھی۔ ہوش میں ہوتی جب بھی وہ بہری تھی اور آنکھوں میں موتیا بند اترا ہوا تھا۔ سو جب رات کے بارہ بجے تو میں چپکے سے اٹھی، کوٹھڑی میں جا کر نیلی ساڑھی پہنی، برقعہ اوڑھا۔ اٹیچی کیس ہاتھ میں لیا اور ننگے پاؤں (جوتیاں ہاتھ میں اٹھائی ہوئی تھیں) باہر نکل گئی۔

گلی کے موڑ پر پہنچی تھی کہ سامنے بندو کھڑا دکھائی دیا۔ یہ کمبخت یہاں اس وقت کیا کر رہا تھا؟ پاس گئی تو دیکھا کہ وہ تو میرے راستے میں اڑا کھڑا ہے۔

"بی بی۔ آپ اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟"

"تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟"

"یہ سمجھ لیجئے کہ میں آپ کا ایک ہم شہر ہوں۔ آپ کے خاندان کا نمک کھایا ہے۔ اس لئے نمک کا حق پورا کر رہا ہوں۔ بی بی۔ واپس چلی جائیے۔"

میں برقعہ میں سے منہ نکالے ڈراتی ہوئی سیدھی چلی گئی۔ آخیر وقت پر وہ راستے سے ہٹ گیا۔

"بی بی جی مت جائیے......" پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

"بی بی جی مت......" وہ وہیں کھڑا تھا اس لئے اس کی آواز پوری نہ آئی۔

"بی بی جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بی بی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر وہ آواز ــــ جو شاید میرے ہی ضمیر کی آواز تھی ــ آنا بند ہو گئی۔

سٹیشن پہنچ کر میں نے دو بجے والی گاڑی سے آگرہ کا ٹکٹ خریدا اور ایک زنانے درجے میں بیٹھ گئی۔

آگرے پر حسب وعدہ محمود میرا انتظار کر رہا ہو گا ــــ انتظار کی گھڑیاں بھی کتنی دلچسپ ہوتی ہیں ــــ وہاں وہ میرے انتظار میں سٹیشن کی گھڑی دیکھ رہا ہو گا کہ کب چار بجیں اور گاڑی وہاں پہنچے ــــ

اور یہاں میں بھی اسی انتظار کا شکار ہوں اور چلتی ہوئی ٹرین کے بند شیشے میں سے مستقبل کی جھلکیاں مجھے نظر آ رہی ہیں۔

گاڑی آگرہ سٹیشن پہنچتی ہے۔

چلتی ہی گاڑی ہی میں سے میری نظر دراز قامت محمود کو ڈھونڈ نکالتی ہے۔

"محمود!" میں آواز دیتی ہوں۔

وہ ہلکی ہوتی ہوئی ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگتا ہے۔ ڈنڈا پکڑ کر درجے میں گھس آتا ہے۔

سب لوگوں کے سامنے مجھے بھینچ کر گلے لگا لیتا ہے۔

"سلیمہ! میری اچھی سلیمہ! تم آ گئیں نا؟"

اس کی ایک دن کی بڑھی ہوئی داڑھی مجھے اپنے گالوں پر اچھی لگتی ہے۔

گاڑی ٹھہر جاتی ہے۔

وہ میرا اٹیچی کیس سنبھالتا ہے۔ مجھے پلیٹ فارم پر اتارتا ہے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے کان میں کہتا ہے "قاضی جی ــ لمبی داڑھی والے ــ ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ پورے سو روپے وعدہ کیا ہے ان کو دوں گا اس بے وقت کی شادی کا!"

ہم ٹیکسی میں بیٹھے۔ اور ٹیکسی گھڑ گھڑ کرتی ہوئی روانہ ہو گئی۔

رات کے دھندلکے میں شہر کی روشنیاں عجیب عجیب لگ رہی تھیں۔

اور یہ ٹیکسی تو ایسے چلتی ہے جیسے ریل چل رہی ہو۔ کیا لوہے کے پہیے لگے ہیں اس میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟

ارے یہ سب تو میرا تخیل تھا۔ ابھی تو میں ریل ہی میں تھی اور ریل کی گھڑ گھڑاہٹ میرے کانوں میں۔ باہر آگرے کے شہر کی دھندلی دھندلی روشنیاں ہلکی ہوتی ہوئی ٹرین میں سے دکھائی دے رہی تھیں۔

اس بار ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر گئی۔

میں نے نیچے اترنے سے پہلے جھانک کر دیکھا۔ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں کوئی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے مرد دوسرے سروں کے اوپر سے جھانکتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ اترنے والے مسافر۔ چڑھنے والے مسافر۔ خونچے والے۔ ریلوے بابو۔ گھمسان کا عالم تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ کوئی آدمی اس بھیڑ میں کھو جائے۔

میں جان کر کھلے درجے کے دروازے میں کھڑی رہی تاکہ میں خود بھیڑ میں نہ کھو جاؤں اور محمود کو دور سے دیکھ کر پہچان لوں۔ مگر ریل چلنے لگی اور محمود نہ آیا۔ میں چلتی گاڑی سے اتر گئی۔

اب پلیٹ فارم تقریباً خالی ہو چکا تھا۔

دور دور تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا...... سوائے ایک پستہ قد آدمی کے جو مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جو شاید اسی طرح ہر اکیلی لڑکی کو دیکھ کر گھورتا ہوگا۔ میں جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی زنانہ ویٹنگ روم میں داخل ہو گئی۔ سوچا محمود کو شاید کہیں دیر لگ گئی ہوگی۔ چند منٹ میں آتا ہوگا۔ تب تک میں منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جاؤں۔

ویٹنگ روم سے باہر نکلی تو اسی پستہ قد آدمی کو گھورتے دیکھا۔ وہ میلی سی پتلون پر ایک دھاری دار بش شرٹ پہنے تھا۔

اب وہ میری طرف بڑھا۔

میں ادھر ادھر دیکھ کر اندر واپس جانے والی تھی کہ وہ آدمی بولا "سنیئے جناب"۔ میں ٹھٹک کر رک گئی۔ سوچا شاید محمود نے اسے مجھے لانے کے لئے بھیجا ہو۔ "آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟"

"جی ہاں"

"کس کا؟"

"محمود علی صاحب کا۔ آپ انھیں جانتے ہیں؟"

"نہیں تو۔ میں تو انھیں نہیں جانتا۔ میں تو بومبے فلم کمپنی سے ادھر فلم سٹار بننے کے قابل لڑکے اور لڑکیاں کھوجنے آیا ہوں...... آپ دیکھنے میں قبول صورت دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے سوچا شاید آپ کو دلچسپی ہو —"

"جی نہیں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے سوائے محمود علی صاحب سے ملنے میں! اگر کوئی ایسے سے صاحب کسی لڑکی کو ڈھونڈتے آئیں تو آپ مہربانی کر کے انھیں ادھر بھیج دیجئے۔" یہ کہا اور میں دروازے کے اندر چلی گئی۔

وہ آدمی سگریٹ جلا کر سامنے ٹہلنے لگا۔

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر فلم سٹار بننے میں کسے دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے سوچا ممکن ہے یہ دنی جھوٹا ہو...... یا ممکن ہے سچ بولتا ہو — محمود آئے گا تو اس سے مشورہ کروں گی۔

مگر صبح سے شام ہو گئی اور محمود نہیں آیا۔

میں نے وہیں کھانا منگوا کر کھا لیا۔

اب میں نے سوچا کسی وجہ سے علی گڑھ جانا پڑا ہوگا محمود کو۔ ممکن ہے یونیورسٹی کھل گئی ہو۔

سو میں رات کی گاڑی سے علی گڑھ کے لئے روانہ ہو گئی۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا — یا شاید نہیں ہوا — کہ وہ پستہ قد آدمی بھی اسی گاڑی میں سوار ہوا۔ مگر پھر اس نے مجھ سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی۔

علی گڑھ کے سٹیشن پر میں اتری تو مجھے تعجب ہوا — یا شاید نہیں ہوا۔ کہ وہ آدمی بھی وہیں اُترا اگر پھر وہ نظر نہیں آیا۔
رات کا وقت تھا۔ میں ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گئی اور صبح کا انتظار کرنے لگی۔ محمود کے ہاسٹل کا پتہ میرے پاس موجود تھا۔
صبح ہوتے ہی میں ایک سائیکل رکشا پر سوار ہو کر وہاں پہنچی۔ یونیورسٹی سنسان تھی۔ اُس کمرے میں اکثر کمروں کی طرح قفل لگا ہوا تھا۔

مگر برابر کا کمرہ کھلا ہوا تھا۔

اُس میں سے چک ہٹا کر ایک نوجوان باہر نکلا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

" آپ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں شاید؟"

" ہاں۔ اپنے کزن محمود علی خاں صاحب کو۔"

" محمود کی کزن ہیں آپ! پڑوسی ہونے کے ناتے میرا فرض ہے آپ کی سیوا کرنا۔ وہ تو ابھی واپس نہیں آیا۔ میں ہی اکیلا ہاسٹل میں ہوں۔ میرا کمرہ حاضر ہے۔ رکشا والے کو رخصت کئے دیتا ہوں!"

نہ جانے اس کی آنکھوں کی چمک مجھے کیوں اچھی نہیں لگی اور میں "جی نہیں شکریہ" کہہ کر برآمدے سے اُتر کر رکشا میں بیٹھ گئی۔

" چلو واپس سٹیشن پر"۔

جب واپس سٹیشن پر پہنچی تو اُس پستہ قد آدمی کو وہاں ٹہلتے ہوئے پایا۔

شام کی ٹرین سے میں واپس شکوہ آباد چلی آئی۔ رات کو پہنچی۔

وہ آدمی بھی اُسی ٹرین میں سوار ہوا۔ مگر اُس کی کوئی بات نہیں ہوئی مجھ سے۔

رات کو شکوہ آباد پہنچ کر تانگے پر سوار ہو کر میں گھر چلی۔

گلی کے نکڑ پر تانگہ رکوایا اور میں نے تانگے کو رکنے کے لئے کہا۔ کیونکہ اب پیسے میرے پاس ختم ہو گئے تھے۔

سوچا گھر جا کر باپ ماں سے کہوں گی کسی سہیلی کے ہاں گئی تھی اور اُن سے تانگے کا کرایہ دلوا دوں گی۔ مگر ڈیوڑھی تک ہی پہنچی تھی کہ ارادہ بدل گیا۔

اندر سے ابا مرحوم اور کریمن بوا کی آوازیں آ رہی تھیں۔

" اس لڑکی کو کبھی سوتیلی بیٹی نہیں سمجھا۔ اپنی بیٹی سے بڑھ کر پالا۔ اور یہ ہمارے خاندان کی ناک کٹوا کر بمبئی چلی گئی فلم سٹار بننے!"

" ہاں بھئی میں تو سینما دیکھنے کو اسی لئے منع کرتا تھا۔ محمود کہتا ہے کہ کب سے اُس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اُس سے کہتی تھی دونوں ساتھ چلیں گے۔ تم ہیرو بننا میں ہیروئن بنوں گی ..... مگر وہ تو شریف کا بچہ ہے اُس نے منع کر دیا تو کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ہے اب!"

" دو چار مہینوں میں ٹھوکریں کھا کر آ جائے گی اپنے چہیتے باپ کے پاس!"

" کیا منہ لے کر آئے گی؟ اب آئی تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا اُس کی! ....."

میں یہیں تک سن پائی تھی کہ مجھے معاً تانگے کا خیال آیا۔ دبے پیروں وہاں سے لوٹی۔

"واپس سٹیشن پر چلو" تانگے والے کو کہا۔

مگر راستے بھر سوچتی گئی کہ پیسہ کیسے ادا کروں گی۔ شاید کوئی زیور گروی رکھنا پڑے۔ مگر اس وقت رات کو گروی کون رکھے گا۔

مجھے تعجب ہوا — یا شاید نہیں ہوا — کہ وہ پستہ قد آدمی سٹیشن کے باہر ہی ٹہل رہا تھا۔

اُس نے تانگہ رُکتے ہی اُس کا کرایہ چکا دیا۔

"آپ نے اچھا کیا کہ وقت پہ آ گئیں؟ متھرا کی گاڑی آنے والی ہی ہے۔ وہاں سے فرنٹیر میل پکڑنی ہے ہمیں"۔

اُس نے میرا ٹکٹ نہیں خریدا۔

اُس کے پاس میرا ٹکٹ پہلے سے موجود تھا۔

گاڑی آنے سے پہلے اُس نے صرف اتنا کہا کہ "آپ مجھ پہ بھروسہ رکھیے۔ آپ کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ زنانے درجے میں آپ سفر کریں گی۔ کمپنی والوں کو آپ کو سپرد کرتے ہی میں تو کلکتے چلا جاؤں گا ..... کچھ بنگالی چہرے بھی لانے ہیں"۔

وہ اپنے قول کا پکا ثابت ہوا۔

زنانے درجے میں سوار کر کے وہ صرف چائے اور کھانا پوچھنے آتا تھا۔

اور ہاں ایک بار بہت سے فلمی پرچے مجھے دے گیا اور کہنے لگا "اب دیکھئے اگلے مہینے ان سب میں آپ کی تصویریں چھپیں گی"۔

اور میں نے سوچا کہ محمود جو ان سب پرچوں کو پڑھتا تھا یہ دیکھ کر کتنا جلے گا۔

میں نے اٹیچی کیس کو تکیہ بنا کر بڑی دفعہ کو رات کو اوڑھ لیا تھا لیکن بمبئی پہنچتے پہنچتے وہ اب غیر ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے وہیں ریل کے ڈبے میں چھوڑ دیا۔

بمبئی پہنچ کر اُس نے مجھے ٹیکسی میں بٹھایا۔ خود ڈرائیور کے پاس بیٹھا اور کہا "میرین ڈرائیو چلو"۔

"کیا کمپنی کا دفتر وہاں ہے؟"

"ہاں یہی سمجھو۔ سٹوڈیو تو ہمارا دادر میں ہے۔ یہ سیٹھانی جی کا اپنا فلیٹ ہے۔ وہ تمہیں اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی ہیں"۔

"تمہاری کمپنی کی مالکن ایک عورت ہیں؟"

"ہاں اور کیا؟ جب ہی تو جب کسی لڑکی کو سے کر ہم آتے ہیں تو راستے بھر اُس کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے ....."

"کیا نام ہے تمہاری سیٹھانی کا؟"

"مس للیتا کماری۔ پہلے وہ بھی ہیروئن ہوتی تھیں۔ مگر کسی اور نام سے کام کرتی تھیں۔ اب ذرا موٹی ہو گئی ہیں سو کمپنی کھول لی ہے"۔

فلیٹ کے دروازے پہ بورڈ لگا تھا "مس للیتا کماری۔ فلم پروڈیوسر"

مگر میں نے دیکھا کہ ایک جنگلہ بھی لگا ہے دروازے کے باہر گیلری میں جسے ایک چوکیدار نے کھولا اور پھر بند کر دیا قفل لگا دیا۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب تو ہوا۔ مگر میرے پستہ قد ساتھی نے اطمینان دلا دیا: "سیٹھانی بہت وہمی ہیں۔ ہمیشہ چوروں سے ڈرتی ہیں کہ کوئی ان کے ہیرے جواہرات چرا کر نہ لے جائے؟"

ایک ڈرائینگ روم میں لے جا کر بٹھایا گیا۔

پستہ قد آدمی باہر کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ بند کر لیا۔

نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے، پرکھ رہا ہے مگر کمرہ خالی تھا۔ کوئی تھا ہی نہیں۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔

کچھ دیر کے بعد دروازہ پھر کھلا۔ اور وہی پستہ قد آدمی ایک موٹی عورت کے ساتھ داخل ہوا جو کسی زمانے میں بہت خوب صورت رہی ہوگی۔

"اچھا۔ نیلی ساڑھی۔ گڈ بائی اینڈ گڈ لک!"

اور یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔

اور سیٹھانی میری طرف آئیں۔

مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بڑے پیار سے میرے سر کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا: "ابھی تو تم تھکی ہوئی ہو۔ کچھ کھا پی کر آرام کرو۔ رات کو تمہارا ٹسٹ لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب ہوگی اور ریشما کماری کا نام روشن کروگی!"

یہ کہہ کر انہوں نے تالی بجائی۔

ایک نوکرانی ایک ٹرے میں کچھ مٹھائی اور دودھ کا گلاس لے کر آئی۔

"کھاؤ۔ پیو!"

"آپ نہیں کھائیں گی؟"

"نہیں میں ابھی کھا پی کر اٹھی ہوں۔ یہ سب تمہارے لئے ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک مٹھائی کی ڈلی میرے منہ میں ڈال دی کہنے لگیں کہ یہ شگن کی مٹھائی ہے۔

مٹھائی کا مزہ تو اچھا تھا مگر اس میں کچھ کڑواہٹ ملی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا پستہ یا بادام شاید کڑوا ہوگا۔

" پھر انہوں نے دودھ کا گلاس میری طرف بڑھایا۔

"پیئو، میری جان" انہوں نے بڑے پیار سے دودھ اپنے ہاتھ سے پلایا۔ دودھ خوشبودار تھا گلاب کی سی خوشبو تھی اس میں مگر ساتھ ہی ایک ہلکی سی کڑواہٹ بھی تھی۔ سیٹھانی نے اپنا ہاتھ نہ ہٹایا، جب تک

میں نے دودھ کا گلاس ختم نہ کیا۔ اور پھر اُن کی آواز ایک دوسری دنیا سے آئی "اور بھول جاؤ سب کچھ۔ اب تمہاری نئی زندگی شروع ہوتی ہے......"۔

ایک لامتناہی رات میں ایک ڈراؤنا خواب دیکھتی رہی۔
دیکھتی ہوں کہ ایک ہاتھ میرے باپ نے پکڑا ہوا ہے۔
دوسرا ہاتھ میری سوتیلی ماں نے۔
ایک ٹانگ محمود نے پکڑی ہوئی ہے۔
دوسری ٹانگ اُس پستہ قد آدمی نے جو مجھے بمبئی لایا تھا۔
اور سیٹھانی کی نگرانی میں میرے بدن میں یہ لمبے لمبے اُنگ کے سوئے گھسیڑے جا رہے ہیں۔
اور میرے بدن میں سے سارا خون پانی بن کر نکل رہا ہے۔
نہ جانے کتنی دیر یہ خواب دیکھتی رہی۔
اس کے بعد جب ہوش آیا تو میں ایک گدّے دار پلنگ پر پڑی تھی۔
میرے سر کے نیچے ایک مخملی تکیہ تھا۔

جب میں نے اپنی ٹھوڑی کھجانے کے لئے اپنا ہاتھ ہلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ٹانگ سکوڑنی چاہی تو ٹانگ بھی پائے سے بندھی ہوئی ہے۔ دوسری ٹانگ بھی، سر بھی اسی طرح کسی چیز سے باندھا گیا ہے کہ میں صرف سامنے دیکھ سکتی ہوں اور پیراہن کے بغیر آرام دہ سولی پہ چڑھا دی گئی ہوں۔

اتنے میں سیٹھانی میرے سامنے کھڑی تھی۔
کہنے لگی "عیش و آرام کرو گی یا تکلیف اُٹھاؤ گی۔ اس کا فیصلہ تم پر ہے۔ دیر یا سویر سب رام ہو جاتی ہیں۔ تم بھی ہو جاؤ گی۔ مگر ابھی یا کچھ اور درد کے بعد؟"

میں نے پوچھا "آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ اس خوبصورت بدن کو انسانیت کو آرام پہنچانے کے لئے استعمال کرو۔ جو مجرد ہیں اُن کے لئے ایک رات کی بیوی بنو، جو اپنی بیویوں کی بدصورتی سے گھبرائے ہوئے ہیں اُن کے بدن کو تسکین پہنچاؤ، جو سیاسی، سماجی، اقتصادی ذمہ داریوں میں دبے ہوئے ہیں اُن کا دل بہلا کر اُن کو اس قابل بناؤ کہ وہ ہمارے سماج کی ذمہ داریاں اٹھا سکیں!"

"تم چاہتی ہو کہ میں رنڈی بن جاؤں؟" میں نے یہ سوال سیٹھانی سے کیا۔ اور اپنے آپ سے بھی۔ "ارے میں ماں بننے والی ہوں۔ ماں!"

"تم ماں کبھی نہیں ہوگی۔ اس بار نہیں۔ کسی بار نہیں۔ دیکھنا چاہتی ہو یہ آپریشن کس کس نے کیا ہے۔ اور بغیر کسی لوہے کے

آئے کسے ؟

اتنے میں اُس کے اشارے پر ایک کے بعد ایک آدمی آتا گیا اور میرے پائنتی کھڑا ہو کر میری نگاہ کے دائرے سے اوجھل ہوتا گیا۔

ہندو — مسلمان — سکھ — کرسچین — پوربی بھیا — مدراسی —

نہ جانے کہاں کہاں سے یہ مسٹنڈے اکٹھے کئے گئے تھے۔

اب مجھ میں چیخنے چلانے کی طاقت نہیں تھی۔ میرا کلیجہ منہ کو آیا اور ایک اُبکائی کے بعد میں نے قے کر دی اور بے ہوش ہو گئی۔

جب پھر ہوش آیا تو میری باقاعدہ ٹریننگ شروع ہوئی۔

ایک بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا کوڑے پڑتے تھے اور کھانا بند۔

دو بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا ان چھ مسٹنڈوں سے منہ کالا کرانا تھا۔

تین بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا ایسڈ منہ پر پھینکنا تھا۔ اس کا مظاہرہ میرے سامنے ایک معصوم سی بلی پر کر دیا گیا تھا جو ایسڈ سے جل کر لوٹ پوٹ کر وہیں میرے سامنے ڈھیر ہو گئی۔

میں نے ایک درخواست کی کہ مجھے یہ بتایا جائے کہ مجھے اس پستہ قد آدمی نے پہچانا کیسے کہ یہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے۔ جواب ملا "تمہاری نیلی ساڑھی سے۔ تمہارے عاشق نے دو سو روپے لے کر یہ اطلاع دی تھی کہ اس ٹرین سے تم آؤ گی اور یہ کپڑے پہنے ہو گی۔"

یہ سننے کے بعد میں تیار ہو گئی۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا۔

اگر میں یہ بتاؤں کہ اگلے چھ برس تک کیا ہوا تو ایک ایسی فہرست تیار ہو جائے گی کہ اُس کے شائع کرتے ہی ملک میں انقلاب آ جائے گا۔ میرے گاہکوں میں کون نہیں تھا . . . . .

افسر — منسٹر — بڑے بڑے بیوپاری — راجہ مہاراجہ نواب — فلم سٹار۔ فلم پروڈیوسر۔

پہلے میرے ساتھ ایک آدمی جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ پہ بھروسہ ہونے لگا۔ پھر مجھے جو روپیہ ملتا تھا اس میں سے ایک تہائی اپنے پاس رکھنے کی اجازت مل گئی۔

میں اپنا پرانا نام بھی بھول گئی۔ نیا نام ہی کافی تھا۔ نیلی ساڑھی۔ میرے پاس ہر شیڈ کی نیلی ساڑھیاں تھیں۔ شفون کی نیلی ساڑھی۔ سلک کی نیلی ساڑھی۔ بنارسی نیلی ساڑھی۔ کنجی ورم کی نیلی ساڑھی۔ جارجٹ کی نیلی ساڑھی . . . . . اور سوٹ کیس کے سب سے نیچے کاٹن کی نیلی ساڑھی۔

ایک دن مجھے چھٹی تھی (جمعہ کو یہ چھٹی میں ضرور لیا کرتی تھی)

اُس دن نہ جانے کیا ہوا کہ مجھے جوہو جانے کی سوجھی۔ اور نہ جانے کیوں میں نے وہی پرانی کاٹن کی نیلی ساڑھی پہنی۔

جوہو پہنچ کر میں نے ناریل پانی پیا۔ بھیل پوری کھائی۔ کوئی مجھے جانتا نہیں تھا۔ اور میں اپنی گمنامی کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔

ایک جگہ ایک آدمی ریت کے پتلے بنا رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی پھیلی ہوئی چادر میں بیس پیسے پھینک دیئے۔

اُس سے آگے بڑھی تو کیا دیکھتی ہوں زمین میں سے دو اُلٹی ٹانگیں اُگ آئی ہیں معلوم ہوا کہ کسی بیچارے کو اُلٹا زمین میں گاڑ دیا گیا ہے۔ پاس ہی چادر پھیلائے ایک آدمی پیسے اکٹھے کر رہا تھا۔ میں نے اُسے ایک روپیہ دیا اور پوچھا یہ آدمی کب نکلے گا۔ اُس نے کہا۔ سورج چھپتے اُسے یہاں سے نکالوں گا۔ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر برسوں تپسیا کی ہے تب جا کر یہ کمال حاصل کیا ہے کہ شترمرغ کی طرح ریت میں سر دے کر دن بھر اُلٹا لٹکا رہتا ہے۔

مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ سورج جب سمندر میں ڈوبنے لگا تو پھر وہاں پہنچ گئی۔

وہ ڈھونگی ڈھول بجا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ دیکھو۔ دیکھو۔ دنیا کا سب سے بڑا کمال۔ بارہ گھنٹے ریت میں دفن رہ کر آدمی زندہ ہو رہا ہے۔

ٹانگوں میں حرکت پیدا ہو رہی تھی۔

اور پھر وہ آدمی جو ایک نیکر پہنے ہوئے تھا۔ نکل آیا۔ اور میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ تو اپنی آنکھوں میں سے ریت نکال رہا تھا۔ لوگ تالیاں مار رہے تھے۔ پیسے کھنا کھن گر رہے تھے اور میں منہ پھاڑے دیکھ رہی تھی —— جیسے سچ مچ کوئی مردہ زندہ ہو گیا ہو۔ اور میں ایک معجزہ دیکھ رہی ہوں۔

کیونکہ میرے سامنے شکوہ آباد کا وہ سقے کا لونڈا کھڑا تھا۔ بندو۔

تالیاں بجنی بند ہو گئیں۔

لوگ اُٹھتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

بندو اور اُس کا ساتھی پیسے بٹورنے لگے۔

آدھے اُس آدمی نے لئے، آدھے بندو نے۔ پھر اُس آدمی نے کہا "اچھا۔ بے۔ میں چلتا ہوں۔ کل یہ تماشا چوپاٹی پر جائیں گے۔"

یہ کہا اور وہ چلتا بنا۔

اور میں وہیں کھڑی بندو کو دیکھتی رہی۔

وہ بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ آگے آ کر میری طرف دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "بندو۔"

اُس نے کہا "جی۔ بی بی جی۔"

"تم شکوہ آباد سے کب آئے؟"
"کوئی سال بھر ہوا ہے۔"
"سب خیریت ہے؟"
"اُس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ سب خیریت نہیں ہے۔
"ابا تو خیریت سے ہیں؟" میں نے کرید کر پوچھا۔
"ابا تو جنت کو سدھا رے۔"
میں نے دل ہی دل میں اِنّا لِلّٰہ و اِنّا اِلیہ رَاجعون پڑھی۔
"یہاں کہاں رہتا ہے؟"
اُس نے کہا "مہالکشمی کے پاس ایک جھونپڑپٹی ہے۔"
مجھے وہاں لے چل سکتا ہے؟"
"بی بی جی —" اُس کا چہرہ خوشی اور تعجب سے پھٹا کا پھٹا ہی رہ گیا۔
"تمہاری بیوی ساتھ رہتی ہے کیا؟"
"بی بی جی — میری شادی نہیں ہوئی!"
"پھر تو ٹھیک ہے . . . . میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔
اُس کا حال تو یہ تھا کہ شادی مرگ نہ ہو جائے۔
"چلئے۔ بی بی جی۔"
"چلو۔"
سو ہم آسس مہالکشمی وال جھونپڑپٹی میں آ گئے۔
جھونپڑی اُن بانبوں سے تو اچھی تھی جو سڑک کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے تھے اور جن میں بے گھر لوگ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اور وہ لوگ اُن سے اچھے تھے جو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ ہی پر سونے کے لئے مجبور تھے۔ جھونپڑی میں ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹیا تھی۔ میں اُس پر لیٹ کر ایسی سوگئی جیسے دنیا کی خبر نہ ہو۔ چھ سال کے بعد میں سچ مچ کی چھٹی منا رہی تھی۔
صبح کو میں نے دیکھا کہ بندو جھونپڑی کے باہر سو رہا تھا۔
میں نے اُسے اُٹھایا۔
اندر آیا تو پوچھا "مجھے تو بہت اچھی نیند آئی۔ تم بھی اندر کیوں نہیں آ گئے؟"
"بی بی جی! — اندر تو ایک ہی چارپائی تھی۔ اور آپ اُس پر ایسی تھکی ہاری سو رہی تھیں۔ جیسے — جیسے — ایک بچہ سو رہا ہو۔"

"مجھے تو ساتھ ہی سونے کی عادت ہے۔ تم ہی آ جاتے!"

"بی بی جی —"

"بی بی جی —"

"نام بتاؤں دو چار کے؟ —" اور میں بتانے ہی لگی تھی۔ مگر اُس نے اتنی لجاجت سے "بی بی جی" کہا کہ میں چپ رہ گئی۔

پھر وہ کہنے لگا: "قاضی جی جب نکاح پڑھ دیں گے تب ٹھیک ہے!"

"قاضی جی؟" مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"قاضی جی!" میں ہنستی ہی رہی۔

اُس کے چہرے پر ایک ایسا بھولا پن تھا کہ مجھے اُس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔

"کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میں پچھلے چھ برس سے کیا کرتی رہی ہوں؟"

"بی بی۔ میں نہیں جاننا چاہتا —"

"...... کہ ایک ایک رات میں چھ چھ کو ......"

"بی بی جی۔ خدا کے لئے چپ رہئے۔ میں نہیں جاننا چاہتا ..... قاضی جی نکاح پڑھا دیں گے پھر جو جی چاہے مجھے بتا دینا۔"

"قاضی جی!" اور مجھے پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اور میرے منہ سے نکل گیا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایک سقے کے لونڈے سے بیاہ کروں گی؟"

یہ سن کر وہ چپ ہو گیا۔ اور باہر چلا گیا۔

دو گھنٹے کے بعد کھانے کی چیزیں لے کر آیا اور میرے سامنے رکھ دیں بغیر ایک لفظ کہے اپنا کھانا باہر لے گیا اور وہاں ہی کھایا۔

میرا جی تو اکیلے کھانے کو نہیں چاہتا تھا پھر بھی جب بھوک لگی تو زہر مار کر لیا۔ سہ پہر کو وہ آیا اور کہنے لگا "میں جا رہا ہوں۔ تم جھونپڑی کا دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ میرے آنے تک کسی کے لئے نہ کھولنا۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"روزی کمانے۔"

"سر ریت میں دے کر اُلٹے لٹکنے کو تم روزی کمانا کہتے ہو؟"

"میں جانتی تھی وہ کیا جواب دے گا۔ میں اس جواب کو سننا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کہے کہ ہر ایک کو اپنے ڈھنگ سے روزی کمانا پڑتا ہے۔ کوئی ریت میں سر دیتا ہے کوئی —؟ مگر اُس نے کچھ نہیں کہا اور چلا گیا۔

میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کھٹیا پہ لیٹ رہی۔

تھوڑی دیر میں باہر سے سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔

میں نے ایسی سیٹیاں پچھلے چھ برس میں بہت سنی تھیں۔ میں اِن کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

دو ایک نے دروازے پر ٹھک ٹھک بھی کی لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ پُرانی لکڑی کا دروازہ جو رسّی سے بندھا ہوا تھا لات مار کے توڑ دے اور اندر چلا آئے۔ غریب بھی بُرائی کرتے ہیں اور امیر بھی۔ مگر غریب کی بُرائی میں امیروں کی سی وہ بے حیائی نہیں ہوتی۔

وہ رات کو دیر میں آیا اور کچھ کھانا ساتھ لایا۔

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

اُس نے کہا "وہی جو تم نے دیکھا تھا۔ مگر پیسے زیادہ ملے۔ شاید تمہارے آنے کی برکت ہے۔"

"برکت؟" میرے جی میں آیا تو کہوں کیوں کچوکے دیتے ہو مگر اُس نے شاید بالکل بھولے پن سے کہا تھا۔ اس لئے میں چپ رہی۔

اُس رات کو میں سوچتی رہی کہ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا کر رہی ہوں چھٹی پر ہوں۔ چھ برس ہو گئے محنت کرتے کرتے۔ کچھ دن تو چھٹی کروں۔ . . . . یہاں جھونپڑ پٹی میں کون مجھے ڈھونڈنے آئے گا۔؟

بندو روز دو تین بجے جاتا رات گئے آتا۔

نہ میں اُس سے پوچھتی کہ کیا ہوا؟

نہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ میں نے کیا کیا؟

نہ ہی اُس نے اُس پہلے دن کے بعد کبھی قاضی جی کی بات چھیڑی۔

وہ اپنے میلے کچیلے بستر کا ڈھیر لیتا اور باہر جا کر بچھا دیتا۔ مگر میرے لئے وہ نئی دری نئی چادر نیا تکیہ لے آیا تھا۔ کھٹیا کو بھی ٹھوک پیٹ کر ٹھیک کر لیا تھا۔

گھر میں اُس کھٹیا پہ اکیلی سوتی تھی۔

اور وہ باہر فٹ پاتھ پہ اکیلا سوتا تھا۔

اس طرح تین ہفتے بیت گئے۔

میری پڑوس میں دو تین عورتوں سے دوستی ہو گئی۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ میرے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور میں بمبئی نوکری ڈھونڈنے آئی تھی۔ یہاں آکر بندو بھتے سے ملاقات ہو گئی تھی۔ جس نے اپنی جھونپڑی میں مجھے پناہ دی تھی۔ جھوٹ بولنے کی مجھے عادت ہو گئی تھی۔

پھر ایک دن اُسے آنے میں دیر ہو گئی تو میں نے سوچا کہ آج میں اس سے کہوں گی کہ تُم یہ کام چھوڑ دو۔ کہے گا کہ "روزی کمانے کا ایک ہی ذریعہ آتا ہے مجھے۔"

میں کہوں گی " مجھے بھی روز کمانے کا ایک ذریعہ مل گیا ہے۔ مگر میں وہ چھوڑنے کو تیار ہوں "

پھر وہ کہے گا " تو قاضی جی کو بلا لاؤں "

اور میں کہوں گی۔ ہاں۔ بلا لاؤ "

مگر وہ اُس رات نہ آیا۔

اگلے دن نہ آیا۔

تیسرے دن نہ آیا۔

میں نے پڑوسی عورتوں سے کہا۔ انہوں نے اپنے مردوں سے کہا۔ انہوں نے کہا وہ معلوم کریں گے۔ اُس آدمی سے پوچھیں گے جس کے ساتھ وہ کام کرتا ہے۔

رات کو ایک آدمی اُن میں سے آیا اور کہنے لگا " بندو تو جیل میں ہے "

" جیل میں ہے ؟ کیوں اُس نے کیا کیا ؟ "

" ریت میں دفن ہونا خودکشی کے برابر ہے۔ سپاہی کو ہفتہ نہیں کھلایا اس لیے وہ اُتم ہتیا کے جرم میں پکڑ کرلے گیا۔ دوسرا آدمی بھاگ گیا۔ اب بندو جیل میں ہے جب تک کوئی ضمانت پر چھڑائے نا ؟ "

" کتنی ضمانت دینی ہوگی ! "

" دو ہزار روپے ! " اُس آدمی نے کہا جیسے دو لاکھ روپے ہوں۔ مگر میں نے سوچا " اس سے کہیں زیادہ تو میں نے بچا کے رکھے ہیں۔ شاید پانچ چھ ہزار تو ہوں گے۔ مگر وہ تو پیڈر روڈ والی فلیٹ میں ہیں ! " (ہماری جانے رہائش بدلتی رہتی تھی)

میں اسی شام کو پیڈر روڈ والی فلیٹ میں پہنچی۔

مجھے دیکھتے ہی للیتا کماری آگ بگولہ ہوگئی " میں تو سمجھی تھی تو مر گئی یا کوئی بھگا کر لے گیا تجھے "

میں نے آواز کو قابو میں کرتے ہوئے کہا " میں جا رہی ہوں۔ اپنا روپیہ لینے آئی ہوں "

یہ کہہ کر میں اندر اپنے کمرے میں گئی اور اپنا سوٹ کیس کھول کر روپے اور اپنا زیور نکالا۔ یہ کر ہی رہی تھی کہ ایک مسٹنڈا آدمی دیکھا پیچھے کھڑا ہے۔ ہاتھوں پر لمبے لمبے کالے ربڑ کے دستانے چڑھائے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک بوتل ہے۔ جس میں مجھے معلوم تھا تیزاب رہتا ہے۔

" کیا کر رہی ہے، حرامزادی ؟ "

چھ سال کے بعد آج نہ جانے کہاں سے مجھ میں ہمت آگئی میں بولی " اپنا روپیہ اور زیور لے جا رہی ہوں۔ اور دیکھتی ہوں کون مجھے روکتا ہے "

اُس بدمعاش نے اپنے سڑے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا " تو جاؤ۔ میری جان "

اور جب میں اُس کے پاس سے گذرنے لگی تو اُس نے میرے منہ پر تیزاب کا وار کیا۔

جانتی تھی تیزاب کا کیا اثر ہوگا۔ میں ایک دو عورتوں کو دیکھ چکی تھی جو اپنا گلا سڑا چہرہ لئے اپنی زندگی کے آخری دن اُس

[redacted]

چکلے میں گذار رہی تھیں کیونکہ کہیں اور وہ اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں۔

مگر میں تو مرنے کے لئے ہی تیار تھی۔ کیوں نہ اس ظالم کو بھی ساتھ لیتی جاؤں۔ میں نے اپنے چہرے کی ناقابلِ برداشت اذیت کے باوجود اُس کے ہاتھ سے بوتل چھین کر اُس کو اُس کے سر پہ دے مارا۔ بوتل ٹوٹ گئی اور آدھا تیزاب جو اُس میں تھا وہ اُس آدمی کے چہرے پر گر پڑا۔ ایک غضب ناک چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور اُس چیخ کا نکلنا تھا کہ اُس کے کھلے ہوئے منہ میں بھی تیزاب گر گیا اور وہ آدمی پھر نہ چیخ سکا۔

میرا منہ جل رہا تھا، پھنک رہا تھا، مگر وہ روپیہ اور زیور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اُسے لے کر میں باہر آئی تو دیکھا پولیس کی ریڈ ہوئی ہے۔ للیتا لکماری بڑے ٹھسّے سے صوفے پر بیٹھی پولیس انسپکٹر سے بات کر رہی تھی "انسپکٹر صاحب میری تو ڈانس کلاس ابھی چھٹی ہے۔ اس کی لڑکیاں اپنے اپنے گھر جا رہی ہیں۔ آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ . . . . . کیا منگاؤں آپ کے لئے۔ کچھ ٹھنڈا یا گرم . . . . ."

"انسپکٹر صاحب!"

اب میں اُن کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ اور تیزاب میرے منہ پہ بہہ رہا تھا۔ اور میرے گوشت کے لوتھڑے لٹک رہے تھے۔ "اس سے پہلے کہ میں بے ہوش ہو جاؤں ——— یا شاید مر جاؤں ——— میں ایک بیان دینا چاہتی ہوں۔"

بس حضور یہی سب کہا تھا اُس بیان میں میں نے۔

میرا چہرہ جس پر پٹیاں بندھی ہیں اب اس قابل نہیں ہے کہ آپ سمجھیں لیکن ایک زمانہ تھا لوگ اس چہرے کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔

بس مجھے یہی کہنا تھا آپ سے۔

اب مجھے اجازت دیجئے۔

بُندو میرا انتظار کر رہا ہے۔

وہی ایک آدمی ہے جو انسان کا چہرہ نہیں دیکھتا۔

اُس چہرے کے پیچھے جو روح ہے اُس کو دیکھتا ہے۔

اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے اُس کے پاس جانا ہے کیونکہ قاضی صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

ایلینز

ممتاز مفتی

یہ ایک انوکھے سفر کی کہانی ہے۔

آپ نے عجیب و غریب سفروں کی کہانیاں سنی ہیں۔ سندباد کے سفر۔ الف لیلوی سفر۔ گلیور کے سفر۔ بالشتیوں میں دیوقامتوں میں۔

لیکن مایم کی ماں کا یہ سفر بالکل انوکھا تھا۔ وہ کبھی عازم سفر نہ ہوئی تھی۔ نہ ہی رخت سفر باندھا تھا۔ نہ ہاتھ میں لگام تھامی تھی نہ پاؤں رکاب پر رکھا تھا۔

نہ وہ کبھی جہاز پہ سوار ہوئی تھی نہ جہاز طوفان سے ٹکرایا تھا نہ وہ بہہ کر کسی انجانے جزیرے کے ساحل پہ جا لگی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیسے — اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک ان جانی بیگانی مخلوق اس کے ارد گرد جھمگٹا لگائے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے وہ عجوبہ مخلوق ہو۔

یہ سفر اس لحاظ سے انوکھا تھا کہ اماں نے خود حرکت نہ کی تھی۔ بلکہ ایک ایلین ماحول خود بخود چل کر اس کے ارد گرد آ کھڑا ہوا تھا۔

وہ سوچنے لگی — الٰہی میں کہاں آ گئی ہوں۔ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔

ان ایلینز میں بہت سے چہرے مانوس سے دکھتے تھے۔ جیسے وہ انھیں جانتی تھی جیسے وہ ان کے ہم سفر رہے تھے لیکن پتہ نہیں کیوں ایک نظر میں وہ مانوس دکھتے دوسری نظر میں ایسے لگتا جیسے بیگانہ ہوں۔ ایلینز۔

پھر اماں کو اپنے آپ پر شک پڑنے لگا — میں کون ہوں — کہاں ہوں۔ میرا مصرف کیا ہے۔ کس لیے ہوں کیوں ہوں۔

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا — وہ سوچتی رہی۔ محسوس کرتی رہی۔ سوچتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ بیمار پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے ٹوٹیاں لگا کر اسے دیکھا۔

ڈاکٹر تو صرف SYMPTOMS دیکھتے ہیں انھیں بیماری سے دلچسپی ہے۔ انسان سے نہیں انھیں ابھی تک شعور نہیں ہوا کہ بیماری روح سے پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر بھلا کیا کہتا، بولا مریضہ کو کوئی بیماری نہیں، صرف کمزوری ہے بڑھاپا ہے۔

جس کا فکر جسم تک محدود ہو وہ کیسے سمجھے گا کہ بڑھاپا عمر سے نہیں ہوتا بلکہ جینے کی امنگ نہ رہے تو اعضا بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

اماں میں جینے کی امنگ نہ رہی تھی۔

جینے کی امنگ بھی قائم رہتی ہے جب کوئی خواہش کوئی خیال کوئی امید کوئی فرد کوئی مطمح نظر کوئی سراب آپ کو انگلی پکڑ کر چلائے۔ جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب آپ کی اپنی حیثیت ہو۔ اہمیت ہو۔ آپ کو احساس ہو کہ آپ کا کوئی مصرف ہے۔

کئی ایک سال سے اماں محسوس کر رہی تھی کہ اس کا کوئی مصرف نہیں رہا۔ وہ ایک فالتو ہستی ہے۔

رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ میں جنبش ہوئی۔ ہڈیوں کے ایک ڈھانچے نے سر نکالا۔ بے نور آنکھوں نے صائم کی طرف دیکھا۔ نگاہیں صائم سے پار ہو گئیں۔ اگر آسیہ کے لئے صائم میں کوئی مفہوم ہوتا تو یقیناً نگاہ صائم پر رک جاتی ـــــــ آنکھوں میں لگاؤ کی چمک لہراتی لیکن صائم تو عرصہ دراز سے اس کے لئے اجنبی بن چکا تھا۔

صائم آسیہ کا اکلوتا بیٹا تھا جو اس وقت ماں کی چارپائی کی پائنتی پہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت کمرے میں ماں اور بیٹے کے سوا کوئی نہ تھا۔

آٹھ دن سے وہ اس کی پائنتی پر بیٹھا تھا۔ آٹھ دن سے آسیہ مر رہی تھی۔

دفعتاً اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں تڑپ پیدا ہوئی۔ آسیہ کی مضطرب لیکن کراکری آواز گونجی۔ اب کیا دیر ہے۔ اب کس کا انتظار ہے۔ تم مجھے لے جاتے کیوں نہیں۔ اس نے اردگرد کی فضا کو مخاطب کر کے کہا۔ آسیہ کے بات کرنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں صائم کے علاوہ اور لوگ بھی موجود تھے۔

شاید روح ہو ہیولے ہوں، فرشتے ہوں۔

آٹھ دن سے وہ آسیہ کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ آٹھ دن سے وہ انھیں ڈانٹ رہی تھی۔

میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ مجھے لے جاتے کیوں نہیں۔ اب کیا دیر ہے۔

اس نے گھر کے باقی لوگوں سے بات کرنی چھوڑ رکھی تھی۔

گھر میں صرف چند ایک لوگ ہی تو تھے۔ صائم اس کی دو نوجوان بیٹیاں سلما ستارہ ایک بیٹا سمیع بہو اسما اور صائم کی بیوی ممینہ عرصۂ دراز سے آسیہ ان سب افراد کی زندگیوں سے خارج ہو چکی تھی۔

اگرچہ ان سب کے دلوں میں بوڑھی اماں کی بڑی عزت تھی۔ لیکن عزت تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عزت تو کوئی جذبہ نہیں عزت تو تہذیب کی ایک مصنوع ہے جس طرح پلاسٹک کے پھول ہوتے ہیں۔ اماں وہ شہد کی مکھی تھی جس کے اردگرد پلاسٹک کے پھولوں کا باغ سجا ہوا تھا۔

صرف ایک گھرانے کو اماں سے قلبی تعلق تھا۔ وہ ڈاکٹر صولت کا گھر تھا۔ ڈاکٹر صولت اماں کے بھائی کا بیٹا تھا اس کا گھر ایک جزیرہ تھا جہاں جدید کی آندھی اثر انداز نہ ہوئی تھی۔ جہاں ماضی ابھی تک حال کا بہروپ دھارے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر صولت کا گھر واحد گھر تھا جہاں اماں کے لئے ایلینز نہیں بستے تھے۔ جہاں وقت کو دوام مل گیا تھا جہاں ابھی تک ۱۹۱۰ سنہ عیسوی رائج تھی۔ جہاں بڑی اماں کو محسوس ہوتا کہ وہ اصلی پھولوں پر بیٹھی ہے۔

لیکن صائم کے لیے ڈاکٹر صولت کا گھر ایک ODD مقام تھا اسے صولت سے شکایت تھی کہ اس نے گھر کو حنوط کر رکھا ہے۔ اور اس حنوط شدہ گھر نے آسیہ کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ کہیں اور رہ سکے صولت کی نسبت صائم کا تعلق آسیہ سے کہیں زیادہ پرانا اور گہرا تھا۔

آسیہ اور صائم نے سالہا سال اکھٹے مل کر دکھ سہے تھے۔ اکھٹے مل کر دکھ سہنا گہرا تعلق پیدا کر دیتا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گرد وپیش ایلین نہ تھا۔ جب آسیہ اپنے دور میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ جب لوگ اس کی بات سمجھتے تھے۔ اسے اہمیت دیتے تھے۔ جب زندگی میں اس کا ایک مقام تھا مفہوم تھا۔

ان کے دکھوں کی وجہ صرف حالات کی ناسازگاری تھی۔ اس ناسازگاری کی بنیاد ایک عام سا حادثہ تھا کہ خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی اور آسیہ کو ہمیشہ کے لئے گھر کی نوکرانی کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

جس باورچی خانے میں اسے دن رات کام کرنا پڑتا تھا۔ وہاں سے اسے اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے طعام نہیں ملتا تھا۔ اس لئے مالک اور مالکن کو کھانا کھلانے کے بعد اسے اپنا چولہا جھونکنا پڑتا۔

مالک کے باورچی خانے کا ایک فایدہ ضرور تھا کہ جب وہاں ہنڈیا پکتی تو آسیہ ہنڈیوں سے اتاری ہوئی ٹوپیاں لے آتی اور ان سے اپنی ہانڈی پکاتی جب وہاں کریلے پکتے تو کریلوں سے چھیلا ہوا بور پکانے کو مل جاتا۔ نوکرانی کے بیٹے کے لئے بور کریلے تھا۔ ٹوپیاں بھنڈیاں تھیں۔ چھلکے سبزیاں تھیں۔

نوکرانی کے بیٹے نے بچپن میں رات کے وقت کبھی کھانا نہ کھایا تھا۔ اس لئے کہ مالک رات گئے گھر آتا تھا اور نوکرانی کو انہیں کھانا کھلانے سے پہلے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ کھانا کھلا کر جب وہ آوٹ ہاؤس میں پہنچتی تو بیٹا سو چکا ہوتا۔ پھر وہ چولہا جھونکتی۔ چھلکے پکاتی اور جب ہانڈی تیار ہو جاتی تو بیٹے کو جگاتی۔ اسے کھانا کھلاتی۔

بیٹا کھا تو لیتا تھا۔ مگر جاگتا نہ تھا۔ اس لئے اسے یاد نہیں تھا کہ بچپن میں اس نے کبھی رات کا کھانا کھایا ہو۔

پھر مالک کا سٹیٹس اونچا ہو جانے پر ایک ٹرینڈ باوردی نوکر رکھنا لازم ہو گیا۔ اس لیے آسیہ کو نکال دیا گیا۔ اور ماں بیٹا آزاد ہو گئے۔

آزادی نے انہیں نئے مسائل سے دو چار کر دیا الاؤنس بہت قلیل تھا ضروریات بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

بڑھتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ماں بیٹے کو محنت مزدوری کرنی پڑی انہوں نے مل کر چارپائیاں بنیں۔ کتابوں پر جلدیں باندھیں۔ کاغذ کے پھول بنائے۔ پتنگ بنائے۔ دھاگا خرید کر اس پر مانجھا لگایا تا کہ ڈور پیچ سکیں۔ بچوں کے کھلونے بنائے آسیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا محنت مزدوری کرے۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک سلائی مشین خریدے اور اکیلی سلائی کا کام کرے لیکن اتنے پیسے نہ تھے۔ پھر کسی مخیر نے قرض کے طور پر ایک پرانی گھسی پٹی مشین خرید دی اور وہ کپڑے سینے لگی۔

آسیہ ہر فن مولا عورت تھی۔ وہ ہر کام کر سکتی تھی۔ وہ ہر عام سے عام کام میں بھی انفرادیت کی کلیاں ٹانک دیا کرتی تھی۔ انوکھے کام سوچا کرتی انوکھی چیزیں بنایا کرتی۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب ہاتھ کے کام کی قدر نہ تھی قیمت نہ تھی۔

ان کا باہمی تعلق بہت گہرا تھا۔ اس تعلق کے کئی رخ تھے۔ ماں بیٹے کا تعلق مظلومیت کا تعلق۔ غربت کا تعلق۔ مزدوری کا تعلق دکھ کا تعلق۔

اگر صائم علم حاصل نہ کرتا۔ اور وہ دونوں ہمیشہ کے لئے مزدور رہتے۔ محنت اور مشقت بھری زندگی بسر کرتے تو یہ تعلق جوں کا توں قائم رہتا۔ لیکن علم قینچی بن کر آیا اور اس نے اس عظیم تعلق کے پرزے اڑا دیئے۔

شاید علم دوست اس پر احتجاج کریں اور اپنی جواز پسندی کے تحت تاویل پیش کریں کہ جو خلوص بھرے تعلق کے پرزے اڑا دے وہ علم نہیں ہو سکتا۔ مجھے کسی حتمی علم کا پتہ نہیں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جو رائج الوقت ہو وہی علم ہوتا ہے۔ ہر دور میں رائج الوقت علم کا خصوصی رخ ہوتا ہے۔

آسیہ کے دور میں۔ ایمان لانا تھا ——— صائم کے دور میں شک کرنا۔ تاریخ شاہد ہے کہ علم کا رخ ہمیشہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہا ہے صائم کے زمانے میں عقل و خرد کا دور تھا۔ جوں جوں وہ علم حاصل کرتا گیا جوں جوں عقل و خرد کی آنکھیں کھلتی گئیں توں توں جذبہ مضحکہ خیز ہوتا گیا۔ تعلقات کٹتے گئے۔

صائم کو آسیہ کے خلاف کئی ایک شکایات پیدا ہو گئیں۔ اماں ایسے مرد سے شادی کرنے پر کیوں رضامند ہوئی جو کسی ایک عورت کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا بلکہ جسے عورت ذات سے دلچسپی تھی۔ اماں نے اپنے ہی گھر میں نوکرانی بن کر رہنے کو کیوں منظور کیا ——— اماں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کیوں نہ کی۔ اماں نے اندھی وفا شعاری کو کیوں اپنائے رکھا شاید اماں غم خور ہو شاید اماں ایذا پسند ہو۔

آہستہ آہستہ صائم کی نگاہ میں مظلوم اماں تسکین پسند آسیہ نظر آنے لگی وہی اماں ایذا پسندی کی لذت سے سرشار دکھائی دینے لگی۔ یوں باہمی مظلومیت کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ دکھ کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ مزدوری کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ ایذا پسند کے لئے محنت جدوجہد نہیں ہوتی۔ دکھ دکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ انا کی تسکین ہوتی ہے۔ بطخ کے پیے جو ہر ہوتا ہے۔

اس عقل و دانش بھری سوچ بچار کی توجہ سے ایک ایسا دن آیا جب دونوں کے درمیان صرف ایک تعلق باقی رہ گیا۔ بیٹے اور ماں کا تعلق۔ لیکن بیٹے اور ماں کا تعلق تو ایک عارضی تعلق ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک بیٹا ماں کا محتاج ہوتا ہے وہ تو ماں کا بیٹے سے تعلق ہے جو واحد دائمی تعلق ہے۔

چونکہ صائم ماں کا محتاج نہیں رہا تھا اس لئے وہ تعلق بھی ٹوٹ چکا تھا۔ صرف برائے نام باقی تھا اس برائے نام تعلق کو ہم رسمی طور پر احترام بھی کہتے ہیں۔

احتراماً صائم آٹھ روز سے اماں کی پائنتی پہ بیٹھا تھا۔ اور آٹھ روز سے اماں مسلسل مر رہی تھی۔

دیر تک وہ رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ کوئی جنبش نہ ہوئی۔

دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال اُبھرا شاید اس نے پھر سے غور سے اماں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ڈر نہیں بلکہ امید کی جھلک تھی۔ جیسے اس شاید ——— نے آنکھوں میں دیا روشن کر دیا ہو۔

چونکہ اماں نے منہ رضائی میں ڈھانپ رکھا تھا۔ صائم نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ ماں کا دل کہاں ہوگا۔ پھر وہ اس مقام کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا کہ حرکت ہے یا نہیں۔

وہ مقام بالکل ساکت تھا۔

اس کے دل سے ایک ہلکی سی آواز آئی جیسے کسی نے اطمینان کا لمبا سانس لیا ہو۔

پھر ایک سرگوشی سی اٹھی۔ اچھا ہوا بیچاری اس عذاب سے خلاصی پا گئی۔

اس کے اندر رچی بسی ہوئی عقل بول رہی تھی۔

پتہ نہیں کبھی کبھی وہ سرگوشیوں میں کیوں بولتی تھی۔ ایسے کیوں بولتی تھی جیسے وہ احساس گناہ سے بھیگی ہو۔

اس کے اندر رچی بسی عقل تو گھر کی ملکہ تھی۔ عرصہ دراز سے گھر پہ اسی کا راج تھا پھر وہ سرگوشیوں میں بات کیوں کرتی تھی۔ اس سے ڈرتی تھی۔ صائم کے دل میں وہ کون تھا جس کے ڈر سے سہم جاتی۔ شرمسار ہو جاتی۔ ندامت سے بھیگ جاتی اس کی آواز زیرلبی ہو کر رہ جاتی۔

صائم کو تو اپنی عقل پہ ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو دانشور سمجھتا تھا۔ محفلوں میں جان بوجھ کر بلند آواز میں ایسے ادراکی نقطے بیان کرنے کا عادی تھا جو دوسروں کو چونکا دیں۔

محفلوں کی بات چھوڑیئے۔ اس نے کئی بار اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پہ ماں سے کہہ دیا تھا اماں جب مر گئی تو میں دیگیں چڑھا دوں گا۔ غریبوں کو کھانا بانٹوں گا۔ شکرانے کے نفل پڑھوں گا کہ یا اللہ تیرا بڑا احسان ہے کہ تو نے میری ماں کو اتنی لمبی عمر دی اور مجھے ماں کے ساتھ اتنی دیر اکٹھے رہنے کا موقعہ عطا کیا۔ اور اماں میں گھر والوں سے کہہ دوں گا کہ میری ماں کے مرنے پہ کوئی نہ روئے۔ کوئی بین نہ کرے۔ رونا اور بین کرنا تو ناشکری کے مترادف ہے۔

آسیہ کی عمر ۹۰ سال کی تھی۔ صائم سمجھتا تھا کہ ساٹھ ستر سال کے بعد موت زحمت بن جاتی ہے۔

صائم خود ستر سال کا ہو چکا تھا خود اس کے اپنے اردگرد ایلین ماحول قائم ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی بیٹیاں سلما اور ستارہ کے خیالات اور احساسات سے بیگانہ تھیں بالکل ایسے ہی جیسے وہ خود ماضی میں اماں سے بیگانہ ہوا تھا۔

اماں سے ایلین بننے کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ اماں جدید تعلیم سے آراستہ نہیں تھی۔

لیکن سلما ستارا کے ایلین بننے کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صائم کا ماں سے تعلق تو علم نے کاٹا تھا۔ لیکن اولاد سے بڑی ذمہ داری کس پر تھی۔

اس ڈر کے مارے کہ اس کے اپنے بچے اس سے کٹ نہ جائیں وہ مسلسل علم حاصل کرتا رہا تھا۔ رائج الوقت علم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تھا تاکہ پیچھے نہ رہ جائے ——— پھر بھی وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ کیوں؟

اس مسئلہ پہ وہ سوچتا رہا تھا سوچتا رہا تھا ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بے علمی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ دانش کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ نئے فکر سے ناواقفیت کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ صائم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ شاید وہ علم ہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو۔

شاید نئی نسل علم و دانش چھوڑ کر پھر سے جذبے کی طرف چل پڑی تھی یہ سوچے بغیر کہ جذبہ تو راستہ ہوتا ہے منزل نہیں۔

منزل کیسی — ان کے جذبے کا تو کوئی رخ ہی نہ تھا۔ صرف شدت ہی شدت تھی، ہانڈی آگ پر چڑھی تھی مگر ہانڈی میں کیا پک رہا ہے سوچ سوچ کر وہ ہار گیا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تھا۔

مثلاً سلما کو فلم اس لئے پسند آتی کہ اس میں کوئی خاص اداکار ہوتا۔ اگر وہ اداکار ہوتا تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جاتا۔ فلم کی کہانی عمدہ ہو جاتی۔ فوٹوگرافی شاندار ہو جاتی۔ مکالمے چست ہو جاتے۔

ستارہ کوئی ٹی وی سیریز اس لئے ناپسند ہوتی کہ اس میں کام کرنے والی کسی ایکسٹرا عورت کی شکل و صورت ایسی ہوتی کہ دیکھ کر اسے گھن آتی۔

سلما سمجھتی کہ کالج کی فلاں پروفیسر اس قدر عمدہ پڑھاتی ہے کہ ایک ایک لفظ دل نشین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بڑی پیاری ہے کتنی پیاری ہے وہ۔ سلما یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ کوئی بدشکل پروفیسر اچھا پڑھا سکتی ہے۔

ستارہ سمجھتی تھی کہ فلاں مضمون اس لئے اچھا ہے کہ فیشن ایبل سرکلز میں اس کا ذکر رہتا ہے اور فلاں مضمون اس لئے برا ہے کہ اس میں دقیانوسی سوچیں بھری پڑی ہیں۔

اتفاقاً صائم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں سلما کھڑی تھی۔ بال لٹک رہے تھے چہرا ستا ہوا تھا۔ سر دروازے کی چوکھٹ سے لگا ہوا تھا۔ ٹکٹکی باندھے وہ آسیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سلما حزن و ملال کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

گھر کے سارے افراد حزن و ملال سے بھرے ہوئے تھے۔ سارا ماحول حزن و ملال سے بوجھل ہو رہا تھا۔

اس لئے نہیں کہ ماں یا دادی اماں مر رہی تھی۔

بلکہ اس لئے کہ گھر میں موت گھس آئی تھی چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ سارا گھر موت سے یوں لبالب بھرا ہوا تھا جیسے انار دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان جانے میں گھر کا ہر فرد آرزومند تھا کہ وہ بوجھ اٹھ جائے۔ بوجھل بوردم دور ہو جائے۔ گھر کا موڈ بحال ہو جائے۔ چاہے بوڑھی اماں پہ کچھ بیت جائے۔

سلما نے اشارے سے پوچھا کہ بڑی اماں کا کیا حال ہے۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

سلما کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ سر ڈھلک گیا بال لٹکنے لگے اور ساتھ ہی آنکھوں میں امید کی کرن ناچنے لگی۔

سلما ایک جذباتی لڑکی تھی۔ اسے آسیہ سے بڑی محبت تھی لیکن کیا کرتی، اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ اس کی چہیتی

سہیلی ثنائی کے بیاہ کو صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اس نے ثنائی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کے بیاہ پر ملتان آئے گی۔ وہ جانتی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن اس کے ملتان جانے میں رخنہ نہ پڑے اور اگر اماں یونہی پڑی رہیں تو وہ ملتان نہ جاسکے گی۔

پہلے ہی اماں کی بیماری کی وجہ سے سلمیٰ کی ساری روٹین تباہ ہو چکی تھی۔

مثلاً فون ہی لیجئے۔

فون اس برآمدے میں fix کیا ہوا تھا جو اماں کے کمرے سے ملحق تھا۔ اماں کی وجہ سے سلمیٰ فون کو آزادانہ طور پر استعمال نہیں کرسکتی تھی۔

پہلے تو عادی طور پر وہ ہر آنے والی کال کو بڑے شوق سے موصول کیا کرتی تھی۔

ان کالوں میں زیادہ تر رونگ نمبر ہوتے تھے وہ ان رونگ نمبروں کو بڑے نخرے سے جھاڑ پلا دیا کرتی۔ یا بڑے تہذیب یافتہ انداز سے رونگ نمبر کا مذاق اڑا دیتی۔

خاص سہیلیوں کے علاوہ سلمیٰ کو کسی خاص رائٹ یا رونگ نمبر سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن رونگ نمبر کو کاٹنے میں کتنا مزا آتا تھا واٹ فن —— اظہار لگاؤ کے جواب میں اظہار بے نیازی میں کتنی لذت ہوتی ہے۔

اماں کی بیماری کی وجہ سے وہ سہیلیوں سے بھی بات نہیں کرسکتی تھی۔ پہلے تو وہ فون پر گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کیا باتیں کرتی تھی۔ پاس کھڑے شخص کے بھی کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔

فون پر وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد ایک ایک لفظ بولتی رہتی۔ اچھا۔ کیوں۔ بور۔ موڈ نہیں۔ وہ کیسے ایسے الفاظ یا پھر خالی ہنس دیتی۔ چھوٹی ہنسی لمبی ہنسی۔ مہذب ہنسی جس میں ہنسی نہ ہوتی البتہ آواز کے زیروبم میں جاذبیت ضرور ہوتی ہے۔

سلمیٰ کے لئے اماں کی صحت یا بیماری اہم نہ تھے۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اس کی روزمرہ بحال ہو جائے۔

ستارہ کو بھی اماں سے بڑا لگاؤ تھا لیکن وہ بھی مجبور تھی۔

ستارہ نے اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار ہر امتحان میں کلاس میں فرسٹ آنے پر رکھا ہوا تھا۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے سارے گھر پر بوجھ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس کی پڑھائی میں مخل ہو رہا تھا۔ اسے فکر لگ گیا تھا کہیں رابعہ اس کی پوزیشن ہتھیا نہ لے۔

رابعہ وہ بدصورت بھدی لڑکی تھی جو رٹا لگا لگا کر ہر امتحان میں اس کے پیچھے پیچھے چڑیل کی طرح لگی ہوئی تھی اور ہر بار سیکنڈ آتی تھی کہیں وہ چڑیل میری جگہ نہ لے لے۔ ستارہ کو صرف یہی ایک فکر لگا رہتا تھا۔ ہے اللہ۔ اماں کی بیماری کیا مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے کب جان چھٹے گی اسے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اماں ڈاکٹر کا علاج کیوں نہیں کراتی۔

ستارہ کی بات سچی تھی۔ عرصہ دراز سے اماں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ علاج نہیں کرائے گی۔ اسے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں تھا۔

اب کیا حال ہے۔ صالح کی بیوی سکینہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

صالح نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

سمینہ چارپائی پر بیٹھ گئی وہ حزن و ملال سے نچڑ رہی تھی۔
سمینہ اور آسیہ کے مابین خدا ترسی کے سوا کوئی تعلق نہ تھا۔ سمینہ ایک مذہبی عورت تھی مذہب اس کے لئے صرف خوفِ خدا تھا۔ وہ بیچاری خود اس گھر میں اکیلی تھی۔ وہ خود الیز میں گھری ہوئی تھی۔ وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔
اگرچہ آسیہ اور سمینہ میں ساس بہو کا رشتہ تھا لیکن وہ رشتہ ہمیشہ برائے نام رہا تھا۔ سارا قصور آسیہ کا تھا۔ اگر وہ حکم چلانا جانتی تو ساس کا مرتبہ حاصل کر لیتی۔ لیکن وہ تو ازل سے حکم بجالانا جانتی تھی۔ چوکی پر بیٹھ کر حکم چلانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے بیٹے کے گھر میں اس کی کوئی حیثیت قائم نہ ہو سکی تھی۔ کیسے ہوتی خود بیٹے نے اسے قائم نہ ہونے دیا تھا۔ جب بھی اماں دل کی بات کرتی تو صائم عقل و دانش کی قینچی سے اسے کاٹ دیتا اماں تم نہیں سمجھتی ——
بیٹے کے گھر سے ماں کا صرف ایک تعلق تھا۔
آسیہ میں خدمت اور کام کا جذبہ اس قدر گھر کر چکا تھا کہ جس گھر میں بھی وہ جا کر ٹھہرتی اس گھر کے چھوٹے چھوٹے کام شروع کر دیتی۔ ٹوٹی ہوئی چیزیں جوڑ دیتی۔ صوفوں کے کپڑے دھو کر پھر سے چڑھا دیتی۔ پردے رنگ کر نئے بنا دیتی۔ ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس مرمت کر دیتی۔ پرانے کپڑوں کو جوڑ کر تی کوزیاں بناتی رضائی کے ابرے تیار کرتی۔ میز پوش تکیے کے غلاف اور کیا کیا۔
آسیہ کی اس عادت کی وجہ سے لوگ اس کی قدر کرتے تھے۔
بیٹے کے گھر سے ماں کا بس یہی ایک تعلق تھا اسی واسطے سمینہ اسے عزیز رکھتی تھی۔
کسی نے کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ تعلق تو نہیں یہ تو مفاد ہے۔ بہرطور سمینہ کا حزن ملال دلی تھا۔ کیونکہ وہ خدا ترس عورت تھی۔
کیوں ابا۔ سمیع نے داخل ہو کر پوچھا کیا حال ہے اماں کا۔
ویسا ہی ہے صائم نے کہا۔
اوہ —— سمیع خاموش ہو گیا!
کچھ دیر کمرے پر خاموشی طاری رہی۔
اماں کو ضرور دوا کھانی چاہیے سمیع بولا۔
ہاں —— صائم نے کہا۔ لیکن اماں ملنے بھی۔
ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اماں کے لیے کچھ نہیں کر رہے سمیع نے کہا۔
ہاں۔
ایک فیلنگ آف گلٹ ہے۔ سمیع گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔
سمیع ازلی طور پر مشنری کارکن تھا، اس کے لئے دفتر دفتر نہ تھا بلکہ مقصدِ حیات تھا۔ کام اس کی زندگی کا مرکز تھا۔ اور یہ مرکز پھیل کر سارے دائرے پر محیط ہو چکا تھا۔ باقی تمام رشتے اور تعلق لگاؤ سمٹ سمٹا کر دائرے کی لکیر پر یوں کھڑے تھے جیسے اوور لوڈڈ بس میں مسافر پائیدان پر لٹکے ہوتے ہیں۔

اوہ سمیع چونکا مجھے تو جانا ہے دفتر میں فنکشن شروع ہو چکا ہوگا۔ ابو میں واپسی پر ڈاکٹر لے آؤں اس نے یوں کہا جیسے صرف ڈاکٹر کے آنے سے اماں سے تعلق استوار ہو جائے گا بسنس آف گلٹ دور ہو جائے گا۔

اماں سے پوچھ لو صائم نے کہا۔

اماں۔ اماں جی سمیع نے آواز دی۔

اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر سمیع گھوم کر اماں کے سرہانے کی طرف جا کھڑا ہوا۔ اس نے اماں کے منہ سے رضائی اتار دی۔

اوہ ـــ وہ زیر لب چلایا۔ اماں تو۔ اماں تو ـــ

کیا کہا ـــ کئی ایک چیخیں گونجیں۔

اماں گزر گئیں کیا۔

ہائے اللہ ـــ اماں چلی گئیں۔

پڑوس والے کہتے ہیں کہ صائم کے گھر سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں۔ نہیں چیخیں نہیں وہ تو بگڑے ہوئے قہقہوں کی آوازیں تھیں۔

میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں جیسے صائم کی ماں مری نہیں بلکہ صائم کے گھر سے منتقل ہو کر میری ماں بن کر میرے گھر آ بیٹھی ہے۔ جیسے یہ کہانی صائم کی ماں کی نہیں بلکہ میری ماں کی ہے شاید تمہاری ماں کی ہو۔ ہم سب کی ماؤں کی ہو۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہ گھر گھر بیٹھی ہے اور اس کے ارد گرد ایلینز یوں ناچ رہے ہیں جیسے وحشی قربانی کرنے سے پہلے بلی کے ارد گرد ناچتے ہیں۔

اسٹل لائف

جیلانی بانو

آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے۔ اکیلے گھر میں کیا کریں گے؟
جاتے جاتے صادق کی بیوی آمنہ نے کہا۔

اکیلا — صادق نے سنسان گھر کو دیکھ کر سوچا۔ آمنہ اور بچے نہ ہوں تو گھر خالی ہو جاتا ہے! خود اس کا وجود جیسے بے معنی ہو۔ اس گھر میں کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا ہو۔ مگر یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ آمنہ کے ساتھ نہ گیا۔ اس کے باوجود صادق کو ایسا محسوس ہو جیسے اس کا کچھ حصہ آمنہ اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گئی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ "زو" کے بندروں کو اچھلتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ اور پھر اتنے بڑے گھر میں تنہا بیٹھا اخبار بھی پڑھ رہا ہے۔ جانے کیوں یہ احساس اب اس کے ساتھ رہنے لگا تھا وہ ٹکڑوں میں بکھر رہا ہے۔ جیسے پرانی دیواروں کا چونا غیر محسوس طور پر چپکے چپکے جھڑتا رہتا ہے۔ وہ بھی بکھر رہا ہے۔ ٹوٹ رہا ہے۔

صبح شیو کرتے میں کئی بار یوں لگتا جیسے وہ آفس پہنچ گیا ہے۔ سرد مہر سخت لوہے کی کرسی پر بیٹھا شرما صاحب کے برداشت کر رہا ہے۔ مگر آمنہ کی آواز پر چونک پڑتا۔

"پونے دس ہو گئے۔ کہیں آج پھر آپ لیٹ نہ ہو جائیں۔"

وہ جلدی سے بشرٹ ہینگر سے اتارتا جیسے بشرٹ کے بغیر وہ پورا نہ ہوگا۔ اسی طرح جلدی جلدی اپنے آپ کو کپڑوں میں چھپا کر وہ مکمل انسان بن جاتا۔ آفس بھی پہنچ جاتا۔ مگر رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا جیسے وہ ابھی تک گھر میں بیٹھا آمنہ کی ٹر ٹر سنے جا رہا ہے۔ اپنے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا احساس اب صادق کے لئے اذیت ناک بنتا جا رہا تھا۔

آمنہ اور بچوں کے جاتے ہی اسے احساس ہوا کہ انھیں روک لیتا۔ آپا جان پکنک منانے جا رہی ہیں تو جانے دو۔ دو بھائی نے کار کیا خریدی ہے کہ اتراتے اترائے پھرتے ہیں۔ اور آمنہ تو جیسے قید میں رہتی ہے۔ اسے تو گھر سے باہر گھومنے کا بہانہ چاہیے۔

جانے سے پہلے آمنہ نے کئی بار پوچھا۔
"میں بھی آپا جان کے ساتھ "زو" چلی جاؤں؟"
اور ہر بار صادق نے کہنا چاہا — نہیں نہیں مت جاؤ۔
"چلی جاؤ۔ بچوں کی تفریح ہو جائے گی۔" اپنی آواز پر صادق خود ہی چونک پڑا۔ یہ کون بول رہا تھا —؟ یہ بات آم

سے کوئی دوسرا آدمی کہہ رہا تھا جو اس کے وجود کی پرچھائیں بن کر اس سے دور ہٹ رہا تھا۔ اسے الگ الگ حصوں میں بانٹ رہا تھا۔

پھر اس نے سوچا۔ آمنہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں اکیلا ہو گیا ہوں۔ اکیلا ہو کر کیا کروں گا! میرا کچھ حصّہ آمنہ سمیٹ کر لے گئی ہے۔ اور بہت سا ڈھیر شرما صاحب نے فائلوں میں سمیٹ لیا ہے۔

"یہ ساری فائلیں کل پُٹ اپ کرنا ہیں۔ یاد رکھیے۔"

ان فائلوں کو وہ بھلا بھول سکتا ہے! جو فائلیں آفس میں ڈوری سے بندھی رکھی ہیں ان میں وہ خود بھی بندھا پڑا ہے۔ آفس کی لائیٹ بند ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ دروازے پہ قفل لگا ہوا ہے۔ اتنا ظلم! صادق کی سانس گھٹنے لگی — وہ بند دروازے پہ اپنا سر مارنے لگا تو اب سر میں درد شروع ہوا۔

"ڈیڈی — مور کیسے بولتا ہے! میاؤں۔" پپو جانے کس آدمی کو اپنا ڈیڈی مان کر اس سے کہہ رہا تھا۔ بیٹے پپو غصے میں ہو۔

ڈیڈی کیوں نہیں آتے ذرا دیکھئے۔ اب میں مور کی آواز اسی ڈیڈی کو سناؤں گا جو سامنے کھڑا ہے۔ اور آمنہ یہ واقعہ ہنس ہنس کر سنائے گی۔

"جو سفید بشرٹ والا نظر آیا پپو اسے ڈیڈی ڈیڈی پکار رہا تھا۔"

ہاں پپو بھی مجھے صرف سفید بشرٹ کی وجہ سے پہچانے گا۔ اس نے بہت دکھی ہو کر سوچا۔ ممکن ہے اب وہ سب آتے ہوں۔

صادق نے کھڑکی کھولی —— تو وہ آ گئے — وہی کار —— دولہا بھائی کی بھڑکیلی بشرٹ۔ آمنہ کی شنون ساڑی — مگر نہیں وہ ہوتے تو صادق کی سفید بشرٹ کو بھی پہچان لیتے۔

سڑک کی بھیڑ بھاڑ — کاروں کے ہارن — بسوں کی قطاریں — پٹرول کی بُو میں بسی ہوئی وہ لڑکی جس کے چہرے پر آنکھوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ان کھوجتی، ڈھونڈتی ہوئی آنکھوں کو صادق روز اپنی بس میں دیکھتا ہے کسی کے انتظار میں، بے چین، بیقرار آنکھیں۔ کسی کو نہ پا کر مایوس تھکی ہوئی آنکھیں۔ بس میں آنے والے ہر آدمی کو اٹھ کر وہ بیقراری سے دیکھتی ہے اور پھر مایوسی سے بیٹھ جاتی ہے۔ چاروں اور پھیلی ہوئی الجھی ہوئی، گم ہوتی ہوئی سڑکوں کو دور دور تک دیکھے جاتی ہے — وہ کہاں ہے —؟ کون ہے جس کی تلاش اس لڑکی کی سدھ بدھ کھوئے ہوئے ہے۔ آفس پہنچنے کے بعد بھی صادق یہی سوچے جاتا۔ کسی دن وہ آدمی اس لڑکی کے پاس آ بیٹھے تو مجھے کتنا سکون ملے —

ایک دن لڑکی کے برابر والی سیٹ پر وہ عورت آ بیٹھی جو بس میں سوار ہوتے ہی دوسروں کے شخصی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دیتی ہے۔

"کوئی اور آنے والا ہے —؟" اس نے بڑی تجسس بھری نظر لڑکی پر ڈالی تھی۔

لڑکی پہ جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر نیچے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

"کوئی نہیں — یہ میری عادت ہے۔"

صادق چونک پڑا۔ اسے لڑکی پر رحم آنے لگا۔ بچاری۔ اس لڑکی کا بھی کوئی حصّہ کسی سڑک پر رہ گیا ہے۔ میری طرح — اکیلے گھر میں اب سچ مچ جی گھبرانے لگا۔

خواہ مخواہ اماں پرسوں میں چلی گئیں۔ گھر کیا سونا ہو گیا۔ جاتے وقت اماں کتنا گھبرا رہی تھیں۔ جیسے دو ہفتے کے لئے نہیں ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔

کہیں جاؤں تو دل گھر ہی میں لگا رہتا ہے۔ اماں کی بات پر صادق چونک پڑا اماں بھی شاید ٹوٹ رہی ہیں۔

ٹرین میں بیٹھنے کے بعد اماں نے کھڑکی سے باہر کھڑے ہوئے صادق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ پھر انجن نے وسل دی، اماں کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ اماں کے ہاتھ سے پھسلتا گیا — جیسے برف کا ٹکڑا آپ ہی آپ پانی بن بن کر جانے کب غائب ہو جاتا ہے — اس کا اور اماں کا ہاتھ بھی الگ ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد صادق نے محسوس کیا کہ وہ بھی اماں کے ساتھ چلا گیا ہے۔ اماں کے پاس ٹرین میں بیٹھا ہے اور ٹرین کھیتوں، جنگلوں ندیوں اور پہاڑوں کو کاٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے — اپنی جیب سے پلیٹ فارم ٹکٹ نکالتے وقت صادق کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسٹیشن پر ہے یا ٹرین میں آفس میں بیٹھا افسر صاحب کے طنز بھی برداشت کر رہا تھا اور اس لڑکی کے سامنے بس میں بھی بیٹھا تھا، جو اپنے وجود کے بچھڑے ہوئے حصّے کی تلاش میں ہے۔

جب آدمی اتنے ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہو، بیک وقت اتنی جگہ موجود ہو تو بھلا وہ کسی ایک کا ہو سکتا ہے — ؟ مگر آمنہ کا اصرار تھا کہ صادق صرف اسی کا ہو رہے۔ میری باتیں سنو — میری صورت دیکھو — مجھے پیار کرو — وہ آمنہ کے سارے احکام بجا لاتا — کیونکہ وہ تسلیم کر چکا تھا کہ اسے بہت سی عدالتوں کے فیصلے قبول کرنے ہیں انہوں نے پیار بھرے حکم — خدا کے پُر جلال احکام اور سماج کے طنز بھرے فیصلے — (یہ قابلیں کل تک پٹ اپ کرنا ہیں۔ یاد رکھیے)

یہ سب میرے آقا ہیں جنھوں نے الگ الگ زنجیروں میں میرے ٹکڑے باندھ رکھے ہیں۔ اس کے باوجود ایک دن آمنہ بڑے پریشان لہجہ میں اپنی ساس سے کہہ رہی تھی۔ "اماں یہ نہ جانے کیوں اتنے کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہیں۔ کسی ڈاکٹر کو دکھا لاؤں نا۔"

ڈاکٹر — ! صادق کے سامنے اُمید کی لو جھلملانے لگی — ایک بار کسی چوراہے پر کار نے ایک بوڑھے کو کچل دیا تھا۔ اس کے بدن کے تین چار ٹکڑے الگ الگ بے حس و حرکت سڑک پر بکھرے پڑے تھے — جیسے کینوس پر "اسٹل لائف"۔ لوگ اس بھیانک منظر کو دیکھ کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ مگر ایک چھوٹا سا بچہ وہاں کھڑا چلا رہا تھا۔

"دادا کو جلدی سے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ ڈاکٹر دادا کو پھر جوڑ دے گا۔"

"ڈاکٹر مجھے بھی جوڑ دے گا — صادق نے سوچا — شاید وہ اماں سے پوچھے۔ ان کے باقی ٹکڑے کہاں کہاں ہیں — ؟

گھبرا کے صادق نے اخبار اٹھا لیا۔

چاند تک جانے والے خلاباز موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ ان کے راکٹ میں کوئی ٹکنیکل خرابی ہوگئی تھی۔

صادق نے اخبار میز پر رکھا اور آن کی آن میں وہ راکٹ کے اندر تھا۔ ہزاروں کل پرزوں والے اندھیرے خول میں پھنسا ہوا۔ اس کے سر پر مشینوں کا بوجھ تھا۔ اس کے باوجود آج اس کے سر سے سارے بوجھ اتر گئے تھے۔ مجھے چاند کو اپنے پیروں تلے روندنا ہے۔ وہ چاند جو دنیا کے ہر شاعر کو محبوب سے زیادہ حسین نظر آتا تھا۔ وہ چاند جو رام چندر جی کے بچپن میں ناقابلِ حصول تھا۔ صادق کے چاروں اور خلا تھی۔ سرد۔ بے مہر۔ بے حس۔ نیچے۔ بہت نیچے زمین ایک حقیر تارے کی طرح چمک رہی تھی۔ بس اتنی سی دنیا۔؟ اس نے ناک سکوڑ کے بڑی حقارت سے دیکھا۔ اور پھر اسے دنیا کے انتشار پر بے حد خوشی ہوئی۔ حقیر۔ ناقابلِ التفات۔ بالآخر دنیا کے سارے بکھیڑوں سے نجات مل ہی گئی۔ وہ بچ کر یہاں تک آگیا۔ یہ کیسی انوکھی خوشی تھی۔ اپنی ذات کا احساس ساری کائنات پر محیط تھا۔ عرب فلسفیوں نے عجم والوں سے کہا تھا کہ کائنات موہوم نہیں ہے۔ موجود ہے۔ مگر یہ بات غلط تھی۔ آج کائنات موہوم ہے۔ میں جو کائنات کی کشش سے اپنے آپ کو آزاد کر چکا ہوں۔ میں نے خدا، گناہ اور محبت کو بہت نیچے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے تمام حواسوں سمیت آزادی کی لذت چکھنے کے لیے۔

”ہیلو ہیلو“ مائیک کہہ رہا تھا۔

”زمین کی طرف لوٹ آؤ۔ آگے خطرہ ہے“۔ صادق کو جیسے کسی نے شوٹ کر دیا۔ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بے سہارا ہو کر نیچے آ رہا۔

یروشلم فتح ہو گیا۔ اس نے اخبار کی دوسری خبر پڑھی اور اپنی بے بسی کا درد اس کی رگ رگ میں سما گیا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔؟ یروشلم کو کس نے ڈھا دیا۔ دیوارِ گریہ گر پڑی ہے۔ آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ اب ہم کہاں کہاں روتے پھریں گے!

جانے آمنہ اور بچے اس وقت کہاں ہوں گے! جانے میں خود اس وقت کہاں ہوں! کبھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ یہودی ہے اور دیوارِ گریہ کے نیچے کھڑا قہقہے لگا رہا ہے۔ گولان کی پہاڑیوں پر عربوں کے ساتھ چھپتا پھر رہا ہے۔ شرما صاحب بن کر اپنے آپ کو ڈانٹ رہا ہے۔ ہائے میری آزادی۔ آگے خطرہ ہے۔ یروشلم فتح ہو گیا۔ اس کے چاروں طرف بندر اچھل کود میں مصروف ہیں۔ اماں جس ٹرین میں جا رہی تھیں وہ رک گئی ہے۔ آگے خطرہ ہے دکھ کے مارے وہ رو بھی نہیں سکتا۔ دیوارِ گریہ شکست ہو چکی ہے۔ آگے خطرہ ہے۔ اماں اس کا ہاتھ اپنے ساتھ لے گئی ہیں اور بس میں بیٹھی ہوئی لڑکی ہر مسافر کو امید بھری نظروں سے دیکھ کر بوسی کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے۔ یہ بھی وہ نہیں ہے۔

مگر وہ تو آفس کی فائلوں میں بندھا اندھیرے کمرے میں رکھ دیا گیا ہے۔ ان فائلوں کو مت بھولو۔ اس اندھیرے کمرے کو مت بھولو جہاں تم ڈوری سے بندھے پڑے ہو۔

”آپ بھی ساتھ چلئے۔ اکیلے گھر میں کیا کریں گے۔؟

اب کیا کر سکتا ہوں۔!

صادق نے تھک کر سگریٹ سلگا لیا۔ آگے خطرہ ہے۔ یروشلم فتح ہوگیا ہے۔ گولان کی پہاڑیوں پر صرف بارود کا دھواں ہے اور لاشوں کی سڑاند۔ میں بھی کہاں کہاں بھٹکتا پھرا۔ پہاڑوں کے اندر غاروں میں جہاں خدا انسان سے ہم کلام ہوا کرتا تھا۔ مگر آج ان غاروں میں انسان کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا۔ صرف موت کے فرمان تھے۔ اور پھر صادق یروشلم کی عبادت گاہوں میں گھسا۔ بندروں کے پنجروں میں۔ اور ہر جگہ سے لوٹ آیا۔

"اچھا ہوا آپ نہیں گئے۔ سخت بوریت ہوئی" وہ سب چیختے چلاتے واپس آگئے۔

"اخوہ بہت تھک گئے"

"ڈیڈی مور کیسے بولتا ہے بتاؤں! میاؤں" پپو بے انتہا خوش تھا۔

"ڈیڈی شیر نا آدمی کو چھوٹے چھوٹے پیس کرکے کھا لیتا ہے"

"ڈیڈی، میں آپ کے لیے ریڈ گلاب لایا ہوں"

صادق نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پھول پکڑنا چاہا مگر وہ نیچے گر پڑا اور گرتے ہی سرخ سرخ پنکھڑیاں بن کر بکھر گیا۔ انسان کے کٹے ہوئے اعضا کی طرح۔ کینوس پر اسٹل لائف کی طرح ———

"پپو — میرے بیٹے یہ کیا ہوا ——؟ دیکھو — دیکھو یہ کیا ہوا ——؟

صادق نے انتہائی خوف زدہ ہو کر بڑی اُمید بھری نظروں سے پپو کی طرف دیکھا — مگر پپو یہ کیوں نہیں کہتا ——— ڈیڈی کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ ڈاکٹر ڈیڈی کو جوڑ دے گا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے ٹکڑے نہیں جوڑے جائیں گے ——!

مرد

رام لعل

لکھنؤ شہر کو اُس کے شمالی مضافات سے ملانے والی سڑک اب سنسان پڑی رہتی ہے۔ کچھ عرصہ تک اس کی حیثیت ایک بائی پاس کی سی رہی جب شہر کو گومتی کی باڑھ سے بچانے کے لئے ایک نئی سڑک نکالی جا رہی تھی۔ جب سے اس سڑک پر ٹریفک جاری ہو گیا ہے اس سڑک پر آمد و رفت بالکل کم ہو گئی ہے۔ صرف تیزاب کے کارخانے کے ٹھیلے شیشے کی بڑی بڑی بوتلیں لادے آتے جاتے رہتے ہیں یا شاہی عمارت کے کھنڈرات کے نیچے بنی ہوئی ریفیوجی کالونی کے لوگ ہی ادھر سے ہو کر مین روڈ کے موڑ کی طرف بڑھ جاتے ہیں جہاں بسیں، ٹمپو، ملیح آباد اور کاکوری کی طرف جانے والی ٹیکسیاں اور رکشے تانگے وغیرہ کثرت سے ملتے ہیں۔

اُس روز جمعرات کی وجہ سے تیزاب کا کارخانہ بند تھا۔ اُس کے آگے صبح آٹھ بجے ایک جیپ رُکی ہوئی تھی جس کے اندر بیٹھے ہوئے پانچ ادھیڑ آدمی بظاہر تو بڑی بے نیازی سے سگریٹیں پھونک رہے تھے اور ہولے ہولے باتیں بھی کر رہے تھے لیکن ان سب کی نظریں بار بار انہی کھنڈرات کی طرف اُٹھ جاتی تھیں جہاں سے ہو کر ریفیوجی کالونی میں رہنے والا امین آباد کا کوئی دکاندار یا صبح سویرے کسی دفتر میں پہنچنے والا کلرک یا شہر کے کسی حصے میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سامان بیچنے والا پٹڑی دکاندار اس سنسان سڑک پر آتا اور بغیر ادھر اُدھر دیکھے مین روڈ کے اُسی موڑ کی طرف چلا جاتا تھا۔

”وہ سیوا رام جا رہا ہے۔ آج نظیر آباد میں دُکان لگائے گا۔“

”جانے دو، یار!“

”میں اُسے روک تھوڑے ہی رہا ہوں۔“

”تم یہ سوچو، کہیں آج چھٹی تو نہیں ہے اُس کے اسکول کی! کہیں وہ آئے ہی نہیں!“

”نہیں یار، آج کوئی چھٹی وُٹی نہیں ہے۔“

”پھر وہ ابھی تک گھر سے نکلی کیوں نہیں؟“

”وہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے نکلتی ہے۔ میں نے کئی روز تک اُس کا پیچھا کر کے معلوم کر لیا ہے۔ پہلے تو کی بس پکڑ کر کچہری کے اسٹاپ پر اُترتی ہے وہاں سے بس اسٹینڈ کے سامنے سے ہو کر اسکول پہنچ جاتی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اِس کالونی میں کوئی اور ٹیچر نہیں ہے۔ ورنہ ہمارا سارا پلان دھرا رہ جاتا!“

”پھر کوئی دوسرا طریقہ نکال لیا جاتا۔“

”ساڑھے آٹھ تو ہو گئے یار۔ وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں؟“

"آتی ہوگی۔ لیکن تم سب ایک ہی طرف اِس طرح مت دیکھو۔ صرف ایک آدمی کنڈر کی پگڈنڈی پر نگاہ رکھے۔ ملہوترہ تم آگے بیٹھے ہو تم ہی اُدھر دیکھتے رہو۔"

"لا پھر ڈبی اِدھر بڑھا دے۔ سردی اور بے چینی کی وجہ سے آج سگریٹیں بھی زیادہ پینی پڑ رہی ہیں۔"

اس کے بعد کچھ لمحوں تک بالکل سناٹا سا ہوگیا۔

ملہوترا اینٹوں کے بھٹے کا مالک ہے۔ یہ جیپ بھی اُسی کی ہے۔ دوسرا سنت رام بترا ہے جو سرگودھا سوپ فیکٹری کا پارٹنر ہے۔ وہ یونائٹڈ کول کمپنی کے منشی دیا رام کا بہنوئی ہے۔ دیا رام بھی اُسی جیپ میں موجود ہے جو کتنی دیر سے بالکل خاموش ہے۔ چوتھا شخص پریم سنگھ ہے جس کے شہر میں تیس چالیس رکشے چلتے ہیں۔ اور پانچواں پٹڑی دکانداروں کی یونین کا صدر ہے جس کا نام ملک راج بھلہ ہے۔ اُس کی ایک دکان نکسن مارکیٹ میں بھی ہے جہاں امریکہ کے پرانے کوٹ وغیرہ کثرت سے بکتے ہیں۔ وہ سب کے سب ایک ہی کالونی میں رہتے ہیں جو یہاں سے پانچ میل دور ہے۔ شہر کے مغربی سرے پر مغربی پنجاب کے ایک ہی شہر کے رہنے والوں نے یہاں آکر ایک پورا گاؤں خرید لیا تھا اور پلاٹ بیچ بیچ کر ایک الگ کالونی بسا لی تھی جو اب لکھنؤ کا حصہ بن چکی ہے۔

سگریٹوں کا دھواں اُٹھتا رہا۔ کسی کسی کی ہلکی ہلکی کھانسی بھی اُبھرتی اور ڈوبتی رہی اور اُن کی بے چین نظریں بھی اُسی پگڈنڈی پر جمی رہیں جہاں سے ایک خاتون ٹیچر کی آمد متوقع تھی۔ غالباً اضطراب اور مایوسی کے ردِعمل نے ہی بھٹے اور جیپ کے مالک ملہوترا کو یہ انکشاف کرنے پر مجبور کر دیا۔ "وہ میرا سالا دلیپ ہے نا، اُس کی جب شادی ہوئی تھی تو اُس کی دلہن بھی اُس کے ساتھ نہیں بستی تھی۔ وہ جب بھی اُس کے قریب جانے کی کوشش کرتا وہ زور زور سے چیخیں مارنا شروع کر دیتی! اپنے مرد سے ملنے کے تصور سے ہی اُس کی روح فنا ہونے لگتی تھی۔ گھر کی عورتوں نے اُسے بہت سمجھایا۔ بھلی مانس! یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ اسی ملاپ سے ہی انسانی مخلوق بڑھتی آئی ہے۔ اور تو اور اُس کے اپنے گھر والوں نے بھی اُسے یہی باتیں کہیں۔ لیکن صاحب، وہ کب ماننے والی تھی! آخر ایک دن اُس کے باپ نے ہی یہ رائے دی، دونوں کو کمرے میں بند کر دیا جائے۔ چلانے دو جتنا وہ چلا سکتی ہے! جانور بھی تو نئے تھان پر آکر اسی طرح رسّہ تڑاتا ہے۔ سینگ مارتا ہے۔ کچھ روز بعد پھر صبر کر لیتا ہے۔ وہی ہوا۔ اب وہ بال بچوں والی ہے۔ ہنسی خوشی سے رہ بھی رہی ہے دلیپ کے ساتھ۔"

یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنسنے لگا۔ دوسرے لوگوں نے اُس کی طرف بس گمبھیر نظروں سے ہی تاکا۔ پٹڑی دکانداروں کے صدر ملک راج بھلہ نے منشی دیا رام کے ہاتھ سے سلگتی ہوئی سگریٹ لے کر اپنی سگریٹ لگائی اور ناک سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولا —

"یار منشی، تم نے بھی یہی تجربہ کیا ہوتا! اپنے مدن کا بھی آج گھر بسا ہوا ہوتا نا!"

منشی دیا رام نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اُس کے بزرگ بہنوئی سنت رام بترا نے اپنے سر کی پگڑی کو سہلاتے ہوئے سب کو تنبیہہ کی۔ "جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب تو جو کچھ سوچ کر یہاں اکٹھے ہوئے ہو اسی پلان کو پورا کرنے کی فکر کرو۔"

اُسی ملے کالونی اور شاہی محل کے کھنڈر کے درمیان انھیں ایک رنگین ساڑی کی جھلک دکھائی دے گئی۔ سب کی آنکھیں اچانک چمک چمک گئیں۔ لیکن اُن کے چہروں پر ایک عجیب سا خوف بھی چھا گیا اور وہ سب کے سب یوں سناٹے میں آگئے جیسے کوئی

چوری کرتے ہوئے پکڑ لئے گئے ہوں!

اُس عورت کو سڑک تک پہنچنے میں بس ایک آدھ ہی منٹ لگا۔ ملہوترہ جیپ اسٹارٹ کر کے فوراً اُس کے قریب لے گیا۔ باقی چاروں آدمی جو اپنے مہذب سماج کے خاصے معتبر لوگ تھے ماہر شکاریوں کی طرح بڑی تیزی سے اُس عورت پر جھپٹ پڑے۔ ایک نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا باقی تین نے اُسے پلک جھپکتے ہی اُٹھا کر جیپ کے اندر ڈال دیا۔ اور پھر فوراً ہی جیپ دوڑنے لگی۔

راستے میں کتنی آبادیاں پڑیں۔ بھیڑ بھاڑ والی سڑکیں، اونچی اونچی عمارتیں، اسکول، کالج، اسپتال، کارخانے اور لال، ہری اور پیلی بتی دکھلانے والے ٹریفک کے جزیرے بھی لیکن کسی کو پتہ نہیں چل پایا کہ اِس شہر کے پانچ مہذب بزرگوں نے ایک نوجوان عورت کو رسیوں سے جکڑ کر اور اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر بالکل بے بس کر رکھا ہے اور اُسے اغوا کر کے اپنی کالونی میں لئے جا رہے ہیں اور اُس کی کتابوں کے صفحے ایسی دلچسپی سے اُلٹ پلٹ رہے ہیں جیسے اپنے اس کارنامے کے لئے فال نکال رہے ہوں!

کالونی اپنے صبح کے معمول میں مبتلا تھی۔ دودھ بیچنے والے سائیکلوں کے آگے پیچھے بڑے بڑے کین لٹکائے ہر گھر کے سامنے رک کر اپنے بندھے ہوئے گاہکوں کے برتنوں میں دودھ بھر رہے تھے۔ جو لوگ دفتروں اور دکانوں کی طرف جانے کے لئے نہا دھو کر گھروں سے نکل پڑے تھے وہ تیز رفتار جیپ کی دھول سے بچنے کے لئے فوری طور سے ٹھٹھک کر ایک طرف کو ہو جاتے۔ جیپ ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے جا کر رک گئی اور اُن لوگوں نے گردوپیش سے بہت محتاط ہو کر رسیوں سے جکڑی ہوئی عورت کو اتارا اور ہاتھوں ہاتھ اٹھائے ہوئے مکان کے اندر لے گئے۔ اُسے فوراً ایک کمرے کے اندر ڈال کر بند بھی کر دیا۔ گھر کی عورتوں نے بہت حیران ہو کر یہ سب دیکھا لیکن کچھ پوچھنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی۔ بس سوالیہ نظروں سے ہی اُن لوگوں کی طرف اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ اُن میں ایک تو مدن کی بوڑھی دادی تھی جو دیوار کے پاس اترتی ہوئی دھوپ میں بیٹھی اپنے پوپلے ہونٹوں سے چھوٹا سا حقہ گڑگڑا رہی تھی۔ دوسری مدن کی ادھیڑ ماں اور تیسری اُس کی پھوپھی۔

اُس واقعے کے فوراً بعد پانچوں مرد ایک عجیب سے احساس جرم میں مبتلا نظر آئے۔ ملہوترہ تو اپنی جیپ لے کر فوراً چل دیا، یہ کہہ کر —— "مجھے اینٹیں ڈھونے والے ٹرک ڈرائیوروں کو پے منٹ کرنی ہے۔" وہ دراصل وہاں سے فوراً کھسک لینا چاہتا تھا۔ کہیں کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے۔ اُس کے جانے کے بعد ملک راج بھلہ نے منشی دیا رام کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا —— "دیکھو منشی، ابھی تک تو خوش قسمتی سے سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ ہمیں کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اُس وقت اپنی گلی میں بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ سوائے بنک منیجر کی بیوی اور لوکو ورکشاپ والے مہندرو کی بہن کے جو میری شکل دیکھتے ہی اپنے اپنے دروازوں کے اندر ہو گئی تھیں۔ پھر بھی میں کہتا ہوں عورت ذات کی ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے جو سب کچھ بھانپ جاتی ہے۔ سمجھے! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے جاتے ہی یہاں عورتوں کی بھیڑ لگ جائے اور پھر شام تک ہم سب کے وارنٹ نکل جائیں!"

اُن دونوں کی بات سننے کے لئے سرگودھا سوپ فیکٹری کا پارٹنر سنت رام بترا بھی اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے فوراً کہا۔

—— "میں دن بھر دروازے کے باہر چارپائی ڈال کر پڑا رہنے کے لئے تیار ہوں۔ کوئی چڑیا تک اندر نہیں پھٹک سکے گی!"

نرکشوں کا مالک پریم سنگھ جو نہ جانے کیوں پیچھے سے باہر نکلا جا رہا تھا اُس کی بات سن کر پلٹ آیا اور بولا —— "بیوقوفوں کی سی بات مت

کرو بترا! سب کام معمول کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اگر تم نے آج خلافِ معمول دروازے پر بیٹھ کر چوکیداری کی تو اگر کسی کو معلوم نہیں بھی ہوگا تو بھی اُسے معلوم ہو جائے گا!"

اس پر سنت رام بترا بھڑک اٹھا ۔" تو پھر کیا کروں؟ گلی محلے کی سب عورتوں کو بُلا بُلا کر اندر بھیجتا جاؤں؟"

ٹُک راج بھلہ نے اُس کے دونوں کاندھوں پر اپنے مضبوط ہاتھ رکھ دیے۔ بڑے پیار سے سمجھایا ۔" غصہ کیوں دکھلاتے ہو یار! مانا کہ تم منشی کے بہنوئی ہو۔ اس گھر کی عزت کو اپنی ہی عزت سمجھتے ہو۔ لیکن ہم نے بھی محلے داری اور دوستی کا کچھ حق ادا کیا ہے۔ کیا ہمیں ابھی کوئی مناسب مشورہ دینے کا حق دیتے ہو کہ نہیں؟ پریم سنگھ کے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ کوئی کام کسی کو بلا وجہ چونکا دینے والا نہیں ہونا چاہیے۔!"

"میں تو صرف اتنا جانتا ہوں، سارا بنا بنایا کھیل یہی عورتیں بگاڑ دیں گی!" یہ بات قطعی طور پر کہہ کر بترا نے ہاتھ بڑھایا اور بھلہ کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکال لی اور سگریٹ سلگانے لگا۔ جب سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لے چکا تو اچانک اُسے جیسے یاد ہو آیا۔ پھر سے تیز ہو کر بولا ۔" وہ مدن کہاں ہے، مدن! میں کہتا ہوں اُسے بھی تو ڈھونڈ کر لے آؤ جس کی خاطر اتنا جوکھم اٹھا کر ہم اُس کی عورت کو لے آئے ہیں!"

مدن کے ذکر پر سب ہی لوگ چونک پڑے۔ بھلہ نے کہا ۔" نالائق سے میں نے کل رات کو بھی کہا تھا آج کام پر مت جانا۔"

"مدن کہیں دُور نہیں گیا ہے۔" اُس کی ماں نے رسوئی کی کھڑکی میں سے سر نکال کر بتایا۔" ابھی آپ لوگوں کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے اسکوٹر سے حسین گنج تک گیا ہے کسی آدمی سے روپے کا تقاضا کرنے کے لیے۔ آتا ہی ہوگا۔"

یہ سن کر اُس کے پھوپھا کو اور بھی طیش آیا۔ چلا کر بولا ۔" یہ نہ ہو، ہم سب تو جیل میں پہنچ جائیں اور وہ اپنے تقاضے کرتا پھرے! اُسے تو فوراً آ کر اپنی عورت سے میل کرنا چاہیے۔"

منشی نے اچانک ہاتھ بڑھا کر اُس کے منہ پر رکھ دیا۔ بہت دھیرے سے کہا ۔" شور کیوں مچاتے ہو بھائی جی۔ کوئی سن لے گا تو میرے سمدی کو فوراً خبر پہنچ جائے گی۔ ابھی تک تو وہ یہی سمجھ رہا ہوگا اُس کی بیٹی اسکول میں پڑھانے گئی ہوئی ہے!"

"منشی ٹھیک کہتا ہے۔ اب سب لوگ اِدھر اُدھر بکھر جاؤ تو اچھا ہے۔ مدن کا سسر معلوم ہو جانے پر پولیس کو بھی لے کر آ سکتا ہے۔"

سردار پریم سنگھ کی تجویز پر سب لوگ باہر نکل گئے۔ گھر میں وہی تین ہی عورتیں رہ گئیں۔ مدن کی ماں نے آنگن میں بھی دھوپ اُترتی دیکھ کر ایک چارپائی لا کر ڈال دی۔ پھر اُس پر ایک ٹاٹ پھیلا کر لال مرچوں کا پورا اُٹھا لائی۔ وہ اور اُس کی نند لال مرچیں پھیلانے لگیں۔ بڑھیا جو ابھی تک ایک طرف بیٹھی حقہ گڑگڑا رہی تھی اچانک جلتے ہوئے تمباکو کی راکھ اُلٹ کر بولی۔" بہو کو کھانے پینے کے لیے کچھ دیا؟"

مدن کی ماں اپنی نند کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بڑبڑائی ۔" ناں، میری ہمت تو نہیں پڑتی اندر جانے کی!"

"میں ہی اُس کے پاس چلی جاتی پر تم جانتی ہو وہ کتنی نک چڑھی ہے!" اُس کی نند نے مرچوں کو بینتے ہوئے کہا۔

"بہن، وہ نک چڑھی نہ ہوتی تو آج اِس طرح رسیوں سے باندھ کر یہاں لے آئی گئی ہوتی! پورے سو گھر دیکھ کر اس لڑکی کو چُنیا

تھا میں نے اپنے بیٹے کے لئے۔ کتنے چاؤ سے بیاہ رچایا تھا ان کا! لیکن قسمت ہی کھوٹی تھی اس کی! اس کی عمر کی لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بھی بن بیٹھی ہیں۔ ایک یہ ہے، ابھی تک ناک پر غصّہ دھرے پھرتی ہے۔ مجھ جنم جلی کی قسمت بھی تو کھوٹی تھی!"

اُن کی نند نے کہا "پر، بھابی تمہارا کیا قصور تھا اس میں! بالکل نہیں تھا!"

"قصور! میرا قصور بس اتنا تھا کہ میں نے اُس کے باپ کی منت سماجت مان لی وہ ہر روز اُن کے پاس کوئلے کے ٹال پر جا پہنچتا تھا۔ بار بار کہتا تھا میری بیٹی کا رشتہ نہ ٹھکراؤ۔ میری بیٹی جیسی سوشیل اور نیک لڑکی تم لوگوں کو اور کہیں نہیں ملے گی۔"

"ہاں بڑی سوشیل نکلی اُس کی بیٹی! یہاں سے جاتے ہی کہلوا بھیجا میں اپنے جہیز کی ایک ایک چیز واپس لے کر دم لوں گی!"

"ہاں، بڑا جہیز دے دیا تھا نا اُس کے باپ نے! ابھی تک ایک طرف بندھا ہوا رکھا ہے۔ دیکھ لیں آکر وہ لوگ جو اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔"

"اب تو وہی لوگ یہ بھی کہتے پھرتے ہیں مدن بہت ہمت والا نکلا۔ چھوٹے چھوٹے کاروبار کر کے پیسہ جوڑ لیا، مکان بنا لیا اور اب تو اُس نے اسکوٹر بھی لے لیا ہے!"

"مکان تو ابھی اور بنے گا بہن۔ تم جانتی ہو سیمنٹ اور لوہے کے پرمٹ نہیں مل رہے ہیں۔ نہیں تو اُوپر دو کمرے اور بن گئے ہوتے! بہن غریبی تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج ہے کل نہیں ہے۔ پر ہرا کرنے سے سب دلدر دُور ہو جاتے ہیں۔"

اچانک مدن کی ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ بولی "پر یہ سب اچھا نہیں لگا مجھے کہ عورت کو اس طرح باندھ کر گھر میں لے آیا جائے! اس کا مطلب تو یہ ہوا نا عورت ذات ہی اتنی گری ہوئی ہے!"

دروازے پر اسکوٹر کی آواز سن کر وہ دونوں چپ ہو گئیں۔ مدن اسکوٹر کو دھکیلتا ہوا اندر لے آیا تو اُس نے اپنی ماں اور پھوپھی کی طرف ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ سمجھ گیا جو منصوبہ کل شام کو بنایا گیا تھا وہ پورا کیا جا چکا ہے۔ لیکن اُس کے چہرے پر فوراً کسی الجھن کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ نہ تو ماں کے پاس گیا نہ ہی پھوپھی یا دادی کے پاس۔ آنگن میں ہی اِدھر اُدھر ٹہلتا پھرا۔ عورتوں کی نظریں اُس پر برابر جمی رہیں۔ وہ بھی اُسے کچھ نہ کہہ سکیں۔ جیسے کسی کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہ رہ گیا ہو۔ وہ اچانک بند کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو اُن کے دل ایک انجانے خوف سے دھڑک اُٹھے۔ لیکن اُس کی ماں اور پھوپھی سر جھکائے مرچیں بینتی رہیں۔ اُس کی دادی حقہ گڑگڑاتی رہی۔

کمرے کے اندر روشنی نہیں تھی۔ وہ اندر گیا تو پہلے تو اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ اپنے پیچھے بند کئے ہوئے دروازے کے ساتھ پیٹھ لگائے سانس روکے ہوئے کھڑا رہا۔ پھر اُسے اپنے پلنگ پر رسیوں سے جکڑی ہوئی --- اپنی بیوی نظر آئی جو چار سال کے بعد پھر وہاں لے آئی گئی تھی۔ اُس کا منہ بند تھا لیکن آنکھیں کھلی تھیں۔ اُسی کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں سے بے شمار آنسو بہہ بہہ کر اُس کے گالوں پر خشک ہو چکے تھے۔

وہ دونوں کتنی دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ مدن کا دل ایک طویل مدت کی علیحدگی کی وجہ سے غصے اور نفرت سے بھرا ہوا تھا جس کے لئے وہ اپنی بیوی کو ہی ذمہ دار سمجھتا تھا لیکن اس وقت وہ اُس دلدوز منظر کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکا۔ آگے بڑھ کر

اُس نے اُس کے منہ سے کپڑا نکال لیا۔ کافی دیر سے کپڑا ٹھنسا رہنے کی وجہ سے اُس کے خوب صورت ہونٹوں کے کونے سوج گئے تھے۔ اُس کے پاس بیٹھ کر اُس نے رسیوں کے بند بھی کھول دیئے۔ اُس کی نازک کلائیاں، پنڈلیاں اور کاندھے بھی سوج گئے تھے۔ اُس کی جلد پر لال لال نشان نظر آ رہے تھے۔ جنھیں وہ دھیرے دھیرے سہلاتا رہا۔ وہ آزاد ہو کر بھی بےحس و حرکت پڑی رہی۔ بس حیرانی سے ہی اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ مدن نے اُسے اُٹھا کر بٹھلاتے ہوئے کہا۔ "اُن لوگوں نے بڑا ظلم کیا تمہارے ساتھ! لیکن ساری اسکیم میرے پھوپھا کی تھی۔ بھگوان اُسے غارت کرے!"

تب بھی اُس نے کوئی جواب نہ دیا تو مدن نے کہا "تمہیں اس طرح مجبور کر کے تو میں کبھی نہیں رکھنا چاہوں گا۔ چاہو تو ابھی واپس چلی جاؤ۔ لیکن اب میں کسی کو بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔ جاؤ گی؟"

یہ کہہ کر اُس نے دروازہ بھی کھول دیا۔ کتنی دیر تک دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ انتظار کرتا رہا، لیکن اُس کی بیوی پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہی رہی۔ وہ اب بھی بڑی حیرانی سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک مدن نے برآمدے میں ماں کی جھلک دیکھ لی۔ وہ ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا ایک گلاس لئے کھڑی تھی۔ اُس نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور جا کر بیوی کے سامنے کر دیا۔ اُس کی بیوی نے گلاس لے لیا اور گھونٹ گھونٹ دودھ پینے لگی۔ پی چکی تو گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن لڑکھڑا کر پھر بیٹھ گئی۔ اُس کی ٹانگیں بندھی بندھی رہنے کی وجہ سے بہت دُکھنے لگی تھیں۔ مدن نے آگے بڑھ کر اُس کی ٹانگوں کو سہلانا چاہا تو اُس نے اُس کا ہاتھ پرے ہٹا دیا اور پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔ اُٹھ کر کپڑے ٹھیک کئے اور دھیرے دھیرے چل کر دروازے کی طرف گئی جس کے سامنے آنگن میں عورتیں کھڑی تھیں۔ وہ بھی اُسے آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ لیکن اُس نے دروازے کے پاس پہنچ کر دروازہ بند کر دیا۔ اندر سے کنڈی چڑھا دی اور پھر مدن کے پاس آ کر اُس کے سینے سے لپٹ کر رو پڑی۔ "یہ کام تم نے اُن لوگوں سے کیوں کرایا؟ کیا تم مرد نہیں تھے! تم خود بھی تو مجھے اُٹھا کر لے آ سکتے تھے!!"

راکھی

اختر جمال

کہانی کے رشتہ سے اور ترقی پسند تحریک کے رشتہ سے تو کرشن جی میرے بڑے بھائی تھے مگر جب میں نے انھیں سرخ ریشم کی راکھی بھیجی تو پھر یہ روحانی رشتہ عمیق رشتہ بن گیا۔ سرخ راکھی میں نے اس لیے چنی تھی کہ وہ تحریک کا بھی رنگ تھا اور خون کا بھی رنگ۔

یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے میں ان دنوں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ میری ایک سہیلی گرجا اکثر رکشا بندھن کے تہوار کی بات کیا کرتی تھی "راکھی پر یہ کروں گی وہ کروں گی سب بھائیوں کے گھر جاؤں گی"۔ مجھے بھی راکھی کا تہوار بچپن سے پسند تھا۔ گرجا کی باتیں سن کر میرا دل مچل اٹھا کاش میرا بھی کوئی بڑا بھائی ہوتا، تو میں بھی تھال میں ناریل مٹھائی اور بہت سی چیزیں سجا کر ساتھ راکھی لے جاتی۔ ننھے بھائیوں کو خدا سلامت رکھے مگر بڑے بھائی کی بات ہی اور ہوتی ہے اس روز یہ حسرت شدید آرزو بن گئی۔ گرجا نے کہا "یہ تو بڑی آسان بات ہے راکھی باندھنے سے تمھیں بڑا بھائی مل جائے گا۔"

"سچ ۔۔۔ !"

"ہاں راکھی کا پوتر بندھن مانو خون کا رشتہ ہوتا ہے اور تم جیسے راکھی باندھو گی وہ تمھارا ایسے ہی بھائی ہو جائے گا جیسے سگا بھائی ہوتا ہے۔"

گھر آئی تو سوچ میں پڑ گئی کہ کسے راکھی باندھوں۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ اللہ میاں نے بہن بھائی اپنی مرضی سے بنا دیئے ورنہ ساری عمر بھائی بہن ڈھونڈنے میں گذر جاتی۔ ان ہی دنوں میں لائبریری سے کرشن جی کی کچھ کتابیں لائی تھی۔ اس روز کتاب پڑھتے پڑھتے میں نے سوچا ایسی باتیں کرنے والا ۔۔۔ ایسے سوچنے والا ۔۔۔ اتنے خوب صورت دل کا انسان! مجھے بڑا بھائی مل گیا۔

دوسرے دن کالج جا کر میں نے گرجا کو پیسے دیئے کہ مجھے ایک لال ریشم کی راکھی منگوا دے۔

گرجا نے پوچھا "لال ہی ہونا چاہیئے اس لئے کہ لال رنگ خون کا بھی رنگ ہے۔ اور اس تحریک کا بھی جس سے ہم سب محبت کرتے ہیں۔"

"کسے باندھو گی؟"

پہلے راکھی لا دے ۔۔۔ ابھی نہیں بتاتی بعد میں بتاؤں گی۔

دوسرے دن گرجا ریشم کی لال راکھی لے کر آئی وہ سرخ دھاگے مجھے دنیا کی سب سے مقدس چیز معلوم ہوتے

قرآن شریف کے اوراق کی طرح ——— خوب صورت اور مقدس ! اور میں نے ایک اچھا سا کاغذ لے کر کرشن جی کو ایک خط لکھا۔ پھر راکھی درمیان میں رکھ کر خط پوسٹ کر دیا۔

چند دن گذرنے کے بعد جب جواب نہ آیا تو مجھے سخت فکر اور بے چینی ہوئی کہ خدا جانے راکھی پہنچی بھی یا ڈاک میں ہی کھو گئی۔ ایک دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب کرشن جی کا خط ملا۔ انہوں نے لکھا تھا "میری اچھی بہن ——— آپ کا خط ملا۔ راکھی بھی مل گئی۔ اس عزت افزائی اور مخلوص محبت کے جذبے کے لئے میں جس قدر اپنی بہن کا شکریہ ادا کروں کم ہے میں اس سے بہت پہلے آپ کو خط لکھتا مگر تہوار کے دوسرے روز ہی مجھے بمبئی سے باہر جانا پڑا اور مسافت میں خط نہ لکھ سکا۔ اس تاخیر کی معافی چاہتا ہوں آپ کی راکھی ہماری دوسری افسانہ نگار بہن سرلا نے باندھی اس طرح یہ سمجھئے کہ یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ سرلا بہن اور بھابی آپ کو سلام کہتی ہیں آپ اپنے گھر میں سب کو میرا سلام کہیے۔

آپ "شاہد" کے لئے کیوں نہیں لکھتی ہیں؟ آپ کا بھائی

کرشن چندر

میں نے خوشی خوشی گھر میں سب کو خط دکھایا اور دوسرے دن کالج میں گرجا اور حامدہ کو بتایا۔

پھر میری کرشن جی سے خط و کتابت جاری رہی۔ جب کبھی میں نے انھیں خط لکھا انہوں نے بڑی شفقت سے جواب دیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کاش میں بھی کرشن جی کی سی کہانیاں لکھ سکوں اور سچ مچ ان کی بہن کہلا سکوں اگلے سال ہمارے کالج میں تین ترقی پسند پروفیسر آئے۔ جاں نثار اختر، صفیہ اختر اور احسن۔ ان لوگوں کے آنے سے کالج میں ادب اور ترقی پسند تحریک کا چرچا بڑھ گیا۔ میں ۴۲ء سے یعنی جب میٹرک میں پڑھتی تھی انجمن کی باقاعدہ ممبر بن چکی تھی۔ مگر میرا تعلق اس گروپ سے اب تک صرف قلمی تھا صفیہ آپا، جاں نثار اختر اور احسن نے بھوپال کی انجمن میں جان ڈال دی اس کے باقاعدگی سے اجلاس ہونے لگے جن میں میں بھی کبھی کبھی شرکت کرنے اور کہانیاں پڑھنے لگی۔

اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کی تیاریاں زور شور سے شروع ہوئیں جس کے لئے ہم سب نے چندہ جمع کیا اور بہت کام کیا مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ کرشن جی بھوپال آ رہے ہیں اور میں بے چینی سے کانفرنس کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کرشن جی ہمارے گھر ٹھہریں ابا کی بھی یہی خواہش تھی لیکن کانفرنس کے منتظمین نے ان کے قیام کا انتظام اختر سعید کے گھر کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا گھر شہر کا آخری سرا ہے وہاں سے منٹو ہال کا فاصلہ بہت زیادہ تھا اختر سعید کا گھر شہر میں تھا اور وہاں سے انھیں آنے جانے اور سب سے ملنے جلنے میں آسانی ہوگی۔ میں نے اختر سعید اور احسن سے کہا کہ آپ نے کرشن جی کو اپنے گھر رکھ کر میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے مگر پھر ان لوگوں کی دلیل میری سمجھ میں آ گئی اور میں خاموش ہو گئی۔

کرشن جی صبح کی ٹرین سے آ رہے تھے اور ان کے ساتھ بہت سے ادیب بھی آ رہے تھے جن میں سے عصمت آپا، مجروح، مہندر ناتھ، عادل رشید وغیرہ کے نام معلوم ہو چکے تھے۔ بھوپال کے ادیب، طالب علم اور مزدور بڑی تعداد میں اسٹیشن

پہنچے تھے۔

گاڑی آئی تو سیکنڈ کلاس کے ڈبہ سے کرشن جی، مہندر ناتھ، مجروح اور رشید عادل وغیرہ باہر آئے۔

کرشن جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے "میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ چھوٹی سی لڑکی ضرور ہماری بہن ہے" پھر بولے "لیکن اپنے خطوں سے تم ذرا بڑی معلوم ہوتی تھیں" پھر کرشن جی نے مہندر ناتھ اور سب لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور ہم اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں چائے کے لئے آ گئے۔

میں نے کرشن جی سے بھابی اور بچوں کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے سب کا ذکر کیا۔ پھر پوچھا "مجھ سے مل کر تمہیں مایوسی تو نہیں ہوئی"

"نہیں کیوں؟"

کہنے لگے قرۃ العین حیدر جب مجھ سے پہلی مرتبہ ملی تھیں تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی تھی"

پھر کرشن جی میری پڑھائی وغیرہ کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ پہلے سفر کی تھکن اتار لیں تو تفصیلی پروگرام طے ہوگا۔ احسن نے کہا کہ وہ فرصت ملتے ہی کرشن جی کو ہمارے گھر لے کر آئیں گے۔

اسی روز سہ پہر کو کرشن جی ہمارے گھر آئے ان کے ساتھ عصمت آپا، شاہد لطیف، عادل رشید، مہندر ناتھ اور مجروح بھی تھے۔ شام کو کافی ہاؤس میں بھوپال کے ادیبوں کی طرف سے استقبالیہ تھا اس لئے ان لوگوں کو وہاں جلدی پہنچنا تھا۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ استقبالیہ سے واپسی پر پھر وہ لوگ آئیں گے اور اطمینان سے باتیں ہوں گی۔

کافی ہاؤس میں چائے کے دوران کرشن جی بھوپال کے ادیبوں سے بات چیت کرتے رہے، وہ بھوپال آ کر بہت خوش تھے اور سب نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ اور ان میں لکھنے کی اُمنگ بڑھا رہے تھے۔ عام طور پر بڑے ادیبوں کا رویہ یہ ہوا کرتا ہے کہ ہم کسی کو نہیں جانتے۔ مگر ان کے برخلاف کرشن جی کے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سب کو جانتے ہیں۔ پھر کرشن جی نے مجھ سے کہا کہ آؤ تمہیں جوش صاحب سے ملوائیں۔ ہم اس جانب گئے جہاں جوش صاحب اور جاں نثار اختر وغیرہ بیٹھے تھے میں نے جوش صاحب کو سلام کیا کرشن جی نے ان سے کہا "جوش صاحب یہ ہماری بہن ہیں بالکل سُرخ"

جوش صاحب بولے "مگر یہ تو سفید ہیں" میں سفید لباس میں تھی۔

پھر بولے "لکھتی ہو—"

میں نے کہا "جی—کہانیاں—"

"اچھا—" ایک دو باتیں کر کے میں ایک طرف بیٹھ گئی۔ صفیہ آپا میرے کان کے قریب منہ لا کر بولیں "کافی ہاؤس میں اندر کمرے میں چلنا" پھر عصمت آپا کے کان میں بھی کوئی بات کی وہ دونوں کھڑی ہو گئیں تو میں بھی ان کے پیچھے ہو لی— جب ہم اندر کمرے میں آئے تو پتہ چلا کہ صفیہ آپا کیوں بلا رہی تھیں۔ صفیہ آپا کا یہ پروگرام تھا کہ خواتین مردوں سے علیحدہ کمرے

میں چلے گئے ہیں۔ نفیس ایک ناشتے دان میں دہی بڑے رکھے سب کی منتظر تھیں۔ صغیرہ آپا نے یہ دہی بڑے خاص طور سے عصمت آپا کے لئے تیار کرائے تھے اور دہی بڑے اتنے زیادہ نہ تھے کہ مردوں کو شریک کیا جاتا۔ مردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ دہی بڑے اتنے باقی بچ گئے کہ عصمت آپا نے کہا "رات کو بھی کھائیں گے۔" ہم چاروں نے چھوٹے سے کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر چائے پی اور پھر صفیہ آپا اور عصمت آپا تصویر میں شامل ہونے چلی گئیں نفیس کا پردہ تھا اس لیے میں ان کے ساتھ ٹھہر گئی۔

کافی ہاؤس سے واپسی پر کرشن جی، مہندر ناتھ، عادل رشید اور مجروح سلطانپوری میرے ساتھ گھر آئے۔ آسن کرشن جی کو ادھر اُدھر لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے کہا اب اور جگہ کل لے جائیے گا۔ ہمارے ہاں اتنی دیر ہو گئی کہ پھر اور جگہ کا پروگرام نہ بن سکا۔ کرشن جی زیادہ تر سیاست پر باتیں کرتے رہے پنڈت نہرو —— کانگریس —— آپ نے ان دنوں بھوپال میں مولانا ابوالکلام آزاد کی انجمن اتحاد و ترقی قائم کی تھی —— اور یہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کر رہے تھے۔ ان سب کی باتیں سن کر اس وقت میری نظر میں مستقبل کے ہندوستان کی تصویر ابھر رہی تھی۔ ذہن اور روح کی پوری آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور —— یہ سب انقلاب کے بعد ہی ممکن ہو سکے گا۔

گھر سے رخصت ہوتے وقت کرشن جی نے مجھے دس روپے دیئے میں نے لینے میں تکلف کیا تو بولے "یہ تمہاری راکھی کے ہیں تمہیں تو جھگڑ کر لینا چاہیئے تھا۔" میں نے سلام کر کے روپے لے لئے کرشن جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر سب سے کہا "کانفرنس کی مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ مگر میں پھر آنے کی کوشش کروں گا۔"

کانفرنس کا اجلاس کئی دن جاری رہا ایک دن کالج کے لڑکوں نے بھی ڈرامہ اسٹیج کیا انہوں نے عورتوں کا ایسا عجیب و غریب روپ دھارا کہ عصمت آپا کو بڑی کوفت ہوئی انہوں نے مجھ سے کہا "لڑکیوں کا پارٹ لڑکیوں کو ہی کرنا چاہیے تھا یہ تم لوگوں کی سزا ہے کہ یہ سوانگ بھر کر تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ توبہ توبہ دیکھو تو شرم آتی ہے۔"

میں نے ان سے کہا کہ "ہم لوگ اپنے ڈرامے علیحدہ کرتے ہیں اور پھر ہم بھی جی بھر کر ان کا سوانگ بھرتے ہیں۔ ہاں ڈبیٹ میں ضرور ہم لوگ لڑکوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔"

عصمت آپا کے لئے ہم لوگوں نے چائے کا انتظام ان کمروں میں کیا تھا جو طالبات کے لئے مخصوص تھے —— عصمت آپا نے طالبات سے بہت سی باتیں کیں۔ مجھے عصمت آپا اپنی عبارت کی طرح بے تکلف سادہ اور خوب صورت معلوم ہوئیں اور بہت پسند آئیں۔ جب میں نے انھیں آٹو گراف البم دی تو انہوں نے یہ جملہ لکھا "ہیروئن بن جاؤ۔ کسی فرد کے دل کی نہیں اپنے ملک کی۔" مجھے آٹو گراف بہت پسند آیا کیونکہ یہ میرے اپنے خیالات کے عین مطابق تھا۔

کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت کرشن جی نے کی اس میں بہت سے لوگوں نے مضامین پڑھے اور تقاریر کیں کرشن جی کا خطبۂ صدارت بہت بصیرت افروز تھا۔ کرشن جی آٹو گراف البموں کی یورش میں گھرے ہوئے تھے۔ جب میں نے البم بڑھائی تو بولے۔ "تمہیں بھی ابھی آٹو گراف لینا ہے۔"

میں نے کہا: "پھر میں بھول نہ جاؤں۔"

انھوں نے ایک جملہ لکھا: "میری پیاری چھوٹی بہن۔ تُم نے اپنے لئے جو راستہ چنا ہے وہ بہت مشکل ہے مگر میں امید کرتا ہوں کہ اب تم اس پر ثابت قدم رہوگی۔"

بعد میں آنے والے برسوں میں جب ہر طرف سے پریشانیوں اور مشکلات نے مجھے گھیرا تو یہ اوٹوگراف ایک روشنی کا مینار بن کر مجھے راہ دکھاتا رہا۔

کانفرنس کے افسانوی اجلاس کی صدارت مہندر ناتھ نے کی تھی۔ مہندر ناتھ سب کو ادیب کم اور ہیرو زیادہ معلوم ہوئے تھے، وہ چند فلموں میں کام بھی کر چکے تھے لیکن جب انہوں نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا تو سب کو قائل کر دیا کہ وہ ادیب پہلے ہیں اور ہیرو بعد میں —— انہوں نے سیاسی اور سماجی مسائل کا بڑا اچھا تجزیہ کیا تھا اور افسانہ نگاروں کو زندگی کی بھرپور ترجمانی کی دعوت دی تھی۔

اسی اجلاس میں کرشن جی نے اپنا مشہور افسانہ مہالکشمی کا پُل پڑھا تھا ان کا کہانی پڑھنے کا انداز بہت دلنشیں تھا بس جیسے باتیں کر رہے ہیں۔ میرا سر فخر اور خوشی سے اونچا ہو گیا اور میں نے سوچا میرا بھائی بہت عظیم ہے۔

آخری اجلاس مشاعرہ کا تھا۔ منٹو ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ عورتوں کا انتظام گیلری میں تھا جہاں چکیں ڈالی گئی تھیں۔ بھوپال میں مشاعروں کی خاص روایات تھیں اس لئے ترقی پسند ادیبوں کی یہ کوشش تھی کہ یہ مشاعرہ سابق روایات سے بڑھ چڑھ کر ہو۔

میں اسٹیج کے قریب ہی صوفے پر کرشن جی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بھوپال کے شعراء نے پہلے پڑھا۔ احسن کے گھر سے کسی عزیز کی موت کی خبر آئی انہوں نے کہا کہ وہ نظم پہلے سنا کر چلے جائیں گے۔ انہوں نے اپنی مشہور نظم "مرحوم ساتھی" سنائی۔ یہ نظم میں پہلے بھی سن چکی تھی۔ یہ مرثیہ رنج و غم میں ڈوب کر لکھا گیا تھا۔ اس روز یہ نظم میرے احساسات پر چھاتی چلی گئی۔ اور مجھے احسن سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا انھیں اس وقت دس بارہ میل دور سائیکل پر اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے کرشن جی سے کہا کہ "ہمارے یہ پروفیسر صاحب بیچارے اتنے بیمار رہتے ہیں، پارٹی کا اتنا کام کرتے ہیں۔ انھیں اس وقت اکیلا نہیں جانا چاہیے تھا ان کا گھر بہت دور ہے۔"

کرشن جی نے بہت غور سے میری طرف دیکھا اور بولے "تم نے پہلے نہیں کہا ورنہ ہم کسی کو ان کے ساتھ کر دیتے مگر اب تو وہ جا ہی چکے ہیں۔"

اس مشاعرے میں بہت سے مہمان شعراء نے پڑھا مجروح سلطانپوری نے بہت اچھی غزلیں سنائیں اور آخر میں جوش صاحب کے پڑھنے پر رات کے دو بجے مشاعرہ ختم ہوا۔

دوسری صبح کرشن جی اور سب ادیبوں کی روانگی تھی۔ اس روز صبح کالج کھل گیا تھا۔ کالج گئی تو پتہ چلا کہ آج سب مہمان جا رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ کرشن جی کو خدا حافظ نہ کہہ سکوں گی۔ منٹو ہال اتنی دور تھا کہ سواری ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ میں اسی فکر میں ٹہل رہی تھی کہ احسن چند لوگوں کے ساتھ جیپ میں آئے اور کہا میں نے سوچا آپ کو بھی ساتھ لے لیں تاکہ آپ

کرشن جی کو خدا حافظ کہہ سکیں۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور جیپ میں بیٹھ گئی۔

بھوپال کا اسٹیشن — ! سیدھا سادھا سا منکسر المزاج ریلوے اسٹیشن سے لکڑی کی سیڑھیاں — !

کرشن جی نے کہا یہ بہت اچھا ہوا کہ احسن تمھیں لئے آئے ہیں روانگی سے پہلے تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔" ہم سب اسٹیشن پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ایک میلا کچیلا چھوٹا سا بچہ وہاں مانگتا ہوا آیا کرشن جی نے کہا دیکھو کتنا خوب صورت اور پیارا بچہ ہے۔ اس کے دانت کتنے خوب صورت اور چمک دار ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے ان گنت بچے ہیں جنھیں صاف کپڑوں اور کتابوں کی ضرورت ہے۔

پھر کرشن جی ہری ماما کے متعلق باتیں کرنے لگے بھوپال کے چند روزہ قیام میں ہری ماما نے انھیں بہت متاثر کیا تھا۔ وہ ایک پُر خلوص اور نڈر مزدور لیڈر تھے۔ اشالن سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور اس زمانے میں سب کو ہی اشالن سے عقیدت تھی۔ کرشن جی نے ہری ماما کے لئے کہا" یہ بہت پیارا آدمی ہے — ! یہ آدمی فولاد ہے!"

پھر مہندر ناتھ، مجروح سلطانپوری، عادل رشید بھوپال کے ادیبوں سے بات چیت میں مصروف تھے۔ بمبئی کے سب مہمانوں کو بھوپال بہت پسند آیا تھا اور وہ سب بھوپال کے قدرتی مناظر کی تعریفیں کر رہے تھے۔

گاڑی آئی کرشن جی نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور بولے" اب ہم تم سب کو بمبئی بلائیں گے۔ تم کانفرنس میں ضرور آنا۔"

بھوپال سے جا کر کرشن جی نے بڑا پیارا سا خط لکھا اور بھی چند لوگوں کو انہوں نے خط لکھے۔ جب احسن نے مجھ سے اپنے نام کے خط کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ" کرشن جی کا وہ خط مجھے دکھایئے۔" احسن نے کہا" آپ بھی اپنے نام کا خط دکھایئے۔ میں نے کہا" پہلے آپ اپنے نام کا خط لاکر دکھائیں تب میں بھی اپنا خط پڑھواؤں گی۔" پھر اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ اگر ان کے نام کرشن جی کا کوئی خط آتا تو وہ مجھے پڑھواتے۔ کرشن جی کی محبت ہمارے درمیان ایک قدر مشترک بن گئی۔

مئی ۱۹۴۹ء میں بھمڑی کانفرنس میں شرکت کے لئے ہم سب بمبئی گئے بھوپال سے کافی بڑا وفد گیا تھا۔ جاں نثار اختر اور صفیہ آپا پہلے سے بمبئی تھے اور عصمت آپا کے گھر مقیم تھے۔ جب ہم لوگ بمبئی پہنچے تو بمبئی کے دوسرے ادیبوں کے ہمراہ کرشن جی اسٹیشن پر تھے۔ ایک جگہ بڑے اسٹیشن پر اتر کر ہم لوگ لوکل میں بھمڑی روانہ ہوئے۔

بھمڑی میں ایک اسکول کی ایک بہت عالیشان بلڈنگ میں کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کئی دن جاری رہی۔ سارے ہندوستان سے مندوب آئے ہوئے تھے۔ تلنگانہ تحریک اپنے شباب پر تھی مخدوم جیل میں تھے اس لئے ادیبوں میں بے انتہا جوش تھا۔

بمبئی کے ادیبوں میں مہندر ناتھ، کیفی اعظمی، ساحر اور نیاز حیدر وغیرہ ہم سب کا بہت خیال رکھتے تھے اور بہت زیادہ خاطر مدارات کرتے تھے۔ طالب علم والنٹیرز بھی ہر وقت مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے رہتے تھے۔ کرشن جی، عصمت آپا اور ملک راج آنند وغیرہ روزانہ بمبئی آیا جایا کرتے تھے باقی ادیب وہیں ٹھہرے تھے۔

مہندر ناتھ صبح ہم لوگوں کو اپنی نگرانی میں ناشتہ کرواتے تھے۔ میں اور سیدہ یحییٰ اوپر کی منزل میں ایک کمرے میں ساتھ ٹھہرے تھے۔

میرا چھوٹا بھائی راشد احسن اور بھوپال کے دوسرے ادیبوں کے ساتھ نیچے کی منزل میں تھا۔ پانی کے نل میدان میں ایک ساتھ بہت سے لگے ہوئے تھے۔ صبح سویرے میں اور سیدہ صابن اور تولیے لے کر منہ دھونے جاتے تو مہندر بھیا کو بڑی کوفت ہوتی وہ اصرار کرتے کہ پانی یہیں منگواتے ہیں مگر میں اور سیدہ دونوں اصرار کرتے کہ ہمیں نل پہ جا کر قطار میں کھڑے ہو کر منہ دھونے میں بڑا مزا آتا ہے۔ ہم لوگ اپنے وہاں کے قیام کو پک نک کی طرح منا رہے تھے۔ بعد میں موتی اور زہرہ بھی ہمارے ساتھ آ کر رہنے لگیں تو پھر اور بھی اچھا لگنے لگا اکثر کانفرنس کے لمبے اور بور اجلاس ہوتے تو ہم چاروں چپکے سے نکل جاتے اور ادھر اُدھر گھومتے۔!

ایک دن دوپہر کے اجلاس میں میں نے بھی تقریر کی مہندر ناتھ نے کرشن جی کو بتایا کہ ان کی تقریر تو بالکل سُرخ تھی" کرشن جی نے کہا افسوس ہم کل دوپہر کے اجلاس میں نہ آسکے اور اپنی بہن کی تقریر نہ سن سکے۔"

کانفرنس کا آخری دن بہت یادگار تھا۔! اس روز مخدوم اور سردار جعفری اور سب نظربند ساتھیوں کو یاد کیا گیا۔ اور انتہائی جوشیلی تقاریر ہوئیں معلوم ہوتا تھا کہ سارا بمبئی سرخ ہو گیا ہے۔ آخر میں بڑے جوش و خروش سے مخدوم کا ترانہ گایا گیا۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے

کرشن جی نے مجھ سے کہا تھا کہ "تمہاری بھابی انتظار کر رہی ہیں اور کانفرنس کے بعد ہم سب کو گھر لے کر چلیں گے"۔ میری بھابی سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد کرشن جی نے یہ پروگرام بنایا کہ ہم لوگ صبح وارسوا آجائیں۔!

دوسرے دن صبح ہم سب بمبئی روانہ ہوئے جانثار اختر ہم سب کو عصمت آپا کے گھر لے گئے۔ عصمت آپا کا گھر بہت خوب صورت تھا۔ اور سمندر کا نظارہ وہاں سے انتہائی دلفریب تھا۔ میں ناشتہ کر کے گئی تھی مگر عصمت آپا نے بڑے اصرار سے ہم سب کو دوبارہ ناشتہ کرایا اور پھر مجھ سے بولیں "کرصفیہ تو تمہاری استانی ہیں ان کے ساتھ تمہیں مزا نہیں آئے گا چلو میں تمہیں بمبئی کی سیر کراؤں۔"

میں بڑی خوشی سے تیار ہو گئی۔ بھیڑ میں نہانے کا علیحدہ انتظام نہ تھا اس لئے عصمت آپا کے گھر جا کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بال دھوئے بہت دن بعد بال دھوئے تھے اس لئے بُری طرح الجھ گئے تھے مجھے کنگھے سے بال نوچتا دیکھ کر عصمت آپا میرے پاس آئیں کنگھا میرے ہاتھ سے لے کر بڑی شفقت سے بولیں "لاؤ میں سلجھا دوں"۔ پھر انہوں نے بڑی آہستہ آہستہ جلدی سے میرے بال سلجھا دیئے۔ اور بولیں "تمہارے بال اتنے خوب صورت ہیں انہیں باندھنے کی ضرورت نہیں کھلا چھوڑ دو۔۔۔ اور میرے ساتھ آؤ۔"

پھر انہوں نے ٹیکسی منگوائی۔ شاپنگ بیگ لیا۔ راستہ میں مہدی بھائی کا گھر تھا اس لئے پہلے وہ مجھے ان کے گھر لے گئیں۔ کچھ دیر وہاں زہرہ کے پاس بیٹھ کر پھر ہم بازار گئے جہاں سے عصمت آپا نے شاپنگ کی۔ سودا سلف خریدتے ہوئے بولیں "میں زیادہ تر یہیں سے سودا لیتی ہوں"۔ پھر بمبئی کی فلمی زندگی سے سیاست تک پھر راستہ بھر دلچسپ باتیں کرتی

رہیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے میرے لکھنے کے متعلق کچھ سوالات کئے۔ میں نے بہت شرما کر دو چار پرچوں کے نام بتائے جن میں میں لکھا کرتی تھی۔ انہوں نے لکھنے پر بہت ہمت افزائی کی اور کہا یہ بہت اچھی بات ہے کہ تمہارا گھرانا اتنا روشن خیال ہے اور تمہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ جب ہم لوٹے تو دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ آتے ہی ہم نے کھانا کھایا۔ اور پھر ہم لوگ کرشن جی کے گھر جانے کے لئے وارسوا روانہ ہو گئے۔ مجھے عصمت آپا کے ساتھ گذارا ہوا وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا مجھے وہ سب کے لئے ممتا کا ایک سمندر معلوم ہوئیں۔

وارسوا پہنچے تو کرشن جی ہم سب کے منتظر تھے۔ کرشن جی کا گھر ان دنوں سرائے بنا ہوا تھا۔ تلنگانہ کے ادیب ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اوپر کے حصہ میں مجاز، ساحر اور غالباً نیاز حیدر بھی وہیں رہتے تھے۔ مجھے بھابی نے بڑی محبت سے اپنے کمرے میں جگہ دی۔ مجھے بھابی سے ملنے کی جب سے ہی تمنا تھی جب سے میں نے راکھی بھیجی تھی۔ میرے ذہن میں بھابی کا بہت خوب صورت اور دلکش تصور تھا۔ مگر وہ ایک سیدھی سادھی گھرستن نکلیں۔ میری آرزوؤں کے مطابق نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے وہ پسند آئیں۔ ان کی سادگی بے تکلفی اور اخلاق نے مجھے گرویدہ کر لیا۔ وہ انتہائی بے تکلفی اور رانداری سے اپنی گھریلو باتیں کیا کرتی تھیں۔ ان کے سامنے بہت سے مسائل تھے وہ کہانیوں کی دنیا سے بہت دور حقیقت کی ٹھوس اور سنگلاخ دنیا میں رہتی تھیں۔ اس لئے انھیں یہ پسند نہ تھا کہ کرشن جی صرف کہانیوں کے ہو کر رہ جائیں۔ وہ چاہتی تھیں وہ کوئی اور کام بھی کریں۔ ایسا کام جس میں ان کا مالی فائدہ ہو۔ جب میں کرشن جی کی حمایت میں کچھ بولتی تو وہ کہتیں "تم بھی اپنے بھائی کی طرح کہانیوں کی دنیا میں رہتی ہو" شاید وہ سچ ہی کہتی تھیں ہم نے اپنے بہترین تصورات، آرزوئیں۔ اور سپنے۔ اور سب کے لئے اچھی زندگی کا خواب دیکھنے کا نام ہی تو انقلاب رکھا تھا۔

کرشن جی نے اپنی مسہری مجھے خالی کر دی تھی اور وہ خود برآمدے میں ایک چارپائی پر سوتے تھے۔ وہ اتنی لمبی چوڑی مسہری تھی کہ میں نے اس پر لیٹ کر سوچا کہ یہ کرشن جی کی مسہری ہے یا اردو افسانہ نگاری کا میدان! میں نے بھابی سے کہا کہ آپ دونوں بچیوں کو میرے ساتھ سلا دیا کیجیے۔ اکثر جب پلنگوں کی کمی ہوتی تو بھابی خود میرے ساتھ لیٹ جاتیں۔ ہم دونوں رات گئے تک باتیں کیا کرتے۔ دوپہر میں بھی اکثر میں اور بھابی برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کرتے۔ وہ اپنے میکے کا بھی ذکر کیا کرتی تھیں۔ کرشن جی کا چھوٹا سا کنبہ تھا۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔ بچپن میں کاکا بہت پیارا بچہ تھا۔ سارے دن شرارتیں کرتا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیلا کرتا۔ راشدہ کو بھی کاکا بہت پسند آیا تھا۔ لڑکیاں بیحد حساس اور سمجھدار معلوم ہوتی تھیں اور سب بڑی محنت سے اسکول کا کام کیا کرتی تھیں اور صبح سویرے جلدی سے اسکول کے لئے تیار ہو جاتی تھیں۔ مجھے کرشن جی کے گھر کا ماحول اپنے گھر سے ملتا جلتا لگا۔ کیونکہ ابا جی کی سیاسی زندگی میں ہمارا گھر بھی اسی طرح سرائے بنا رہتا تھا۔ اور مستقل مہمان آیا جایا کرتے تھے۔

کرشن جی کے گھر میں گھنے اور لمبے درخت تھے اور گھر سے باہر چمکتی ہوئی ریت اور ناریل کے درخت نظر آتے تھے اور پھر دور تک پانی۔ سمندر کا نظارہ اتنا خوب صورت لگتا تھا کہ جا کر وہاں سے لوٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں، راشدہ اور حسن

اکثر وہاں سمندر کے کنارے جاتے۔ اور خوب صورت سیپیاں اکٹھی کرتے۔

کرشن جی کے گھر میں درختوں کے گھنے اور ٹھنڈے سایوں میں بیٹھ کر واقعی کہانی لکھنے کی آرزو ہوتی تھی اور یہ کوئی تعجب نہیں کہ اس گھر میں کرشن جی نے اتنی بہت سی خوب صورت کہانیاں لکھیں۔

اکثر میں راشدہ، کرشن جی اور احسن سب سیر کی غرض سے بس میں سوار ہو کر اندھیری سے بمبئی جاتے۔ ایک دن بس میں بہت سی مچھیرن عورتیں اور مرد سوار تھے۔ کرشن جی مجھ سے کہنے لگے ان عورتوں اور مردوں کو دیکھو ـــ ایسے خوب صورت جسم بس مچھیروں کے ہی ہو سکتے ہیں۔ محنت ان کی خوبصورتی کا راز ہے ـــ! میں نے غور سے آبنوسی رنگ کے دھوتیوں میں ملبوس مچھیروں کو دیکھا تو مجھے ان کے ملے جیسے بازو دیکھ کر ایسا لگا کہ سمندر کی سب مچھلیاں ان کے بازوؤں میں چھپ گئی ہیں۔ ـــ وہ مرد اور عورتیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہو رہے تھے۔ اتنے صحت مند اور تندرست کہ ان کے کالے رنگ میں زندگی صحت اور چمک تھی جو بجائے خود ایک حسن تھی۔

صبح ناشتہ پر بھابی بہت مزیدار پکوڑے تلا کرتی تھیں۔ میں سیڑھیاں اتر کر جب ان کے باورچی خانے میں جاتی تو بھابی کو ایک سلیقہ مند گھرہستن کے روپ میں دیکھتی۔ صاف ستھرا باورچی خانہ اور چم چم کرتے ہوئے برتن۔ مجھے ہندوؤں کا باورچی خانہ ہمیشہ سے بہت پسند تھا۔ اپنی ہندو سہیلیوں کے گھر بھی مجھے سارے گھر میں باورچی خانہ پسند آیا کرتا تھا اور ان کے چولھے اور چوکے کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے کو جی چاہتا تھا۔ اکثر میں بھابی کے ساتھ پکوڑے تلنے میں اور جب ہم گرم گرم پکوڑے لے کر کمرے میں آتی تو کرشن جی فرش پر آئینہ رکھے شیو بنانے میں مصروف ہوتے۔ وہ جلدی جلدی شیو ختم کرتے اور سب کو ناشتے کے لئے بلاتے یہ کہہ کر پکوڑے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

اکثر جب ہم سب ناشتہ کر رہے ہوتے تو نیاز حیدر ایک عجیب عالم میں کمرے میں داخل ہوتے غالباً زیادہ مصروفیت کی وجہ سے انھیں اپنے حلیہ سے سروکار نہیں رہتا تھا اور صفائی کی طرف زیادہ توجہ دینے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ ایک دن کرشن جی بیزارگی کے عالم میں بولے: "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ روز نہایا کرو یا اجلے کپڑے پہنا کرو، بالوں میں کنگھا کرو یا قمیص کا گریبان بند کرو۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر تم دو وقت نہیں تو صبح ضرور منجن سے دانت صاف کر لیا کرو۔"

میں سب کے لئے پیالیوں میں چائے بناتی نیاز حیدر بالکل سیاہ چائے پیتے۔ کرشن جی کہتے "اتنی کالی چائے صحت کے لئے اچھی نہیں ہوتی ہے" ان کی مراد صحت کے لئے اچھی نہ تھی اور انھیں کوئی کب تک سمجھاتا مگر کرشن جی برابر سمجھائے جاتے تھے۔ نیاز حیدر کہیں باہر سے آتے تو کرشن جی ان سے کئی سوال کرتے کہاں گئے تھے؟ کیوں گئے تھے؟ قسم کے سوال یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ پی کر تو نہیں آئے ہیں۔ نیاز حیدر اس زمانے میں ریڈیوے پالیسی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اور نوجوانوں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی نظم "ساتھیو آؤ کہ ہنگامہ آرائی ہے" بھمڑی کانفرنس میں بہت مقبول ہوئی تھی۔

جب کرشن جی نیاز حیدر، ساحر اور مجاز کو بہت زیادہ پیتے ہوئے دیکھتے تو بہت کڑھتے تھے۔ ایک شام میں

کبھی نہ بھولوں گی جب کرشن جی برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور آہستہ آہستہ غم سے کہہ رہے تھے:" انہوں نے وعدہ کیا تھا مگر آج یہ پھر پی کر آ گئے۔ یہ بڑے دیسی قسم کا ٹھرا پیتے ہیں۔ اپنے کو تباہ کر رہے ہیں۔ کیا کیا جائے نہیں مانتے" یہ بات میں نے ان کے منہ سے بار ہا سنی "یہ اتنے پیارے پیارے لوگ ہیں کیسے اچھے شاعر ہیں مگر یہ سب اپنے کو تباہ کر رہے ہیں۔ انھیں کوئی نہیں روک سکتا کسی کی نہیں سنتے۔"

میں انقلابیوں کے کردار کا یہ رُخ دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی تھی کہ جب یہ اپنے کو نہیں سدھار سکتے تو یہ سماج اور ملک کی حالت بھلا کیا بدلیں گے۔ شاید بھابی ٹھیک ہی کہتی تھیں ہم سب کہانیوں کی دنیا میں رہتے تھے اور انقلاب کی باتیں کرتے تھے۔

ابا جی اور امی جب بمبئی آئے تو خلافت ہاؤس میں مقیم ہوئے پھر ہم لوگ بھی وارسوا سے خلافت ہاؤس چلے گئے۔

بھابی اور کرشن جی نے ہمیں بڑی محبت سے رخصت کیا اور کہا کہ امی اور ابا کو ساتھ لے کر ضرور کسی دن آؤں پھر ایک دن میں امی کو ساتھ لے کر کرشن جی کے گھر گئی۔ امی کو ان کا گھر بہت پسند آیا اور بھابی سے مل کر وہ بہت خوش ہوئیں کرشن جی نے امی سے اس روز بہت دیر تک احسن کے متعلق گفتگو کی۔ اور امی ان کی باتوں سے احسن کے متعلق مطمئن ہو گئیں۔ یہ سچ ہے کہ کرشن جی اگر ہمارے معاملات میں دلچسپی نہ لیتے تو میرا شمار ان ہی لوگوں میں ہوتا جو زندگی بھر شادی نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانے میں میرے خیالات کچھ اس طرح کے تھے انقلابیوں کو محبت اور شادی وغیرہ ہرگز نہیں کرنی چاہیے اور اپنی زندگی انقلاب کے لئے وقف کر دینا چاہیے بہر حال احسن یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ اگر ہم ہاتھ پکڑ کر چلیں گے تو منزل قریب آ جائے گی۔ اس زمانے کی بہت سی باتیں ہیں اور بہت سی یادیں ہیں لیکن اگر میں اپنی ذات کو درمیان میں لائی تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔

شادی کے بعد زندگی کے اکثر خوش کن لمحوں میں، اپنے بچوں کی خوشیوں میں جب میں نے اپنے ماں باپ کو یاد کیا تو کرشن جی کو بھی یاد کیا۔ اور ان کے لئے دعا کی۔

شادی کے تین سال بعد جب ہم لوگ سیالکوٹ آئے تو میں نے سیالکوٹ سے کرشن جی کو خط لکھا۔ کرشن جی نے مجھے لکھا۔ تمہارے سیالکوٹ جانے اور احسن کی ملازمت کا حال جان کر میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ میں تمہاری وجہ سے بڑی ذمہ داری محسوس کرتا تھا۔" پھر انہوں نے نصیحت کی کہ" تم نے ان چند سالوں میں اتنی مشکلات اٹھائی ہیں کہ اب تمہارا حق ہے کہ تم کچھ آرام کرو۔ احسن کی صحت، اپنی تعلیم اور بچے کی دیکھ بھال پر توجہ دو۔"

۵۵ء میں ہندوستان جانا ہوا۔ دہلی میں میرا قیام خالہ کے گھر پر تھا اور بھوپال جاتے ہوئے دو روز کو ٹھہری تھی۔ یہ معلوم ہوا کہ کرشن جی دہلی میں ہیں اور سرلا بہن کے گھر مقیم ہیں میں سرلا بہن سے بھی ملنے کی بہت مشتاق تھی کرشن جی کی آمد کا علم ہوا تو اسی روز صبح سرلا بہن کے گھر گئی۔

سرلا ان دنوں زچگی میں تھیں ایک ننھے سے بچے کو گود میں لئے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں سانولا رنگ بڑی بڑی کالی آنکھیں اور پیاری سی مسکراہٹ۔ دور سے دیکھ کر معلوم ہو جاتا تھا کہ کرشن جی کی بہن ہیں۔ وہ بہت پیار سے ملیں اور ہم بہت جلد

ایک دوسرے سے گھل مل گئے ۔ ان دنوں انہوں نے لکھنا بہت کم کر دیا تھا ۔

کرشن جی کی کشمیری بھاوج بھی مجھے بہت اچھی لگیں ۔ اور جب میں نے ماتا جی کو وہاں دیکھا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ مجھے ماتا جی سے ملنے کی بڑی آرزو تھی ۔ ماتا جی نے مجھے گلے سے لگا کر پیار کیا اور میرے پاس بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتی رہیں ۔ کرشن جی کے بچپن کی باتیں ۔۔۔ کشمیر کی باتیں ۔۔۔ دلی کی باتیں ۔۔۔ ان کی باتوں میں بڑا اچھا لگتا تھا ایسا لگتا تھا جیسے کہانی سنا رہی ہیں ۔ یہ کچھ ان کا ہی اثر تھا کہ ان کے بیٹوں اور بیٹی نے بھی کہانی سے رشتہ جوڑ لیا ۔

جب کرشن جی گھر آئے اور انہوں نے وہاں مجھے بیٹھے دیکھا تو خوشی اور تعجب کا اظہار کیا ۔ میرے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا ۔ پھر احسن کی صحت اور ملازمت وغیرہ کے بارے میں پوچھا پھر میری تعلیم اور سرگرمیاں ۔۔۔ میں نے ان کو ایبٹ آباد اور کاکول کے متعلق بتایا اور وہ یہ جان کر خوش ہوئے کہ ہم لوگ پاکستان میں خوش اور مطمئن ہیں ۔

پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "تمھیں پنجاب کے لوگ کیسے لگے ؟"

میں نے کہا کہ پنجاب کے لوگ بہت اچھے ہیں اور مجھے وہاں محبت ہی محبت ملی ہے ۔ کرشن جی یہ سن کر خوش ہوئے ۔ پنجاب کے لوگوں کی باتیں کرنے لگے " وہاں کے لوگوں میں تمھیں فرق لگتا ہوگا وہاں کے لوگ قد آور، صحت مند اور خوبصورت ہوں گے ۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا وہ بولے ۔ "خالص گھی اور دودھ خوب ملتا ہوگا ۔" ان دنوں واقعی مل جاتا تھا ۔

دوپہر کے کھانے پر ماتا جی نے مزیدار لوبیا کی پھلیاں اور چاول پکائے تھے ۔ انہوں نے کہا " ہم تمھیں آج کشمیری کھانا کھلائیں گے ۔ دستر خوان پر سب لوگ آ گئے اور ہم سب نے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا ۔ کرشن جی دہلی والے گھر کے متعلق بتلانے لگے کہ پہلے ایک زمانے میں وہ منٹو اور مجاز ایک عرصہ تک اسی گھر میں ساتھ رہے ہیں ۔ اس زمانے میں خوب محفلیں جمتی تھیں ۔ سب جمع ہوا کرتے تھے ۔ پھر پوچھا " ہاں فیض بھی تو رہا ہو گئے ہیں تم ان سے ملیں ؟ کیسے ہیں وہ ؟"

فیض صاحب ان ہی دنوں رہا ہوئے تھے مگر میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی ۔ بہر حال سنی سنائی معلومات کی بنا پر میں نے کرشن جی کو ان کے متعلق بتایا اور وہ ان کی خیریت معلوم کر کے خوش ہوئے ۔ پھر کرشن جی نے پنجاب کے کچھ اور ساتھیوں کا پوچھا ان میں سے کچھ کے نام میں نے سن رکھے تھے زیادہ تر کو میں نہیں جانتی تھی اس لئے کہ ہمارا لاہور میں کبھی زیادہ قیام نہیں رہا ۔

کرشن جی ان دنوں بچوں کے لئے کتابیں لکھ رہے تھے چند کتابیں انہوں نے میرے چھوٹے بھائی کو دیں ۔

کرشن جی کو کسی ضروری کام سے جانا تھا مگر انہوں نے ریوتی سرن شرما سے کہا کہ آج وہ کہیں نہیں جائیں گے اور وہ کام کل دیکھا جائے گا ۔ پھر کرشن جی نے مجھ سے کہا کہ " ہم آج تمھیں دہلی کی سیر کرائیں گے تم نے پہلے بھی دہلی دیکھی ہے ؟"

میں نے انھیں بتایا کہ بچپن میں کبھی کبھی امّی اور ابّا کے ساتھ دہلی آنا ہوتا تھا ۔ کہنے لگے اب تو دہلی بالکل بدل گئی ہے ۔ خاص کر نئی دہلی اور شرنارتھیوں کی آبادیاں ہر طرف پھیل گئی ہیں ۔"

انھوں نے ٹیکسی منگوائی اور ہمیں دہلی کی سیر کرائی ۔ انڈیا گیٹ ۔۔۔ اور بہت سی عمارتیں ۔۔۔ نئی دہلی کی خوب صورت سڑکیں اونچے اور گھنے درختوں کا ٹھنڈا سایہ ۔ کرشن جی اس لمحے لاہور کو یاد کرنے لگے ۔۔۔ لاہور کی مال روڈ پھر انھیں مری کی یاد آئی مری کی مال روڈ ۔

چیڑ کے درخت ——— اتفاق سے میں نے اس وقت تک مری نہیں دیکھی تھی کیونکہ ایبٹ آباد کا موسم اتنا اچھا تھا کہ ہمیں کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی۔ کرشن جی کہنے لگے کہ جو بات مری میں تھی وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ وہ نینی تال جاکر کچھ عرصہ گزارنے اور ناول لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

واپسی میں ہم نے ایک ریستوران میں چائے پی۔ میرے بیٹے کے لئے نچلا بیٹھنا مشکل تھا۔ وہ دوڑنا شروع کر دیتا۔ کرشن جی اسے گود میں لے کر شیشے کی الماریوں کے پاس گئے اور کہا کہ تم اپنے لئے مٹھائی پسند کرو ——— اس نے ایک دو پیسٹریاں چنیں اور پھر انہیں توڑ توڑ کر پھینکتا رہا ——— جب وہ توڑ چکا تو کرشن جی نے کچھ اور پیسٹریاں پسند کرنے کو کہا ——— اس کے توڑ توڑ کر پلیٹ میں ڈالنے پر میں نے کہا کرشن جی یہ کھا نہیں رہا ضائع کر رہا ہے ——— کرشن جی نے کہا نہیں وہ ضائع نہیں کر رہا وہ کھیل رہا ہے ——— اسے کھیلنے دو ——— اسے کھیلتا ہوا دیکھنا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے"

واپسی پر انہوں نے ہمیں اردو بازار میں اتارا! خالہ کا گھر گلی میں تھا اور میں نے ان سے کہا کہ میں جامع مسجد کے پاس ہی اتروں گی۔ انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور پھر خدا حافظ کہہ کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے ——— جب ٹیکسی روانہ ہوئی تو میری نظر جامع مسجد کے خوبصورت اور عظیم ستونوں پر پڑی اور میں نے سوچا کہ کرشن جی بھی ویسے ہی بلند اور عظیم ہیں!

یہ مضمون یہاں تک ڈائری خطوط اور یادداشت کی مدد سے کرشن چندر نمبر کے لئے لکھا گیا تھا۔ "شاعر" کا کرشن چندر نمبر شائع ہو رہا تھا۔ مگر پھر ان ہی دنوں جنگ چھڑ گئی اور حالات کچھ ایسے ہوئے کہ یہ مضمون روانہ نہ کیا جا سکا ——— نہ ہی کرشن جی سے خط و کتابت ممکن رہی۔ انہیں میں ہر سال راکھی کے موقعہ پر خاص طور پہ یاد کیا کرتی تھی ——— اور دور بیٹھے ان کے لئے اس روز بہت دعائیں کرتی تھی۔ ایک دور دراز بہن کی راکھی دعا ہی بن جاتی ہے۔

ایک دفعہ سنہ ۴۹ء میں ڈاک کی گڑبڑ سے کرشن جی کو میری راکھی نہ پہنچ سکی تھی انہوں نے مجھے خط لکھا "اب خط لکھ رہا ہوں تو سب سے پہلے ایک شکایت بھی ہو جائے تم سے کہ تم نے راکھی نہیں بھیجی تہوار کے دن تمہاری راکھی کا بہت انتظار کیا۔ بھوپال سے ایک اور راکھی بھی آئی تھی لیکن جس راکھی کا مجھے انتظار تھا وہ نہیں ملی۔ شاید ہم پھوکٹ میں بھائی بنے تھے۔ (بمبئی والوں کی اصطلاح ہے) خیر پھر بھی پھوکٹ کی ایک راکھی تو بھیجی جا سکتی تھی ہم تم سے بے حد خفا ہیں جی ہاں"

سنہ ۶۹ء میں پورے چودہ برس بعد ہندوستان جانے کا موقعہ ملا اتفاق سے جس دن میں نے بمبئی کا سفر کیا وہ راکھی کا دن تھا۔ ریل کے ڈبے میں ہر طرف خوب صورت اور چمکدار راکھیاں نظر آرہی تھیں میرا جی چاہ رہا تھا کہ جلدی سے بمبئی پہنچوں اپنے سب بہن بھائیوں اور امی کو دیکھوں ——— اور کرشن جی کے راکھی باندھوں۔

میں نے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سے پوچھا "کیا آج راکھی ہے" اس نے پیار سے اپنی راکھی کو چھو کر کہا "نہیں جی ——— راکھی کل تھی۔ آج دوسرا دن ہے۔ کل میں اپنی بہن کے گھر گیا تھا۔ آج واپسی ہوئی ہے" میں نے سوچا کہ راکھی کا دن میرا پورا سفر ہی میں گذرا جس دن میں نے سرحد پہ قدم رکھا تھا وہ راکھی کا دن تھا اور آج مجھے ٹرین میں دوسرا دن تھا ——— !

کرشن جی کو راکھی باندھے ہوئے مجھے اکیس برس ہو چکے تھے ـــــ! اور میرا اتنا دل چاہتا تھا کہ انھیں اپنے ہاتھ سے راکھی پہناؤں ڈاک کے جانے کتنے لفافوں میں راکھیاں کھو چکی تھیں اور جب سے پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات خراب ہوئے تھے میری اپنے گھر والوں سے بھی خط و کتابت بند تھی۔ پھر دو پہر کے بارہ بجے بمبئی کا اسٹیشن آیا۔

دوپہر کو کھدّے کی میز پر چودہ برس بعد ہم سب بہن بھائی یکجا ہو کر بیٹھے بچپن میں رام چندر کے بن باس کا حال پڑھ کر میں کہا کرتی تھی کہ نسا کمال کیا۔ سیتا جی ساتھ تھیں لچھمن ساتھ تھے پھر ایسا اچھا جنگل ـــ خوب شریفے اور رام پھل کھایا کرتے ہوں گے۔ اب جب اتنے ہی سال بعد میں ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ یکجا ہوئی تو مجھے وہ چہرہ تڑپ کر یاد آیا جو ہمارے درمیان نہ تھا۔ ابا کا چہرہ ـــ! مگر میں نے ان کا نام بھی نہ لیا۔ اس لئے کہ سب میرے آنے کی خوشی میں گم تھے۔ اور میں سب کو اداس نہیں کرنا چاہتی تھی ـــ!

زہرہ نے مجھے بتایا کہ کرشن جی کا گھر بالکل قریب ہے۔ ہماری سڑک چودہ ہے اور ان کی پندرہ ـــ پھر ہم نے یہ طے کیا کہ شام کو راکھی لے کر چلیں گے۔

شام کو میں راشد احسن اور تزئین کرشن جی کے ہاں گئے۔ کھار کا علاقہ بہت خوب صورت ہے۔ گھنے سایہ دار درخت سڑک کے دونوں طرف تھے۔

جب ہم کرشن جی کے گھر پہنچے تو وہ گھر میں ہی تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کرشن جی ان برسوں میں اتنے بدل گئے تھے اور ان دنوں ان کی صحت بہت خراب ہو رہی تھی۔ کچھ عرصہ ہوا دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اور اس لئے وہ بہت دبلے اور کمزور نظر آ رہے تھے۔

وہ بڑی شفقت سے ہم سب کا حال پوچھتے رہے۔ تزئین کو پیار کیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں نے سلمیٰ بھابی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ "مخدوم کی یاد میں ایک جگہ جلسہ ہے سلمیٰ اس کی صدارت کر رہی ہیں ابھی آ جائیں گی۔"

کرشن جی کا ڈرائنگ روم سلیقہ اور نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا سلمیٰ بھابی کا سلیقہ ہر طرف بول رہا تھا۔ میں نے کرشن جی سے کہا کہ میں آپ کے لئے راکھی لائی ہوں۔ وہ بہت خوش ہو کر بولے "پھر جلدی سے باندھو" اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے ان کے راکھی باندھی انہوں نے مسکراتے ہوئے راکھی کو دیکھا اور کہا "بہت خوب صورت راکھی ہے۔" پھر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اکیس روپیہ میرے ہاتھ پر رکھے۔ ان سے روپیہ لیتے ہوئے اس روز مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

" اب آپ کی طبیعت کیسی رہتی ہے؟"

پھر انہوں نے بتایا کہ "اب تو ٹھیک ہوں مگر بہت بیمار رہا۔ ڈاکٹروں نے ہلنے جلنے اور بولنے چالنے کو بھی منع کر دیا تھا۔ بہت پرہیز کیا مگر اب میں بالکل ٹھیک ہوں ـــ آرام اب بھی کر رہا ہوں۔

میں نے سرلا اور ماتا جی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ماں جی کا انتقال ہو گیا ہے اور جس دن یہاں بمبئی میں

میرا جشن منایا جا رہا تھا اس روز ان کا انتقال ہُوا۔ عجیب بات ہے۔ اور وہ جشن میرے لئے دکھ بن گیا۔

پھر وہ ماتاجی کی بیماری کا تذکرہ کرنے لگے اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں ——!

کرشن جی نے کہا: "اب تم لوگ کھانا کھا کر جانا۔" میں نے کہا: "امّی کھانے پر سب کا انتظار کریں گی۔" اس بات پر بولے: "پھر چائے چلے گی۔" نوکر سے کہا کہ "وہ کشمیری سیب جو کل آئے ہیں لے آؤ —— اور جلدی سے چائے بناؤ۔"

نوکر ایک بڑی پلیٹ میں سیب لایا۔ کرشن جی سیب چھیلنے لگے۔

میں نے کہا: "لائیے میں چھیلوں۔"

انہوں نے کہا: "تم مجھے اس خوشی سے کیوں محروم کرنا چاہتی ہو جو مجھے اس وقت سیب چھیل کر محسوس ہو رہی ہے —— تم لوگ کھاؤ ——" وہ چھیل چھیل کر ہمیں سیب دیتے رہے۔ سرخ سرخ کشمیری سیب دیکھ کر میں نے شرارت سے کہا: "یہ سیب تو ہمارے کشمیر کے ہیں۔"

کرشن جی ہنس پڑے "ہاں کشمیر —— اِکشمیر کے ہیں۔"

اسی لمحہ سلمیٰ بھابی اندر آئیں۔ میں نے انہیں تصویروں میں دیکھا تھا۔

ہم گلے مل لئے تو وہ بولیں: "میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ میں نے آپ کی تصویر دیکھی تھی اور آپ کو بہت پڑھا ہے۔"

میں نے کہا: "میں نے بھی آپ کو بہت پڑھا ہے مگر افسوس اتنے عرصہ سے رسالے آنے جانے بند ہو گئے اس لئے کوئی نئی چیز نہیں پڑھی پھر مجھے نقوش کا پرچہ یاد آیا جو میں ایک طرف رکھ کر بھول گئی تھی میں نے کرشن جی کو دے دیا۔ وہ پرچہ لے کر بہت خوش ہوئے طفیل بھائی کو پوچھا —— اور پھر کہا پاکستان سے اردو کے اتنے اچھے اچھے پرچے نکلتے ہیں کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ بہت زیادتی ہے رسائل ایک جگہ سے دوسری جگہ ضرور آنا چاہیے —— پھر ادب کی باتیں ہونے لگیں ہندوستان اور پاکستان میں اردو کا مستقبل —— سیاست —— جنگ اس روز کرشن جی کی باتیں سن کر مجھے احساس ہُوا کہ ادب کو کوئی تقسیم بھی تقسیم نہیں کر سکی ہے۔ وہ آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں قدم جمائے کھڑے ہیں: "میرا لاہور ——" "میرا پاکستان ——" "اردو ——" اور "وہاں سب میرے ہیں۔" ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن کر میں سوچنے لگی کہ ادب کے لئے کوئی حد ہے۔ نہ مقام۔ نہ وقت ——! ادب تو ازل سے ابد تک کا ایک لامتناہی سمندر ہے۔

سلمیٰ بھابی نے بتایا کہ "جن دنوں جنگ ہو رہی تھی کرشن جی کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ میں ان سے کہا کرتی تمہاری تو سی آئی ڈی میں رپورٹ کرنی چاہئیے کہ تم تو پاکستانی ہو۔ جس دن لاہور پر بمباری ہوئی انہوں نے سارے دن کھانا پیا نہیں۔ سارے دن قالین پر پڑے —— میرا لاہور —— میرا لاہور کہتے رہے۔"

کرشن جی ان کی بات کے جواب میں مسکرا دئیے۔

ہم نے چلنا چاہا تو کرشن جی نے کہا "پھر کسی دن تم سب ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔" سلمیٰ بھابی سے پوچھا: "انہیں

باتیں — ؟

میں نے کہا کل ہم لوگ مجروح بھائی کے ہاں مدعو ہیں۔

" پھر — پرسوں — پرسوں ٹھیک ہے ؟"

" جی ہاں پرسوں ہم ضرور آئیں گے۔ انشاء اللہ!

تیسرے دن ہم سب کرشن جی کے ہاں گئے۔ میں نے احسن سے کہا کہ کرشن جی ابھی بیماری سے اُٹھے ہیں انھیں زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اس لئے ہم لوگ ذرا دیر سے چلیں گے۔ ہم کوئی ساڑھے سات بجے کے قریب وہاں پہنچے۔

سلمٰی بھابی اور کرشن جی کا جوڑا اتنا خوب صورت ہے کہ یہ لگتا ہے کہ قدرت نے اپنے ہاتھ سے یہ جوڑا بنایا ہے۔

کرشن جی نے اس دن بہت سی باتیں کیں۔ وہ بیماری میں بھی اردو کانفرنس کی فکر مول لئے بیٹھے تھے۔ اُردو کے ادیبوں کے مسائل!

کرشن جی نے بتایا کہ بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے پر ہم نے بھی اندرا گاندھی کو مبارک باد کا تار دیا ہے اور اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اب زمینوں کی باری بھی جلدی آنا چاہیے۔ پھر انہوں نے کہا کہ " یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ انھوں نے کہا کہ ترقی کی جانب جب بھی قدم آگے بڑھتا ہے رجعت پسند طاقتیں فوراً بلوے شروع کرا دیتی ہیں۔ ہندو مسلم بلوے شروع ہوتے ہی ہمارا آگے بڑھتا ہوا قدم رک جاتا ہے اور یہ لڑائی جھگڑے اہم قومی کاموں کی توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ اور یہی رجعت پسند طاقتوں کا مفاد ہے۔" کرشن جی نے یہ باتیں اس وقت کہی تھیں جب فسادات شروع نہ ہوئے تھے۔ مجھے بعد میں ان کی باتیں یاد آتی رہیں۔

جن دنوں میں بمبئی میں تھی میں نے یوم مسجد اقصیٰ پر وہ شاندار جلوس دیکھا تھا جس میں سب مذہب اور ملتوں کے لوگ شامل تھے۔ اور پھر میں نے وہ بھیانک باب بھی دیکھا تھا جو احمد آباد اور گجرات کے فسادات کا دردناک باب تھا۔ مگر اس روز کرشن جی کی باتیں سن کر میرے دل میں یہ امید بندھی کہ یہ اندھیرا ایک نہ ایک دن ضرور چھٹ جائے گا۔ سورج کو کون روک سکتا ہے؟ اور انسانیت کا مستقبل روشن ہے۔

سلمٰی بھابی اپنے بھائی اور بہن کو تڑپ کر یاد کرنے لگیں۔ انہوں نے دکھ سے کہا۔ " مجھے اپنی بہن کے گھر جانا اور وہاں پانی کا ایک گلاس پینا بھی نصیب نہیں ہوا۔" میں نے اس لمحہ زہرہ کی طرف دیکھا میرے دل میں بھی یہ حسرت تھی کہ زہرہ میرے گھر نہ آ سکی۔ کاش وہ دن آ سکے جب ہم آزادی سے ایک دوسرے کے گھر آ اور جا سکیں خدا جانے دونوں ملکوں کے تعلقات کبھی اچھے ہوں گے بھی یا نہیں؟

پھر کھانا لگ گیا۔ کھانے پر سلمٰی بھابی نے بہت زیادہ اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے کہا " اتفاق سے آج کل ہمارے پاس ایک بہت اچھا باورچی بھی ہے اور اس لئے مجھے باورچی خانے میں زیادہ نہیں جانا پڑتا۔"

انہوں نے سب کو پلیٹیں دیں اور خود تھال اٹھا لیا۔ میں نے کہا آپ تھال میں کھاتی ہیں۔ ہنس کر بولیں " اس لئے کہ کرشن جی ہوم سِک نہ محسوس کریں۔" پھر کہا " نہیں دراصل یہ بات یہ ہے کہ مجھے ہندوؤں کا کلچر اتنا پسند تھا۔ اور کلچر کی اس تبدیلی کے بجائے

مجھے پتہ چلا کہ یہ شخص اندر سے مسلمان ہے۔ سخت مولوی۔ اور میں مولویوں سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ مگر یہ تو سخت مولوی ——
پاکستانی ہیں اور اس لئے میں تھال میں کھانا کھاتی ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ اکیس برس پہلے جب میں نے کرشن جی کے راکھی باندھی تھی تو میں نے بھی ان کے واسطے سے ہولی کے رنگوں کی پھوار اور دیوالی کے جلتے ہوئے دیپ دیکھنے کی آرزو کی تھی مگر مجھے بھی یہ محسوس ہوا تھا کہ کرشن جی اندر سے مسلمان ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان وہ تو بس انسان ہیں اور سب مصلحتوں کا فرق مٹا کر ان کو ایمان کا جزو بنا چکے ہیں۔

سلمیٰ بھابی کا بیٹا ماشاءاللہ بہت ذہین اور پیارا ہے۔ میرے بیٹے سے اس کی فوراً دوستی ہو گئی اور وہ دونوں اکٹھے گھومنے نکل گئے جب ہم نے چلنے کا ارادہ کیا تو پتہ چلا کہ دونوں غائب ہیں۔

جب وہ دونوں لوٹے تو ہم نے اجازت چاہی اور پھر آنے کا وعدہ کیا مگر میرا ویزا نہ بڑھ سکا اور مجھے دوسرے ہی دن بھوپال روانہ ہونا پڑا۔ بہت سے لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مہندر بھیا سے ملاقات نہ ہو سکنے کا خاص طور پر افسوس رہا عصمت آپا اور قرۃ العین حیدر سے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر مل آئی تھی۔ ان سے بھی دوبارہ ملنے کی آرزو رہ گئی۔

بھوپال جاتے ہی ہمارا ویزا ایک ماہ کے لئے بڑھ گیا۔ ایک ماہ بھوپال گزار کر میں تزئین اور طارق کو ساتھ لے کر دوبارہ بمبئی آئی۔ احسن کو ان کے گھر والوں نے روک لیا اور مجھے اپنی امّی کے پاس رہنا نصیب نہ ہوا تھا میں چند روز اپنی امی اور بہن بھائیوں کے ساتھ گذارنا چاہتی تھی۔

بمبئی کے دوران قیام عارف کی شادی طے پا گئی اور اس سلسلہ میں بھاگ دوڑ کی وجہ سے مجھے کرشن جی کے گھر جانے کا موقعہ نہ مل سکا ایک دن میں اور زہرہ شادی کا بلاوا دینے گئے وقت بہت کم تھا اس لئے ہم دونوں زبانی ہی سب کو بلاوا دیتے پھر رہے تھے۔ کرشن جی کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سلمیٰ بھابی کہیں گئی ہوئی ہیں۔ کرشن جی آرام کر رہے تھے۔ میں نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ اور پھر قدموں کی چاپ کئے بغیر ہم برآمدے میں آ گئے۔ ان کے سیکرٹری صاحب ان کی اردو میں لکھی ہوئی ناول کو دیوناگری رسم الخط میں لکھ رہے تھے۔ میں نے سلمیٰ بھابی کے نام رقعہ لکھ کر سیکرٹری صاحب کو دیا۔

راستے میں سلمیٰ بھابی مل گئیں انہوں نے اندر چلنے اور بیٹھنے پر اصرار کیا مگر ہم بہت جلدی میں تھے شادی کا بلاوا دینے ہمیں مجروح بھائی اور جاں نثار اختر کے ہاں بھی جانا تھا۔ میں نے کہا کہ کسی دن اطمینان سے آؤں گی اور پھر جی بھر کر باتیں ہوں گی۔ مگر افسوس اس کے بعد سلمیٰ بھابی اور کرشن جی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بھاگ دوڑ میں وقت ہی نہ ملا۔ بلکہ امّی سے بھی اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ زہرہ سے بھی بس دوڑتے بھاگتے بات چیت ہو سکی۔ جب ہم دونوں بس میں یا لوکل میں یا کیو میں کھڑے ہوتے تو ہم سب کچھ بھول کر گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے اور باتیں کرنے لگتے کنڈکٹر ہمیں حیران ہو کر دیکھتا اس لئے کہ ہمیں ریزگاری واپس لینے سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ کیو میں کھڑے ہوئے لوگ دیکھتے کہ ہم بس میں چڑھتے کیوں نہیں ہماری وجہ سے پوری قطار رک جاتی تھی۔ ایک دن ایک کلا مار بولا۔ "آپ لوگ آپس میں گھر جا کر باتیں کیجئے گا میں

...دیر سے آپ کے سامنے یہ ساریاں لئے کھڑا ہوں خدا کے لئے پسند کر لیجیے" ۔ ہم اس روز بھائی کی بہو کا سامان خرید رہے تھے ۔ ہم اسے کیا بتلاتے کہ ہم چودہ برس بعد تو ملے ہیں اور اب دو روز بعد اتنے ہی سالوں کے لئے یا اس سے بھی جدائی کا ...ڑ ہمارے درمیان کھڑا ہو جائے گا ۔ مگر یہ چند لمحے ہی تو ہمارے اپنے ہیں !

میں جس دن بمبئی سے رخصت ہوئی وہ دیوالی کا دن تھا ۔ سارا بمبئی روشنی کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا ۔ روانگی سے پہلے میرا ...ن جی اور سلمیٰ بھابی سے ملنے کو بھی بہت ہی چاہا مگر افسوس کہ یہ ممکن نہ ہو سکا ۔

ٹرین چلنے کو ہوئی تو سب بہن بھائی نیچے اتر گئے ۔ زہرہ بولی " آپا میں تو اگلے اسٹیشن کا ٹکٹ لے رہی ہوں ہم ایک گھنٹہ ...ر ساتھ گذار سکتے ہیں !"

میں نے کہا " نہیں ــــ جانِ اب تم اتر جاؤ ۔ آخر تو مجھے جانا ہی ہے اور پھر تم اکیلی خدا جانے کس اسٹیشن پر اترو گی تو مجھے ...رہے گی ۔ میں تمھیں سب بہن بھائیوں کے ساتھ رخصت کرنا چاہتی ہوں " وہ آنکھوں میں آنسو لئے اتر گئی ۔

جب تک اسٹیشن نظر آتا رہا ان سب کے چہرے دکھائی دیتے رہے جہاں تک انسانی طاقت ساتھ دے سکتی تھی وہ ...ب دوڑتے رہے ۔ میرا بیٹا اور بیٹی چلتی ریل میں دروازوں سے لٹکے ہوئے تھے ۔ میں نے دونوں کو بڑی مشکل سے اوپر کھینچا ۔ ...میں نے ڈبے میں سوار مسافروں سے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ آنسو تو اور آنکھوں میں بھی تھے ۔

سفر میں تا حدِ نظر میری آنکھوں کے سامنے روشنیاں جھلمل کرتی رہیں ۔ روشنیاں ہی روشنیاں ـــ ایسا چراغاں میں نے ...ل میں پہلے نہیں دیکھا تھا ۔ کبھی نہ ختم ہونے والا چراغاں ۔ بمبئی سے بھوپال تک کا وہ سفر روشنی کا سفر بن گیا ۔

پھر مجھے وہ سب روشن روشن چہرے معلوم ہوئے ۔ امی کا چہرہ ـــ زہرہ کا چہرہ ـــ راشد، جاوید، عارف اور ناہید ...ت کے چہرے ! کرشن جی کا چہرہ ـــ سلمیٰ بھابی کا چہرہ ـــ !

دیوالی کی روشنی نے میرے دل میں اُمید کا دِیا روشن کر دیا ۔ میں نے سوچا ہماری سرحدیں ایک دن محبت کی ...حدیں بن جائیں گی ۔ دیوالی کی روشنیوں نے اس رات کا اندھیرا ختم کر دیا تھا !

بھوک پریت

جوگندر پال

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

اپنی داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے مجھے تھوڑا سا رو لینے دو۔

تھوڑا سا کیوں برادر؟ خوب خوش ہو کے رو لو۔

نہیں برادر، خوب خوش ہو کے رو تا چلا گیا تو تمہیں اپنی داستان بھول جائے گی۔

ہاں، داستان بھول گئی تو میرے پاس سنانے کو کیا رہے گا؟

لیکن تمہاری داستان ایسے طربیہ مقام پر آپہنچی ہے برادر، کہ میرے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے۔

ہاں برادر، خوشی کے موقع پر جو تھوڑا سا رو لیتا ہے اُس کا دکھ میں بھی ہنسنا بنا رہتا ہے۔

نہیں، اتنی عاقبت اندیشی سے کام لوگے تو اپنی عاقبت کو خواہ مخواہ بگاڑ لوگے۔

وہ تو بگڑ ہی چکی ہے برادر۔

پوری داستان سناؤ برادر، داستان کا اختتام تو تم پہلے بھی بتا چکے ہو۔

ہاں، جب ساری داستان پیش آ چکے تو اُسے سنانا ہی باقی رہ جاتا ہے ——— تو پھر یہ ہوا برادر، کہ شہزادی نے میرے گلے میں اپنی باہیں حمائل کر دیں۔ خدام نے حکومت کا تخت اپنی جگہ سے اُٹھا کر وہیں ہمارے پیچھے لا رکھا اور اُس تخت پر نیم دراز ہو کر ہم محبت کرنے لگے ———

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

مجھے رونا آ رہا ہے کہ میرے ساتھ بھی یہ سب کچھ پیش کیوں نہ آیا۔

روتے ہو برادر، نہ داستان کو آگے بڑھنے دیتے ہو۔

تمہاری داستان تو وہاں آ ہی پہنچی ہے جہاں اسے پہنچنا ہے ——— لو بھوکے ہو تو کھجور کھا لو۔

بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔

ہاں، یہ لو یہ پانی بھی پی لو۔

بڑا میٹھا پانی ہے برادر — اب اپنی داستان آگے بڑھاتا ہوں۔
وہ تو یہاں آ ہی پہنچی ہے۔
کہاں؟
اس صحرا میں، جہاں ہم بیٹھے ہوتے ہیں۔
ہاں برادر، ٹھہرو مجھے بھی قرار دے لینے دو۔
تم یہاں اپنی شہزادی کی گود میں سر دھر لو اور میں یہاں تمہاری ہی گود میں سر دھر کر بساط بھر رو لیتا ہوں۔
ٹھہرو برادر، پہلے مجھے آرام سے اپنا سر کہیں ٹکا لینے دو، پھر تم میری گود میں اپنی جگہ بنا لو — لیکن — یہ کیا برادر؟ تمہارے تو گود ہی نہیں۔
ہاں! — ارے ہاں! — میری گود برادر؟
اپنی ساری داستان یاد کرو برادر — یاد کرو، تمہاری گود کہاں رہ گئی؟
اور کہاں رہے گی؟ — وہیں حکومت کے تخت پر شہزادی کے سر کے نیچے۔
اور تم اُسے بڑے آرام سے وہیں بھول آئے؟
ہاں، بھول تو آیا برادر! شہزادی کے بال اتنے گھنے تھے کہ وہاں سے اٹھتے ہوئے کہیں دکھائی ہی نہ دی۔
یہ تو بہت برا ہوا برادر۔
ہاں، برا تو ہوا برادر۔
اب ایک ہی چارہ ہے: شہزادی کو ڈھونڈو، ورنہ تمہارے گود ہی نہ رہی تو جی کر کیا کرو گے؟
بس جی لوں گا برادر۔
پر جیو گے بھی کیسے؟
ہاں، جیوں گا بھی کیسے؟
جینا ہے تو پہلے اپنی گود کو ڈھونڈو۔
کہاں ڈھونڈوں، برادر؟
حکومت کے تخت پر!
حکومت کے طلسمی تخت کی طرف جو بھی بڑھتا ہے برادر، تخت اُسے واپس اچھال دیتا ہے۔
تو پھر اُن خدام کو ڈھونڈو، کہ تخت تمہاری پشت پر ڈال جائیں۔
وہ خدام تو شہزادی کے محل میں ہیں۔
اور شہزادی کا محل؟

میرے خیال میں، برادر۔
اور تمہارا خیال، برادر؟
میرے پاس ہی ہے پر پتہ نہیں کہاں ہے۔
تمہارے پاس ہی ہے برادر، تو تمہارے پاس ہی ہوگا۔
پتہ ہی نہیں کہاں ہے برادر، تو کیا پتہ، کہاں ہوگا؟
ٹھہرو برادر۔
ٹھہر گیا برادر۔
اگر تمہارا خیال بھی تم سے کھو گیا ہے تو پھر کیا فکر، کہ تم نے کیا کیا کھویا ہے؟
ہاں برادر، تمہاری بات لگتی تو ٹھیک ہے۔
تو پھر مزے سے اپنی داستان کو آگے بڑھاؤ۔
آگے کیسے بڑھاؤں برادر، اُسے تو جہاں پہنچنا تھا، پہنچ لی۔
ہاں، اِس صحرا میں۔
ہاں برادر، اب ایک یہی ممکن ہے کہ پیچھے جا کے پھر یہاں تک آجاؤں۔
ہاں، یہاں سے آگے کی کیا خبر؟
ہاں برادر، جو کچھ ابھی پیش ہی نہیں آیا اس کی کسے خبر؟
ٹھہرو برادر۔
ٹھہر گیا برادر۔
مجھے خبر ہے کہ آگے جا کے ہمارے ساتھ کیا پیش آئے گا۔
کیا پیش آئے گا، برادر؟
ہم اِس صحرا سے نکلنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔
تو پھر آؤ برادر، آگے ہی چلیں۔
نہیں برادر، تم پیچھے جاؤ کہ تم پیچھے سے ہی آئے ہو۔
اور تم برادر؟
میں کہیں سے بھی نہیں آیا برادر، اس لئے چلتا ہوں اپنے آگے کہیں بھی جا پہنچوں گا۔
کیا تمھیں اجنبیوں سے خوف محسوس نہ ہوگا؟
نہیں برادر، میں کسی سے بھی مانوس نہیں ہوں، اِس لئے مجھے کوئی بھی اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔
تو پھر چلو برادر، ہم ایک دوسرے کی طرف پیٹھ موڑ کے اپنے اپنے سفر پر تیز گام روانہ ہو جائیں۔

ہاں چلو ——

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

تم کہاں سے ہو کے آ رہے ہو؟

شہزادی کے محل سے۔

تعجب ہے!

نہیں برادر، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میرا منہ غلطی سے ادھر گھوم گیا اور تمہارا۔ اُدھر۔

لیکن میں بھی شہزادی کے محل سے ہی ہو کر آ رہا ہوں۔

تعجب ہے!

نہیں برادر، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ یہ راستہ بھی شہزادی کے محل کو ہی جاتا ہو گا۔

ہاں، جاتا تو ہو گا برادر، نہیں تو تم وہاں کیسے جا پہنچتے؟

ہاں، سبھی راستے شہزادی کے محل کو ہی جاتے ہیں۔

ہاں، وہ راستے بھی جن پہ ابھی ہمارا جانا نہیں ہوا۔

ہاں، کسی بھی راستے پر نکل پڑو، وہیں جا پہنچو گے۔

ہاں برادر، کسی بھی راستے سے لوٹ آؤ۔

ہاں برادر، لیکن لوٹ ضرور آؤ۔

ہاں، ورنہ بچھڑ جاؤ گے۔

نہیں، ابھی تو لوٹے ہیں ابھی بچھڑنے کا ذکر مت چھیڑو۔

ہاں، بچھڑنے کا ذکر چھیڑو ہیں گے تو ملیں گے کیسے؟

ہاں برادر، ملن کا ذکر چھیڑو —— کیا تم میری شہزادی سے مل آتے ہو؟

مل تو آیا ہوں برادر ——

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

پہلے مجھے بتاؤ ——

نہیں۔ پہلے میری سنو برادر —— تمہاری گود میں شہزادی کے بالوں کے نیچے دبی پڑی تھی۔ میں نے چپکے سے اُسے اٹھا لیا

بہ آہستہ آہستہ اپنی گود میں بھول آیا۔

بت تیرے کی! ــــ تو پھر میں تمہاری ہی گود کو اپنی سمجھ کے اٹھا لایا ہوں۔
میری ہی گود میں پڑے ہو برادر، اسی لئے مجھے اتنے اچھے لگ رہے ہو۔
اور تم مجھے، برادر۔
اور ایک دوسرے کی گود میں پڑے پڑے ہم یہاں جنت میں آپہنچے ہیں۔
ہاں برادر، نخلستان اپنے ہزار قدموں سے چل کر خود آپ یہاں آپہنچا ہے۔
اور خدام نے ہمارے نیچے حکومت کا تخت ڈال دیا ہے۔
نہیں برادر، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھو، وگرنہ یہ طلسمی تخت تمہیں واپس اچھال دے گا۔
ہاں، ہم اپنے خیال سے اچھل گئے برادر، تو کسی کام کے نہ رہیں گے۔
اچھل بھی آئے تو کیا مضائقہ ہے برادر۔
ہاں، اپنے خیال سے اچھل کر باہر آگئے تو نفع کیا اور نقصان کیا؟
نفع اور نقصان کو چھوڑو برادر، یہ لو یہ کھجور کھاؤ۔
بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔
ہاں، یہ لو یہ پانی پیو۔
بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔
ہاں ــــ اب سو جاؤ۔
بڑی نیند آرہی ہے برادر۔
ٹھہرو برادر۔
ٹھہر گیا برادر
اگر ہم سو گئے تو ہمیں جگائے گا کون؟
جو سلاتا ہے وہی جگا بھی دیتا ہے۔
تو آؤ، سو جائیں۔
ہاں برادر، سو جائیں۔
کیا تم سو گئے ہو برادر؟
نہیں برادر، شہزادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔
لیکن مجھے تو لگ رہا ہے کہ سو رہے ہو۔
ہاں برادر، شہزادی کے بال اتنے گہرے ہیں کہ نیند میں اترنے کا احساس ہوتا ہے۔

ہاں برادر، اور چہرہ اتنا شفاف کہ نیند میں ڈوب کر بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سطح کے نیچے نہیں گئے ہیں۔
ہاں، ہم خواب میں بھی اُسے دیکھتے رہتے ہیں۔
ہاں، اور وہ ہمیں۔
ہاں، ہم سو جاتے ہیں تو ہماری قسمت جاگ پڑتی ہے۔
ہاں، ہماری خوابیدگی میں چاند سے دھن برسنے لگتا ہے۔
تو آؤ برادر، چپکے سے سو جائیں۔
ہاں آؤ——نہیں، اُدھر نہیں برادر، اِدھر آؤ۔
ہاں، اُدھر تو نیند ابھی جاگ رہی ہے۔
ہاں، جاگ رہی ہے تو چوروں کو اپنے اندر کیوں کر گھسنے دے گی؟
ٹھہرو برادر۔
ٹھہر گیا برادر۔
بھوک نے پھر میرے کلیجے میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا ہے۔
لو برادر، کھجور کھاؤ، ورنہ بھوک تمہارا کلیجہ کھائے گی۔
بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔
یہ لو یہ پانی بھی پی لو۔
بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔
ہاں، اب سو جاؤ۔
ہاں، اب تو آنکھوں کے کواڑ اپنے آپ بند ہو رہے ہیں۔
ہاں، وقت آ گیا ہے برادر، اب چپکے سے نیند کے باطن میں داخل ہو جاؤ۔
لیکن کواڑ بند ہو گئے برادر، تو باہر کیسے نکلو گے؟
لیکن برادر، اندر داخل ہی نہ ہوئے تو باہر کیسے نکلو گے؟
ہاں——تو شب بخیر برادر!——میں چلتا ہوں۔
ہاں، جاؤ۔
ہاں، چلتا ہوں۔
پھر آ گئے برادر، گئے بھی نہیں کہ پلٹ آئے ہو۔
خدا کا شکر ادا کرو برادر، کہ پلٹ آیا ہوں، نہیں تو پل ہی پل میں ہزاروں کوس کی مسافت طے کر کے کون پلٹتا ہے؟

ہاں! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لوٹ آئے ہو۔ مگر برادر گئے کہاں تھے؟

کہیں نہیں برادر، بس شہزادی کی رفاقت میں حکومت کے تخت پر ہوا میں پرواز کرتا رہا، اور یہ واہمہ کر رہا تھا کہ اچانک تمہاری آواز سنائی دی اور تمہیں کوس کوس کر اس طرح تخت سے نیچے قدم رکھا جیسے ابھی زمین پر ہی تھا۔

لیکن تم تھے تو ہوا میں ہی۔

ہاں، اور کہاں؟

تو اچھا ہی ہوا برادر، کہ زمین پر لوٹ آئے۔ خدا نے ہمیں پر عطا نہیں کئے تو اُس کی رضا یہی ہے کہ ہم دھرتی پر پڑے رہیں۔

پر دھرتی پر نیند نہیں آتی برادر۔

ہاں، یا آتی ہے تو یہی خوف لاحق رہتا ہے کہ اب آنکھیں نہیں کھولیں گے۔

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

بھوک مجھے پھر تنگ کر رہی ہے۔

تو کیا ہوا برادر، لو یہ کھجور کھالو۔

بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔

لو پانی بھی پی لو۔

بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔

پیٹ بھر گیا ہے تو اپنی شہزادی کی داستان شروع کر دو برادر۔

شہزادی کی داستان شروع کر دوں؟

ہاں برادر۔

اگر مجھے اجازت دو برادر، تو حرف بحرف سچائی بیان کر دوں۔

ہاں برادر، خدا کا فرمان ہے کہ ہمیشہ سچ بولو۔

تو سچی بات یہ ہے برادر، کہ اپنی خوشی کے لئے میں نے ہمیشہ جھوٹ بولا ہے۔

اسی لئے خدا نے تمہیں اس بے کراں صحرا میں دھکیل دیا ہے۔

ہاں برادر، اور تمہیں بھی۔

ہاں مجھے بھی، برادر ــــ لو اور کھجور کھالو، بھوک سے دیوانے ہوئے جا رہے ہو۔

ریت کی اسی مٹھی کو پرے ہٹاؤ برادر ـــــ اور مجھے سو جانے دو۔

ہاں برادر، آنکھ لگ کر نہ بھی کھلی تو کون سی کھجور آ جائے گی؟

مارگزیدہ

سائرہ ہاشمی

ڈاکٹر ڈوسے بات کرنے سے پہلے مجھے احساس کی اس شدت کا گمان تک بھی نہ تھا۔ میں تو بس یونہی مینٹل ڈیپ پیشنٹ چلا آیا تھا۔

میرے ذہن کے اس خوابیدہ گوشے کو رات راحیلہ کی دہکتی قربت نے جگایا تھا اور پھر برسوں پہلے کا ایک عریاں جسم مجھے یاد آ گیا تھا۔ ایک نادر مجسمہ جو آنکھیں بند کئے میرے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن سفر کا وہ ایک قدم میرے لئے کڑے کوس بن گیا تھا اور میں نے گھبرا کر اپنی آنکھوں کو بند کر لیا تھا۔ اور ندرت کو اپنے گھر سے چلے جانے کو کہا تھا۔ اُس کی خوب صورت آنکھیں حیرانی اور شرم سے پھیل گئی تھیں۔ اُس کے آنسو اُس کی گالوں پر بہنے لگے تھے۔ اُس کے ہونٹ کپکپا کر ساکت ہو گئے تھے۔ میں نے بند آنکھوں سے ہی چیخ کر کہا تھا۔ "چلی جاؤ ندرت، چلی جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری کوئی خواہش نہیں۔ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ دوبارہ یہاں نہ آنا۔" اور پھر وہ چلی گئی۔ اور جب اُس کے بھاگتے قدموں کی چاپ ڈوب گئی تو میں یوں بیٹھا رہ گیا تھا۔ جیسے اِس لمحے سے پہلے اور بعد میں کوئی لمحہ اتنا زندہ نہیں تھا۔ وہ لمحہ جو اپنی تخلیق کی ساعت میں قید ہو گیا تھا۔

اکثر جب میں جام کو ہاتھ میں لئے پینے لگتا ہوں یا اپنے کمرے کی نیم تاریک روشنی میں کسی دوشیزہ سے بہت ہی خوب صورت باتیں کرتا ہوں تو وہ لمحہ کہیں نہ کہیں سے آ کر میرے سامنے ٹھہر جاتا ہے۔ پھر میرے ہاتھ ایک لمحہ کے لئے کانپ جاتے ہیں۔ اور ٹھنڈ کی تکلیف دہ لہر مجھے ہراساں کر دیتی ہے۔ حالانکہ ندرت سے میں نے انتقام لیا تھا۔

ایسی ہی لہر میں نے رات محسوس کی تھی جب راحیلہ کے کمرے میں بیٹھ کر میں نے آنے والے دل پسند لمحوں کی دھند سے راحیلہ کو جھانکا تھا۔ اور پھر وہی لمحہ کہیں سے آن کر میرے ذہن پر رقصاں ہو گیا۔ میں گھبرا کر بغیر معذرت کئے، یا خدا حافظ کہے، انٹر کانٹی نینٹل کے ملبے کاریڈار سے بھاگتا باہر آ گیا تھا۔ وہ لمحہ جو ندرت کی مانند ہی بے ضرر تھا لیکن انوکھا، میری دسترس سے دُور اور پرے۔ میری مضبوط گرفت میں نہ آنے والا۔

اُس روز مسز رفاقت نے فون پر کہا تھا۔ "مائی سویٹ بوائے راحیلہ گھر لوٹ کر اُس سے بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان ہے۔ اس لئے اس کو بہلانے کے لئے میں نے چند قریبی دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ ضرور آنا۔"

اور جب میں نے انٹر کون کا گیسٹ عبور کیا ہے تو میں آنے والے وقت کی خوب صورتی سے دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ ارغوانی مے۔ خوبصورت ماحول۔ جوان جسم اور پھر بے باک قہقہے۔ انٹر کون کی خوبصورت عمارت پوری طرح روشنیوں کی زد میں تھی لیکن کمروں میں کہیں کہیں جلتے لیمپ۔ ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی ملی آنکھوں سے اشارہ کر رہا ہو۔ بلا رہا ہو۔

درختوں کے نیچے یو۔ بی۔ ایل کے روشن نیون سائن بورڈ تھے۔ اور سرخ لائٹس میں لکھا ہوا ہوٹل کا نام اس طرح لگ رہا تھا جیسے تازہ خون کی سرخی منجمد ہو گئی ہو۔ درختوں کی شاخوں میں اُلجھا ہوا اور مٹا مٹا اندھیرا تھا۔ اور درختوں کے اوپر اندھیرے کا دبیز جال تھا۔ اپنی گاڑی کو لاک کرتے ہوئے میں ایک بہت ہی ماڈرن دھن گنگنا رہا تھا۔ جب بار میں گیا ہوں تو بیرا ٹرے میں بوتل اور گلاس رکھے جا رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر مسز رفاقت نے کہا تھا۔

یونانی بوائے تم ہمیشہ دیر سے آتے ہو۔ راحیلہ تمہارا انتظار کرتے کرتے بور ہو رہی ہے۔

میں نے جھک کر مسز رفاقت کی گال پہ ایک بھرپور بوسہ لیا تھا۔ اور راحیلہ کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

راحیلہ نے جب میرا ہاتھ پکڑا تو وہ بہت ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

اسلم صاحب۔ آپ وقت کی اہمیت سے بالکل غافل لگتے ہیں۔ بہت انتظار کروایا۔ راحیلہ نے برف کی ڈلی میرے گلاس میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔

میں ہنس دیا تھا اور زمرد کو دیکھنے لگا تھا جو گلاس کو پکڑے پاؤں سے تال دیتی سوچوں میں گم تھی۔ اُس نے خالی گلاس کو زور سے تپائی پر رکھا اور کھڑی ہو گئی۔

میوزک کے خوابناک لہریے دل کو دھڑکاتے ہوئے ہمارے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ جیسے کوئی خوب صورت روح اس ہال کی چار دیواری سے اُٹھ کر فضائے بسیط میں گم ہونا چاہتی ہو۔ اونچی۔ بہت اُونچی۔ بہت دور۔ نیلے آسمان کی پہنائیوں سے بھی پرے۔ وہاں پر موجود سب لوگ خوش تھے۔ ہمارے پاس خوب صورت جسموں کی گرمی تھی۔ اور پھر ہم سب جو ایک دوسرے سے اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے اُٹھ کر زمرد کے خوب صورت جسم کے گرد اپنے بازو ڈال دیے اور تیز سروں کا ساتھ دیتے ہوئے گھومنے لگے تھے۔ راحیلہ نے اپنی آنکھیں بند کر کے سر کو صوفے کی پشت پہ رکھا ہوا تھا۔ اور مسز رفاقت فخرالدین کے ساتھ لگی بیٹھی پی رہی تھیں۔ ہم سب آگے پیچھے گھومتے جا رہے تھے۔

زمرد جی آپ کا جسم واقعی ڈانس کے لئے بنا ہے۔ اگر آپ ڈانس نہ کرتیں تو یہ آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہوتی۔ آپ کو بازوؤں میں لے کر محسوس ہوتا ہے کہ جسم کا گداز اور لوچ کیا معنی رکھتا ہے۔

اُس نے جھٹکے سے اپنے آپ کو مجھ سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

تم جانتے ہو کہ عورت کو کیسے خوش کیا جاتا ہے۔ اسی لئے تم مجھے اچھے بھی لگتے ہو لیکن میں خوش ہونے کے موڈ میں نہیں ہوں مجھے کئی دنوں سے کوئی کنٹریکٹ نہیں ملا۔ اس لئے چپ چاپ ناچتے جاؤ۔ اُس نے کونٹر کے پاس جا کر نیا گلاس اُٹھایا اور میرے کندھے کے ساتھ سر لگا دیا۔

اور جب میں اپنے آپ سے خوش خوب صورت جسم کی لذت سے مسحور ہو رہا تھا تو مجھے قدرت کی حیران اور روتی ہوئی آنکھیں

بار کے چاروں طرف سے جھانکتی نظر آنے لگیں۔ اور میرے بازو زمرد کے جسم کے ساتھ لگے اکڑ سے گئے تھے۔ اُس محرومی سے خوفزدہ سے جو ندرت کی یاد سے وابستہ تھی۔ میں نے زمرد کو اپنے اور بھی نزدیک کر لیا تھا۔ میں اِس جسم سے لگا اُس جسم کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جو کبھی بھی پوری طرح میری گرفت میں نہیں آیا تھا اور جس کی یاد مجھے اُس پیاسے کی یاد دلاتی تھی جو انتہائی تشنہ لبوں تک نہ پہنچ سکا ہو۔ وہ جسم ایسا ہی تو پیاسا تھا۔ وہ ایسا ہی تو مجھ تھا۔ اور پھر میں خوفزدہ ہو کر زمرد کی تپش کے باوجود سرد ہو گیا تھا۔

یہ آنکھیں۔ . . . . یہ آنکھیں مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتی ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

اور زمرد کہہ رہی تھی۔ "وہ پروڈیوسر کا بچہ ابھی تک نہیں آیا۔ اُسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔"

اور مسز رفاقت کہہ رہی تھیں۔ "بے بی میں تمہاری بے چینی سمجھتی ہوں تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور جب گھٹتے تال کے ساتھ میں راحیلہ کے پاس بیٹھا ہوں تو میں نے گذری باتوں کو اپنے ذہن سے پوری طرح جھٹک دینا چاہا تھا۔ میں ندرت کے بارے میں تو کم از کم کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ایسا ورق تھا جس پر میں اپنے حسب مرضی کوئی تحریر نہیں لکھ سکا تھا۔ میں تو اُسے ایسا صفحہ سمجھنا چاہتا تھا جو ہوا کی تیزی میں اُڑتا کہیں گم ہو گیا ہو۔ بغیر کوئی سوچ چھوڑے۔ لیکن مکمل راحت کے اُس ماحول میں گھرا میں اُس کی پھڑپھڑاہٹ کو سن رہا تھا۔ میں نے راحیلہ کے اُداس چہرے کو دیکھ کر کہا تھا۔

"راحیلہ ان خوب صورت لمحوں کو یوں ضائع کیوں کر رہی ہو۔ کیا یہ سب خوب صورتیاں اور مسرتیں تمہارے دل کو خوش نہیں کر سکتیں۔ میں نے بظاہر یہ لفظ راحیلہ سے کہے تھے لیکن میں اپنے دل کے اندر اُس برف کی سِل کو پگھلانا چاہتا تھا جو ندرت کی آنکھوں کے تصور سے میرے اندر اُتر آئی تھی۔ وہ مجھے کیوں یاد آ رہی تھی؟

راحیلہ نے میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ سامنے روشنی کے مدھم گلوب کو دیکھ رہی تھی اور جب میں نے جھک کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کی آنکھیں نم آلود تھیں۔ ندرت کی آنکھیں . . . . . ندرت کی آنکھیں۔ نہیں تو۔ . . . نہیں تو۔

"اسلم صاحب ایسی عورت کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ جس کا شوہر اُس کو ٹھکرا چکا ہو۔ جس کا بچہ اُس سے بچھڑ چکا ہو۔ جس کی زندگی کو لامتناہی اکیلے پن اور دُکھ کا سامنا ہو۔ اُس نے گلاس کو پاس پڑی تپائی پہ رکھ دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی گود میں رکھ کر خاموش ہو گئی۔

اُس کی گود میں پڑے دو ساکن ہاتھ مجھے اُن ہاتھوں کی یاد دلا رہے تھے جو ندرت کے چہرے پہ دھرے تھے۔ میں اُن ہاتھوں کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اُس جسم کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی شدید خواہش کے باوجود میں نے اُسے ٹھکرا دیا تھا۔ اُس وقت میں نے سوچا تھا۔ عورت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سب عورتیں برابر ہی تو ہیں اور پھر میں نے اپنی اَنا کی اتنی بڑی قیمت وصول کر لی تھی۔ مجھے تو بہت خوش ہونا چاہیے تھا۔ پر نجانے کیا بات تھی کہ میں ندرت کے تصور کے ساتھ ہمیشہ خوفزدہ اور ٹھنڈا ہو جاتا ہوں۔ کیا میرا یہ گناہ دوسرے گناہوں سے مختلف اور انوکھا تھا۔ میں سوچنا چاہتا۔ لیکن میرا ذہن منجمد ہونے لگتا اور میں گھبرا کر کسی بہت ہی ضروری کام میں اپنے آپ کو لگا کر اُسے بھول جانے کی کوشش کرتا۔ اُس جسم کے بارے میں میں

کیوں سوچتا جاتا تھا جو پوری طرح میری انگلیوں کی پوروں سے مَس بھی نہیں ہُوا تھا۔ وہاں بیٹھے مجھے فاروق یاد آ
چند دنوں بعد میرے دوست فاروق نے آ کر کہا تھا معلوم ہے دوست ندرت کا کیا حال ہے ؟
میں نے کبھی کبھار اُس کے متعلق سوچا تو تھا۔ لیکن میں اُس کی یاد کی کسی گرفت میں قید نہیں تھا۔ شکست
شکست خوردگی کی نشانی ہے۔

کیوں کیا ہُوا اُسے؟ میں نے اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے اُن آخری ساعتوں کو یاد کیا تھا اور مسکرا کر فاروق۔
وہ پاگل ہو گئی ہے اور زنجیروں میں بندھی اپنے سر کو چاروں طرف پٹکتی ہوئی کہتی رہتی ہے " روشنی بند
بند کرو۔ کیا تم دیکھ نہیں سکتے کہ میں عُریاں ہوں۔ میں کتنی عُریاں ہوں۔ اور تم یوں بے تعلقی سے کھڑے میرا تماشا دیکھ رہے
روشنیاں گل کر دو۔ اندھیرے میں روح کے گھاؤ نظر نہیں آتے۔ اندھیرا تو ایسا نقاب ہے جو سب کچھ چھپا لیتا ہے
چیخ چیخ کے رونا شروع کر دیتی ہے۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کو چہرے پر رکھ لیتی ہے۔ شائد اس کو اپنی دونوں
کا اندھیرا مطمئن کر دیتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی ساکت آنکھوں سے چپ چاپ اپنے سامنے دیکھنے لگتی ہے اور دیکھتے ہی
اور پھر جانتے ہو کیا ہوتا ہے۔ ندرت کی امی اس کی ساکت آنکھوں پر پیار کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

میری بچی۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ اپنی ماں کو دیکھو میری ندرت . . . . . اور ندرت بڑبڑانے لگتی ہے۔
" روشنی میں جسم عُریاں ہو جاتا ہے۔ روشنی بجھا دو۔ روشنی بجھا دو"
فاروق کی آواز کسی اندرونی غم سے بوجھل تھی۔

اور میں جو ان گزشت لذتوں سے آشنا۔ اپنے گمان میں قید اس ساری بات کو ایک عام واقعہ سمجھنے کی کوشش
پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ میں نے فاروق سے بہت کچھ پوچھنا چاہا تھا۔ لیکن میں تو ہنس بھی نہیں سکا تھا۔ حالانکہ میں نے
سے قہقہے لگانے چاہے تھے۔ میں نے اپنی فتوحات کی لسٹ میں ایک اور جسم کا اضافہ کرنا چاہا تھا . . . لیکن میرا دا
تھا۔ اور میں خالی خالی نظروں سے فاروق کو دیکھنے لگا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہ گئے تھے۔

فاروق کے جانے کے بعد میں نے اپنے سامنے رکھی کھلی فائل کو آگے بڑھا کر پڑھنا چاہا تھا۔ جس کے لئے میرا
دفتر آ چکا تھا۔ لیکن میں ندرت کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے تو درجنوں لڑکیوں کی منتیں سُنی تھیں۔ میں نے تو عورت کو ہمیشہ ہی ایک کھلونا سمجھا تھا۔ ایسا کھلونا جو
جا سکتا ہو۔ میں نے محبت کے خوب صورت لفظوں کو خراج سمجھ کر لیا تھا۔ لیکن یہ کیا ہوا کہ اس سب سے بڑے خراج کو
ہوسے میں بکھر کر رہ گیا تھا۔

پھر میں آفس ٹائم سے بہت پہلے ہی اُٹھ کر گھر آ گیا۔ میں نے سر جھٹک کر اُس تکلیف دہ سوچ کو اپنے ذہن سے
کوشش کی تھی۔ اُس ہنسی کو بھولنا چاہا تھا جو ندرت کے لبوں سے میں نے سُنی تھی۔ ان آنکھوں کی پُرکشش چمک کو مٹا دینا
میرے لاشعور میں نہ جانے کیوں محفوظ ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا " ندرت کیا تھی۔ ندرت تو کچھ بھی نہیں تھی۔

زندگی میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ اُن درجنوں عورتوں کی طرح جو صرف ایک رات کا ساتھ تھیں اور جن کو میں نے دوبارہ کبھی ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔" پر میں اپنے کمرے میں بیٹھا چُپ چاپ اُس کے متعلق سوچنے لگا۔ ندرت جو روشنی میں اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتی۔ ندرت جو روشنی سے ڈر کر اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے۔ ندرت جو سراپا روشنی تھی اور میں نے اُس روشنی کو گُل کرنے کے لئے بڑی تگ و دو کی تھی اور "آخر کار میں نے اس روشنی کو گُل کر ہی دیا نا۔" میں نے ہنس کر اپنے آپ کو خوش کرنا چاہا تھا لیکن کوشش کے باوجود میں ہنس نہیں سکا تھا۔ میں اپنی انا کی چکاچوند میں گھِرا سب کو شکست دینا چاہتا ہوں۔ کسی کے مجھ سے آگے بڑھے ہوئے دو قدم مجھے مشتعل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ میں تو اپنے میں ہمیشہ ہی خوش رہا تھا۔ لیکن اُس روز اپنی انا کے اندھیرے اور سیاہ رُخ کو دیکھ رہا تھا۔

سگریٹوں کے آدھ جلے ٹکڑے میرے ایش ٹرے میں پڑے سُلگ رہے تھے۔ اور میرے دل پر ایسا بوجھ تھا جو میری ناپسندیدگی کے باوجود میرے سینے میں ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان تمام جسموں کی قطار میں صرف ایک چہرہ تھا۔ جس پر دو ہاتھ دھرے تھے۔ رات بوجھل ہو گئی تھی۔ اُس بوجھل یاد کی طرح "ندرت منصور علی۔ آخر میں تم سے شکست کھا ہی گیا۔" میں نے جُز بُز ہو کر بے یقینی سے اپنے آپ سے کہا تھا۔ میں یادوں میں گُم ہو گیا تھا ...... "اسلم صاحب بہت گہری سوچوں میں ہیں آپ۔" راحیلہ نے اُداس لہجے میں پوچھا تھا۔ اور میں نے چونک کر یوں اُسے دیکھا تھا جیسے کسی نے گہری نیند سے اچانک جگا دیا ہو۔ میں نے راحیلہ کے غمگین چہرے کو دیکھا۔ اُس کے چہرے کی اُداسی مجھے اور بھی اُداس کر گئی۔ میرے دل میں اُس وقت اُس کے لئے نہ جانے کیوں رحم پیدا ہو رہا تھا۔ میں اُس کی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھ دینا چاہتا تھا۔ حالانکہ عورت کے آنسو مجھے ہمیشہ ہی تسکین دیتے ہیں۔ راحیلہ کو مسز رفاقت نے دُور سے دیکھ کر کہا تھا۔ "جاناں تمہارا گلاس ابھی تک خالی نہیں ہوا۔ اتنی سُستی بھی کیا۔ تم اپنے مہمانوں کو کس طرح زیادہ خوش کر سکتی ہو۔ دیکھو کتنی جاندار اور دلکش دُھن بج رہی ہے۔ اُٹھو نا۔ اسلم بھی بور ہو رہا ہے جم۔ میرا دل نہیں چاہتا۔ راحیلہ کی آواز میں اُداسی اور اندرونی چھُپا غم تھا۔

"اُٹھو بھئی۔ جوان لوگ جب یوں سُست ہو جائیں تو ہم بوڑھے لوگ تو بالکل ہی مٹ جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا زمرد رانی۔" مسز رفاقت نے اُس کی طرف اپنا گلاس لہراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تمہارا گلاس خالی کیوں ہے اسلم بیٹے۔ ایسی دلنشین راتوں میں خالی گلاس کو ہاتھ میں تھامے رکھنا بہت بڑی بدذوقی ہے۔"

میں مسز رفاقت کو دیکھ کر مُسکرایا تھا اور پھر راحیلہ کا اُداس چہرہ مجھے اور بھی اُداس نظر آنے لگا۔ وہ بھی یادوں کے بھنور میں گھری تھی اور میں بھی چُپ چاپ بیٹھا تھا۔

"راحیلہ تمہارا بیٹا کتنا بڑا ہے۔" میں نے بے خیالی میں ہی پوچھ لیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے وہ اُن گذرے لمحوں کو یاد کر رہی ہو جو اُس نے ایک مرد کے ساتھ گذارے تھے۔ وہ اپنے بچے کے اُن نرم آگیں بوسوں کو یاد کر رہی ہو جو معصوم ہونٹوں سے اُس کے چہرے پر ثبت کئے گئے تھے۔

"میرا بیٹا۔ اُس کی غمگین آنکھوں میں خوشی کی روشنی صرف ایک لمحہ کے لئے ہوئی تھی۔ دوسرے لمحے وہ جوت بجھ گئی تھی۔ ٹمٹماتے دیئے کی مانند۔ یاد کی تہہ ہوا سے۔

میرا بیٹا۔۔۔۔ میرا بیٹا چھ سال کا ہے۔ وہ بہت ہی خوب صورت ہے۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کی گرمی کی تپش تھی اور آنکھیں ماضی میں دیکھ رہی تھیں۔

ماضی تو کوئی حقیقت نہیں۔ بس لذتوں کے وہ لمحے ہیں جو ایک زنجیر کی صورت حال سے مستقبل میں بدلتے رہتے ہیں۔ میرے لئے تو بس حال کا زمانہ ہی زندہ ہوتا ہے جب میں آئینے میں کھڑا اپنے آپ کو دیکھتا اور پوری طمانیت کے ساتھ مسکراتا ہوں۔ اور میرے لبوں میں سگریٹ کا دھواں آنے والی لذتوں سے مخمور، بل کھا کر فضا میں غائب ہو جاتا ہے۔ ندرت منصور علی کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں میرے اندر کبھی وہ جوش پیدا نہیں ہوا تھا جو خوشی اور صرف پاکیزہ اور الوہی خوشی ہوتا ہے۔ دوسروں کے زندہ اور جاندار جذبوں کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں اور پھر عورت جو میرے نزدیک لذت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ندرت کو میں الگ کیسے سمجھ سکتا تھا۔ بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی عورت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میرے نزدیک اُس کی ذات میں ایسی تو کوئی الجھی ہوئی بات ہی نہیں تھی جو بہت مشکل ہو۔ پھر بھی میں نہ جانے کیوں ماضی کی گندی باتوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ حالانکہ راحیلہ کا گداز جسم میرے ساتھ چھو رہا تھا۔

"وقت سب سے بڑا مرہم ہے راحیلہ ڈیئر۔ چھوڑو اُن باتوں کا ماتم جو تم کو دھوکہ دے گئیں۔ جب تک تم پورے دل سے ہنس سکتی ہو، تم وقت کو مات دے سکتی ہو۔ میں نے اُس کے سرد ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ میں اپنی لگاتار آتی یادوں سے پریشان ہو اٹھا تھا۔ میں اور راحیلہ مدہم روشنی کی زد میں بیٹھے تھے۔ ہمارے خالی گلاسوں کو بیرا نئے سرے سے بھر گیا تھا۔ اور جب جاز کے تیز سُر شوریدہ سری سے ہمارے کانوں سے ٹکرائے تو سب لوگوں نے اپنے ہاتھ تیزی سے گلاسوں کی طرف بڑھائے تھے۔ ہم دونوں نے بھی اپنے گلاسوں کو اٹھا لیا تھا۔

راحیلہ نے کہا تھا۔ "اسلم صاحب میں ہمیشہ خوش رہتی ہوں۔ لیکن گندی یادیں بعض اوقات ایسے اُبھر آتی ہیں جیسے جھوٹی روشنیوں کے ہنڈولوں سے سلطے۔ اور پھر ٹم کی زندہ دلی۔ ان کی دعوتیں۔ پارٹیاں اور ریت نئے لوگوں کی محبتیں۔ میں اُداس نہیں رہ سکتی اسلم صاحب۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے دبایا تھا۔ میں ٹم کی بڑی شکر گذار ہوں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔" اور پھر جب ہم دونوں تال کی لہروں پر تیر رہے تھے تو مجھے ایسا لگا۔ جیسے میرا وجود ہلکا پھلکا ہو کر دھند میں اُڑ رہا ہو۔ اور میرے پاس کسی اور انجانی ہستی کا بھی وجود ہو۔ جو کہہ رہا ہو۔

"اسلم۔ عورت تو ازل سے حوا ہے اور سانپ کے ورغلانے میں ہمیشہ ہی آ جاتی ہے۔ اپنی حفاظت کے حصار سے نکل کر جادو کے پھندے میں پھنس جاتی ہے۔ عورت محبت کے زہر کو ہنس کر پیتی ہے اور جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو قربان کر دیتی ہے۔" یہ آواز کس کی ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے سروں کی دھند سے ادھر اُدھر جھانکتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔ راحیلہ نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا تھا اور مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اُسے مسکراتے دیکھ کر مجھے ندرت کی ہنسی یاد آ رہی تھی۔ ندرت جو

مینٹل ہاسپٹل کے گرد آلود فرش پر بیٹھی خلاؤں میں دیکھتی رہتی ہوگی۔ اور پھر ملیے چوڑے میدانوں میں اڑتی گرد اور تپش سے گھبرا کر خالی ذہن سرد سلاخوں سے لگی دوسری عورتوں کو دیکھتے دیکھتے اپنے دن گزار دیتی ہوگی۔۔ مجھے ندرت کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہیے۔ لیکن میں بے بس تھا۔ فاروق ندرت کے بھائی کا دوست تھا۔ ایک روز اُس نے آکر کہا تھا۔

" دوست۔ عورت بھی کتنی نازک سی چیز ہے۔ ٹوٹ گئی تو ٹوٹ گئی۔ کوشش کے باوجود بھی نہیں جڑتی " میں نے اُس سے ندرت کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا۔ میں نے اُس کی بربادی سے لذت لینی چاہی تھی۔ میں تو کب کا احساس گناہ کے اُس بلکے سے تصور سے بھی چھٹکارا حاصل کر چکا تھا جو پہلی بار مجھے محسوس ہوا تھا، لیکن میرے اندر سے کوئی چیز کمی خوشی نہیں تھی۔ میں خاموش اُس کے ذکر کا منتظر رہا تھا اور فاروق نے کہا تھا۔

مجھے کبھی کبھی قدرت کی بے رحمی پر بڑا غصہ آتا ہے۔ بھلا ندرت کو کس بات کی سزا ملی۔ اُس سے کس بات کا انتقام لیا گیا۔ مینٹل ہاسپٹل میں جانے سے پہلے اُس کا گھر میں بھی علاج کرنے کی کوشش کی گئی۔۔۔۔۔۔ لیکن اس کی ذہنی حالت اور بھی بدتر ہو گئی۔ وہ سب کمروں میں گھومتی ساری بتیوں کے سوئچ آف کرتی رہتی تھی۔ اور پھر اپنے کمرے میں جا کر اپنے ہاتھ چہرے پر رکھ لیتی۔ نفسیاتی معالج تو اس کی توجیح عجیب سی انداز میں کرتا تھا۔ وہ سارا خاندان تو بہت صحت مند رجحانات کا مالک ہے۔ ان کے ہاں بے جابے حیائی اور بے جا حیا۔ دونوں کو ہی دخل نہیں۔۔۔۔ کیا تم اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟

اُس کی آنکھوں میں لکھے گئے سوال کو پڑھ کر میں نے بہت کچھ بتانا چاہا تھا۔ اُن لڑکیوں کے قصوں کی مانند جو میری مردانگی کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں۔۔۔۔ عورتوں کی رسوائی میرے لئے کوئی نئے معنی نہیں رکھتی تھی۔ لیکن پھر بھی میں ندرت کے بارے میں اور کوئی بات کر کے اُس رسوائی کو آگے نہیں بڑھانا چاہتا تھا جو ندرت کی بیماری نے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دی تھی۔۔۔۔۔ اُس روز فاروق زبردستی مجھے باغ جناح میں لے آیا میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ تھا۔ جو اسے بے چین کئے ہوئے تھا۔۔۔۔ اُس کی آنکھوں میں اُداسی کے سائے سے تھے۔ فاروق اور میں ایک نسبتاً اُداس کنج میں پھر رہے تھے۔ باغ کے کیفے میں لوگوں کا ہجوم تھا، غمگین چہرے۔ تھکے چہرے۔ اُداس چہرے۔ سب آپس میں گڈمڈ تھے۔ وہاں پر ہنسی کا ترنم بھی تھا۔ زندگی اپنے بہاؤ پر بہے جا رہی تھی۔ اور فاروق کی معیت میں میرے اندر احساس گناہ بھی تھا۔ جو میری فطرت کے خلاف تھا اور میں اُس سے چھٹکارا پانے کی خواہش پر بھی نہیں پا رہا تھا۔ میں کس چیز پہ نادم ہو رہا تھا۔۔۔۔ میرا کون سا گناہ ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔۔۔ اور ندرت کا وجود اُن لانبے درختوں کے درمیان کسی صلیب پہ لٹکا میری نظروں کے سامنے جھول گیا۔۔۔۔۔۔ میں مداوا کرنا چاہوں بھی تو کس چیز کا مداوا کروں۔۔۔۔ اور مداوا میرے بس میں کب تھا۔ بس کبھی کبھی جب زندگی کے ہنگاموں سے تھک کر میں رات کے پچھلے پہر آ کر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹتا ایک جسم اندھیرے کے کینوس پہ اُبھرتا اور میری بند آنکھوں کے سامنے ٹھہر جاتا اور پھر میں درجنوں ہی آدھ جلی سگریٹوں کا ڈھیر لگا دیتا۔ اور تھک کر روشنی کر دیتا اور دھندلے شیشوں پر ملگجی روشنی کے دائرے سے بن کر شیشوں کے پھولوں کو واضح کر دیتے۔ اور نوکر آ کر بیڈ ٹی رکھتا ایش ٹرے کو صاف کرنے کے لئے لے جاتا اور سہما سا میرے کمرے کی بے ترتیبی کو درست کرتا رہتا۔ اور پردوں کو برابر کر کے چلا

جاتا . . . . . پھر مجھے معلوم ہوتا کہ رات گذر گئی ہے ۔ لمبی سیاہ رات ۔

میری یادوں میں ندرت کا بس اتنا ہی تو حصہ تھا ۔ اور وہ ندرت جو مینٹل ہاسپٹل کی سلاخوں سے لگی کھڑی تھی . . . اُس کا تو خیال بھی مجھے شدت سے نہیں آتا تھا . . . . . میں تو اُس کے بعد بھی کئی لڑکیوں سے ملا تھا ۔ وہ کوئی اکیلی تو نہیں تھی، پھر یہ کیا بات تھی کہ اُس کی یاد کے ساتھ شکست اور محرومی کی کسک مجھے پریشان کر دیتی ۔ وہ کسک کیا تھی؟ ندرت کو بغیر مسلے کھو دینے کی جلن یا میرے اندر کوئی اور بھی جذبہ تھا جو دوسروں سے الگ تھا ۔ تب میرا ذہن بوجھل سا ہو جاتا اور ساری سوچیں گرم پتھر کی مانند میری کنپٹیوں کو گرما دیتیں ۔ میں خاموش دیوان پہ لیٹا خالی ذہن سا ہو جاتا اور پھر الجھا الجھا سا آفس میں چلا جاتا اور کسی خوب صورت آواز میں ٹیلی فون مجھے ساری رات کی تھکاوٹ سے نجات دلاتا لگتا ۔ میں زیرِ لب سیٹی بجاتا ۔ فائلوں کے اوراق اُلٹتا . . . . سرسری نظر سے دیکھ کر دستخط کر دیتا اور پھر شام کے خیال سے خوش ہو کر زور سے سگریٹ کا کش لے کر دھواں اُڑاتا ۔ اور اِس کے ساتھ ہی رات کی تھکن دور ہو جاتی ۔ لیکن اس روز وہاں پھرتے ہوئے میں فاروق کو کیا بتاتا ۔ میں اپنی فتوحات کے قصّے کہہ سکتا تھا ۔ لیکن میں نے تو ہمیشہ ندرت سے شکست کھائی ہے اور اِس شکست کو فتح میں بدلنے کے لئے میں نے جو راہ چنی وہ بھی مجھے دھوکا دے گئی ۔

اُس دن سکندر حیات کے گھر دعوت تھی ۔ مخلوط پارٹی کی اُس گہماگہمی میں میں نے ندرت کو دیکھا تھا ۔ وہ فاروق کی بہن کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھی اور میں کوشش کے باوجود اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول نہ کر سکا ۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا ۔ جو بے اندازہ حسین نہیں تھی لیکن اُس کے چہرے پہ ایک انوکھی موہنی تھی ۔ اُس کی ہنسی میں انوکھا سا ترنم تھا ۔ میرے سب طرف خوب صورت چہرے تھے اور پھر مجھے عورتوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے کبھی بھی زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی ۔ پر میرا دل اُس کو دیکھ کر عجیب طرح سے دھڑکا تھا ۔

"ڈیم ہر" ۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا اور اُن کے پاس پڑے میز سے گلاس اُٹھانے کے لئے چل پڑا ۔ بڑے سے مخملی لان میں شیشم کے درختوں کی اوٹ سے چاند جھانک رہا تھا اور تیز روشنی میں پھولوں کے رنگ اور بھی اچھے لگ رہے تھے ۔ درختوں کے پرے سرمئی بادلوں کا رنگ تھا اور میرے سب طرف ہنسی کا جلترنگ تھا اور ندرت کا چہرہ تھا جو سب سے الگ نظر آ رہا تھا ۔

سکندر حیات میرے پاس آیا ۔ اُس نے میرے انہماک کو دیکھ کر کہا تھا ۔

"یار کیا بات ہے ۔ چلو تعارف کرواؤں" ۔ وہ مجھے اُن کے پاس لے گیا ۔

"بھئی یہ میرے دوست اسلم ہیں ۔ اور یہ ہیں ندرت اور یہ ہیں پنکی رحمان ۔ اپنے نام کی مناسبت سے بھی زیادہ گلابی ۔"

پنکی رحمان نے مجھے سلام کیا اور ندرت کا ملنے تک گیا ہاتھ ایک ساعت کو رُکا اور پھر وہ بڑی لاپرواہی سے پلیٹ پر جھک گئی تھی ۔ اس کے خوبصورت ہونٹوں پہ ہنسی سی تھی ۔ وہ میرا وہم تھا اور پھر میں نے اپنی تمام صلاحیتیں اسے مرعوب کرنے میں لگا دیں تھیں ۔ لیکن وہ لاپرواہ اور لاتعلق سی کھڑی رہی تھی ۔ اُس نے ایک دفعہ بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا ۔

پنکی رحمان کی ہنسی کے جلترنگ میں میں ایک اور آواز سننے کی خواہش میں وہاں کھڑا بے سروپا باتیں کرنے لگا تھا ۔ میں

جو بہت سی فتوحات میں ایک مغرور شہنشاہ کی مانند گھرا رہتا تھا۔ ایک دم اُداس ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے قدرت کہہ رہی ہو۔
"کیوں اس قدر اچھل کود کر رہے ہو۔ میں ایسی ٹہنی تو نہیں جس کو تم جھکا کر توڑ سکو۔"

"دیکھا جائے گا۔" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا۔ میں جو زندگی کی تمام شیرینیوں سے شرابور رہا جاتا تھا۔ اس ایک وقتی شکست سے کیسے بچ سکتا تھا۔ میں جو دوستوں میں اپنی کامیابیوں کا ذکر بڑے فخر سے کرتا تھا۔ یوں ایک دم ہراساں ہونے والا تو نہیں تھا۔ پر قدرت کی لاپرواہی نے میرے غرور کے تناور پودے کو مرجھا سا دیا تھا۔ قدرت کا بے نیازی کا انداز ایک تازیانہ تھا۔ ایک چیلنج تھا۔ جس کو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور مان لیا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے درختوں کے مونگیا اندھیرے کے پیچھے چاند کے روشن چہرے کو دیکھا اور پھر اس ناکامی کو چھپانے کے لئے دوسرے لوگوں میں شامل ہو کر زور زور سے قہقہے لگانے لگا تھا۔

اُس وقت اگر قدرت کو میں ایک دفعہ بھی اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتا تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا۔ جو بعد میں ہوا۔ میرے اندر کے زہر نے قدرت کی زندگی کو ڈس لیا۔ فاروق سے باتیں کرتے میں چپ ہو کر سوچنے لگتا۔ اور جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ جانے لگی تو میری روح کھنچ کر میری دو آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ صرف ایک خواہش کے لئے۔ کتنا اچھا ہو اگر قدرت جاتے ہوئے صرف ایک دفعہ ہی میری طرف دیکھ لے تو میں اپنے اندر اکٹھے ہوتے زہر کو ہنس کر مٹا دوں۔ لیکن گاڑی کے پٹ سے اُس کا صرف تھوڑا سا چہرہ نظر آیا تھا اور پھر اُن کی گاڑی لمبی سیاہ سڑک کے موڑ پر مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

میں چپ چاپ کھڑا چاند کے نیچے جمع ہوتے سفید بادلوں کو دیکھتا رہا تھا۔
سکندر حیات نے کہا تھا۔
"کہو دوست اُداس کیوں ہو۔۔۔؟"

"تمہیں معلوم ہے اُداسی جیسے لفظ کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں اور میں نے ایک زوردار قہقہہ لگانے کی کوشش کی تھی لیکن اُس قہقہے کے کھوکھلے پن سے ڈر کر میں نے جلدی سے انہیں خدا حافظ کہا اور پوری رفتار سے اپنی گاڑی کو سٹارٹ کیا تھا اور موڑ پر میری بریک کی تیز آواز دور تک گونج گئی تھی۔

اور پھر باغِ جناح میں اُس روز میں اور فاروق رات گئے تک گپیں ہانکنے کی کوشش میں رہے تھے۔ فاروق مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے پاس بتانے کے لئے کوئی ایسی بات نہ تھی جو مجھ پر اپنے فخر کو ظاہر کر سکتی۔ اور میں رنگ و نور کے طوفان میں اپنے اندر سمٹ گیا تھا۔۔۔ یہ سوچیں۔۔۔۔۔ یہ اندھیرے۔

راحیلہ کے سر کا بوجھ میرے کندھے پر تھا اور پھر راحیلہ نے کہا تھا۔
"اسلم صاحب آپ میرے شوہر سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔" راحیلہ میرے اور قریب آ گئی تھی۔
"میرے لئے خوشی کی بات ہے راحیلہ ڈیئر۔" میں نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

"راحیلہ بیٹی تھک تو نہیں گئی ہو۔" مسز رفاقت اپنے مہمانوں کو الوداع کہہ رہی تھیں۔

"مم ڈیئر آپ میرا کس قدر خیال رکھتی ہیں"۔ راحیلہ نے ان کے پاس جا کر کہا تھا۔

"مائی بے بی۔ یو آر مائی لائف۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

فخر الدین نے اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے کہا تھا۔ "بے بی تمہاری ماں تو بہت ونڈر فل ہیں۔ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔"

زمرد نے گستاخی بھری آواز میں کہا تھا۔ "مسٹر فخر الدین آپ اور پیجئے۔ ابھی آپ ہوش میں ہیں۔ کوئی بہت تیز سا جام تاکہ آپ کو ہماری رفاقت آنٹی ہی ونڈر فل نہ لگیں۔ بلکہ ساری دنیا ہی ونڈر فل ہو جائے۔"

"شریر لڑکی۔ پروڈیوسر کے نہ آنے سے اتنی دل برداشتہ ہو گئی ہو کہو تو میں تمہیں دو ہزار ماہانہ پہ نوکر رکھ لوں۔ چلو گی میرے ساتھ۔" فخر الدین نے مسز رفاقت کے کندھے پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے ہنس کر کہا تھا۔

"میں ابھی جوان ہوں اور اتنی مایوس بھی نہیں۔ شکریہ میں بوڑھے لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔" اور اس نے زور سے تپائی کو ٹھوکر ماری تھی۔ "یہ پروڈیوسر کا بچہ۔ سؤر کی اولاد کہیں اور منہ کالا کر رہا ہو گا۔"

"چچ..... چچ۔ اتنی مایوسی۔ میری آفر اب بھی موجود ہے۔" اور فخر الدین نے زور کا قہقہہ لگایا۔

زمرد اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پہ غصہ تھا۔ "آنٹی اب میں چلوں گی۔" اس نے راحیلہ کے پاس آ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اور مسز رفاقت نے اس کی پیشانی کو چوم کر کہا تھا۔

"میں موجود ہوں۔ فکر کیوں کرتی ہو۔ میری پہنچ سے کوئی بھی باہر نہیں۔"

"ذرا مجھے گاڑی تک تو چھوڑ آؤ۔" اس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ جاتے ہوئے میں نے راحیلہ کو دیکھا تھا وہ اپنی ماں کے پاس بالکل خاموش کھڑی تھی اور مدہم روشنی میں بالکل ہی بے جان لگ رہی تھی، اس کی ساڑھی کے جھلملاتے ستارے چمک رہے تھے۔ پھر اس کی آنکھوں کی جوت بجھی ہوئی تھی۔ باقی لوگ تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ جیسے وہ سب لوگ وقت کے سحر میں قید حقیقت کی تلخیوں سے آنکھیں چرائے اس جگہ اکٹھے تھے لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے دور اور نا واقف

زمرد نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ "میرے ساتھ چلو۔ آج میں بہت ہی اداس ہوں۔ اور اکیلی بھی۔"

"پھر کبھی سہی۔" میں نے سیاہ آسمان کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔ آسمان مجھے راحیلہ کی مانند لگ رہا تھا چمکیلا لیکن اداس۔ ایک اداس غمگین عورت کو قابو کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اور میں تو بہت سے تجربات کر چکا تھا۔

"تمہاری مرضی۔" اس نے پورے زور سے پٹ کو بند کیا تھا اور جب میں نے مسکرا کر اسے خدا حافظ کہنے کے لئے ہاتھ ہلایا تو اس کی گاڑی گیٹ کو پار کر چکی تھی۔ مجھے کس بات کی جلدی تھی مجھے اپنی طاقت کا احساس تھا۔ زمرد کو بھی نہ کبھی میری کشش کھینچ ہی لائے گی۔" میں نے راحیلہ کے غمگین چہرے کے متعلق سوچتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا مجھے دوسروں کے غمزدہ چہروں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو زندگی کو ایک گیند سمجھ کر اپنے آگے آگے بھگاتا چلا آیا تھا۔

اور جب ہم تھکے قدموں سے چل رہے تھے تو راحیلہ نے کہا تھا۔

"بہت دکھی ہوں اسلم صاحب"۔ ہوٹل کے لیے کاریڈار میں اندھیرا سا تھا۔ دور کسی بلب کی دھیمی روشنی تھی کسی اور منزل پر کوئی دروازہ بند ہوا تھا۔ کہیں مٹتی ہوئی قدموں کی چاپ تھی۔ ہر حرکت مکمل طور پر ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی۔

رات بہت گزر گئی ہے راحیلہ۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ لیکن وہ ایک معصوم بچے کی مانند میرے ساتھ لگی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ پھر اس کی سسکیوں کی ہلکی سی آواز پیلے کاریڈار میں پھیل گئی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ میرا دل کسی انجانے خوشگوار نشے سے دھڑک رہا تھا۔

راحیلہ چپ چاپ مسہری پر بیٹھ گئی۔ وہ میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر اس کے بیٹے کی تصویر رکھی تھی۔ اس نے اس کو اٹھایا آہستہ سے چوما اور پھر الٹ کر رکھ دیا۔

کمرے کا خوابگوں ماحول مجھ پر جادو کر رہا تھا یا میری رگوں میں ساری شراب کی تیزی تھی جو میں نے اپنے اندر انڈیل لی تھی یا پھر اور بھی کچھ تھا۔

راحیلہ نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ میرے قدم قالین کی نرمی میں گڑے ہوئے لگ رہے تھے۔

رات تھوڑی ہی باقی ہے۔ میں نے ٹیبل لیمپ کو جلا کر گھڑی کے ڈائل کو دیکھا تھا۔

"رات تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ رات کا تو کوئی کنارا نہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے اسلم صاحب۔ مت جائیے۔ مت جائیے"۔ اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا تھا اور کوئی تسلی بھرا لفظ کہنا چاہتا تھا۔ میں راحیلہ کے احساس کی باگ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے اپنی مرضی کے مطابق موڑنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا میرا جذبہ وقتی ہے۔ اور صبح جب میں جاگتی دنیا میں شامل ہو جاؤں گا تو میرے ذہن سے سب کچھ مٹ جائے گا اور میں بڑے مطمئن انداز سے سارے کام کروں گا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کو گل کر دیا تھا۔ مکمل اندھیرے میں ہم دونوں بیٹھے تھے۔ باہر کی روشنیاں کمرے میں مدھم جال سا بُن رہی تھیں۔

"اسلم صاحب! میں نے بارہا مر جانے کی خواہش کی ہے لیکن ممی ڈھال بن کر میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں"۔ ....

میں اُس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ اور وہ روتے ہوئے کانپ رہی تھی۔ وہ خوف یا خوشی تھی۔ میں نے اس بارے میں جاننا نہیں چاہا تھا۔

میں بڑے سکون کے ساتھ سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا تھا لیکن پھر یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ ندرت کا سراپا ایک دم اُس مٹتے مٹتے اندھیرے میں ابھر آیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اور اس کی پوروں کے درمیان سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"آج ہی میں اِس اذیت میں کیوں گرفتار ہو گیا ہوں" ایسی اذیت جس کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔

"راحیلہ مجھے معاف کرنا۔ اب میں جاؤں گا۔ میرا جی ٹھیک نہیں" میں نے پہلی دفعہ خوفزدہ ہو کر کہا تھا۔

راحیلہ یوں کھڑی رہ گئی تھی جیسے اُسے شدت کا غم اپنی گرفت میں لے رہا ہو۔ پھر ہم دونوں کچھ لمحے کھڑے رہے جاتے ہوئے میں نے جھک کر اُس کے بیٹے کی تصویر کو سیدھا کر کے رکھتے ہوئے اُسے دیکھا۔ وہ اب بھی ساکت کھڑی تھی۔ ندرت کی طرح۔۔۔۔

آج کی رات ندرت میری یادوں سے کیوں وابستہ ہو گئی ہے۔ کیا میں اُس کے انتقام کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اُسی کے بارے میں سوچتا ہوا پا رہا تھا۔

تیز قدموں سے چلتا ہوا میں نیچے آیا تھا۔ لمبے کاریڈار میں میرے پیچھے سسکیاں سی گونج رہی تھیں یا شاید باہر لان میں تیز ہوا چل رہی تھی۔

جب میں لان میں آیا تو درختوں کے پار سے فطرت کی گلابی جھانک رہی تھی اور ساری فضا پر اُداسی اور غنودگی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے اکیلی سڑک پر گاڑی کی سپیڈ تیز کرتے ہوئے اپنے ذہن کو خالی کرنا چاہا تھا۔ لیکن میرا ذہن اور دل پُرانی یادوں سے بھاری ہو رہا تھا۔۔۔۔ یادیں جن کا ہر زاویہ ندرت کے چہرے میں ڈھل رہا تھا۔

میں اتنا مشتعل کیوں تھا۔ مجھے کن باتوں کا رنج تھا۔ میں نے تو ندرت کی ذات سے اپنے کسی دُکھ کو وابستہ نہیں سمجھا تھا۔ لیکن ندرت میرے حافظے کی سطح پر اُبھر رہی تھی۔ جیسے سیاہی کے پہلو سے روشنی کی خوابیدہ سی کرن جھانک رہی ہو۔

اُس روز اپنی کھڑکی میں کھڑے میرے ذہن پر مینٹل ہسپتال کی موٹی سلاخیں اُبھر رہی تھیں۔ جن کے پیچھے ندرت کا جسم قید تھا۔ ہاں۔۔۔۔ وہ وہاں قید تھی لیکن اُس کی روح تو تمام رنجشوں سے بالا تھی۔ میری یادسے دُور۔ میرے دئے ہوئے زخموں سے ماورا۔

میں نے ایک روز فاروق سے کہا تھا "تم آخر ندرت کے معاملے میں اتنا تعلق کیوں محسوس کرتے ہو۔ مینٹل ہوسپٹل میں سبھی لوگ کسی نہ کسی وجہ سے ہی آتے ہیں۔

تب فاروق نے دُکھ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

دوست کبھی کبھار وہ لوگ جن کو ہم سرراہے جانتے ہیں یوں ہمارے دل میں بیٹھ جاتے ہیں جیسے وہ ہمیشہ سے وہاں تھے اپنے اپنے سے قریب تر۔ میری داستان تو بہت لمبی نہیں اور اب کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اور سب سے زیادہ تم کو تو کوئی غم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو باتیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ تم اُن کو کبھی یاد نہیں کر سکتے۔ تمھیں کبھی یاد نہیں آسکتیں۔ تم اُن کو جانتے ہی کب ہو۔

میں نے پوچھا تھا "تم میرے اور ندرت کے بارے میں کیا جانتے ہو"۔

"صرف ایک لفظ کہ تم جو اُس کی بربادی کے ذمہ دار ہو اس قدر بے حس کیوں ہو۔ کبھی جی بھر کر اُس کی بربادی کا ماتم تو کر لیا ہوتا تاکہ اُس کے ساتھ کوئی انصاف ہو جاتا"۔

"میں کوئی الزام اپنے سر نہیں لے سکتا۔ اُس کا ذہن اُس کی بربادی کا سبب ہے۔ میں کیا کر سکتا تھا" میں فاروق کو کیسے بتاتا کہ ندرت جو میری انا کی بھینٹ چڑھ گئی ہے میرے لئے ایک چیلنج تھی۔ اور میں نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا۔"

دوست تمہیں الزام کون دے رہا ہے۔ میں تو بس بات کر رہا ہوں۔ میں تو اُس دُکھ کی داستان بھی تمہیں نہیں سنانا چاہتا تھا جو میری بہن نے ندتی آنکھوں سے مجھے سنائی تھی۔ لیکن تمہارا سویا ضمیر کسی طور جاگ جائے تو۔ اور تم اُس کے لئے ماتم کرو جو تمہارے لئے برباد ہو گئی۔ ایسا نہ ہو جب تم اُس کے لئے ماتم کرنے کی خواہش کرو تو موت کے اندھیروں میں جا چکی ہو۔"

"کیا تم بھی ندرت سے محبت کرتے تھے؟" میں نے اُس کی باتوں کی کاٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس نے میز پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا اور طنز سے ہنس کر کہا تھا۔ "اس "بھی" کا بھی کوئی جواب نہیں دوست میں تو اب بھی اُس سے محبت کرتا ہوں۔ کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا تمہیں۔" اور خاص طور پر اب اُس کے ہونٹ دُکھ سے کپکپا رہے تھے۔

میں اُسے کیا جواب دے سکتا تھا۔

"زندگی میں بعض ایسی غلطیاں انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں جن کا کوئی مداوا نہیں ہوتا، تم بھی ایک ایسی ہی غلطی ہو جو ندرت سے سرزد ہوئی اور اب تو وہ اِس غلطی پر پچھتا بھی نہیں سکتی۔ اچھا ہی ہوا۔ اس کی آواز رُندھی ہوئی تھی۔" جانتے ہو چند روز پہلے میری بہن ثریا ندرت کی امی کے ساتھ اُسے ملنے ہاسپٹل گئی تھی۔ جانتے ہو وہاں پر اُس نے کیا دیکھا۔"

"بتا دو۔ اگر یہ ساری بات اِس کوشش میں ہے کہ مجھ پر کوئی الزام ثابت کر سکو تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔" میں نے اُس وقت اپنے دل کو ہر قسم کی یاد سے خالی پاتے ہوئے کہا تھا۔ میری آواز میں لاپرواہی تھی۔ میں گناہ کے احساس کا قائل ہی نہیں تھا۔

فاروق چپ بیٹھا رہا تھا جیسے کسی بہت ہی تلخ مزے کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ندرت اور ثریا دوست تھیں"۔ اُس نے بھاری آواز میں کہا تھا جیسے آنسوؤں کا ایک سیلاب ہو جو ہر بند سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ندرت کے ہاسپٹل جانے پر ثریا بہت روئی تھی۔ اور میں اُس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں جو ندرت سے کوئی تعلق محسوس نہیں کرتا تھا۔ میں اپنے اندر کے چھپے جذبوں کو کیسے عیاں کرتا۔

مینٹل ہاسپٹل میں میٹرن کے کمرے میں بیٹھ کر ثریا نے سوچا تھا ندرت صاف ستھرے لباس میں کسی چارپائی پر خاموش اور اُداس بیٹھی ہوئی خلاؤں میں تکتی۔ اندر پھول ہوں گے۔ گھاس کا سبزہ ہوگا۔ تتلیوں کے رنگین پر ہوں گے۔ لیکن جانتے ہو وہاں کیا تھا۔ وہاں پر گرد آلود زمین کی برہنگی تھی۔ سورج کی روشنی میں تپتا آسمان تھا۔ بارکوں کے برآمدوں میں بیٹھی عورتیں تھیں۔ جن کی آنکھیں خالی تھیں۔ جن کے چہرے تمام جذبوں سے تہی تھے۔ جن کے ہاتھ ساکن تھے ان کی آنکھیں آنے والوں کو دیکھتی تو تھیں لیکن اُن میں پہچان کی روشنی نہیں تھی۔ کسی کسی چہرے پر ہنسی تو تھی لیکن وہ ہنسی اِس لئے نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو پہچانتی ہیں۔

ثریا کا دم اُس کے سینے میں گھٹ رہا تھا اور وہ خوفزدہ سی ندرت کی امی کے ساتھ لگی آگے بڑھتی جا رہی تھی . . . . ثریا کو لگا تھا جیسے یہ فاصلہ کئی میلوں پر محیط ہو گیا ہو۔ اُس نے بڑے بڑے درختوں کے گرد آلود پتوں کو دیکھا تھا اور اُسے لگا تھا جیسے سب

طرف ویرانی ہی ویرانی ہو۔ اتنے میں ایک سانولی سلونی سی پندرہ سولہ سالہ لڑکی نے آکر اُسے سلام کیا اور کہا۔

"سہیلی کیا تم میری شادی میں آئی ہو۔ پر میرے پاس تو صابن ہی نہیں۔ جہاں آرا چڑا کہنے لگی اور پھر اُوپر سے ناراض بھی ہو گئی ہے۔ کیوں میڈرن جی آپ جہاں آرا کو ڈانٹیں گی نا"

میڈرن نے اُسے پیار سے کہا تھا۔ میں جہاں آرا سے تمہارا صابن واپس دلا دوں گی۔ وہ پگلی ثریا سے پھر کہنے لگی۔

"سہیلی تمہیں معلوم ہے بغیر صفائی کے بغیر انسان کہیں جا سکتا ہے۔ میں کپڑے دھوؤں گی۔ خوب صورت بنوں گی اور پھر اپنے سسرال جاؤں گی ٹھیک بات ہے نا سہیلی" اور میری بہن کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ اُس نے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے بڑی مشکل سے روکا تھا۔

ندرت کی ماں نے اُس کو اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔ اور کہا تھا۔" بیٹی ایک دن تم ضرور دلہن بنو گی۔ تمہارا دولہا آئے گا۔ اور تمہیں ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا"

وہ ندرت کی ماں سے لگی ہنسنے لگی تھی۔ خوش ہو رہی تھی۔ اور میری بہن نے اُس کے ڈھیلے قمیض اور پاجامے کو دیکھ کر سوچا تھا" کیا ندرت بھی ایسے ہی موٹے لباس میں ہوگی۔ کیا اُس کے بال ایسے ہی بے ترتیب اور اُلجھے ہوئے پھیلے ہوں گے اور کیا وہ بھی ننگے پاؤں تپتی زمین پر پھر رہی ہو گی۔ اور اُس کے چہرے پر ایسی ہی اپنے حالات سے بے خبر مسکراہٹ ہو گی۔ یہ سب کچھ سوچ کر اُس کا دل بند ہونے لگا تھا۔ پگلی کہہ رہی تھی۔

میڈرن جی مجھے صابن ضرور لا دینا۔ کہیں مہمان آ جائیں اور میں گندی ہی بیٹھی رہوں اور پھر اُس نے ثریا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"میرے کپڑے دیکھو گی" میری بہن نے روتی آنکھوں سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر پگلی نے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی مختلف چیزیں نکالی تھیں۔ صابن کا چھوٹا سا ٹکڑا۔ ٹوٹے دندانوں والی کنگھی۔ موتیوں کا معمولی ہار اور پہنے ہوئے گلابی کپڑے۔ وہ ہر چیز کو بہت پیار اور محبت سے دیکھ رہی تھی۔ اور میری بہن کا دل ایک بوجھ کی مانند اسے اپنے سینے میں چُبھتا ہوا لگ رہا تھا۔

ثریا اور ندرت کی امی ایک بڑے سے پُرانے پیپل کے درخت کے نیچے کھڑی تھیں۔ ثریا نے اپنے سامنے بیٹھی اُن عورتوں کو دیکھا جو جوان تھیں۔ لیکن وہ سب چُپ چاپ ایک دوسرے کے ساتھ لگی بڑی ترتیب سے چٹائیوں پر بیٹھی تھیں۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے۔ اُن کے کپڑے گرد آلود تھے۔ اُن کے چہروں پر زندگی کی کوئی تازگی نہیں تھی اور ثریا ندرت کا سوچ رہی تھی جو اُسے ابھی تک نظر نہیں آئی تھی وہ ندرت کی امی سے پوچھنے کی خواہش پر بھی نہیں پوچھ رہی تھی۔ اُس کے دل میں عجیب طرح کا خوف پیدا ہو رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اُسے لگا تھا جیسے وہ بھی ابھی اپنے ترتیب سے بنے بالوں کو بکھرا کر ان کے درمیان چُپ چاپ بیٹھ جائے گی۔ اس نے ندرت کی امی کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ وہ ندرت کا نام لیتے بھی ڈر رہی تھی۔ وہ واپس آنا چاہتی تھی۔ وہ ندرت کو اس چاروں طرف پھیلے ماحول میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اُس ندرت کو کیسے یوں دیکھ سکتی جو اُس کے بچپن کی دوست تھی۔

پگلی نے پھر کہا تھا "سہیلی میں یہ ساری چیزیں سنبھال کر اس لئے رکھتی ہوں کہ کوئی چُرا کر نہ لے جائے"۔ ثریا نے چاہا تھا کہ وہ اس پگلی کے پاس بیٹھ کر اُس کی چیزوں کو ترتیب سے باندھ دے اور رکھے۔

دیکھو سہیلی انسان جن جذبوں کی، جن چیزوں کی زیادہ حفاظت کرتا ہے وہی چرائی جاتی ہیں۔

میٹرن کا سفید بے داغ لباس اور سیاہ چھتری۔ اس تمام ماحول میں اُس کا پورا وجود ہی صرف ہوشمند دنیا کی نشانیاں تھیں ۔۔۔۔ احساس سے عاری عورتیں۔ گرد آلود سپتے۔ مٹیالی زمین اور بارکوں کی سلاخوں کی ویرانی اور کرختگی ۔۔۔۔ ان سب باتوں نے ثریا کے اندر ایک خوف پیدا کر دیا تھا۔

دو تین نسبتاً اُجلے بستروں کے پاس سے گزر کر جب وہ آگے بڑھی ہیں تو اس بارک میں اندھیرا تھا اور جب ثریا نے موٹی سلاخ کو پکڑ کر اندر جھانکنے کے لئے اپنا سر ساتھ لگایا ہے تو وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ آئی تھی اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ اتنی دلخراش حقیقتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جو سب کی سب اُس کے سامنے عریاں کھڑی تھیں۔۔ وہ سب اپنے وجود کی برہنگی سے بے خبر تھیں اور خالی نگاہوں سے ان کو وہاں کھڑے دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے چہرے گرد آلود تھے۔ وہ مختلف حالتوں میں بیٹھی تھیں یا سلاخوں کو پکڑے باہر دیکھ رہی تھیں۔

ندرت کی امی نے گھبرا کر میٹرن سے کہا تھا "میٹرن صاحبہ آپ میری بیٹی کو یہاں ان سب کے درمیان کیوں لے آئی ہیں" ثریا کو محسوس ہوا تھا جیسے ندرت کی امی اپنی عمر سے کہیں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اُن کی آواز کہیں پاتال سے آتی لگ رہی تھی اور ثریا نے جلدی سے آنکھیں کھول کر ندرت کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ ندرت نہیں ہو سکتی" اُس نے ایک گندے بالوں اور اُجاڑ چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا "یہ ندرت نہیں ہو سکتی" اور ندرت کی امی بارک کی سلاخ کو پکڑے رونے لگی تھی اور ندرت اُن تمام عورتوں کے درمیان کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔

میٹرن نے اپنی نظریں دوسری طرف کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

بیگم صاحبہ یہ پرائیویٹ وارڈ میں روشنی کو دیکھ کر بہت شور کرتی ہے اور جب تک اندھیرا نہ ہو جائے پریشان رہتی ہے لیکن دوسرے مریض اندھیرے سے ڈرتے ہیں۔ یہ کشمکش اِس کی ذہنی صحت کے لئے اچھی نہیں تھی۔ ایسا مجبوراً کرنا پڑا ہے۔"

ندرت کی امی کا چہرہ سفید ہو گیا جیسے کسی نے خون کی بوند بوند نچوڑ لی ہو۔

ثریا نے آہستہ سے پکارا تھا۔ "ندرت ۔۔۔۔۔ ندرت ادھر دیکھو میں ثریا ہوں۔ میں تمہیں ملنے آئی ہوں" لیکن وہ بالکل ساکت وہاں آنکھیں بند کئے کھڑی تھی اور کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

ندرت کی امی نے میٹرن سے پوچھا تھا۔ "میٹرن صاحبہ میری بیٹی کب تک ٹھیک ہو جائے گی" اُن کی آواز میں منت تھی اور تمام ماتا کا درد بھی ایسا درد جو صرف بیٹی کے اُجڑنے پر ماں کے دل میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

میٹرن نے چھڑی گھماتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "بیگم صاحبہ ہمارا کام تو صرف اِن کی دیکھ بھال ہے۔ باقی کام تو بڑے ڈاکٹر صاحب کے ذمہ ہے۔" اور ثریا نے ندرت کی ماں سے کہا تھا۔

"آنٹی! آپ ندرت کو گھر لے چلیں۔ وہ یہاں پر مر جائے گی۔ مر جائے گی۔"

ندرت کی ماں نے کہا تھا "بیٹی گھر میں مجھ سے اِس کا درد نہیں دیکھا جاتا۔ وہ جب روشنی کو دیکھ کر چیخنے لگتی ہے تو میرا دل ڈوب ڈوب جاتا ہے اور پھر گھر کے دوسرے لوگ۔ زندگی اندھیرے میں کس طرح گذر سکتی ہے۔"

ندرت نے آگے بڑھ کر ساح کو پکڑ لیا تھا۔ وہ ثریا کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی امی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں سورج کی روشنی پر تھیں جو پارک کے پیچھے سے سیدھی پیپل کے بوڑھے درخت کے پتوں پر پڑ رہی تھی۔ پھر اُس کے چہرے پر خوف کی تیز لہر سی پیدا ہوئی۔ اس کے ہونٹ کانپ کر ساکن ہو گئے اور وہ بڑبڑانے لگی۔

یہاں پر کتنی چمک اور روشنی ہے۔ وہ دیکھو تیز بلب جل رہا ہے۔ سب طرف روشنی ہے۔ اور میں یہاں کھڑی ہوں ...... میرے کپڑے کہاں ہیں ..... اور وہ بڑبڑاتی ہوئی پیچھے کو ہٹ کر دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے ہاتھوں کو چہرے پر رکھ لیا لیکن وہ اپنی انگلیوں کے درمیان سے اَدھ کھلی آنکھ سے باہر پھیلی روشنی کو دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی۔

ندرت کی ماں نے دُکھ سے میٹرن سے کہا تھا "میٹرن صاحبہ یہ کب تک ٹھیک ہو گی؟" اور میٹرن نے کہا تھا۔ "بیگم صاحبہ شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ آپ دعا کرتی رہا کریں۔ ویسے یہ پہلے کی نسبت بہت بہتر لگتی ہے۔ اب روشنی کو دیکھ کر اتنا نہیں چیختی۔ ..... بس بڑبڑانے لگتی ہے۔ ابھی دیکھا ہے نا آپ نے ایسے ہی یہ اکثر کرتی ہے .... آپ دعا کریں اللہ ضرور سُنے گا۔ ....." اور ثریا نے روتی آنکھوں سے ندرت کو ایک بار پھر پکارا تھا لیکن وہ زمین پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کا سر اُس کے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔

ثریا اور ندرت کی ماں کتنی ہی دیر وہاں کھڑی رہیں تھیں پیپل کی شاخ پر بیٹھی کوئی چڑیا چوں چوں کر رہی تھی۔ اور پگلی اپنے تھیلے کو کندھے پر ڈالے بہت ہی معصوم مسکراہٹ سے ثریا کو دیکھ رہی تھی۔

ندرت کی امی نے وہ نیا جوڑا جو وہ اپنی بیٹی کے لئے لائی تھیں۔ اُس پگلی کو دے کر کہا تھا ..... "بیٹی دلہن بنتے وقت یہ پہن لینا ضرور پہن لینا۔ برہنہ جوان بیٹیاں ماں باپ کے دل چھلنی کر دیتی ہیں۔"

دوست کیا تم زندگی کی اس تلخ حقیقت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہو۔ شاید تم اس ماں کے جذبات کا تجزیہ کرنا چاہو گے جس کی جوان خوب صورت بیٹی اُس کے سامنے عریاں کھڑی ہو اور اس کے کپڑے وہ دوسری لڑکی کو دے دے۔ ہو سکتا ہے کہ تم اندازہ لگا سکو کہ بربادی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

پگلی نے ثریا سے کہا تھا۔ "سہیلی اِن تمام لڑکیوں نے شاید اپنے کپڑے دھو کر ڈالے ہیں۔ اِن سب نے بھی تو ڈولی میں بیٹھنا ہے۔ اِن سب نے بھی تو سسرال جانا ہے۔ کیوں سہیلی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" اُس پگلی کے چہرے پر معصوم خواہشوں کا سایہ تھا۔ اور اُس کے پہلو میں دل تھا جو خواہش کے بھنور میں پھنس کر چکر لگا رہا تھا۔

ثریا ندرت کے لئے چند چیزیں لے کر گئی تھی۔ لیکن ندرت کو اِن چیزوں کی ضرورت نہیں تھی اور پھر ثریا نے وہ چیزیں

دو مری عورتوں میں بانٹ دی تھیں۔ اُس کے خالی ہاتھ اُس کے پہلو میں لٹک گئے تھے جیسے وہ دو سخت کڑیاں ہوں جن کو وہ ہلا نہ سکتی ہو۔

اور جب وہ بڑے گیٹ کو پار کر کے باہر آنے لگی تو پگلی اپنے تھیلے کو کندھے پر لٹکانے اداس نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی اُس نے ثریا سے زور سے کہا تھا۔

"سہیلی جب میں ڈولی میں بیٹھوں گی تو مجھے دیکھنے ضرور آنا۔ آج تو میرا صابن جہاں آرا نے لے لیا ہے۔ جب وہ واپس کرے گی تو میں صاف ستھری ہو جاؤں گی۔" ثریا نے اپنا سر ہلایا تھا۔ جب خدا حافظ کہنے کے لئے ثریا نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو وہ پگلی اور ہی تھی اور ثریا کو آواز آئی تھی۔

"دیکھو سہیلی میری شادی میں ضرور آنا" اور ثریا اُس ڈولی کے بارے میں سوچنے لگی تھی جس میں ندرت کو بیٹھنا تھا۔ اُن قہقہوں اور ہنسی کے متعلق سوچنے لگی جو اب کبھی سنائی نہ دیں گے ثریا کے بابل کے گیت اُس کے اندر ہی دم توڑ چکے تھے جو اُس نے ندرت کی شادی پر گانے تھے۔

اور ندرت کی ماں کہہ رہی تھیں کہ کئی ڈولیاں کبھی نہیں اٹھتیں میری بیٹی۔ ماں باپ کے کندھے ان کا بوجھ اُٹھاتے اٹھاتے شل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اُن کے کندھوں کا ہی بوجھ بنی رہ جاتی ہیں۔ بیٹی تمہاری ڈولی کبھی کہیں نہیں جائے گی۔ یہ انتظار بہت جان لیوا ہے۔ میری بیٹی۔" یہ انتظار بہت جان لیوا ہے۔

جانتے ہو دوست۔ . . . . ثریا نے یہ سب باتیں اتنی دفعہ دہرائی ہیں کہ مجھے لگتا ہے جیسے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ جیسے میں نے بھی اُس دھول کو لپٹتے پاؤں پہ لگایا ہے۔ جیسے میں نے بھی وہاں کی ویرانی کو اپنے اندر گھستے محسوس کیا ہے۔ جیسے وہ مجھی کہہ رہی ہو۔ ندرت یہاں اکیلی تو نہیں۔ ہم سب بھی تو ندرت ہیں۔ تم کس کس کے لئے غمزدہ ہو گے۔ کس کس کا ماتم کرو گے۔

"دوست میں تم کو الزام نہیں دے رہا۔ میں تو خدا کو بھی الزام نہیں دے سکتا۔ اِس تمام داستان میں تمہارا تو ذکر بھی نہیں آتا۔ اور پھر میں تمھیں کیونکر کوئی الزام دے سکتا ہوں۔ میں تو جانتا بھی نہیں کہ ندرت کی بربادی میں تمہارا کتنا حصہ ہے۔ تم نے اُس کی زندگی کی بساط پر کون سا مہرہ بن کر اُسے مات دی؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تو بس سننے والے کی مانند خاموش تھا۔ یہ ساری کہانی تو صرف ندرت کی تھی۔۔ . . . . اُس لڑکی کی جو کبھی میری زندگی میں آئی تھی۔ . . . . اور میں شاید اُسے بھول بھی چکا تھا۔

فاروق چپ چاپ کرسی پر بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں غم کے گہرے سائے تھے۔ اور پھر بڑے کلاک کی تیز گھنٹی نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ . . . . ۔

فاروق میرے دفتر کا دروازہ بند کر کے جب باہر گیا تو میں نے سوچا۔" ہاں اِس ساری کہانی میں میرا تو کہیں بھی ذکر نہیں لیکن یادوں کا ایک اذیت ناک لمحہ ابھی تک میری یاد میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ لمحہ جو میری شکست پر ختم ہوا۔ کیا میں فاروق کو بتا دوں؟

کیا میں فاروق کو بتادوں ۔ وہ کہانی جو میری مجروح اَنا سے شروع ہوکر اُس رات پر ختم ہوتی ہے۔ جب میں نے ندرت کو اپنے کمرے سے چلے جانے کو کہا تھا۔ نکل جانے کو کہا تھا۔ میں نے سوچا تھا میں ندرت کو فتح کرچکا ہوں۔ میں ندرت کو مٹا چکا ہوں . . . . اِس سے زیادہ مجھے کیا چاہیے۔ ندرت کی یہی سزا تھی ۔

فاروق کے جانے کے بعد میں نے سیٹی بجا کر اپنے ذہن کو ہلکا کرنا چاہا۔ میں نے خوش ہونا چاہا کہ ایک عورت میری مردانگی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ندرت کو آخر کار میں نے شکست دے ہی دی۔ ہوسکتا ہے . . . ہوسکتا ہے ۔ میرا ذہن بھاری ہو رہا تھا۔ کیا میں خوش ہوں . . . . . ہوسکتا ہے . . . . . . ۔

شکست اور فتح ۔ وقتی جذبے ۔ بے وقعت احساس . . . . . لیکن پھر بھی زندگی کے لئے ضروری ۔

فاروق اور ندرت کے خاندانوں کے ساتھ میں سکندر حیات کی وجہ سے ہی تو متعارف ہُوا تھا ۔ میرے اندر کا شیطان بڑے خوب صورت انداز سے اُن کو مرعوب کرنے کی کوشش میں تھا۔ میں جو کئی لڑکیوں کو دوستی کے خوب صورت جال میں پھنسا چکا تھا ۔ اِس بات کا اندازہ کرچکا تھا کہ ندرت کو ڈھب پر لانے کے لئے مجھے نئے طریقے اختیار کرنے پڑیں گے ۔ مجھے شرافت کا لبادہ اوڑھنا پڑے گا جو شریف لڑکیوں کے دل میں اترنے کے لئے کارگر ہوتا ہے ۔

اور پھر کس طرح میں ندرت کو اُن سب باتوں کا یقین دلانے میں کامیاب ہُوا تھا ۔ جس پر میرا اپنا کبھی بھی یقین نہیں تھا ۔ یہ میری زندگی کا سب سے الجھا ہُوا اور ٹیڑھا مرحلہ تھا ۔ میں اکیلے میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا میں اُس وقت سے انتظار میں تھا ۔ جب آگے بڑھ کر میں اُس کی ساری پاکیزگی کو روند سکوں گا ۔ لیکن اس کی معصوم اور خود اعتمادی سے بھرپور نظریں مجھے اپنی ہی نظروں میں حقیر بنا دیتیں ۔ تب نفرت کا عجیب کڑوا کسیلا احساس میرے اندر بھر جاتا ۔ میں اس کے تقدس کو اپنے پاؤں تلے روندنا چاہتا تھا ۔ اور اس سے پوچھنا چاہتا تھا ۔

"کہو ندرت خانم کیا ہُوا تمہارا وہ تقدس اور پاکیزگی" لیکن وہ کتابوں کے ورق پلٹتی ہوئی میرے پاس دفتر میں بیٹھی رہتی ۔ آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہتی اور میں اپنے ناٹک میں نئے اور زیادہ دل لبھانے والے رنگ بھرتا رہتا ۔ میں جانتا تھا اُس کے دل کو تسخیر کئے بغیر اُس کے جسم کی طرف بڑھنا ایک شدید غلطی ہوگی ۔ تب میں چپ چاپ بیٹھا اُس کے جسم کے خطوط کو دُزدیدہ نظروں سے دیکھتا اور اُس کے دیکھنے پر آنکھیں جھکا کر بڑے رسان سے مسکراتا ۔

میں اُس کی موجودگی میں اپنی زندگی کا سب سے مشکل کردار کرنے پر مجبور ہو جاتا ۔

ایک روز میں نے کہا تھا "ندرت زندگی تمہارے بغیر ادھوری اور نامکمل لگتی ہے ۔ میں اُسے ٹٹولنا چاہتا تھا ۔ اُس کے جذبات کی شدت کا صحیح اندازہ کرنا چاہتا تھا ۔ وہ اپنے اندرونی احساس سے کانپ سی گئی تھی ۔ اُس کے معصوم چہرے پر حیا کی سُرخی تھی ۔ وہ محبت کے الوہی جذبے میں گرفتار تھی ۔ اُس کے چہرے پر چھائے رنگوں کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا ۔

ہاں اب وہ میرے قابو میں آنے والی ہے۔ میں کامیاب ہونے والا ہوں۔

اور جب میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اُس کے ہاتھ کو چھونا چاہا تو وہ ہمیشہ کی طرح سکڑ سی گئی تھی۔ اور اُس نے آہستہ سے کہا تھا۔

"اسلم محبت لمس اور گرفت نہیں۔ یہ تو انسان کے اندر یوں دوڑنے لگتی ہے جیسے خون کے ساتھ روانی۔ میں بہت حساس ہوں اور اگر تم مجھے نازک بھی سمجھ لو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ چھوٹی سی بات میری ساری ہستی کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ نہ جانے میں اس طرح کی کیوں ہوں۔ لیکن اِس پر میرا بس بھی تو نہیں۔ میں جب اپنے اندر جھانکتی ہوں تو ڈر جاتی ہوں۔ میرا توڑنا کتنا آسان ہے۔ مجھے مٹانا کوئی مشکل نہیں اور خاص طور پر اُس کے ہاتھوں جو مجھے ساری کائنات لگتا ہے۔" وہ آہستہ سے ہنس پڑی۔ . . .

اور دفتر کی دودھیا روشنی میں بیٹھی وہ کوئی غیر مرئی ہستی لگ رہی تھی۔ "لیکن یہ مت سمجھنا میں اخلاقی طور پر بھی کمزور ہوں۔ میں زمانوں تمہارے پاس بیٹھ کر باتیں کر سکتی ہوں۔ میرے لئے تمہارا اتنا ہی قرب کافی ہوگا۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے اسلم۔ لیکن میں کمزور نہیں ہوں۔" اُس کی آواز میں اعتماد اور یقین تھا۔ اپنے آپ پر۔ مجھ پر۔ میں کچھ نہیں بولا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کون سی راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ پھر میں نے زور سے قہقہہ لگایا تھا اور کہا تھا۔

"یہ باتیں تو بڑی ماورائی سی ہیں ندرت۔ ان کی خوب صورتی ہمیں اپنے اندر سمیٹ تو لیتی ہے لیکن ہمیں مکمل طور پر خوش نہیں کر سکتی اور میں پورے طور پر خوش ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنے اندر چھپی خواہش کو آواز دے ہی دی آخر کار۔

وہ میری بات کے مفہوم کو پانے کی کوشش میں سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"خوب صورت جذبے اپنا صلہ خود ہیں اسلم۔" پھر وہ ہنس پڑی۔ اور بڑے یقین سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کا یہ یقین ہی مجھے زہر آلود کر رہا تھا۔ اُس کے انداز میں فاختہ کی سی بے بسی اور لاچاری نہیں تھی۔ وہ کیوں اپنے پر اتنا یقین رکھتی تھی۔ کیوں۔

تو کیا میں تم سے ماورائی محبت کروں؟ کیا میں تمہاری محبت سے تمہیں نکال دوں۔ کیا میں اپنے جذبوں کی نفی کر دوں۔

"کیا حرج ہے آخر اس میں۔ اگر کر سکو تو۔" اُس نے سن کر بہت سکون سے جواب دیا۔ اور ہنستی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

"ماورائی محبت۔ خوب صورت جذبے اپنا صلہ خود ہیں۔" میں نے بیزاری اور نفرت سے اُس کے کہے ہوئے الفاظ کو دُہرایا اور زور سے پاؤں کو زمین پر مارا۔

"یہ لڑکی آخر اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ میں اِن سب باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ یہ جذبے کیا ہیں اور اِن کی سچائی سب بکواس۔ سب بکواس۔ صرف جسم ہے زندہ اور جاندار جسم۔" میں نے ندرت کے جسم کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔

خوب صورت جذبے جو ندرت کے لئے اُس کے اندر سمٹ گئے تھے۔ اور میرے لئے اُس کے جوان جسم کی لائنوں اور زاویوں میں مجسم ہو گئے تھے۔ وہ تو اتنی حساس تھی کہ کوئی خوب صورت چیز۔ کوئی خوب صورت لفظ اُس کے ہاتھوں کو لرزش میں مبتلا کر دیتا تھا اور وہ یوں کانپنے لگ جاتی تھی جیسے نرم ٹہنی ہو۔ لیکن وہ اِن تمام باتوں کے باوجود کتنی سخت بھی تھی۔ وہ خوب صورتی

سے متاثر تھی لیکن میں جو اپنی جسمانی خوب صورتی کا سب سے بڑا ہتھیار رکھتا تھا اُس کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔ اور میری یہ بے بسی میرا اپنے پر یقین ڈگمگا رہی تھی۔ ندرت میری پہنچ سے کس طرح دور ہو سکتی تھی۔ پر وہ مجھے بہت ہی دور لگ رہی تھی اور میں دیوانہ وار اُس کو اپنے انتقام کے شکنجے میں دبوچ کر مسل دینے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ میری تمام خوبصورتی اُس کے سامنے اُس کے نازک وجود کی کیا حقیقت تھی۔ اور اُس کی یہی حقیقت ایک تلخ زہر بنتی جا رہی تھی۔ اُس کے اور میرے درمیان ایسی لائن تھی جس کو عبور کرنے کے لئے میں کوئی بھی قیمت چکانے کو تیار تھا۔ یہ خواہش اُس کے جسم کی شدید خواہش تک ہی تو تھی اور میں تو ہمیشہ جسموں کا ہی خریدار رہا تھا۔

میں جب بھی اُس کو فون کرتا تو ایسے ایسے خوبصورت الفاظ میں باتیں کرتا۔ جن میں سچائی اور شرافت کا پَرتو ہو۔ اور جو کھوکھلی آواز بن کر میرے اندر گونجتے رہتے تھے۔

میں اِس کھیل سے تھک چکا تھا۔ جس کا کوئی انجام مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ سچائی اور شرافت کی ایکٹنگ کرتے کرتے میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ وہ میرے پاس آتی تھی اور مزے اور آرام سے باتیں کرتی رہتی جیسے اُس کو میرے وجود کی طاقت سے کوئی خوف نہ ہو۔ مجھے لگتا تھا وہ مجھے نہیں دیکھتی بلکہ اپنے اندر پیدا محبت کے خوب صورت جذبے کی پرستش کر رہی ہو۔ اس نے اپنے لئے ایک خوب صورت اور نازک جال بُن رکھا تھا اور آنکھیں بند کئے اُس کے اندر بیٹھی سب طرف سے غافل ہو چکی تھی۔ اور یہ پھر بھی میرے ہاتھوں کی گرفت سے دُور تھی۔ اُس کے چھونے کی خواہش پر بھی میں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ حالانکہ وہ میرے آفس میں اکیلی ہی ہوتی تھی۔ لیکن میں اپنی کرسی پر بیٹھا سر دھنتا رہتا اور غصے کے مارے پیچ و تاب کھاتا رہتا۔

ایک روز میں نے پوچھا تھا۔ "ندرت کیا تم وجود کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہو؟"

اُس کی ہتھیلیاں پسینے سے نم ہو گئی تھیں اور اُس نے اُن کو پلّو سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ "اسلم وجود آتا تو ہے۔ لیکن اپنے وقت پر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جلدی سے چلی گئی تھی۔

پھر میں نے ندرت کو ملنا چھوڑ دیا اور شکست خوردہ ہو کر اس جذبے کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ میں نے اپنے چپراسی سے کہہ دیا تھا کہ جب مس ندرت آئیں تو کہہ دینا کہ میں مصروف ہوں۔ چند روز بعد جب وہ میرے دفتر کا دروازہ کھولنے لگی تو چپراسی نے کہا تھا۔

مس صاحبہ صاحب بہت مصروف ہیں۔ آپ سے نہیں مل سکتے۔

میں اندر اپنی کرسی پر بیٹھا تن سا گیا تھا اور اپنے اس نئے داؤ کا اثر دیکھنا چاہتا تھا۔ جو مجھے زندگی میں پہلی بار آزمانا پڑا تھا۔

چند ساعتوں تک باہر خاموشی رہی تھی۔ میرے سٹینو کی ٹائپ مشین کی ٹک ٹک میرے سر میں ہتھوڑوں کی مانند لگ رہی تھی اور دفتر کے خوب صورت رنگ ایک دم بے جان سے نظر آنے لگے تھے۔ میری زبان پر کڑوا سا مزہ تھا جو میری شکست نے پیدا کیا تھا۔

چپراسی نے ایک دفعہ پھر کہا تھا۔
"مس صاحبہ۔ صاحب نے ہدایت کی ہے کہ کوئی فالتو آدمی اُن کے دفتر میں نہ آنے پائے۔" ندرت کی آواز سنائی دی تھی..... اُس نے کہا تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بابا" اُس کی آواز میں بے یقینی اور غصہ تھا۔ "مس صاحبہ کہہ جو دیا کہ صاحب مصروف ہیں"۔ "آپ اندر نہیں جا سکتیں۔" چپراسی کی آواز میں بدتمیزی تھی۔ اور اندر بیٹھا میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

"بے کار کا دردِ سر۔ مفت کا جھنجھٹ" میں نے فائلوں کو آگے رکھ کر اُن پر بڑی روانی سے دستخط کرنے شروع کر دیئے اور میرے لبوں سے سیٹی کی مدھم آواز میرے کمرے میں بھر گئی تھی۔ لیکن ساتھ کے کمرے سے ٹائپ مشین کی کھٹ کھٹ کا مجھے نہ جانے ہمیشہ سے زیادہ کیوں احساس ہو رہا تھا.....

"اوہ۔ اتنا شور کیوں ہے آخر۔ کیا تم لوگ آرام سے کام نہیں کر سکتے۔" میں زور سے چلّایا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے ٹائپ مشین کی کھٹ کھٹ میرا مذاق اُڑاتے ہوئے کہہ رہی ہو۔

شکست خوردہ..... شکست..... شکست..... تم ہار گئے ہو۔ ٹائپ مشین چیختی رہی اور میں نے گھبرا کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا... میں نے اُسے لوٹایا ہے میں نے اُس پر فتح حاصل کی ہے.... جھوٹ ہے... جھوٹ ہے کلاک کی ٹک ٹک کہتی رہی اور میں سر کو ہاتھوں میں تھامے فائل کے کھلے کاغذ کو گھورتا بیٹھا رہا تھا۔

فون کی گھنٹی کی مسلسل ٹرن۔ ٹرن..... سے گھبرا کر جب میں نے ریسیور کو اٹھایا تو ندرت کی آواز سنائی دی اور میں نے پوری بات سنے بغیر فون کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اور اپنی پہلی ناکامی پر غصے کے مارے میں نے چپراسی کو بلا کر بلا وجہ خوب ڈانٹا تھا۔

اگلے چند روز میں نے اپنا زیادہ وقت کلب میں گذارا تھا۔ اور تاش کے پتوں میں۔ بیئر کی بوتلوں میں جسم کے موج میں اور زبردستی کے لگائے گئے قہقہوں میں مَیں نے اپنی اِس شکست کو بھولنے کی کوشش کی تھی۔

"پھر کیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا..... میں اب بھی بہت سے جسموں پہ قبضہ کر سکتا ہوں"۔ میں اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔

اُس روز میرے سر میں شدید درد تھا۔ اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ دیوار پر پھیلی بیل کے پتے سوکھ کر گر رہے تھے۔ شہد کی مکھیاں جو بہار میں سارا وقت اِن پھولوں کے بھیتر میں گھسی شہد اکٹھا کرتی رہتیں تھیں۔ کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ صرف چند مکھیاں کبھی کبھار آ کر بیٹھتی اور پھر شروع سردیوں کی ہوا سے گھبرا کر واپس اُڑ جاتیں۔ آسمان دھندلا تھا جیسے ہلکی سی کہر کی چادر نے ساری فضا کو ڈھانپ رکھا ہو۔ میں سگریٹ پیتا ہوا ٹائم کے نئے پرچے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ کہ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ دبے قدموں کی چاپ میری کرسی کی پشت پر آ کر رُک گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ندرت تھی۔

میں اپنی آخری ناکامی کے مٹ جانے پر دِل ہی دِل میں خوش ہو اُٹھا۔ یہ میرا بچھایا جال تھا۔ وہ کس طرح بچ کر جا سکتی تھی بھلا۔ ندرت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس کا چہرہ زرد اور غمگین تھا۔

میں نے اپنے چہرے کو تمام جذبات سے عاری بناتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کو اپنے سامنے پھیلا دیا۔ دھوئیں کی ہلکی تہہ کے پار سے ندرت کے آنسو چمک رہے تھے۔ جو اس کی زرد گالوں پر ایک دھار کی طرح چپکے چپکے بہہ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں خزاں زدہ بیل پر اُڑتی اکیلی تتلی پر جما دیں تھیں۔

"ناراضگی کی وجہ تو بتا دو۔" ندرت کی آواز بےزبانوں کی محرومی تھی۔ وہ کھڑی کھڑی ویرانے میں اکیلی شاخ کی طرح کانپ رہی تھی۔

"وجہ تو کوئی نہیں۔ بس دِل نہیں چاہتا۔" میں نے اپنی آواز میں ساری لاپرواہی لاتے ہوئے جواب دیا۔

اسلم تم چاہتے کیا ہو۔ وہ جھک کر میرے بستر کی پائنتی کے پاس بیٹھ گئی۔ جیسے غم کا بوجھ برداشت نہ کر پا رہی ہو۔

"صرف اپنے پر اعتبار۔" میں بدستور ٹائم کے ورقے پلٹ رہا تھا۔

"وہ تو مجھے دیتے کیا اِس تمام عرصے میں تم اتنا بھی نہیں جان سکے۔ تمہیں معلوم ہو جانا چاہیے تھا اسلم کہ میرے جیسی لڑکی جب ایک مرد کے دفتر میں اکثر اکیلی آتی ہے تو وہ اس پر اعتبار کرتی ہے اور آج جب میں تمہارے گھر چلی آئی ہوں تو اعتبار کے بھروسے ہی تو آئی ہوں

"یہ جھوٹ ہے اور خالی باتیں مجھے مطمئن نہیں کرتیں۔" میں غصے سے بولا اور تازہ جلی سگریٹ کو میں نے زور سے ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا۔

اسلم اِن چند دنوں کی اذیت اور کرب نے میرے اندر کا سارا حوصلہ اور غرور نچوڑ لیا ہے! اسلم یہ محبت اتنی جان لیوا اور دردناک ہوتی ہے۔ اور دوسرا شخص اتنا عزیز اور پیارا لگتا ہے یہ تو مجھے اب ہی معلوم ہوا ہے۔ میں تو اُس پرندے کی مانند ہوں جو فضائے بسیط میں بغیر کسی منزل اور نشان کے اُڑتا پھرے۔ اکیلا اور دکھی۔ بغیر کسی منزل کے مجھے کونسی راہ جانا ہے میں نہیں جانتی۔ میں کیا کروں بولو میں کیا کروں۔ تمہیں حاصل کرنے کیلئے مجھے کن ظلمات کو پار کرنا ہوگا۔ کونسی گہرائیوں میں چھلانگ لگانی پڑیگی بولو مجھے کونسے کانٹوں کو چننا ہوگا بولو ۔ ۔ ۔ ۔ بولو۔ وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھی اور میرا گریباں پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی اور بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ تم نے مجھے ڈس لیا ہے۔ اسلم۔ تم نے ۔ ۔ ۔ تم نے۔ میں نے شاید ایک لمحے کے لئے اپنے دِل میں اُس کے لئے رحم محسوس کیا تھا۔ لیکن دوسرے لمحے میں وہی انسان تھا۔ جو دوسروں کو کچلنے میں ہی لذت پاتا ہو۔ میرا زہر ہی میرا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔

"تم کسی بات میں پوری نہیں اُترو گی۔ تم انتہائی خود پرست اور خود غرض لڑکی ہو۔" میں اُس کی انا کو پوری طرح مجروح کرنا چاہتا تھا۔

"یہ غلط ہے۔" اُس نے میرا گریباں چھوڑ دیا اور لاچار سی میرے سامنے کھڑی رہی۔

"یہ غلط نہیں ہے۔ تم مجھے اِس لئے نہیں مِلتی رہی ہو کہ تم کو مجھ سے کوئی لگاؤ تھا۔ تم محض وقت کٹی کے لئے ایک دلچسپ مشغلہ بنا کر میرے جذبات کو بھڑکاتی رہی ہو۔ اور اب جب میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ تم ایسی شرافت کا ڈھونگ رچاتی

ہو جو تمہارے کردار میں کہیں بھی موجود نہیں۔ تم دوسروں سے کھیلنا چاہتی ہو۔

وہ ایک دم کرسی پر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے سر جھکا لیا۔ اور رونے لگی۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے اَن گنت گھروں کی روشنیاں جھانک رہی تھیں۔ چھتوں پر ٹیلی ویژن کے ایریل تھے۔ روشنیوں کے درمیان سمٹا ہوا اندھیرا تھا۔ اور میں کسی مناسب لفظ کی تلاش میں تھا جو ندرت کے نازک احساسات اور خیالات پر ایک تازیانہ بن کر لگے اور میں اُس کے تڑپنے کا تماشہ دیکھ سکوں۔ میں اِس موقعہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے مہینوں کی تگ و دو کی قیمت وصول کرنے کا موقعہ آ گیا تھا۔ وہ بے بس اور اکیلی تھی اور سرتاسر میرے جادو میں جکڑی ہوئی۔ جسے وہ محبت کا نام دے رہی تھی۔
محبت جس کا کوئی وجود نہیں۔ میرے سامنے بیٹھی لڑکی کا شاداب وجود میرے اس قدر نزدیک تھا۔ میری دسترس میں۔ میرا دل اچانک اُسے اپنی گرفت میں لینے کے لئے مچل اُٹھا۔ اُس کا خوبصورت جسم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور پھر اس جسم کو عریاں دیکھنے کی شدید ہوس میرے اندر پیدا ہوئی۔ میرا خون تیزی سے میری رگوں میں دوڑنے لگا۔

"کیا میری شرافت تمہارے میرے درمیان ایک دیوار ہے اور کیا اِس دیوار کے اس پار بھی تم میرے منتظر ہو گے؟ اگر مجھے اس بات کا پورا یقین ہو تو میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولتی رہی اور مجھے لگا جیسے یہ آواز اُس کی اپنی نہ ہو۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور باہر بھی دنیا خاموش تھی۔ ۔ ۔ ۔ اُس کی آواز میں انجانے اندیشوں کا ارتعاش تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی اور میں اپنی کامیابی پر ہنس رہا تھا۔

میں بستر سے نیچے اتر آیا۔ کھڑکی سے نظر آتا آسمان تاریک ہو گیا تھا۔ اِکا دکا تارے زیادہ واضح اور روشن نظر آ رہے تھے۔ میں نے سگریٹ جلائی اور دھوئیں کے گہرے مرغولے کو اُس کے مُنہ پر چھوڑ دیا۔

"ندرت میرے اور تمہارے درمیان یہ اجنبی پن کیوں ہے"۔ اُس وقت مجھے اپنے اندر کی بڑھتی ہوئی ہوس کو روکنا انتہائی مشکل لگ رہا تھا۔

"اسلم تمہارا ذرا سا بھی غلط قدم مجھے توڑ کر رکھ دے گا۔ تم جانتے ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو میں تمہارے جال میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی لیکن تمہاری باتوں کے جادو نے مجھے بے بس کر دیا۔ اور اگر تم مجھے اب ڈس بھی لو تو میں اُف نہیں کروں گی کچھ نہیں کہوں گی۔ اپنا بچاؤ بھی کر نہ سکوں گی۔" وہ بہت ہی تھکی ہوئی لگ رہی تھی اور اندھیرے میں بیٹھی وہ ایسی چڑیا کی مانند سہمی ہوئی تھی جو شکاری کی زد پر ہو۔

جب میں نے دروازہ بند کر کے اُس کی طرف قدم بڑھایا تو وہ بدستور سر جھکائے رو رہی تھی۔ میرے تیز قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور کھڑی ہو گئی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے میں نے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے سوچا تھا "کیا ہوا اگر ندرت کا جسم نہ ہو، کوئی اور جسم ہو۔ جسموں میں کیا فرق ہے" لیکن دوسرے لمحے غصے کی تیز لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ میں اتنے مہینوں اِس لڑکی کی خاطر اپنا سکون مٹا رہا ہوں۔ اور یہ لڑکی لذتوں کی مٹھاس میں ریت بن کر میرے تمام مزے کو کرکرا کرتی رہی ہے۔

"یہ میرے اِس کمرے میں آ کر بھی اپنی حفاظت کا سوچتی رہی ہے۔ میں نے میز کو زور سے نفرت بھری ٹھوکر ماری۔ یہ ٹھوکر

ندرت کی پاکیزگی اور شرافت کو تھی۔ جس کی حیثیت میرے اندھے جذبات کے سامنے کچھ نہیں تھی۔

"ندرت خانم دوسروں کے جذبات کو ابھارنا اور پھر دور کھڑے ہو کر دوسروں کا تماشا دیکھنا اتنا آسان نہیں۔ اس کی کچھ قیمت دینی پڑتی ہے۔"

یہ تم ہو۔ یہ تم ہو جس کے لئے میں نے اتنی ذہنی اذیت برداشت کی۔ اِتنے دِنوں کرب اور عذاب میں مبتلا رہی۔ وہ حیرانگی سے بولی۔

"میں شکست کا عادی نہیں ہوں ندرت خانم۔ ہم دونوں میں سے ایک کو ہارنا ہوگا اور وہ تم ہو ندرت خانم تم۔ تم کوئی نہیں ہو صرف ایک جسم ہو جس کی خواہش مجھے تھی اور ہے۔ اور اب میں ہمیشہ کی طرح۔ دوسرے جسموں کی طرح اس کو بھی روند ڈالوں گا۔ اور تم کچھ نہ کر سکو گی۔ کچھ نہ سکو گی۔ کیا کہو گی اور کیونکر کہو گی۔ میں اس تپش کا عادی نہیں ہوں اور تمہیں اس کی قیمت دینی پڑے گی۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ اور وہ کچھ اور پیچھے ہٹ گئی "قیمت کا یقین صرف تمہارے ہی اختیار میں نہیں ہے۔" اُس نے آگے بڑھ کر اپنی پوری طاقت سے ایک تھپڑ میرے منہ پر دے مارا۔

اور پھر نہ جانے کیسے ایک وحشی کی طاقت سے میں نے اُس کو دبوچ لیا۔ اور جب روشنی جلا کر میں نے اُس کو دیکھنا چاہا تو اُس نے اپنی بہتی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لئے۔ اور گھٹی گھٹی آواز میں کہنے لگی۔

"روشنی بجھا دو خدا کے لئے روشنی بجھا دو۔" میں نے اُس پہ ایک نظر ڈالی جو خواہش اور انتقام کی تپش سے دہک رہی تھی۔ پر یکایک نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا کہ اُس برہنہ جسم کا تقدس اور پاکیزگی مجھے ایسی لگی تھی جو میری پہنچ سے بہت دور ہو۔ جو سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ ہو۔ جو شبنم کی مانند ہاتھوں کی پوروں سے اوجھل ہو جانے والی ہو۔ میں وہاں کھڑا پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔

"روشنی بجھا دو۔ خدا کے لئے روشنی بجھا دو۔ کھڑکی بند کر دو۔" اس کی آواز ایسے آ رہی تھی جیسے کوئی ڈوبتا انسان مدد کے لئے پانی کی تہ سے پکار رہا ہو۔ میں نے اُس کو آخری چرکا لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا تم اس جسم کے تقدس کی حفاظت کرنا چاہتی تھیں لیکن اب جبکہ تم میری پہنچ سے اس قدر نزدیک ہو۔ مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔ بس میرا انتقام تھا جو میری مجروح انا کے سب زخم مندمل کر گیا۔" اُس کے ہاتھ ابھی تک اُس کے چہرے پر دھرے تھے۔ یہ کہتے ہوئے بھی میں جانتا تھا کہ ایسے بھی میں ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول رہا ہوں میں اگر اُس کی طرف بڑھنا بھی چاہتا تو نہیں بڑھ سکتا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی آنکھوں کو بند کر لیا تھا اور اُسے اپنے گھر سے چلے جانے کو کہا تھا۔ اور پھر وہ چلی گئی تھی۔ اور میں دِنوں ہی اُس حسین مجسمے کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ وہ مجسمہ جو ہمیشہ میرے لاشعور کے پردے پر ٹھہرا رہتا اور پھر مجھے لگا جیسے میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ پر پچھلی رات جب راحیلہ کی کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی تو ندرت اپنی فتح پہ ہنس رہی تھی۔ دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی اور اُس کے چہرے پر دھرے دونوں ہاتھ آنسوؤں سے تر تھے۔

گہن

قیّوم راہی

تھوڑی ہی دور سامنے مخالف سمت والے فٹ پاتھ پر جب اس نے جبار کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی اپنی نگاہیں پھیر لیں اور یوں کترا کر تیزی سے دوسری سڑک پر مڑ گیا جیسے کوئی قرض دار اس شخص کو دیکھتے ہی گھبرا کر چھپنے کی کوشش کرنے لگتا ہے جس سے اس نے قرض لے رکھا ہو اور کئی بار اسے ٹال چکا ہو۔

لیکن اس نے اپنے دوست جبار سے نہ تو کچھ قرض لیا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی لڑائی جھگڑا تھا اس کا، پھر بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت جبار سے آمنا سامنا ہو اور نوبت بات چیت تک پہنچ جائے ——— دراصل ان دنوں کچھ عرصے سے وہ ایک عجیب قسم کی بیزاری اور بے دلی کا شکار ہوتا جا رہا تھا، جس کے باعث وہ تنہا ہو کر رہ گیا تھا جی ہی نہیں چاہتا کسی سے ملنے کو، بات کرنے کو سب باتیں کھوکھلی اور بے معنی معلوم ہونے لگی تھیں حتیٰ کہ زندگی تک کا مقصد مشکوک ہو گیا تھا ——— وہ تو بس ان دنوں آگہی کے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

اس منزل پر پہنچنے سے قبل اسے ایک لمبا سفر طے کرنا پڑا تھا، اس سفر کے دوران حقائق کی روشنیوں نے اس کو بہت سے ایک کونوں سے روشناس کرایا تھا اور تب اس نے کتنے ہی لوگوں کے ظاہر و باطن کا تماشا دیکھا تھا۔ یہ تماشا دیکھ کر پہلے پہل اس کا خون کھولتا تھا۔ اور کبھی کبھار وہ بے قابو ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا جی چاہتا منافقت کے ہر ناگ کو سختی سے کچل ڈالے، نیست و نابود کر دے۔ لیکن جلد ہی جب اس کو اپنی بے بسی کا احساس ہوا تو اس کے خیالات نفرتوں کی آنچ میں تپنے لگے، پھر رفتہ رفتہ اس نے لاتعلقی کا راستہ اپنا لیا، یہاں تک کہ تنہائیاں اس کا مقدر بن گئیں ——— گھر پر اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ جو وہ آنکھیں پہلے ایک آس کے ساتھ اس کو تکتی تھیں، پھر ان میں شکایت کی جھلک ہوتی تھی، اور اب مایوسی کے سائے ڈولتے تھے، اسے احساس تھا کہ وہ بیوی بچوں کے جائز مطالبات پورے نہیں کر پاتا ——— اس سلسلے میں اس نے مسلسل تگ و دو کی تھی، بڑے بڑے جتن کئے تھے، تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خاصے تجربے اور اہلیت سے بھی مالا مال تھا۔ اور یوں کئی بہتر ملازمتوں کے لئے موزوں ترین فرد تھا۔ اسی لئے اس نے مستقبل کے لئے خوشحال زندگی کے خواب دیکھے تھے، جن کے لئے وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ لیکن مسلسل نظر انداز ہونے کے باعث اس کے خوابوں کے دھنک رنگ پیرہن تار تار ہو کر محدود فضاؤں میں بکھر گئے تھے اور اس کی امیدوں کا محل مسمار ہو گیا تھا اور وہ کف افسوس مل کر رہ گیا تھا حتیٰ کہ اس نے شکست تسلیم کر لی تھی اور اس موضوع پر سوچنا تک ترک کر دیا تھا ——— گھر میں اس کی نگاہیں جھکی جھکی رہتی تھیں اور اکثر اس کے ذہن و دل میں دھواں سا پھیلنے لگتا تھا۔

چند دنوں سے اس کے مزاج کی تلخی اور بجھی بجھی سی کیفیت نقطۂ عروج تک پہنچ گئی تھی، تب ہی سے اس نے خود کو تیاگ

پینے پر مجبور پایا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں سے اس نے خود کو دفتری اوقات کے بعد گھر کے ایک چھوٹے کمرے میں مقید کر لیا تھا اور اس کے منہ کو چپ سی لگ گئی تھی، گہری اور پراسرار چپ ——— بیشتر اوقات وہ طرح طرح کی حوصلہ شکن سوچوں میں ڈوبا رہتا تھا، کبھی کبھار اس کی بیوی نے اسے آہیں بھرتے ہوئے بھی دیکھا تھا، ایک دو بار اس نے شوہر سے اس بارے میں دریافت بھی کیا تھا لیکن اس نے بے تکے جواب دے کر بیوی کو ٹال دیا تھا۔ چنانچہ بیوی کو بھی ٹھنڈے سانس بھر کر خاموش ہونا پڑا تھا۔ رہا سوال بچوں کا، تو وہ ان سے بھی کترایا کترایا رہتا تھا، الگ تھلگ، جیسے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو اُن سے یوں بچے بھی اس سے بات کرتے ہوئے اس کے سامنے جاتے ہوئے سہم جاتے تھے، اس لئے زیادہ وقت باپ کی نظروں سے اوجھل ہی رہتے تھے۔ دوستوں اور دیگر ملنے والوں سے بھی گھر پہ کوئی نہیں آتا تھا، پہلے ہمیشہ باہر ہی ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، اُن کی باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، بلکہ بعض اوقات تو کوفت محسوس ہونے لگتی تھی ——— چنانچہ گوشۂ تنہائی میں پناہ لے کر اس نے ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہر لحظہ بے قرار اور مضطرب بلکہ ایک عذاب میں مبتلا رہتا تھا۔

لیکن آج اچانک ایک رو بہا کر اسے گھر سے باہر لے آئی تھی۔

جبار نے اس کو نہیں دیکھا تھا اس لئے جبار اپنی راہ پر گامزن رہا ——— اور وہ مخالف سمت چلتا چلتا دور نکل گیا، آپ ہی آپ اس کے قدم کسی دوسری سڑک پر مڑ جاتے تھے، ——— وہ ابھی تک طے نہیں کر پایا تھا کہ اس کو کدھر جانا ہے، کیوں جانا ہے۔ کیا کرنا ہے ——— ایک کشادہ سڑک پر مڑتے ہوئے اس نے دیکھا دور مغربی افق پر سورج غروب ہو رہا تھا، ——— ایک دن زندگی کا بھی یہی انجام ہونا ہے، اس نے گہرا سانس لے کر سوچا ——— فرق اتنا ہے کہ یہ سورج کل پھر طلوع ہو جائے گا، لیکن زندگی کا سورج ایک بار غروب ہو جائے تو پھر طلوع نہیں ہوتا۔

"یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں" قریب ہی کسی ریستوران میں رفیع کی درد بھری آواز گونج رہی تھی۔ اس نے یہ گانا کافی دنوں کے بعد سنا تھا ——— پہلے اسے اس کی دھن اور ساز پسند تھے، لیکن اب رفیع کی آواز سوز میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے دل، اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔ اور ایک ایک بول کا مطلب آپ ہی آپ اس پر عیاں ہوتا جا رہا تھا، فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے اس نے پورا گانا سنا اور اس کے سینے میں ایک قسم سی گھلتی رہی۔

کیوں نہ ایک پیالی چائے پی لی جائے ——— اس نے سوچا، اور اس کے قدم ریستوران کی جانب بڑھ گئے، اسے یکایک جماہی آئی، کتنی ہی راتوں سے وہ بے چین تھا، کبھی یوں ہوتا کہ رات گئے تک نیند نہیں آتی تھی، پھر تھوڑی دیر تک سوتا اور آنکھ کھل جاتی، طرح طرح کے پریشان کن خیالات اس کے حواس پر چھانے لگتے اور وہ ایک انجانے خوف سے سہما ہوا، دم سادھے، آنکھیں میچے سونے کی کوشش کرتا رہتا۔ آنکھیں کھولتا تو اسے بے کراں اندھیرے اور بے اماں سناٹے میں یوں لگتا جیسے وہ اپنے کمرے کی بجائے قبر میں لیٹا ہوا ہو، ——— کروٹیں بدل بدل کر وہ تنگ آ جاتا حتیٰ کہ رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھیں مُندنے جاتیں ——— سوتے میں بھی اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ بے تکے، ڈراؤنے مایوس کن خواب اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے ——— جب وہ ریستوران میں سب سے الگ تھلگ ایک گوشے میں بیٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ تھک چکا

تھا اور اب بیٹھنے کے بعد اس کو آرام ملا تھا — فوراً ہی اسے کئی دن قبل کی ایک دوپہر یاد آگئی جب وہ مسلسل کئی گھنٹے برفیلے موسم میں دفتر کا کام مکمل کرنے کے بعد باہر دھوپ میں آیا تھا، کچھ اسی قسم کا آرام اسے اس وقت ملا تھا۔ کافی دیر وہ دھوپ کی تمازت سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

بیرے نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھی تو اس کے خیالات کا دھاگہ ٹوٹ گیا۔ آج وہ ضرور آرام سے سوئے گا۔

اس نے جلدی جلدی گرم چائے پی ڈالی، گویا اسے کوئی اشد ضروری کام یاد آ گیا ہو پھر اس نے بل ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر وہ فٹ پاتھ پر کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔ پھر اس نے اس سڑک کا رخ کیا جس پر بہت سے سینما ہاؤس تھے، کافی دیر تک وہ وقت گزارنے کے لئے ایک ایک پکچر ہاؤس میں داخل ہوتا رہا اور تصاویر کے سیٹوں کو یوں دیکھتا رہا جیسے اسے فلم بینی کا بے حد شوق ہو ——— جب وہ اس شغل سے اکتا گیا تو اسے بھوک محسوس ہونے لگی اور وہ ایک نان چھولوں والے کی طرف بڑھ گیا۔ روٹی کھانے کے بعد وہ ایک ایسے راستے پر ہو لیا جہاں بہت کم آمد و رفت تھی ——— اس سڑک پر چلتے چلتے اسے ریلوے اسٹیشن کا خیال آیا اور وہ فوراً ہی ادھر چل پڑا۔

تکان کے باوجود وہ رات گئے تک گھومتا رہا حتیٰ کہ اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔ تب اسے گھر کی یاد آئی ——— موسم گذشتہ ہفتے سے بہتر ہو گیا تھا۔ وہ پہلی سی ٹھنڈ نہیں تھی۔ ادھر لگاتار چلنے کے باعث اس کا جسم گرم تھا۔

گلی سنسان تھی۔ محلے کے بازار کی تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سوائے ایک ریستوران کے جو عموماً دیسے ہی بند ہوتا تھا — اندر بھی سناٹا تھا اور باہر بھی خاموشی ——— خاموشی اور ویرانی بھی ——— اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے اور ٹانگیں جسم کا بوجھ سہارنے پر احتجاج کر رہی تھیں۔ اس نے دھیرے سے کنڈی کھٹکھٹائی، اس کی بیوی نے دروازہ کھولا اور وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا — سب بچے سوئے ہوئے تھے۔

"کھانا لاؤں"۔ اس کی بیوی نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں"۔

وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کوٹھری میں چلا گیا۔

جب اس نے جوتوں میں سے پاؤں باہر نکالے تو بھنچی ہوئی، دکھتی ہوئی انگلیوں کو آزادی ملی۔ انگلیوں کو حرکت میں لایا تو ان میں اسے ایک ٹیس سی محسوس ہوئی۔ اس تکلیف میں اسے ایک انجانا سا، انوکھا سا لطف آیا، ——— اس کی آنکھیں نیند کے غلبے سے بری طرح بوجھل تھیں اور بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا ——— اس نے دیکھا برابر والے پلنگ پر اس کی بیوی منہ ڈھانپے لیٹی تھی۔ اس نے کوئی بات کرنے کے بارے میں سوچا، لیکن تکان اور نیند کے باعث اس پر غنودگی کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس لئے وہ بتی بجھا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے لحاف اوڑھا تو وہ گرم تھا ——— اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں۔ بھاری بھاری پپوٹے ——— دکھتا ہوا، گرم گرم جسم ——— آج اسے بستر میں لیٹ کر بڑا آرام مل رہا تھا۔ نہ سوچوں کی یلغار۔ نہ سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلنا ——— بس چند ہی منٹوں کے بعد وہ گہری اور پرسکون نیند کی آغوش میں بے سدھ پڑا تھا۔

نشیب

ریاض میرزا

اس کا رنگ کیسر کی طرح زرد پڑ گیا۔ جسم ٹھنڈے پسینے میں تر ہو گیا، کنپٹی زور زور سے پھڑکنے لگی اور اسے یوں لگا جیسے دماغ کی شریان پھٹنے والی ہو، جانے کب تک وہ اسی حالت میں کھڑا رہا، ساکت، گم صم، لرزتے ہاتھوں میں اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ اس کا جی چاہا کہ اس گھر کے درو دیوار کو جلا کر خاک کر ڈالے اور اس آگ میں گھر کے سارے افراد سوکھی گھاس کی طرح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"میں نے کہا نازکے ابا! ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" باورچی خانے سے اس کی بیوی کی تیز اور نوکیلی آواز نے اس کی سوچ کو تہ و بالا کر دیا، وہ وہیں کھڑا رہا، شاید دوسری آواز کا انتظار کر رہا تھا۔

"نازکے ابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

عبدالستار کے چہرے پر ایک زہر خند پھیل گیا اور وہ دروازے کی جانب بڑھنے لگا، آہستہ قدم، تھکا ہارا۔

نازنین اس کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی، جو اس وقت دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ پہلے اس کی بیوی اسے رحمٰن کے ابا کہہ کے پکارا کرتی تھی، عبدالرحمٰن اُن کا سب سے بڑا بیٹا تھا، جو ان کی شادی کے پانچویں برس میں بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ پھر تو گویا دبستان کھل گیا، عبدالرحیم، آمنہ، عائشہ، عبدالکریم اور پھر نازنین، پروین۔ نازنین پیدا ہوئی تو نہایت خوبصورت بچی تھی، گھر کے سارے لوگ اسے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ اور ماں باپ تو اسے ہر دم یوں سینے سے لگائے پھرتے تھے جیسے وہ ان کی اکلوتی اولاد ہو، اس کا نام بھی انہوں نے سب سے مختلف اور ماڈرن قسم کا رکھا، اور لاڈ پیار بھی سب سے زیادہ ہی کیا، عبدالستار گھر لوٹتا تو سب سے پہلے اسی کا پوچھتا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس کی بیوی نے اس کے چہرے کے تغیر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے۔" اس نے جلدی جلدی کھانا حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے جیسے آپ پریشان ہیں، کیا پریشانی ہے؟

"کوئی پریشانی نہیں، بس ذرا کاروباری مسائل ہیں۔"

"کتنی دفعہ کہا ہے، بچے بڑے ہو گئے ہیں، کاروبار سنبھالنے کے قابل ہیں، اب آپ آرام کریں سب کچھ انہی کے سپرد کر دیں۔"

"اب ایسا ہی کروں گا۔"

عبدالستار کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم اس میں پہلے ہی شریک تھے۔ رحمٰن بزنس کا کام سنبھالے ہوئے تھا،

اور رحیم دوسرے شہروں میں جا کر کتابوں کے آرڈر حاصل کرتا، عبدالستار خود دکان پہ بیٹھتا اور یہ ذمہ داری وہ کسی دوسرے کے سپرد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اگرچہ اس کی دکان دوسری کتابوں کی دکانوں سے الگ تھلگ اور شہر سے کچھ فاصلے پر تھی، مگر چند ہی سالوں میں اس نے بزنس میں اتنی ترقی کر لی تھی، اور دکان اتنی چل نکلی تھی کہ دوسرے دکاندار اس سے جلنے لگے تھے۔

اس نے تیس برس سرکاری ملازمت کی تھی باوقار اور باعزت طور سے ریٹائر ہوا تھا وہ ایک نہایت محنتی سرکاری قواعد و ضوابط کا پابند، انتہائی ایماندار اور قابل اعتماد اہل کار تھا، افسران اس پہ بھروسہ کرتے تھے اور اس کی عمدہ کارکردگی اور اہلیت و قابلیت پہ خوش تھے۔ اس نے بھی حکومتی کاروبار میں نہ تو کبھی تساہل برتا اور نہ کبھی حکام بالا کے اعتماد کو ٹھکرایا تھا، اس نے بڑے بڑے سخت گیر اور راشی افسروں کے ساتھ کام کیا تھا، مگر اس کے خلاف اس کے ریکارڈ میں کہیں سرخ اندراج نہ ہوا، عمر بھر وہ حکومت کی نہایت اہم اور کلیدی آسامیوں پہ کام کرتا رہا۔ جہاں ہن برستا، پیسے کی بارش ہوتی، وہ چاہتا تو ملازمت کے چند ہی سالوں میں اتنا کما سکتا تھا کہ اس کی اگلی پشتیں ایک امیرانہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر سکتی تھیں، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ ٹھاٹھ یہیں پڑا رہ جائے گا اس کی اولاد زیادہ ہوتی چلی گئی اور وسائل کم اور اس وجہ سے سخت پریشانیوں کا سامنا ہوتا، لیکن وہ خدا کا بندہ انھیں برداشت کرتا اور کبھی تنگ دستی کی شکایت کسی سے نہ کرتا۔

"تمہارا توکل ہمیں تو لے ڈوبے گا" اس کی بیوی اسے طعنے دیتی، اسے اپنے ہمسائے میں رہنے والے خورشید احمد کی مثال دیتی، جو کسی سرکاری دفتر میں ایک ادنیٰ سا ملازم تھا، مگر اس کے بچے انگریزی سکولوں میں پڑھتے تھے، اس کا ذاتی مکان بھی تھا اور اس کی بیوی نہایت قیمتی لباس پہنتی تھی، گھر میں ٹی وی بھی تھا اور فرج بھی۔

مگر اس کی عاقبت .... وہ اسے سمجھانا چاہتا تو وہ اس کی بات ٹوک دیتی "عاقبت کی کون جانے، ہم تو یہاں بھی جہنم ہی میں ہیں"۔

وہ شاید سچ ہی کہہ رہی تھی، وہ سوچتا۔ اس نے میرے گھر میں کوئی سکھ بھی تو نہیں دیکھا، مگر..... مگر... رشوت! اور وہ یوں کانپنے لگتا خوف سے، جیسے بخار میں مبتلا ہو، اور اسے یوں لگتا جیسے وہ اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں کبھی وہ نوٹ تھام نہیں سکے گا جو رزق حرام ہوں۔

اس وقت وہ ایک بے بس، مجبور و مظلوم مجرم کی طرح اپنی روتی ہوئی بیوی کے سامنے کھڑا ہوتا، اور زبان حال سے فریاد کرتا۔

"مت رو، رحمٰن کی ماں، مجھے معاف کر دے، میں بزدل ہوں، ڈرپوک ہوں مجھ میں اتنی ہمت نہیں، میں اپنے بچوں کا قاتل اور تمہارا مجرم ہوں"

زندگی یوں ہی گزرتی رہی اس کی بیوی ہر روز اپنے نصیبے کا ماتم کرتی رہی وہ ہر روز اس کے سامنے ایک ملزم کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہو کر فریاد کرتا دفتر میں اس کے سامنے ہزاروں کے نوٹ رقص کرتے، اس کا دل دھڑکتا، اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں، اس کا ذہن منتشر ہوتا، مگر اس کا ضمیر

رکتا، اور شام جب وہ دفتر بند کر کے اٹھتا، تو اس کے ہاتھ خالی ہوتے مگر اس کا دل مطمئن، آسودگی کا ایک اور دن گزر گیا تھا، اور اس کا دامن اس میں تر نہ ہوا تھا، وہ بڑے فخر سے باہر نکلتا، آج بھی اس نے اپنا دفاع کر لیا تھا، غلاظت کے اندھے کنوئیں میں گرنے سے اپنے آپ کو بچا لیا تھا، یہ بات وہ اپنی بیوی کو آج بھی سمجھائے گا۔

ریٹائرمنٹ پہ اس کی کئی الوداعی دعوتیں ہوئی تھیں، اس کی نیک نامی، شرافت، کام سے والہانہ لگن، بے داغ سروس اور بے لوث خدمت اور ایمانداری کی تعریفیں ہوتی تھیں، اس کی تصاویر اخبارات میں چھپی تھیں، ہر دعوت کے اختتام پر جب وہ گھر لوٹتا تو اسے اپنے میں ایک تبدیلی کا احساس ہوتا، ان دنوں پہلی بار اسے یہ احساس ہوا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ایک بڑا آدمی ہے بڑائی صرف دولت سے نہیں ملتی، جاہ و منصب اور اقتدار ہی اس کا ذریعہ نہیں، بڑائی اور عزت بے لوث خدمت اور ایمانداری سے بھی حاصل کی جاتی ہے۔ اس نے اپنے ماضی کے ایک ایک دن کا حساب کیا اور اسے لگا جیسے ہر نیا دن، گزرے ہوئے دن سے زیادہ بہتر، روشن، امید افزا اور قابلِ فخر رہا۔

اور اب اس کے سامنے مستقبل تھا، صدیوں تک پھیلا ہوا مستقبل، وسیع و عریض، پیچ در پیچ، مسائل سے بھرپور فرائض اَن گنت ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پہ اٹھائے ہوئے، زرد رو مستقبل اور محدود وسائل پنشن نہ ہونے کے برابر اور اخراجات لامحدود دو بچے کالج میں زیرِ تعلیم اور تین بچے سکول جاتے تھے، ایک بیٹی شادی کی منزل پہ، جو اب جوانی کو خیرباد کہہ رہی تھی، اور اس کی اس وقت سب سے زیادہ فکر تھی، پراویڈنٹ فنڈ کی رقم میں سے وہ دو کام کرنا چاہتا تھا، بیٹی کی شادی اور کوئی کاروبار، شادی کے لئے رشتے کا انتظار تھا دراصل یہ انتظار تو پچھلے کئی برسوں سے تھا، دو تین رشتے آئے مگر پھر انہوں نے خبر تک نہ دی، رشتے کرانے والی "وچولی" نے ایک دفعہ عبدالستار سے کہا۔

"بھائی جی، لڑکے والوں سے آپ یہ تو کہہ دیا کریں کہ یہ مکان آپ کا ذاتی ہے۔"

عبدالستار کا رنگ یہ بات سن کر پھیکا پڑ گیا، وہ یہ جھوٹ بولنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔

"بہن جی، اس نے پوچھا، میرے اور میری اولاد کے پاس شرافت ہے، کیا اس کا کوئی مول نہیں۔"

وچولی نے رحم بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب میں کہا۔

"بھائی جی، یہ سکہ اب رائج الوقت نہیں۔"

عبدالستار کو یوں لگا جیسے وچولی نے اس کی داڑھی نوچ لی ہو، اور جیسے آمنہ، عائشہ، سکینہ اور نازمین اس کے گرد ایک وحشیانہ ناچ میں مصروف ہوں اور ان کے مونہوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں اور ان شعلوں میں ان کی چتائیں جل رہی ہوں اور پھر یک بیک ان چتاؤں میں سے ان کی بے گور و کفن لاشیں اٹھ کر اس کی طرف بڑھنے لگی ہوں، ان کے مسخ شدہ چہروں پہ خوفناک ہنسی تھی اور وہ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔

"آخر، تم نے ہمیں جنم کیوں دیا تھا؟"

"تم رشتے کی تلاش جاری رکھو بہن، کسی غریب گھر کا رشتہ ہو، باقی اللہ پہ چھوڑ دو، میں یوں ہی تو بیٹھا نہیں رہوں گا، چلدی کر دو"

کاروبار شروع کر دوں گا، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

کاروبار کے لئے اس کے پاس کوئی منصوبہ نہ تھا، اس سلسلے میں اس نے پہلے کبھی سوچا ہی نہ تھا، ساری زندگی ہی وہ دفتر کے کام میں گم رہا تھا، اب اس نے لوگوں سے معلومات حاصل کرنا شروع کیں، کئی مہینوں کی چھان بین اور معلومات کے بعد اسے دو کام پسند آئے، دوائیوں کی دکان یا پھر کتابوں کا کاروبار، دونوں ہی شریفانہ کاروبار تھے۔ ادویات کی دکان شروع کرنے کے لئے زیادہ سرمائے کی ضرورت تھی اور اس کے لئے ممکن نہ تھا، تجربے کے علاوہ اس میں کچھ ایسے رموز بھی تھے، مثلاً بلیک مارکیٹنگ جیسے اس کا صاف اور شفاف ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا، البتہ کتابوں کا بزنس ضرور ایسا تھا جس میں عزت سادات بھی قائم رہتی تھی، اور زیادہ سرمائے کی ضرورت بھی نہ تھی، اور اس میں ناجائز اور گھٹیا ذرائع سے آمدنی بڑھانے کے امکانات بھی بہت کم تھے، یوں بھی اچھی اچھی کتابیں رکھنے اور پڑھنے کا اسے ذوق اگرچہ تھا مگر عدیم الفرصتی اور محدود آمدن کی بنا پر یہ شوق آج تک تشنہ ہی رہا تھا، چنانچہ اپنے اس فیصلے پر وہ مطمئن بھی تھا اور خوش بھی، اور اب وہ اسے جلد از جلد عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا، دکان کا ایک خوب صورت سا نقشہ اس نے اپنے دل و دماغ میں تیار کر لیا تھا۔

بہت کوشش سے اسے ایک چھوٹی سی دکان مل گئی، یہ دکان اگرچہ شہر سے دور تھی، مگر اس کاروبار کے لئے موزوں جگہ پر واقع تھی، یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر لڑکیوں کا کالج تھا۔ اور لڑکوں کا سکول بھی زیادہ دور نہ تھا، دکان کی کامیابی کے لئے یہ بات خاصی ہمت افزا اور باعث تسلی تھی۔

دکان کی تزئین اس نے بڑے اہتمام سے کی، حسن کاری اور سلیقے سے اس کی زیبائش کی اور فراخ دلی سے پیسہ لگایا، بیوی کی مخالفت کے باوجود۔ اس کے بعد اب کتابوں کے انتخاب کا مسئلہ تھا، اقبال اور غالب کو تو وہ عظیم شعرا کی حیثیت سے جانتا تھا، کبھی کبھار انھیں پڑھنے کا موقعہ بھی اسے ملا تھا، مگر ادبا اور شعرا کے بارے میں اس کی واقفیت بہت محدود تھی، چنانچہ اس سلسلے میں اس نے معلومات اکٹھا کیں، وہ دانشوروں اور ادیبوں سے ملا، ادب کے اساتذہ سے ملا، علما سے بات چیت کی، بڑی بڑی دکانوں میں گیا اور اس طرح اس نے صاف ستھرے اور اعلیٰ پایہ کی کتابوں کی فہرست تیار کی، اعلیٰ ادب کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی خیال رکھا کہ یہ کتابیں نفیس اور عمدہ چھپی ہوں، خوب صورت ہوں، اس کا خیال تھا کہ شائستہ لوگوں اور شستہ ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ دکان علم و ادب کا کعبہ بن جائے گی، علم کے پیاسے اور ادب کے جویا دور دور سے اس کی زیارت کے لئے آیا کریں گے اور جب دکان سجی تو واقعی اس کے خوابوں کی تعبیر تھی، علم و فن کے شاہکار، ہیرے موتی اور جواہرات کی طرح پوری آب و تاب سے وہاں چمک رہے تھے۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے اس کا افتتاح کیا اور شہر والوں نے بڑے فخر سے "دارالادب" کا ذکر کیا، افتتاحی تقریب پر حاضرین نے عبدالستار کے مقدس ارادوں کی تکمیل کی دعائیں کیں اور داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے مگر حاضرین نے چائے پی اور چل دیئے، کسی نے ایک کتاب نہ خریدی، عبدالستار نے ڈپٹی کمشنر کو دیوان غالب کا ایک نہایت قیمتی نسخہ پیش کیا جو انہوں نے بخوشی قبول کر لیا، ضلع کے دوسرے حکام اور معززین شہر کے دلوں میں بھی یہ خواہش تھی کہ اتنا بیش قیمت نسخہ نہ سہی کچھ کم قیمت کی کتاب انھیں بھی پیش کی جاتی تو یہ موقعہ ایک عہد آفریں اور یادگار تقریب بن جاتا، مگر عبدالستار اتنی استطاعت نہ رکھتا تھا، بعد میں

نے رخصت ہوتے وقت للچائی ہوئی نظروں سے ڈپٹی کمشنر کے تحفے کی طرف دیکھا اور حسرت بھری نگاہوں سے علم و ادب کے خزانوں کو دیکھتے ہوئے گھروں کو روانہ ہوئے، کچھ لوگوں نے وہیں سے سینما کا رخ کیا جہاں آج جمعۃ المبارک کے دن ایک نئی اور مشہور فلم کا افتتاح ہوا تھا، اور جس کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے شو ٹائم سے بہت پہلے پہنچنا ضروری تھا۔

وہ باقاعدگی سے صبح نو بجے دکان کھولتا اور رات آٹھ بجے تک بیٹھا رہتا، مگر ایک ہفتے میں پہلے وہ ایک دن کچھ لوگ اس دکان کا پرچا سن کر اسے دیکھنے ضرور آئے، انہوں نے کتابوں کی ورق گردانی بھی کی، عبدالستار کے اعلیٰ انتخاب کی داد بھی دی اور بغیر کچھ خریدے واپس چلے گئے، کچھ نے تبصرہ کے طور پہ کہا کہ کتابوں کی قیمتیں تو آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ اس ایک ہفتہ میں ایک خریدار آیا، اس نے مقدمہ شعر و شاعری مانگی، جو نصاب کی کتاب تھی، عبدالستار نے پیش کی تو خریدار جو ایک طالب علم تھا، نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ مجھے تو اس کا سستا ایڈیشن چاہیے، اتنا مہنگا تو میں AFFORD نہیں کر سکتا، اور پھر اس کتاب پر میری سگرٹ کی دو ڈبیا بھی شامل ہیں، جن کے لئے ڈیڈی مجھے الگ خرچ تو دیتے نہیں، ویسے تو کتابوں کے بغیر بھی کام چلتا ہے۔ مگر ہمارے ایک استاد ہیں جو اس کے خریدنے پہ اصرار کر رہے ہیں، ورنہ کلاس سے نکال دینے کی دھمکی دیتے ہیں یوں لگتا ہے جیسے اس کتاب کی فروخت میں ان کا بھی کمیشن ہے۔"

دیکھنے میں وہ لڑکا جو غالباً انٹر کا طالب علم تھا، بڑا بھولا بھالا سا لگتا تھا، مگر اس کی باتوں میں ایک درشتگی تھی، اس کا لہجہ تلخ تھا اور آنکھوں میں بدمعاشی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کے پورے سیاہ ہو رہے تھے جو بے تحاشہ سگریٹ نوشی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ ایک شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے دکان سے باہر نکلا تو عبدالستار کو یوں محسوس ہوا جیسے کچھ تعلق کم ہو گیا ہو، اس طالب علم کی باتوں پہ وہ جتنا سوچتا اتنا ہی خوفزدہ ہوتا جاتا، یہ کیسا زمانہ آ گیا تھا جس وقت وہ طالب علم تھا، وہ تو کچھ اور ہی وقت تھا، احترام کا زمانہ، کتابوں کا احترام، استاد کا احترام!

ایک مہینہ گزر گیا، ایک کتاب بکی، 'بانگِ درا' وہ بھی اس لئے کہ نصاب میں شامل تھی اور شاید اس کتاب میں کسی استاد کا کمیشن نہ تھا اور شاید اس لئے بھی کہ اس کا کوئی دوسرا یا چیپ ایڈیشن نہیں تھا، اُدھر گھر میں ہر لمحہ اس کی مخالفت بڑھتی جا رہی تھی، پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ زیادہ تر دکان کی نذر ہو چکا تھا، باقی بڑی تیزی سے گھر کے مصارف پہ خرچ ہو رہا تھا، پنشن بہت معمولی تھی، اور آمنہ کے لئے ایک رشتہ بھی آ چکا تھا، وہ لڑکا کسی دفتر میں ایک معمولی سا کلرک تھا، مگر اس کے دیہاتی والدین کا مطالبہ تھا کہ لڑکی والے شادی دھوم دھام سے کریں، بارات بھی زیادہ آئے گی اور جہیز بھی خاطر خواہ ملنا چاہیے۔ وہ لوگ اپنے مطالبات میں اس لئے بھی بضد تھے کہ ایک تو لڑکی معمولی شکل و صورت کی تھی اور دوسرے وہ لڑکے سے عمر میں بھی بڑی تھی، اور اس پہ پردہ ڈالنے کے لئے ضروری تھا کہ شادی دھوم دھام سے ہو۔

عبدالستار پہ قبیل داری کا بوجھ زیادہ تھا، رشتہ بھی زیادہ برا نہ تھا۔ جیسے کیسے بھی ہوا، اس نے یہ شادی کر ڈالی، اگرچہ وہ کچھ تو نہ ہوا جو لڑکے والے چاہتے تھے بہرحال برادری میں ناک زیادہ نہ کٹی، باتیں ضرور ہوئیں "عمر بھر کمائی کی، وہ کہاں گئی" "سادگی سے لڑکی کو بیاہ دینا کہاں کی شرافت ہے؟" لڑکے والے بھی زیادہ خوش نہ ہوئے تھے، حالاں کہ اس شادی نے عبدالستار کی کمر بالکل ہی توڑ دی، پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ختم ہو گئی تھی، اب صرف پنشن تھی اور دکان!

اور دکان کی صورت یہ تھی گویا قبرستان ہو۔ سارا دن شیخ تسا بیٹھا اخبار پڑھتا رہتا، دوپہر کو مکھیاں مارتا، اور شام کے وقت اس کی نگاہیں سامنے والی سڑک پر کسی گاہک کے انتظار میں بھی تھیں کرتی، بھولا بھٹکا گاہک ادھر آن نکلتا تو شیخ تسا کرسی سے اٹھ کر نہایت خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتا، بڑے بڑے نامور رائٹرز اور شہرۂ آفاق کتابوں کے بارے میں اس سے تبادلۂ خیالات کرتا، گاہک بڑی بے دلی سے اس کی باتیں سنتا اور پھر یہ کہہ کر چلتا بنتا کہ آپ تو خود ایک عظیم ادیب معلوم ہوتے ہیں، یا پھر کسی ایسی کتاب کا نام لیتا جس کا نام اس نے پہلے کبھی نہ سنا ہوتا، دکان بند کرتا تو اس کی اس دن کی آمدن صفر ہوتی۔ وہ دل مسوس کے رہ جاتا، بوجھل قدموں اور نیم دلی سے وہ گھر کی طرف قدم بڑھاتا اور سوچتا۔ وہ گھر والوں کا سامنا کیسے کرے گا؟ کس طرح ان کے شکوہ کناں چہروں اور اپنی بیوی کے طعنوں کا جواب دے گا؟ اس کے اندر جو احساس جرم پیدا ہو گیا تھا اس میں ہر نئے دن اضافہ ہوتا چلا جاتا، اس نے اپنے بال بچوں کو دھوکہ دیا تھا، شاید عمر بھر دھوکہ دیا تھا اور اب اسے اپنے ہی گھر میں یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کی اولاد کے دلوں میں اس کے لئے کوئی عزت کسی قسم کا احترام نہ رہا تھا اس کی بزرگی دم توڑ رہی تھی۔ گھر کے سربراہ کی حیثیت سے اس کا مرتبہ کم ہوتا جا رہا تھا، اس کی شخصیت، اس کا دماغ مجروح ہو رہا تھا، اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اگر یہی صورت رہی، اگر ہر شام وہ خالی ہاتھ گھر واپس لوٹتا رہا تو اس گھر میں اس کا مقام اس کی ہستی ختم ہو جائے گی۔ گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد اس کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے اور وہ تنہا رہ جائے گا اور تنہا وہ اس متحدہ طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکے گا، اس لئے کہ یہ محاذ حق پر ہو گا اور وہ باطل کی طرح مٹ جائے گا، اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ان سے کنارہ اختیار کر کے مر جائے اس طرح وہ ان کے قلوب میں تو زندہ رہے گا۔ یا پھر اگر وہ جسم کی موت نہیں چاہتا تو اس کی بقا کے لئے اسے کوئی دوسرا پیشہ یا اسی پیشے میں کسی دوسری صورت کو پیدا کرنا ہو گا یعنی دارالادب کی بجائے کوئی دارالصحت جس میں نشے کی ادویات چور بازاری میں بکتی ہوں۔ یا پھر دارالکباب جہاں تکے پندرہ روپے سیر اور مرغ کی ٹانگ پانچ روپے میں بکتی ہو اور شام جب وہ اپنے سارے دن کا حساب کرے تو آمدن چار یا پانچ سو روپوں سے کم نہ ہو، ایک ہمدرد دوست نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اپنا پرانا سرکاری اثر استعمال کر کے سیکرٹوں کی ایجنسی حاصل کرے اور اس طرح بینک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ کمائے۔ دنوں میں وارے نیارے ہو جائیں، غربت و افلاس کے دلدر دور ہو جائیں اور یوں وہ ایک خوشحال اور باعزت زندگی گذارے، کتاب فروشی سے زیادہ ذلیل دھندہ اور کوئی نہیں،

دھندے کو یکسر تبدیل کر کے نیا کاروبار شروع کرنا تو اسے ممکن نظر نہ آیا، سیگرٹوں کی ایجنسی اور بینک کی طرف اس کا دل مائل نہ ہو سکا، نشہ آور ادویات بیچنے کے لئے وہ اپنے دماغ کو تیار نہ کر سکا، بہرحال اس نے سوچا کہ وہ ادب کی کتابوں کی بجائے علم کی کتابیں رکھے، دارالادب سے دارالعلم بن جائے، علم کی کتابوں سے مراد سکولوں اور کالجوں کے نصاب کی کتابیں تھیں، چنانچہ رفتہ رفتہ اس کی دکان سے کلاسیکل اور اصل ادب کی کتابیں ہٹتی چلی گئیں اور ان کی جگہ اردو کی پہلی جماعت کے قاعدے، سلیٹیں، تختیاں، پنسلیں، سیاہیاں، کاپیاں اور دیگر دوسری نصابی کتابیں آتی چلی گئیں، وہ چند ایک ادب کی کتابیں بڑے دکھ اور افسوس سے اٹھاتا، انہیں لاہور لے جاتا اور ان کی جگہ نصابی کتابیں لے آتا، وہ اب بھی مطمئن تھا، اس لئے کہ کاروبار میں جس شرافت اور دیانت کا وہ آرزومند تھا، وہ یہاں بھی تھی، اس کی دکان میں اب رونق رہنے لگی، سکول کے بچوں سے شام کے وقت اور دن میں کالج کی لڑکیوں سے دکان بھری رہتی، نئی کلاسز

کی ابتداً اور امتحانات کے دنوں میں تو ہجوم اس قدر رہتا کہ اپنی مدد کے لئے اسے اپنے بڑے لڑکے کو بھی اپنے ساتھ دکان پر رکھنا پڑتا۔ سارا دن باپ بیٹا مصروف رہتے، گاہکوں کو چیزیں دیتے دیتے تھک جاتے کبھی تو کھانے کا ہوش بھی نہ رہتا، اور شام جب وہ آمدن کا حساب کرتے تو خالص آمدن پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوتی، مصروف دنوں کے علاوہ باقی دوسرے دنوں میں یہ آمدن پانچ دس تک ہی رہتی، اس کے جوان سال بیٹے نے کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا، مگر وہ اس صورتِ حال سے مطمئن نہ تھا وہ اپنے باپ کو مشورے دینے لگا تھا، یہ تو محض 'کھیچل' ہی ہے 'ونگ' تو ہے ہی نہیں، سارا دن ٹانگیں تھکاتے رہو، بچ بچ، بخ بخ، اور شام صرف سبزی ترکاری کے لئے پیسے گٹھڑی میں باندھ کر گھر چلو، یہ ٹکوں کا کاروبار اسے تو پسند نہ تھا، چنانچہ اس نے توسیع اور فروغ کا منصوبہ بنایا، اور بیکار دنوں میں آمدن کا سامان یوں پیدا کیا کہ فلمی رسالے اور رنگا رنگ ڈائجسٹوں سے دکان کو مزین کیا، اور کامیاب ہوا سکولوں کے لڑکے اور خاص طور پر کالجوں کی لڑکیاں فلمی رسائل کی مستقل اور باقاعدہ خریدار تھیں، فلمی رسالے کی اشاعت کے مخصوص دن سے پہلے ہی وہ ان رسائل کے بارے میں بڑی بے چینی سے پوچھتی رہتیں، اور جس وقت رسائل دکان پر پہنچ جاتے وہ بڑے جوش و خروش، بڑی جستجو اور اشتیاق سے رسائل خریدتیں، اور جنسی اور جاسوسی ڈائجسٹوں کی وجہ سے اب طلبا الادب پر کم عمر بچوں کی بجائے بالغوں اور نئے نئے نوجوان ہونے والے لڑکوں کا ہجوم رہنے لگا، اور یوں یہ دکان چل نکلی، اس کا سہرا دونوں باپ بیٹے کے سروں پر تھا۔

ادھر شیخ عبدالستار کی دوسری لڑکی کے لئے بھی وہی دیچولی دو ایک رشتے لائی تھی، مگر وہ لوگ گھر بار کی حالت دیکھ کر اسے ناپسند کر گئے تھے، اس کی شادی شدہ لڑکی بھی اپنے گھر میں ایک بدتر اور خستہ حال زندگی گزار رہی تھی، شیخ ستار کو اس کا قلق تھا اور وہ مقدور بھر کوشش کر رہا تھا کہ اب ایسا نہ ہو، وہ دن رات اپنے حالات کو بہتر بنانے میں مصروف تھا، گھر میں تھوڑی بہت خوشحالی ضرور ہوئی تھی مگر لڑکی بیاہنے کے لئے یا رشتہ لینے کے لئے جس شان و شوکت اور طمطراق کی ضرورت ہوتی ہے، وہ منزل شاید ابھی دور تھی، اس کی بیوی تو اس غم میں بیمار رہنے لگی تھی، اور کئی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ یہ مقدس کاروبار جو اس نے اپنی عاقبت بنانے کے لئے شروع کر رکھا ہے، چھوڑ دے۔

"تو کیا چوریاں کروں، ڈاکے ماروں"

"اس کاروبار سے تو وہ بھی بہتر ہیں"

کئی بار تلخی ہوئی۔ کئی کئی دن وہ ایک دوسرے سے روٹھے رہے، کئی بار معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ ڈاکے نہ مار سکتے تھے تو اتنی نوبت بڑھانے کی کیا ضرورت تھی، اب بھی سب کے لئے زہر لے آؤ۔ اور پھر خود اطمینان سے بیٹھ کے علم کا کاروبار کرنا۔ اس کے طعنے خوفناک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے،

ایک دن وہ دکان میں تنہا بیٹھا یہی سوچ رہا تھا اور کسی کا سمجھایا ہوا یہ خیال اس کے ذہن میں تقویت پکڑ رہا تھا کہ جوتوں کا کاروبار کرتے اس کے ایک کاروباری دوست نے اسے راز کی بات بتائی تھی۔

"جوتوں کے کاروبار میں بڑا فائدہ ہے، دس روپے کا جوتا پچاس میں بیچ لو یا ساٹھ میں، سب چلتا ہے، گاہک صرف ظاہر

کی چمک دیکھتا ہے، اسے خاک پتہ نہیں چلتا کہ اندر کیا ہے، یہ تو اسے اسی وقت پتہ چلتا ہے جب وہی جوتا دس دن بعد اس کے سر پہ پڑتا ہے لیکن اس سے آپ کا ضمیر مجروح نہیں ہوتا، اس لئے کہ خود گاہک نے پسند کیا ہے۔" میرے نزدیک۔ اس نے حتمی طور پہ کہا تھا، اس سے زیادہ منافع بخش کاروبار اور کوئی نہیں، اور منافع بھی جائز نہ بلیک کا دھندہ اور نہ ہی اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کا چکر، خود بھی مطمئن اور گاہک بھی خوش۔" وہ سوچ رہا تھا کہ یہ مشورہ بالکل صحیح تھا، اور وہ دکان کو تبدیل کرنے کا منصوبہ بھی اپنے ذہن میں تیار کر رہا تھا کہ ایک نوجوان اندر داخل ہوا، اس نے ادھر اُدھر کتابوں کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ نثار کو یوں لگا جیسے وہ کچھ گھبرایا ہوا سا ہو، ایک دو مرتبہ وہ کاؤنٹر تک اس کے پاس آیا اور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

آپ کو کوئی خاص کتاب چاہئے۔

وہ کچھ سنبھل گیا جیسے دکاندار نے اس کے منہ کی بات پکڑ لی ہو، اور ذرا پُر اعتماد لہجے میں کہنے لگا "جی ہاں۔ خاص کتاب" اس کے چہرے پہ ایک معنی خیز اور پُراسرار سی مسکراہٹ تھی۔

"فرمائیے" شیخ نثار نے بڑے ادب سے کتاب کا نام جاننا چاہا۔

جی وہ دہی آبادی کی کتاب ہے" اس کا نام ہے "جس نے ڈالی بری نظر ڈالی"۔ مصنف اور کتاب کے نام، وہ دونوں سے ناواقف تھا،

"یہ نصاب کی کتاب ہے یا ادب کی؟"

"جی، یہ دلچسپ کتاب ہے، جنرل بک ہے، آپ کتابیں لینے لاہور تو جاتے ہی ہوں گے وہاں سے مل جائے گی، میں اس کے لئے آپ کو ایڈوانس رقم دے سکتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے، میرا تو یہ کاروبار ہے، ایڈوانس کی ضرورت نہیں، میں جمعے کے دن جاؤں گا اور تلاش کر کے لیتا آؤں گا، مگر دیکھئے آپ اسے لینے کے لئے ضرور آ جائیے، ایسا نہ ہو میرے پاس پڑی رہے، کتاب بھلا آج کل کہاں بکتی ہے؟"

"آپ بے فکر رہیں، میں ہفتے کی صبح یا آپ فرمائیں تو جمعہ کی شام کو ہی آ جاؤں"۔

"آپ ہفتہ کے روز ہی تشریف لائیں، جمعہ کو مجھے واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے، ناحق آپ کو آنے کی زحمت ہوگی"۔

نصابی کتابوں کی مارکیٹ میں اس نے اس کتاب کو بہت تلاش کیا، دکانداروں نے ہنسی میں ٹال دیا، کچھ نے مذاق اڑایا، چند ایک نے کنکھیوں سے اسے دیکھا، کہیں طنز بھی ہوا، وہ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھ سکا، بہرحال ایک دکاندار نے اسے کتاب کے ملنے کا پتہ بتایا، وہ دکان کیا تھی۔ ایک تاریک سی غار تھی، کتابیں وہاں بکھری پڑی تھیں، گھٹیا کاغذ پہ چھپی ہوئی کتابیں، بغیر جلد کے، بغیر کسی ترتیب کے رکھی ہوئی کتابیں۔ اس دکان کا دروازہ ایک تنگ و تاریک گلی میں کھلتا تھا، وہیں سے وہ داخل ہوا، اسے یوں لگا جیسے دوزخ میں داخل ہو رہا ہو۔ اور جانے اسے کچھ یوں لگا جیسے اس دوزخ کا ایک در جنت میں بھی کھلتا ہے۔

دوسرے دن اس نے دکان ابھی کھولی ہی تھی کہ وہ نوجوان آن پہنچا، شیخ نثار نے کتابوں کے بنڈل میں سے وہ کتاب نکال کر اس کو دی، لڑکا مسکرایا، کتاب کی قیمت جو بہت زیادہ تھی بخوشی ادا کی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"آج بونی تو بہت اچھی ہوئی ہے۔" نثار نے دل میں کہا اور دکان جھاڑنے میں مصروف ہو گیا، واقعی وہ ایک اچھا دن تھا سارا دن گاہک آتے رہے، اس دن خوب بکری ہوئی دوسرے دن اس کے پاس جو گاہک آئے ان میں سے اکثر نے اسی کتاب اور اسی قسم کی چند ایک دوسری کتابوں کا مطالبہ لیا، چند ایک نے رقمیں بھی پیشگی جمع کرا دیں، خفیہ دکان کے پچھلے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ایک کتاب اس نے اپنی جیب میں ڈال لی، سفر میں پڑھنے کے لئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے کتاب جیب سے نکالی اور بڑے تجسس سے اسے بغور دیکھا اور پھر اس کے پہلے صفحے پر نظر ڈالی، ایک مظلوم لڑکی کی خود نوشت داستان تھی، دکھ کی داستان مشکلات اور مصائب میں گھری ہوئی ایک معصوم، شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کی کہانی، دوسرا صفحہ اور پھر تیسرا اور چوتھا اور پھر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، خوف سے اس کے کان سرخ ہو گئے، اس کے جسم کا رُواں رُواں کانپنے لگا، اس کا ہم نشین بھی عینک لگائے اس کے ساتھ ساتھ پڑھتا جا رہا تھا۔

"صفحہ الٹیے۔" اس نے کہا، اور نثار نے بدحواس ہو کر کتاب بند کر دی۔

"آپ نہیں پڑھنا چاہتے تو مجھے دیجئے سفر کے لئے بڑی دلچسپ اور مزیدار کتاب ہے۔"

نہیں نہیں۔ مجھے اگلے اسٹیشن پہ اترنا ہے" وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اگلے اسٹیشن پر اس نے ڈبہ تبدیل کر لیا، اور سوچنے لگا گھر ان کتابوں کا کیا کرے، وہ انھیں اس دریا میں گرا دے گا، اس نے سوچا جو ابھی آنے والا ہے، دریا آ گیا، مگر اس میں اس بنڈل کو پھینکنے کی اسے جرأت نہ ہوئی، اس نے سوچا، گھر پہنچ کر وہ انھیں جلا دے گا، خاکستر بنا ڈالے گا، اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی جرم کر کے آیا ہو، قتل کا جرم، انسانیت کے قتل کا جرم!

گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے اسے خوشخبری دی، رشتہ پکا ہو گیا ہے، اگلے ماہ شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی ہے، جہیز کے علاوہ پانچ ہزار انھیں نقد دینا ہوگا رات بھر وہ سوچ میں ڈوبا رہا، اپنے خوابوں میں اس نے کتابوں کے کئی بنڈل جلا دیئے مگر پھر جب آنکھ کھولتا تو اسے یوں لگتا جیسے کئی اور بنڈل جمع ہو گئے ہیں، اور وہ ان بنڈلوں کے نیچے پڑا کراہ رہا ہو، اور اس کے پاس کئی دوسری کتابیں خاکستر ہو گئی ہوں، اقبال، غالب، میر، سرسید، حالی، شبلی، آزاد کی کتابیں اور اسے یوں لگا جیسے وہ خود بھی کسی کتاب کا ایک مظلوم کردار ہو، مظلوم اور معصوم، ایک ننگا اور مخش کردار!

عائشہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی، محلے والوں نے انگلیاں دانتوں میں داب لیں، خود نثار کی بیوی حیران رہ گئی تھی،

"نیت نیک ہو تو کاروبار میں ضرور خدا برکت دیتا ہے۔" ایک براتی نے مرغ کی پوری ٹانگ منہ میں دبلتے ہوئے کہا۔

دکان تو چھوٹی سی تھی، پر فضل ربی زیادہ ہے، کتابوں کے کاروبار میں پھلتے کم ہی لوگوں کو دیکھا ہے۔"

دوسرے نے فرنی کی ساتویں پلیٹ خالی کرتے ہوئے کہا۔

"کھانا بہت اچھا پکا ہے، اور کسی چیز کی کمی نہیں۔" ایک نے دوسرے سے کہا۔

"پیسے کی بات ہے بھائی۔ پہلی لڑکی کی شادی پہ تو کسی کو پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملا تھا۔"

شادی کا اتنا شہرہ اس چھوٹے سے شہر میں ہوا کہ چند ہی دنوں میں نازنین کے لئے ایک نہایت معزز اور اونچے گھرانے سے رشتہ آ گیا، لڑکا نہ صرف خوبصورت اور نیک تھا بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے وسیع کاروبار کا مالک مگر نازابھی صرف آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی اور ستار کے سامنے ابھی دو بڑے منصوبے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے موٹر خریدی جائے پھر کوٹھی تعمیر کروائے، اور اپنا معیار زندگی امیرانہ سطح پر لانے پھر ناز کی شادی کرے، ناز جو اسے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ لڑکے والے یہ رشتہ کسی صورت چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے، وہ تو دو تین سال انتظار کرنے پر بھی آمادہ تھے۔

دارالادب اب تک ایک وسیع کاروباری ادارہ بن چکا تھا، عبدالرحمٰن اور رحیم بھی اس میں شریک ہو گئے تھے، رحمٰن دکان چلاتا اور رحیم نے ایک چھوٹا سا پریس لگا لیا تھا۔ اور اب وہ اس قسم کی کتابیں خود ہی چھاپنے لگے تھے اور پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رحیم نے ایک کتاب بھی خود ہی لکھ لی اور سب سے پہلے رحمٰن کو پڑھائی۔

"لکھنے والے کی محتاجی کیوں ہو؟ اس نے اپنے بھائی سے کہا، جب کہ ہم خود ان سے بہتر لکھ سکتے ہیں"۔

رحمٰن نے کتاب پڑھنے کے بعد کہا "یقیناً یہ کتاب ان سب سے بہتر اور پرلطف ہے جو آج تک ہم بیچتے رہے ہیں"۔

کتاب دو ہی دن میں چھپ گئی، رحیم خود شہر شہر گیا اور ہزاروں کی تعداد میں کتاب بیچ آیا، اسی ماہ میں انھیں کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا، لڑکیوں میں یہ کتاب خاص طور پر بہت مقبول ہوئی، خواتین کے کالج کی تقریباً پچاس فیصد لڑکیوں نے یہ کتاب خریدی۔ اس کی بے حد تعریف کی، دوسری لڑکیوں نے ان سے مستعار لے کر پڑھی، والدین سے چھپ چھپ کر، نصف رات موم بتیوں کی روشنی میں، گھر کے غسل خانوں میں گھس کر اور کالج کے چار دیواری کے کسی سنسان گوشے میں بیٹھ کر اور بعض جرأت مند لڑکیوں نے تو کلاس روم ہی میں اسے پڑھ ڈالا، پھر اسے پڑھ کر افسردہ ہوئیں، یہ افسردگی کی ایک خاص کیفیت تھی، جو تشنگی کا نتیجہ ہوتی ہے اکثر کے جذبات مشتعل ہوئے اور وہ لاشعوری طور پر عجیب عجیب نازیبا حرکات کرنے لگیں، خالی کمروں کے کونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، اور کچھ مار دھاڑ پر اتر آئیں، اپنی سہیلیوں کے ساتھ اور چند ایک نے تو اپنے استادوں سے گستاخیاں بھی کیں، ان کا طرز عمل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، دراصل یہ طرز عمل سمجھ میں آ بھی کیسے سکتا تھا، مگر قابل رحم حالت ان خاموش طبع لڑکیوں کی تھی جو زبان کھول نہ سکتی تھیں، مگر اس زہر کو اپنے جسم میں لحظہ لحظہ اترتا ہوا محسوس کر رہی تھیں۔

ادھر کاروبار بھی پھیلتا چلا گیا، دوسری دکان شہر کے ایک اور علاقے میں لے لی، ایک دو ملازم بھی رکھ لئے گئے، شیخ ستار خود کوٹھی کی تعمیر کی طرف متوجہ ہو گیا، نقشے تیار کرنے لگا پھر تعمیر شروع کرا دی اور چند مہینوں میں ایک عظیم الشان کوٹھی تیار ہو گئی، جس کا نام 'قصرادب' رکھا گیا۔

قصرادب تقریباً ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا، اس کے کمرے میں قیمتی فانوس آویزاں تھے اور باہر سامنے والے حصے کو سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا۔ ٹیوٹا موٹر کار بھی خرید لی گئی تھی، اور ضروریات زندگی کے علاوہ تعیش کا سامان بھی کوٹھی میں موجود تھا، نوکروں کی چہل پہل بھی تھی، پہلے پہل تو شہر کے لوگ اس تبدیلی کو دیکھ کر حیران رہ گئے، اور سوچنے لگے کہ کہیں کوئی ڈربی کی لاٹری نکل آئی ہے یا چھپر پھاڑ کے مولا نے دولت کی بارش کی ہے۔ قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے، یا کہیں سمگلنگ کا بیوپار ہے،

اس لئے کہ عبدالستار نے تیس سال کی ملازمت میں اس دولت کا ایک معمولی سا حصہ بھی نہ دیکھا ہوگا اور نہ کبھی سوچا ہی ہوگا کہ ایک دن وہ شہر کے امرا میں شریک ہوگا، مگر پھر لوگوں کو یقین ہوگیا کہ کاروبار ہی کا فضل ہے۔ ستار کے لونڈے، لاہور میں بھی تو کتابوں کا بزنس شروع کر چکے تھے۔

قصر ادب کی بچی بڑے اہتمام سے کی گئی تقریباً سارا شہری مدعو تھا۔ لوگ کوٹھی کے حسن اور ذوقی ترتیب کو سراہ رہے تھے تعریف کر رہے تھے اور جانے کیوں اس معطر کوٹھی میں کبھی کبھار لوگ ایک ہلکا سا اجنبی تعفن گزرتا ہوا محسوس کر رہے تھے یہ احساس تقریباً سبھی کو ہوا جیسے کسی بدرو کے قریب سے گزرتے ہوئے بدبو کے بھبکے آتے ہیں، ایک آدھ نے گھر والوں سے تو اس کا ذکر بھی کر دیا، مگر انہوں نے قطعاً ہنسی میں سرجھٹک کر اسے احباب اور کرم فرماؤں کا وہم قرار دیا، یہ احساس، اہلِ خانہ کی نظر میں، محض لوگوں کے جذبۂ حسد کی پیداوار تھا، یہ تعفن ان کے سینوں کے جلنے کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوا تھا، اہلِ خانہ رات ایک ساتھ بیٹھ کر اس موضوع پر بحث کر رہے تھے، دولت کی جلن خوفناک احساسات کو جنم دیتی ہے، وہ ہنستے رہے۔ کھلکھلا کے ہنستے رہے، قہقہے لگاتے رہے کبھی کبھار یوں لگتا جیسے یہ قہقہے ہسٹیریائی ہوں۔

عبدالستار نے فیصلہ کیا کہ اب وہ حج کو جائے گا، دنیوی کام تو اب مکمل ہی تھے، کچھ عاقبت کی فکر بھی کرنا چاہیئے کاروبار کو اس کے بیٹے اتنی خوبی سے نبھا رہے تھے کہ وہ خود تقریباً عضوِ معطل بن چکا تھا، اور پھر جس رب نے انھیں اتنا بے حساب دیا تھا۔ اور وہ بھی اتنی قلیل مدت میں، اس رب کا شکر ادا کرنا فرض تھا، چنانچہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر بذریعہ ہوائی جہاز حج کی سعادت حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوگیا اور ڈیڑھ ماہ تک زیارتیں وغیرہ کر کے واپس آگیا، اس کے چہرے پر اب کوئی دوسرا ہی نور تھا، نور جو دولت، عزت اور شہرت کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ کسی روحانی لگن سے جنم لیتا ہے، تو جلال و جمال کا سنگم ہوتا ہے۔

حاجی عبدالستار ہر چند کہ اب امورِ دنیوی میں حصہ نہیں لینا چاہتا تھا، مگر نازو بیٹی اس کی آنکھوں کا سکھ اور کلیجے کی ٹھنڈک تھی، جانے کیوں اس کے دماغ میں یہ خیال پختہ ہو چکا تھا کہ وہ سب کچھ جو اسے حاصل ہوا ہے، وہ نازو ہی کے مقدر سے ہے اور نازو کی شادی ہونا ابھی باقی تھی اور وہ یہ شادی اتنی دھوم دھام سے کرنا چاہتا تھا کہ ایک مثال بن جائے، اور واقعی یہ مقدر ہی کی تو بات تھی کہ بے شمار رشتے آ رہے تھے، اعلیٰ سے اعلیٰ، امرا و شرفا کے ہاں سے، ان کے گھروں سے جن کی شہرتیں اور زمینیں دور دور تک تھیں اور نازو ابھی دسویں جماعت کا امتحان دینے والی تھی۔

حاجی عبدالستار دکان پہ اب بہت کم جاتا تھا، زیادہ تر گھر پہ ہی مصروفِ عبادت رہتا، گھر کے سب لوگ آج فلم "خطرناک" دیکھنے گئے تھے اور وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بڑے فخر سے چکر لگا رہا تھا، ناگاہ اس کی نظر نازو کے بستر پہ پڑی اور اس کے قدم اچانک رک گئے اس نے نازو کے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی اپنے ادارے کی تازہ ترین کتاب کو پہچان لیا تھا، اس کتاب کا عنوان تھا "حرامزادی" اور اس کے سرورق پہ ایک عریاں لڑکی کی رنگین تصویر تھی، یہ کتاب اتنی ہر دلعزیز ہوئی تھی کہ اب تک چار ری چھپ لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکی تھی اور ابھی اس کی مانگ تھی، اس کتاب کا مصنف اس کا چھوٹا فرزند تھا۔ اور تیور بتا رہے تھے کہ وہ مستقبل کا ایک عظیم ادیب بننے والا ہے۔

عبدالستار نے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہاتھوں سے وہ کتاب اٹھائی، اور اسے کھول کر جگہ جگہ سے دیکھا، کتاب کے

کئی صفحات پہ مختلف فقرے سرخ روشنائی سے خط کشیدہ تھے، اور متعدد مقامات پہ ان کے متن پہ لپنے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، یہ مقامات اور مناظر نہایت فحش تھے، اور ناز نے بڑی فراخ دلی سے اپنے الفاظ میں ان کی داد دی تھی، بلکہ بعض جگہ اضافے بھی کئے تھے۔ جنھیں پڑھ کر حاجی عبدالستار کی آنکھیں شرم سے بند ہو گئیں۔ اسی کتاب میں ایک جگہ اسے رقعہ دکھائی دیا جو ناز نے اپنے محلے کے ایک لڑکے کے نام لکھا تھا، اور جس میں اس کتاب کے کئی جملے نقل کئے گئے تھے، اس کے علاوہ اپنے ننگے جذبات اور عریاں خواہشات کا بے دھڑکے اظہار کیا گیا تھا اور سچے عشق کا واسطہ دے کر اپنے گرم جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی التجا کی گئی تھی۔

وہ دیر تک اس خط کو اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں لئے گم سم کھڑا رہا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کیا کرے، اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ پہلے تو ایک خیال اس کے ذہن سے گزرا، اس گھر کو آگ لگا دے، بزنس کو آگ لگا دے اور یہ آگ جو دوزخ کی آگ سے کم نہیں، اس کے چاروں طرف پھیل جائے، اور سب کو جلا کر خاکستر کر دے، مگر شاید وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کرنے کے لئے جس جذبے اور ایقان کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس میں کہاں تھا، وہ قوت اب اس میں کہاں رہی تھی، جس کے سہارے وہ تیس برس تک زندہ رہا تھا، زندہ اور اپنے وقت کا محسن تھا، مگر اب وہ طاقت اس سے چھن گئی تھی، محروم ہو گیا تھا، کر دیا گیا تھا، نہتہ ہو گیا تھا، اس طاقت کی آرزو کر کے وہ پھر سے تنگ دستی، افلاس اور بے چارگی کو آواز دینا نہیں چاہتا تھا، اب وہ صرف کانپ سکتا تھا، رو سکتا تھا۔

فلم دیکھ کر سب لوگ واپس آ گئے تھے، ان کے چہرے دمک رہے تھے جیسے کوئی خوشی چوری چھپے ان کے اندر چٹکیاں لے رہی ہو، اور جس کا اظہار کرنے سے وہ جھجک رہے ہوں، مگر ناز حیران تھی، قوت اور جرأت کی علامت تھی، اپنا برقعہ ایک طرف پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔

"توبہ، توبہ، کس قدر واہیات اور فحش فلم تھی۔

اس کے بھائیوں نے زیر لب مسکرا کر اس کی بات کی تائید کی۔

ستار کی بیوی نماز پڑھنے کے لئے غسل خانے میں وضو کر رہی تھی۔

اور ادھر سارے بھائی بہن تفصیل سے فلم کے عریاں رقص اور مناظر پہ تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھائی بہن نہ ہوں بے تکلف دوست ہوں اور بے محابانہ سیکس پہ گفتگو کر رہے ہوں، کسی کلب میں بیٹھے ہوئے۔

"میرے خیال میں اپنی نئی کتاب کا نام بھی میں کچھ اسی قسم کا رکھوں گا، یہ نام لوگوں میں خاصہ پاپولر ہو چکا ہے"۔ حرامزادی کے مصنف نے کہا۔

باقی بھائی بہنوں نے اس تجویز کی بھرپور حمایت کی۔

حاجی عبدالستار ابھی تک کمرے میں بیٹھا تھا، کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا، پھر وہ بھاری قدموں سے باہر نکلا، اور حسب معمول ناز پروین اپنے باپ سے لپٹ گئی اور عبدالستار کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈس لیا ہو اور زہر اس کے جسم میں اتر رہا ہو، اس نے اپنی بیٹی کو اپنے سے الگ کرنا چاہا۔

"ہم نے آج بڑی سیکسی فلم دیکھی ہے، بڑی خراب ......"۔

اور عبدالستار کو محسوس ہوا جیسے کسی گٹر کا منہ کھل گیا ہو اور تعفن پھیلنے لگا ہو۔ اس نے سے اپنے آپ سے پھر الگ کرنا چاہا۔ مگر اس نے اپنے باپ کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور عبدالستار کو یوں لگا۔ جیسے ناز اس کی بیٹی نہیں بلکہ "جس نے ڈالی بری نظر ڈالی" "گندم" "اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے" "حرامزادی" اور "خطرناک" کا ایک کردار ہے۔ اس کے دوسرے بیٹے بیٹیاں، اس کی بیوی اور وہ خود بھی سب کے سب اہم کردار ہیں۔ سب کے سب ہیرو، سب کے سب ولن! مگر کیا ہو سکتا ہے؟

حاجی عبدالستار نے اپنی بیٹی کے ہاتھ کا لکھا ہوا رقعہ اپنے مصنف بیٹے کے بریف میں رکھ دیا تاکہ وہ اس کی نئی تصنیف کا ایک باب بن سکے۔

اس رات جب وہ کھانا کھانے میز پر بیٹھے اور رنگ رنگ کی نعمتیں دسترخوان پر چنی گئیں تو کھاتے ہوئے انھیں یوں احساس ہوا جیسے گھر کے درودیوار سے بُو آ رہی ہو۔ جیسے غلاظت کے ڈھیر لگ رہے ہوں۔ اور پھر یہ بُو ایک خوفناک سڑانڈ بن کر فضا ادب میں پھیل گئی۔ جیسے کوئی بدرو بہنے لگی ہو اور جیسے وہ سب اس بدرو میں گر پڑے ہوں۔

بیڑیاں

احمد سعید

"تم بس چلے آؤ۔"

"یار اتنی جلدی؟ مجھے ذرا پاؤں تو جما لینے دو۔"

"میں کہتا ہوں، بکواس نہ کرو۔ اسی ہفتے، ہفتہ اور اتوار — چھٹی کے دن — اکٹھے گزاریں گے"

"لیکن پانچ سات پونڈ آنے جانے کا کرایہ؟"

"واپسی کی ٹکٹ میرے ذمے رہی۔"

سات آٹھ برس بعد میں اپنے عزیز دوست ڈاکٹر اصغر کی آواز ٹیلی فون پر سن رہا تھا، اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میری بیکاری اور قدرے مایوسی کے گہرے سکوت کو توڑتی ہوئی اس کی آواز لندن سے کوئی دو اڑھائی سو میل دور سے آ رہی تھی کارڈ سے میرا خط مل گیا تھا۔ اس میں میں نے اپنا قیام انگلستان میں مستقل پتہ اور فون نمبر درج کر دیا تھا۔

"میں تمہیں سٹیشن پر لینے آؤں گا۔ آنے سے پہلے اطلاع کر دینا۔" اصغر نے دس منٹ تک مجھ سے باتیں کر کے فون بند کر دیا۔

میں اس کا بلند قہقہہ سننے اور نیلی، شفاف آنکھوں میں خلوص چھلکنے اور انگلستان میں، دوسری شادی کے چنگل سے آزاد ہونے کی داستان اس کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

بیکاری الاؤنس میں سے جب میں نے اصغر کو ملنے کے لئے اڑھائی پونڈ کا ریل کا ٹکٹ خریدا تو مجھے اپنے دکھ بھول گئے۔ مجھے بٹھنڈا جانے والی چھوٹی سی ریل گاڑی جیسی گاڑی جانا تھا۔ وکٹوریہ سٹیشن، جو سابق برطانوی سلطنت کی مانند بے پناہ پھیلا ہوا ہے، کے بے شمار پلیٹ فارموں پر کھڑی ایک گاڑی سے۔ اس میں بیٹھتے ہی میری نظروں کے سامنے اصغر اور اس کی بیوی بچوں کے چہرے ابھرنے لگے، جیسے کھوئے ہوؤں کا پتہ ملنے پر کوئی ان سے ملنے جا رہا ہو۔ دو ہفتے پہلے اصغر کی بڑی لڑکی نے مجھے اس کے ہاں آنے کی دعوت دی تھی، باپ جیسا ناک نقشہ، منہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بتیسی نکال کر مسکراتی اور ہنستی ہوئی اصغر کی بیٹی۔ اس کی لندن میں ہی شادی ہو گئی تھی، اس نے وہیں سے درس و تدریس کا ڈپلوما لیا تھا اور اب ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔ اُسی اصغر کی بیٹی جس کا ہر نیا قدم نہ صرف مضحکہ خیز بالکل دیوانے کا خواب لگتا تھا۔ دسویں جماعت سے لے کر ایم بی بی۔ ایس اور بعد ازاں نفسیات میں ایم اے کرنے تک اس نے ہر خواب کو حقیقت میں منتقل کر دیا۔ اس پر آٹھ دس بچے، وہ بھی ایک ایسی بیوی کے بطن سے جو نہ صرف اس سے آٹھ دس برس بڑی تھی بلکہ جبراً اس کے

پلے باندھ دی گئی تھی ۔۔۔۔۔

ایسی بیڑیاں پہن کر ان حالات کے قیدی، اصغر نے زندگی میں آخری جوا کھیلا تھا۔ اس نے انگلستان میں ایک انگریز عورت سے شادی کر لی جس نے اسے تین چار برس کے عرصے میں دو بچوں کا تحفہ دیا۔

میں میکانیکی انداز میں ایک نظر انگلستان کے مشہور و معروف بڑی مناظر پر ڈال لیتا۔ جب کہ میری آنکھوں کے سامنے اصغر کی زندگی کی جھلکیاں تیزی سے ابھر کر غائب ہو رہی تھیں۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ کرتی ایک لخت دوسری لائن پر نمودار ہو کر پاس سے گذرتی گاڑی نے میرے خیالات کا تانتا وقتی طور کے لئے توڑ دیا۔ اس کے بعد میری نگاہیں انگلستان کے دیہی مناظر پر پڑیں، اس کے صاف ستھرے کھیتوں پر جو گوریلا کی گھٹی ہوئی حجامت کی طرح منڈھے ہوئے لگتے تھے۔ جدھر نظر اٹھتی کوئی ذی جان چیز دکھائی نہ دیتی، نہ کوئی مویشی، نہ دوشیزہ یا مٹیار ہے اور نہ تو اور گائے بھینسوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ گاڑی خاصی رفتار سے جا رہی تھی، غالباً ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کے حساب سے یہ راستے میں تین چار سٹیشنوں پر رکی۔ ان کی طرز تعمیر سے مجھے ہند و پاک کے ریلوے سٹیشن یاد آ گئے۔ انگریز فاتح نے کس کس جگہ اپنے نقوش چھوڑے تھے۔

اس دورِ غلامی میں اصغر کی زندگی میں ایک خوفناک موڑ آیا تھا جس میں اس نے دنیا کو تیاگ لے لیا تھا، بیراگیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ گیروے کپڑے پہن لے جو جوگیا رنگ کے چوغے پر مشتمل تھے، بال چھوڑ دیئے اور کلائی میں کڑا پہن لیا۔ ——— اپنی ایک شاگرد سکھ لڑکی سے نا تمام محبت کا نتیجہ! ۔ چونکہ اصغر نے ٹیوشنیں پڑھا پڑھا کر زندگی کے مینار کے زینے طے کئے تھے، اس کی منزلیں پار کرتا گیا تھا۔ ادھر اس کی نا تمام محبت کے واقعہ کو جیسے بھلانے کے لئے اس کے والدین نے اس کے تشنہ جذبات پر شادی کی منوں مجوبل ڈال دی تھی ——— اس کی منت سماجت کر کے اس کی شادی کر دی۔

بیس پچیس برس بعد جب اس کا بس چلا اس نے انگلستان میں پہنچنے کے دو ایک برس بعد ایک انگریز عورت سے شادی کر لی۔ اس نے اس کے بعد تین چار برس میں دو تین کھیپوں میں اپنے تمام بچوں کو انگلستان بلوا لیا۔ لیکن اپنی بیوی کے نام طلاق نامہ بھیج دیا۔ اس کی اس حرکت کی جن لوگوں نے سخت مذمت کی ان میں میں بھی شامل تھا۔ لیکن میں اصغر کے جذبات کا خون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ اس کی شادی اس کے والدین نے اصغر سے کی تھی۔ اس میں اس کا کیا قصور تھا میں اسے اس کی پہلی بیوی کے نا کردہ گناہ کی سزا سے روکنا چاہتا تھا۔ دوسری شادی کرنے سے نہیں۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی ہم وطن اور ہم مذہب عورت سے شادی کرے۔ ۔۔۔۔ اس کے نتیجے میں اصغر کی انگریز بیوی اس سے الگ ہو گئی اس نے اس سے طلاق لے لی، ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد اصغر کا مجھ سے کیا برتاؤ ہو گا میں یہ جاننا چاہتا تھا۔ یوں تو میں نے اسے کبھی خفا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ انتہائی مفلسی میں جوانی بسر کرنے کے باوجود اس میں جانے تلخی کیوں نہیں پیدا ہوئی تھی اور وہ گھر آئے کو خندہ پیشانی سے ملتا اور اس کی حتی المقدور خاطر تواضع کرتا ——— یہ سوچتے سوچتے

گاڑی میری منزل مقصود پر پہنچ گئی۔

میں نے پلیٹ فارم میں داخل ہوتی ہوئی ٹرین میں سے دور سے دیکھا کہ اصغر مخالف سمت سے مجھے ڈھونڈتا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلایا۔ جواباً اس کا ہاتھ ہلا اور وہ بھیڑ نکال کر تندرستی سے قدم بڑھا کر میرے استقبال کے لئے آئے بڑھا ۔۔۔۔ نیم قہقہہ ۔۔۔۔ ہم بغلگیر ہوئے۔

تم نے اچھا کیا آ گئے۔ اس نے مخصوص پرانی چاہت سے کہا۔ تاہم اس میں پہلے سا بے محابا پن نہیں تھا۔ ہمارے ہاں پہلوانوں کے انداز میں بغلگیر ہونا جس میں طرفین کافی عرصہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ پر جب میں نے اپنا بیگ اٹھایا، جو اس دوران میں اس سے ملنے کے لئے میں نے ہاتھ سے چھوڑنے کے بعد پلیٹ فارم پر رکھ دیا تھا، تو اس نے مجھ سے فوراً میرے ہاتھ سے لے کر خود اٹھا لیا ۔۔۔۔ انگلستان میں قلی نہیں ملتے، نہ ہی مسافر چھوٹے چھوٹے بوجھ دوسروں سے اٹھوانا پسند کرتے ہیں یا اس کی اجرت ادا کر سکتے ہیں۔ یہ بیگ ہلکا تھا لیکن اصغر اسے اٹھا کر میری عزت افزائی کرنا چاہتا تھا ۔۔۔۔ انگلستان میں قیام کا نتیجہ۔ اس کے آداب و اخلاق کا اثر! گھر آئے مہمان کا، اوور کوٹ یا برساتی وغیرہ اتارنے یا اسے پہنانے اور اس کا بوجھ کم سے کم کرنا انگریزوں کے ضابطۂ اخلاق کا ایک حصہ ہے۔

اسی طرح جب ہم سٹیشن سے باہر نکلے تو اصغر کار سٹینڈ میں پہنچ کر ایک طرف مڑا۔ اس نے ایک گاڑی کے سامنے رک کر اس کا دروازہ کھولا اور مجھے اس میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ اصغر کی کار! مجھے اسے خوشحال دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، ایسے شخص کو اس عمر میں کار کا مالک، زندگی بھر چلتے چلتے جس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔

اس نے گاڑی سٹارٹ کی، موڑی اور یہ جا وہ جا ۔۔۔۔ راستہ صاف تھا۔ ہمارے ہاں کی طرح کسی گائے، بھینس یا بیل گاڑی چھکڑے نے اسے روک نہیں رکھا تھا۔

اور گاڑی چند منٹوں بعد صاف کھلی سڑک پر یوں لڑھکنے لگی جیسے بلیرڈ (BILLIARD) کی میز پر اس کا گیند۔

"سناؤ کیسے آئے ۔۔۔۔؟"

"کچھ تو طالع آزمائی کرنے اور کچھ تحقیق اور کتاب کے لئے ناشر ڈھونڈنے۔"

اس نے پھر میرے بڑے بھائی، اس کے اور میرے بیوی بچوں کی خیر خیریت پوچھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس میں پہلے سا جوش و خروش، والہانہ پن نہیں تھا، نہ ہی شکوہ شکایت۔ اگر کچھ کہا سنا تو میں نے، بڑے دبے الفاظ، اشارے کنایے میں۔ اس کے جواب میں وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتا رہا جیسے اس نے مقدر سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ ایسا شخص جس نے آج تک زندگی کی جدوجہد میں ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ چنانچہ میں نے اس کا دل کھرچنا چاہا، بڑی احتیاط سے۔

"اچھا، تو پھر خدا کے فضل سے تمہارے پاؤں یہاں خوب جم گئے!" وہ اس کوٹھی کا ڈاکٹر تھا جس میں سے ہم اس وقت گزر رہے تھے۔

وُہ قصبہ جس میں وہ تعینات تھا، سٹیشن سے کوئی بیس پچیس میل دُور تھا۔

"کبھی وطن ——— اور لاہور ——— آنے کا بھی ارادہ کیا ہے کہ نہیں؟"

"——— ناصر ——— کا کیا حال ہے ——— ؟" ناصر اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ لیکن دونوں میں کافی عرصہ سے خط و کتابت بند تھی۔

اس کی وجہ اصغر کا اپنی بیوی ——— ناصر کی بھابی ——— کو طلاق نامہ بھیجنا تھا، جو ناصر نے پھاڑ دیا تھا اور بھائی کو لکھا تھا کہ جو جی چاہے کرے۔

"کیوں، ابھی تک خط و کتابت ——— ؟"

"——— . . . چھوڑو یار۔"

اس وقت کار ٹنڈ منڈ پہاڑی نمائیلوں اور بے برگ درختوں میں سے گذر رہی تھی۔

"کہاں جاؤں ——— کہاں ——— رہوں ——— اصغر نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ میرے استفسار کرنے پر کہ ناصر نے اس کے الاٹ شدہ مکان پر قبضہ کر لیا تھا اور ڈاکٹر بننے کے بعد اصغر کی کلینک کی جگہ اپنی کلینک کھول لی تھی۔ اور اسے کسی قیمت پر چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ ناصر دنیا دار، سیانا آدمی تھا، ایک کاروباری ڈاکٹر۔ اس نے اصغر کی تمام خوبیوں یا کمزوریوں سے گریز کیا۔ جن کے باعث اسے پریکٹس میں نقصان ہُوا تھا۔ اس کے برعکس اس نے دوست احباب اور عزیز و اقارب سے فیس لینے کا اصول بنایا۔ بہت کم مریض ہوتے جنہیں وہ دوا داروں میں رعایت دیتا اور کسی کو بل وصول کئے بغیر نہ چھوڑتا لیکن اصغر کی طرح ہر شخص سے بڑی مٹھاس سے بات کرتا۔

مجھے معلوم تھا وہ انہی اصولوں کی بدولت ہزاروں میں کھیل رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے آمدنی میں مستقل اضافہ کرنے کے لئے چند اداروں سے بھی کاروباری معاہدہ کر رکھا تھا۔

اصغر کا جواب سن کر میں قدرے سناٹے میں آگیا۔ اپنے اکلوتے بھائی کو اصغر نے جس طرح اپنے بچوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا تھا اور نامساعد حالات میں بھی ڈاکٹری کی تعلیم جاری رکھوائی تھی، نہایت قابل تعریف تھا۔ اس کے جواب میں ناصر نے دو تین برس تک اصغر کے بیوی بچوں کی کفالت کی تھی اور ان سے بڑی شفقت سے پیش آیا تھا اور آخر میں اپنی بھابی کو اس نے طلاق ہونے سے بچا لیا تھا۔

ناصر نے اس کے باوجود بھائی کا احسان نہیں چکایا تھا۔ اصغر کی زبانی یوں لگتا تھا جیسے اس نے اس کا بہت کچھ چھین لیا ہو۔ میرا بھی ناصر کے بارے میں ایسا ہی تاثر تھا۔ جیسے اسے بھائی کو بے گھر کرنے کا ایک بہانہ چاہیئے تھا۔

ع ——— بالم آؤ ہمارے من میں

قدرے توقف کے بعد اصغر نے اچانک سہگل کا وہ اس میں سے ایک مشہور گانا گانا شروع کر دیا۔ تیس بتیس برس

پرانی فلم اور پرانا گانا جو عاشق کے کردار۔ دیوداس کی ناکام محبت کی عکاسی کرتا تھا۔ یہی دکھ اصغر کی بھی ناکام محبت کا تھا —— وہ گانا گاتے وقت مجھے چند بار معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرایا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اصغر، یار مرو بنو——"

"دکھ کے دن بیت نا ہیں ——" اس نے جواب میں دیوداس کے آخری اور المیہ دوسرے گانے کے بول گائے۔

اس اثنا میں ہم ایک جدید طرز کے قصبہ میں داخل ہو گئے۔ اس کی منصوبہ بندی، نئی عمارات اور ان کی طرزِ تعمیر سے لگتا تھا کہ یہ لاہور یا کراچی کی نئی آبادی کا حصہ ہو۔

اصغر نے ایک دو موڑ مڑے اور گاڑی ایک نئے بنگلے میں جا کھڑی کی۔

بنگلہ بنے نیارا

رہے اس میں کنبہ سارا

اب کے میں نے سہگل کا ایک طربیہ گانا گایا جو اس نے اپنی کسی فلم غالباً دھرتی ماتا یا پریذیڈنٹ میں گایا تھا۔ یہ گانا بڑا بر موقعہ تھا مجھے اصغر کی زبانی پتہ چلا تھا کہ اس نے یہ گھر حال ہی میں خریدا تھا اور اس میں اس کے بیوی بچے آباد تھے۔ ہفتہ اور اتوار کے دن اس کی مطلقہ انگریز بیوی "الزبتھ" کے بطن سے دو بچے اس سے معاہدہ کے مطابق باپ کے ساتھ ہر ہفتہ دو روز گذارنے آجاتے اس دن اس گھر میں بڑی رونق ہوتی ہو گی۔۔۔ یہی تھا اصغر انہیں اُن کی ماں کے ہاں سے لینے مجھ سے چھٹی لے کر چلا گیا۔ وُہ اس وقت بجھا بجھا سا لگتا تھا۔ لیکن اصغر کی بیوی اور بچے مجھے مل کر بڑے خوش ہوئے۔ بچوں کا ایک "انکل" لاہور سے آیا تھا

کوئی ایک گھنٹہ میں اصغر اپنے دو منجھلے بچوں کو قریبی گاؤں سے لے آیا جو وہاں سے دس بارہ میل دُور تھا۔ اس وقت وہ خوش تھا۔ اس کے دونوں بچے، جن کی عمر بالترتیب پانچ اور سات برس تھی، اپنے سوتیلے بھائی بہنوں سے زیادہ پیارے اور شریر تھے۔ میں نے اس دوران میں اصغر کی بیوی سے ان کی نجی زندگی کے بارے میں چند اہم سوال پوچھنے کی جسارت کی۔ اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ وُہ آسودہ حال تھے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وُہ اب بھی فقط اپنے بچوں کی ماں کی حیثیت سے بات کر رہی تھی، اصغر کی رفیقۂ حیات کی طرح نہیں۔ اس کی تنہائیوں کی ساتھی نہیں، جس کے بننے کے وُہ ناقابل تھی۔

سب نے میری خوب خاطر تواضع کی اور اصغر نے مجھے قصبے کی سیر کرائی، اس کی بار میں BEER پلوائی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے کچھ دیر باہر گھمائے پھرائے۔

اگلے روز شام کو اس نے اپنے بچوں کو چھوڑنے گاؤں جانا تھا۔ اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ شاید وہ مجھ سے کوئی ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے گاؤں سے نکلتے ہی گاڑی یکدم تیز کر دی۔ جیسے وہ بچوں کو ان کی ماں کے فوراً حوالے کر کے واپس آنا چاہتا تھا،

ہو۔ ہم دس پندرہ منٹ میں گاؤں پہنچ گئے۔ اصغر نے گاڑی ایک کوٹھی کے باہر روک لی اور بچوں کو باہر نکلنے کو کہا۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی ـــــ وہ اپنی مطلقہ بیوی سے میری ملاقات کروانا بھی چاہتا تھا اور نہیں بھی ـــــ وہ ہینڈل پر سر جھکا کر ایک لمحہ کے لئے سوچنے لگا۔ بچوں کی ماں ان کی منتظر لگتی تھی۔ ان کی آواز سن کر وہ باہر لپکی اور کار کی طرف بڑھی۔ غالباً یہ اس کا معمول تھا

اس نے آتے ہی اصغر کا شکریہ ادا کیا، پھر بچوں کو پیار کیا۔ اصغر کو مجبوراً میرا اس سے تعارف کروانا پڑا۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں تو اس نے مجھے اندر آ کر کچھ نہ کچھ پینے کی دعوت دی۔ مجھے اس میں قدرے اصرار کا عنصر بھی محسوس ہوا۔ اخلاق کا یہ تقاضا تھا کہ میں انکار نہ کروں، لیکن اصغر کی اجازت کے بغیر نہیں۔ اس لئے میں نے اس سے نظروں نظروں میں اجازت چاہی۔ اس نے مریضانہ سی جھوٹ موٹ کی ہنسی ہنستے ہوئے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

الزبتھ خاصی صحت مند اور دلکش جسمانی خطوط کی مالک عورت تھی۔ عمر کوئی چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ قدرے بے تکلف، چست اور باعزم عورت۔ وہ اور اصغر ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ میں نے اس لئے وہاں زیادہ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا، گو مجھے اس سے ملنے اور باتیں کرنے کی خواہش ضرور تھی۔ میں نے اس کے پیش کردہ مشروبات میں سے فقط کافی پینا پسند کیا۔

الزبتھ نے ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے، جن میں بیشتر میرے انگلستان اور اس کے لوگوں کے بارے میں تاثرات کے بارے میں تھیں، مجھ سے مخاطب ہو کر اچانک کہا۔

"مجھے آپ لوگوں سے شکایت ہے۔"

اصغر یہ سن کر معنی خیز انداز میں کھنکارا، جیسے مجھے اور الزبتھ کو بھی کسی تکلیف دہ موضوع چھیڑنے سے احتراز کرنے کو کہہ رہا ہو۔ میں نے بھی سوالیہ لیکن تجسس انداز میں پہلے الزبتھ پھر اصغر کی طرف دیکھا، اور جواب دیا۔

"کیا ـــــ کیسی شکایت؟"

"تم عورت کے ساتھ مرد کو بھی بیڑیاں پہنا دیتے ہو" الزبتھ نے قدرے جذباتی ہو کر کہا۔

میں اس کا اشارہ فوراً سمجھ گیا کہ وہ ہمارے ہاں کے شادی شدہ مرد کو عمر بھر کا قیدی سمجھتی تھی! کہ دونوں کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہونا کتنا مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔

"میڈم، بات لمبی ہو جائے گی ـــــ دونوں طرف کی ذمہ داریاں ـــــ"

"کیا دکٹورین دور کی باتیں کرتے ہو ـــــ آپ لوگ مختصر سی زندگی کو بھی عذاب اک جہنم بنا دیتے ہو"

لزا، برائے مہربانی یہ بات نہ کرو۔ یہ معاملہ اب ختم ہو گیا ہے LIZA LEAVE IT ALEASE IT'S OVER اصغر نے قدرے لرزتی آواز میں الزبتھ سے درخواست کی۔ اس کے ردعمل کے طور پر الزبتھ آنسو ضبط نہ کر سکی۔

اصغر جیسے انسان آپ کے ہاں بھی بہت کم ملتے ہوں گے۔ میں نے خود کو بڑا خوش قسمت سمجھا جو اسے ——— پا لیا" الزبتھ نے جیسے ہوا کو پکڑنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں میڈم۔ لیکن فقط انفرادی خوشی کا نام زندگی نہیں" میں نے جواب دیا۔

"خواہ مرد جہنم میں عمر بھر جلتا رہے۔ اب۔ اب تو آپ لوگ خوش ہونا ——!" الزبتھ نے تنک کر جواب دیا اور اٹھ بیٹھی۔

"یار۔ تم کیا بحث میں اُلجھ گئے۔ کبھی تو انسان کو انسان سمجھا کرو ——— فرشتہ نہیں —— چلو ——— جس کی زندگی میں ازلی اذیت لکھی ہو۔ اُسے اس کے جہنم میں جلنے دو ———" اصغر بھی بے قابو ہو کر اٹھا، میں نے الزبتھ سے گستاخی کے لئے معافی چاہی اور جانے کے لئے اجازت چاہی اور ہم اس کے گھر سے باہر آ گئے۔

ع ——— دُکھ کے دن بیتت ناہیں

اصغر نے پانچ منٹ گاڑی میں خاموش اور مغموم رہنے کے بعد یہ گانا شروع کیا۔

تصویرِ شبِ غم

فاروق خالد

میں صبح کی سیر کو جا رہا تھا کہ ایک نسبتاً الگ تھلگ کوٹھی کے لان میں ایک ننھی منی پیاری سی بچی کو کھیلتے پایا۔ اس کے بال سنہری اور ملائم تھے اور پیچھے سے بندھے ہوئے تھے، فراک ہلکا پیازی تھا اور سفید براق دور تک جاتے ہوئے موزوں کے باہر جوتے گہرے سرخ رنگ کے تھے۔ وہ اطراف میں کھلکھلاتے ہوئے پھولوں کو اور زیادہ ہنسنے پر مجبور کر رہی تھی اور ان کے پاس کھڑی نہ جانے کیا باتیں کر رہی تھی۔ وہ مسحور کن حد تک واضح اور خوب صورت تھی۔ میں قریب پہنچتے ہوئے بولا۔

"ہیلو بے بی، آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"کھیل رہی ہوں۔" اس نے مترنم نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسا کھیل۔ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔" میں اس کے ساتھ باتوں میں شریک ہو گیا۔ اور پھولوں کی ہنسی بھول گیا۔

"جی ابھی ابھی یہاں ایک تتلی تھی۔ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے!"

"وہ تو اب بھی یہاں ہے۔"

"کہاں ہے؟" جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔

"میرے بالکل پاس ہی۔" اور میں مسکرا دیا۔

"مجھے تو دکھائی نہیں دیتی۔" اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں ہے بتائیے نا!"

"یہیں ہے!"

"یہیں کہاں؟"

"یہیں ہے لیکن آپ کو نظر نہیں آ سکتی۔"

"مجھے نظر نہیں آ سکتی؟" وہ اپنی گول مٹول آنکھیں میرے چہرے پر مدغم کرتے ہوئے بولی۔ "کیا میری آنکھیں نہیں ہیں۔" اس کی نگاہیں اجلی تھیں اور پورا چہرہ فصیح کا رہے۔

"وہ تو ہیں، لیکن آپ اس تتلی کو نہیں دیکھ سکتیں۔"

"اچھا آپ ہی اسے پکڑ دیں۔" وہ اس ساری بحث سے بیزار ہوتے ہوئے بولی اس بچی نے کچھ اس لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں بہت کچھ چھوڑ چھاڑ کر جو بھی وہ چاہ رہی تھی کرنے کو تیار ہو جاتا، لیکن میں شرارت کرنے کے موڈ میں تھا چنانچہ اس کی گول مٹول اور بڑی بڑی آنکھوں میں ظاہر ہوتے ہوئے بولا۔

"میرا کیا ہے، میں تو اُسے جب جی چاہے پکڑ سکتا ہوں۔"

"پکڑ سکتے ہیں؟" اُس نے تعجب زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل پکڑ سکتا ہوں۔"

"تو پکڑ دیجئے نا۔" وہ میری طرف مسکراتے ہوئے بولی اور تمام پھولوں نے بھی اُس ایک لمحے میری جانب یوں دیکھا گویا سفارش کر رہے ہوں۔

"تو کیا واقعی پکڑ دوں؟"

"ہاں، ہاں لیکن ذرا جلدی کیجئے۔"

"اچھا پکڑتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن وہ فوراً ہی میرے ہاتھ کو جھٹلاتے ہوئے بولی۔ "بتلائیے نا کہاں ہے تتلی؟"

"معلوم نہیں ہے۔" میں نے پوری طرح شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ تو اُسے پکڑ رہے تھے۔"

میرا متحرک ذہن بالکل ساکن تھا اور میں اُس کے ہلکے گلابی فراک کو دیکھ رہا تھا اور چاہ رہا تھا کہ مجھے کوئی آواز نہ دے مگر اُسی لمحے ایک سرگوشی سنائی دی "لیکن آپ تو اُسے پکڑنے جا رہے تھے۔" اُس کی نگاہوں میں اشتیاق تھا اور لہجے میں اک سوال؛ اچانک اُس نے میرے بالوں کی سمت ہاتھ لہرایا اور چلائی — "وہ رہی وہ رہی۔"

"کہاں، کہاں؟" میں نے پلٹ کر پوچھا۔

"یہ دیکھئے۔ یہ دیکھئے!"

اور یہ دیکھتے ہوئے میں پیچھے کی سمت بھاگا، جہاں ایک زرد، خوش رنگ تتلی اُڑی جا رہی تھی۔ اِس خوش رفتار تتلی کی پرواز میں ایک جھلملاہٹ تھی اور ایک پسند آنے والی سیمابی کیفیت۔ میں بھاگا، دوڑا اور اُس کے پیچھے بہت دور تک دوڑتا چلا گیا، آگے کھیت تھے اور چند ایک مکانات۔ یہ مضافات کا علاقہ تھا اور شہر سے بہت دور، اس لئے مکانات اور تعمیرات جلد ہی غائب ہو گئیں اور چند درخت قریب آتے دکھائی دیئے، یہ بھی جلد ہی میرے قریب سے بھاگ گئے اور پھر وسیع تر میدان اور کھیت شروع ہو گئے، میں پوری قوت سے بھاگ رہا تھا اور تتلی کو پا لینے کی کوشش میں بے قرار میں بے کل تھا۔ تتلی گہرے نیلے پانیوں پر سے ہوتی ہوئی کہیں چلی گئی اور میں اِس بارش کے جمع شدہ ذخیرے کے کنارے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ آسمان گہرا نیلا تھا۔ اور دور تک صاف تھا اور فضا میں رو پہلی کیفیت دبے پاؤں چلی آ رہی تھی، لحظہ بعد ہی سورج کی زرفشاں آفتابی کرنیں رات کے بچے کھچے غم کشیدہ دھویں کو جیسے کاٹتی ہوئی نمودار ہوئیں اور سماں صاف ہو گیا۔ آگے خود رو پودوں اور بے ترتیب اُگے ہوئے درختوں کی بوچھاڑیں تھیں اور علاقہ خاصا پُر خیز تھا۔ میں پیچھے مڑنے کو تھا کہ ایک مختصر سی عمارت سے محقر باغ میں ایک چھوٹی سی بچی مرغیوں کو دانا ڈال رہی تھی۔ اُس کا قد تین مرغیوں کے برابر رہا ہو گا۔ اُس کے بالوں میں ایک سُرخ ربن بندھا ہوا تھا اور کپڑے بے حد نفیس

اور عمدہ تراش کے تھے۔ اُس کی رنگت زیتونی تھی اور آنکھوں میں جو چمک تھی وہ قدرتی رنگوں کے ملاپ سے جنم لینے والی جزئیات سے مشابہ تھی۔ اِس بچی کے دائیں ہاتھ میں گیہوں کے دانے تھے اور وہ کُک، کُک، کُک کرتے ہوئے مرغیوں کو پاس بلا رہی تھی میں پاس چلا گیا اور فضا میں پھیلی ہوئی نیم گرم ہوا تلے اِس لڑکی کو دانہ چگتی ہوئی مرغیوں کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لڑکی نے میری طرف دیکھا تو اُس لمحے مجھے صرف اس کے دانت دکھائی دیے، میں بھی مسکرا دیا۔ اُس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا اور بولی:

"ہماری مرغیاں ہیں۔"

"کتنی ہیں؟" میرے لبوں پر مسکراہٹ ابھی قائم تھی۔

"کتنی ہیں! ابھی بتاتی ہوں۔" وہ ایک سمت میں گھوم گئی، ننھے سے ہاتھ کو ہلکے سے اٹھاتے ہوئے گننے لگی ——— ایک، دو، تین اور، اور چار۔ ......

"چار ہیں۔" میں نے یوں پوچھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔

"ہاں چار ہیں، آپ خود گن لیجئے ——— لیکن اُس نے مجھے گننے کا موقع نہ دیا اور آخری فیصلہ دے دیا۔" چار ہیں، پوری چار۔"

"لیکن آپ نے کہاں سے لی ہیں؟"

"کہاں سے لینی ہیں، ہماری اپنی ہیں۔" اُسے جیسے میری باتوں کی سمجھ نہ آ رہی ہو، وہ میری طرف ایک سیدھ میں دیکھتی ہوئی بولی۔ "ہم نے بازار سے خریدی ہیں، میرے ابو لائے تھے۔"

"اچھا!" میں نے ہنستے ہوئے ایک اور سوال کیا۔ "کیا آپ اسکول جاتی ہیں۔"

"نہیں! ابھی نہیں ——— ابھی میں صرف کھیلتی ہوں۔"

"اور کیا کرتی ہیں۔"

"اور میں نے کیا کرنا ہے، کچھ بھی نہیں۔" اُس کا لہجہ بڑا کاٹ دار تھا۔ "کھانا کھاتی ہوں، سوتی ہوں، کھیلتی ہوں اور اپنی مرغیوں کے ساتھ کھیلتی ہوں ——— اور ہمارے پاس ایک سفید کتا بھی ہے چھوٹا سا، تیز بھاگنے والا۔"

"اچھا ——— اور کیا کرتی ہو۔"

"اور کچھ بھی نہیں!"

"کیا مطلب؟"

"پہلے آپ مطلب بتائیں۔" وہ بھول پن سے بولی۔ "آپ کیا کہتے ہیں۔" اُس نے یہ پوچھا اور میں فیل ہو گیا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک وہ الگ جاتے ہوئے بولی۔ "اب میں چلتی ہوں، مجھے پھول لانے ہیں۔"

"کیسے پھول؟" میں نے اُسے ذرا روکتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے باغ میں سے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہمارے باغ میں بڑے اچھے اچھے پھول کھلتے ہیں۔" یہ کہتے

ہوئے وہ باغ میں چلی گئی اور سامنے پھیلے ہوئے سبزہ زار میں کھل اُٹھی۔ میں اُس کے قریب پہنچا اور ضد کرتے ہوئے بولا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔"

"کہاں!" اُس نے میری طرف چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کہاں جائیں گے۔ مجھے تو بہت سے پھول لانے ہیں۔"

"تو کیا ہوا میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور ہم باغ میں نکل آئے۔ یہ ایک عام سا چلڈرن پارک تھا جو یہاں پر رہائش پذیر لوگوں نے اپنے بچوں کی سہولت اور مصروفیات کے لئے خود ہی ترتیب دے رکھا تھا۔ باغ میں ایک طرف ایک بہت بڑا الکڑی کا بنچ تھا یہ بھی ٹھیک طرح سے زمین میں گاڑا نہیں گیا تھا کیونکہ اس کا ایک حصہ بہت نیچا تھا اور دوسرا حصہ بُری طرح سے اوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ زمین پر جو گھاس تھی وہ بھی جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ پودے بھی تازہ تازہ لگائے گئے تھے جن پر کوئی قابلِ ذکر پھول نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے یہ سب دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"ہمیں کیسے پھول تلاش کرنے ہوں گے؟"

"تو پہلے آپ یہاں کبھی نہیں آئے۔"

"اوں ہوں! کبھی نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر آپ کیسے پھول تلاش کر سکیں گے۔"

"کر لوں گا۔" میں گویا ظاہر ہوتے ہوئے بولا۔

"کیسے کریں گے؟"

وہ بہت ضدی تھی لیکن میں نے بھی بالکل ایسا ہی جواب دیا۔ "بس کر لوں گا، آپ بتائیے آپ کو کل کتنے پھول چاہئیں۔" میں نے اُس کا بایاں بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔ "کس قسم کے پھول ہونے چاہئیں اور کتنے رنگوں میں۔"

اُس نے چپکے سے اپنے لبوں پہ انگلی رکھ لی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو اور بولی ـــ "چار ہاں کل چار ہونے چاہئیں، نہیں! نہیں پانچ وہ ہنستے ہوئے بولی۔" پانچ اچھے اچھے اور خوبصورت رنگوں والے پھول۔"

"پانچ؟"

میرے اِس غیر ضروری حد تک پھیلے ہوئے سوال کے جواب میں اُس نے سر ہلا دیا جو کہ ایک مکمل جواب تھا اور ہلکے سے ہنس دی۔ مجھے یہ ہنسی بڑی بھلی دکھائی دی اور میں نے اُس کے کھلکھلاتے ہوئے بالوں کو ایک طرف کر دیا۔

"ایک تو میں ابھی آپ کو دے سکتا ہوں۔"

"دے سکتے ہیں؟ کیسے! کس رنگ میں۔" اُس کی آواز میں گہری حدت تھی اور لہجے میں جیسے کسی خوش کن جذبے کی مٹھاس شامل تھی۔

"رنگ! —— رنگ اُس کا عنابی ہے اور پتیاں گہری سیاہ۔" میں نے بے چین ہوتے ہوئے اُس کے کالے سنہری بالوں کو اوپر سے کر دیا اور میرا ہاتھ اُس کے چھوٹے سے معصوم سر پہ کافی دیر سلامت رہا، میری آنکھوں میں نمی تھی اور دل میں ایک الاؤ۔

"کہاں ہے وہ!" وہ ایک دم سے چلائی۔ "آپ مجھے وہ پھول لا کر دیں۔"

"لیکن میں تمہیں وہ پھول نہیں دے سکتا، کیونکہ تمہیں اُس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مجھے ضرورت ہے، مجھے پانچوں پھول چاہئیں۔ وہ ضد کرتے ہوئے بولی۔" آپ مجھے وہ پھول لا کر دیں لیکن فوراً ہی اُس نے جیسے مجھے میزان میں رکھ دیا ہو اور یک لہجہ صاف بولی ۔" نہیں! مجھے کوئی پھول نہیں چاہیے، میں خود تلاش کر لاؤں گی، آپ . . .!

میں از حد پریشان ہو گیا اور جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے مزید کچھ کہنے سے روکتے ہوئے بولا "نہیں، نہیں —— نہیں! میں جاتا ہوں، میرا انتظار کرنا۔" میں نے اُس کی طرف الوداعی نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ آگے کافی کھلی جگہ تھی اور ہر سو ایک پُر رعب سناٹا طاری تھا جیسے کان لگائے کچھ سن رہا ہوں۔ کبھی کوئی پرندہ خوش الحان آواز میں گاتا ہوا اوپر سے گذر جاتا اور پھر وہی ناثر انگیز خاموشی چھا جاتی۔ فضا میں خوشگوار تمازت تھی اور بے قرار لطافت۔ اِس پرسکون ماحول کے بیچوں بیچ بادلوں کے سادہ اور پُر پیچ صفحات ورق در ورق اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے اچھے اچھے پھول درکار تھے اور خوشنما رنگوں سے مہین پروں والی تتلیاں۔ آگے ایک کشادہ سڑک تھی جس کے دو رویہ شیشم کے گھنے پیڑ تھے میں ان درختوں تلے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا کہ ایک سمت اسکول جاتی ہوئی بچیاں دکھائی دیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں گلے میں کتابوں کے بیگ لٹکائے نپے تلے قدم اُٹھائے چلی جا رہی تھیں۔ اِن کے لباس اُجلے اور کلف لگے کپڑوں میں ایک انجانا مستقبل سمٹا ہوا تھا ہر بچی کسی جیتے جاگتے خوش رنگ کھلونے کی مانند متحرک تھی اور چہرے پہ خوشی اور فراغت سے عبارت آشنائی سئے ہوئے تھی۔ پہلو بہ پہلو دو بچیاں ہاتھوں میں ایک تصویروں والی کتاب تھامے گزرتی دکھائی دیں۔ یہ دونوں محویت کے عالم میں رنگین تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

"یہ دیکھو —— یہ دیکھو اِس تصویر میں اِس انگریز لڑکی کا فراک کتنا خوب صورت ہے۔"

"اور جوتے کتنے شاندار ہیں۔" ساتھ چلتی ہوئی بچی نے جواب دیا۔ "مجھے یہ تصویریں بہت اچھی لگتی ہیں۔

"اور مجھے بھی!"

"سچ! —— کیا واقعی۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں، دیکھو تو سہی کتنی پیاری لڑکی ہے۔" وہ یک لخت ٹھہرتے ہوئے بولی۔" اور یہ دیکھی ہے —— ہائے کیسا خوب صورت باغ ہے اور فوارے میں سے پانی بالکل نکلتا ہوا لگ رہا ہے۔"

"اور اِدھر دیکھو، یہ گانے والی چڑیا کی تصویر۔"

"ہاں سلمیٰ —— لیکن یہ بتاؤ کیا واقعی گانے والی چڑیا ہوتی ہے۔"

" ہوتی کیوں نہیں ہے "

" اور ناچنے والی بُلبل ؟ "

" وہ بھی ہوتی ہے لیکن یہ ...... "

" اور چالاک لومڑی ؟ "

" وہ بھی ہوتی ہے لیکن یہ دیکھو اس تصویر میں پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیاں صاف دِکھائی دے رہی ہیں ۔ کیوں ہے نا "

" دکھاؤ ذرا " سلمیٰ کی سہیلی اور آگے کو جھکتے ہوئے بولی " اچھا ۔ لیکن سلمیٰ ایک بات مانو گی یہ کتاب ایک دن کے لئے دے دو ، میں خوب اچھی طرح سے دیکھ کر کل لوٹا دوں گی "

" نا بھئی یہ تو میں نہیں کر سکتی اور پھر اگر اور دیکھنے کے لئے آ گئیں تو ؟ " سلمیٰ نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ پاس سے گزرتی ہوئی اِن کی ہم عمر لڑکیاں واقعتاً قریب لپکتی چلی آئیں اور چند ایک جھلاہٹ میں بولیں " ہمیں بھی دکھاؤ ، ہمیں بھی دکھاؤ نا "

" بس اَب ختم ، اور مَیں کسی کو نہیں دکھاؤں گی " سلمیٰ نے یہ کہتے ہوئے کتاب بند کر دی اور اسکول کے گیٹ میں داخل ہو گئی ۔ اَب سب کچھ واقعی ختم ہو گیا تھا میں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور قریب آتی ہوئی ایک بس میں بیٹھ کر شہر چلا گیا ۔ شہر پہنچ کر میں نے دلکش رنگوں والی تصویریں خریدیں جو انواع اقسام کی تھیں اور جن میں رنگوں کا ایک طوفان موجزن تھا ۔ تصویریں میں نے ایک لفافے میں رکھ لیں اور وہاں سے ہوتا ہوا ایک بہت ہی مشہور اور قابلِ دید باغ میں چلا گیا ۔ یہاں ایک دوست کی وساطت سے میں نے چند ایک اچھے اچھے دیدہ زیب پھول جمع کئے ، اِن پھولوں میں رنگ قوسوں اور دائروں میں چکر کاٹتے ہوئے اپنا راستہ بھول رہے تھے ۔ یہ پھول جو بھول رہے تھے میں انھیں تنہائی کی سرحد سے نکال کر دناؤں کے عرض طول میں ڈالنے لے چلا ۔ اب دوپہر کا سورج میرے سر پہ تھا اور ہواؤں میں جو خشکی تھی وہ مجھے راس نہیں آ رہی تھی ۔ مجھے تتلی کے پروں کی بھی ضرورت تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انھیں کہاں سے حاصل کروں ۔ میں نے سوچا اگر میں یہ پر نہ لے کر گیا تو وہ بچی ناراض ہو جائے گی لیکن میں کہاں جاؤں اور کس جگہ تلاش کروں یہ سوچ سوچ کر میں تھک گیا ۔ تھکاوٹ زہر کر رہی تھی اور میں بے بسی کے ہاتھوں نڈھال تھا ۔ میں نے تتلی کو رہنے دیا ، اگر نہیں ملتی تو کیا کروں ، اسے کوئی اچھی سی تصویر دے دوں گا اور وہ بچی جو مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی اُسے ملنے چل دیا لیکن راستے میں اُس کا گھر زیادہ نزدیک تھا جس نے مجھ سے تتلی کے پروں کی فرمائش کی تھی لیکن فوراً ہی ایک دوسرے خیال نے مجھے دبوچ لیا کہ یہ تصویریں جن کی ہیں انھیں ملنا بھی تو ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ مبادا اسکول بند ہو جائے ، چنانچہ میں نے سب سے پہلے ایسے ہی کیا اور اس پرائمری اسکول کی طرف روانہ ہو گیا ۔ مجھے اُن بچیوں کی شکلیں اچھی طرح سے یاد تھیں جنھوں نے تصویروں کی آرزو کی تھی اور اُس بچی کا نام بھی ابھی تک ذہن میں تازہ تھا جس کے پاس وہ کتاب تھی ، سلمیٰ ! ہاں " میں مطمئن ہو گیا اور چل دیا مگر اُس جگہ جہاں وہ اسکول واقع تھا ، کے گرد و نواح میں زمین چٹیل اور صاف تھی اور چار دیواری کے اندر بھی کوئی چہل پہل دکھائی نہ دے رہی تھی ۔ میں افسردہ دل لئے بوجھل قدموں واپس لوٹ آیا اور اس راستے پر ہو لیا جہاں میں صبح سیر کو جایا کرتا تھا مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بچی اس وقت بھی پودوں کے پاس

کھڑی پھولوں سے باتیں کر رہی ہو ——— میرے ذہن نے جیسے ایک تھپڑ رسید کیا۔ لیکن دیکھ لینے میں کیا حرج ہے، کچھ عجیب پاگل طبیعت تھی۔ میں چلتا رہا اور وہاں پہنچ گیا۔ کوٹھی کا گریبان کھلا تھا اور کوئی دربان وہاں موجود نہ تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور وہاں جتنے پھول تھے سب افسردہ تھے اور دردناک خاموشی کے بوجھ تلے دبے چپ چاپ کھڑے تھے اور اس بچی کا کہیں عکس تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ تصویریں اب میرے ہاتھ میں یوں تھیں جیسے جلا وطن لاشیں اور پھول میں اپنے ہاتھ میں یوں پکڑے ہوئے تھا جیسے بے گناہوں کے گریبان۔ وقت ایک بہتے ہوئے آئینے کی مانند میرے سامنے سے گزر رہا تھا اور میں اس میں ابہام و خواب کے لڑھکتے ہوئے تودوں کو گرتا دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے اس کوٹھی کے طویل رہگزر میں چار بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی، میں لپک کر سامنے پہنچا تو دیکھا، وہ لڑکی اور اس سے ذرا دور ایک اور لڑکی باہر کی طرف دوڑی چلی آ رہی ہے۔ مین گیٹ کے قریب وہ ایک پھل بیچنے والے کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اس کے سفید موزوں کے ساتھ براؤن جوتوں کی دوستی پہ بہت خوش ہوا۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے اور زیادہ وضاحت سے مسکرایا شاید کہ وہ میری مسکراہٹ جان لے لیکن اس نے ایک مختصر سا وقفہ ڈال کر مجھے فوراً فراموش کر دیا تھا۔

"بے بی، یہ تصویریں دیکھیں بھلا کیسی ہیں۔" میرے چہرے پہ ایک بے معنی ہنسی تھی۔ "دیکھیے اچھی ہیں کیا؟" لیکن ان دونوں لڑکیوں نے اپنی نگاہیں مجھے صرف چند سیکنڈ کے لئے دے کر جلد ہی واپس لے لیں اور تب ان میں خوف اور حیرت کی چنگاریوں کو بھر لیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے موہوم ارادے کے ساتھ ایک اور کوشش کر ڈالی لیکن اسی دوران اندر سے ایک چندھائی ہوئی آنکھوں والا عمر رسیدہ شخص نمودار ہوا، بچیاں بھاگ کر اس کے پاس پہنچیں اور میری طرف بے یقینی سے دیکھنے لگیں۔ اس شخص کے سر پہ عمر کا تاج تھا اور پاؤں میں فراغت کی زنجیریں۔ اس فارغ الاوقات شخص نے مجھے پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور میں اسے قریب آتا پا کر بتدریج اپنی مسکراہٹ کو سکوڑتا پا رہا تھا کہ وہ دور ہی سے دھاڑا۔ "کیا بات ہے، کیا چاہیے ہے؟"

یہ مجھ سے ایک سوال کیا گیا تھا، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں، اس ضمن میں اگر مجھے کئی سال بھی ودیعت کئے جائیں تو صحیح جواب نہ دے سکوں گا۔ میں الٹا چل آیا اور خود کو فضاؤں میں تلاش کرنے لگا۔ ابھی میں زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ وہ آواز پھر سنائی دی، وہ شخص چلایا۔

"اسے! کون ہو تم؟"

"چار آنے پاؤ، چار آنے پاؤ" فروٹ فروش نے مجھے قریب آتے ہوئے دیکھ کر آواز لگائی۔ میں اجنبی سایوں کو ساتھ لیے جا رہا تھا تھوڑی دیر بعد میں اسی جگہ پہنچ گیا جہاں وہ جناح پارک تھا۔ اب سہ پہر ہونے کو تھی اور دھوپ میں جو تمازت تھی وہ خنکی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ باغ میں نہ مرغیاں تھیں اور نہ وہ بچی۔ چند پتے جھولا جھول رہے تھے اور بعض پودوں کی جڑوں میں رینگتا ہوا پانی محویت کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ پھول میرے ہاتھوں غفلت کی نیند سو گئے تھے اور تصویریں الگ سہمی ہوئی تھیں۔ میں اسی باغ میں بچوں کے ایک جھنڈ کے پاس گیا، ان بچوں کو کپڑے پہنانے اور سنوارنے میں ان کے والدین نے خاصا اہتمام کیا تھا اور یہ واضح کرنے کی پوری

کوشش کی تھی کہ یہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی اہلیت کیا ہے۔ یہ بچے ایسے تمام خاندانوں کی مالی حیثیت کی واضح گواہی تھے۔ ان بچوں کے کپڑے ایسے صاف تھے کہ یہ خیال خواہ مخواہ ذہن کی نچلی سطحوں کو تنگ کرتا تھا کہ یہ روز ہی ایسے صاف و نفیس کپڑے پہنتے ہوں گے۔ ان میں دو لڑکے ایسے بھی تھے جن کی عمر زیادہ نہ رہی ہوگی مگر ان کے پاس ریسٹ واچ موجود تھی اور ایک چھوٹی عمر کی بچی نے کانوں میں بندے اور کلائی میں چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ تھوڑی دیر وہ بچی بھی آنگن جو صبح مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی، اس کے کپڑے بھی کافی اچھے تھے۔ میں نے اسے پاس بلایا اور کہا "میں تمہارے لئے پھول لے آیا ہوں۔"

"تو دے دیجئے۔" اس نے صحیح جواب دیا۔ میں نے پھول اسے دینے چاہے تو اس نے میرے دینے سے پہلے ہی انھیں جھپٹ لیا اور پرے پھینکتے ہوئے بولی۔ "یہ کوئی پھول ہیں، مرے ہوئے اور دو سال پرانے۔" وہ ان مرے ہوئے پھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "آپ اچھے اچھے خوب صورت پھول کیوں نہیں لائے۔"

میں نے ان لاشوں کو دوبارہ اٹھا لیا اور سانس لیتے ہوئے دشواری محسوس کرنے لگا۔ "میرے پاس بہت اچھی تصویریں بھی ہیں، آپ انھیں رکھ لیجیے۔" اس وقت میرے ذہن میں تصویروں کا اور کوئی مصرف نہیں تھا چنانچہ میں نے یہ سب تصویریں انھیں پیش کردیں۔ تمام بچے لپکتے ہوئے انھیں لینے کے لئے بڑھے۔ جس بچے کے ہاتھ پر ریسٹ واچ تھی وہ تصویر کو الٹ کر دیکھتا ہوا بولا۔ "یہ کیسی تصویر ہے، اس میں نہ کوئی بلڈنگ ہے اور نہ کوئی محل۔" اس تصویر کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹانگوں والا گھوڑا آپ نے کہاں سے حاصل کیا ہے، اسی قسم کے گھوڑے پر کوچوان ہمیں اسکول لے جاتا ہے۔"

باقی دو بچے میری دی گئی تصویروں کو موڑ توڑ کر کاغذ کی کشتی بنانے میں مشغول تھے اور سامنے پودوں میں پھیلتے ہوئے پانی میں ڈالنا چاہتے تھے میں نے ان بچوں سے سب تصویریں واپس لے لیں اور نہتے زخم لئے واپس آگیا۔ جب میں اس خود ساختہ باغ سے نکلا تو معلوم ہوا کہ سب تصویریں میں نہیں لا سکا ہوں گو ان سب کا خیال میرے ساتھ تھا۔ شام دبے پاؤں چلی آ رہی تھی سرویوں کے سایے لمبے ہو رہے تھے۔ جہاں سے اب میں گزر رہا تھا وہاں میرے قدموں کے دائیں طرف کچے مکانات تھے اور بائیں طرف بھی اسی قسم کی رہائش گاہیں تعمیر تھیں۔ گندے پانی کے جوہڑ جا بجا قائم تھے اور ایک عجیب طرح کی بو چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ دور سے قہقہوں کے چھلکے آ رہے تھے مگر قریب پہنچنے پر معلوم ہوا یہ آوارہ کتوں کے رونے کی آوازیں تھیں۔ فضا گرد اور دھوئیں سے بس دار تھی اور ایک عجیب نوعیت کی مخلوق ادھر ادھر بکھری پڑی دکھائی دے رہی تھی۔ عورتیں کمزور اور نحیف تھیں اور صاف پتہ چلتا تھا کہ انھیں کپڑوں اور اچھی خوراک کی اشد ضرورت ہے۔ یہ عورتیں اپنے مکانوں کے کھلے اور دروازوں سے بے نیاز صحنوں میں گھریلو کام کر رہی تھیں۔ نل سے پانی نکالتے ہوئے ان کے جسم ایک طے شدہ پروگرام کے تحت جنبش کرتے دکھائی دیتے تھے اور چہروں پر مسکراہٹ تھی اور نہ رنج بلکہ ایک مستقل قسم کی خوفناک رضامندی گہرائی تک کھدی ہوئی تھی۔ جو مرد تھے وہ بیٹھے حقہ پی رہے تھے، اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتے سنائی دیتے اور یا پھر وحشت کے عالم میں اپنے بچوں کو بے دردی سے پیٹتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لوگ اس قدر بے کار اور عام تھے جیسے دھوپ کی کرنوں میں جھلسے ہوئے خالی ذرات۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکلنے کو بے تاب تھا کہ اس صحرائے وحشت کے آخری سرے پر دھول میں لپٹی ہوئی ایک کم سن بچی آہ و زاری کرتی دکھائی پڑی۔ وہ

وقفوں سے رو رہی تھی اور اس کے غلیظ اور میل سے پُر ہول رخساروں پر آنسوؤں کی بہتی ہوئی لکیریں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے یہ قدرت کی صناعی ہے کار پر خطِ تنسیخ کھینچ رہی ہوں۔ شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں اس کا ناتواں وجود ایک مظلوم ہیولے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ یہی تماشا اگر کسی اسٹیج پر یا کسی کلچرڈ سوسائٹی کے ترتیب کردہ پروگرام کے ذیل میں آتا تو یقیناً" تفریح بن جاتا مگر اس جگہ زندگی کے دم گھونٹنے والے گھٹم گھٹا ماحول میں، مردار خور بستیوں کے بیچوں بیچ ایک دوسرے سے متصادم اور نچلی سطح پر پھیلی ہوئی بیہودہ سازشوں کے درمیان یہ روتا ہوا بے مایہ جسم مجھے ایک گالی کی طرح لگا۔ میں قریب پہنچا۔ بچی کی عمر یہی کوئی آٹھ نو سال رہی ہوگی مگر اس کے رونے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے اُسے مسلسل کئی سال تک اذیت دی جاتی رہی ہو۔ اُس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے، جنہوں نے خوب صورت اور چمک دار دانتوں کو بھی بہت حد تک بد وضع بنا دیا تھا۔ اس کے سر کے بال آپس میں الجھ کر رہ گئے تھے جیسے ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے ہوں۔ پورے چہرے پر ایک ناقابلِ بیان تلخی چھائی ہوئی تھی جسے آنسو دھونے میں ناکام رہے تھے۔ میں نے قریب پہنچ کر اُسے دلاسا اور پیار سے اُٹھانا چاہا مگر وہ اُسی حالت میں پڑی رہی اور میرا ہاتھ فضا میں سے ہوتا ہوا خاک سے جا لگا۔ اُس کا دائیاں بازو کہنی کے اوپر سے غائب۔ اس نے ایک پھٹے رنگ کا میل خوردہ فراک پہنا ہوا تھا جو اِس مفلوک الحال بچی سے زیادہ خاک دھول اور وقت کی مار کھائی ہوئی ایک بہت پرانی حقیقت کی ملکیت معلوم ہوتا تھا۔ اِس اپاہج اور معدوم ہوتی ہوئی بچی کے پورے وجود میں ایک ایسا کرب سمٹا ہوا تھا جسے اگر میں بیان بھی کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ میں قریب ہی بیٹھ گیا اور اِس کے بد رنگ چہرے پر لرزاں و ترساں ہونٹوں کو بمشکل خشک کرتے ہوئے بولا۔

"منی تم کیوں رو رہی ہو، کیا بات ہے"۔ میری آواز میں گہری شدت تھی "شاباش چُپ ہو جاؤ، تم رو نہیں"۔ میں کوشش کے باوجود اُسے اپنے آپ سے مخاطب نہ کر سکا، یہ خوف لئے جیسے یہ میرا جملہ نہیں سمجھ پائے گی اور مجھے بعد از اں تغیر و تبدل کے احساس تلے ہلاک ہونا پڑے گا۔ وہ اب خاموش تھی مگر ہچکیوں پر سوار ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں تھی اور جب میں نے اُسے دیکھنے کے لئے تصویریں دیں تو وہ یک لخت رُک سی گئی اور ایک مدہم سی بے جان مسکراہٹ اُس کے لبوں پہ طلوع ہوتی دکھائی دی یہ بعینہٖ وہی مسکراہٹ تھی جیسے مرنے کے بعد لاش کے چہرے پہ ابدی طور پر ثبت ہو جاتی ہے۔

"کیا بات ہے، تم کیوں رو رہی تھی"۔ میں نے اور قریب ہوتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا، بولو کیا بات ہوئی ہے"۔ رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور وقت پگھلنے کے ساتھ ساتھ اِس بچی کے چہرے کے نقوش دم بہ دم غیر واضح ہوتے جا رہے تھے اور پھیلتی ہوئی سیاہی انھیں پوری طرح سے مٹانے میں مصروفِ عمل تھی۔ آسمان بتدریج سیاہ ہوتا جا رہا تھا اور زمین کے اِس خطے کے عین اوپر اپنا وجود مٹا دینا چاہتا تھا۔ میں نے تمام تصویریں اِسے دے دیں اور پھول بھی اور بولا۔

"یہ اچھی اچھی خوب صورت تصویریں، انھیں تم رکھ لو اور یہ سارے پھول بھی تمہارے ہیں"۔ میں ایک تصویر اُسے دیتا ہوا بولا "دیکھو کتنے خوب صورت درخت ہیں اور نیچے ایک ہرن بھی کھڑا ہے"۔

وہ اچانک کھڑی ہو گئی اُس کی حرکت میں ایک اضطرابی کیفیت پنہاں تھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ایک طرف کو چل دی۔

پھول زمین پر بکھرے پڑے رہے تھے اور تصویریں حسن و جبر سے عاری اس چھایا ہوتے ہوئے ماحول میں سے نکلنے کو بے تاب تھیں اور وہ لڑکی اپنی آنکھوں کو دیتے، اپنے نازک رخساروں اور سیاہ بالوں کی ویران لٹوں کو لئے دور اور دور لحظہ بہ لحظہ ایک گناہ گار جیسے کی مانند تاریک تر ہوتی جا رہی تھی۔ واپس آکر میں نے کچھ بھی نا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا، جوتے ویسے ہی پاؤں میں تھے اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اندازاً کوئی بیس پچیس منٹ بعد کا عمل ہوگا کہ وہی لڑکی مجھے ملنے آئی، اُس نے وہی بوسیدہ فراک پہنا ہوا تھا اور چہرے پر وہی آنکھیں لئے ہوئے تھی میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے جیسے اسے پکڑ کر قریب کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے اُس کا صرف ٹانیاں بازو آگے کی طرف لپکتا دکھائی دیا اور یہ وضاحت جانتے ہوئے نا معلوم کس سوچ نے میرے شعور پہ دستک دی کہ میں بھی اپنا بائیاں بازو اتار پھینکوں وہ میرے ہاتھ کے سہارے پاس آتے ہوئے بولی۔

"یہ سب پھول آپ وہاں بھول آئے تھے اور تصویریں بھی وہیں چھوڑ آئے تھے، یہ آپ کی ہیں انھیں رکھ لیں۔" اُس نے میری طرف دیکھا اور کہا "جب پیٹ بھوکا ہو تو حسن کوئی معنی نہیں رکھتا اور تب خوبصورتی کی تعریف ممکن نہیں رہتی۔"

میں نے تصویریں لے کر ایک طرف رکھ لیں اور کوشش کرتا ہوا بولا "آپ . . . . . . آپ کیسے آئی ہیں یہاں آتنی...؟"

"میں آپ کو ملنے آئی ہوں، آپ میرے لئے پھول لائے تھے اور اچھی اچھی خوبصورت تصویریں اور میرے پاس آنسو تھے اور خاکی ذرات، آنسوؤں نے اِن تصویروں کا رنگ بگاڑ دیا تھا اور دھول نے پھولوں سے روشنائی چھین لینی تھی چنانچہ سوچا آپ کو واپس کر آؤں۔" اُس کی آواز میں لرزتے پتوں کی سی سرسراہٹ تھی۔ "میں ایک ہی طرح کی لڑکی ہوں اور ہم سب کے آنسو بھی ایک سے ہیں، جیسے ہمارے خون کا رنگ ایک جیسا ہے۔ یہ مختلف تصویریں جو مختلف خوب صورتیاں لئے ہوئے ہیں آپ انھیں دیں جن کے پاس کئی طرح کے اور کئی رنگوں میں مزے ہیں۔ جن کی نازک اور کم عمر کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں ہیں یہ تصویریں اُن ہاتھوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ آپ اگر مجھے کچھ دینا چاہتے ہیں تو کھانا لا کر دیں جس کا ہر لقمہ ہم شکل اور روٹی کی ہر صورت بعینہٖ وہی صورت ہوتی ہے ایسی تصویریں لا کر دیں تو اچھا ہے، اِن کاغذی تصویروں اور خوشنما پھولوں کو میں کیا کروں۔" اُس کے لبوں پر میں نے پہلی مرتبہ ایک غیر فانی مسکراہٹ پھیلتے دیکھی۔

"میں آج رات تمہارے پاس آئی ہوں لیکن میں سب کے پاس جانے کو تیار ہوں، میں ہر ایک کے پاس جانے کو تیار ہوں صرف امید کی اِس بجھتی ہوئی شمع کو ساتھ لئے کہ کبھی تو کوئی محسن اور ہمدرد دکھائی دے گا۔"

"سنو تمھیں کیا چاہیے۔" میں نے چپکے سے پوچھا بھلا کتنا کچھ تمہارے لئے کھانے کو لاؤں۔"

وہ ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ آواز کے اِس بہاؤ میں بلا کا شور تھا، جب تلاطم ختم ہوا تو وہ بڑی مشکل سے ہنسی جذب کرتے ہوئے بولی۔

"میں جاتی ہوں، آج کی رات بھی بیکار گئی۔" وہ جاتے جاتے مڑی اور ایک لہجہ گویا ہوئی۔ "پہلے میرے باپ نے میری اُمی کو مارا اور وہ برتن توڑ دیا جس میں ہم سب پانی پیتے تھے، اُس نے سب کو گالیاں دیں اور پھر خود کو گالیاں دیتا

ہوا باہر چلا گیا۔ بعد میں ماں نے مجھے بہت پیٹا اور وہاں اُس کچی مٹی پر زور سے پٹختے ہوئے واپس چلی گئی —— ہمیں کھانے کے لیے بہت کچھ چاہیئے اور پھر کل رات شمو بھی تو رو رہی تھی۔ اُسے بھی تو بھوک لگتی ہے، اُس کا چھوٹا بھائی بیمار ہے اُسے بھی روٹی چاہیئے اور وہاں بھی کچھ ضرورت ہے اور وہاں اور وہاں بھی تو کچھ ضرورت ہے اور وہاں اور وہاں —— اور وہاں بھی ضرورت ہے ؟

صبح چار بجے میری آنکھ کھل گئی، جوتے ابھی تک پاؤں میں بندھے تھے اور میں آدھا بستر پر اور آدھا بستر کے نیچے پڑا سو تا رہا تھا۔

ابّو

سلمان سعید

سردیوں کے دن تھے۔ نصرت اپنے بنگلے کے رنگا رنگ پھولوں سے بھرے وسیع و عریض لان میں پچھلے پہر کی مدھم اور اُداس دھوپ میں تنہا بیٹھی اپنے شوہر میجر سرفراز کے لئے، جسے ہندوستان کی قید میں صعوبتیں جھیلتے ایک برس ہو چکا تھا، سویٹر بن رہی تھی۔ اتنے میں اس کا ڈھائی تین سالہ گول مٹول سرخ و سپید بچہ، پپو بھاگتا ہوا آیا اور اپنی ماں کے ساتھ لپٹ کر اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بے حد ہراساں لہجے میں اپنی توتلی آواز میں بولا:-

"امّی امّی - باجی لوتی ہیں!"

یہ سن کر نصرت نے سویٹر بُننا بند کر دیا اور دونوں ہاتھوں میں یوں سر پکڑ لیا جیسے کسی ناقابلِ حل مسئلے کا حل ڈھونڈ رہی ہو۔

"امّی، کیا ہوا؟ دَرد ہے سر میں؟ دبا دوں؟" بچے نے ماں کی گردن میں اپنی گداز باہیں حمائل کرتے ہوئے انتہائی فکر مندی سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا۔" نصرت نے رقت بھرے لہجے میں یہ کہتے ہوئے فرطِ محبت سے بچے کو اپنے ساتھ بھینچ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ اور پھر اسے گود میں اُٹھا کر اپنی آٹھ دس سالہ اکلوتی بیٹی شاذیہ کو، جسے وہ پیار سے بے بی کہتی تھی، چپ کرانے اپنے گھر کے اندر چلی گئی۔

بے بی اپنے کمرے میں، ہاتھوں میں اپنے ابّو کی تصویر لئے، بستر پہ لیٹی سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ نصرت جونہی اندر داخل ہوئی اس نے کروٹ بدل لی جیسے وہ اپنی ماں سے اپنی اشکبار آنکھیں چھپانا چاہتی ہو۔ نصرت پپو کو گود سے اتار کر بے بی کے بستر پہ بیٹھ گئی اور اپنے دل میں اُٹھتے غم کے طوفان پہ قابو پاتے ہوئے بولی:

"بیٹی، تم آج پھر رو رہی ہو۔ تمہارے آنسو تقدیر کا لکھا مٹا تو نہیں سکتے۔" اس نے بے بی کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"چپ ہو جاؤ بیٹی۔ اللہ نے چاہا تو تمہارے ابّو جلد لوٹ آئیں گے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ اس نے بہت چاہا کہ اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکلتے آنسو واپس پلٹ جائیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جبھی ننھے پپو نے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے تالی بجا کر اچھلتے ہوئے، جیسے کوئی پہیلی بوجھتے ہوئے کہا:

"امّی لوتی ہیں، امّی لوتی ہیں۔"

"میں کب رو رہی ہوں بیٹا، رو تو تمہاری باجی رہی ہے۔" نصرت نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے یوں کہا گویا وہ کوئی

انتہائی بلند حوصلہ عورت ہو۔ منہ دوسری طرف کئے لیٹی، چہرہ بازوؤں میں چھپائے بے اختیار آنسو بہاتی بے بی کی سسکیاں اور بلند ہو گئیں۔ "بیٹی، اللہ پہ بھروسہ رکھو۔" یہ کہتے ہوئے نصرت کھڑی ہو گئی اور اپنی ساڑھی کے پلو سے دوبارہ آنسو پونچھتے ہوئے گھوم کر بستر کے دوسری طرف چلی گئی۔ ماں کو اپنے سامنے پا کر بے بی نے تکیے میں منہ چھپا لیا۔ جلدی میں اس کے باپ کی تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بستر پہ گر گئی۔ اس نے جھٹ سے تصویر اٹھانا چاہی، لیکن اس سے پہلے اس کی ماں نے اسے اٹھا لیا۔ تصویر کے نیچے یہ حروف تحریر تھے:

"پیارے ابو، آپ اب میرے خوابوں میں کیوں نہیں آتے؟"

تصویر کے نیچے لکھے اس سوال نے نصرت کے حوصلے کے تمام بند جیسے ایک دم سے توڑ دیئے۔ اس کے سینے میں چھپا غم آنسوؤں کی صورت اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔ پل بھر میں اس کے رخسار بھیگ گئے۔ "چپ ہو جاؤ بیٹی۔۔۔ تمہارے ابو تنہا۔۔۔۔۔ دشمن کی ۔۔۔۔۔ قید میں نہیں۔" نصرت سسکیاں بھر رہی تھی۔ "۔۔۔۔۔ ان کے ساتھ ۔۔۔۔۔ اور بھی ۔۔۔۔۔ بہت سی بیٹیوں کے ۔۔۔۔۔۔ باپ ہیں ۔۔۔۔۔" اس نے تصویر کے نیچے لکھا ہوا بے بی کا سوال دوبارہ پڑھا اور وفور غم سے زور زور سے رونے لگی۔ "چپ ہو جا بیٹی ۔۔۔۔۔ حوصلہ کر ۔۔۔۔۔ صبر سے کام لے۔" وہ روتے ہوئے اپنی بیٹی کے سر میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

یہ منظر اس گھر میں کئی بار دیکھا جا چکا تھا۔ کبھی ماں بیٹی کو چپ کراتی اور کبھی بیٹی ماں کو۔ دونوں چھپ چھپ کر رونا چاہتیں لیکن ننھا پپو۔ جو سمجھ بوجھ کی سرحد سے ابھی بہت پرے تھا کبھی اپنی باجی امی کے رونے کی اور کبھی اپنی امی کو اپنی باجی کے رونے کی خبر کر دیتا۔ اور یوں کبھی ماں بیٹی کی ڈھارس بندھاتی اور کبھی بیٹی ماں کی۔۔۔۔ اسی دوران پپو انھیں سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ایک طرف کھڑا رہتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی امی اور باجی کیوں اور کس لئے روتی ہیں اس نے نہ تو کبھی اپنی باجی کے آنسوؤں کا ساتھ دیا تھا اور نہ اپنی امی کے آنسوؤں کا، کیونکہ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ "ابو" کسے کہتے ہیں۔۔۔ اگرچہ اس نے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک یہ لفظ بارہا سنا تھا اور اپنے ابو کی تصویر بھی دیکھی تھی، لیکن یہ تصویر اسے ابو کا مفہوم نہیں سمجھا سکی تھی۔۔۔ اس کے علاوہ چونکہ اس نے اپنی باجی کو ابو کی تصویر کے سامنے ہمیشہ روتے ہوئے ہی دیکھا تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ ابو کے لئے صرف رویا ہی جاتا ہے، ہنسا نہیں جاتا جبھی ایک رات اس نے اپنی امی کے ساتھ بستر پہ بیٹھے بیٹھے بے ساختہ پوچھا تھا "امی، کیا ابو کے لئے صرف روتے ہی ہیں؟"

اس اچانک سوال پہ نصرت چونک گئی تھی اور ننھے پپو کو سینے کے ساتھ لگا کر بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ اور ماں کے آنسوؤں نے جیسے پپو کے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ ابو کے لئے صرف رویا ہی جاتا ہے، ہنسا نہیں جاتا۔۔۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ آئے دن اپنی امی سے ابو کے بارے میں عجیب عجیب سوالات پوچھا کرتا:

"امی کیا ابو بھی ہنستے ہیں؟"

"امّی، کیا ابّو بھی لڑتے ہیں؟"

"امّی، کیا ابّو بھی ٹی۔وی دیکھتے ہیں؟"

"امّی کیا ابّو بھی کار چلاتے ہیں؟"

اور جب اُسے ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں ملتا تو وہ کسی سوچ میں پڑ جاتا اور اپنی بڑی بڑی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں مٹکاتے ہوئے انتہائی بھولپن سے کہتا:

"تو پھل (پھر) انکل بھی تو ابّو ہی ہوئے۔ اِڈرائیور بھی تو ابّو ہی ہوا۔ وہ بھی تو کار چلاتا ہے۔ وہ بھی تو ہمارا ٹی۔وی دیکھتا ہے۔"

اس پر نصرت سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ بچے کو ابّو کا مطلب سمجھانا اسے حساب کا ایک ایسا سوال معلوم ہوتا جسے دنیا کا کوئی حساب دان بھی حل نہ کر سکتا ہو ——— چنانچہ وہ اکتاہٹ بھرے مغموم لہجے میں فقط اسی پر اکتفا کرتی۔

"ابو بس، ابو ہوتے ہیں بیٹا۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو اُمڈ آتے۔ اور پپو جیسے فوراً بوجھ لیتا کہ اس کی ماں رو رہی ہے ——— وہ بھاگتا بھاگتا اپنی باجی کے پاس جاتا اور ہانپتے ہوئے کہتا "باجی امی رو ائی ہیں ——" اور یوں کبھی اس کی باجی اپنی امی کو چپ کراتی اور کبھی امی باجی کو!

. . . . . . لیکن آج تو سماں ہی اور تھا۔ ایک طرف بے بی تکیے میں منہ دیئے بھبک بھبک کر رو رہی تھی۔ دوسری طرف نصرت اپنا چہرہ دونوں ہتھیلیوں کی اوک میں چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ قریب ہی بستر پر اس کے شوہر کی فوجی وردی میں کھنچوائی گئی وہ تصویر پڑی تھی جس کے نیچے لکھا تھا "پیارے ابو، آپ اب میرے خوابوں میں کیوں نہیں آتے؟" ——— خوابوں میں نہ آنے والا ایک باپ بھی تھا اور شوہر بھی، ایک بیٹا بھی تھا اور وطن کا محافظ بھی ——— محافظ جو کبھی غازی بن جاتا ہے کبھی شہید اور کبھی ——— قیدی! ——— نصرت کا خاوند اور بے بی کا باپ قیدی تھا ——— زندہ ہوتے ہوئے بھی اُن سے اوجھل! ——— اس لیے وہ رو رہی تھیں آج جیسے ماں، اور بیٹی نے وہ تمام آنسو بہانے کی قسم کھا رکھی تھی جو وہ ایک برس سے ایک دوسرے کے سامنے پیتی آئی تھیں۔ آج جیسے وہ دونوں سچ بول رہی تھیں۔ اس لئے کہ آج کوئی کسی کے آنسو نہیں پونچھ رہا تھا۔ کوئی کسی کو چپ نہیں کرا رہا تھا، کوئی کسی کی جھوٹی ڈھارس نہیں بندھا رہا تھا۔ اور ننھے پپو کے لئے یہ منظر بالکل نیا اور ان دیکھا تھا۔ اپنے سائیں سائیں کرتے گھر سے بیک وقت ابھرنے والی ماں اور بہن کی سسکیوں کے درمیان وہ جیسے خود کو تنہا تنہا اور اجنبی سا محسوس کر رہا تھا۔ اور اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ وہ کبھی اپنی باجی کے ساتھ لپٹ کر اپنی توتلی آواز میں کہتا "باجی۔ نہ لوئیں" کبھی اپنی ماں کے ساتھ لگ کر کہتا "امی، مت لوئیں"۔

ماں اور بہن کی ڈھارس بندھانے کا یہ کیسا ڈھنگ تھا جس سے ان کی سسکیاں بند ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی تھیں، آنسو تھمنے کی بجائے اور بہنے لگے تھے ———

اس کی لاکھ کوشش کے باوجود جب اس کی ماں اور بہن نے رونا بند نہ کیا تو اس نے سوچا کہ اسے بھی ان کے آنسوؤں میں شریک ہو جانا چاہیئے ——— اس نے رونا چاہا — اپنے ان دیکھے باپ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے اس نے رونے کی بہت کوشش کی ——— لیکن وہ اپنی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ لا سکا!

——— اسی روز شام کو باہر برآمدے میں اپنے کھلونوں کے ساتھ کھیلنے کے دوران پپو فرش پر گر پڑا اور زور زور سے روتے ہوئے اندر چلا۔ اس کی امی اور باجی نے جب اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے جیسے کچھ سوچ کر قدرے توقف کے بے ساختہ کہا:

"مجھے بھی — ابو — یاد آ رہے ہیں!"

بات اتنی کہ بات کچھ بھی نہیں

احمد جمال پاشا

بات اتنی کہ بات کچھ بھی نہیں، یعنی خیر سے میں کچھ گھر گھسنا اور شرمیلا واقع ہوا ہوں۔ ملاقاتیوں سے مجھے الجھن اور لمبی چوڑی باتوں سے وحشت ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں اور مغرور ہوں۔ لیکن میں بلا کسی کے مطلب کی پروا کئے بھی گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک اپنے آپ کو محدود رکھتا ہوں۔

دفتر میں اس لئے سر نہیں اٹھاتا کہ بے بھاؤ کی پڑ جائیں، بلکہ کوئی ملاقاتی گلے نہ پڑ جائے۔ اسی لئے احتیاطاً گھر میں باہر سے تالا لگا کر پچھواڑے سے داخل ہوتا ہوں۔ تاکہ آنے والا "آؤٹ" کی تختی اور تالا دیکھ کر باہر ہی سے آؤٹ ہو جائے۔ مگر پھر بھی وہ پچھواڑے ہی سے کیچ کر لیتا ہے۔ میرا پڑھنا رہتا ہے تالا بند رہتا ہے۔ مگر گھیرنے والوں کا سلسلہ خیال کی رفتار سے جاری رہتا ہے۔

میں پڑھنے میں بے حد اڑیل تھا۔ صرف ناول پڑھتا۔ ہر سال فیل ہونے کے بعد پرنسپل صاحب ہاتھ جوڑتے کہ "اب میں اس کالج کو معاف کر دوں۔ میرے جیسے لڑکوں کی وجہ سے کالج کی ایڈ تک بند ہو سکتی ہے۔" پڑھنا، فیل ہونا، اور معاف کرنا جاری رہنے کے باوجود شاید ہی کوئی کالج ایسا بچا ہو، جس کا رزلٹ میں نے فیل نہ کیا ہو۔

بدقسمتی دیکھئے، میرے ساتھ کے بے شمار پڑھنے والے، سماج کی اونچی سے اونچی کرسیاں گھیرے ہوتے ہیں۔ سب کے کارنامے مجھے منہ زبانی یاد ہیں۔ اور کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں میرے منہ سے نکل ہی جاتے ہیں۔

میرے سر پہ کوئی سینگ نہیں کہ لوگ مجھے دیکھنے آئیں۔ اس کے باوجود صبح سے میرا دربار لگنے لگتا ہے۔ وہ بھی اس شان سے کہ دودھ والی کے لئے دروازہ کھولا گیا اور دو چار آدمی اندر، مہتر آیا تو ساتھ میں لوگ بھی آ گئے۔ بچے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے تو گھر میں کچھ اور آدمی داخل ہو گئے۔ نوکر سودا ترکاری لینے نکلا تو کچھ اور چلے آئے۔

آنے والوں میں کسی کو رشوت لیتے پکڑ لیا گیا تھا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ اگر میں اس کے بڑے افسر سے جھوٹوں ہی کہہ دوں "ارے بھائی! یہ اپنا آدمی ہے۔" تو وہ کھٹ سے بحال ہو جائے گا۔ کسی کی لڑکی کی شادی اس لئے رکی ہوئی ہے کہ ہونے والا داماد ابھی تک بیکار ہے۔ اس کو نوکری دلانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے مہربان لڑکی کے ہاتھ پیلے کرتے ہی تیرتھ یاترا پر چلے جائیں گے۔ ان کا کام نہ کرنے کا یہ مطلب ہوا کہ ایک طرف تو ایک نیا گھر نہ بس پائے، دوسری طرف ان کی یاترا میں دیر کا پاپ بھگتیں۔ کسی کو مکان کی ضرورت ہے۔ اگر میں چاہوں تو کھٹ سے الاٹ ہو جائے۔ کسی کے باپ نے خون کر دیا تھا۔ اب پھانسی پانے والا ہے۔ اگر میں رحم کی سفارش کر دوں تو اگلا خون کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا۔ کسی کا

جینا اس کے پڑوسی نے حرام کر دیا ہے۔ اگر میں پولیس سے اُس کے ہوش ٹھکانے لگوا دوں تو وہ محلہ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ زندگی حلال ہو سکے گی۔ کسی کی لڑکی کا ایک کُتا پیچھا کرتا ہے۔ اور کسی بھی وقت کاٹ سکتا ہے۔ میں کتے کو سمجھا دوں کہ ——— بیٹا! لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا بہت بڑی بات ہے۔ اس طرح با عزت کا خیال کئے نہیں بھاگا کرتے۔ اگر تم نے لڑکی کو کاٹنے کی کوشش کی تو میں تمہیں میونسپلٹی کی کتا گاڑی میں بند کروا کے چلتا کر دوں گا۔" کسی کو پریشانی ہے کہ فلاں اخبار اُس کی غلط خبریں نہیں چھاپتا جو صحیح سے کہیں زوردار ہوتی ہیں۔ میں اُسے ڈانٹ پلا دوں تو اس کا کاروبار چمک اُٹھے ——— کوئی چاہتا ہے کہ اس کے حرام کے دھن کی طرف انکم ٹیکس والے اِس لئے رُخ نہ کریں کہ یہ اُس کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔ اگر میں منع کر دوں تو بے ان کا حال پتلا ہوگا نہ پسینہ ———

میری بیوی کو یہ بھیڑ بھاڑ سخت ناپسند ہے اُسے حیرت ہے کہ جس آدمی سے چنے کی دال منگاؤ تو مونگ کی اُٹھا لائے۔ فرمائش لفافے کی ہو تو تار کا فارم لئے گھر میں گھسے۔ جسے مالک مکان ہمیشہ گھر سے نکالنے کی دھمکی دے کر کرایہ بڑھاتا رہے۔ جو ہول تول کی قابلیت نہ ہونے کی وجہ سے کوڑیوں کا مال اشرفیوں میں لا کر گھر کا بجٹ فیل کرتا رہتا ہو۔ دفتر میں جس کی بڑے صاحب کی بے جا گھڑک تک پر گھگی بندھ جاتی ہو وہ ہر روز کے حاتم طائیوں کے سات سوال کیسے پورے کر سکتا ہے۔

میری بیوی اس کے باوجود خاموش رہتی ہے۔ خاموشی پٹی کوٹ گورنمنٹ کی پالیسی ہے۔ گورنمنٹ کوئی بھی ہو۔ ہمیشہ سب سے اچھی پالیسی خاموشی ہوتی ہے۔ حکومت میں رہنے کے لئے سوچنا، سمجھنا اور خاموش رہنا ضروری ہے، گھر کی حکومت کی خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ آنے والوں کا گھر کے بجٹ پر بہت خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ بڑی راحت ملتی ہے۔ کوئی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ اگر آیا بھی تو کام ہو جانے پر ہاتھ بھر جائے گا۔

آنے والا آتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔" صاحب! لڑکا مقابلے کے امتحان میں آ گیا۔ انٹرویو میں بھی آ گیا تو سمجھئے مار لیا اس نے پالا۔ بس اب ناگر جی کے ہاتھ میں ہے ———" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ——" اچھا اچھا ناگر جی! ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کہہ دوں گا۔ جائیے! جائیے۔ سمجھئے انٹرویو میں تو وہ آ گیا۔"

اُس کے جانے کے بعد بیوی پوچھتی ہے۔" سمجھے بھی؟ کون ناگر جی! ناگر جی اپنا کام تو کر نہیں پاتے۔ ناپ تول کر نمبر دیتے ہیں۔ اب ایسے بھی گئے گذرے نہیں کہ آپ کے کہنے سے انٹرویو میں "فیور" کرنے لگیں؟" اور میں حیرت سے پوچھتا ہوں۔" کون ناگر جی؟ لو اور سنو، میں نے آج تک کبھی کسی کے لئے کہا ہے؟ تم ناگر جی! ناگر جی کی رٹ کیوں لگائے ہوئے ہو۔؟ ——— میرا مطلب سمجھ کر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ اتنے میں کھاٹ بنے کے ساتھ ایک صاحب گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ میں غور کرتا ہوں کہ ان میں کون صاحب ہیں اور کون کھاٹ بنے! وہ کہتے ہیں:" جی وہ دفتر سے ٹور پر گیا تھا فرسٹ کا کرایہ ملا تھا۔ بھیڑ بہت تھی۔ جلدی میں مجبوراً سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینا پڑا۔ معاملہ طول پکڑ گیا معطل ہوں اگر منتری جی چاہیں تو معاف کر دیں، ورنہ اس فرسٹ اور سکینڈ کے جھگڑے میں بال بچے بھوکوں مر جائیں گے ———" میں پوچھتا ہوں۔ کون ہے آج کل؟" ——— جی وہ سکسینہ صاحب!" ——— "ارے وہ سکسینہ اپنا پرانا کلاس فیلو۔ جاؤ کہہ دوں گا۔!" پھر میں اُس وقت تک خاموشی

سے اُن کی سنتا رہتا ہوں، جب تک کہ وہ میرے رُعب سے چُپ ہو کر چلتا نہیں بنتا۔
دفتر میں ابھی پہلی چائے بھی نہیں ختم کر پاتا کہ کوئی نہ کوئی نازل ہو جاتا ہے۔ پہلی چائے پر میں نے اس لئے زور دیا
ہے کہ جب تک دو چار دور چائے کے نہ چل جائیں۔ ایک آدھ راؤنڈ لگا کر دفتر کی خیریت اور سیاست نہ معلوم کر لی جائے
ایک آدھ بیڑا اسٹرک پر بھروسے کی پان کی دوکان کا نہ لگا لیا جائے۔ کام شروع کرتے نہ اچھا لگتا ہے۔ نہ موڈ بنتا ہے۔
کم از کم لنچ تک۔ لاتعلقی بلا اس کی پروا کئے، کہ میں نے سلام کا جواب دیا ہے یا نہیں۔ بس آتے ہی شروع ہو جاتا ہے
"صاحب! پاسپورٹ پھنسا ہوا ہے۔ آپ حکم کر دیں۔" میں بلا سر اٹھائے کہتا ہوں۔ "جائیے! مل جائے گا۔" اور وہ دعائیں
دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔

قسم لے لیجئے جو یہ تک معلوم ہو کہ پاسپورٹ کا دفتر کہاں پر واقع ہے۔
اتنے میں ایک بڑے میاں اپنے پوتے کی انگلی پکڑے داخل ہوتے ہی فرماتے ہیں۔ "بھئی تمہارے پوتے نے انٹر
کا امتحان دیا ہے۔ حساب میں ذرا کچا ہے۔ کاپی مسٹر خان کے پاس پہنچ گئی ہے۔ یہ رہا اس کا رول نمبر۔ آپ لکھ دیں
تو اس کی فرسٹ کلاس پکی ہو جائے گی۔!"
"جی بالکل! میں آج ہی اُسے لکھ دوں گا۔ اپنا تو پرانا کلاس فیلو ہے!"
بڑے میاں دعائیں دیتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ میں اب کام شروع ہی کرنے والا ہوتا ہوں کہ ایک سردار جی
ٹپک پڑتے ہیں۔ ...

"جی! وہ زو کا ٹھیکہ دلا دیجیے۔!"
میں حیرت سے انہیں دیکھتا ہوں۔ کہ کیا یہ مع فیملی کے زو میں رہنا چاہتے ہیں؟ یا سوائے اِن کے عجائب گھر پہ کسی اور
کا حق ہی نہ ہے۔ مگر وہ بڑی گمبھیرتا سے کہتے ہیں۔
"جانوروں کے لئے جانوروں کی سپلائی کا ٹنڈر بھرا ہے۔ مگر زو میں تو چترویدی صاحب ہی کی چلتی ہے۔ جانوروں
کا پیٹ بھرنے کے بہانے اگر اپنی بھی پرورش ہو جائے تو کیا ہرج ہے بادشاہو۔؟"
اور میں مسکرا کے کہتا ہوں۔ "وہ چترویدی! اپنا پرانا کلاس فیلو۔ کہہ دوں گا۔ جاؤ۔" اور وہ اپنا کارڈ دے کر
جانوروں کے راشن میں حصہ بٹانے کی اُمید میں خوشی خوشی چلا جاتا ہے۔
غرض گھر ہو یا دفتر۔ آنے والوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کوئی بڑا سا مٹھائی کا ڈبہ لئے چلا آ رہا ہے کہ وہ رشوت
میں معطل ہو گیا تھا۔ آپ نہ کہتے تو بڑے صاحب ہرگز نہ بحال کرتے۔ "کوئی صاحب آگرے کا پیٹھا اور دالموٹ لئے چلے
آ رہے ہیں کہ آپ کی مہربانی سے ہونے والے داماد کو نوکری مل گئی۔ لڑکی کے ہاتھ پیلے ہو گئے۔ آپ کی کرپا سے کل
تیرتھ یاترا کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔"
کمال تو یہ ہے کہ پھانسی بھی عمر قید میں بدل گئی۔ خونی باپ کا بیٹا آئس کریم کا دھندا کرتا ہے۔ اس لئے دنیا بھر میں

بانٹنے کے لئے درجن بھر پرنڈ بمینٹ چڑھا گیا۔

پڑوسی کے محلہ چھوڑ کر بھاگنے کی خوشی میں وہ صرف شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ مگر بعد کو گھر میں پتہ چلا کہ ولایتی کپڑے کا بہترین تھان ہماری بیوی پر چڑھا کر بچہ تک پہونچا تھا۔ اب ہماری خفا ہیں کہ "دنیا بھر کے فضول لوگ آپ کے پاس آتے ہیں۔ آخر کوئی ٹیلر ماسٹر کیوں نہیں آتا۔؟"

اس خوشخبری کے ساتھ کہ گنتے تے لڑکی کا بیاہ کرنا چھوڑ دیا ہے وہ ہمیں ایک عدد ولایتی پلا تھما گئے۔

غلہ خرید بیچنے والے آئے تو باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور مونچھیں دو بجے کر دس بجا رہی تھیں ۔ بولے۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ کسی بھی قسم کے اگائے ہوئے مال کی ضرورت ہو۔ بلا تکلف فرمائیے گا ۔ نمونہ مفت پیش کر دوں گا۔!

اُن کے جانے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ وہ سوئی میں تاگا ڈالنے والی مشین بیوی کی نذر کر گئے ہیں ۔ حالانکہ وہ بلا مشین کے نہ صرف تاگا ڈال سکتی ہیں بلکہ سی تک سکتی ہیں۔

گاڑھے پسینے والے نہیں آئے ۔ بہت سے نہیں آئے مگر یقین ہے کہ ضرور اُن کا پسینہ دو نمبر کی پکڑ دھکڑ میں پتلا ہو چکا ہوگا۔ ورنہ لدے پھندے آتے۔

سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے والے مہاشے میری خیال سفارش سے اتنے شیر ہو چکے ہیں کہ اب بلا ٹکٹ تک سفر کرنے پر تیار ہیں۔

معلوم نہیں جن صاحب کا پاسپورٹ بننا تھا۔ جن کے پوتے کی تھرڈ کلاس کا بی یہ فرسٹ کلاس نمبر ملنے تھے یا جو صاحب آدمیوں کے بجائے جانوروں کا ٹھیکہ لینا چاہتے تھے۔ اُن سب کا کیا حشر ہوا۔؟

ڈاکٹروں کے لئے کہا جاتا ہے کہ ہر سو میں نوّے مریض خود ہی لوٹ پوٹ کے اچھے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح گھسنے والوں کے زیادہ تر کام بن ہی جاتے ہیں۔ دنیا کا دستور ہے کہ یہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو گھیرتی ہے۔ جو اُس کے کام نہ آتے ہوں۔ شائد آپ پوچھ بیٹھیں کہ لوگ آپ کو کیوں گھیرے رہتے ہیں۔؟ ۔ تو میں جواب دوں گا کہ "بات اتنی ہے بات کچھ بھی نہیں ۔ میرے پاس لوگ صرف اس لئے آتے ہیں کہ میں اِن میں سے کسی کے بھی کام نہیں آ سکتا۔ یوں بھی میں ہر کامیاب افسانہ کی طرح سوائے اپنے کسی کے بھی کام کا نہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ میرے پاس صرف وہی لوگ آتے ہیں۔ جن کا کام ہونے والا ہوتا ہے"۔



ایک زندہ رہنے والی افسانہ نگار — خدیجہ مستور

خدیجہ مستور

کے دُوسرے ناول

زمین

کا پہلا باب

سفر

"میری بچی میری بیٹی - میری بیٹی کہاں ہے" بوڑھا اپنے بال نوچ کر زور زور سے چیخا اور پھر سر جھکا لیا - چیخنے کے بعد جیسے اسے قرار آجاتا اور پھر گھنٹوں وہ ایک ہی طرح سے سر جھکائے بیٹھا رہتا - اس کے پاس سے سب لوگ خاموشی سے گزر جاتے - کوئی اس سے نہ بولتا - کوئی اسے جواب نہ دیتا - شاید اسے جواب دینے کی کسی میں بھی سکت نہ تھی، یا پھر سب اپنے آپ میں گم تھے مگر ساجدہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ بوڑھے کی ہر چیخ اس کے کلیجے سے دراتی ہوتی گزر جاتی ہے - اس کا جی چاہتا کہ وہ بوڑھے کے پاس جائے، اسے تسلی دے لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتی تھی - آخر وہ اس سے کیا کہے گی ؟

ایک باپ جس کی بیٹی کو لوگ جبراً چھین لے گئے ہوں، وہ اس سے کن الفاظ میں ہمدردی کرے گی ؟ صبر جیسا لفظ سن سن کر تو اس کے کان پک گئے تھے - بوڑھے سے وہ صبر کی بات نہیں کر سکتی -

جب بھی بوڑھا چیختا تو ساجدہ الفاظ کی تلاش میں پریشان ہوتی رہتی - اسے کیا پتہ تھا کہ جبر کا نشانہ بننے والوں کی تسلی کے لئے آج تک الفاظ پیدا نہیں ہوئے تھے -

وہ اپنا جی بہلانے کے لئے بوڑھے سے نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی - عورتوں اور مردوں کے چہروں پر اسے بے سروسامانی برستی محسوس ہوتی - حالانکہ سب نے اپنا اپنا ٹھکانہ بنالیا تھا فوجیوں کی خالی کی ہوئی لمبی لمبی بدرنگ بارکوں میں، درختوں کے سائے تلے، دریوں کی چھتوں کے نیچے تمبوؤں کے پُراسرار اندھیروں کے اندر - زمین کے اس ٹکڑے نے سب کو پناہ دے دی تھی - اس نے سب کے قدموں کی تھکن اپنے سینے میں جذب کر لی تھی -

ابا نے بھی ایک گھنے درخت کے نیچے، موٹی چادروں کی دیواریں بنا کر اسے بٹھا دیا تھا اور اس نے سفر کی دہشت کے بعد پہلی بار سکون کی سانس لی تھی -

والٹن کیمپ کی یہ تیسری شام تھی - امدادی کمیٹیاں سورج ڈھلنے سے پہلے ہی کیمپ کے پُرجوش نعروں کے درمیان چنے کی دال اور نرم و گرم روٹیاں بانٹ گئی تھیں اور اب حقہ پینے والوں کی ٹولیاں، ننھے ننھے الاؤ جلا کر ان کے گرد بیٹھی تھیں - حقے کے ہر کش پر دھوئیں کی ننھی سی بدلی اٹھتی اور ہوا میں گم ہو جاتی - لوگ بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے وہ اپنی اپنی بپتا کے ترازو میں دکھوں کا زیادہ سے زیادہ بوجھ بھرنے کی کوشش میں ڈنڈی مار رہے تھے - عورتوں کی ٹولیاں الگ بیٹھی تھیں - خنک ہوا میں ان کے میلے کچیلے آنچل پھڑ پھڑا رہے تھے - ان کے چہروں پر گھروں کی چھت کے سائے کی محرومیت برس رہی تھی - لڑکیاں اب تک دہشت زدہ سی تھیں، پھر بھی اپنے آس پاس سے گزرنے والے نوجوان لڑکوں کو دیکھ کر پیشانی تک سر ڈھانک لیتیں - بس صرف نیچے

تھے جنھیں دنیا کی کوئی فکر نہ ستا رہی تھی - وہ اسی طرح اچھلتے کودتے پھر رہے تھے جیسے عید بقر عید اپنی گلیوں میں کھیلا کرتے تھے۔

نومبر کا آدھا مہینہ گزر چکا تھا شام ہوتے ہی خنکی ہونے لگتی - یوں ہی اِدھر اُدھر دیکھتے دیکھتے ساجدہ کو سردی کا احساس بھی نہ ہوا لیکن پھر اس کے استنے پاس سے دوڑتا ہوا گزرا کہ اس کا پاؤں کچل گیا۔

"شاید بچے چھپول کھیل رہے ہیں - وہ اپنا پاؤں ہلاتی ہوئی اٹھی اور دالان میں جا کر ہوا کھر درا کمبل شانوں پر پھیلا لیا کھانا ابھی تک کیس پر اسی طرح رکھا ہوا تھا - اماں کو بھوک نہ لگ رہی تھی اور وہ ابا کے بغیر کھانا کھانے کو تیار نہ تھی۔

فوراً اس نے اپنی کچی پکی کتاب بکس سے نکال کر وہ بجلی کے کھمبے کے پاس زمین پر پلتی مار کر بیٹھ گئی - ابھی اس نے ایک ہی سطر پڑھی تھی کہ ایک عورت اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی - وہ اپنے دودھ پیتے بچے کو سلانے کے لئے ویسے تھپک تھپک کر ٹہل رہی تھی۔

"انگریزی پڑھ رہی ہو کہ اردو ؟" عورت نے پوچھا۔

"انگریزی"

"کیا کرو گی انگریجی پڑھ کر ؟"

"کچھ نہیں" - اس نے اکتا کر کہا - وہ عورت سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔

"تمہاری اماں کہاں ہیں ؟"

"گزر گئیں" اس کی آواز میں دکھ تھا۔

"چہ چہ - گزر گئیں - تمھاری شادی ہو گئی ہے ؟

نہیں !" وہ عورت کو نظر انداز کرنے کے لئے سر جھکا کر جیسے بڑے انہماک سے پڑھنے لگی مگر کتاب کا ہر لفظ ایسے بن گیا تھا۔

صلاح الدین ، صلاح الدین - صلّو ـــ

اس نے کتاب بند کر دی عورت شاید اسے مغرور سمجھ کر جا چکی تھی۔

وہ جب سے یہاں آئی تھی اسے یاد نے اس کے دل کو کس کس طرح تڑپایا تھا - جدائی ننھی ننھی یادوں کو بھی اس طرح جوان کر دیتی ہے کہ ان کے خیال ہی سے دل پر دھمک کا احساس ہوتا ہے - اسے یاد آیا کہ جب پہلی بار صلاح الدین اس سے ملا تھا تو اس نے یہی بتایا تھا " میرا نام صلاح الدین ہے - مگر اماں مجھے صلّو کہتی ہیں - سب مجھے صلّو کہتے ہیں - تم بھی یہی کہا کرو۔"

"اچھا" اس نے بے حد سعادت مندی سے اقرار کر لیا تھا - اس کے بعد تو اس نے خوش ہو کر اسے اپنی ساری رام کہانی سنا ڈالی تھی - ہم گاؤں سے آئے ہیں وہاں ہماری زمین ہے - وہاں بہت سے درخت ہیں - آموں کے درخت - آموں پر جب بور آتا ہے تو کوئلیں بہت بولتی ہیں - اور جب وہ ہماری امیوں کو کھاتیں تو میں غلیل سے انھیں مار ڈالتا۔

"ہائے تم انھیں کیسے مار ڈالتے ہو ؟" وہ حیران ہو گئی تھی۔

"تو ، مارنا کون سا مشکل کام ہے ، وہ تو کوئی بھی - لوگ تو آدمیوں کو مار ڈالتے ہیں - میری اماں کے پاس آنا - ہاں - ہم یہاں

پڑھنے کے لئے آئے ہیں۔ ابا نے زبردستی اماں کو میرے ساتھ بھیجا ہے۔ ان کا یہاں جی تو نہیں لگتا۔" پھر وہ بڑے آدمیوں کی طرح اپنے بال جھٹکتا چلا گیا۔

دو نرسیں چند پیکٹ پکڑے بڑی تیزی سے آرہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کو اس کے پاس رکیں۔ "ہمارے ملک کی آبادی تو ابھی سے بڑھ رہی ہے۔ وہ آگے بڑھ گئیں۔ ساجدہ ہنس پڑی۔" تو کیا وہ صرف یہ خوش خبری سنانے کے لئے اس کے پاس رکی تھیں۔"

صبح وہ ذرا دیر کو زچہ خانے کی طرف گئی تھی۔ ہال کے کمرے پلنگوں پر زچائیں چادریں اوڑھے پڑی کراہ رہی تھیں اور نوزائیدہ بچے ماؤں کے دوپٹوں میں لپٹے پڑے تھے۔ شاید مائیں ننھوں کے لباس کہیں راستے میں لٹا آئی تھیں یا اپنی جان بچانے کے لئے گھروں سے نکلتے وقت وہ ان ننھی زندگیوں کے جسم کو بھول گئی تھیں۔ انہیں یہ احساس ہی کہاں ہوگا کہ موت اور جنم بڑے سے بڑے تغیر کو ٹھوکر مار کر اپنے کو منوا لیتی ہیں۔

وہ اپنی جگہ کھڑی ہو گئی اور حقہ پینے والوں کی ٹولیوں میں نظریں دوڑا کر بابا کو ڈھونڈھنے لگی۔

بوڑھا پھر چیخنے لگا۔" کہاں ہے میری بیٹی؟ کہاں ہے میری بیٹی۔ ظالمو میری بیٹی کو لا دو۔" لوگوں نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا اور پھر حقہ پینے لگے۔

ساجدہ بے قرار سی ہو کر بوڑھے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ اس سے کیا کہے گی، کیا سنے گی؟ اس وقت اس کے ذہن میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اس کے پاس جانے کے لئے لمبے لمبے قدم اٹھا رہی تھی اور جب بوڑھا بابا اس سے دو تین قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا تو ایک شخص نے اپنے دونوں ہاتھ بوڑھے کے شانوں پر رکھ دیئے تھے۔

" بابا۔ تم کس بیٹی کو پکار رہے ہو؟ وہ بیٹی نہیں تھی بابا۔ وہ لوٹ کا سب سے قیمتی مال تھی۔ وہ تمہارے چیخنے سے واپس نہیں آئے گی۔ تمہاری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔"

بابا دہشت زدہ آنکھیں پھاڑے اس آدمی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ساجدہ کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس ظالم آدمی کے منہ پر ایک تھپڑ مار دے۔ وہ اس سے کہے کہ عورتوں کو لوٹ کا مال کہنے والے لوٹنے والوں پر طنز کرتے ہوئے اونچے تو نہیں ہو جاتے۔" پھر بھی وہ ضبط کئے چپ چاپ کھڑی رہی۔

" تم جھوٹ بول رہے ہو۔ بوڑھا پھر چیخا۔ وہ میری بیٹی تھی۔ وہ مال خزانہ نہیں تھی۔ میری بیٹی۔ میری بیٹی۔"

بابا۔ تمہاری بیٹی کے اغوا کا بدلہ چک گیا ہے۔ وہاں بھی بہت سے باپ تمہاری طرح رو رہے ہوں گے۔ لوٹ کا مال واپس بھی مل جائے تو پورا نہیں ہوتا۔

" اچھا۔" بوڑھے نے آستینیں چڑھالیں۔" اچھا تو تم نے بھی بیٹیاں لوٹی ہیں۔" بوڑھے نے آدمی کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے ساجدہ کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔" بابا میں تم کو نہیں سمجھا سکتا، میں تم کو تسلی نہیں دے سکتا۔" وہ جیسے ساجدہ سے کہہ رہا تھا۔" میں تم کو کیسے سمجھاؤں۔ لوگ یوں ہی بدلہ لیتے ہیں۔ یہ بہت پرانا چلن ہے بابا۔ تم نہیں جانتے

اس چلن کے قید خانے میں صدیوں سے کتنے بے گناہ قید کاٹتے چلے آ رہے ہیں۔"

بوڑھے نے کیا سنا، کیا سمجھا۔ وہ تو اب مارے غصے کے اس کی طرف دیکھے لرز رہا تھا۔ آدمی سر جھکائے چل دیا اور حقہ پینے والوں کی ٹولی میں غائب ہو گیا۔

"بابا!" ساجدہ نے آگے بڑھ کر آہستہ سے پکارا۔ بوڑھے نے اجنبیوں کی طرح اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر یوں بیٹھ گیا جیسے اب وہ کسی سے نہیں بولنا چاہتا۔

ساجدہ کچھ نہ کہہ سکنے کی حسرت دل میں لئے اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑی۔ جب وہ حقہ پینے والوں کی ایک ٹولی کے پاس سے گزری تو اسے ابا کی آواز سنائی دی۔ وہ وہیں رک گئی۔

"تم یہاں کہاں پھر رہی ہو بیٹیا؟" ابا نے تابڑ توڑ حقے کے کش لگائے اور پھر کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ساجدہ نے دیکھا کہ ابا اس آدمی سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا رہے ہیں جو بوڑھے کی بیٹی کو قیمتی مال کہہ کر تسلی دے رہا تھا۔

وہ اپنے چادروں کے گھر میں آ کر بکس کی ٹیک لیتے ہوئے آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ اب اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ ابا شاید پھر حقہ پینے بیٹھ گئے۔ اس نے سوچا۔ اگر ابا اسی طرح خالی پیٹ حقہ پیتے رہے تو جانے ان کی اس گرتی ہوئی صحت کا کیا انجام ہوگا۔

اب عشا کی اذان ہو رہی تھی۔ اس لئے لوگوں کے بولنے کی آوازیں ختم ہو گئی تھیں۔ نماز کے بعد رات دس گیارہ بجے تک گراموفون ریکارڈ بجتے رہتے۔ پاکستان میں صحیح سلامت پہنچنے کی خوشی کا اظہار۔ رات کو شدت اختیار کر جاتا۔ بعض اچھی آوازوں والے لڑکے خود بھی ایک آدھ تان لگا دیتے۔ ساجدہ کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگتا۔ وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی یادوں کو جگا کر ایک انجانی سی مسرت سے ہمکنار ہونا چاہتی تھی۔ مگر روز یہی ہوتا کہ ہزاروں بار کے سنے ہوئے گھسے پٹے ریکارڈ اس کی یادوں کی مٹھاس چاٹ جاتے۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی یادیں ایک گھسا ہوا ریکارڈ ہیں جس پر رکھی ہوئی سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی ہے۔

ابا جب اپنا چھوٹا سا حقہ اٹھائے آئے تو وہ آدمی بھی ان کے ساتھ تھا۔ "اچھا تو اب کل ملاقات ہوگی ناظم صاحب۔"

"خدا حافظ۔" ناظم چلا گیا۔

"یہ کون ہے ابا؟ کیا دلی کی گلیوں کا رہنے والا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ سجو بیٹیا یہ تو کانپور کے رہنے والے ہیں۔ بڑا لائق آدمی ہے۔ یہاں حکومت نے بحالیات کے محکمے میں کام دے دیا ہے۔ کیا کہنے، واہ، واہ، بہت نفیس آدمی ہے۔" ابا بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ "روٹی کھا لیجئے ابا۔" اسے افسوس ہو رہا تھا کہ ابا کس بیہودہ آدمی کی تعریف کر رہے ہیں۔ ابا سے تو جو بھی پیار سے بول دے اچھا ہو جاتا ہے۔

ساجدہ نے روٹی اور دال کا پیالا ابا کے سامنے رکھ دیا اور پھر ان کے ہاتھ سے حقہ لے لیا۔ ابا ہنس پڑے۔ "بٹیا کو تو میرے حقے سے دشمنی ہے۔"

"روٹی کھائیے۔ دھوئیں سے پیٹ نہیں بھرتا ہے۔"

"قسم لے لو بیٹا، جو مجھے ذرا سی بھوک لگی ہو۔ دوپہر کی روٹی ابھی تک ہضم نہیں ہوئی۔ تم کھاؤ۔ رات گئے بھوک لگی تو پھر کھا لوں گا۔"
وہ پٹتے ہوئے بستر کو بچھا کر لیٹ گئے۔ ساجدہ کو اکیلے کھانا کھانا زہر لگ رہا تھا۔

"ابا ہم لوگ کسی گاؤں میں آباد ہوں گے۔ کہاں ہوگا سرگودھا؟ بس سرگودھا کے آس پاس۔ کیوں ابا؟ میں وہاں کسی اسکول میں بچوں کو پڑھاؤں گی۔"

گاؤں۔ وہ بھی سرگودھا کا گاؤں۔ کیا رکھا ہے وہاں اری پگلی گاؤں میں کیا رکھا ہے؟

"سکون!

ابا نے لالٹین کے ٹمٹماتے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اپنی بیٹی کو دیکھا "تھک گئی ہے میری بٹیا۔ گھر کے بغیر اداس ہے۔ روٹی کھا لو، پھر آرام سے سو جاؤ۔ بس کیمپ سے نکلنے کی دیر ہے۔ میری بٹیا نے پڑھائی شروع کر دی تو پھر خوش رہے گی۔ ایم۔ اے تک پڑھاؤں گا۔ اب کیا ہے اب تو اپنے ملک میں ہیں۔"

اس نے دکھ سے ابا کی طرف دیکھا۔ اونچی دکان پر نیچی تنخواہ کے عوض حساب کتاب کرتے ساری زندگی گزر گئی۔ ابا اس کے لئے اس سے زیادہ اور کیا سوچ سکتے تھے کہ اسے ایم اے تک پڑھا دیں پھر انھیں ایک لائق داماد مل جائے اور بس۔ حساب کی پوتھی میں دل اور دلداری کے کوئی ہندسے نہیں ہوتے۔ اب وہ ابا سے کیسے کہتی کہ وہ گاؤں میں کیوں آباد ہونا چاہتی ہے؟

ابا سو گئے تھے اور ہلکے ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ وہ بھی اپنا بستر بچھا کر لیٹ گئی۔ درخت کی شاخوں کے بیچ سے کہیں کہیں آسمان نظر آ رہا تھا۔ کوئی بسیرا بسنے والا پرندہ جانے کیوں پھڑ پھڑایا اور ایک پتہ ٹپ سے ساجدہ کے اوپر آ گرا جسے اٹھا کر وہ آہستہ آہستہ انگلیوں سے مسلنے لگی۔ اس کی انگلیاں نمی محسوس کر رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا۔ ابھی یہ پتہ پوری طرح سوکھا نہیں تھا۔ ابھی اس میں زندگی باقی تھی۔ صلو کی دی ہوئی ادبی کتابوں کو پڑھ پڑھ کر وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہو گئی تھی۔

اب کسی طرف سے گراموفون ریکارڈوں کی بوچھار شروع ہو گئی تھی: "آئیے آ جائیے، آ جائیے۔ پھر مری آغوش میں آ جائیے" "رم جھم برسیں بادروا، مست ہوائیں آئیں" — "سو جا راج کماری سو جا۔ سو جا میں بہاری سو جا۔"

کوئی بہت زور سے دھاڑا۔ "بند کرو۔ کان پک گئے ان گانوں کو سن سن کر۔ پھینک دو ان ریکارڈوں کو۔ شرم نہیں آتی انھیں بجاتے"۔ سب ریکارڈیوں خاموش ہوئے جیسے ٹوٹ گئے ہوں۔

"بچو اپنے ملک کے گانے بجاؤ۔"

"میرے مولا بلا لو مدینے مجھے، میرے مولا بلا لو ـــــ" "اب ہوئی کوئی بات۔ واہ۔" کوئی بے پناہ داد دے رہا تھا۔

ساجدہ نے جھک کر ابا کو دیکھا۔ کہیں اس داد و بیداد نے انھیں جگا تو نہیں دیا، مگر ابا ٹھنڈی ہوا میں بڑی غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی شاید وہ کوئی بہت اچھا خواب دیکھ رہے تھے۔

"وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دست ناتواں سے — وہ چلے" یہ کسی لڑکے کی آواز تھی جو ٹونگی کی طرز پر گا رہا تھا۔

غور سے سننے لگی۔ بچپن میں سنی ہوئی یہ طرز آج اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"اب چُپ چاپ رہ۔ پاکستان میں اب یہ بُری عادتیں نہ چلیں گی۔ وہاں نوٹنکی کے پیچھے دیوانہ رہا اور اب یہاں بھی۔"

تان لیتی ہوئی آواز دم توڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سب خاموش ہو گئے کیونکہ اب بوڑھا چیخ رہا تھا۔ "اس کا دامن ے ہاتھ میں رہ گیا ہے۔ میری بیٹی کہاں ہے؟ وہ کہاں ہے؟"

ساجدہ نے ایک پلے کو سوچا اگر بوڑھے کی بیٹی کی طرح اسے بھی اغوا کر لیا جاتا تو —— اس پہ ایک دم دہشت طاری ہو گئی ، پر تو صرف خیال ہی سے دہشت طاری ہو گئی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ جبر کے دانت اتنے زہریلے ہوتے ہیں جن کے توڑ کا آج ، کوئی ٹیکہ ایجاد نہیں ہوا۔

بوڑھے کے روپ میں ابا کو دیکھ کر وہ رو پڑی اور جب اس خیال کا غبار اس کے سینے سے چھٹ گیا تو اسے احساس ، وہ تو بوڑھے کے غم میں رو رہی تھی۔ رونے کے بعد جب اسے قرار آیا تو وہ بغیر کسی جدوجہد کے گہری نیند میں ڈوب گئی۔ سونے ، پہلے آج اس نے آسمان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ لوگ آسمان کو چھت کیوں کہتے ہیں۔ اور اگر یہ چھت ہے تو انسان اس کے تلے خود کو اتنا غیر محفوظ کیوں سمجھتا ہے؟ سونے سے پہلے اسے گھر کی چھت بے طرح یاد آتی۔

وہ خواب میں صلاح الدین کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سامان باندھے لاہور روانہ ہونے کے لئے تیار تھی اور کیمپ میں پھر پھر پنے گلی محلے والوں سے مل رہی تھی۔ ان سے پوچھ رہی تھی کہ کون کہاں جا رہا ہے۔ اور وہ جو ابھی نہیں جا رہے تھے ان سے دہی کر رہی تھی۔ انھیں تسلی دے رہی تھی، وہیں اسے صلو کچھ ڈھونڈتا نظر آیا۔

تم ابھی تک گئے نہیں۔ تم یہاں کیسے آ گئے؟ کیا تم نے اپنی اماں کو محفوظ مقام پہ پہنچا دیا ہے؟

"تم ہم سب کی فکر نہ کرو۔ میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ ابا نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سب سرگودھا جائیں گے۔ یا آس پاس ہی گاؤں میں رہیں گے۔

"سرگودھا کے کسی گاؤں میں؟" اس نے اپنے اطمینان کے لئے پھر سے پوچھا۔ "ہم لوگ لاہور جا رہے ہیں۔"

"پروا نہ کرو۔ میں تو شہر میں ہی کسی کالج میں لیکچرر ہو جاؤں گا۔"

"مگر۔ مگر مجھے کیسے معلوم ہوگا صلو؟" وہ رو رہی تھی۔

"مت رو ——" "تمھیں ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" وہ ہنسا تو اس کے خشک ہونٹوں کی پپڑی سے خون کا ایک قطرہ ، پڑا۔ وہ اس قطرے کو اپنے پلو میں جذب کرنا چاہتی تھی مگر صلو ایک دم قطروں سے غائب ہو گیا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اتنی سرد رات میں پسینے سے نہا گئی تھی۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے۔ "تمھیں ڈھونڈ لیں گے کہیں نہ کہیں۔" وہ حیران تھی کہ کیا خواب اتنے سچے بھی ہوتے ہیں۔

دور سے سیاروں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاخوں سے جھانکتے ہوئے آسمان پہ صبح کا دور دور پتہ نہ تھا۔ اس نے ندر کا کونہ سرکا کر باہر جھانکا۔ جانے کون لالٹین اٹھائے جھک جھک کر ہر طرف آہستہ آہستہ پھر رہا تھا۔ سیاروں کی آواز اور پھر کسی

کا ایسے پراسرار طریقے سے پھرنا ۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ اس نے ڈر کے مارے کمبل سے چہرہ چھپا لیا ۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابا کو جگا دے مگر اس سے بولا نہ گیا ۔ "ہو گا کوئی ۔ کیمپ میں چور ڈاکو تو آنے سے رہے ۔" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی پھر اسے ایک دم محسوس ہوا کہ لالٹین کی روشنی کمبل سے چھن کر اس کی آنکھوں میں گھس رہی ہے ۔ اس نے آنکھوں پر سے کمبل ذرا سا سرکایا ۔ لالٹین اس کے سامنے ڈول رہی تھی ۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پوری طاقت سے چیخ پڑی ۔ ساتھ ہی بوڑھے کی آواز اس کی آواز میں شامل ہو گئی ۔ "یہیں ہے ۔ وہ یہیں ہے ۔ وہ ابھی چیخی تھی ۔ میری بیٹی ۔ میری بیٹی ۔"

کیمپ کے بہت سے لوگ جو اس کی چیخ سن کر ادھر آ رہے تھے ۔ واپس لوٹ گئے ۔ وہ جانے کیا کہہ رہے تھے ۔ شاید جاگ پڑنے کی وجہ سے ناراض ہو رہے تھے ۔ ابا ساجدہ کے سر پہ ہاتھ رکھے بوڑھے کو گھور رہے تھے ۔

"تم راتوں کو بھی شور مچاتے ہو ۔ بھاگ جاؤ یہاں سے ۔" ابا نے بوڑھے کو گھورا مگر وہ ڈری ہوئی ساجدہ کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو ۔ کون کیا کہہ رہا ہے اسے اس کی پروا نہ تھی ۔

"بابا ۔ میں چیخی تھی ، میں ڈر گئی تھی ۔" ساجدہ اپنے بستر پہ اٹھ کر بیٹھ گئی ۔

"کیا سب لڑکیاں ایک ہی طرح چیختی ہیں ؟"

"ہاں بابا ۔" ساجدہ نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ بڑھا کر بابا کے ہاتھ پہ رکھ دیا ۔

"میں سمجھا ۔ میں سمجھ گیا ۔ کیا تم بھی قیمتی مال ہو ؟"

"چلو بابا ۔ چلو تو یہاں سے اب بکواس مت کرو ۔" ابا نے بابا کے شلوکے پہ سختی سے ہاتھ رکھا تو لالٹین بوڑھے کے ہاتھ سے گر پڑی ۔ "یہ لالٹین اٹھا کر رکھ دو بیٹیا ۔ جانے کس کی اٹھا لایا ہو گا ۔" ابا بوڑھے کو تقریباً کھینچتے ہوئے لے چلے ۔ "اپنے بستر پہ لیٹ کر چپکے سے سو جاؤ ۔ صبح تمہاری بیٹی آ جائے گی ۔"

ابا جب بوڑھے کو چھوڑ کر واپس آئے تب بھی بڑبڑا رہے تھے ۔ "پاگل ہو گیا ہے ۔ سب کی نیندیں حرام کر دی ہیں ۔" وہ اپنے بستر پہ لیٹ گئے ۔ "سو جاؤ بیٹیا ۔ سو جاؤ ۔ ابھی تو آدھی رات گزری ہے ۔ خدا کسی کو پاگل نہ کرے ۔"

ساجدہ نے ابا کو کوئی جواب نہ دیا ۔ ان کی طرف دیکھا بھی نہیں ۔ وہ بوڑھے کو جس طرح کھینچتے ہوئے لے گئے تھے اس کی اذیت وہ ابھی تک محسوس کر رہی تھی ۔

ابا سو گئے تھے مگر وہ ایک لمحے کو بھی آنکھ نہ جھپکا سکی ۔ شاخوں سے چھنتے ہوئے نیلے آسمان کو اس نے سفید ہوتے دیکھا ۔ پرندوں کا شور سنا اور جب وہ پر پھڑپھڑا کر اڑ رہے تھے تو ننھی ننھی شاخوں اور پتوں کو کمبل پر سے چھنتے ہوئے اس نے عجیب سی مسرت محسوس کی ۔ اس نے چادر کی دیوار ایک طرف سرکا دی اب لوگ لوٹوں اور کٹوروں سے وضو کر رہے تھے ۔

اس نے آہستہ سے پکارا ۔ "ابا صبح ہو گئی ۔" اسے صبح ہمیشہ خوب صورت لگتی تھی ۔ ابا نے کروٹ لے کر محبت سے اس کی طرف دیکھا ۔

"تم اٹھ گئیں بیٹیا ۔ کیا کر رہی تھیں ۔"

"دعا"

"کیا دعا مانگ رہی تھیں؟"

"بس یوں ہی سی دعا ابا ـــ وہ بوکھلا گئی" بس یہی کہ اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے" اس نے یوں ہی کہہ دیا۔

"بھلا یہ دعا کیا ہوئی پگلی" ابا ایک دم سنجیدہ ہو گئے " ہم نے کبھی کون سا گناہ کیا ہے۔ جب تمہاری اماں نے منہ موڑا تو تم کو پالتے ہوئے یہ بھی نہ دیکھا کہ دنیا میں کچھ اور بھی ہے" وہ لوٹا اٹھا کر باہر چلے گئے تو ساجدہ کو ہنسی آ گئی۔ خود تو ابا ہمیشہ یہی دعا کرتے تھے مگر آج اس کی زبان سے نکلی ہوئی دعا ہی ان کے لئے طعنہ بن گئی۔

نماز کے بعد لوگ دعائیں مانگ رہے تھے۔ جانے وہ کون سی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ساجدہ کو ایک بار تو ایسا محسوس ہوا کہ اتنے بہت سے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں ساری دنیا کی آسائشیں سمیٹ لینے کی تمنائیں پھڑک رہی ہیں۔ اسے اماں یاد آ گئیں۔ اماں کی جہاں اور بہت سی باتیں وہ بھول گئی تھی، کچھ یاد بھی رہ گئی تھیں۔ اماں جب اپنے کسی عزیز کو دولت کے چکر میں دیکھتیں تو بڑے دکھ سے کہتیں "کوئی مجھے سونے کا نوالہ کھا کر دکھائے تو جانوں" ابا ان کو چھیڑتے "مگر انسان تر نوالہ تو کھا سکتا ہے" ویسے ابا اماں کی قناعت پسندی سے بہت خوش رہتے اور جب اماں مر گئیں تو ابا رو رو کر سب کو یہی بتاتے تھے کہ اس قناعت پسند بی بی نے مجھ سے کبھی کوئی فرمائش بھی نہیں کی۔

اب سوتے ہوئے بچے اٹھ کر ادھم دھاڑ رہے تھے۔ کچھ رو رہے تھے کچھ کھانے پینے کی فرمائش کر کے ماؤں کے آنچل کھینچ رہے تھے عورتیں انھیں جھڑک رہی تھیں۔ پیٹ رہی تھیں۔ ایک عورت کی آواز سب سے اونچی تھی۔ "ارے کمبختو ہم یہاں کون سا گھر وا کر رہے ہیں۔ تین دن سے بیٹھے خیرات کی روٹیاں توڑ رہے ہیں"

ساجدہ کو یہ الفاظ تیر کی طرح محسوس ہوئے۔ وہ سوچنے لگی بعض لوگ کسی بھی بات سے خوش نہیں ہوتے۔ جذبے کی کسی طرح کو پانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ آخر اتنے انجانے پن سے کیوں کام لیتے ہیں۔ وہ نوجوان لڑکے یاد آ گئے جو میلی میلی شلواروں اور قمیصوں میں ملبوس تھے مگر سیکڑوں روپوں سے تیار کی ہوئی کھانے کی دیگیں اور نانوں کے جھوے کیمپ میں پہنچا رہے تھے۔ کھانا بانٹتے ہوئے ان کے چہرے مسرت سے تمتما اٹھتے۔ وہ سب سے کہتے "پاکستان تمہارا ہے بھائیو، ہم تو تمہارے خادم ہیں"

بچوں کا ایک شور برپا ہوا۔ رہڑھوں پر لدی ہوئی دیگیں اور نانوں کے جھوے اتارے جا رہے تھے۔ بچے ماؤں کے آنچل چھوڑ کر اب دیگوں کے گرد مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ ایک گورے سے جوان لڑکے نے نعرے کی طرح آواز لگائی "آج ہم چائے بھی لائے ہیں بادشاہو۔ حلیم بھی ہے بھائیو" پھر وہ بچوں کو ایک طرف کرنے لگا "بس ذرا دیر صبر کرو بچو۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے" لڑکے نے پھرتی سے اینٹوں کا چولہا بنایا اور پھر سوکھی ہوئی شاخیں، پتے اور کاغذ کے ٹکڑے ٹھونس کر آگ جلا دی۔ چائے گرم ہو رہی تھی۔ اور پھر وہ مارے خوشی کے بچوں کو گھیرے میں لے کر ناچنے لگا "چائے پیو گرم گرم، روٹی کھاؤ نرم نرم" بچے بھی اس کے ساتھ گا رہے تھے۔ چائے پیو ـــ

ساجدہ کو یہ سب کچھ اتنا پیارا لگا کہ وہ گلاس اٹھا کر تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں پہنچ گئی اور بچوں کے نرغے کو توڑ کر اس نے اپنا گلاس لڑکے کی طرف بڑھا دیا لڑکا شرما کر کھڑا ہو گیا۔

" سب سے پہلے میں چائے پیوں گی "۔
" باجی آپ ہمارے حصے کی چائے بھی پی لیں۔ ابھی میں نے بھی نہیں پی "۔
" سچ ؟" ساجدہ نے اسے پیار سے دیکھا۔ تمہارا نام کیا ہے ؟"
" غلام محمد، ویسے سب لوگ مجھے گاما کہتے ہیں۔ پیار کا نام ہے باجی اور یہ دیگ میں لایا ہوں باجی۔ میں نے چندہ جمع کیا تھا۔ باجی۔ لوگ مجھے لڑکا سمجھ کر جلدی جلدی دیتے تھے۔" لڑکے نے ایک ہی سانس میں اپنا کارنامہ سنا دیا۔
" پھر تو یہ چائے بہت مزے کی ہوگی "۔
" پی کے دیکھیں باجی "۔ لڑکے نے اس کا گلاس لبالب بھر دیا۔
ساجدہ آنے کو تو آگئی تھی مگر جب اس نے لوگوں کو دیگوں کی طرف آتے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ ان میں کوئی عورت نہ تھی۔ وہ جس طرح آئی تھی اس سے بھی زیادہ تیزی سے بھاگ پڑی اور جب وہ اپنی جگہ پر پہنچی تو دیکھا کہ ابا اگوچھا کندھے پر ڈالے، کٹورا اور گلاس لئے دیگوں کی طرف جا رہے ہیں۔
ساجدہ اپنے بکس پر بیٹھ کر مزے مزے چائے پینے لگی۔ گڑ کی بنی ہوئی اس نیم گرم چائے نے اس وقت سارے ذائقوں کو مات کر دیا تھا۔
" اتنی اچھی چائے تو خود میں نے بھی کبھی نہیں بنائی "۔ جیسے اب بھی وہ لڑکے سے باتیں کر رہی تھی اور بار بار مسکرائے جا رہی تھی۔
" میں نہیں کھاؤں گا۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ میری بیٹی کہاں ہے ؟ میں نے اس کی چیخ سنی تھی "۔
اس نے گلاس رکھ دیا۔ مسرت کے لمحے بوڑھے کی چیخوں تلے دم توڑ گئے۔ جانے بابا نے کب سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ وہ بابا کو کس طرح تسلی دے۔ وہ اس وقت سخت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ ایک مرد لوٹتا ہے۔ دوسرا لوٹ پر طنز کرتا ہے۔ تیسرا لوٹ کے غم میں پاگل ہو جاتا ہے اور ——
ابا کھانے پینے کا سامان لئے جوانوں والی چال سے واپس آ رہے تھے۔ کیا یہ مسرت اور بے فکری صرف اسے دکھانے کے لیے ہے۔ ابا کو اپنا گھر چھوٹنے کا غم ہے، اور وہ اس غم کو کس کس طرح چھپا رہے ہیں۔
" لو بیٹا۔ خوب گرم ہے۔ ایسی مزے کی چائے تم نے کبھی کاہے کو پی ہوگی۔ اور یہ دیکھو حلیم ہے، ساری رات پکائی جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تم کھچڑا پکاتی تھی "۔
ساجدہ نے گلاس اٹھا لیا اور ساری کے پلو سے پکڑ کر آدھی چائے اپنے گلاس میں ڈال لی اور گلاس ان کی طرف بڑھا دیا۔
" ابا کیا سچ مچ آپ بہت خوش ہیں ؟"
" ہاں بیٹا۔ زندہ سلامت اپنے ملک میں آگئے۔ خوش نہ ہوں گا۔" وہ چائے کے گھونٹ پینے لگے۔

"تو پھر آپ تھوڑی سی نان کھا لیجئے ۔ آپ نے رات کو بھی کچھ نہیں کھایا ۔"

"نہیں بیٹا ۔ تم کھاؤ ۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے معدے کے منہ پر ڈھکن رکھ دیا ہو ۔ بھوک تو لگتی ہی نہیں ۔

ساجدہ نے ابا کو غور سے دیکھا مگر وہ بڑے سکون سے چائے پی رہے تھے ۔ بھوک نہیں لگتی ۔ وہ سوچنے لگی ۔ اماں نے بارہ سال تک پائی پائی جمع کر کے دو کمروں کا پکا مکان بنوایا تھا ۔ اسے اچھی طرح یاد تھا، جب وہ چھوٹی سی تھی تو ایک کچی کوٹھری میں رہتی تھی ۔ اماں ساری رات سامان کو ادھر سے ادھر رکھتی رہتیں اور ابا چھت کے سوراخوں کو بند کرنے کی کوشش میں چھینک چھینک کر بے حال ہو جاتے تو پھر انھیں غصہ آنے لگتا ۔ اماں انھیں چائے بنا کر پلاتیں اور تسلی دیتیں "کوئی سدا تو اس گھر میں نہیں رہنا ۔"

نئے گھر میں آ کر اماں نے بڑے فخر سے کہا تھا "دیکھا تم نے سجو کے ابا ، میں نے ماٹی چن چن کر محل بنایا ہے ۔ انھوں نے اپنے محل میں موتئے کا پودہ لگایا تھا اور چنبیلی کی بیل دیوار پر چڑھائی تھی ، وہ اپنے محل کو طرح طرح سے سجانے میں لگی رہتیں مگر محل بناتے اور سجاتے ہوئے وہ اتنی تھک گئی تھیں کہ کچھ ہی دن بعد ساون کی ایک دم جھم برستی رات میں وہ ایسے سکون سے پاؤں پھیلا کر سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں ۔ مگر ابا نے اماں کی جگہ کو جلد ہی پر کر دیا تھا وہ منہ اندھیرے اٹھتے گھر کی صفائی کرتے، چائے بناتے اور موٹی چھوٹی روٹیاں پکاتے ۔ پھر اسے پیار سے جگاتے ۔ ناشتہ کراتے اور جب وہ کپڑے بدل کر تیار ہو جاتی تو گھر میں تالہ ڈال کر اسے اسکول چھوڑتے اور خود دکان چلے جاتے ۔ کچھ دن بعد اس نے خود ہی گھر سنبھال لیا تھا ۔ ابا اسے گھر صاف کرتے دیکھتے تو ناراض ہونے لگتے "یہ تمہارا کام نہیں بٹیا ۔ تم کو اس لئے تھوڑی پڑھا رہا ہوں کہ ایسے گھٹیا کام کرو ؟ وہ رنجیدہ ہو جاتی "اور یہ کام آپ کے لئے بڑھیا ہیں ؟ ابا ایسی باتیں نہ کیا کریں ۔"

شام کو جب ابا دکان سے لوٹتے تو گھوم پھر کر گھر کی ایک ایک چیز کو دیکھتے پھر موتئے اور چنبیلی میں پانی ڈالتے ۔

"بٹیا ۔ یہ چنبیلی کی پتیاں کون نوچتا ہے ؟" ابا اس سے پوچھتے تو وہ شرمندہ ہو جاتی چپکے سے کسی کام میں لگ جاتی ۔ وہ ابا کو کیسے بتاتی کہ جب آپ رات کو حقہ پینے دوستوں کے پاس جاتے ہیں تو صلو اس سے ملنے آتا ہے ۔ وہ اسے دیکھ کر ساری باتیں بھول جاتی ہے اور بس یوں ہی پتیوں کو توڑنے لگتی ہے ۔

اس نے پھر غور سے ابا کی طرف دیکھا مگر ان کے سپاٹ چہرے پر کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا ۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ابا کو گھر نہ یاد آ رہا ہو ۔ وہ تو چنبیلی کی ایک پتی کا ٹوٹنا بھی برداشت نہ کر سکتے تھے ۔ کبھی کبھی وہ بڑے چاؤ سے کہتے تھے "سجو کی اماں کا بنایا ہوا محل میں اپنے داماد کے نام کر دوں گا ، ہاں وہ بھی کیا یاد کرے گا ، ہماری بٹیا کے پاؤں دھو دھو کر پیے گا ۔"

اور جب پاکستان بننے کے بعد فساد کی آگ تیز ہوئی اور اپنا محلہ بھی خالی ہونا شروع ہوا تو بھی ابا گھر چھوڑنے کو راضی نہ تھے مگر جب انھیں احساس ہوا کہ گھر پہ ایک چھوڑ دس دامادوں کی یلغار ہونے والی ہے تو گھر کے دروازے بند کرنا بھی بھول گئے تھے ۔ دلی میں پناہ گزینوں کے کیمپ میں انہوں نے سر جھکائے جھکائے اپنے محل کا نوحہ پڑھا تھا "ماٹی چن چن محل بنایا ، لوگ کہیں گھر میرا ———"

سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ ماضی کی یادوں کے ویرانے سے بچنے کے لئے ۔ وہ باہر دیکھنے لگی جانے کیوں بہت سے لوگ ایک ہی جگہ جمع ہو رہے تھے ۔ اس ہجوم میں اسے ڈاکٹر بھی نظر آ رہا تھا ۔

"یہ لوگ کیوں جمع ہو رہے ہیں ابا؟"

"معلوم نہیں بیٹا۔" ابا نے اچٹتی سی نظر سے باہر دیکھا۔ "چائے سے میرے پیٹ کو بہت فائدہ ہوا ہے۔"

اچھا؟ وہ اتنی دیر سے یوں ہی چائے کا گلاس پکڑے بیٹھی تھی۔ اب اسے یاد آیا تو چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

بوڑھے کی ایک چیخ بلند ہوئی۔ "میری بیٹی۔ میری بیٹی۔" لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر دوری کی وجہ سے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔

"ابا، جا کر دیکھئے تو سہی۔ کیا بات ہے؟" وہ بے چین ہو رہی تھی۔

"کیا دیکھوں بیٹا۔ بیچارہ پاگل ہو گیا ہے۔" ابا چلم میں تمباکو بھرنے لگے۔ "ابھی چپ ہو جائے گا۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔"

بوڑھا آخری چیخ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ لوگ بکھرنے لگے۔ اسے سب لوگ بیحد سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ اسے موت کے بعد چھانے والی ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔

"ابا، کہیں بوڑھا بابا مر تو نہیں گیا؟ سب جمع ہوئے پھر سب بکھر گئے۔ آخر کیوں؟"

"کچھ بھی نہیں بیٹا۔ میں ابھی ذرا دیر پہلے اسے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ درخت تلے آرام سے بیٹھا تھا۔ تم یوں ہی ساری دنیا کی فکر میں مبتلا رہتی ہو۔" ابا آنکھیں موند کر حقے کے کش لگانے لگے۔

اسے ابا کی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابا سے کہے۔ آپ کے خیال میں تو بوڑھا حساب کتاب کی پوتھی ہے۔ اور اس پوتھی میں صرف رقم درج ہوتی ہے جذبات نہیں۔

وہ باہر نکل آئی اور ہر طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں بوڑھے کو تلاش کر رہی تھیں۔ جس درخت تلے وہ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا اب وہاں بچے کھیل رہے تھے۔ اس نے دیکھا ناظم تیز تیز قدم اٹھاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ اس کے قریب آ گیا تو اس نے بے اعتنائی سے نظریں جھکا لیں۔

"آپ کے ابا کہاں ہیں؟"

"بوڑھے بابا کو کیا ہوا؟ لوگ جمع تھے اور وہ چیخ رہا تھا۔ اب کہیں نظر نہیں آتا۔"

ڈاکٹر نے اسے پاگل خانے بھیج دیا ہے۔ سنا ہے کل رات وہ سب کو تنگ کرتا رہا۔ آپ بھی ڈر گئی تھیں؟

تو بابا کو پاگل خانے بھیج دیا گیا۔ لوگ اسے رخصت کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ اس کا دل بھر رہا تھا۔ "خدا حافظ بابا!" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اسے دکھ تھا کہ وہ بابا کو الوداع نہ کر سکی۔ اسے اس وقت یہ احساس ہی نہ تھا کہ بابا ان سب باتوں سے بہت دور جا چکا ہے۔ اس کا دماغ چیزوں کا ایک ریکارڈ ہے جسے یاد کی سوئی اس وقت تک بجاتی رہے گی جب تک گھس نہ جائے گی پھر ریکارڈ میں گڑھے پڑ جائیں گے اور پاگل خانے کو اس سے نجات مل جائے گی۔

"آپ بہت رنجیدہ ہیں؟ شاید بابا وہاں ٹھیک ہو جائے۔ یہ پاگل خانے حساس لوگوں کے لئے ہی بنائے گئے ہیں۔"

"مجھے تو آپ بھی بہت حساس لگتے ہیں۔" ساجدہ نے جل کر کہا۔

"مجھے تو آپ ہی بہت حساس معلوم ہوتی ہیں۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر کبھی سائنس والوں نے فضا میں بکھری ہوئی چیزوں کو ریکارڈ کر لیا تو کیا ہو گا۔ پھر یہ مہذب انسان کو کون سا احساس دیں گی؟" "سب جنگلوں میں بھاگ جائیں گے اور پتوں کا لباس پہن لیں گے۔ مگر ان میں آپ شامل نہیں ہوں گے۔ ابا اندر ہیں۔" "ابا ناظم صاحب آئے ہیں۔" وہ چند قدم ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ناظم اسے کتنی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

ابا جیسے جھپٹ کر باہر آئے۔ "اوہ تو آپ آ گئے۔ آپ کو ہمارا کتنا خیال ہے۔ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ بیٹھیے اندر چلیے۔" ابا خواہ مخواہ ہنسے جا رہے تھے۔

"ابھی میں جلدی میں ہوں۔ کل آؤں گا تو بیٹھوں گا۔ اچھا تو اب آپ تفصیل بتائیں۔ آپ وہاں کیا کیا چھوڑ آئے ہیں۔"

"ارے ناظم صاحب نہ پوچھیے کہ کیا کیا چھوڑ آیا ہوں۔ پانچ کمروں کا مکان۔ ایک بہت بڑی کپڑے کی دکان، وہاں دو دو منشی کام کرتے تھے۔ کیا دن تھے وہ بھی۔" ابا نے لمبی ٹھنڈی آہ بھری۔ ساجدہ نے آنکھیں پھاڑ کر ابا کو دیکھا۔

"مجھے افسوس ہے رمضان صاحب میں آپ کو منشی نہ دلا سکوں گا۔" وہ ہنسا۔ "بہر حال یہ لیجیے کاغذات اپنا کلیم لکھیے گا اور دو گواہوں کے دستخط کرا لیجیے گا۔"

ساجدہ نے غصے سے تلملاتی ہوئی نظروں سے ناظم کو گھورا اور پھر چند قدم سرک کر ابا کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی وہ ناظم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ تم میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میرے ابا کا مذاق اڑاؤ۔ مگر وہ ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ غصے سے اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔

ابا نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ "ایک گواہ کیا۔ چار گواہوں کے دستخط کراؤں گا۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔ کل آؤں گا۔"

"بس آپ کی مہربانی چاہیے۔ بغیر گھر کے تو انسان بندر لگتا ہے۔"

ابا جیسے اس کے سامنے گھگھیا رہے تھے۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ایک دو دن میں آپ کو گھر مل جائے گا بس ایک تالہ توڑا اور آپ کو گھر میں بٹھایا۔"

"کیا آپ تالے توڑنے کا کام کرتے ہیں؟" ساجدہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ابا کے سامنے کسی غیر مرد سے بات کی پہلی بار جرأت کی تھی۔

"پہلا تالہ میں نے یہیں آ کر توڑا تھا۔" اس نے ساجدہ کی طرف دیکھے بغیر بہت سنجیدگی سے کہا۔ "اچھا خدا حافظ رمضان صاحب" وہ بڑے سکون سے نپے تلے قدم اٹھاتا چل دیا۔

"تم۔ تم سچو بیٹا۔ ابا غصے سے بولنے لگے۔ "بھلا تم کو ایسی بات کہنی چاہیے تھی؟ مردوں کی بات چیت میں تمھیں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی۔ ٹھیک ہے تم نے برقع اوڑھنا چھوڑ دیا، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ———"

"ابا میں نے آخر ایسی کیا بات کہہ دی کہ آپ کو غصہ آ رہا ہے۔ وہ آپ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔"

"وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا؟ مذاق تو تم اڑا رہی تھیں۔ تمہاری زبان اور پاؤں دونوں کھل گئے ہیں۔ آج صبح تم لوگوں کے ہجوم میں چائے لینے پہنچ گئیں، رات بوڑھے سے ہمدردی کرنے چلی گئیں اور ——"

وہ سر جھکائے اندر چلی گئی۔ اسے اچھی طرح احساس تھا کہ ابا آج پہلی بار حساب کتاب میں غلطی کر کے شرمندہ ہیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ابا چند ہی لمحوں بعد اندر آ گئے۔ اسے یوں روتے دیکھ کر وہ جیسے گھگھیانے لگے "کیوں رو رہی ہو بٹیا۔ میں نے تو تم کو کچھ نہیں کہا۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو گئی ہو بٹیا۔ مت رو نہیں تو —— ابا کی آواز بھرا گئی "میں بھی رونے لگوں گا"

ساجدہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے "میں آپ کی بات پر نہیں رو رہی ابا۔ بس یوں ہی جی بھر آیا تھا" اس نے بڑے انداز سے چہرہ اٹھا کر مسکراتے ہوئے ابا کو دیکھا ابا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

"وہ بٹیا۔ بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں تم سکھی رہو۔ اور دیکھو نا۔ یہاں تو اپنی گلی محلے کے بس دو چار ہی جاننے والے ہیں اور پھر —— وہ ٹھنڈا حقہ اٹھا کر گڑگڑانے لگے۔

"روٹی کھا لیجئے ابا۔ وہ برتن اٹھانے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہ ہو۔ ابا کا شرمندہ چہرہ دیکھ دیکھ کر اسے رحم آ رہا تھا۔ دیانتداری کے ڈھنڈورے نے ساری زندگی انھیں چھوٹی سی تنخواہ کے سہارے زندہ رہنے پر مجبور رکھا اور جب انھیں احساس ہوا کہ یہاں تو انھیں کوئی جانتا بھی نہیں تو انھوں نے ایک ہی ضرب میں ڈھنڈورے کے چمڑے کو پھاڑ دیا مگر اب اندھیرے خول کو دیکھ کر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ "روٹی کھا لیجئے ابا" اس نے پھر کہا۔

"دے دو"۔ وہ جیسے سوچتے سوچتے چونک پڑے۔

"کب سے آپ کے سامنے رکھی ہے"۔ وہ ہنسنے لگی۔

"اچھا۔ اچھا۔ میں نے دیکھا ہی نہیں۔ تھوڑی سی کھائے لیتا ہوں۔ پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے"۔

"یہ بھوک کا درد ہو گا ابا۔ دو نوالے کھاتے ہیں اور بس، دو کوڑی کی صحت نہیں رہ گئی۔ آج ڈاکٹر کے پاس ضرور جائیے گا"۔

برتن رکھنے کے بعد وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ وہ ابا کو اتنا کمزور دیکھ کر سخت پریشان تھی۔ پھر وہ بھی تو ابھی تک نہیں آیا۔ شاید وہ کسی اور فاصلے سے آ رہا ہو۔ شاید ہوائی جہاز سے آ گیا ہو۔ اگر وہ آ جاتا تو ابا کو کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاتی۔ پھر اسے یاد آنے لگا کہ صلو نے اس کے ہر دکھ درد کو بٹایا تھا۔ جب وہ دس گیارہ سال کی تھی اور اماں مر گئی تھیں۔ اور جب وہ گلی میں کھڑی اماں کی میت کو جاتا دیکھ کر زور زور سے رو رہی تھی تو صلو نے آ کر اسے اپنے شانے سے لگا لیا تھا "مت رو منی، مت رو"۔ وہ مردوں کی طرح سے چپ کرا رہا تھا اور وہ سچ مچ چپ ہو گئی تھی۔ صلو اسے بہلانے کے لئے دن میں کئی بار اس کے پاس آتا۔ اسے چڑیلوں اور بھتوں کی کہانیاں سناتا اور اسے یقین دلاتا کہ اس نے ایک بار اپنی آنکھوں سے پری دیکھی تھی۔ اسے کبھی یقین نہ آتا "بھلا پریوں کو کیا پڑی ہے جو زمین پر آ بسیں"۔ صلو بگڑ کر چلا جاتا۔

جب وہ ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی تو اس نے اماں کے دوپٹے نکال کر اوڑھنا شروع کر دیئے اور بس اسی وقت سے

ابّا نے صلّو کو ڈانٹ دیا تھا کہ وہ اب گھر نہ آیا کرے۔ انھیں دنوں صلّو میٹرک کا امتحان دے کر گاؤں چلا گیا تھا۔ تب اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کے لیے بے چین ہے۔ اس نے چھٹیوں کے دن گن گن کر کاٹے تھے۔

ابّا دوا لے کر واپس آ گئے اور ایک خوراک پی کر بستر پہ لیٹ گئے۔

"ابّا اب کیا حال ہے؟"

بس ٹھیک ہوں بٹیا۔ انھوں نے کروٹ لے لی اور پیر اس طرح سمیٹ لئے کہ گھٹنے پیٹ میں اڑے ہوئے لگ رہے تھے۔

"میں سر دبا دوں ابّا۔" ذرا دیر سولیں گے تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ ابّا کے سرہانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ ان کا سر دبانے لگی تو انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی سی دیر بعد ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگے۔

دوا سے فائدہ تو ہوا ہے۔ ساجدہ نے اطمینان کی سانس لی۔ چند پیلے پیلے پتے ابّا کے بستر پہ گرے تو اسے احساس ہُوا کہ خزاں کا دور شروع ہونے والا ہے۔

وہ ابّا کے سرہانے سے اُٹھ کر اپنے بستر پہ آ گئی۔ دوپہر اسے بہت ویران لگ رہی تھی۔ وہ اپنے بستر پہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اگر نیند آ جائے تو کتنا اچھا ہو۔ وہ سوچنے لگی۔ ایک ذرا دیر کے لئے انسان ساری فکروں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے کوئی پکے پھل جیسا میٹھا خواب بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ وہ صلاح الدین کو یاد کرنے لگی۔ ایک بار اس نے صلّو سے کہا تھا کہ اسے رات کو نیند نہیں آتی۔ اور صلّو نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ "پھر تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں سجو، محبت کے سائے میں تو انسان بڑی غفلت کی نیند سوتا ہے۔ اسے پکے پھل جیسے میٹھے خواب دکھائی دیتے ہیں۔"

مگر آج جب وہ اسے یاد کرتے کرتے سو گئی تھی تو پکے پھل میں جیسے کیڑے پڑ گئے تھے۔ بوڑھے کی چیخیں جانے کہاں سے سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ بھی اس کے ساتھ چیخنے لگی۔

"کیا بات ہے بٹیا" ابّا بستر پہ بیٹھے تھے اور اسے پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا ابّا؟" وہ پسینے میں شرابور تھی۔

"کچھ نہیں۔ تم سو رہی تھیں اور تمھارے گلے سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔ جیسے تم چیخنا چاہ رہی تھیں۔ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھیں؟"

"ہاں، ابّا، میں سفر کا خواب دیکھ رہی تھی۔ وہی جب اندھیری رات میں ٹرین پہ حملہ ہوا تھا۔ وہ جھوٹ بول دی۔

"اب تو اپنے پاکستان میں ہو بٹیا۔ اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔" ابّا ہنسنے لگے۔ "تمھاری اماں، اللہ اسے جنت نصیب کرے کبھی کسی بات سے ڈرتی نہیں تھی۔

"اب آپ کا درد کیسا ہے؟" اسے ابّا کا چہرہ بہت پیلا نظر آ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ دوائی ایک خوراک اور دے دو۔ تمھاری اماں ایک چورن بناتی تھیں کبھی میرے پیٹ میں درد ہوتا تو ایک چٹکی کھلا دیتیں۔ بس اسی وقت ٹھیک ہو جاتا۔" ابّا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دعا پلٹاتے ہوئے ساجدہ نے سوچا کہ آج ابا کو اماں اتنی کیوں یاد آ رہی ہیں۔ وہ تو اس کے خیال سے کبھی اماں کا ذکر ہی نہ کرتے تھے۔

"ابا سچ سچ بتایئے آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں۔"

"ارے نہیں۔" وہ کھڑے ہو گئے۔ "میں ذرا ٹہل لوں تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔ باہر رونق ہوگی، جی بہل جائے گا۔"

ابا حقہ اٹھا کر باہر چلے گئے تو وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگی۔ "اے اللہ تو ابا کا ہر دکھ درد مجھے دے دے۔" اس نے اتنے خلوص سے دعا مانگی تھی کہ اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ باہر نکل کر کھڑی ہو گئی۔ اب کیمپ میں خاصی گہما گہمی تھی۔ سرخی پوڈر سے لپی تپی چند بیگمات عورتوں سے ان کے دکھ درد پوچھتی پھر رہی تھیں۔ کچھ لوگوں کا سامان ریڑھوں پر رکھا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے عزیز و اقربا ملنے آئے تھے۔ وہ گلے مل مل کر مسرت کے آنسو بہا رہے تھے۔ ایک لڑکا اس کے پاس سے گاتا ہوا گزر گیا۔ "بچھڑے ہوئے میں گے پھر خالق نے گرملا دیا۔"

جانے وہ کس سے ملنے کو بیتاب تھا۔ وہ کس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ یہاں سب انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ جیسے سب پلیٹ فارم پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بھی تو یہاں بیٹھی انتظار کر رہی ہے۔ وہ ابھی تک اسے ڈھونڈنے نہ آیا تھا۔

اس نے دیکھا، ابا دور سے ٹہلتے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور راستے میں رک رک کر لوگوں سے باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ انھیں کیمپ کی نظاہر نظر آنے والی ذرا ذرا سی بات کا علم رہتا۔ کتنے لوگ آئے ہیں۔ کتنے خاندان چلے گئے۔ کتنے جانے والے ہیں اور کون کہاں جا رہا ہے۔ جانے والی بات سناتے ہوئے ابا کی آنکھوں میں چمک آ جاتی۔ "ایک دن ہم بھی چلے جائیں گے، بہت جلدی، سنا تم نے بٹیا؟ کوئی ہم سدا تو یہاں نہیں رہیں گے؟"

اب سورج ڈھل گیا تھا۔ بسیرا لینے والے پرند درختوں پر شور مچا رہے تھے۔ وہ ایک دم اداس ہو گئی۔ بیگمات اب واپس جا رہی تھیں۔ اور کھانے کی دیگیں ریڑھے پر سے اتاری جا رہی تھیں۔ بجلی کے کھمبوں پر کم پاور کے بلب پکے پھوڑوں کی طرح چمک اٹھے۔ اس نے دیکھا کہ ابا اس کی طرف آ رہے ہیں۔ مگر اب وہ کچھ اس طرح چل رہے تھے جیسے خود کو گھسیٹ رہے ہوں۔

وہ لپک کر ابا کے پاس پہنچ گئی تو انھوں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

"ابا، آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے نا؟"

"ٹھیک ہوں بٹیا۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ لوگ کہہ رہے تھے آج گوشت کی دیگیں آئی ہیں۔ تم لپک کر برتن تو اٹھا لاؤ بٹیا۔"

"آپ اندر چل کر لیٹیے، کھانا آ ہی جائے گا۔"

"ارے نہیں بٹیا۔ تم دیکھتیں نہیں لوگ کس طرح دیگوں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگے۔ "ساری بوٹیاں ختم ہو جائیں گی۔ تم میرے آرام کی خاطر بھوکی رہ جاؤ گی۔ سالن کی خوشبو آ رہی ہے نا؟" انھوں نے ساجدہ کے شانے سے ہاتھ ہٹا لیا مگر ہاتھ ہٹاتے ہی وہ پیٹ پکڑ کر اس طرح جھک گئے جیسے گر پڑیں گے۔

"بھاڑ میں جائے کھانا۔ آپ اندر چلیے۔" جب وہ ابا کو سہارا دے کر اندر لا رہی تھی تو اس نے محسوس کیا کہ ان کے پاؤں کانپ رہے ہیں۔

ابا کو لٹا کر اس نے دوا کی شیشی اٹھائی تو انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"کیوں ابا؟"

"اس دوا سے فائدہ نہیں ہو رہا، ڈاکٹر سے کہو کہ —" ابا نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں ابا، میں اسے ابھی لاتی ہوں۔" وہ باہر نکل کر پوری طاقت سے بھاگنے لگی۔ اس نے یہ بھی نہ سنا کہ ابا اسے پکار رہے تھے۔ "رک جاؤ بیٹا۔ پہلے کھانا لے آؤ۔ لوٹ آؤ بیٹا۔ میں ٹھیک ہوں۔"

ڈسپنسری تک پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول گئی۔ اسٹول پر بیٹھا ہوا کمپونڈر بڑے مزے سے نان کے ساتھ بوٹیاں کھا رہا تھا۔ جب وہ ڈسپنسری کے اندر جانے لگی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"ڈاکٹر صاحب ڈاک کے لیے گئے ہیں بی بی۔" نوالہ نگلنے کے بعد اس نے بتایا۔

"کب آئیں گے؟"

"آجائیں گے بی بی، اب دیکھونا جب تک بندہ ٹھیلے نہیں روٹی کیسے ہضم ہو؟ بس آتے ہی ہوں گے۔"

"میرے ابا بہت بیمار ہیں۔" وہ کمپونڈر کو التجا سے دیکھنے لگی۔ "جب ڈاکٹر صاحب آئیں تو ان سے کہنا منشی رمضان صاحب کو آ کر دیکھ لیں۔" یہ پیغام اس نے بالکل اسی طرح دیا جیسے ایک بار رات کو اپنی گلی میں رہنے والے ڈاکٹر کو دے آئی تھی۔ اس رات بھی ابا کے پیٹ میں سخت درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹر چند منٹ بعد آ گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ آپریشن کرا کے اپینڈکس نکلوا دیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد ابا بہت ہنسے تھے۔ "کل کو ڈاکٹر صاحب کہیں گے کہ پیٹ ہی بدلوا لو۔" ساجدہ نے کیسا کیسا سمجھایا مگر ابا تو آپریشن کی بات ہی سننے کو تیار نہ تھے۔ باپ کی کم علمی بعض وقت اسے خون کے آنسو رلاتی۔

وہ چند منٹ تک کھڑی ڈاکٹر کا انتظار کرتی رہی اور پھر یہ سوچ کر دوڑ پڑی کہ ابا اکیلے ہیں مگر جب وہ ابا کے پاس پہنچی تو وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے اور ڈاکٹر بھی سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ ساجدہ کو دیکھ کر لوگ ابا کے پاس سے ہٹ گئے۔ ابا کے سرہانے رکھی ہوئی لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔

"آپ یہاں ہیں، میں آپ کو ڈسپنسری میں تلاش کر رہی تھی۔ اب ابا کی طبیعت کیسی ہے؟ وہ ڈاکٹر کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ابا ٹھیک ہیں نا، آپ کو کس نے بتایا کہ میرے ابا بیمار ہیں؟

"میں نے ان کو ادھر سے گزرتے دیکھا تو بلا لیا تھا۔" ایک بزرگ سے آدمی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"میں پوچھ رہی ہوں میرے ابا کیسے ہیں۔ وہ تقریباً چیخ پڑی۔ سب خاموش رہے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں ڈیوٹی پر تھا۔ اگر میں گھر سے نہ گیا ہوتا تو —" اس نے ساجدہ کی وحشت زدہ آنکھوں میں جھانک کر سر جھکا لیا۔ "مجھے اپنے جرم کا احساس ہے۔"

"اللہ کی مرضی - اللہ کی مرضی" کئی آوازوں نے ایک ساتھ کہا۔ تب اسے احساس ہوا کہ ابا مر گئے اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ سر سے پاؤں تک سن پڑ گئی - اس نے ڈاکٹر کو جاتے دیکھا، لوگوں کو ہٹتے دیکھا۔ پھر وہ ایک کمزور شاخ کی طرح جھکنے لگی تو کئی ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ دو ادھیڑ عمر کی عورتیں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کا سہارا لئے سو رہی تھیں اور دو سپارے ان کے سامنے کھلے ہوئے تھے۔

وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ابا کے چہرے سے چادر سرکا کر لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔ سرد، اُداس اور ویران چہرہ جیسے اس سے سرگوشی کر رہا تھا: "اری بٹیا - زندگی کے حساب میں بھی غلطی ہو گئی۔ اب تم کیا کرو گی؟"

اس نے اپنا چہرہ ان کے ٹھنڈے چہرے پر رکھ دیا اور اس طرح گھٹ گھٹ کر رونے لگی کہ کہیں کوئی اس کے آنسوؤں کی آہٹ نہ سن لے۔ کوئی اس کے غم کی راہ کو صبر کے لفظوں سے کھوٹا نہ کر دے۔

اور جب اس کے سر کو آہستہ سے کسی نے اٹھایا تو پو پھٹ چکی تھی اور دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔

عورتوں نے اس سے جانے کتنے بہت سے سوال کر ڈالے تھے۔ "تمھارا کوئی عزیز ہے کہ نہیں؟" "اب تم کس کے پاس رہو گی؟" "اب تم کہاں جاؤ گی؟"

وہ ان کے ہر سوال پر انکار میں گردن ہلا دیتی۔

"کوئی نہیں تو پھر کیا ہوا - کیا ہم مر گئے ہیں۔" ایک عورت نے بڑی ہما ہمی سے کہا۔

"میرے ہوتے ہوئے تم اکیلی نہیں ہو۔" دوسری عورت نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو اسے ایسا لگا جیسے ایک مضبوط ہاتھ اسے تھپک رہا ہے۔ "مت رو منی، مت رو بچو۔" احساس کی محرومیت پر وہ بُری طرح تڑپ گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے چیخے - "ابا مر گئے صلو۔ ابا مر گئے۔" اس نے عورت کا ہاتھ آہستہ سے ہٹا دیا۔

اب سورج کی کرنیں چادر کے کھلے ہوئے کونے سے اندر جھانک رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ چائے اور کھانے کی دیگیں ریڑھے پر سے اتاری جا رہی ہیں پھر اس نے غلام محمد کی آواز سنی - "گرم چائے، چائے پیو بادشاہو چائے۔"

پھر وہ بچوں کے بیچ میں ناچنے لگا۔ "چائے پیو گرم گرم نان کھاؤ نرم نرم۔"

ساجدہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لئے آج کی صبح کل کی صبح سے کتنی مختلف تھی۔ غلام محمد کی آواز آج اسے کتنی بُری لگ رہی تھی۔

کیمپ کے منتظم ایک کھاٹ اور چند آدمیوں کے ساتھ جب اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تو وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ "بیٹی" —— کیمپ کا بزرگ منتظم کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"ابا کا آخری لباس خریدنے کے لئے میرے پاس کچھ روپے ہیں۔" اس نے بے حد صبر سے صاف لہجے میں کہا۔

"میں صرف تم سے اجازت لینے آیا ہوں بیٹی، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ رمضان بھائی میرے بھائی تھے۔ غسل دینے کے

بعد تم کو آخری دیدار کرا دوں گا۔"

انتہائی کوشش کے باوجود وہ بزرگ کو جواب نہ دے سکی۔ اس کے ہاتھ چھوٹے سے بکس کی طرف بڑھے اور پھر جیسے مفلوج ہو گئے اور وہ آپا کو کلمے پڑھتے ہوئے اٹھا کر لے گئے۔

چادروں کی دیوار ایک طرف گر گئی تھی۔ دونوں عورتیں اس پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ رو رہی تھیں مگر اس کی آنکھیں اب لورسے پیالے کی طرح صاف تھیں۔ اب صرف تنہائی کا احساس اور مستقبل کا خیال اس کے سامنے کھڑا جیسے دھمکیاں دے رہا تھا۔

غلام محمد نے شاید میت اٹھتے دیکھ لی تھی بچوں کے نرغے کو توڑ کر وہ ساجدہ کے پاس آ گیا تھا۔ اور سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جاؤ بیٹے اپنا کام کرو" ایک عورت نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔

"باجی کیا آپ کے ابا ـــــ؟ غلام محمد بات پوری نہ کر سکا۔

"ہاں! گامو میرے ابا مر گئے۔" وہ بڑی مشکل سے بولی اور پھر اس نے دیکھا کہ گامو جیسے الہڑ لڑکے کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے میلے گریبان میں جذب ہو رہے ہیں۔ گامو کے آنسوؤں نے اس کے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیئے۔

"صبر کرو مت رو" ایک عورت اسے سمجھا رہی تھی۔

"لو، بیچاری روئے نہ تو کیا کرے۔ کوئی رشتے ناطے کا بھی نہیں جو ساتھ دے۔ ہائے ہائے کیسا قہر ٹوٹا ہے۔"

ساجدہ ایک دم چپ ہو گئی۔ ہمدردی کے یہ الفاظ اسے ہتھوڑے کی چوٹ لگ رہے تھے۔

"باجی" آپ میرے ساتھ چلئے۔ میری اماں ہیں۔ ہمارا چھوٹا سا گھر ہے۔ میری کوئی بہن نہیں۔ میں آپ کی خدمت کروں گا۔ میں آپ کو ـــ

"ارے لڑکے ذرا عقل کی بات کرو۔ ایک جوان لڑکی تمہارے ساتھ جائے گی تو دنیا کیا کہے گی؟

گامو بگڑا تھا۔" اجی چھوڑو، کیا کہے گی دنیا؟

ماسی یہ دنیا نہیں، پاکستان ہے پاکستان اور یہ میری باجی ہیں، باجی۔"

"گامو" وہ بہت پیار سے بولی۔" تم میری فکر نہ کرو۔ میں اپنی مدد آپ کر سکتی ہوں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"جاؤ! لوگ جائے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جائے پیو گرم گرم۔ روٹی کھاؤ نرم نرم۔" وہ بازوؤں میں سر چھپا کر آنسو پونچھنے لگی۔

اس نے گامو کے سسکنے کی آواز سنی اور جب اس نے سر اٹھایا تو وہ جا چکا تھا۔ دنیا اور پاکستان سب اس کے ذہن میں گڈ مڈ ہو کر رہ گئے۔

زندگی کے خاتمے کے تمام مراحل گزر چکے تھے۔ اور اب شام ہو رہی تھی۔ بادلوں کے چند سیاہ ٹکڑے ہوا میں جیسے دوڑے جا رہے تھے اور بسیرا لینے والے پرندے درخت پر شور مچا رہے تھے۔ پرندوں کی سیٹیوں جیسی آوازیں آج اس کی زندگی میں کوئی امنگ پیدا نہ کر رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہر آواز اس کے کانوں میں درد کی ٹیس بن رہی ہے۔

دونوں عورتیں تھوڑی دیر کے لئے اٹھ کر گئیں اور پھر آ گئیں۔ اس وقت وہ دونوں اس کے مستقبل کے لئے بڑی فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

"میں کہتی ہوں کہ میرا دیور اتنا اچھا لڑکا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو ہر ایک تعریف کرتا ہے۔ کانپور میں زیوروں کی بہت بڑی دکان تھی۔ سب لُٹ گئی۔ خیر دکان تو یہاں بھی مل جائے گی۔ تیس چالیس سیر سونا تو کپڑوں میں چھپا کر نکال لائے ہیں۔" سنار کی بھاوج نے چند لفظوں میں ساری رام کہانی سنادی۔

"اور میرا بھائی۔ ماشاءاللہ بارہ جماعتیں پڑھا ہوا ہے۔ وہاں جلسے جلوسوں میں پڑ گیا۔ کہتا تھا کہ اب تو پاکستان جا کر ہی پڑھوں گا۔ میں تو کہتی ہوں پاکستان کے لئے اس نے رات دن ایک کر دئے۔ سچ پوچھو بہن تو پاکستان بنایا اس نے اللہ اس کی لمبی عمر کرے صورت شکل ایسی کہ دیکھے سے بھوک پیاس اڑے۔"

ساجدہ نے آنکھیں پھاڑ کر دونوں عورتوں کو دیکھا۔ تو اسے دو جونکیں نظر آئیں۔ بالکل ویسی ہی جونکیں جنھیں ایک بار حکیم نے اماں کے پیروں میں چپکا دیا تھا اور جب وہ اماں کا خون چوس چوس کر پھول رہی تھیں تو وہ مارے ڈر کے باہر بھاگ گئی تھی۔ مگر یہ جونکیں تو ان سے زیادہ خطرناک تھیں وہ اس کی خود اعتمادی کی دیوار کو ڈھا رہی تھیں۔

بچپن میں اماں اسے ایک کہانی سنایا کرتی تھیں۔ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ تو بیٹا اس بادشاہ کی سات بیٹیاں تھیں ایک بار بادشاہ نے اپنی ساتوں بیٹیوں کو اپنے پاس بلایا اور باری باری سب سے پوچھا کہ تم کس کی قسمت کا رزق کھاتی ہو چھ بیٹیوں نے کہا کہ ابا حضور ہم آپ کی قسمت کا رزق کھاتے ہیں۔ مگر سب سے چھوٹی بیٹی نے کہا کہ ابا حضور میں اپنی قسمت کا لکھا کھاتی ہوں بادشاہ چھوٹی بیٹی سے ناراض ہو گیا اور اس نے خادموں کو حکم دیا کہ چھوٹی بیٹی کو ڈولے میں بٹھا کر جنگل بیابان میں چھوڑ دیا جائے۔ چھوٹی بیٹی جنگل میں حیران پریشان پھرتی تھی۔ نہ کھانے کو روٹی تھی نہ پینے کو پانی پھر خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ چھوٹی شہزادی کو وہیں خزانہ ملا اور اس خزانے سے اس نے ایک بہت بڑا محل تعمیر کرایا اور ———

خود اعتمادی کی یہ کہانی ختم بھی نہ ہوتی کہ ساجدہ بول پڑتی۔ "اماں میں سب سے چھوٹی بیٹی ہوں" اسے چھوٹی بیٹی سے بہت محبت ہو گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اماں کے مرنے کے بعد اس نے چھوٹی عمر میں گھر سنبھال کر ابا کو بہت سی فکروں سے آزاد کر دیا تھا۔ مگر ابا اسے تنہائی کے جس ڈولے میں بٹھا کر انسانوں کے جنگل میں چھوڑ گئے تھے وہاں وہ خود اعتمادی کا خزانہ کھودنے کی طاقت کھو بیٹھی تھی۔

"بہن تمھارے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ کیمپ سے نکل کر دو وقت کی روٹی کھا سکو" ——— سنار کی بھاوج فخر سے کہہ رہی تھی ——— علم کو چاٹنے سے پیٹ تو نہیں بھر جاتا۔"

"واہ جی واہ" ——— پاکستان بنانے والے کی بہن کو تاؤ آ گیا ——— "سونے میں کھوٹ ملا ملا کر چار پیسے کما لئے تو ہمارے منہ لگتی ہو؟ ٹھیک کہتا ہے میرا بھائی، جاہلوں سے اس طرح بھاگو جیسے کمان سے تیر۔"

"ذرا میں دیکھوں تمھارا تیر کمان" ——— سنار کی بھاوج نے آستین چڑھا کر ہاتھ لہرایا تو ساجدہ آنکھیں بند کیے زور سے چیخی ——— "ابا" ——— اور پھر چیختی چلی گئی "ابا۔ ابا"

دونوں عورتیں گھبرا کر اسے تسلی دینے لگیں۔

ے تو کچھ نہیں کہا۔ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔"

نے کچھ نہیں کہا۔ مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا کوئی ہم ضد کر رہے ہیں۔ ہم نے سوچا بیچاری بے سہارا ہے کہاں جائے گی۔"

نے جیسے کچھ نہیں سنا۔ بس وہ چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس ایک ہجوم جمع ہو گیا ہے
نے سر پر ایک نرم نرم سا ہاتھ محسوس کیا تو وہ خاموش ہو گئی اور آنکھیں کھول کر اس نرم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ہجوم میں گہری
ی آنکھوں والی سادہ سی لڑکی نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا بادشاہ کی سب سے چھوٹی شہزادی کی طرح اسے
س نے خزانے کا سراغ پا لیا ہے۔

ب معصوم ہے، اب تم اکیلی نہیں ہو۔" لڑکی اسے اس طرح لپٹا رہی تھی جیسے اپنے سینے میں سمو رہی ہو۔ "اب تم میرے ساتھ

نے حیرت سے اپنا نام سنا اور لڑکی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ "تم کون ہو، تم کیا ہو۔ مجھے کہاں لے جاؤ گی؟"
ن سوالیہ نظروں کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی اور جیسے ان سوالوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ن کو جانتا ہوں بیٹی۔ تم اطمینان سے ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ تم اکیلی ہو۔ یہ تم کو سہارا دیں گی۔" لڑکی کے ساتھ کیمپ
ے تھے۔

۔۔۔ اس کی نظر سنار کی بھاوج پر پڑی تو جیسے اس نے سہم کر اپنا سر لڑکی کے کاندھے پر رکھ دیا۔

رخصت ہوں بیٹی۔ میں سامان سے چلتا ہوں۔" منتظم کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

سے لپٹائے آگے بڑھ گئی۔ اس نے ایک بار مڑ کر گھنے درخت کو دیکھا۔ وہ اسے خزاں میں لٹا ہوا ٹنڈ منڈ نظر آ رہا تھا
ر اور نیچے سب اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ وہ سب جیسے اُسے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

یسی کار میں پچھلی سیٹ پر وہ لڑکی کی گود میں منہ چھپائے نڈھال سی پڑی تھی اور ناہموار سڑک پر تیز چلتی ہوئی کار سے لحد
ڈ لڑکی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے پکارا۔

بھائی ۔۔۔ گاڑی آہستہ چلاؤ کوئی حادثہ نہ کر بیٹھنا۔"

دہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ جس خزانے کا سراغ پایا تھا اس پہ تو ناگ بیٹھا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ چلتی کار سے کود جائے
اس نے بے بسی سے لڑکی کو دیکھا۔

رہو۔ رو رو کر سر میں درد ہو رہا ہوگا۔" لڑکی نے پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا تو وہ سسک کر رو پڑی
ر جا رہی ہے جس نے اس کے باپ کا مذاق اڑایا تھا اور جس نے پاکستان آ کر سیلا تالہ توڑا تھا۔

یں تسلی بھی نہیں دے سکتیں سلیمہ۔ میں اناڑی ڈرائیور ہوں۔ کہیں واقعی حادثہ نہ کر بیٹھوں۔" ناظم نے کار کی رفتار اور
ر ابھائی کار کو غائب پا کر سخت برہم ہوگا۔"

یونچھ کر وہ بند شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ درختوں سے لدی پھندی سڑک پر کہیں روشنی نہ تھی بادلوں نے اور بھی اندھیرا

کر رکھا تھا۔ اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ آئندہ کیا ہوگا۔ اس سوال کا جواب نہ پا کر اس کا دل بیٹھنے لگا اس کا جی چاہا کہ وہ اتنے زور زور سے چیخنے کہ اس کی آواز صلاح الدین تک پہنچ جائے مگر اس نے اپنی اس خواہش کو ہونٹ بھینچ کر سینے میں دفن کر دیا۔ بے بسی اور خطرے کے احساس کے ساتھ انسان کیسی کیسی انہونی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ اس نے بھی سوچا کہ صلو کیمپ میں ضرور آئے گا جب اسے نہ پائے گا تو لوگوں سے پوچھے گا۔ بوڑھے منتظم سے ملے گا۔ اس سے پتہ معلوم کرے گا۔

اب اندھیرا راستہ ختم ہو گیا تھا۔ اب سڑک کے دونوں طرف بجلی کے کھمبے روشن تھے۔ کار ایک کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو کر پورچ میں کھڑی ہو گئی تو اس نے تیز روشنی میں دیکھا کہ کوٹھی کا رنگ و روغن اڑا ہوا تھا وہ بے حد پرانی لگ رہی تھی۔ لان کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت گزرے ہوئے برسوں کا پتہ بتا رہے تھے۔ ہوا میں دیسی گلابوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

کار سے اترتے ہی اسے خوشبو کے ساتھ سردی کا ایسا احساس ہوا کہ وہ کانپنے لگی۔ ناظم کار سے اترتے ہی غائب ہو گیا۔ سلیمہ اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھام کر بڑے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ گیلری میں بچھی ہوئی دبیز قالین پہ چلتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں دھنس رہے ہیں۔ وہ ایک لمحے کو کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے سجو؟" سلیمہ نے پوچھا۔

"میں تھک گئی ہوں۔" ساجدہ نے آہستہ سے کہا۔

"بس اتنا سا چل کر تھک گئیں؟" وہ مسکرا دی۔

"میں تو بہت دور سے سفر کر کے آ رہی ہوں باجی۔" ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔ اسی لمحے اسے کمرے کے کھلے ہوئے دروازوں سے ایک سریلی آواز سنائی دی "تم نے گھر کو خیرات خانہ سمجھ رکھا ہے۔ تم کو یہ بھی خیال نہیں کہ اب تمہارے باپ کتنے تھک چکے ہیں۔ پہلے تمہاری ماں گھر کے کام کے بہانے تاجی کو اٹھا لائیں اور اب تم ——— تمہیں پتہ ہے کہ آٹا مہنگا ہو رہا ہے؟

"کیا آپ آہستہ نہیں بول سکتیں۔ آپ ایک شخص پہ حکومت کرتے کرتے یہ کیوں سمجھنے لگیں کہ سب آپ کے غلام ہیں۔" یہ ناظم کی آواز تھی۔ سلیمہ جیسے ساجدہ کو گھسیٹنے لگی ——— "تم بہت تھک گئی ہو سجو۔ جلدی سے چلو، تم اپنے کمرے میں ذرا دیر آرام کر لو گی تو تھکن دور ہو جائے گی۔"

دبیز قالین۔ خیرات خانہ، مہنگا آٹا۔ یہ کون سی جگہ ہے اللہ۔ یہ ساری چیزیں ایک جگہ کیسے جمع ہو گئیں۔

"سلیمہ بیٹی۔ کہاں ہو میری جان؟" اب وہ سریلی آواز گیلری میں گونجی۔

"آتی ہوں امی۔" سلیمہ نے مڑ کر جواب دیا اور ایک چھوٹے سے اجاڑ کمرے میں داخل ہو گئی جہاں ایک رنگین پایوں والا نواڑی پلنگ اسے آرام کی دعوت دے رہا تھا۔

"سلیمہ باجی ———" ساجدہ خالی خالی نظروں سے سلیمہ کو دیکھنے لگی۔

"تم آرام کرو سجو۔ تاجی ابھی تمہارے لئے چائے بنا دے گی۔ صبح تمہارا کمرہ صاف کر کے تمہارا سامان لے آئے گی۔ کھانے کے وقت میں آ کر تم کو لے جاؤں گی پھر تم کو سب سے ملاؤں گی۔ ایں نا؟" سلیمہ اسے معصوم معصوم نظروں سے دیکھ کر مسکراتی ہوئی چلی

گئی ۔ اب بادل آہستہ آہستہ گرج رہے تھے اور کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی اور پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ درد کے مارے اس کا سر جیسے پھٹا جا رہا تھا اس وقت اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت ایک کراہ بن کر رہ گئی تھی۔

"لو چائے پی لو۔ اور یہ رہا تمہارا بستر۔" لڑکی نے بستر پلنگ پر رکھ دیا اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"تم تاجی ہو؟" ساجدہ نے لمبی چوڑی لڑکی کو ذرا غور سے دیکھا۔ بھدے نقوش کے باوجود وہ بے حد معصوم لگ رہی تھی۔

"ہاں۔ میں تاجی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "اچھا ہوا تم آ گئیں۔ اتنے بڑے گھر کا اکیلے کام کر کر کے تھک جاتی تھی۔"

"تاجی سلیمہ باجی سے کہنا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گی، اچھا، کہہ ضرور دینا۔ خواہ مخواہ وہ مجھے بلانے آئیں گی۔"

"ارے واہ۔" تاجی زور سے ہنسی۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے؟" ساجدہ نے اسے غصے سے دیکھا تو وہ چپ ہو گئی۔

"پیالی خود سے آنا۔ میں جاتی ہوں۔" تاجی نے بھی اسے غصے سے دیکھا اور چلی گئی۔ ساجدہ نے اٹھ کر دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ الٹا سیدھا بستر بچھایا روشنی گل کر کے لیٹ گئی اور درد کی شدت سے کراہتے کراہتے کب سو گئی اسے پتہ بھی نہ چلا۔

ہم جلیس، ہم صفیر

منظور الٰہی

شیخ محمد اکرام، حمید احمد خان، ممتاز حسن، ایک ایک کرکے تارے ماند پڑ گئے۔ ان احباب کی صحبت ایک نعمت تھی۔ پہروں باتیں ہوتیں لیکن جی سیر نہ ہوتا، شرابِ لطف پہ دور جام می ریزی و می ترسم، کہ زود آخر شود این نشہ، و من در خمار افتم طویل صحبتوں میں بسا اوقات ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی۔ وہ یادیں زیست کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اُردو اور فارسی کے شہ پارے، تنقیدی جائزے، احیائے دین کی تحریکیں، اسلامی روایت کی بنیاد استوار کرنے میں صوفیائے کرام کا حصہ، نقاشی اور فنِ تعمیر میں مسلمانوں کے آثار — یہ جانتے ہوئے کہ وہ نقوش اَنمٹ بھی ہیں اور انمول بھی انہوں نے برصغیر میں مسلمانوں کے ثقافتی کارنامے اُجاگر کئے اور اُس عظیم الشان وراثت کی لاج رکھ لی۔ جسے ہم ہند اسلامی تہذیب کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، ہمارے ماضی کی تابناک روایات کے یہ امیں مغربی علوم میں بھی دسترس رکھتے تھے، انھیں برصغیر کی اسلامی ثقافت کا شارح کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

۱۹۶۲ء میں میرا تقرر بحیثیت سیکرٹری تعلیمات مغربی پاکستان ہوا تو پہلی مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان سے نیاز حاصل ہوا، وہ اُس وقت اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے، بکمال شفقت اُنہوں نے مجھے اپنے کالج آنے کی دعوت دی، وہ طلبا کی تکالیف سے بخوبی واقف تھے، لیبارٹریوں میں سامان کی کمی، لائبریری کے لیے گرانٹ کی ضرورت، ملحقہ ہاسٹل سے 'ناخواندہ مہمانوں' کے انخلا کا مسئلہ، توسیع عمارت کا منصوبہ، اُن کی دوررس نگاہ سے اِدارے کی جزئیات مخفی نہ تھیں، چائے کے وقفے میں مجھے احساس ہوا کہ لڑکوں کے گروہ میں اُن کی حیثیت ایک مشفق باپ کی تھی اور انھیں وہ مقام حاصل تھا جو برسوں کی بے لوث خدمت، ذاتی دلچسپی اور ہمدردانہ روش کا ثمر ہوتا ہے، وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو مجھے سنڈیکیٹ کی نشستوں اور نجی محفلوں میں اُن کی دلآویز شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اُن دنوں یونیورسٹی کو بہت سی الجھنیں درپیش تھیں، طلبا میں ہیجان، انتظامیہ اور تدریسی شعبوں میں رقابت، شخصیات کا ٹکراؤ، سازشیں اور الزام تراشیاں، طلبا کو 'خانہ جنگی' میں ملوث کرنے کی سعی، یہ منفی رجحانات اِدارے کے ضعف کا باعث تھے اور اُس کی سربراہی کانٹوں کی سیج تھی لیکن اُس پُرآشوب دَور میں بھی پروفیسر صاحب کی کوشش رہی کہ جادۂ اعتدال سے نہ بھٹکیں، نظم و ضبط بے لاگ ہو، درپیش مسائل مروجہ قاعدے کے مطابق حل کئے جائیں۔

سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں وہ اپنا نقطۂ نظر مختصر مگر جامع الفاظ میں بیان کرتے، مسئلے کے نشیب و فراز سمجھا کے باقی ممبروں کی رائے طلب کرتے، کسی مد کی تیاری میں عملہ غفلت یا نااہلیت کا ثبوت دیتا تو چیں بجبیں ہو جاتے، چہرہ سرخ ہو جاتا لیکن شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا، قوتِ برداشت آڑے آجاتی، درشتی ملائمت میں بدل جاتی، میٹنگ کے دَوران وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھتے تھے، چھوٹے بڑے کی تمیز نہ تھی، بعض چیئرمین عمر یا منصب کے لحاظ سے سینئر ممبروں کو SIR کہہ دیتے ہیں یا اُن کے آنے پر

تعلیماً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن وہ اِس نازبرداری کے قائل نہ تھے، وہ لاشعوری طور پر معلّم کی مسند پر فائز تھے جس کا احترام سب پر واجب تھا۔

اساتذہ میں حمید احمد خان کا مقام بہت بلند تھا، ہزاروں جویائے علم اُس چشمے سے بہرہ مند ہوئے لیکن صاحب کردار ہونے کے لحاظ سے اُن کا رتبہ بلند تر تھا، وہ تملق سے گریزاں تھے، وزارت میں ردّ و بدل ہوا اور ایک بزرگ کو محکمۂ تعلیم سونپا گیا، حمید احمد خاں سلام کے لئے نہ گئے، وزیر صاحب بہت جزبز ہوئے، کہیں خفگی کا اظہار بھی کیا، خان صاحب کا مؤقف تھا: "وزیر صاحب مصروف آدمی ہیں، میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا، کوئی کام تھا تو مجھے یاد فرما لیتے۔"

اعلانِ تاشقند کے بعد طلبا کے ہنگامے اور پولیس کی فائرنگ تاریخی واقعات ہیں، اُس روز گورنر نتھیا گلی میں تھے، لاہور واپس آنے پر انہوں نے یونیورسٹی یونین اور منسلک اداروں کے عہدیدار براہِ راست کو ابھیجے تاکہ اضطراب کی کیفیت ختم ہو، ملٹری سیکرٹری نے خان صاحب کو فون پہ کہا کہ آپ بھی فلاں وقت پہنچ جائیں، خان صاحب کا جواب تھا: "چونکہ چانسلر نے میرے طلبا کو میری وساطت سے نہیں بلوایا، میں میٹنگ میں حاضر ہونے سے قاصر ہوں۔" ملٹری سیکرٹری نے دو تین مرتبہ سختی سے کہا کہ چانسلر گورنر بھی ہیں اور یہ اُن کا حکم ہے لیکن خان صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے، پی۔ اے کو کہہ دیا کہ پھر فون آئے تو ملانے کی ضرورت نہیں، اتفاق سے مرکزی سیکرٹری تعلیمات ایس ایم شریف لاہور آئے ہوئے تھے، صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن عاقبت کوشی عبث تھی، خان صاحب کا فیصلہ اٹل تھا، نواب کالاباغ سخت برہم ہوئے۔ آٹھ دس ماہ اُن کی خفگی برقرار رہی لیکن وہاں بھی یہ وضعداری ضرور تھی کہ خان صاحب کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ پہلی ٹرم کے خاتمے پر مزید چار سال کی توسیع کر دی، نواب صاحب کا ذکر چل نکلا ہے تو متذکرہ میٹنگ کی تفصیل بیان کر دوں جو شام کے وقت گورنر ہاؤس میں ہوئی، شدید حبس تھا، شاید اسی وجہ سے خلافِ معمول نواب صاحب نے سفید کھدر کا تکمے دار کرتا پہن رکھا تھا، شروع میں اُن کا لہجہ مشفقانہ تھا: "آپ جذبات کی رَو میں بہہ گئے ہیں، بہر حال آپ ہمارے بچے ہیں اور کوئی باپ نہیں چاہتا کہ بچوں کو تکلیف ہو" پھر ناصحانہ "آپ کو حزبِ اختلاف نے گمراہ کیا ہے، اُس کا اپنا اثر رسوخ نہیں۔ اس لئے آپ کو آلۂ کار بنایا۔" نواب صاحب کے لہجے میں ٹھہراؤ اور خود اعتمادی تھی، انہوں نے انگریزی زبان میں بات جاری رکھی۔ "آپ کو اس ملک پر حکومت کرنے کے سبز باغ دکھلائے گئے ہیں لیکن کسی خوش فہمی میں نہ رہیے، انقلاب برپا ہوا تو کوئی فوجی جرنیل ہی حکومت سنبھالے گا، ترکی سے جنوبی ویٹ نام تک کسی طالب علم کو اقتدار سونپا گیا؟ ہر جگہ مارشل لاء کا دور دورہ ہے۔" پھر کچھ بے ربط ہو کر نام لیے بغیر وہ ایک سیاسی حریف پر برس پڑے "اس شخص پر صدر ایوب کی بے شمار عنایات ہیں لیکن وہ ناشکرا ہے، ہم سات سو برس سے اپنے علاقے میں بیٹھے ہوئے ہیں، صاحبِ صدر نے ہماری جاگیریں واپس لے لیں لیکن ایک ایسے شخص کو جاگیر پر قابض رہنے دیا۔" یکدم نواب صاحب طیش میں آگئے "لیکن میں کسی سے نہیں ڈرتا، مجھے کسی کا خوف نہیں۔" میں نے دبے لفظوں میں کہا کہ باری تعالیٰ کی ذات مستثنیٰ کر دیں ورنہ یہ کلمۂ کفر ہوگا۔

کچھ عرصے بعد بڑے اندوہناک حالات میں نواب صاحب کی موت ہوئی۔ پروفیسر حمید احمد خاں کسی تقریب پر میانوالی گئے، پُرسا دینے کے لئے نواب صاحب کے گھر گئے، پھر قبر پہ جا کر فاتحہ پڑھی، جبلّی شرافت ہو تو ایسی، ایک اصولی بات پر اختلاف تھا، کوئی کدورت باقی نہ تھی۔

عہدوں اور مناصب کے پیچھے تگ و دَو کرنا اُن کی فطرت میں نہ تھا ، ۱۹۶۳ء میں اُن کے وائس چانسلر بننے کی تجویز ہوئی انہوں نے سرسری طور پر ایک آدھ مرتبہ یاد دہانی کروائی ، وہ بھی اس لئے کہ اسلامیہ کالج میں ملازمت ختم ہو رہی تھی اور توسیع کے لئے وہ انتظامیہ کمیٹی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے میں متامل تھے ۔

مجھے اِس بات پر ناز ہے کہ ہماری چار سالہ رفاقت کے دَوران یونیورسٹی اور محکمہ تعلیمات کے درمیان روایتی چشمک معدوم تھی ، اختلاف کی جگہ دوستی اور تعاون کا جذبہ کارفرما تھا ۔ خان صاحب کی نتھری ہوئی بے داغ شخصیت ایسی تھی کہ از خود انسان کے دل میں توقیر پیدا ہو، ایک سال محکمہ تعلیم کی سعی سے پنجاب یونیورسٹی کو فیاضانہ گرانٹ ملی، تدریسی شعبوں کے چند سربراہ سیکرٹریٹ میں مجھے ملنے کے لیے آئے ، میں نے نیم سنجیدگی سے پوچھا ” یہاں آنے سے پہلے آپ حضرات نے وائس چانسلر صاحب کی اجازت حاصل کر لی تھی؟ ” جی انہوں نے ہی شکریہ ادا کرنے کے لئے آپ کے پاس بھجوایا ہے ! “ یہ تھا وسیع القلبی کا عالم ۔

نیو کیمپس کی تعمیر شروع ہوئی تو منتظمین نے سب سے پہلے وائس چانسلر کا گھر بنانے کی پیشکش کی ، خان صاحب کا جواب تھا ” تدریسی شعبوں اور لیبارٹریز کی تعمیر کو اوّلیت دیجئے ، وائس چانسلر کا گھر اُس کے بعد بنے گا ، چنانچہ پانچ برس بیگم روڈ کے پرانے مکان میں ہی گزرے جہاں وہ پچیس برس قبل بحیثیت لیکچرار مقیم تھے ، وہ درویش صفت انسان وائس چانسلر کے گھر میں صرف ایک برس رہا ، کاش پاکستان میں ایسے چند اور لوگ ہوتے ۔

حمید احمد خان دوسری ٹرم کے دو برس ہی گزار پائے تھے کہ صوبائی سیکرٹری تعلیمات کے ساتھ اختلافات نے شدت اختیار کر لی ، ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت اخبارات میں مہم چلائی گئی جس سے وائس چانسلر کی اہانت مقصود تھی ، جنرل موسیٰ سے عین اُس وقت غلط احکام حاصل کئے گئے جب وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو رہے تھے ، حمید احمد خان کی غیرت کسی لچک کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی ، یونیورسٹی سے علیحدگی ناگزیر ہو گئی ، لوگوں نے اِس اِقدام کو سراہا ، اصول پرستی کی خاطر یہ قربانی رائیگاں نہیں گئی ، قدرتی طور پہ خان صاحب بیحد دل گرفتہ تھے ، فرمانے لگے : ” جسٹس ایس ۔ اے ۔ رحمٰن کے علاوہ ۔ اس سلسلے میں صرف آپ کو ملنے آیا ہوں “ مارشل لاء کا نفاذ ہو چکا تھا ، حسبِ وعدہ حقیقتِ حال نئے گورنر کے گوش گذار کی گئی لیکن ” گورنمنٹ “ کا پلہ بھاری رہا ، بیوروکریسی کے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکہ لگنا تھا ، ایک صریح زیادتی کا ازالہ نہ ہو سکا ۔

زخم ہا برداشتیم و فتنہا کردیم ، لیک
ہرگز از خونِ کسے رنگیں نشد دامانِ ما
عرفی

وہ مشرقی وضعداری کی تصویر تھے ، ابّا کا انتقال ہوا تو میں ترقی پا کر بورڈ آف ریونیو میں جا چکا تھا ، گویا محکمہ تعلیم اور یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہ رہا تھا ، کیا دیکھتا ہوں کہ سیاہ اچکن پہنے ہوئے خان صاحب چلے آ رہے ہیں ، اُس روز انہوں نے فرمایا تھا ” میں کسی تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا ، والدہ کی ذات میری زندگی کا محور تھی ، میں نے اُن کی شخصیت کا بھرپور تاثر قبول کیا ، میرے لیے وہ سب کچھ تھیں ، ان کے انتقال پر مجھے بیحد صدمہ ہوا تھا ، ہر روز صبح سویرے لاہور سے کرم آباد چلا جاتا ، اُن کی قبر پر جا کر تلاوت کرتا اور رات گئے لَوٹتا ، دس بارہ روز یہی عالم رہا ، سخت گرمی تھی ، دودھ کی کچی لسّی پی لیتا ، کوئی غذا نہیں کھا سکتا تھا “ مجھے نصیحت کی کہ کثرت سے

تلاوت کریں اور والد مرحوم پر ایک مبسوط مضمون لکھیں تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو،

حمید احمد خان کی ذات میں سنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔ اُن کی وضع قطع، سوچ کا انداز، کام کی لگن، اسلامی افکار سے شغف، لوگوں سے تعلقات کی نوعیت ایک بھاری بھرکم شخصیت کے مختلف پہلو تھے، بایں ہمہ وہ مسموم مزاج سے محروم نہ تھے، ایک تقریب میں چہرے پر بشاشت کھل رہی تھی، میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے "آج اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا، معائنے کے بعد اُس نے کہا تمہارا دل ایک نوجوان کے دل کی طرح مضبوط ہے، میں نے کہا یہ بھی خوب دی، وقتِ پیری شباب کی باتیں!" بعض اوقات اپنی غلطی پہ ہنس دیتے "قیام کیمبرج کے دوران مجھے ایک سوٹ کی ضرورت پڑی سلے سلائے کپڑے ایک شوروم میں بکتے تھے دکان کے باہر لکھا تھا 'برٹن' میں نے اندر داخل ہوتے ہی کہا "گڈ مارننگ مسٹر برٹن" سیلزمین مسکرا دیا "جناب میں مسٹر برٹن نہیں ہوں، برٹن کی برطانیہ میں ساڑھے چھ سو شاخیں ہیں"۔ ایک اور موقع پر ہم ایک سربراہِ مملکت کے استقبال کے بعد ایئرپورٹ پر اپنی سواری کا انتظار کر رہے تھے لیکن جھنڈے والی گاڑیوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا، پروفیسر صاحب فرمانے لگے "توقف کیجئے، ابھی کارہائے نمایاں آرہی ہیں"۔

مولانا ابوالکلام آزاد خشک مزاجی کو یبوست کا نام دیتے ہیں لیکن سنجیدگی اور خشک مزاجی دو مختلف چیزیں ہیں، یہ صحیح ہے کہ انھیں غلط کاری اور ناحق بات برداشت کرنے کا یارا نہ تھا، ایسے موقع پہ چہرہ تمتما اٹھتا لیکن دوستوں کے لئے جو گرمجوشی اُن کے دل میں تھی وہ بھی کتاب کی مانند پڑھی جاسکتی تھی۔

یونیورسٹی ریزرو فنڈ کی رقم خطیر ایک ہی بنک میں جمع تھی جسے پالیسی کے تحت منتشر کرنا تھا، وائس چانسلر نے ایک کثیر رقم بذریعہ چیک نکلوانی چاہی لیکن متعلقہ بنک نے حریص ہونے کا ثبوت دیا اور چیک آنر نہ کیا حالانکہ ایسی حرکت کرنے کا کوئی جواز نہ تھا، سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں انہوں نے یہ قصہ سنایا، چہرے کے آتار چڑھاؤ سے ظاہر تھا کہ سینے میں طوفان بپا ہے، ایک اور میٹنگ میں انہوں نے بڑے غصے کے ساتھ ایک سربراہِ شعبہ کا ذکر کیا جس نے اپنے سرٹیفکیٹ پہ III ڈویژن کو II ڈویژن بنا کر یونیورسٹی کو دھوکا دیا تھا، اسی حمید احمد خان کا چہرہ مسرت سے جگمگا رہا تھا جب اُن سنایا یا کہ ایک قریبی دوست شیخ محمد اکرام کو علمی خدمات کے اعتراف میں یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملی، وہی کیفیت اُس وقت تھی جب ایک کتاب کی تعارفی تقریب میں ممتاز حسن صاحب کی دستار بندی ہوئی، حلقۂ یاراں میں حریر و پرنیاں، رزمِ حق و باطل میں شمشیرِ برہنہ

جامعہ عثمانیہ میں رسولِ پاکؐ کی سیرت پر ایک مضمون لکھ کر حمید احمد خان نے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا، ممتحن کو شک گزرا کہ ایک طالب علم ایسا مضمون نہیں لکھ سکتا، جستہ جستہ سوال کرنے کے بعد اُس کی تسلی ہوئی، علم و تحقیق کے میدان میں وہ جوانوں کا عزم اور شاہین کا تجسس رکھتے تھے، پچاس برس کی عمر میں کیمبرج سے ایم۔لٹ کی ڈگری حاصل کرنا اُسی کا کرشمہ تھا،

بقول شخصے وہ غالب شناس اور غالب دوست تھے، ایک ایک مصرع کی چھان پھٹک کے بعد انہوں نے تصحیح شدہ نسخۂ حمیدیہ کی طباعت کروائی، غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر مجلس یادگارِ غالب کے قیام کا سہرا بھی اُن کے سر ہے، مجلس کے

زیرِ اہتمام متنی صحت کے ساتھ غالبؔ کی جملہ تصنیفات کی اشاعت غالبیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ تنقید و تاثرات پر چار کتابیں اس پہ مستزاد ہیں۔ حمید احمد خان غالبؔ کے طرفدار، اقبالؔ کے گرویدہ، اُردو زبان کے عاشق اور نظریۂ پاکستان کے مجاہد تھے، ایک تقریر میں انہوں نے کہا تھا "غالبؔ ہماری ایک ہزار سالہ تہذیب کا نمائندہ اور اقبالؔ کا پیشرو تھا، اُس کی عظمت سے انکار کرنا اسلاف کو جھٹلانا اور اپنی تہذیب سے انکار کرنا ہے۔" وہ خوب سمجھتے تھے کہ ہماری تہذیب کا پاک و ہند کے اسلامی تمدن کے ساتھ کیا رشتہ ہے اور مسلمانانِ ہند کے عربی، فارسی اور علاقائی زبانوں میں لکھے ہوئے شاہکار محفوظ کرنے کی کیا اہمیت ہے شعبۂ تاریخ ادبیات کا انعقاد اسی جذبے کے تحت کیا گیا تھا۔

دریغا کہ کام و لب از کار ماند
سخن ہائے ناگفتہ بسیار ماند

ایک گوشہ

مُمتاز مفتی

کے بارے میں

لوک تماشا

ممتاز مفتی

باپ اور بیٹے کے باہمی تعلق میں دو رنگ ہوتے ہیں۔ لاگ اور لگاؤ۔ لگاؤ نمایاں ہوتا ہے لاگ ڈھکا چھپا یوں جیسے ابلے ہوئے انڈے میں زردی ہوتی ہے۔ لگاؤ میں وسعت ہوتی ہے لاگ میں گہرائی شدت۔ عکسی اور میرے تعلق میں لاگ میں بھی شدت ہے اور لگاؤ میں بھی۔ یہ شدت تصادم کی شدت نہیں بلکہ حالات کی پیدا کردہ شدت ہے۔

بہر حال یہ مضمون میں اس لئے نہیں لکھ رہا کہ عکسی کے عیب یا خوبیاں گنواؤں۔ اس لئے بھی نہیں کہ اپنی تحلیل نفسی کا رعب جماؤں۔ الٹا یہ مضمون تو بذات خود اظہار عجز ہے۔ تحلیل نفسی کا طالب علم ہونے کے باوجود میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ نفسیات کے کس اصول یا قانون کے تحت چھبیس سال کی عمر میں دفعتاً عکسی نے اپنی پرانی شخصیت کی کینچلی اتار پھینکی۔ ایسا کیوں ہوا کہ ایک رات پرانا عکسی معدوم ہو گیا اور ایک نیا عکسی ابھر آیا۔ اس واقعہ پر میں آج تک عالم حیرت میں ہوں اور یہ مضمون اسی حیرت کا اظہار ہے۔

ہمارے باہمی تعلقات کے خارجی رُخ کی کہانی بڑی مختصر ہے۔ پہلے لوگ عکسی کو جاننے کے لئے کہا کرتے تھے۔ "اچھا تو تم ممتاز مفتی کے بیٹے ہو۔" اب مجھے جاننے کے لئے پوچھتے ہیں۔ "اچھا تو یہ عکسی مفتی کے والد ہیں۔"

پہلی مرتبہ جب میں عکسی مفتی کے والد کے طور پر جانا گیا تو مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ ان دنوں عکسی گارڈن کالج میں لیکچرار تھا۔ کالج میں کوئی تقریب تھی اس تقریب کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ عکسی نے کہا۔ "ابو میرے ساتھ چلئے۔ ضروری ہے۔" کالج میں پرنسپل سے میرا تعارف کرایا گیا۔ ایک صاحب بولے۔ "یہ ممتاز مفتی ہیں۔" جب اس پر پرنسپل صاحب کے چہرے پر روشنی کی کوئی کرن نمودار نہ ہوئی تو دوسرے صاحب بولے۔ "آپ عکسی مفتی کے والد ہیں۔" اس پر پرنسپل صاحب مجھے بڑے تپاک سے ملے۔

تقریب کے اختتام پر میرے دو ایک دوست مل گئے اور ہم سب ایک ریستوران میں جا بیٹھے۔ برسبیل تذکرہ میں نے پرنسپل صاحب سے تعارف کا قصہ سنایا۔

اس پر عکسی بولا۔ "آج پہلی مرتبہ ابو کو عکسی کے والد کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا اور ان پر گراں گزر رہا ہے۔ میرا دل گردہ ملاحظہ ہو کہ پچیس سال سے سبھی کہتے ہیں کہ یہ ممتاز مفتی کا بیٹا ہے اور میں اسے برداشت کئے جا رہا ہوں۔"

یہ تو ۱۹۶۶ء کی بات تھی ۱۹۷۴ء کا یہ عالم ہے کہ وزیٹرز (ملاقاتی) مجھ سے کہتے ہیں۔ "جی آپ سے نہیں ہمیں مفتی صاحب سے ملنا ہے۔" اور مجھے خندہ پیشانی سے جواب دینا پڑتا ہے۔ "جی اس وقت مفتی صاحب گھر پر نہیں ہیں۔" میرے بے تکلف

دوست مجھے فون کرتے ہیں تو کہتے ہیں "بھئی ہمیں جعلی مفتی سے بات کرنا ہے اصلی سے نہیں۔"

۱۹۶۲ء میں میں نے علی پور کا ایلی عکسی کے نام ان الفاظ میں معنون کی تھی "اپنے بیٹے، دوست اور ساتھی عکسی مفتی کے نام"۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم دوست تھے ساتھی تھے۔ تب مجھے علم نہ تھا کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جب ہم اجنبی ہو جائیں گے۔

چھبیس سال ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے زندگی کے راستے پر جوتے چٹخاتے پھرے۔ رسمی قیود سے بے نیاز تکلف اور دکھلاوے سے آزاد لیکن آج —— آج ہم ایک دوسرے کے سامنے یوں کھڑے ہیں جیسے دو اجنبی ہوں ہماری شخصیتوں کے رنگ جدا ہیں ہمارے خیالات مختلف ہیں۔ ہمارے رخ متضاد ہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ صرف وہی ایک واقعہ ہے جو ۱۹۶۷ء میں وقوع پذیر ہوا۔ اور جسکی نوعیت میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ یہ کایا پلٹ تبدیلی تتلی جیسی نہیں تھی۔ تتلی کی کایا پلٹ میں تو سنڈی پر چھولدار پر اُگ آتے ہیں۔ عکسی کی کایا پلٹ تو تخیلی پرندے دیپک کی سی تھی جو بہار میں دیپک راگ الاپتا ہے۔ جس کے اگنی سروں سے اس کے پروں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ جل کر خاک ہو جاتا ہے پھر اس کے خاکستر سے ایک نیا دیپک پیدا ہوتا ہے۔

معلوم نہیں کس نے نوازنے دیپک چھیڑا تھا اور اس کے اثرات عکسی پر مرکوز ہوئے۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ اس روز پرانا عکسی معدوم ہو گیا تھا اور ایک نیا اجنبی عکسی وجود میں آ گیا تھا۔

سائنس صرف تدریجی کایا پلٹ کو مانتی ہے۔ فوری کو نہیں۔ شاید پارا سائیکالوجی مانتی ہو لیکن فی الحال ہم پارا سائیکالوجی کو نہیں مانتے لہٰذا یہ بات ابھی تک میرے لئے معمہ ہے۔

شخصیت بذات خود ایک معمہ ہے جسے نفسیات حل نہیں کر سکی جو سائنسی اصولوں کے احاطے میں نہیں آ سکا۔

شخصیت بنیادی طور پر تفاوات کا مجموعہ ہے جیسے گدڑی ہوتی ہے جس پر رنگ رنگ اور طرح طرح کے پیوند لگے ہوتے ہیں یہ سرخ ہے، وہ کالا ہے، یہ گاڑھا ہے وہ ریشم ہے شخصیت پرائمری سکول کے بچے کی جیب کے مصداق ہوتی ہے جس میں چاک ہوتا ہے چھلے ہوتے ہیں۔ گھڑی کی ٹوٹی ہوئی کمانی ہوتی ہے نیل پالش کی خالی شیشی ہوتی ہے اور شوخ رنگوں والے بٹنے ہوتے ہیں۔

بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی جیب میں سوراخ ہونے کی وجہ سے جیب کی دو ایک چیزیں پھسل کر کوٹ کے اندر سے جا گرتی ہیں جنھیں ڈھونڈ نکالنا مشکل ہوتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ شخصیت میں رنگ رنگ کی چیزیں آتی کہاں سے ہیں۔ اور وہ اُلٹی سیدھی کیوں ہوتی ہیں۔ گھوڑے کے پاؤں۔ اونٹ کا سر چڑیا کا جسم چوہے کی دم۔ پھر تعجب کی بات ہے کہ شخصیت کا مالک دیکھنے میں عجیب الخلقت نظر نہیں آتا۔

آج کے عکسی میں اک مست قلندر ہے اک بے داغ انگریز ہے۔ ان دنوں کا انگریز جب سورج نے سلطنت برطانیہ پر غروب نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی ایک "ماڈ" مداری ہے۔ ایک بودھ بھکشو ہے ایک علم خور فلسفی ہے اور سب سے بڑھ کر ایک لوک دیوانہ ہے جس نے اسے گامی بنا رکھا ہے۔ اس حد تک گامی کہ وہ لوک تماشہ بن کر رہ گیا ہے۔

ایسی شخصیت سے آپ کیا رابطہ پیدا کر سکتے ہیں۔ مست قلندر سے بات کرو تو روبرو انگریز کھڑا گھور رہا ہوتا ہے ماڈ مداری سے

بات کرو تو غم خور فلسفی جواب دیتا ہے۔ بدمعاشوں سے بات کرو تو کیا دیکھتے ہیں آپ کہ دیوانے کامی نے اُسے اَن سنی کر دیا ہے۔

دیوانہ کامی آج کے عکسی کی شخصیت کا جزوِ اعظم ہے۔ وہ اس کے سر پہ یوں سوار ہے۔ جیسے سرمایہ دار کے سر پہ منافع کی ہوس سوار رہتی ہے۔

اگر دیوانے کامی کا عنصر حاوی نہ ہوتا تو عکسی انگریز، مداری، فلسفی اور قلندر کے ہاتھوں یوں پٹ جاتا جیسے ٹینس کورٹ پہ ربڑ کا گیند ڈبلز کے ہاتھوں پٹ جاتا ہے۔

اس دیوانے کامی کی وجہ سے وہ گھر میں ہمارے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ نہیں ہوتا مثلاً وہ مجھ سے کہتا ہے۔

"ابو میں اپنے کام سے اُدھر جا رہا ہوں اگر آپ کو کوئی سکرپٹ بھیجنا ہو تو دے دیجیے۔"

چند ساعت کے بعد جب میں سکرپٹ لے کر باہر آتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تو چلا بھی گیا۔

اکثر وہ اپنی بیوی سے پوچھا کرتا ہے "ممی میں ناشتہ کر چکا ہوں کیا؟"

کھانے کی میز پر کسی سے سن کر کہ نمک کم ہے وہ چونک کر کہتا ہے "اچھا تو نمک کم ہے میں بھی سوچ رہا تھا کہ بات کیا ہے۔ کھانے میں ذائقہ کیوں نہیں"

اسی دیوانے کامی کی وجہ سے اس کی گھر میں ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو پاتی۔ گھر میں وہ ایسے پرزے کی مصداق ہے جو کہیں فٹ نہیں بیٹھتا اور گھر اس کے لئے یوں ہے جیسے ریلوے سٹیشن کا ویٹنگ روم ہو جہاں وہ بیٹھا کوک گاڑی کا انتظار کر رہا ہو۔

عکسی کو گھر کے کام سے سخت چڑ ہے۔ وہ حتی الوسع گھر کا کام نہیں کرتا۔ اس کی دانست میں گھر ایک چھکڑا ہے جو مرد کے پیچھے اس لئے باندھ دیا گیا ہے کہ وہ زندگی بھر ہاتھی کی طرح قدم قدم رینگتا رہے اور پرواز کی اہلیت کھو بیٹھے شادی سے پہلے وہ اکثر کہا کرتا تھا میں اس لڑکی سے بیاہ کروں گا جو مجھ سے وعدہ کرے کہ وہ مجھے گھر کا کام کرنے کے لیے نہیں کہے گی۔

صرف کام ہی نہیں۔ گھر اس کی توجہ کے مرکز میں نہیں آتا۔ مرکز میں لانا ہو تو اس کے لئے کرائسس کا عالم پیدا کرنا ضروری ہے۔ کوئی بیماری۔ کوئی ہنگامہ۔ کوئی جھگڑا۔ کوئی فتنہ۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے گھر کے لوگوں سے لگاؤ نہیں۔ وقت یہ ہے کہ وہ لگاؤ کو راستے کی رکاوٹ سمجھتا ہے شعوری طور اظہارِ جذبہ سے گریز کرتا ہے اور مسلسل اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہونے نہ پائے کہ اسے اظہار کرنا پڑے۔

مثلاً وہ اپنے بیٹے انس سے پیار کرتا ہے۔ اس حد تک پیار کرتا ہے کہ جب انس ماں پہ توجہ مرکوز کر لیتا ہے تو عکسی جل کے کباب ہو جاتا ہے اس کے باوجود اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طلب توجہ کے لیے اُنس عکسی کا دامن تھام لیتا ہے مگر عکسی کام کی دیوانگی میں اس حد تک کھویا ہوتا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں لگتا کہ کسی نے دامن تھاما ہوا ہے اس وقت وہ اپنا اپنا دامن یوں چھڑا لیتا ہے جیسے کانٹا لگا ہو۔

ویسے فرصت ملے تو وہ اَنس سے کھیلتا ہے لیکن فرصت ملے بھی۔ کام ہو تو فرصت نہیں ہوتی کام نہ ہو۔ تو کام نہ ہونے کا غم ہوتا ہے کام حاصل کرنے کی تڑپ ہوتی ہے ایسے میں فراغت کہاں۔

اپنی دانست میں وہ اپنی بیوی تہمینہ کا بہت خیال رکھتا ہے۔ لیکن خیال رکھنا جبھی ممکن ہے جب رکھنے کو خیال ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ تہمینہ ایک اکیلی اور تنہا لڑکی ہے۔ اُدھر تہمینہ بھی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں۔ وہ بہت تیز اور ذہین ہے اپنے تحفظ اور تسلی کے لئے اس نے ایک ہاتھ سے تالی بجانا سیکھ لیا ہے۔

گھر کے دوسرے لوگ بہنیں اور اسی عکسی کے لئے یوں ہیں جیسے تھیٹر کی سٹیج کی سائڈز میں چھپے ہوئے کردار ہوں کبھی کبھار از راہ اتفاق یہ لوگ عکسی کی توجہ کے مرکز میں آجاتے ہیں تو وہ چونک اٹھتا ہے " ہائیں یہ بھی ہیں کیا؟" پھر احساس ندامت کی وجہ سے وہ ان لوگوں کو بہلانے کی شدید کوشش کرتا ہے۔

گھر میں صرف ایک شخص ہے۔ باپ۔ جس کے وجود سے عکسی آج تک بے نیاز نہیں ہو سکا باپ کے لئے اس کے دل میں عظیم جذبہ ہے۔ وہ اکثر اپنے باپ سے کہا کرتا ہے۔ باپو آپ کی محبت میرے لئے راب ہے اور میں اس لت پت کے عالم سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔

جذباتی لت پت سے عکسی بہت خائف ہے یہ خوف بذات خود اس حقیقت کا غماز ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں لت پت کا لاوا کھول رہا ہے جسے دبائے رکھنے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں مصروف رہتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ گھر میں رہتے ہوئے بھی عکسی گھر میں نہیں ہوتا۔ یہ غیر حاضری گھر والوں کے لئے مایوس کن سہی لیکن عکسی کے لئے دفاعی خود کا کام دیتی ہے۔ دفتر کے نامساعد حالات چٹکیاں نہیں بھرتے۔ ورنہ اس کے جسم پر جا بجا نیل پڑے ہوتے۔

اس کا می کی دیوانگی فوک لور پر مرکوز ہے۔

عکسی کی سب سے بڑی خوشی اس بات میں ہے کہ فوک لور کا کوئی ایسا پراجکٹ اپنے ذمے لے جو آسان نہیں بلکہ کٹھن ہو۔ اس حد تک کٹھن کہ اس کے بس کی بات نہ ہو۔ ایسا کام مل جائے تو اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ آ ہا ہا ہا۔ ساتھ ہی دل میں گھبراہٹ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید میں اسے نباہ نہ سکوں۔ اب کیا ہوگا۔ کیا مصیبت ہے پھر یہ آ ہا ہا۔ اور۔ کیا مصیبت ہے دونوں مل کر رقص کرتے ہیں ایک ڈرتت ئے میں دوسرا بلمپت میں اس تضاد سے اس کے قدم اکھڑے رہتے ہیں۔ کیفیت متذبذب۔

اس وقت عکسی کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسی پھپھولاں رانی ہوا کرتی تھی۔ جو ایک آنکھ سے ہنستی تھی دوسری سے روتی تھی۔ ایک آنکھ سے پھول جھڑتے تھے دوسری سے موتی۔

عکسی بیک وقت روتا ہنستا ضرور ہے پر نہ پھول جھڑتے ہیں نہ موتی گرتے ہیں۔ جب وہ کام اپنے ذمے لے لیتا ہے تو آنکھیں ملفوف ہو جاتی ہیں دیکھتی ہیں پر نہیں دیکھتیں۔ کان سنتے ہیں پر نہیں سنتے صرف وہی بات سنتے ہیں جو کام سے متعلق ہو۔ ذہن صرف اسی بات کو توجہ میں لاتا ہے جو محبوب سے متعلق ہو۔

جب تک کام چلتا رہے عکسی اس کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے۔ کام کے متعلق اس کا اصول ہے کہ اگر دوڑنے سے گزارہ ہو جائے تو چلنے کی کیا ضرورت ہے جب کام ختم ہو جائے تو وہ تھکاوٹ سے چور چور ہو کر دھڑام سے گر پڑتا ہے۔ اس کے اعضا یوں ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں جیسے پلاسٹک کے منکے میں پرویا ہوا الاسٹک کا دھاگا ٹوٹ گیا ہو۔ پھر وہ لاشں کی طرح پڑا رہتا ہے " باپو ہمت نہیں رہی

جان نہیں۔ ہی کچھ بھی نہیں رہا۔"

اس وقت اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے کسی غرق شدہ کشتی کا وہ مسافر جسے سمندر میں ڈبکیاں کھانے کے بعد کوئی بہتا ہوا لکڑی کا تختہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ جو تھکا ہارا تختے سے چمٹا ہوا سمندر میں خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہا ہو بہے جا رہا ہو۔

لیکن اس تھکاوٹ کے باوجود چوری چھپے اس کی نگاہیں کسی خفیہ منزل کی طلب سے سرشار رہتی ہیں۔ پھر دفعتاً عکسی چیخ مار کر کہتا ہے۔ جزیرہ جزیرہ وہ۔ وہ۔ اور جزیرہ کیا ہوتا ہے۔ کوئی نیا کام پہلے سے بڑھ کر کٹھن پہلے سے بڑھ کر بس سے باہر۔

اگر طالب اور مطلوب کے درمیان مشکلات حائل نہ ہوں تو طلب کا وجود ہی باقی نہ رہے شاید اسی لئے عکسی کی جملہ مشکلات کام کے بارے میں ہیں۔ اس کے ہم کار یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ کام کرے۔ وہ چاہتے ہیں کہ حسب دستور وہ کرسی پر بیٹھے افسری کرے۔ عہدہ بڑھانے کی جد و جہد کرتے تنخواہ بڑھانے کی تجاویز سوچے بات بھی درست ہے۔ عکسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ دیوانہ وار کام کر کے دوسروں کی پوزیشن خراب کرے۔

میں نے ساری عمر دفتر کے دشت کی بادیہ پیمائی کی ہے اور عقل و خرد کے موتی چنے ہیں۔ ویسے تو اصولاً میں ان موتیوں کو نگاہِ غیر سے چھپائے پھرتا ہوں لیکن آپ سے کیا پردہ ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ کام کرنے کی چیز نہیں وہ تو ٹکائے رکھنے کی چیز ہے جس طرح دلہن ماتھے پر جھومر ٹکائے رکھتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کام کرنا لازم ہو جائے تو کاغذ پر کرو۔ کاغذ پر فروغِ فن کا ادارہ بناؤ۔ کاغذ پر کارہائے نمایاں کرو، تعمیر کرو، تخلیق کرو لیکن خبردار یہ وہ کاغذ سے نیچے قدم رکھنے نہ پائیں۔

تیسری بات یہ کہ جو کام کل ہو سکتا ہے وہ آج کیوں کیا جائے ———— اور جو کام کل ہو سکتا ہے وہ پرسوں بھی ہو سکتا ہے دس دن کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ پھر جلدی کیوں؟

پہلے میری عقل و دانش کا بڑا رعب تھا لیکن جب سے عکسی کے سر کام کا بھوت سوار ہوا ہے یار لوگ مجھ پر ہنستے ہیں کہتے ہیں جب ساتھ بیٹھے پر اثر نہ ڈال سکا تو دوسروں کے سامنے عقل و خرد کا زعم کس برتے پر!

ہر باپ اپنی زندگی میں چند ایک امریکا میں دریافت کرتا ہے پھر وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوتا ہے "بیٹا میں نے بہت خوار ہو کر فلاں امریکا دریافت کی ہے۔ اگر تو اسے اپنے پلے باندھ لے تو ———— لیکن کسی بیٹے نے آج تک باپ کی دریافت کی ہوئی امریکہ کو پلے نہیں باندھا وہ امریکہ کو از خود دریافت کرنے پر مصر ہے چاہے اس میں کتنی ہی ذلت و خواری برداشت کرنی پڑے۔

مجھے یاد ہے میرے والد صاحب نے ہی مجھے عقل و خرد کے موتیوں سے نوازنے کی کوشش کی تھی۔ ایک روز مجھے پاس بٹھا کر کمال شفقت سے کہنے لگے بیٹا بے شک سچائی بڑی اعلیٰ و ارفع چیز ہے لیکن اعلیٰ ارفع چیز ہر زید، بکر کے سامنے رکھنے والی نہیں ہوتی لہٰذا بیٹے حتی الوسع سچ نہ بولنا۔

اور بیٹے میں نے اپنی ساری زندگی عورت کو جاننے کی مسلسل کوشش میں صرف کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ظاہری تنوع پیدا کرنے والے اوصاف، حسن، عشوہ، ادا، لبھاہٹ، شرم حیا سب فریب نظر ہیں اندر سے وہ سب ایک سی ہوتی ہیں۔

والد کی بات سن کر میرے دل میں خیال آیا کہ بڑے میاں بڑے رند ہیں کس چالاکی سے مجھے اس نشاط باغ میں چہل قدمی سے محروم کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

سیانے کہتے ہیں کہ شخصیت کو تربیت سے گہرا تعلق ہے ہوگا۔ میرے تجربے میں نہیں آیا۔ میرے والد نے میری شخصیت کو اپنا رنگ دینا چاہا۔ شاید اسی لئے میری شخصیت میں متضاد رنگ ابھر آئے۔ میں نے عکسی کو اپنے رنگ میں ڈھالنا چاہا لیکن ـــــــ میری دانست میں تو تربیت ہمارے گھر کے بیک یارڈ کی کیاری کے مصداق ہے۔ مولی بیجو تو بیج پھوٹتے ہیں۔ پتے نکلتے ہیں ڈنٹھل بنتے ہیں لیکن نیچے مولی نہیں بنتی۔ گوبھی بیجو تو ڈنٹھل نکلتے ہیں۔ پتے پھوٹتے ہیں بڑھتے ہیں۔ بڑھ کر کٹورہ سا بن جاتے ہیں لیکن کٹورہ خالی ہی رہتا ہے اس میں گوبھی کا پھول نہیں بنتا۔ زراعت والے کہتے ہیں اس زمین کا مزاج ہی ایسا ہے۔ میں نے عکسی میں وہ وہ اوصاف بوئے جو میری دانست میں دنیاوی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ نہ جانے زمین کے مزاج کی وجہ سے یا کیوں میں نے مولی بوئی تو گاجر پھوٹ نکلی بینگن بوئے تو کدو اگ آیا پیاز بوئی تو اس میں سے لہسن کی تریاں نکلیں ۔ تربیت کی بات چھوڑئیے وہ تو ایک مصنوعی چیز ہے۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ عملی طور پر کرکے دکھاؤ۔

کہتے ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ میں نے زندگی بھر کئی ایک محبتیں کیں مگر خربوزے نے رنگ نہ پکڑا۔ عکسی نے کسی لڑکی سے محبت نہیں کی۔ نوجوانی میں وہ لڑکیوں میں دلچسپی لیتا تھا لیکن اب ۔ اب وہ ان سے خائف ہے اگرچہ یہ خوف بذاتِ خود دلچسپی کا ایک روپ ہے بہر حال نوجوانی میں اس نے عورت کو محبوب نہیں مانا یہ مسئلہ بھی دلچسپ اور قابل تحقیق ہے کہ عورت کی جانب مرد کا رخ پشت بہ پشت کس طرح بدلتا ہے۔

عکسی کا پردادا عورت کا پجاری تھا اگرچہ اس نے تپسیا کے لئے ایک نمائندہ عورت کو چن لیا تھا عکسی کے دادا نے عورت کو صرف ایک رنگین چھیڑ چھاڑ کا درجہ دیا۔ والد نے چھیڑ چھاڑ اور پوجا کا امتزاج بنا دیا۔ ایسا امتزاج جس میں پوجا کا عنصر حاوی تھا عکسی نے ایک منفرد رخ اختیار کیا جس میں نہ تو پوجا تھی اور نہ چھیڑ چھاڑ۔ اس نے عورت کو ایک ساتھی سمجھا۔

نوجوانی میں عکسی نے کئی ایک سنگتیں کیں۔ آزمانے کے لئے۔ دیکھوں اس میں ساتھی پن کی کتنی صلاحیت ہے۔ اسے کئی ایک قربتیں حاصل ہوئیں لیکن کوئی قرب حاصل نہ ہوا۔

نسائیت کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ عورت بنیادی طور پر ساتھی کی متلاشی ہوتی ہے لیکن اگر روکھے ساتھ کے تسلسل کی دھار بندھ جائے تو اسے سخت دھچکا لگتا ہے۔

اگر بھکاری بن کر دست سوال دراز کرو تو وہ اپنا پرس الماری میں رکھ کر مقفل کر دیتی ہے بھکاری نہ بنو تو اسے غصہ آنے لگتا ہے پھر وہ پرس کو تمہارے سامنے یوں جھلاتی ہے جیسے وہ جھنجھنا ہو۔ پھر بھی دستِ سوال دراز نہ کرو تو وہ چڑ جاتی ہے۔ وہ چند ایک لڑکیاں جو نوجوانی میں عکسی کے قریب آئیں مدھی اور مسلسل سنگت ہی سنگت کو دیکھ کر بوکھلا گئیں پھر پرس جھلائے گئے۔ ہونٹ بٹوہ بنائے گئے۔ بوجھل پلکیں جھک جھک گئیں۔ آنکھیں کشتی کی طرح ڈولیں لیکن وہ احمق لڑکا میٹھا ساتھ پن کی مالا جپتا رہا۔ اسے علم نہ تھا کہ دست سوال دراز نہ ہونے کو عورت اپنی توہین سمجھتی ہے۔ عورت کی اہمیت کا انحصار اسی بات پر ہے کہ دستِ سوال دراز ہو۔ چاہے دستِ

سوال منہ زبانی ہی رہے۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ گمان قائم رہے کہ بھکاری دکشنا کو اہمیت دیتا ہے۔

ہاں تو عکسی ساتھ پن کی مالا جپتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا قربتیں فاصلوں میں بدل گئیں فاصلے نفرتوں سے بھر گئے۔ پھر چاروں طرف سے آوازے اُٹھے۔ بڑا اوہ جی عکسی تو فلرٹ ہے۔

پرانے زمانے میں فلرٹ کا مطلب تھا کہ شادی کرنے کے خیال کے بغیر رنگین وقت کٹی کرنا اب یہ مفہوم ہے کہ دست سوال دراز کرنے کے بغیر خالی چھیڑ چھاڑ!

ہاں تو اتنے طویل قرب کے باوجود ہم دونوں اجنبی کیسے بن گئے اس حد تک اجنبی کہ ہماری شخصیتوں کے رنگ جدا جدا ہیں خیالات ایک دوسرے کی ضد ہیں محسوسات مختلف ہیں۔ مثلاً میں غصہ کھاتا ہوں وہ سمجھتا ہے کہ غصہ پینے کی چیز ہے۔ میں بات کہہ دینے کا قائل ہوں چونکہ میرا خیال ہے کہ بات کہہ دینا خلوص کا مظہر ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ بات کہہ دینا اچھا وصف نہیں بلکہ جذباتیت کی نشانی ہے اور جذباتیت خوبی نہیں

میں مافوق الفطرت کو مانتا ہوں اس کا کہنا ہے کہ مافوق الفطرت چاہے حقیقت ہی کیوں نہ ہو وہ اس قابل نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے میں روح کو مانتا ہوں۔ وہ کہتا ہے روح بھی مادے کی ایک لطیف شکل ہے۔

مجھے ادب سے دلچسپی ہے اس کا ایمان ہے کہ ہمارا ادب حقائق سے گریز سکھاتا ہے۔ ہمارا ادب جذبات کا جھنجھنا ہے اور ادیب اس جھنجھنے کو بجا بجا کر دل خوش کرتے رہتے ہیں۔

میں پیر پرست ہوں وہ خدا پرست ہے۔ میرا خدا ایک ڈکٹیٹر ہے اس کا خدا ایک آٹومیٹزم ہے۔ میں جذبات پرست ہوں وہ جذبات کو خود فریبی کی راہ فرار سمجھتا ہے۔

میں چائے کا متوالا ہوں وہ چائے سے گریز کرتا ہے مجھے مرچ سے رغبت ہے اس کے نزدیک مرچ زہر ہے۔ میں لباس کو اہمیت نہیں دیتا وہ لباس کو اہم سمجھتا ہے مجھے انگریزیت سے نفرت ہے۔ وہ انگریزیت کو پسند کرتا ہے میں سائنس سے مایوس ہوں اس کا ایمان ہے کہ سائنس ہی ایک واحد معبد ہے چونکہ وہ دورِ حاضر کی زبان ہے۔

میں عقیدت پرست ہوں وہ عقیدہ پرست ہے میں مذہب کو جذبہ سمجھتا ہوں وہ اسے اوراک سمجھتا ہے۔

ایسا کیوں ہوا۔ پچیس سال ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے والے دو افراد ایک دوسرے سے اس قدر دور کیسے جا پہنچے اجنبی کیسے بن گئے ہیں تو نہیں سمجھ سکا شاید آپ سمجھ سکیں خاصی طویل داستان ہے۔

بچپن میں عکسی ایک گول مٹول بچہ تھا جب وہ مدرسے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر ذہانت یا شرارت کی کوئی کرن نہ تھی۔ چہرہ گونگا۔ انداز بے حس۔ اکتاہٹ بھرا۔ کھیلنے کودنے کا شوق نہ تھا کھیل کود سے دلچسپی نہ تھی۔ ساتھی بننے یا بنانے کی نہ تو خواہش تھی اور نہ صلاحیت وہ ایک اکیلا بچہ تھا۔ اکیلا گونگا اور بے جان جب وہ تین سال کا ہوا تو نہ جانے کیوں۔ اس کا باپ گھر چھوڑ کر چلا گیا جب وہ چار سال کا ہوا تو امی اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر باپ واپس آ گیا۔ اسے سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کبھی باپ چھوڑ کر چلا جاتا ہے کبھی امی۔ اسے گردوپیش پر اعتماد نہ رہا۔ اپنے باپ پر اعتماد نہ رہا کہ کب اسے چھوڑ کر چلا جائے۔ اس کے دل میں ڈر پیدا ہو گیا۔

پھر عکسی اور اس کا باپ دونوں کے لئے رہ گئے یوں اکیلے جیسے کوئی والی وارث نہ ہو۔ وہ دونوں اکٹھے سوتے تھے اکٹھے جاگتے تھے۔ اکٹھے باتھ روم جاتے تھے۔ اکٹھے مدرسے جاتے تھے اس کا باپ سکول ماسٹر تھا۔ جب وہ جماعت کو سبق دیتا تھا تو عکسی دیوار سے لگ کر کھڑا رہتا۔ انتظار کرتا کہ کب ابا فارغ ہو۔ کب واپس آئے کہیں اسے چھوڑ کر چلا نہ جائے جب باپ سٹاف روم میں دوسرے اساتذہ کے پاس بیٹھا ہوتا تو عکسی کسی کونے میں دبک کر بیٹھ رہتا۔

وہ دونوں اکیلے رہتے تھے نہ دوست نہ رشتہ دار نہ ساتھی۔ عکسی کو علم نہ تھا کہ یہ تنہائی باپ کے مکافاتِ عمل کا نتیجہ ہے۔

شاید اس تنہائی بے اعتمادی اور بے نام خوف کی وجہ سے عکسی گونگا اور بے جان ہو گیا ہو۔

پھر وہ تنہائی ٹوٹی تو ایک امی گھر آ گئی۔ یہ امی وہ امی تو نہ تھی۔ یہ تو ایک نئی امی تھی۔ وہ امی گھبرا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی بہنیں ہو گئیں اور گھر گھر بن گیا۔

جس گھر میں عکسی پرورش پا رہا تھا۔ وہاں کتابیں تھیں کاغذ تھے پنسلیں تھیں غربت تھی موسیقی تھی۔ آزادی تھی مادر پدر آزاد آزادی باپ منشی تھا۔ ہر وقت لکھتا رہتا تھا اور جب بھی لکھتا ساتھ ریڈیو پر گانے لگا لیتا۔ چونکہ موسیقی کے بغیر وہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ کام ختم ہوتا تو وہ کتاب کھول کر پڑھنے لگتا۔ دوست آ جاتے تو بولنے لگتا پھر بولتا ہی چلا جاتا۔

غربت کی وجہ سے موسیقی کا واحد ذریعہ ریڈیو تھا۔ ریڈیو پر وہ ایسا سٹیشن تلاش کیا کرتا جہاں شدھ راگ ہو رہا ہو۔ اگرچہ شدھ راگ کی سوجھ بوجھ نہ تھی۔ نہ سر کی نہ تال کی لیکن شدھ راگ سن کر اس کے دل میں کچھ کچھ ہوتا تھا اور یہ کچھ کچھ تخلیق میں مدد کرتا تھا۔

عکسی کو شدھ راگ سے بیر تھا اس لئے جب بھی موقعہ ملتا وہ سوئی گھما کر فلمی موسیقی لگا دیتا۔

پھر ایک روز ایک عجیب واقعہ عمل میں آیا۔ باپ بیٹھا کام کر رہا تھا۔ ریڈیو چل رہا تھا لیکن ریڈیو پر شدھ کی بجائے فلمی گیت ہو رہے تھے۔ عکسی آیا اور اس نے سوئی گھما کر شدھ راگ لگا دیا۔ باپ چونکا۔ اس نے بیٹے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ عکسی کے چہرے پر بیداری کی پہلی کرن ناچ رہی تھی۔ پھر بھی باپ نے اسے اہمیت نہ دی وہ سمجھا کہ شاید مجھے خوش کرنے کے لئے پکا گانا لگایا ہے۔

پھر عکسی کی چھوٹی بہن سویرا نے شکایت کی کہنے لگی بھائی مجھے فلمی گیت سننے نہیں دیتے باپ نے عکسی سے پوچھا۔ تم سویرا کو فلمی گیت سننے کیوں نہیں دیتے۔ عکسی غصے میں بولا۔ اُسے شدھ گانا اچھا کیوں نہیں لگتا۔ اس کے چہرے پر بیداری کی وہ اولین کرن بالکل ہی نمایاں ہو گئی تھی۔

پھر میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ کراچی میں ویلیج ایڈ کا دفتر تھا جہاں عکسی اور میں دن کا بیشتر حصہ گزارتے تھے اس دفتر میں سازتھے فلم تھے۔ پروجیکٹر تھے کیمرے تھے حفیظ جالندھری تھے۔ ٹیپ ریکارڈرز تھے۔ احمد بشیر تھا۔ جو شومین شپ۔ پارچہ فروشی۔ گدھا گاڑی بانی۔ صحافت۔ کلرکی اور ریڈیو نویسی سے گھوم پھر کر اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ دفتر میں ابن انشا تھا جو ابھی پورے طور پر ابن انشا نہ بنا تھا ابھی اس میں شیر محمد کا رنگ تھا۔ ابھی اس کا مزاج دکھ کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ ابھی وہ آوارہ گرد نہیں بنا تھا اس کے اندر کا کالمسٹ ابھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں وہ صرف شاعر تھا۔ شاعر نگیں تو نہیں بلکہ سادھو شاعر۔ وہ جنون جس نے اسے شاعر بنایا تھا ان دنوں پورے جوبن پر تھا۔ ان دنوں وہ سمجھتا تھا کہ وصال "تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نہیں او دسنا" کی کیفیت کا نام ہے

ان کے علاوہ دفتر میں عنایت خان نثار نواز تھا اور نادر خان تھا جو بعد میں پیارا رنگ بن گیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ دفتر میں عکسی اور میرے لیے گیت تھے ٹھمریاں تھیں۔ حفیظ جالندھریاں تھیں۔ فلمی تصویریں تھیں ابنِ انشائیاں تھیں احمد بشیریاں تھیں قہقہے تھے اور پھر باتیں ہی باتیں باتیں ہی باتیں ۔

دفتر کے باہر قیصر تھا جو عکسی اور میرا واحد دوست تھا قیصر ایک لنڈورا ہی تھا جو دن بھر امریکی سفارت خانے میں دیوانوں کی طرح کام کرتا اور رات سے باہر نکل کر کافی ہاؤس کے ایک کونے میں جا بیٹھتا پھر سگرٹ کافی سگرٹ کافی ۔ سگرٹ سے سگرٹ سلگاتا۔ پیالے پہ پیالہ کافی پیتا اور بالآخر آدھی رات کے وقت کہیں جاکر ڈھیر ہو جاتا ۔

کراچی پہنچ کر ہم نے قیصر کو کافی ہاؤس کے کونے سے نکال لیا ۔ اس پہ قیصر نے ہم سے انتقام لیا۔ اس نے ہم دونوں کو کراچی کے لنڈورے سے بنا دیا۔ ہم تینوں کیفے ٹیریا میں جائے پیتے بازاروں میں گنڈیریاں چوستے شالوں پر کھڑے ہو کر چاٹ کھاتے۔ کھوکھوں سے تکے کباب کھاتے اور گھٹیا فلم دیکھتے ۔

عکسی کا کوئی اپنا دوست نہ تھا۔ لہذا وہ میرے دوستوں کے حلقے میں ہی رہا کرتا تھا۔ میرے دوستوں سے اس کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ اسے دوست سمجھا جائے دوست کا بیٹا نہیں۔ اس سے ایسا سلوک نہ کیا جائے جیسا بڑے چھوٹوں سے کرتے ہیں۔ وہ بڑے چھوٹے کے امتیاز کے سخت خلاف تھا۔ احمد بشیر اور عکسی پرانے دوست تھے۔ وہ دونوں ۱۹۴۵ء سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ احمد بشیر نے عرصہ دراز سے اسے مساوی حقوق دے رکھے تھے۔ احمد بشیر خود مار گزیدہ تھا اس کے والد نے اسے کبھی برابری کا درجہ نہ دیا تھا۔ ابنِ انشا نے عکسی کو بحیثیت فرد تسلیم کر لیا۔ قیصر عکسی کا پرانا ساتھی تھا۔ رہے حفیظ جالندھری تو حفیظ نے تو عکسی کے باپ کو بھی برابری کا درجہ نہیں دیا تھا۔ باقی رہے شہاب اور اشفاق ۔

کراچی میں اشفاق کی وجہ سے میں شہاب سے متعارف ہوا تھا۔ ابھی تعلقات ابتدائی منازل میں تھے۔ ویسے شہاب کی سرشت ایسی ہے کہ وہ اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے دوسرے کو چھوٹا نہیں سمجھتے۔ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ وہ تو چھوٹے کو سمجھتے ہی نہیں۔ گنتے ہی نہیں۔ اشفاق اندر سے پیدائشی چودھری ہے۔ وہ کسی کو برابر کا نہیں سمجھتا۔ وہ تو بورے پہ بیٹھ کر بھی چوکی پہ بیٹھا رہتا ہے۔ عکسی کو برابری کا درجہ دینے کے باوجود اس کا انداز مربیانہ تھا۔ کراچی میں عکسی نے صرف ابن انشا احمد بشیر اور قیصر کو اپنایا۔ یوں وہ میرے حلقہ احباب میں بیٹھ بیٹھ کر جوان ہونے سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا ۔

ہاں تو میں یہ کراچی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کی بات کر رہا تھا۔ جب ہم آوارہ گردی کرتے کرتے تھک جاتے تو احمد بشیر کے گھر جا بیٹھتے ۔

احمد بشیر کا گھر گویا گاؤں کا دارا بھی تھا اور شہر کا کلب بھی ، مسافر خانہ بھی تھا۔ راگ رنگ کا چوبارہ بھی۔ وہاں ہر وقت منڈلی لگی رہتی تھی۔ احمد بشیر کی مالکن اس کی بیوی مودی پیارا رنگ سے موسیقی سیکھتی تھی۔ سبق ختم کرنے کے بعد پیارا رنگ محفل موسیقی لگا کر بیٹھ جاتے وہ گاتے اور ہم سب آدھی آدھی رات تک بیٹھے سنتے عکسی بھی ان محفلوں میں سر جھکائے بیٹھا رہتا ایک روز محفل کے دوران طبلچی بازار سے سگرٹ خریدنے چلا گیا۔ پہلے تو پیارا رنگ طبلے کے بغیر ہی گاتے رہے پھر عکسی نے لپک کر جوڑی اپنے سامنے رکھ لی اور ازخود تین

تال بجانی شروع کر دی۔ خالی تالی گر سب کچھ اس پر محفل میں حیرانی کی رو دوڑ گئی چونکہ اس سے پہلے عکسی نے کبھی جوڑی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

اگلے ہی روز میں نے عکسی کو ایک جوڑی خرید دی پھر چند ایک ماہ وہ دیلیا: دار طبلہ بجاتا رہا۔ احمد بشیر نے کہا میں کسی طبلچے سے کہہ دوں کہ وہ باقاعدہ آکر تمہیں سکھاتا رہے۔ عکسی نے انکار کر دیا۔ جب وہ طبلہ بجاتا تو اس کا منہ سرخ ہو جاتا کان کھڑے ہو جاتے آنکھوں میں دیئے روشن ہو جاتے۔

دو سال ہم کراچی میں رہے اس کے بعد پھر سے میرا تبادلہ پنڈی ہو گیا۔ پنڈی آکر عکسی نے طبلہ بجانا چھوڑ دیا۔ جب سے اس کی جوڑی آج تک ہمارے کاٹھ کباڑ میں پڑی ہے اس دوران میں عکسی ایف اے کر چکا تھا۔

پنڈی آکر میں نے اسے گارڈن کالج میں داخل کرا دیا۔ گارڈن کالج میں داخلے کے بعد عکسی میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ پہلے وہ اپنا بیشتر وقت میرے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ اب وہ زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔

ایک روز میں نے پوچھا۔ آج کل کہاں ہوتے ہو تم۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے ابو۔ وہ بولا۔ آج تک میں آپ کے دوستوں کے حلقے میں رہا ہوں۔ آپ کی سوسائٹی نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ میرا کوئی ساتھی نہیں۔ دوست نہیں۔ کوئی ہم عمر میرے قریب نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں تم ہم میں سے نہیں ہو۔ میں ان کے مشاغل میں شمولیت نہیں کر سکتا۔ کرتا ہوں تو اکھڑا اکھڑا رہتا ہوں۔ لیکن اب۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اپنے دوست بناؤں گا۔ ساتھیوں کا ایک حلقہ بناؤں گا اپنے مشاغل پیدا کروں گا۔

عکسی کی بات سن کر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ اپنی سوسائٹی میں رکھ کر میں نے عکسی کو بوڑھا کر دیا ہے کہ میں نے اپنا آپ اس پر ٹھونس رکھا ہے کہ میں اس کے راستے کی رکاوٹ تھا الٹا میں تو یہ خوش فہمی رچائے بیٹھا تھا کہ میں نے اسے پوری آزادی اور برابری دے رکھی ہے۔

اس کے بعد چند ایک مہینے ہم دونوں کے راستے الگ رہے۔ اس زمانے میں ہم چک لالہ کی گریسی لائینز میں ریکارڈوں کے ایک کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ ریکارڈ رڈنگ کے صدر دروازے کے قریب اپنا ایزل رکھے عکسی کینوس پر تصویر بنا رہا ہے۔ اس وقت وہ تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔ سامنے آئل کلرز کی ٹیوبیں تھیں ہاتھ میں برش کی جگہ چاقو تھا۔

”تصویر پینٹ کر رہے ہو“ میں نے پوچھا۔

”ہاتھ آزما رہا ہوں وہ بولا۔

عکسی کی یہ پینٹنگ آج بھی ہمارے گھر میں آویزاں ہے۔ میں خود تو تصویر کشی کے فن میں کورا ہوں لیکن واقف کار لوگوں کا کہنا ہے کہ عکسی کی اس تصویر میں بڑی جان ہے انفرادیت ہے اس کے بعد کسی سے سیکھے بغیر کسی کو استاد مانے بغیر عکسی نے سات آٹھ کینوسز بنا ڈالیں۔ گھڑوں کا ایک ڈھیر۔ قلعے کا بیرونی منظر۔ درختوں کا جھنڈ۔ مری کا شہر دھوپ چھاؤں میں۔

مری کا شہر ڈاکٹر عفت شہاب کو اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے اسے لے جا کر اپنے ڈرائنگ روم میں سجا لیا۔

ایک روز عفت نے کہا عکسی تو تصویریں بنانے کا کاروبار کیوں نہیں کرتا۔ بڑا پیسہ ہے اس کاروبار میں۔

"پیسے کے لیے تصویریں بناؤں" عکسی ہنسا۔
"پیسے کے لیے نہ سہی میرے لئے بناؤ" وہ بولی
"اچھا" عکسی پھر ہنسا۔
ہمارے ہاں جو مہمان آتے ہیں وہ تمہاری تصویر میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں پھر میں تمہاری سیلز مین بن جاتی ہوں۔ میں نے
ایک ہزار روپیہ فی تصویر آفر کر لیا ہے۔
اچھا۔ عکسی ہنسا۔ بڑی قیمت پڑ رہی ہے میری تصویر کی۔
تمہاری تصویر کو کون پوچھتا ہے وہ بولی۔ یہ تو میری سیلز مین شپ کا اعجاز ہے۔ تصویر کا دو سو روپیہ تمھیں دے دیا کروں گی با
میرا کمیشن ہوگا۔
انہی دنوں عکسی نے ایک نیا پینترا بدلا۔ اس میں ایک فرنگی نے انگڑائی لی اور وہ بڑی تیزی اور شدت سے مسٹر بننے لگا
نہیں بلکہ ضمیر جعفری والا مسٹر جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ۔ کھلتے کھلتے ڈیڑھ گھنٹے میں کہیں مسٹر کھلا سوٹ شف کالر ٹائی
وہ ہونٹ بنا بنا کر انگریزی بولنے لگا۔ پہلے ہی عکسی کی اردو سے انگریزیت کی بو آتی تھی چونکہ دسویں تک اس نے انگریزی پبلک ؎
تعلیم پائی تھی۔ اب اس کی انگریزی سے آکسفورڈ کی بو آنے لگی۔ اس پر گھر والوں کے لئے خاصی مشکل پیدا ہو گئی۔
طبلہ نوازی اور مصوری تو خیر چل گئے تھے۔ انگریزیت گھر والوں کے حلق میں کانٹا بن کر پھنس گئی۔ گھر میں سب ٹھیٹھ پنج
بوریہ نشین تھے باپ سالہا سال سے ادیب ہونے کے باوجود دو پنجابی میں بولتا تھا اور وہ بھی معمول کے طور پر نہیں بلکہ خاہ
پر۔ وہ ادیبوں کی محفلوں میں بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے انداز کو اپنا نہ سکا تھا اس پر ادبی کلف نہ چڑھی تھی۔ عکسی کے اس نئے ؎
سے وہ بہت سٹپٹایا۔ انگریزی تو خیر اسے آتی تھی۔ دفتری انگریزی نہیں بلکہ جدید انگریزی۔ لیکن وہ لکھنے والی انگریزی تھی بو
نہیں۔

آپ تو جانتے ہی ہیں۔ لکھنے والی انگریزی کو کون پوچھتا ہے وہ نہ آپ کو بنا سکتی ہے نہ سنوار سکتی ہے اور بولنے وا
کیا نہیں کر سکتی اسی کا تو راج پاٹ ہے۔ ہمیشہ رہا ہے۔
ان دنوں عکسی بڑی شدت سے انگریزیت کے جوہڑ میں ڈبکیاں کھاتا رہا۔ کالج کے سیمناروں۔ ڈسکشنز۔ ڈیبیٹس۔
پارلیمنٹ۔ ہاؤس آف کامنز۔ ڈیکلے میٹنز میں حصہ لیتا رہا۔
پھر اسے عشق کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ کسی لڑکی سے عشق ہوتا تو بات سمجھ میں آتی چونکہ باپ اس کیفیت کے جملہ کوا
پورے طور پر واقف تھا۔ عشق ہوا بھی تو الیکٹرانک مشینوں سے جن کے متعلق باپ جاہل مطلق تھا اس انوکھے عشق میں عکسی کی کیف
مجنوں کی سی ہو گئی۔ مجنوں صحرا نوردی کیا کرتا تھا عکسی نے جنک شاپ نوردی شروع کر دی روز وہ باری باری شہر کے م
کباڑیوں کی دکانوں پر جاتا۔ وہاں پڑی ہوئی مشینوں کو دیکھتا انھیں سمجھنے کی کوشش کرتا۔ چلا آتا پھر گھر آکر آہیں بھر بھر کر مجھے سم
الو ہزاروں کا ریکارڈر سینکڑوں پر بک رہا ہے نایاب سٹیج ساؤنڈ سسٹم کوڑیوں کے حساب مل سکتا ہے کباڑیے کو علم ہی نہیں

نایاب ہے۔

اس زمانے میں پہلی مرتبہ عکسی کو احساس ہوا کہ وہ ایک غریب باپ کا بیٹا ہے۔

اس کے باوجود گھر میں کئی ایک مشینیں آگئیں ۔ریکارڈ چینجر۔ بائیک ۔لاوڈ سپیکر۔ٹیپ ریکارڈر۔

آج بھی کباڑیوں کی دکانوں کا جائزہ لینا اس کا مرغوب مشغلہ ہے۔

انہی دنوں اس نے اپنا معمول پھر سے بدل لیا۔وہ زیادہ تر وقت گھر پر بسر کرنے لگا۔

ایک دن میں نے پوچھا عکسی تم نے باہر جانا کیوں چھوڑ دیا۔

پہلے تو وہ خاموش رہا پھر میرے اصرار پر کہنے لگا۔بے کار ہے ابو بالکل بے کار۔مجھ میں دوسروں کو دوست بنانے کی صلاحیت ہی نہیں۔میں نے بہت کوشش کر دیکھی۔میں نے اپنی سرشت کو بدلنے کی کوشش کی۔میں نے اپنا رنگ بدلنے کی کوشش کی۔لیکن سب بے کار۔میں ان میں سے نہیں ہوں ابو۔میں ان کے مشاغل اپنا نہیں سکتا۔میرے خیالات مختلف ہیں احساسات مختلف ہیں دلچسپیاں مختلف ہیں مجھ میں نوجوانی کا وہ سمروہاٹ نہیں۔اور۔ اور۔ وہ رک گیا۔دراصل آپ کی سوسائٹی میں رہنے کی وجہ سے میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ہم عمروں کی باتیں مجھے گھٹیا لگتی ہیں۔نوجوانوں کے مشاغل بے معنی نظر آتے ہیں۔

زندگی بھر عکسی نے صرف چار ایک ہم عمروں سے تعلقات پیدا کئے۔لیکن کوشش کے باوجود یہ تعلقات دوستی تک نہ پہنچ سکے۔

ڈاکٹر جہانگیر عکسی کا واحد دوست ہے اگر ان کی دوستی آج تک نبھ رہی ہے تو اس کا سہرا جہانگیر کے سر ہے سینٹ میری سکول میں وہ ایک دوسرے کے ساتھی بنے تھے۔لیکن یہ ساتھ ایک ہاتھ کی تالی بجانے کے مترادف ہے پھر مظفر ہے نجم ہے صادق ہے افضل ہے۔ان سب سے عکسی کے دوستانہ تعلقات ہیں۔منہ زبانی کے تعلقات۔

یہ تعلقات عکسی نے اس زمانے میں پیدا کئے تھے جب وہ بی اے میں تھا۔بی اے کے بعد اس نے ایم اے نفسیات میں داخلہ لے لیا۔ایم اے کے اختتام پر لبارٹیری میں پریکٹس کے لئے لاہور گورنمنٹ کالج میں جانا پڑا۔

لاہور میں وہ چھ ماہ بانو قدسیہ کے گھر میں رہا بانو قدسیہ کے گھر کا نام داستان سرائے نہیں بلکہ رنگ پچکاری ہونا چاہئے چھ ماہ عکسی اس رنگ پچکاری میں بھیگا بیڑا بن کر بیٹھا رہا۔

ایم اے کرنے کے بعد وہ گارڈن کالج میں لیکچرار ہو گیا۔

انہی دنوں میں نے عکسی سے کہا۔مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم گورنمنٹ سروس نہیں کرو گے۔

کیوں ۔ اس نے پوچھا۔

اگر گورنمنٹ سروس کرنی ہے تو سی ایس پی کرنا لازم ہے میں نہیں چاہتا کہ تم بے عزتی کی نوکری کرو۔

میں سی ایس پی کر دوں گا ابو۔

اس کے بعد وہ تیاری میں مصروف ہو گیا۔

عکسی کو مطالعہ کا شوق نہ تھا۔اسے امتحان پاس کرنے کا گر آتا تھا۔اسی لیے وہ ہر امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کیا کرتا

تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ ابو
امتحان مطالعہ یا محنت سے پاس نہیں ہوتا۔ سوجھ بوجھ کے زور پر ہوتا ہے۔
ڈیڑھ سال کے بعد عکسی میرے پاس آیا کہنے لگا۔ ابو میں نے سی ایس پی کی تیاری کر لی ہے میں اچھی پوزیشن حاصل کر دوں گا۔
بڑی خوشی کی بات ہے میں نے جواب دیا۔
لیکن اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا کیا یہ ضروری ہے کہ میں سی ایس پی بنوں۔
میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم عزت کی نوکری کرو۔
میں سی ایس پی کو عزت کی نوکری نہیں سمجھتا۔
میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
میں سی ایس پی بننا نہیں چاہتا وہ بولا۔
تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔
اس لئے کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں محنت کرنے سے جی چراتا ہوں۔ اب فیصلہ آپ پر ہے اگر آپ بضد ہیں کہ میں سی ایس پی بنوں تو میں امتحان دے دوں گا ورنہ نہیں۔
میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں نے اپنے بچوں کو یہ خوش فہمی دے رکھی ہے کہ میں بہت وسیع القلب ہوں اور ان کی رضامندی کے بغیر کوئی کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ بہر حال اس روز میرا جی چاہتا تھا کہ فراخ دلی کا وہ ڈھونگ چاک کر کے رکھ دوں۔ لیکن مجھ میں جرأت نہ ہوئی۔ مجبوراً سینے پر پتھر رکھ کر میں نے عکسی کی بات مان لی۔
پھر ۱۹۶۷ء میں وہ واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک زلزلہ تھا جس نے عکسی کی شخصیت کے ایوان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ پچیس سال کی عادتیں جڑوں سمیت اکھاڑ دیں۔ پچیس سال کے تعلقات کے نقوش دھو ڈالے۔ اس واقعہ نے گویا عکسی کو ایک بے سروسامان مہاجر بنا دیا۔ مجھے علم نہیں کہ وہ واقعہ کیا تھا۔ اس کی تفصیلات کیا تھیں۔ اس کی نوعیت کیا تھی۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس روز کوئی ہاتھی چینی کی دوکان میں گھس آیا تھا۔
وہ واقعہ رات کے پچھلے پہر ہوا جب ہم گہری نیند سو رہے تھے۔ صبح سویرے جب میں باتھ روم جانے کے لئے جاگا تو میں نے دیکھا کہ عکسی کے کمرے کی بتی جل رہی ہے۔ یہ تفصیل بہت حیران کن تھی۔ چونکہ عادی طور پر عکسی صبح نو بجے کے قریب جاگا کرتا تھا۔ صبح سویرے جاگنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ خیال آیا دیکھوں تو سہی بات کیا ہے۔
میں نے کمرے میں جھانکا تو میرا منہ مارے حیرانی کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ عکسی کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔
عکسی نے عید کے سوا کبھی نماز نہ پڑھی تھی۔ اسے اسلام یا دینیات سے نہ تو واقفیت تھی نہ دلچسپی۔ اگرچہ امی باقاعدہ طور پر نماز پڑھتی تھی۔ لیکن باپ کی وجہ سے گھر کے ماحول میں اسلام کی جھلک نہ تھی

بہرحال باتھ روم سے فارغ ہو کر میں پھر سو گیا۔ دوبارہ جاگا تو عکسی کی امی نے مجھے اشارہ کیا۔ بولی۔ ذرا اٹھ کر عکسی کے کمرے میں جھانک کر تو دیکھئے۔ میں نے دیکھا تو عکسی بیٹھا قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا۔ جب وہ چائے پینے کے لئے کمرے سے باہر نکلا تو اسے دیکھ کر میں ڈر گیا۔ منہ سرخ ہو رہا تھا۔ چہرہ سوجا ہوا تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ انداز میں دیوانگی نمایاں تھی۔ اسے تخت پوش پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کسی درگاہ کے دروازے پر کوئی مست بیٹھا ہو۔

اس روز عکسی نے چائے پینے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ چائے کا رسیا تھا۔ صرف چائے ہی نہیں اس روز اس نے تمام معمولات کو بدل دیا گھر والے حیران تھے میں گھبرا گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عکسی سے پوچھا۔ کیا بات ہے عکسی۔

ضرور کوئی بات ہے عکسی کی امی بولی۔

عکسی نے اپنی ABNORMAL کیفیت کو دبانے کی شدید کوشش کی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ اور بھی بھیانک ہو گیا۔ بولا۔ کچھ نہیں ابو۔ کچھ بھی تو نہیں۔

کچھ تو ہے۔ میں نے کہا۔

نہیں نہیں وہ بولا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ ایک عام سا مشاہدہ ہے۔ عام سا مشاہدہ۔ جو بہت سوں کو ہو گا۔ بہت سوں کو آپ کو بھی ہو گا ابو۔

لیکن ہوا کیا میں نے پوچھا۔

ایک مشاہدہ ایک ویژن وہ بولا۔ پاکستان کی آنے والی عظمت کا ویژن۔ ابو جیسے پھر سورج میرے کمرے کے اندر گھس آیا۔ اس وقت اس میں حدت نہ تھی صرف نور ہی نور تھا میں جیکا چوند ہو کر رہ گیا ابو۔

پھر وہ سورج سمٹ کر پاکستان بن گیا۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا فضا کو گھورتا رہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر دیوانگی کے اثرات بالکل ہی نمایاں تھے۔

ابو یہ مشاہدہ صرف مجھے ہی نہیں۔ بہت سوں کو ہو گا۔ پچاس سال کے اندر اندر سب اس کا تماشہ کریں گے۔ سب۔

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

ابو آپ پاکستان کو نہیں جانتے۔ نہیں جانتے۔ اس کی آواز پھٹی پھٹی تھی۔ میں جانتا ہوں، اب میں جانتا ہوں میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لیکن میں بتا نہیں سکتا کہ کیا دیکھا ہے۔ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا صرف دیکھا جا سکتا ہے۔ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے وہ پھر خاموش ہو گیا جیسے بیتی بات کا پھر سے مشاہدہ کر رہا ہو۔

بابو وہ بولا پاکستان نے دنیا کی راہنمائی کرنی ہے۔ دنیا کو راستہ دکھانا ہے۔ اب میں سول سرونٹ ہوں ابو۔ مجھے پاکستان کی چاکری عطا کر دی گئی ہے بہت سوں کو یہ چاکری عطا کی جائے گی۔ بہت سوں کو مجھے اب پڑھنا ہے۔ مطالعہ مطالعہ مطالعہ۔

اس کے بعد عکسی اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا اس نے فزکس۔ فلاسفی۔ پاراسائیکالوجی تصوف ای ایس پی کی کتابوں کا ذخیرہ جمع کر لیا اور دیوانہ وار مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔

اس کے باوجود اس کی کیفیت ویسی ہی رہی۔ منہ سرخ اور سوجا ہوا آنکھیں پھٹی پھٹی چہرے پر وہی وحشت۔ سارا دن کمرے میں بند رہتا۔ ہمیں اس کے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ جیسے آسیب زدہ ہو۔

پھر عکسی کے ایک دوست نے لات مار کر عظمت پاکستان کا وہ مینار پاش پاش کر دیا۔ بولا یہ سب فتنہ و فساد ایک اٹھایا ہوا ہے۔

اس لڑکی سے میں مل چکا تھا۔۔

ایم اے کے بعد میں نے عکسی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنا جیون ساتھی خود تلاش کرے۔ میں نے کہا تھا جب تم چکو تو مجھے بتا دینا۔ پھر میرا کام شروع ہوگا۔ اس کے لواحقین سے میں خود جا کر ملوں گا۔ ان کی منتیں کروں گا۔ ہاتھ جوڑ دوں گا بھی اگر وہ راضی نہ ہوئے تو ہم لڑکی کو اغوا کر لیں گے۔

اغوا کرنے کی کیا ضرورت ہے عکسی جھنجھلا کر بولا بڑی ضرورت ہے میں نے سنجیدگی سے کہا۔ تمہیں نہیں پتہ۔ کی لڑکی کو ہر قیمت پہ حاصل کرنا زیس ضروری ہوتا ہے ناکامی ہو جائے تو شدید جھٹکا لگتا۔ ناکامی تسلیم کر لو تو تمہاری میں ٹوٹ رہ جاتی ہے جس طرح شیشے کے گلاس میں بال آجائے تو وہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔

ایک روز عکسی میرے پاس آیا بولا ابو آپ مصروف تو نہیں۔

میں نے کہا۔ نہیں۔

بولا ذرا باہر چل کر میرے دوست سے مل۔

جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ میرے ابا ہیں عکسی بولا اور یہ میری دوست ہیں۔ میں اس لڑکی سے مل چکا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو عکسی کہنے لگا ابو اگر میں اس لڑکی کو جیون ساتھی بناؤں تو۔۔۔آپ کی کیا را

کیا تمہیں اس لڑکی سے محبت ہے میں نے پوچھا۔

محبت وحبت نہیں۔ بس اسے پسند کرتا ہوں۔

وہ اک چٹ کپڑی لڑکی تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی چٹ کپڑی لڑکی نہ دیکھی تھی۔ لڑکیاں تو رنگدار ہوتی ہیں دھاریدا ہوتی ہیں البتہ میں نے زندگی میں چند ایک چٹ کپڑی خواتین ضرور دیکھی تھیں۔ چٹ کپڑی سے یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ وہ صرف سفید لباس کی شوقین ہوتی ہیں یا سادہ مادی رہنا پسند کرتی ہیں۔ بے شک وہ سفید اور سادہ لباس پہنتی ہیں سنگار سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ نہیں بات نہیں۔ یہ بے نیازی خالص بظاہر ہوتی ہے۔ سنگار جب درجہ کمال پہ پہنچتا ہے تو ایک ایسی کیفیت عمل میں آتی ہے کہ دیکھنے کو یوں لگتا ہے جیسے محترمہ سنگار سے بے نیاز ہو چٹ کپڑی سنگار کے اس درجہ کمال سے واقف ہوتی ہے۔ اسے اپنی ہر حرکت ہوتی ہے اسے ہر سرسری جنبش کا شعور ہوتا ہے اور اس کے اثرات کا واضح علم ہوتا ہے۔

یوں جان لیجئے کہ چٹ کپڑی نسائیت کا ایک خاص رخ ہے ایک PATTERN ہے ایک طریق کار ہے ایک کردار۔ میری دانست میں چٹ کپڑی نسائیت کی دودھ بھری کڑاہی کی بالائی ہوتی ہے۔ چٹ کپڑی کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔ لیکن اگر چٹ

مہربان ہو جاتے تو پھر جنت میں جانے کی آرزو نہیں رہتی ۔

عکسی کے دوست نے مجھے بتایا کہ دونوں کے درمیان شادی کے عہد و پیمان ہو چکے تھے ۔

عکسی نے کہا تھا میرا انتظار کرو۔ پھر ایک روز عکسی کو اس کا خط ملا۔ لکھا تھا۔ گھر والے میری شادی ایک کپتان سے کرنا چاہتے ہیں ۔ میری کوئی نہیں سنتا اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔

عکسی نے یہ بات مجھے نہ بتائی۔ پتہ نہیں کیوں۔ شاید اس لئے کہ عادی طور پہ وہ حتی الوسع مجھے تکلیف دینے سے گریز کیا کرتا تھا۔ یا شاید اس لئے کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں میں اپنی جذباتیت کی وجہ سے صورت حال کو اور خراب نہ کر دوں ۔

عکسی نے کہا سیدھی بات ہے لڑکی کے متعلقین پڑھے لکھے لوگ ہیں ۔ خاندان متمدن ہے ۔ لڑکی سے میرے تعلقات بڑے پاکیزہ اور خوشگوار ہیں۔ ان میں ناخوشگواری یا غیر مناسب کا عنصر نہیں ۔ کیوں نہ خود ان سے مل کر بات کروں وہ سمجھ جائیں گے یقیناً سمجھ جائیں گے ۔

جب عکسی نے ان سے بات کی تو سمجھنے کی بجائے وہ گھورنے لگے۔ گھورنے پر بھی عکسی نہ سمجھا تو وہ تو تو میں میں پر اتر آئے۔ انہوں نے عکسی اور اس کے خاندان کو بے نقط سنائیں اور پھر اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اور چٹ کپڑی چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی ۔

عکسی کے دوست کی زبانی یہ تفصیلات سن کر میں سخت گھبرا گیا۔ اگرچہ میرا ایمان تھا کہ عکسی نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا پھر بھی مجھے شک پڑنے لگا کہ شاید صدمے کی وجہ سے اس کا ذہن گڈ مڈ ہو گیا ہو۔ اور شک کی وجہ سے رات کے وقت اس کے کمرے میں سورج طلوع ہو گیا ہو۔

کئی ایک دن میں نے بڑھتے تذبذب میں گزارے میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ عکسی کو واقعی مشاہدہ ہوا تھا یا یہ سب دماغ کا خلل تھا۔

آخر میں نے قدرت اللہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے حلقہ ارباب میں صرف قدرت اللہ ہی ایسا فرد ہے جو روحانیات اور عقل و دانش دونوں کو ہم آہنگ سمجھتا ہے۔ انہیں متضاد نہیں جانتا۔ جس کا ایمان ہے کہ عقل و خرد روحانیت کے لئے باعث تقویت ہے۔ میں نے قدرت سے کہا مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ یہ مشاہدہ تھا یا چٹ کپڑی کا اعجاز ۔

میری بات سن کر ڈاکٹر عفت قہقہہ مار کر ہنسیں بولیں اس واقعہ کو چٹ کپڑی سے کوئی تعلق نہیں ۔

آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں ۔

ہاں میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں وہ بولیں ۔ اس لیے کہ میں جانتی ہوں ۔

آپ کیسے جانتی ہیں ۔

میں چٹ کپڑی کے متعلق بہ تفصیل جانتی ہوں ۔

آپ کو کیسے علم ہے ۔

عکسی مجھے ہر تفصیل سے آگاہ رکھتا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ لڑکی کا واقعہ بالکل الگ ہے۔ چونکہ دونوں واقعات صرف آٹھ دس منوں کے وقفے سے ہوئے ہیں اس لئے غلط فہمی کی گنجائش ہے۔

تو کیا واقعی مشاہدہ ہوا ہے میں نے قدرت سے پوچھا۔

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ مشاہدہ ہوا ہے یا نہیں۔ البتہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دماغ کا خلل نہیں۔ نہ ہی خود فریبی ہے۔ قدرت نے کہا۔

ڈاکٹر عفت بولیں۔ میری دانست میں عکسی کو ملک سے باہر بھیج دینا چاہیے۔ ایک تو چینج ہو جائے گی دوسرے عکسی کو باہر جانے کا بہت شوق ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عکسی کو سکالرشپ دلا کر چیکوسلوویکیا بھجوا دیا گیا۔

پراگ میں عکسی ڈیڑھ ایک سال مقیم رہا۔ اس دوران میں اس پر وہی کیفیت طاری رہی وہی دیوانگی وہی مطالعے کا جنون وہی اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو۔

پراگ سے عکسی کا ہر خط جو مجھے موصول ہوتا رہا اسی کیفیت کا غماز تھا۔ اگرچہ اپنے خطوں میں وہ ذاتی کیفیت کا غماز تھا۔ اگرچہ اپنے خطوں میں وہ ذاتی کیفیت کے اظہار سے گریز کرتا پھر بھی بات چھلک کر باہر نکل آتی۔ اس کے خطوط میں ضبط اور شدت نمایاں تھے۔ ان کے علاوہ جا بجا اللہ اور پاکستان کا تذکرہ ہوتا۔ مثلاً ایک خط ملاحظہ ہو۔

ابو:۔ چیک ایک مایوس قوم ہے۔ انہوں نے اپنی امیدوں کے سارے انڈے مارکسزم کی ٹوکری میں ڈال رکھے تھے۔ مارکسزم کا رنگین وعدہ ایفا نہ ہوا۔ جس سے انہیں دھچکا لگا اور سارے انڈے ٹوٹ گئے۔

اہلِ مشرق کے پاس اللہ ہے۔ اہلِ مغرب کے پاس زر ہے چیک کے پاس نہ اللہ ہے نہ زر ہے پھر وہ کس امید پر جئے۔ اسے پتہ نہیں کہ وہ کیوں اور کدھر جا رہا ہے اور اس کی منزل کیا ہے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے۔

اس کی گہری مایوسی سے ایک طوفان ابھر رہا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پاکستان میں ایک طوفان جنم لے رہا ہے۔ چیک کے دل میں ابھرنے والا طوفان مثبت نہیں پاکستان میں ابھرنے والا مثبت ہے۔ پاکستان میں عظیم واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اللہ ایک عظیم پلانر PLANNER ہے ابو۔ وہ معجزوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے عظیم نتائج پیدا کرتا ہے۔ پاکستان میں عظیم نتائج رونما ہوں گے۔ انشا اللہ۔

سنہ ۱۹۶۹ء میں عکسی چیکوسلوواکیہ سے واپس آ گیا لیکن یہ وہ عکسی نہیں تھا جس کے ساتھ میں نے زندگی کے پچیس سال گذارے تھے۔

مجھے علم نہیں کہ پراگ میں اس پر کیا بیتی البتہ اس بیتی کی شدت کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ وہ تیس نوٹ بکیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس کے مشاغل کا پتہ دیتی تھیں۔

ان کاپیوں میں مضامین نہیں بلکہ مختصر نوٹ لکھے ہوئے تھے۔ ان کا موضوع، وحدانیت تھا کہیں اعداد کی بنیاد پر وحدانیت کا

مسئلہ حل کیا ہوا تھا کہیں روشنی اور رنگ کی بنیاد پر۔ کہیں ایٹم کی مدد سے وحدانیت پر روشنی ڈالی گئی تھی کہیں سبز پتے کی ساخت کی مدد سے
عکسی کی واپسی پر ہم سب نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ عکسی سے پراگ کی بات نہیں کریں گے۔ شاید اسی وجہ سے سارا گھر پراگ سے یوں بھرا ہوا تھا جیسے پھوڑا پیپ سے بھرا ہوتا ہے۔

آخر ایک روز بے خبری میں بات میرے منہ سے نکل گئی۔ برسبیل تذکرہ میں نے کہہ دیا۔ یوں معلوم پڑتا ہے کہ پراگ میں تم پھانسی پر لٹکے رہے۔

عکسی کی آنکھیں پرنم ہو گئیں کہنے لگا ہاں ابو پھانسی پر لٹکا رہا۔ کاش وہ دن پھر سے لوٹ آئیں اور میں ایک بار پھر پھانسی پہ لٹک جاؤں۔ لیکن اب شاید ایسا کبھی نہ ہو۔ کبھی نہیں۔ کھو دیا ابو سب کھو دیا اب میں ایک خالی برتن ہوں یوں لگتا ہے جیسے غبارے کی ساری پھونک نکل گئی ہو۔ اب میں ایک چھچھڑا ہوں چھچھڑا۔ زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا۔ کوئی منزل نہیں کوئی مفہوم نہیں اب میں ایک خلا ہوں بھیانک خلا۔

پھر جیسے سمیر نگیب کی آمد پر وہ خلا بھر گیا۔

سمیر نگیب ایک مصری نوجوان تھا۔ خوش شکل رنگین مزاج۔ ہینسم۔ وہ یونیسکو کا ایک ایکسپرٹ تھا جسے پاکستان کے لوک گیت جمع کرنے کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا۔

وزارت تعلیم کے لئے سمیر نگیب کی آمد ایک غیر از معمول بات تھی۔ یونیسکو نے پہلے ہی کئی ایک مطالبات کئے تھے لیکن وہ اپنی نوعیت میں کاغذی تھے۔ یعنی کاغذ پر لکھے ہوئے موصول ہوتے تھے جن کا جواب کاغذ پر دے دیا جاتا تھا یونیسکو کا یوں ایک جیتے جاگتے آدمی کو بھیج دینا اور عملی کام کا مطالبہ کرنا۔ واقعی یہ بات معمول سے بہت ہٹ کر تھی۔ اس قدر ہٹ کر تھی کہ وزارت تعلیم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

بہرحال انہوں نے سمیر نگیب کو انٹر کام میں ٹھہرا دیا بولے آپ چند ایک روز آرام کرلیں جب تک ہم لوک گیتوں کا انتظام کئے دیتے ہیں۔

دفعتاً وزارت کو خیال آیا کہ گیتوں کا بادشاہ ریڈیو پاکستان ہے۔ انہوں نے ریڈیو سے بات کی ریڈیو نے کہا ہم تو صرف وہ گیت اکٹھے کرتے ہیں جنھیں لوگ سنتے ہیں وہ گیت اکٹھے نہیں کرتے جو لوگ گاتے ہیں۔

اس پر وزارت کا دل ڈوب گیا۔

ادھر انٹر کام میں سمیر نگیب بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ کرتا رہا۔ پھر وہ اکتا کر اٹھ بیٹھا۔ اور ٹہل ٹہل کر انتظار کرنے لگا۔

انٹر کام کا مغربیت زدہ ماحول اس کے لئے جاذب توجہ نہ تھا وہ تو مغربیت سے اکتایا ہوا تھا اور خالص مشرقیت کے ماحول میں رہنے کا خواہش مند تھا۔ پھر اسے ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا جب تک میں ذاتی طور پر کوشش کیوں نہ کروں۔ پاکستانی لوک گیتوں کا اتا پتہ پوچھوں۔ کسی رنگین مزاج نے اسے ہیرا منڈی کا پتہ بتا دیا۔

ہیرا منڈی سمیر نگیب کو بہت پسند آئی۔ وہاں مشرقیت کی جھلک تھی جو اسے نئی نظر آئی دو مہینے وہ ہیرا منڈی کی بائیوں سے

گیت سنتا اور چٹکیاں بجاتا رہا پھر کسی نے یہ کہہ کر کہ یہ لوک گیت نہیں یہ تو چوبارہ گیت ہیں اس کا دل توڑ دیا۔ اس پر وہ سیدھا سیکرٹری تعلیم سے جا کر ملا بولا میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گیا آپ نے ابھی تک لوک گیتوں کا کوئی انتظام نہیں کیا۔

اِن دنوں قدرت اللہ شہاب وزارتِ تعلیم کے سیکرٹری تھے انہوں نے عکسی کو سمیر نگیب کا معاون مقرر کر دیا۔

عکسی نے سمیر نگیب کو سمجھایا کہ بھلے آدمی۔ پاکستانی لوک گیتوں کو اکٹھا کرنا آسان کام نہیں پاکستانی لوک گیت بائیوں کے چوباروں میں نہیں ملتے نہ ہی آرٹ کونسلوں میں ملتے ہیں انھیں اکٹھا کرنے کے لئے دور افتادہ گاؤں میں جانا پڑے گا۔ ان گاؤں میں جہاں شہر کے اثرات ابھی تک نہیں پہنچے۔ جہاں وہ دم توڑ رہے ہیں۔ وہاں پہنچنے کے لئے پیدل چلنا ہوگا۔ مقامی لباس پہننا ہوگا۔ ٹرک ہوٹلوں سے کڑک چائے پینے کی عادت ڈالنی ہوگی۔

آٹھ روز عکسی سمیر نگیب کو ٹریننگ دیتا رہا یونیسکو کے فوک لورا کسپرٹ کے لیے یہ ایک انوکھی ٹریننگ تھی۔ پھر وہ دونوں سندھ بلوچستان مکران تھرپارکر سرحد کے دور افتادہ دیہات کی طرف نکل گئے جہاں مظلوم پاکستانی کلچر مغرب زدہ شہر۔ کالا صاحب اور ماڈرازم سے چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ جہاں پاکستانی لوک گیت کس مپرسی کے عالم میں دم توڑ رہے ہیں۔ جہاں پاکستانی دیہات کے منفرد سازدیوار پر لٹکے لٹکے کرم خوردہ ہو چکے ہیں۔ پتہ نہیں عکسی نے وہاں کیا دیکھا۔ شاید اس نے پاکستانی عظمت کے اس ویژن کی تعبیر کی جھلک دیکھی ہو شاید پاکستان کے درخشندہ مستقبل کی کرن پھر سے اس کے دل کی گہرائیوں میں چمکی ہو۔ شاید پاکستان کے اس ادنےٰ چاکر کو راستہ مل گیا ہو۔

بہر حال جب وہ لوٹا تو اس کی تمام تر توجہ پاکستان کی لوک ریت پر مرکوز ہو چکی تھی۔ پہلے اس کی دیوانگی کا مرکز مطالعہ تھا اب لوک ریت ہے۔ لوک ریت کے جنون نے اسے کام کا بنا رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے شہر کے فرزانوں کی نگاہ میں وہ لوک تماشہ بنا ہوا ہے۔

اَن کہی باتوں کی تفہیم

مظہرالاسلام

قدریں بظاہر ٹوٹنے اور بکھرنے کے عمل کی زد میں محسوس ہوتی ہیں لیکن اگر تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قدروں کے ٹوٹنے بکھرنے اور پھر بلنے کا عمل محض ایک تکنیکی مسئلہ ہے ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ قدریں اپنی بقا کے لیے اذیت کے ایک مسلسل اور ناگزیر عمل سے گزرتی ہیں اور پھر عذاب کے انہی لمحوں میں خود بخود اُن کی تجدید ہوتی رہتی ہے ۔ میں اپنی بات کی ، مزید وضاحت اس طرح کروں گا کہ کوئی بھی قدر ٹوٹتی یا بکھرتی نہیں ، صرف اپنی بقا کے لیے ایک دلچسپ اور مشکل عمل سے گزر کر نئی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ اس پورے عمل میں قدروں کی اساس مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے ۔ ان صورتوں کا دارومدار اس نفسیاتی رویئے سے تشکیل پاتا ہے جو انسان کی ذہنی زندگی کے شعوری اور لاشعوری ادراک سے پھوٹتا ہے ۔ چنانچہ انسان شعوری یا لاشعوری طور پر جن قدروں کو معصوم بچوں کی طرح کندھوں پر بٹھا کر پالتا ہے ایک مخصوص نفسیاتی وقفے کے بعد انہیں خود ہی منتشر کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے ، لیکن جس طرح خود انسان کبھی نہیں مرتا بلکہ نئے نام کے ساتھ پھر سے نمودار ہو جاتا ہے اسی طرح قدریں بھی ایک نئے روپ کے ساتھ ظاہر ہونے لگتی ہیں ۔ لہٰذا قدروں اور انسانوں کا یہ دائمی سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا اور یہی قدر مشترک ظاہر کرتی ہے ، کہ قدریں انسانوں کے رحم و کرم پر اور انسان قدروں کے رحم و کرم پر ہیں ، اور اس جنگ کی پُشت پناہی کرنے والا نفسیاتی عمل پوری طرح ممتاز مُفتی کے افسانوں کی گرفت میں ہے ۔ ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں میں انسانوں سے ڈری ہوئی قدریں اور قدروں سے ڈرے ہوئے انسانوں کا نفسیاتی فلسفہ اس فنی مہارت اور چابکدستی سے پیش کیا ہے جس نے مفتی کو اپنے ہمعصر لکھنے والوں سے منفرد حیثیت عطا کی ہے ۔ آپا میں آپا کا کردار بھی ایک ایسی قدر کے طور پر ظاہر ہوتا ہے جو کہانی بیان کرنے والی لڑکی کے نفسیاتی عمل سے ٹوٹتا اور پھر نئے سرے سے وجود میں آتا ہے ۔ اس افسانے میں آپا سے زیادہ اہم کردار کہانی بیان کرنے والی لڑکی کا ہے ۔ آپا تو اس کے لاشعور میں چھپی ہوئی صرف ایک خواہش ہے اور جب یہ خواہش شعور کی سطح پر نمودار ہوتی ہے ، تو ایک قدر کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے ۔

"آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی ۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی ، اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک چھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں ، جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی ۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا ، آپا یہ — ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے ، دل توڑنے والا گھر ، اس کے کیا معنی ہوئے ۔ پہلے تو آپا ٹھٹھک گئی ، پھر وہ سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی ، مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا ، میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا ، اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے ،

کہنے لگی میں کیا جانوں۔

کتاب کو چھپا کر رکھنے والی آپا کہانی بیان کرنے والی لڑکی کے نفسِ لاشعور کے پردے پر جلتی بجھتی تصویر ہے اور لڑکی کبھی کبھی لاشعور میں جھانک کر تمام گمنام کارروائی کا ادراک حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن پھر اپنے اردگرد جالے کی طرح بنی ہوئی نفسیات کے ہاتھوں مجبور ہو کر سب کچھ دبا جاتی ہے۔ لڑکی آپا سے نہیں دراصل اپنے آپ سے سوال کرتی ہے "یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا کیا مطلب ہے اور پھر خود ہی جواب دیتی ہے اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔ کچھ اسی طرح کی صورت حال مفتی کے افسانے "جھکی جھکی آنکھیں" میں بھی ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار عذرا کا نفسِ لاشعور ہر وقت پنجرے میں بند طوطے کی صورت میں اس کے سامنے پڑا رہتا ہے۔

"اس روز وہ اپنے طوطے سولی سے کہہ رہی تھی، سولی چاہے تم کوئی بھی ہو تم میرے ہو تمہیں مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا کوئی بھی نہیں۔"

سولی کے ہونے کا ادراک اور پھر اس سے قطع تعلق کا احساس شعور اور لاشعور کے درمیان خیالات اور ہونے یا نہ ہونے کی جنگ ہے۔ لاشعور جانتا ہے لیکن جاننے نہیں دیتا، بلکہ عمل میں کہیں کہیں ظاہر کر دیتا ہے۔

"وہ سوچ رہی تھی سولی بے زبان ہو کر بھی سمجھتا ہے اس وقت غالباً پہلی مرتبہ اس کے دل میں سولی کو آزاد کرنے کی خواہش محسوس ہوئی۔"

نفس لاشعور کے ادراک کا احساس اور پھر اس کے اندر چھپی ہوئی حقیقت کو ظاہر کر دینے کی خواہش ان لائنوں میں دم مارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ شعور کی سطح سے پیچھے ہونے والی کارروائی عذرا کے بند بند میں پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ لیکن شعور اقدار سے ڈرا اور سہا ہوا ہے۔ وہ کچھ نہیں جاننا چاہتا، اس لیے کہ اگر وہ جان کر اسے تسلیم کرے تو بدلنے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ ٹوٹ بھی جائے گا۔ لیکن نفسِ لاشعور کی ظاہر ہونے کی خواہش دباؤ کے ردِعمل کے طور پر اور زیادہ بے چین اور مضطرب ہونے لگتی ہے۔

"سولی اپنے پنجرے میں یوں مضطرب تھا جیسے اسے سر نو قید کیا گیا ہو۔ وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر پھڑپھڑاتا اور ان دیواروں کی اجنبیت محسوس کر کے بار بار چیختا ہے۔ شام کے وقت نذیر نے سولی کا پنجرہ عذرا کے پلنگ کے قریب رکھ دیا۔ سولی نے عذرا کو دیکھ کر چیخنا بند کر دیا۔ اپنی گردن موڑ کر اپنے بازوؤں پر رکھ دی، اور عذرا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ گیا۔"

دبی ہوئی خواہش کو تسلیم نہ کرنے سے جو صورت حال پیدا ہوتی وہ پنجرے میں بند عذرا کے لاشعور کے مضطرب ہونے سے ظاہر ہوتی ہے۔ نذیر جو کہ شعور کی سطح پر مثبت اور لاشعور کے اندر منفی حیثیت کا حامل ہے پنجرہ پھر عذرا کے قریب رکھ کر لاشعور میں دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دیتا ہے لیکن جذبات کے مجروح ہونے کی انتہائی صورتِ وہ ڈراؤنی چپ ہے جو طوطے کی آنکھوں میں دبک کر بیٹھ جاتی ہے۔

"سولی کی چیخ نے اسے بیدار کر دیا اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا اور اُٹھ کر سولی کے پنجرے کے قریب جا بیٹھی
وہ سولی سے باتیں کرنا چاہتی تھی، پوچھنا چاہتی تھی تم میرے ہو نا سولی۔"

جان کر نہ جاننے کے عمل کے درمیان تضاد طوطے کی وہ چیخ ہے جو عذرا کو بیدار کر دیتی ہے اور وہ ایک بار پھر جانی ہوئی بات کو جاننے کی کوشش میں لگ جاتی ہے۔ اس افسانے میں نفسیاتی تضاد کی جنگ صرف ایک قدر کی بقا کیلئے لڑی جاتی ہے۔ مفتی نے اپنے تمام افسانوں میں ایسی ہی صورت حال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے سطحی اور خارجی واسطہ نہیں رکھتا، بلکہ ان کے داخلی تہوں تک رسائی حاصل کر کے انہیں بے نقاب کر دیتا ہے۔ اسی لیے کرداروں کے اندر دبی ہوئی خواہشات اور گھناؤنا پن مفتی کے افسانوں میں ایک ظالم حقیقت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ حقیقت صرف ایک رُخ کی ہی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ ایک دوسرے کے اندر سے پھوٹنے والے تمام مسائل اور پھر ان کی انتہا کو بھی ظاہر کر دیتی ہے مگر مفتی نے اس تمام سفر کے لیے وہ نفسیاتی راستہ منتخب کیا ہے جو اجتماعی اور انفرادی رویوں کے باہمی ربط سے تعمیر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کا استعمال، میاں کی مرضی، چڑ دودھیا سویرا اور ذاتی معاملہ، اس سلسلے کے اہم افسانے ہیں۔

اپنے خیالات کو ایک مکمل تھیم کی شکل دینے اور پھر اس تھیم کے لیے کرداروں کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں ہر فنکار کو ایک تجزیاتی عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور بڑے فنکار کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس تجزیاتی عمل کے دوران زندگی کے وسیع مطالعے اور ذہنی کشادگی کی مدد سے خود ہی سوال اٹھاتا اور خود ہی اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانے میں واقعات اور کرداروں سے یہ کام لینے کے لیے افسانہ نگار کو نہ صرف انتخاب کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ محرکات کے تخلیقی اور تاریخی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ مفتی اپنے افسانوں میں تاریخی نفسیاتی شعور کی مدد سے سوالیہ کردار تخلیق کرتا ہے۔ اور پھر واقعات کی مدد سے ان کے جوابات فراہم کرتا ہے۔ "ریت کی لہریں" کا مرکزی کردار باقر، افسانے کے ابتدائی حصے میں ایک سوال اور بعد میں خود ہی اپنا جواب بن جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے قریب مفتی پر یہ الزام بھی تھا کہ وہ کہیں کہیں مبہم ہو جاتا ہے۔ لیکن آج کے دور میں شاید نئی نسل یہ جانتی بھی نہیں کہ ان کی طرح ایک دور میں مفتی بھی ذرا مشکل سے سمجھ میں آیا کرتا تھا۔ ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ مفتی کا فن ایک ایسے مقام پر آ چکا ہے جہاں اسے بہتر طور پر سمجھا اور سراہا جا سکتا ہے۔ لوگ مفتی کو جنس کا افسانہ نگار سمجھتے ہیں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جنس مفتی کے افسانوں میں صرف حوالے کے طور پر آتی ہے۔ اصل مقصد تو ان جبلتوں کا تجزیہ کرنا ہے جو حیات کے اصول مرتب کرنے میں انسان کی ڈوری ہلاتی ہیں۔ جنس جہاں خود ایک مسئلہ ہے وہاں بہت سے مسائل پیدا کرنے کا موجب بھی بنتی ہے۔ سیاسی اور معاشی گھٹن کے عالم میں کچے کوٹھوں، پکے مکانوں، حویلیوں اور جنگلوں کے اندر جنسی کشمکش مفتی کے افسانوں میں خام مواد کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مفتی مسئلے کو درمیان سے شروع کرتا ہے اور پھر ماضی اور حال کی طرف پھیلا دیتا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے مفتی کے افسانوں میں کھڑکی کا ذکر بہت آتا ہے۔ کھڑکی دراصل مفتی کا Medium ہے جس کی مدد سے وہ نفرت، چاہت، گھٹن، خواہشات اور

ضروریات جسم کا بھرپور مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اسی مشاہدے کو افسانے میں استعمال کرتے ہوئے کھڑکی کا سہارا اس کے لیے ایک لازمی جزو کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مفتی کے ہر تیسرے افسانے میں کھڑکی کا ذکر ضرور آتا ہے۔ بلکہ "سو پرہ کی کھڑکی" افسانہ تو صرف کھڑکی کی مدد سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ اس کے علاوہ مفتی نے محل اور کوٹھے کا ذکر بھی بہت کیا ہے۔ محل کو وہ ایک بھرپور علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جہاں کہیں بھی محل کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے اندر کا کھوکھلا پن افسانے کا جواز بنا ہے۔ شان و شوکت اور شرافت کے پس پردہ نفسیاتی رویوں کی کشمکش اور پھر قدروں کا احترام ایک ایسی کھلن ہے جو "وقار محل" میں پوری طرح نظر آتی ہے۔ اور اگر قدروں سے ڈرے ہوئے انسانوں اور انسانوں سے ڈری ہوئی قدروں کے حوالے سے اس افسانے کو دیکھا جائے تو "محل" ایک کمل اور بھرپور قدر کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ "وقار محل" کی لڑکی اپنے جنسی اور نفسیاتی حوالے سے قدروں کو توڑ دیتی ہے اور باپ اپنے نفسیاتی عمل سے انہیں جوڑنے کی کوشش میں جانے کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا مفتی اپنے تخلیقی اور اک سے جو سیاق و سباق ترتیب دیتا ہے وہ مفتی کے فن کو ذاتی حیثیت بخشتا ہے جہاں تک "کوٹھے" کے ذکر کا تعلق ہے یہ وضاحت کر دوں کہ مفتی کے افسانوں میں جس "کوٹھے" کا ذکر ہے وہ طوائف کا کوٹھا نہیں، بلکہ عام کچے پکے مکانوں کا کوٹھا ہے جہاں کھڑا ہو کر ہر شخص اپنے صحن میں جھانک سکتا ہے۔ میں یہاں یہ ضرور کہوں گا کہ مفتی کے ہاں ایک نفسیاتی منطق ہر لمحہ موجود رہتی ہے۔ اور دوسرے لفظوں کی طرح کوٹھے کا بھی ایک نفسیاتی پس منظر ہے جس کا تعلق کھڑکی سے ہے۔ اور کوٹھا تو ہندستان کی ایک سطح ہے۔

اس تجزیے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مفتی نے بلاشبہ اپنا ایک سکول تخلیق کیا ہے۔ اور اب اس سکول کی تجدید اور ارتقا کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے علاوہ مفتی نے اپنے مخصوص نظریاتی رویے سے طبقات کی نفسیات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ طبقاتی نفسیات کی جتنی خوبصورت عکاسی مفتی نے کی ہے مشکل سے ہی کسی اور افسانہ نگار کے ہاں نظر آئے گی۔ ایسے موضوع کی ترسیل کے لیے مفتی کے کردار قدرتی ترتیب کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ چار گوٹ میں تینوں طبقوں کی نفسیات کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔

"جہاں ادائیگی کے لیے پرس سبز نوٹ اگلتے ہیں اور ساتھ ہی گرہ سے کھولے ہوئے میلے سکے کھنکتے ہیں پھیری والوں کے آوازے فقیروں کی صدائیں، دفتر کے بابوؤں کی دبی دبی آہیں، صاحبوں کے "اے ہٹ جاؤ آگے سے" اور مزدوروں کے ننگے بے تکلف قہقہے گونجتے ہیں۔"

ان لائنوں میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ مختلف طبقوں کی نفسیات اور نفسیات کے عمل دخل سے ترتیب پانے والی عادات کو ظاہر کرتی ہے اور ان کے مخصوص رویئے ان کے حال کے ساتھ ساتھ ماضی کو بھی سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ یہی نہیں آگے چل کر مفتی نے نفسیاتی عمل کے تضادات اور ان کے ماخذ بھی دریافت کیے ہیں اور ان تضادات کی روشنی میں ان لوگوں کی نفی کی ہے جو کسی بھی نظریے کو صرف فیشن کے طور پر اپنا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مفتی نے ان انقلابیوں پر بھی طنز کی ہے جو صرف اپنی باتوں اور حلیے کی مدد سے انقلابی بننا چاہتے ہیں۔ چار گوٹ کی لائنیں ہیں۔

"لمبے بالوں والا کمیونسٹ شاعر حلوہ کھاتے ہوئے جوش میں اٹھ بیٹھتا ہے "یہ مہنگائی حکومت کا قصور ہے۔" وہ تقریر شروع کرتا ہے لیکن چچا بیچ ہی میں بول اٹھتا ہے "تو گویا گھی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ سب ہنس پڑتے ہیں اور لمبے بالوں والے کی کوئی بات نہیں سنتا اور وہ چپ چاپ بیٹھ کر حلوہ کھانے لگتا ہے۔"

یہ صورت صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ لمبے بالوں والا کمیونسٹ اندر سے کھوکھلا ہے وہ اپنے نظریات اور ان کی عملی صورت سے ایماندار نہیں۔ وہ نظریات کو صرف اپنی ذات کے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ نظریہ ذات کی نفی کر کے اجتماع کو اہمیت دیتا ہے۔ لیکن وہ گھی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا اور چاہے کسی کو ملے یا نہ ملے۔ یہی نہیں بلکہ مفتی کے افسانوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی بھی نظریے کے ساتھ وابستگی کو عملی صورت میں بھی واضح اور پختہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک غلط مسلک پر سختی سے قائم آدمی اس شخص سے کہیں بہتر ہے جو اپنے مسلک کے ساتھ سنجیدہ نہ ہو۔ مثلاً چارگوش میں برائے نام انقلابی کے ساتھ ساتھ مفتی نے ملّا کا بھی تجزیہ کیا ہے۔

"مسجد کا ملّا وضو کرتے ہوئے اجو کی طرف دیکھتا ہے۔ لاحول پڑھتا ہے اور پھر دیکھتا ہے اس کی آرزو ہے کہ اجو صراطِ مستقیم پر آجائے۔ دل ہی دل میں وہ جانتا ہے کہ صراطِ مستقیم سے اس کا حجرہ قریب تر ہے بہت قریب۔" ملّا کے ظاہر و باطن کا تضاد ایک خاص نفسیاتی پس منظر رکھتا ہے۔ لیکن یہاں پر ملّا نام نہاد انقلابی سے مختلف نہ ہونے کے باوجود مختلف ہے۔
"لمبے بالوں والا اشتراکی رک جاتا ہے "ہاں" وہ اجو کی طرف دیکھتا ہے "یہ سب حکومت کا قصور ہے۔"

ان لائنوں میں ملّا اور انقلابی کے عمل کے نتائج میں تو کوئی فرق نہیں، لیکن صرف ان کے نفسیاتی حوالے انہیں اپنے عمل کے انداز میں جدا کرتے ہیں۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کوئی بھی کام چاہے وہ کسی بھی طریقے سے کیا جائے اگر اس کا مخصوص نتیجہ نکلتا ہو تو تمام چیزیں ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں اور نتیجہ بنیادی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ عمل اور نتیجے کی ایسی ہی کیفیت مفتی کے کئی اور افسانوں میں بھی ملتی ہے جسے اس نے بڑے عمدہ تجزیئے سے پیش کیا ہے۔

شروع میں میں نے کہا تھا کہ مفتی نے قدروں سے جڑے ہوئے انسانوں اور انسانوں سے جڑی ہوئی قدروں کو کرداروں اور واقعات کی مدد سے اپنے افسانوں کے قالب میں اتار دیا ہے۔ لہٰذا اب اگر اس سطح پر میں یہ کہوں کہ مفتی نے اس خاموش، مگر پُر شعور عمل کو ظاہر کر کے ثقافتی خلیج کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے تو شاید مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ مفتی نے جذبات و احساسات کے اندر چھپی ہوئی ان قدروں کو چھیڑا ہے۔ جو جنسی، سیاسی یا معاشی کسی بھی حوالے سے بالآخر ثقافتی تغیر کا موجب بنتی ہیں۔
اس سلسلے میں مینا کے پاؤں، گڑیا گھر، بابا کھونٹ والا، ریت کی لہریں اور جوار بھاٹا کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اور اسی لیے میرا خیال ہے کہ اپنے فن اور موضوع کے لحاظ سے مفتی کے افسانے نہ تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مفتی نے اپنے دور تک پھیلی ہوئی فنی اور موضوعاتی یکسانیت اور اکتاہٹ کو ختم کر کے افسانے کو ایک نیا نثری موضوعاتی آہنگ عطا کیا۔ اس نے ایسے جملے تخلیق کیے جو آج بھی نئے افسانے میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔

نفط کا مضمون اس کا پیچھا کر رہا تھا اور لوند لوند اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹپک رہا تھا۔

اس نے وہ پیغام کانوں سے نہیں بلکہ جسم کے بند بند میں سُنا۔
تڑپ اُداسی بن کر اس پر چھاتی جا رہی تھی۔
گونگے الفاظ ناچ ناچ کر اسے پریشان کر رہے تھے۔
تنگ سڑک یوں گھومتی ہوئی نکل گئی تھی جیسے چلتے چلتے کھو گئی ہو۔
بجلی کے کھمبے حیرانی سے بُت بنے کھڑے تھے۔
اندھیرے کے بڑے بڑے بھیانک ٹکڑے چمگادڑوں کی طرح پر پھڑپھڑاتے پھر رہے تھے
اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے جسم کو اُٹھا نہیں سکتا۔
تاریک اندھیرے کا ایک کلہاڑا اس کی طرف بڑھا۔
باہر درختوں کی ٹہنیوں میں گرتی ہوئی بوندیاں یوں سنائی دے رہی تھیں، جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو — دور جاتی بین کر رہی تھی۔
رقص وہ پھول ہے جو جب تک نسائیت کی آہوں سے نہ بھیگے خوشبو نہیں دیتا۔
سمندر کی تھکی ہاری لہروں کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

مفتی کی افسانہ نگاری کو مفتی کی شخصیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ مفتی کی شخصیت نے مفتی کی افسانہ نگاری کو اور افسانہ نگاری نے اس کی شخصیت کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اسی لیے پچھلے چند سالوں میں لکھے جانے افسانوں پر اس کی شخصیت کا بہت گہرا اثر ہے۔ ان افسانوں میں مفتی نے Modern کے حوالے رشتوں کی نئی پہچان کی ہے اور اس نئے نفسیاتی عمل کا سراغ لگایا ہے۔ جو قدروں کی تجدید کے بعد پوری شدت کے ساتھ کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں "باپ اور بیٹا" کی مثال بڑی جاندار اور ٹھوس ہے۔

مفتی بدستور لکھ رہا ہے۔ اپنے ہمعصروں میں وہ ایسا افسانہ نگار ہے جس کے فنی نظریے نے نئے دور کے تقاضے اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اور وہ بڑی جرأت اور بیباکی سے اس کا اظہار کر رہا ہے اور اسی لیے اس کا نام ہند و پاک افسانہ نگاروں کی فہرست میں نمایاں اور اہم مقام رکھتا ہے۔

علی پور کا ایلی

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

"علی پور کا ایلی" کے پہلے ایڈیشن کی ہر جلد کے ساتھ ایک چھپی ہوئی پرچی تھی جس پر لکھا ہوتا تھا "اسے آدم جی انعام بھی ملا" اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کے بابت ابن انشا صاحب نے کہا "اسی لئے مشہور ہے کہ اس پر آدم جی انعام نہیں ملا" اور یہ فقرہ بعد میں اس کے ہر ایڈیشن کے ساتھ چھپا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ۱۹۶۱ء کا آدم جی انعام ملنے والا تھا تو یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس ناول کو انعام ملنا چاہیے یا ملے گا یا ضرور ملے گا۔ مگر انعام "تلاش بہاراں" کو دیا گیا۔ مولوی عبدالحق بقید حیات تھے اور میں ان کی خدمت میں بیباک تھا۔ ان کے ناول کے سلسلے میں ذوق پر مجھے کبھی اعتماد نہیں ہوا۔ جب پہلا آدم جی انعام "خدا کی بستی" کو دیا گیا تھا تو میں نے مولوی صاحب سے کہا تھا "آپ نے ترازو سے تول کر انعام دیا ہے" اور ان سب کتابوں کو جو مولوی صاحب کے کمرے میں ایک پلنگ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا "آخر ان سب کتابوں سے تو وزن میں یہ سب سے بھاری ہے" مولوی صاحب ہنس دیتے تھے۔ پھر آئندہ سال "تلاش بہاراں" کو انعام ملنے کے بعد میں ان کے پاس گیا وہ قریب المرگ تھے مگر باتیں کرتے تھے میں نے کہا "آپ کی انعام دینے کے سلسلہ میں "علی پور کا ایلی" اس قدر زیادہ بڑی کتاب تھی کہ ترازو ہی ٹوٹ گئی لہذا اس کا وزن ہی نہ ہو سکا اور اس کم وزن کی کتاب "تلاش بہاراں" کو آپ نے انعام دے دیا" مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد غش میں آجاتے تھے۔ کہہ نہیں سکتا کہ انہوں نے یہ بات پوری سنی یا نہیں۔ مگر میں یہ سب ہی سے کہتا رہا۔ یہ عجیب واقعہ تھا کہ ایک ناول کی سب سے بڑی تعریف یہ ہو کہ "اسے آدم جی انعام ملا" اور دوسری کی تعریف یہ کی جائے کہ "اسے آدم جی انعام نہیں ملا"۔ انعام ملنا یا نہ ملنا بے معنی ہو گیا اور ایک مدت تک جن ناولوں کے بابت یہ کہا جائے کہ انہیں انعام ملا یا نہیں ملا وہ بھی بے معنے ہو گئیں۔ اس بنا پر مجھے "علی پور کا ایلی" سے ایک مبہم سا تعصب ہو گیا اور میں اسے بھی ایسی چیز ماننے لگا جو میرے پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ اس تعصب کو ختم ہوتے بھی عرصہ گزر گیا۔ پھر ایک دن جمیل صاحب کے یہاں اس کا وہ ایڈیشن رکھا ہوا دیکھا جو "ہماری لائبریری" کے سلسلہ کا ہے۔ ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری سے بھی بہت پہلے ہی سے واقف تھا اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے یہ طے کیا کہ "علی پور کا ایلی" کو ضرور پڑھ کر دیکھوں گا اور جمیل صاحب سے کتاب عاریتاً لے لی۔ پڑھنا شروع کیا تو اس میں ایسا محو ہوا کہ دن دن بھر اور رات میں کافی دیر تک پڑھتا رہا۔ ساتھ لئے لئے پھرا اور کراچی کی بسوں میں دفتروں میں جہاں بھی ذرا سا وقت مل گیا اس کی طرف رجوع ہو گیا کتاب ضخیم تھی اور جلد پیپر بیک جب میں نے اسے جمیل صاحب کو واپس دیا تو اس کے بلا مبالغہ آٹھ الگ الگ ٹکڑے ہو چکے تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے میرے ہاتھ میں دیکھ کر تعجب سے یہ بھی کہا "اتنی موٹی کتاب پڑھ رہے ہیں" میں نے جواب دیا چھوٹی یا موٹی کی مجھے کوئی پروا نہیں یہ کتاب حد سے زیادہ دلچسپ ہے اور میرے

لئے۔ میں غیر ادبی یا ادب سے گری ہوئی کتاب نہیں پڑھتا اور یہ مجھے آج کی سب ادبی کتابوں سے زیادہ دلچسپ معلوم ہو رہی ہے جلد سے جلد ختم ہو جائے گی۔" غرض اس کتاب کو ایک ہلکی قسم کی نفرت سے میں نے شروع کیا مگر یہ میرے لئے دلچسپ اور قابل وقعت ہوتی گئی اور آخر میں اس شکل پہ پوری اتری کہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ مشفق محمد طفیل اڈیٹر "نقوش" نے اس کا "فسانۂ آزاد" سے مقابلہ کیا اور ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا "علی پور کا ایلی" اور "فسانۂ آزاد" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آخر الذکر ناول کے میدان میں پہلا ڈگمگاتا ہوا قدم ہے اوّل الذکر اس میدان کے ادب میں پورے طور پہ تسخیر کا نشان ہے۔" انہوں نے کہا "اس پر ایک مفصل مضمون لکھ ڈالئے۔" میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ رسالہ نقوش سو گیا ہے مجھے بھی نیند آ گئی اور وہ مضمون رہ گیا۔ مگر اب جب اس تصنیف کو مقبول ہوئے بارہ برس ہو گئے میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پہ مضمون لکھ ڈالنے ہی کا فیصلہ کیا۔ نقوش نہ معلوم کب نکلے گا مگر مضمون کو تیار رہنا چاہیئے۔ لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اب ان تمام ناولوں پہ مفصل لکھنے کی ٹھان لی ہے جو ۱۹۴۷ء سے اب تک وجود میں آئی ہیں اور جو ہماری ناول نگاری میں ایک نیا بلکہ ناول کے اصل معنوں میں پہلے دور کے نقوش جما رہی ہیں۔ میری رائے ہے کہ "علی پور کا ایلی" ان آدھے درجن ناولوں میں ہے جو ہمیشہ اہم مانی جاتی رہیں گی۔

ممتاز مفتی صاحب ناول کا واضح شعور رکھتے ہیں اور اس لئے ان کے سلسلے میں انعام کی کوئی اہمیت نہ ہونا چاہیئے کیونکہ انعام تو بیشتر ایسے لوگوں کو ملتا ہے جن کو ناول کا کوئی شعور نہیں ہوتا اور وہ اپنی ناول کے بابت یہ نہیں بتا سکتے کہ اس میں ہے کیا۔ برخلاف اس کے مفتی صاحب انکسار کے ساتھ فرماتے ہیں۔

> "اپنی دانست میں میں نے ناول نہیں بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقا پیش کروں۔ اسی لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا ہے لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پنچھی کی طرح پر جھاڑ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔"
>
> بہرحال اردو ادب میں کوئی طویل کہانی ایسی نہ ملے گی جس کی تفصیلات براہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور بناؤ کے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں۔۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ بیتی ہے۔
>
> (پیش لفظ، طبع ثانی)

پیش لفظ طبع اوّل ۱۹۶۱ء میں وہ پہلے ہی فرما چکے تھے۔

> .. .. — یہ روئداد ہے۔
> ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔
> جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔
> جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔

جو پلا پروان چڑھا اور باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔

جس نے کئی ایک محبتیں کیں لیکن محبت نہ کر سکا۔ جس نے محبت کی پھلجھڑیاں اپنی انا کی تسکین کے لئے جلائیں لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالانہ پیدا کر سکا۔

جو زندگی بھر اپنی انا کی دھندلی بھول بھلیوں میں کھویا رہا حتیٰ کہ بالآخر نہ جانے کہاں سے ایک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو سے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور افسانہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گریز کی وجہ میرا عجز ہے اور ان کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی لہذا افسانوی رنگ شامل کرکے میں نے اپنے عجز کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

ظاہر ہے کہ دو پیش لفظوں میں جو کچھ نہیں ملتا ہے اسے باقاعدہ تنقید سی کہا جا سکتا مگر وہ ممتاز مفتی صاحب کے ناول کے سلسلے میں شعور کا ضرور اندازہ دیتا ہے اور اس میں سے حسب ذیل خاصی باتیں سامنے آتی ہیں۔

اول یہ کہ وہ مستقل واقعیت پسند ہیں۔ وہ اپنا مخصوص تجربہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ وہ بالکل صحیح رہے۔ یہ بات ہمیں ناول کی بنیاد تک لے جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ناول کی ابتدا کرنے والوں کے سامنے یہی مخصوص مقصد تھا اور یہی مقصد آج بھی تمام بڑے ناول نگاروں کا ہوتا ہے۔ گر وقت کے ساتھ اسی مقصد میں اور بھی مقاصد شامل ہو گئے۔ خاص طور سے بیسویں صدی میں تجربہ یا زندگی کے حالات کو نظریہ یا تخیل کے اثر سے بدل کر پیش کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی سے ناول نگار مفکر کے روپ میں سامنے آتا ہے اور ناول متاثر کرنے کے علاوہ ذہنی بحث کا مواد بہم پہنچاتی ہے۔ مفتی صاحب اس جھنجھٹ میں نہیں پڑ رہے ہیں۔ وہ نہایت غیر جانبداری سے ایک سرگزشت ایک روئیداد کو بے کم و کاست بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ناول کا ارتقا عجیب سا ہے۔ ابتدا کے ناول نگار اسے فسانہ سمجھ کر بہت سے فرضی، خیالی اور مبالغاتی چیزیں اس میں داخل کرتے رہے اور آج کل کے ناول نگار جدید تجربوں کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ اس لئے ہمارے یہاں ایسی ناول جسے ناول کا NORMA کہا جائے ڈھونڈے نہیں ملتی۔ مفتی صاحب اس فارم اس "خالص ناول" کی راہ پر چل رہے ہیں اور "علی پور کا ایلی" اپنے نام سے ہی اور پھر مواد سے بھی زندگی کی اس طرح ترجمانی ہے جیسی واقعیت پسندوں اور فطریت پسندوں نے کی تھی۔ جدید دور میں اس راہ پر چلنا اور قدم میں لغزش نہ آنا بھی ایک کمال ہی کے دائرے میں آتا ہے اور ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ اسے کہاں تک حاصل کر سکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقعیت پورے طور پر ہمکنار رہنے کی کوشش سے اس ناول میں دو خصوصیات پیدا ہونا لازمی تھیں اور انہیں مفتی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے پیدا ہونے دیا۔ اول یہ کہ تجربوں کا ڈھیر لگتا چلا گیا اور اس میں سے انہوں نے چھننے کی کوشش نہیں کی۔ ناول کو آج کل انتخاب اور ارتفع کے اصولوں کے ماتحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی تفصیلات غائب ہو جاتی ہیں اور بہت سی سکڑا کر رکھی جاتی ہیں۔ قاری کو ناول نگار کے اشاروں سے خود بہت کچھ اپنی طرف سے شامل کر لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح ناول فنکار اور صاحب ذوق دونوں کی تخئیل کے ساتھ ساتھ چلتے رہنے سے بنتی ہے۔ وہ اکثر لوگوں کے لئے

مبہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہے اور بیشتر لوگ اسے اپنی اپنی طرح پر سمجھتے ہوئے اسے پڑھ جاتے ہیں۔ مفتی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں اور اس معاملے میں بھی وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ناول نگاروں کے ساتھ ہیں جو تفصیلات کو زیادہ سے زیادہ واضح طریقہ پر پیش کرنے کے قائل تھے اور زندگی کا واضح سے واضح نقشہ پیش کرتے تھے۔ اس لئے "علی پور کا ایلی" میں ہمیں جدید فن کاری سے انکار بلکہ اختلاف ملتا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرانا طریقہ اب بھی کتنا زوردار ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی وجہ سے اس کی ضخامت بڑھ گئی ہے جس پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہے۔ ناول کے سلسلے میں ہمارے یہاں کوئی واضح نظریہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ اسی تصنیف کو ناول کہتے ہیں جو کم از کم ایک ہزار صفحوں کا ہوگا۔ زیادہ تر لوگ ضخامت سے گھبراتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ناول حد سے حد چار سو صفحوں کی ہو۔ "علی پور کا ایلی" کی ضخامت زیادہ تر لوگوں پر بار ہے۔ میں اسے ایک قسم کی بدمذاقی سمجھتا ہوں اصل میں ضخامت مواد اور فن پر مبنی ہوتی ہے اور مفتی صاحب کا جو مواد ہے اور جس طرح وہ اسے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اتنی ضخامت گھیرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا جتنی کہ ناول کی ہے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ مفتی صاحب بغیر سوچے سمجھے روانی کے ساتھ ناول سرہراتے گئے ہیں اور انہیں فنکاری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ سب تفصیلات اور طوالت کیا محض لاپرواہی کی وجہ سے ہے یا اس کے پیچھے کوئی مستقل فنی صورت چھپی ہوئی ہے اور ہے تو وہ کس حد تک دلکش ہے۔

تیسرے یہ کہ تخلیق کار کی حیثیت سے وہ تمام قوت کردار نگاری پر صرف کرنا چاہتے ہیں اور خاص طور پر ناول کے ہیرو اور اسی کی حد سے زیادہ نارمل نوعیت کو دائمی حقیقت بنا دینا چاہتے ہیں۔ جدید ناول کردار نگاری کے سلسلے میں بھی باغی ہے اور بالکل واقعاتی کردار پیش کرنے کے بجائے اشاریت وغیرہ پر عمل کرتی ہے مفتی صاحب اس کے بھی خلاف ہیں اور ان کی وہ راہ ہے جو "ڈون کوکسوٹے" سے شروع ہو کر "پکوک پیپرز" تک چلی آتی ہے اور آج بھی سومرسٹ ماہم وغیرہ کی راہ ہے۔ غرض اس معاملے میں بھی وہ ناول نگاری کے تمام الجھاووں کو الگ کر دیتے ہیں۔ ضخامت اور وسعت کے لحاظ سے اس کتاب میں کردار کا ابھرنا اور نئے نئے کردار کا ہر موڑ پر سامنے آتے رہنا لازمی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کس قدر زندہ ہیں اور کیسے مل جل کر ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں اور یہ دنیا کس حد تک دلکش ہے پھر ناول کا مرکزی کردار ایلی سب سے زیادہ مصنف کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے بابت چند بنیادی باتیں وہ پیش لفظ ہی میں کہہ دیتے ہیں۔ یہ باتیں نہایت معمولی ہیں مگر معمولی ہونے ہی کی وجہ سے تعجب انگیز بھی اور اسی مثل کی مصداق ہیں کہ حقیقت مجاز سے زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہے۔ غرض یہ ناول صاف صاف طور پر اس قسم کی ناول ہے جسے کرداری ناول کہا جاتا ہے اور اس کی کامیابی بالکمال آخر کار اس کے ہیرو کی تخلیق کی کامیابی بالکمال سے وابستہ ہونا چاہیئے اور اگر ایلی دنیائے ناول نگاری کے ان کرداروں میں سے ایک ٹھہرتا ہے جس کو حقیقت سے زیادہ حقیقی اور ایک معاشرے کا مکمل نمائندہ کہا گیا ہے تو ناول کو عظیم درجہ میں جگہ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

غرض ہم اس ناول کو یہ جان کر اور مان کر شروع کرتے ہیں یہ ناول کی بنیادی روح یا سیدھی ضرور راہ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان جدید ضروری یا غیر ضروری آلائشوں سے پاک ہے جو تجربہ کی طرح اس پر تھوپی جا رہی ہیں۔ ہمیں پیش لفظوں میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اسے ناول کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی رائے کو کوئی خاص وقعت

نہیں دیا جا سکتا۔ یہ لوگ ناول میں رومان دیکھنا چاہتے ہیں اور "علی پور کا ایلی" میں بس اسی حد تک ہے جتنا کہ ایلی کے کردار سے ممکن تھا۔ اس کو رنگ دینا واقعیت سے غداری کے مترادف ہوتا اس لئے مفتی صاحب رومانی رنگ چڑھانے سے گریز کیا۔ اس لئے عام ناولوں کو پڑھنے والے اسے غیر دلچسپ کہیں گے۔ مگر میں نے پڑھ کر دیکھا ہے اور بہت سے لوگ میرے ہم رائے ہیں کہ اس میں بے پناہ دلچسپی ہے۔ ویسی دلچسپی ہی جیسی ناول کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے ڈھونڈتے ہیں اور ویسی دلچسپی بھی جو جیسی ایک نئی دنیا سے کشمکش سے خاص طور پر عشق بازی کی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے اس میں ایک مسلسل عشقیہ قصہ بھی ہے جو بڑے جذبات کے ساتھ سامنے آتا ہے اور بڑے دلکش کردار کے مختلف پہلو دکھاتا ہے۔ ایلی اور شہزاد کا عشق بڑی عجیب حقیقت ہونے کی وجہ سے اچھا خاصا رومانی ہے اور اس میں پڑھنے والوں کو اس کے نتیجوں کو ہم بڑی دلچسپی سے نکلتے ہوئے دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں۔ لاہور میں ایلی کا ایک اور عشق چلتا ہے اور وہ بھی بڑا دلچسپ ہو جاتا ہے ایک اس وجہ سے کہ وہ اپنی جگہ عجیب ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ وہ ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ کو ختم نہیں کرتا۔ پھر جب ہمیں ایلی سے شروع ہی سے دلچسپی ہو جاتی ہے تو اس کی ہر بات جو ایک حد تک نارمل بھی ہے ہمارے لئے نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسے ناول کے سلسلے کے تعصبات سے ذہن کو خالی کر کے پڑھیں تو زندگی کا جو منظر یہ پیش کرتی ہے وہ حد سے زیادہ دلچسپ ہو جائے گا اور ضخامت ہماری دلچسپی کی راہ میں کسی طرح حائل نہ ہو گی بلکہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ یہ اور بھی ضخیم ہوتی تو اچھا تھا۔

(۲)

مفتی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں زندگی کی تفصیلات ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہیں۔ ڈھیر کا لفظ بے ترتیبی کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر کسی ڈھیر پر غور کیجئے تو اس میں بھی ایک ترتیب ضرور نظر آئے گی۔ یہ ترتیب انسان کی دی ہوئی تو کسی طرح نہ ہو گی مگر قدرت نے انسان کے ڈھیر کئے ہوتے مواد سے ایک ترتیب ضرور پیدا کر دی ہو گی۔ اناج کے ڈھیر کو دیکھیے اس کی ایک چوٹی ہو گی اور سارا مواد اس سے شروع ہو کر ایک مثلث کی شکل ضرور اختیار کر گیا ہو گا۔ "علی پور کا ایلی" بھی اسی قسم کی ترتیب قدرتی ترتیب رکھتا ہے۔ اس کی ابتدا ایلی یا ایلیاس کے گھر کا سین سب میں پہلے سامنے لاتا ہے باپ علی احمد دو مائیں ایک سگی ماں ہاجرہ اور ایک سوتیلی صفیہ صاف صاف ایک دوسرے سے مختلف اور اپنی جگہ پر منفرد ہیں۔ ایلی کو بچہ ہی کہا جا سکتا ہے مگر وہ ان میں سے ہر ایک سے ایک خاص ردعمل رکھتا ہے۔ علی احمد مستقل کردار ہے۔ وہ ایلی کو ملازم کی طرح سمجھتے ہیں اور ایلی ان کی آواز سن کر دھک سے رہ جاتا ہے اور ان کا حقہ بھرنے لگ جاتا ہے۔ ہاجرہ بھی ایک ملازمہ کی طرح ہے جو قناعت اور رواداری سے زندگی گزار رہی ہے اور وضع دار اور حسین صفیہ کے حکم پر چل رہی ہے ایلی صفیہ سے نفرت کرتا ہے اور گھورتا ہے مگر اس کے حکم پر چلنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس طرح وہ ماحول پورے طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے جو ایلی کے کردار کے سلسلے میں بنیادی ہے۔ ناول کی یوں ابتدا بڑی معنی خیز اور فنی لحاظ سے بڑی مناسب ہے۔ علی احمد اور ایلی جو تمام داستان پر حاوی رہیں گے پوری انفرادیت کے ساتھ سامنے آ جاتے ہیں اور ایلی کا عورتوں کی طرف ردِعمل جو داستان

طور سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہاجرہ کو وہ ہیروئن اور صفیہ کو وہ ولین سمجھتا ہے اور علی احمد کے ہر حکم پر چلنے کو ں سے محبت کرتے ہیں جو اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ کھانا کھاتے وقت گوشت کی بوٹی اسے وہ انگلیوں سے اٹھا محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی وہ انگلیوں سے اٹھا کر دینا ایسا پیار ہے جو ثابت کرتا ہے کہ علی احمد کا خاص رجحان لی طرف ہے یا پھر عورتوں سے تعلق پیدا کرنے میں ہے مگر وہ ایلی کی طرف باپ کے فرائض اور باپ کی محبت کے تقاضے لہستے سے گریز ہی کریں گے۔ بہر حال ابتدا ایک ڈرکس ہے جس میں ساری ناول دکھائی دے گئی ہے اور اس سے علی پور کی طرف ہر یز اور اس کا مناسب بیان نہایت قدرتی ہے۔ اس کا آصفی محلہ ایک چھوٹی سی دلکش دنیا ہے اور اس کے بادشاہ اور ملکہ علی احمد اور صفیہ کے نقوش اور بھی گہرے کر کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ فرحت بھی دبے پاؤں اس گھر میں آجاتی ہے۔ صفیہ اور ہاجرہ کے آپس میں تعلقات انوکھا انتقام اور نرالا امتحان کے واقعات کے ذریعہ روشن ہو جاتے ہیں۔ پہلا باب "گرد و پیش" اسی طرح مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر باب کی ایک سرخی ہے اور اس کے ہر حصہ کی ماتحت سرخی ہے جو الجھی میں چھپی نظر آتی ہے۔ ظاہرہ یہ تاثر ہوتا ہے ناول کی قاشیں اور اس پہ چھوٹی قاشیں کر دی گئی ہیں، مگر یہ سب قدرتی اور منطقی تسلسل سے جڑی ہوئی ہیں۔ سرخیوں پر سرخیوں کا استعمال وضاحت میں اور دھیان لگا رہنے میں خاص مدد کرتا ہے۔ کتاب ایک ڈھیر ہے اور معمولی ڈھیر بھی نہیں بلکہ بڑے سائز کے قریب بارہ سو صفحوں کا چوڑا اور اونچا ڈھیر ہے۔ ایک پہاڑی کہئے مگر اس پہ جانے کا راستہ چکر کا بھی مگر صاف ہے۔ ہر چوٹی اور موڑ پہ نشان کے تختے لگے ہوتے ہیں اور سفر کرنے والے کی راہ نمائی کرتے ہیں اور ہر ہر گوشے کی نوعیت کا علم بہم پہونچاتے ہیں۔ "علی پور کا ایلی" قدرتی طور پر ایک بے شکل پہاڑی ہے مگر مفتی صاحب نے پورے شعور کے ساتھ اور فنکارانہ آنچ اور جدت کے ساتھ اس پہ چلنے والے کے لئے ہر ہر قدم پہ دلچسپ راہبر کے فرائض ادا کئے ہیں۔ بے خیالی میں یہ مان لینا ممکن ہے ناول کا کوئی اسٹرکچر نہیں ہے مگر غور سے دیکھنے پہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بے ہنگم ڈھیر کو ناول نگار نے نہایت صحیح اور سائنسی شکل دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہر باب کی بڑے حروف میں لکھی ہوئی سرخی اور پھر اس کے تحت درجنوں چھوٹے حروف میں لکھی ہوئی سرخیاں ایک عظیم ڈھیر کو جو قدرت کا بنایا ہوا ہے انسان کے ذہن نشین کراتے اور مواد کو ایک فارم دینے میں خاص طور پر ممد ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ ناول کا کوئی خاص فارم نہیں ہے۔ ناول زندگی کی طرح بے ہیئت ہے مگر اس پہ مصنف نے ایک فارم عائد ضرور کیا ہے۔ یہ عام طور سے جو فارم ناولوں میں نظر آتے ہیں ان سے مختلف ہی نہیں بلکہ ان کا متضاد ہے مگر غور کرنے والوں پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل نئی چیز ضرور ہے اور مفتی صاحب کا شعور داد کے قابل ہے کہ انہوں نے فارم کو بھی خوبی سے چھپایا ہے یا مواد بھی وہ اسی خوبی سے چھپ گیا ہے کہ ناول نگاری میں ایک بالکل نئی اور اچھوتی ہیئت کا اضافہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس ہیئت کو قدم بقدم طے کرنا ایسا طول عمل ہوگا کہ تنقید بھی کتاب کے برابر ضخیم ہو جائے گی۔ ہر چھوٹی سرخی ایک دلچسپ واقعہ سامنے لاتی ہے اور بڑی سرخی ان کا ایک مستقل ترتیب میں آجانا دکھاتی ہے۔ واقعات نئے اور دلچسپ ہیں اور ہر ایک سے یا تو کوئی نیا کردار ابھرتا ہے یا جانا پہچانا ہوا کردار کوئی نئی چھب دکھاتا ہے تفصیل سے ہٹ کر ہم دیکھتے ہیں تو علی احمد۔ ایلی

اور کچھ آگے چل کر شہزاد کے قصے پلاٹوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ علی احمد کے معاشقوں کے قصوں کا تار جس سے ایلی ضمنی طور پر وابستہ ہے ایک دلچسپ لکیر بناتا ہے۔ پھر ایلی اور شہزاد کے عجیب و غریب معاشقہ کا پلاٹ اس طرح آتا ہے کہ وہ ناول کا مرکزی پلاٹ ہو جاتا ہے۔ مگر اصل پلاٹ ایلی کی سرگزشت کا ہے۔ یہ ناول کو علی پور سے باہر لے جاتا ہے۔ لاہور اور امرت سر کے واقعات اس میں شامل کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کا وہ علاقہ جو علی پور کو مرکز مان کر اور امرت سر کو حد مان کر دائرے میں لایا جا سکتا ہے ناول کا ماحول ہے۔ ایلی دلی اور بمبئی کی بھی خبر لیتا ہے مگر جہاں بھی جائے یہ ماحول اس کے ساتھ ہے اور ساتھ نہیں تو اس کے دل اور اس کے کردار میں رچا بسا ہے۔ پنجاب اور اس کا وہ مخصوص حصہ جسے علی پور کہتے ہیں ایک واقعاتی گمرنئی اور عجیب کائنات کی طرح پوری ناول پر حاوی رہتا ہے اور مختلف بلکہ گوناگوں قصوں اور کردار کو ایک اتحاد میں لاتا ہے۔ اس طرح اس وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مواد میں ایک تخیلی اتحاد صاف طور پر موجود نظر آتا ہے۔ ناول کی سرخی "علی پور کا ایلی" نہایت سادہ، نہایت سیدھی، سپاٹ اور اردو میں سرخی دینے کی رسم کو دیکھتے ہوئے نہایت درجہ بلکہ ممکن حد تک بے مزا ہے مگر یہ انگریزی اور یورپی ناولوں کی سرخیوں سے بالکل ہم آہنگ ہے اور ان کی طرح بغیر کسی دکھاوے کے ناول مواد کے ہر ہر جزو میں پروئی ہوئی نظر آتی ہے۔ اتحاد کا تاثر اسی سے شروع ہوتا ہے اور سارا مواد اس سے ابل کر نکلتا ہوا اور تمام میں پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایلی جو بنیادی طور پر علی پور ہی کا ہے ایک طرف علی محمد سے متعلق ہے اور ان کی تمام دلچسپیوں میں ایک مبصر کی طرح شریک ہے۔ پھر اس کی اپنی بھی دلچسپیاں اور مصروفیات ہیں۔ تعلیم حاصل کرتا ہے اور ملازمت پر آتا ہے اور اس سلسلے میں وہ واقعات کا منفرد مرکز نظر آتا ہے۔ اس کا خاندانی گھر ہے اور اس میں اس کے عزیز ہیں جن سے بھی اس کے تعلقات ہیں مگر اس کی سب سے خاص دلچسپی اپنے ایک عزیز کی بیوی اور اپنے سے کافی بڑی چھ بچوں والی شہزاد سے ہو جاتی ہے۔ شہزاد بھی اپنی جگہ پر بڑی دلکش اور زندہ دل عورت ہے اور ایلی کے اس عشق کا قصہ ناول کا سب سے زیادہ دلچسپ پلاٹ ہو جاتا ہے۔ کسی پراسرار اصول کے ماتحت ناول کو عشقیہ قصہ ہی مانا جاتا ہے اور عام ناول میں روایتی عشق کے واردات اور ایک معشوق کے لئے دو عاشقوں میں کش مکش سے ہی سارے قصے کی تعمیر ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی کو جیسے کسی روایتی امر سے کوئی تعلق نہیں ہے ویسے روایتی عشق بازی بھی ان کے دائرے سے خارج ہے۔ ایلی اور شہزاد کے عشق میں ایک بات حد سے زیادہ حقیقی ہے مگر ہم اسے بجا اور پر خلوص عشق ضرور کہیں گے۔ یہ عشق ناممکن بھی کہا جا سکتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ مضحک بھی ہو سکتا ہے مگر اس کی واقعیت میں ایسا زور اور ایسی عظمت ہے کہ ہم اس کے مظاہر سے پہ ایک عجیب تخیلی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور آخر میں اسی کو ناول کا حاصل اور ممتاز مفتی کا اہم ترین تجربہ مان لیتے ہیں۔ اس قصے کے مدارج بہت ہیں اور بہت دلچسپ ہیں مگر ان میں سے بہت ہی خاص کا ذکر کر کے ہم اس کی اہمیت، نوعیت اور جدت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ایلی کی زندگی میں شہزاد اس کے ایک قریب عزیز کی دولہن کی طرح داخل ہوتی ہے اور علی پور کے اصفی محلے کے سب سے خاص مکان ہی میں آ کر رہنے لگتی ہے۔ وہ ایلی سے کافی بڑی ہے اور پھر جلد ہی چھ بچوں کی ماں ہو جانے کی وجہ سے اس سے اور بھی دور ہو جاتی ہے۔ مگر دونوں کا دل قریب ہے۔ شہزاد اس کی طرف ایسی توجہ دکھاتی ہے جیسے کوئی چاہنے والی بھاوج چھوٹے دیور کی طرف دکھائے اس معاملے میں اگر عشق بھی آ جاتا ہے تو وہ پاک قسم کا ہے۔ دونوں کا تعلق جنس سے بالاتر ہے۔ ایلی کے جنسی رجحان کو

وہ یہ کہہ کر روکتی ہے کہ وہ اسے دوسری عورتوں کی طرح نہ سمجھے۔ ایلی اس کی طرف آکر پلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ اسے مشین
یا او کلام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے بازوؤں پر ایلی کی خاص نظر رہتی ہے۔ شہزاد بھی جب دیکھو "چھن سے" اس
ہے۔ اس مبہم مگر دلچسپ محبت میں جنس داخل ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک دفعہ جب شہزاد سامان کی الگ کوٹھری میں ہے
حملہ کر دیتا ہے مگر ناکامیاب رہتا ہے۔ اس سے ان دونوں کے تعلقات میں فرق نہیں آتا اور آگے چل کر ایک دن یہ
کہ ایلی شہزاد کو بھگا لے جائے گا۔ وہ اس کام کے قانونی پہلو پر ایک مشہور وکیل سے رائے لیتا ہے اور وکیل یہ سن
کی مال ہے ایلی کو کسی دماغ کے ڈاکٹر سے رائے لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں دماغی خلل
ہے۔ شہزاد ایلی کے ذہن میں بس جاتی ہے اور ہر وقت اس کے تصور میں "چھن سے" آ جاتی ہے۔ وہ لاہور میں تعلیم
رہتا ہے اور قریب کے گھر میں رہنے والی ایک اونچے خاندان کی لڑکی سے اس کے پیچ کافی بڑھتے ہیں اس لڑکی کو
ہوئے وہ لاہور کے مختلف مقامات پر جاتا ہے۔ دونوں بہت قریب آ جاتے ہیں اور یہ بھی امکان نظر آتا ہے کہ دونوں
مگر اس عشقیہ معاملے کے دوران بھی شہزاد اس کے تصور میں آتی رہتی ہے۔ ایلی کی ماں اس کی ایک جگہ منگنی کی رسم بھی پوری
مگر اس سے بھی ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ علی احمد جن کا خاص مشغلہ عورتوں سے لگاؤ کرتے رہنا
سے بھی متعارف ہونے کا موقعہ دیتا ہے اور ایلی کو ایک رنڈی پھانس لینے کی بھی ناکام کوشش کرتی ہے۔ ایلی خود بھی ایک
گندے رنڈی خانے کی گندگی میں کود ہی پڑتا ہے۔ مگر آخر میں ایسا کچھ ہوتا ہے کہ ایلی اپنی تعلیم ختم کر کے اسکول کی ملازمت
شہزاد سے اس کی شادی ہو ہی جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی بڑی خوشگوار نظر آتی ہے مگر آگے چل کر شہزاد کو اپنی پہلے شو
شادی کی بنا پر ایلی سے سخت شکایت ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان کشیدگی سی رہتی ہے اور آخر میں شہزاد دق سے
اب سے ایلی کی توجہ اپنے شہزاد سے لڑکے عالی کی طرف رہتی ہے۔ وہ بمبئی میں صحافی کی حیثیت ملازم ہوتا ہے اور جب
سلسلے میں لاہور میں فسادات ہوتے ہیں تو "عالی عالی" کرتا ہوا لاہور بھاگ آتا ہے۔

یہ خاص پلاٹ کا بہت ہی زیادہ مختصر خلاصہ ہے اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پلاٹ معاون کی طرح شا
ہیں۔ علی احمد کے ٹین کا سپاہی بن کر متعدد معاشقے کرنے کا ایک طویل قصہ ہے۔ ایلی کے تعلیم اور اس کے بعد ملازمت حا
ایک الگ پلاٹ ہے۔ اس کے مختلف عزیزوں کے بھی قصے ضمناً ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ہر پلاٹ مناسب تفصیل کے ساتھ
ہر سلسلے میں ڈرامائی سین بڑی مناسب اور موزوں مکالموں کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں۔ کتاب کی ضخامت میں اضا
مگر کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی جملہ کیا لفظ بھی بلا ضروری ہے اور اسے ناول سے خارج کر کے ناول کو بہتر فارم
بنیادی طور پر ناول کرداری قسم کی ہے یعنی اس کا مقصد اہل فرد کو مختلف واقعات سے گزرتے ہوئے دکھانا ہے
ناول یعنی ایسی ناول کے جو مختلف لوگوں کے درمیان کشمکش دکھائے اور وقت کے ساتھ اس کشمکش کے درجہ
بھی شامل ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے ہی بنتا ہے کہ یہ ناول ندرت کے ساتھ ڈرامائی بھی ہے۔ مقامات بھی بدلتے ہیں
ہے کہ علی پور اور اس کا آصفی محلہ اور اس میں بھی ایلی کا خاندانی محل ایک اسٹیج ہے اور اسی پہ سارا قصہ دکھایا جا رہا۔

لاہور اور دوسرے مقامات پر کچھ ضمنی سین ضرور دکھائے گئے ہیں مگر یہ مرکزی اسٹیج سے اس قدر متعلق ہیں کہ اتحادِ تاثر میں کسی طرح فرق نہیں آتا۔ آخر میں قاری کے تصور میں جو زیادہ باقی رہ جاتی ہے اس میں علی پور اس کے خاص قسم کے مکانات۔ آصفی محلہ اور اس کے خاص محل کے رہنے والے بڑے دلکش طریقہ پر زندہ نظر آتے رہتے ہیں۔ اتحاد کے ساتھ تو تنوع کو ہم آہنگ کرنے کی بڑی اچھی مثال قائم ہوتی ہے۔ مفتی صاحب فن کاری سے زیادہ زندگی کی طرف متوجہ ضرور ہیں اور اسی کو اہمیت دیتے ہیں اور ناول کو ایک ڈھیر کھڑ دینے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے مگر ان کی ناول شاید لاشعوری اور قدرتی طور پر مواد کو اس طرح سمیٹتی اور ایک مستقل شکل یا ہئیت میں تبدیل کرتی جاتی ہے کہ ان کی غیر معمولی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ضخامت ڈرا دینے والی چیز ضرور ہے اور بیشتر ضخیم ناولوں کا مواد ناول نگاروں کی گرفت سے نکل ہی جایا کرتا ہے اس لئے سطحی نظر رکھنے والے لوگ ضخامت اور بے ترتیبی کو ہم معنے سمجھتے ہیں۔

"علی پور کا ایلی" ایسے کلیوں کی صاف رد ہے۔ اتنے وسیع مواد کو ترتیب میں لے آنا۔ ایک مستقل فارم کا تاثر دینا اور دلچسپی کو قائم رکھنا ہی وہ کمال ہے جو مفتی صاحب کو ناول نگاروں کی صف اوّل میں کھڑا کر دیتا ہے۔ طفیل صاحب نے ضخامت میں لطف پیدا کرنے کا خیال کرتے ہوئے "علی پور کا ایلی" کا سرشار کے "فسانہ آزاد" سے مقابلہ کیا ہے۔ "علی پور کا ایلی" فسانہ آزاد کا سا جنگل کا جنگل ضرور سامنے لاتا ہے مگر اس جنگل کی ایک بڑی اہم اور فنکارانہ ترتیب بھی ہے جو فسانہ آزاد ایسی بے تکان چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ آتی اور اردو ناول کو ایک کٹھ بڑھاسے سے ایک دلکش تعمیری ارتقا کر کے پہونچ جاتی ہوئی دکھاتی ہے۔ فسانہ آزاد کو اگر اس سے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے تو تضاد کے لئے یعنی یہ واضح کرنے کے لئے کہ محض ناول نما فسانہ اور صحیح معنوں میں ناول کے درمیان کیا فرق ہے۔ "علی پور کا ایلی" کے بعد شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ناول اپنے پورے رنگ و روپ کے ساتھ اردو ادب میں کھپ گئی۔ مفتی صاحب اس کے لئے داستان۔ سرگزشت۔ ڈھیر وغیرہ کے الفاظ استعمال کریں یعنی نقاد کی حیثیت سے اس کی بابت ناول کا لفظ استعمال کرنے سے ہچکچائیں مگر ان کے اندر جو فن کار ہے وہ ان تنقیدی شکوک سے بالاتر ہے اور اس کی موج خرام نے گل کترے ہیں اور ایک بالکل نیا انفرادی اور دلکش چمن ایجاد کر دیا ہے۔

(۳)

مفتی صاحب کی تخلیقی قوت کا سکہ ان کے افسانوں ہی سے جم چکا تھا مگر "علی پور کا ایلی" اس کے بڑے پیمانہ پر عمل اور کامیاب عمل کی مثال سامنے لاتا ہے۔ تخلیق قصہ گوئی کے ذریعہ بھی ظاہر ہو سکتی ہے مگر اس کا خاص میدان باوجود کچھ جدید ناول نگاروں کے سخت اختلاف کے کردار نگاری ہی رہا۔ "علی پور کا ایلی" میں ہر جگہ کردار منڈلاتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی منفرد زندگی کا واضح اور دلکش نقش ضرور چھوڑ جاتا ہے مگر ناول نگار کی عظیم تخلیقی قوت کا بیان مظاہر میں لافانی کردار کے ذریعہ خاص طور پر ہوتا ہے اور یہ کردار پہلو بدلتے۔ ارتقا کرتے حقیقت سے ہمکنار رہتے ہوئے حقیقت سے زیادہ حقیقی ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اردو ادب میں ان کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا۔

علی احمد کا کردار سب میں پہلے سامنے آتا ہے اور پوری ناول پر ایک مستقل نہ بدلنے والے شخص کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اس کی زندگی کی ہر دلچسپی منتشر ہو کر ایک خاص شپہ کی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے کام میں چوکس ہے۔

اس کے ابا عام طور پر ایک چٹائی پہ بیٹھے ڈیسک پہ رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے

تھے۔ وہ قمیص اتار کر بیٹھا کرتے تھے اور ان کی دھوتی میلی ہونے کے علاوہ پھٹی ہوتی تھی اور اس کے پلوؤں کو ادھر اُدھر سرکے رہنے کی عادت تھی جو آپی پر بے حد گراں گزرتی تھی۔

اس عالم میں وہ ہمیشہ نیچے نظر آتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے آواز لگاتے ہیں "ایلی حقہ بھر دو"۔ حقہ بھی اس کے کردار کا ایک حصہ ہے اور پھر ان سب سے زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہے ان ایک بیاہتہ بیوی ہاجرہ ایلی کی ماں ہیں جو اب محض نوکرانی ہو کر رہ گئی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایک بنی ٹھنی بیوی صفیہ ہیں جو زیادہ تر ان کے کمرے کی زینت رہتی ہیں۔ مگر صفیہ ان کے بے پناہ جنسی رجحان کی ایک مثال ہے ورنہ

"دادا کی وفات کے بعد علی احمد نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہاجرہ کو ہمیشہ کے لئے آٹو چھیلنے اور آٹا گوندھنے پر مامور کر دیا اور خود کمر ہمت باندھ کر اپنے جذبہ تسخیر کو مطمئن کرنے چل نکلے۔ وہ اپنی ایستادہ چال۔ ابھری ہوئی چھاتی۔ فراخ پیشانی اور رنگین تبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے پھر نکلتے میں ڈان کوہٹے کی سی پرجوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کارزار کی دہلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے کہ انھیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سلا دے گا اس لحاظ سے ان کی شخصیت جنگجو سورما مین کے سپاہی اور دودھ پیتے بچے کی دلچسپ آمیزش سے بنی تھی اور چونکہ ان کا جنسی پہلو شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا اس لئے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تار و پود تھا۔ مین کا سپاہی جنگجو سورما۔"

علی احمد اس صفت کے تمام تر نہد سے ہونے کی وجہ سے یک طرفہ کردار یا کری کیچر بھی کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی کے اور بھی پہلو ہیں۔ وہ ایلی کے محبت دار باپ ہیں اور اس کی ترقی کے لئے اپنی بساط بھر سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ گھر کے اپنی حد تک اچھے خاصے منتظم بھی ہیں اور عام انسانی فرائض کی ادائیگی میں کوئی خاص کوتاہی نہیں کرتے مگر زیادہ تر ان کا مین کے سپاہی والا پہلو ہی سامنے آتا رہتا ہے اور بڑی والہانہ دلچسپی کے ساتھ وہ عورتوں کو فتح پر فتح حاصل کرتے ہیں ایسے ہیرو کی طرح مصروف نظر آتے ہیں جس کا ایک اور ایک ہی مقصد حیات ہو۔ ان میں مجلسی زندگی کی جملہ صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ انھیں لکھنے سے تو عشق تھا عشق۔ یہ عشق گھر کا حساب اور پیدائش اور موت کی تاریخوں کے نوٹ کرنے پر محدود تھا۔ ایک جنرل رجسٹر کے علاوہ وہ گھر سے متعلقہ ہر فرد کا ایک رجسٹر کھولے ہوئے تھے۔ پھر ان کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔

حتیٰ کہ وہ عورت پر بھی روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے میں روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی ٹھوس چیز سے کیا تعلق۔

ان کے کردار پورے طور پر پہلودار (ROUND) کرنے کی مفتی صاحب کوشش کرتے ہیں اور ہمیں یہ محسوس کرا دیتے ہیں کہ ان کی زندگی کے سب ہی انسانی پہلو ہیں اور وہ ہرگز کری کیچر نہیں کہے جا سکتے مگر ان کی جنسی زندگی کے مناظر پر مناظر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں ہر ایک منفرد، نیا اور نہایت درجہ دلچسپ اور ان کے کردار کی تمام زندگی اس بات میں سمٹ آتی ہے عورت دیکھتے ہی یہ مین کا سپاہی کس طرح زندہ ہو جاتا ہے۔ کس ہوشیاری سے عورت کو تسخیر کر کے اپنے مخصوص کمرے میں لے جاتا ہے۔ یہ کمرہ ایک قلعہ ہے جس میں پکارے جانے پر

بھی ایلی کو واضح ہوتے ہوئے بڑا دقت لگتا ہے کیونکہ وہاں ہر وقت رجسٹر پہ علی احمد کے قلم چلتے رہنے کے باوجود کسی جنسی حرکت کے ہوتے رہنے کا بھی امکان ہے جس کو راز میں رکھنا رسم دنیا ہے۔

غرض علی احمد کا سارا قصہ اور اگر سارا نہیں تو اس کا اہم ترین اور دلچسپ ترین حصہ ان کی مختلف عورتوں کو ڈوون کیہوٹے کی طرح تسخیر کرنے کے واقعات کا احاطہ کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعات بہت ہیں اور ہر ایک کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان میں سے کسی کا اقتباس کرنا طول عمل ہے اور ان کا خلاصہ کرنے سے ان کی زندگی ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ان میں ایلی بھی اسی طرح شریک نظر آتا ہے جیسے ڈوون کیہوٹے کے ساتھ سانکو پانزا۔ سروانٹیز کے یہ دونوں کردار یورپ کی تمام ناول نگاری میں ڈکنس کے مسٹر پکوک اور سام ویلر تک ماحول کے حساب سے روپ بدل بدل کر آتے رہے ہیں۔ مفتی صاحب کے درمیان میں بھی وہ آفاقی اور دائمی ٹائپ ہیں۔ اور "علی پور کا ایلی" میں وہ علی احمد اور ایلی کے ذریعہ پنجاب کے اس علاقے سے متعلق ہو کر جو ناول کا مخصوص ماحول ہے پیش ہوتے ہیں۔ علی احمد ہر قسم اور ہر طبقہ کی عورت کے آتے ہی ڈوون کیہوٹے کی طرح اپنا بھالا تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایلی سانکو پانزا کی طرح اس کی بیدلی سے مدد میں مصروف نظر آتا ہے۔ گھریلو لڑکیاں جیسے سارہ اصغری وغیرہ۔ وضعدار عورتیں جو بیویاں بن کر رہنا چاہتی ہیں اور رہ جاتی ہیں۔ کسبیاں جو وقتی تعلق ہی کو کافی سمجھتی ہیں۔ ایک ہندو عورت جو علی احمد سے تعلق تو کر لیتی ہے مگر اس کے یہاں کا پانی نہیں پیتی اور ایلی کو اس کے لئے کنوئیں سے پانی نکال کر ایک بوتل میں بھر کر لانا پڑتا ہے سب ہی ان کے دائرے میں آتی ہیں اور ان سے دم کے دم میں تسخیر ہو جاتی۔ اپنے سے رشتہ کی عزیز کی جوان بیوی شہزاد بھی ان کی توجہ کا مرکز ہو جاتی ہے اور وہ اس سے جس طرح لطف لیتے ہیں اس کا منظر بھی عجیب ہے وہ کھل کھلا کھل کھلا لگاوٹ کی ہنسی ہنستے ہیں اور شہزاد کا نام لیتے جاتے ہیں۔ بخیران کا وار خالی جاتا ہے مگر ان کی جنسی فطرت ایسی خوبی سے سامنے آجاتی ہے کہ جس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ مفتی صاحب نے جس تفصیل سے اور جتنے جزویات کے ساتھ ان کے حالات بیان کئے ہیں وہ کردار نگاری کے لئے بڑے ضروری ہیں خاص طور سے مزاحیہ کردار نگاری کے لئے۔ شیکسپیر نے فالسٹاف کو پورے طور پر جمانے کے لئے ایک نہیں تین تین ڈرامے لکھے۔ ڈکنس نے پکوک کو پراثر بنانے کے لئے ہزار صفحے کے قریب کالے کئے۔ ہمارے یہاں سرشار کا خوجی بھی اب تک اردو کا سب سے زیادہ مزاحیہ کردار اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہزاروں صفحوں پہ بار بار آتا ہے۔ علی احمد خوجی سے تو کم ہی جگہ گھیرتے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ پہلودار اور واقعاتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے عظیم مضحک نمائندہ ہیں اور آفاقی مزاج کے بھی نمائندہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اردو ناول نگاری میں ان سے بہتر مزاحیہ کردار اب تک نہیں پیش ہوا تو غلط نہ ہوگا۔

"علی پور کا ایلی" کا کردار نگاری میں دوسرا اہم شاہکار شہزاد ہے۔ یہ حسن جوانی اور زندہ دلی کی صورت ہے اور حسین عورت کی بیباکی اس میں عجیب و غریب کرشمہ دکھاتی ہے۔ اس کا سب میں پہلے ذکر شریف سے اس کی شادی کے سلسلے میں آتا ہے۔ اس نے شریف پہ ہتھیلی میں بند مینڈک پھینکا۔ شریف بیان کرتا ہے:۔

> واقعی وہ شہزادی ہے۔ اسم بامسمیٰ ہے۔ مجھے چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دہلیز سے باہر آگئی۔ اور میرے روبرو اس نے ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔
>
> ...... اس نے مینڈک کو ایک ہتھیلی میں ہی رکھا تھا اور جب میں سو رہا تھا تو وہ ہتھیلی میرے منہ پہ

پھینک دی اور میں ڈر کر اٹھ بیٹھا اور وہ ہنسنے لگی۔

اور پھر ایلی کی نگاہوں تلے ایک شوخ حسینہ آ کھڑی ہوئی۔ اور پھر شادی میں رخصتی کے بعد ریل کے ڈبے میں ایک مونگیا گٹھڑی اسے دکھائی دیتی ہے۔

> مونگیا گٹھڑی میں جنبش ہوئی دو سفید خون میں بھیگے ہوئے ہاتھ ایلی کی طرف لپکے تازہ خون کی بو کا ایک ریلا آیا۔ ایلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا کہ گٹھڑی کے پٹ کھل گئے دو گلابی جھیلیں جھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ مخملی بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں اور بالآخر ایک چمکدار تبسم اور ایلی یوں کھڑا تھا جیسے پتھر کا بن چکا ہو ڈبے کے دوسرے لوگ جھلملا کر معدوم ہو چکے تھے۔

شہزاد کی کردار نگاری اس کے دوسرے لوگوں پر تاثر کے ذریعہ ہوتی ہے۔ آصفی محلہ میں آتے ہی وہ ہر شخص کے لئے حسن و ناز کا عجیب کرشمہ ہو جاتی ہے مگر ایلی اس سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے جسے اس کے حسن کی ہر ہر ادا رومانیت کا مظاہرہ نظر آتی ہے۔ اس کی چال چھم سے آ جانا۔ اس کا دوپٹہ اوڑھنے کا انداز۔ اس کے ماتھے پر تل۔ اس کے گورے گورے کھلے بازو۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سنگ مرمر کے پیر۔ اس کا لنگاؤ اس کی بے نیازی۔ وہ چیز جسے محلے والے بے شرمی کہتے ہیں اور اس کی بے پناہ ذہانت جس کی بنا پر وہ سب کے باوجود ایلی سے شوخی کرنے کا بہانا نکال لیتی ہے بار بار بیان ہوتا ہے اور یہ سب ایک سچے عاشق کے نقطہ نظر سے جس کی بنا پر اس میں حد درجہ کا حسن ٹپکنے لگتا ہے۔ مفتی صاحب شہزاد کو دنیا کی حسین ترین چیز کی طرح پیش کر دیتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایلی کے تاثرات ہی کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ شہزاد سے انھیں خود ویسا ہی دلی تعلق ہے جیسے ایلی کو تھا۔ وہ ساری ناول ان کے تجربہ کی چیز ہے ہی مگر اس تمام تجربہ میں جس چیز نے ان کے دل کو سب سے زیادہ چھوا ہے اور جس چیز نے ان کے تخیل کو سب سے زیادہ آباد اور روشن کیا ہے وہ شہزاد یا شہزاد کی طرح کی کوئی محبوبہ ہے۔ ایلی کے شہزاد سے بڑھتے ہوئے تعلقات کی نفسیاتی تحلیل اس طرح ہوتی ہے کہ قاری کو وہ اپنا خود کا حال معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی کردار نگاری کا کمال ہے اور ان تمام معاملات میں حد سے زیادہ واقعیت کے ساتھ جو رومانی پیچیدگی تعجب پیدا کرتی رہتی ہے اس کے انکشاف میں مفتی صاحب کردار نگاری کے اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ کتاب کے وہ مقامات جن میں شہزاد چھم سے آ جاتی ہے عجیب طرح روشن اور دلکش ہو جاتے ہیں۔ ان کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور تکرار کے باوجود ان کا لطف کم نہیں ہوتا۔ شریف کی اجازت سے پہلے پہلے ایلی کو چائے پر بلانے آنا۔ پھر اکیلے میں ایلی سے بیباکانہ ملنا۔ مختلف ملاقاتوں میں ایک وقت اتنا قریب اور اس وقت اتنا دور ہو جانا عجیب کرشمہ قدرت کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرتا رہتا ہے۔ ایلی کے عشق میں جسمانی محبت کو دخل نہیں ہے۔ ایسی محبت سے اسے اپنے باپ کے معاشقوں کی وجہ سے نفرت ہو چکی ہے اور قاری بھی شہزاد کے جسمانی حسین تاثرات کے باوجود اسے آسمانی چیز ہی کی طرح چاہنے لگتا ہے۔ وہ اسے قبول بھی کرتی ہے گر ٹالتی بھی ہے۔ وہ اسے ستاتی بھی رہتی ہے۔ اس کے گالوں کو سہلاتی ہے اس کے چٹکی بھی لے لیتی ہے مگر وہ شادی شدہ عورت ہے اور اپنے کو پسپا نہیں ہونے دیتی۔ ناول کا وہ سین جس میں ایلی بند بیٹھک میں چھپا بیٹھا ہے اور بے انتظار کر رہا ہے۔ شہزاد وہاں آئے تو اس پر حملہ آور ہو شہزاد کو پورے طور پر سامنے لے آنے کا کمال ہے:۔

> دروازہ کھلا شہزاد اندر داخل ہوئی۔

ایلی بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے نکلا اور لپک کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ شہزاد نے ڈر کر ایک ہلکی سی چیخ ماری۔

کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزاد کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی "تم یہاں" ایلی کی خاموشی اور اس کے دہشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سرِ نو گھبرا گئی۔ "یہ سب کیا ہے؟" وہ بولی "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

ایلی جواب دیئے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" وہ زیرِ لب چلائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ ایلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی شدید کمتری کی خفت مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا اصلی روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی کھال پہننے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔

"خدا کے لئے" وہ چلائی۔ "ہٹ جاؤ۔ یہ کیا دیوانگی ہے؟"

وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔

"ضرور تم پاگل ہو گئے ہو" وہ بولی "تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

"ہاں" — ایلی نے بھیانک آواز میں جواب دیا "نہیں ہوں۔"

"ایلی کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔" وہ چلائی "پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔"

ایک رنگین دھندلکا ایلی کے قریب تر آتا گیا اور قریب اور قریب اور وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزاد کا خون چوسنے کے لئے جونک کی طرح آگے بڑھے۔ ہاتھ بازو، منہ سر جسم وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چوسنے لگا۔ پہلے تو شہزاد نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ تھک کر۔ ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر گر پڑی۔ بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی دہشت ختم ہوتی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار جھٹی میں نیا ایندھن دھکیلنے کی کوشش کی۔ چرار چرار۔ ریشمیں کپڑے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

"ایلی پاگل نہ بنو" ایک بار پھر مردہ جسم کے اس تودے میں حرکت ہوئی "پاگل نہ بنو" مدھم آواز میں مبہم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی بپھر گیا۔

دھپ — ایک ہوائی سی چھوٹ گئی اور دفعتاً گرد و پیش تاریک ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ خفت ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ دہشت کا سہارا ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوانگی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں خفت اور شکست کے

منفی احساسات کا ریلا امڈا آ رہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے منہ میں گھاس کا تنکا ہو۔ وہی تنکا جو پورس اپنے منہ میں لئے کر سکندر کے حضور میں حاضر ہوا تھا۔

اس نئی خفت کو مٹانے کے لئے ایلی ایک بار پھر آگے بڑھا اور دیوانہ وار شہزاد کے بند بند چومنے لگا اور بالآخر تھک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر پڑا۔ "مجھے تم سے محبت ہے شہزاد مجھے تم سے۔"

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ بیٹھی اور اس کا بازو ایلی کی طرف بڑھا اور اسے تھپکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا اطمینان تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سرزنش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد تھپک رہا ہو۔

ماں کا ہاتھ عجیب نفسیاتی اشارہ ہے۔ شہزاد عورت کے تمام منصب بڑی پیچیدگی کے ساتھ ادا کر رہی ہے۔ وہ ماں بھی ہے۔ بیوی بھی۔ اور محبوبہ بھی۔ معشوقانہ انداز پوری بیباکی کے ساتھ اس میں شروع ہی سے دکھائی دیتے رہے۔ وہ ایک شخص کی قانونی بیوی بھی ہے اور بچہ پیدا کرنے میں زرخیز بھی کہی جا سکتی مگر ایلی کی طرف اس کا رجحان مادرانہ بھی ہے۔ ہمارے معاشرے کے لوگ عورت کے بابت دھڑ سے کچی یا پکی رائے دے دینے کے عادی ہیں۔ مفتی صاحب ان لوگوں سے کس قدر بالاتر ہیں اور عورت کی پیچیدہ اور غیر مطمئن فطرت کا کتنا زبردست مشاہدہ رکھتے ہیں۔

شہزاد کا رویہ متضاد سوالات ایلی کے دل میں لاتا ہے اور ہم بھی ان سوالات میں پڑ کر تعجب کے عالم میں آ جاتے ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا شہزاد ایلی سے محبت کرتی ہے۔ اس سلسلے میں وہی معاملہ سامنے آتا ہے کہ نہ اعتبار مجھے ہے نہ اعتبار انہیں۔ مگر یہ صاف ہے کہ شہزاد کی اس زمانے میں جب ایلی چھٹی سے کر علی پور آتا ہے اور شریف بھی آ موجود ہوتا ہے حرکات سے محبت ٹپکتی ہے اور وہ اسے بڑی ذہانت سے بیباکی کے روپ میں چھپاتی رہتی ہے۔ وہ ایلی کو ڈھونڈنے جاتی ہے اور اسے گھسیٹ کر لے آتی ہے۔ اپنے شوہر کے سامنے ایک فرضی محبوب کی باتیں کرتی ہے جس کا اشارہ اپنی طرف ہوتا ہے۔ وہ اس پردے میں صاف صاف عشق کا اظہار کرتی ہے اور اکیلے میں اس کی تصدیق بھی کر دیتی ہے۔ گھر میں اور محلہ میں ہر ایک کو شبہ ہے کہ وہ ایلی سے عشق لڑا رہی ہے اور وہ اس عشق کو کبھی بیباکی میں اور کبھی ذکاوت کی باتوں میں چھپا لیتی ہے۔ اس کا جھم سے آ جانا۔ اس کا چھن سے آ جانا قیامت ہے۔ وہ وارفتہ بھی ہو جاتی ہے مگر اپنے کو سنبھالے رہتی ہے۔ وہ اپنے میاں کی افسردگی سے نفرت کا اظہار بھی کرتی ہے اور ایلی سے محبت کا بھی۔ اس کی محبت میں جنس کا مقام بھی کچھ میں نہیں آتا۔ وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتی ہے اور پاک عشق کرنا چاہتی ہے۔ اس کے میاں سے ایلی رقابت محسوس کرتا ہے تو اسے جتاتی ہے کہ جسمانی تعلق کچھ نہیں ہے۔ کئی بار وہ کہہ دیتی ہے "تم مجھے سمجھے کیا ہو۔" "تم مجھے نہیں سمجھے۔" حقیقت میں وہ ایسا راز حیات ہے جس کو سمجھنا مشکل ہے۔ مفتی صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ شوخ تندخو کیا ہے۔ مگر وہ ایسا کرشمہ ہے جسے انہوں نے محسوس کیا ہے اور وہ ہمیں محسوس کرانے میں پورے کامیاب ہیں۔ ایلی اس کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہوتا رہتا ہے مگر وہ اس کے دل و دماغ میں ایسی بس گئی ہے کہ چھن سے تصور

میں آجاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بھی کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ گھر کے ہر کام میں فرد ہے اور دو چار بچے بھی ہو رہے ہیں۔ ایلی سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی ناز کبھی نیاز اور آخر میں اس چھ بچوں کی ماں سے کنوارا ایلی شادی کر لیتا ہے ایلی نوکر ہے اور وہ اس کے گھر کی بیوی نہیں دل کی بھی شہزادی بنی رہتی ہیں۔ شادی کے بعد وہ بیمار پڑتی جاتی ہے۔ سخت بیمار بھی ہوتی ہے مگر ہومیوپیتھی کی دوا سے ہونے سے بچ جاتی ہے مگر اپنی شریف سی لڑکی کے بارے میں اس کا ایلی سے جھگڑا ہوتا ہے وہ بالکل دوسری چیز ہے۔ ایلی اس سے الگ بھی ہو جاتا ہے اور بہت جلد اس کی طرف سے پھر جاتا ہے۔ آخر میں وہ دق ہو کر مر جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قیامت کے حسن پر پانی پھر گیا۔ شہزاد کے ارتقا کے سلسلے میں مجھے ناول نگار کی حیثیت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کے آخری دور کا کردار نہ دکھایا جاتا تو حسن اور خوبی کی مکمل تصویر ہمارے تخیل پر ثبت رہتی۔ ٹولسٹوئے نے اناکارینہ کو اس درجہ پر پہنچنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔ فلابیر نے میڈم بواری کے ساتھ بھی یہی کیا۔ مگر مفتی صاحب بالکل رومانی فنکار نہیں ہیں۔ وہ کامل ریلسٹ ہیں۔ وہ اس حسین مجسمہ کو رفتہ رفتہ مٹتا بھی دکھاتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ فنکار کو کچھ چیزیں چھوڑ بھی جانا چاہیے۔ بہرحال جس حسن و خوبی سے انہوں نے شہزاد کو پُر اثر بنایا ہے وہ ان کے تجربہ کا اور اس کو نہایت کامیابی سے پیش کرنے کا حق ہے۔ اردو ناول نگاری کی وہ سب سے زیادہ حسین اور واقعیاتی ہیروئن ہو جاتی ہے۔ وہ پنجاب کے حسن و کرشمہ کا اشارہ ہے۔ وہ ہر کرشمہ ساز عورت کا اشارہ ہے۔ وہ شیکسپیر کی کلیوپاترا کو نگر کی میلانات۔ ٹولسٹوئے کی انا۔ فلابیر کی ایما اور ہر عظیم ہیروئن کے ساتھ برابر کا مقابلہ کرتی ہے۔ اردو کی بساط ہی کیا ہے۔ ——— وہ ہماری ناول نگاری میں سب سے بڑا فنی شاہکار ہے۔

(۴)

مگر ناول کی ریڑھ کی ہڈی۔ روحِ رواں اور جان ایلی ہے اور مفتی صاحب اسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہیں۔ دوسرے کردار اس کی ضمن میں آتے ہیں اور اس کی طویل اور وسیع سرگزشت کی سطح پر چھوٹے چھوٹے نقوش بنا کر چلے جاتے ہیں۔ ان نقوش میں علی احمد اور شہزاد کے نقوش زیادہ حصہ گھیرتے ہیں۔ ایلی کے کردار واضح کرنے کے لئے ہی ساری ناول لکھی گئی اور اس کو مفصل طور پر سامنے لانے کے لئے پوری ناول کے خلاصے کی ضرورت ہے۔ اسی کے بابت پیش لفظوں میں مفتی صاحب نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کی رائے میں ایلی ایسا کردار ہے تمام تجربے اور تعلیم کے باوجود نہیں بدلتا۔ جس کے خیالات اور جذبات میں ہمیشہ کشمکش رہی جس کی بنا پر وہ اپنا کوئی کردار نہ بنا سکا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہر اخلاقی اور نفسیاتی معیار سے بالکل بے کردار شخص ہے مگر پھر بھی وہ مستقل حقیقت ہے۔ اسے پنجاب کے اس خطہ کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے جس کا مرکز علی پور ہے اور جس کا دائرہ امرتسر اور لاہور تک بھی جاتا ہے۔ وہ دِلی اور بمبئی میں بھی مقیم رہتا ہے مگر اپنی مخصوص پراسرار صفت نہیں کھوتا۔ ایسا بھی جو پانی میں ڈبکیاں لگاتا ہے مگر پر پھاڑ کر پھر جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے شاید بلکہ یقیناً ایسے لوگ کسی خاص جغرافیائی علاقہ سے مخصوص نہیں کئے جا سکتے۔ شاید بلکہ یقیناً ہر شخص کے اندر باوجود شدید اختلاف کے ایک ایلی چھپا ہوا رہتا ہے۔ وہ معمولی نہایت ہی معمولی ہستی ہے اور اسی لیے نہایت درجہ معمولی ہے۔ ہمارے تصور میں ایک معمولی انسان ہے مگر یہ معمولی انسان کہیں ڈھونڈھے نہیں ملتا اس لئے اسے نایاب

کہہ دیتے ہیں۔ ایلی وہ نایاب معمولی انسان ہے۔ مفتی صاحب کو وہ مل گیا ہے اور اسے انہوں نے صفحۂ ناول پر اتار دیا ہے۔ ناول کا شروع ہی سے یہ مقصد رہا کہ نارمل انسان کی شکل دکھائے۔ فیلڈنگ نے ٹوم جونس میں ایسا ہی کردار پیش کیا جو تمام ناول نگاروں کے لئے آج بھی ماڈل ہے۔ مفتی صاحب نے بھی ایلی میں ایسا کردار پا لیا ہے شاید وہ خود ایلی ہیں اور ساری سرگزشت انکی آپ بیتی ہے۔ ان میں ادیب کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی ہیں جو ایلی میں نہیں ہیں مگر ان کی نظر اپنی ان صلاحیتوں پر ہے جو نہایت معمولی نہایت عام ہیں اور جن میں پنجاب کا ہر آدمی ہندوستان کا ہر آدمی اور دنیا کا ہر آدمی ان کا حصہ دار ہے۔ دوسرے ناول نگار جب اپنے کو اپنی ناول میں پیش کرتے ہیں تو اپنی مخصوص صلاحیتوں کو سامنے لاتے ہیں یا انکساری میں اپنے کو اصلیت سے گرا کر پیش کر دیتے ہیں۔ مفتی صاحب کو نہ بڑھانے سے سروکار ہے نہ گھٹانے سے۔ ان کے ذاتی تجربے سے جو آدمی محض آدمی نکلتا ہے وہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ عموماً بڑا آدمی اور اس کا کوئی بڑا کام سنسنی پیدا کر کے عام آدمی کے لئے دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ایلی میں کوئی بھی بڑائی چھو کر بھی نہیں گزری اور نہ اس نے کوئی بڑا کام ہی کیا۔ وہ نہایت معمولی گھر میں پیدا ہوا۔ نہایت معمولی ماحول سے زندگی بھر گزرتا رہا۔ احساس کمتری کے سوا اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ قوت ارادہ کا تو اس کے اندر سوال ہی نہیں اٹھتا۔ زمانے کے اثرات اسے جیسے بہاتے گئے وہ بہتا رہا۔ ٹوم جونس راسکل ہے مگر تجربہ اسے ہیرو بنا ہی دیتا ہے۔ جرمن ناولوں میں جنہیں BILDUNGS ROMAN کہا جاتا ہے ایک معمولی لڑکا ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے اور آخر میں غیر معمولی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ایلی یوں بھی ارتقا نہیں کرتا۔ وہ ڈبکی لگانے کے بعد پر جھاڑ کر ویسے کا ویسا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کسی قسم کی قدروں سے سروکار نہیں جو وہ اپنے کو بہتر بنائے۔ وہ مٹی میں گڑا ہوا پودہ ہے جس کا قد اور سن مٹی اور پانی کے اثر سے بڑھ جاتا ہے مگر جس میں ذہنی یا اخلاقی شعور یا رجحان آنے کا سوال نہیں۔ باپ کا زور اگر نہ ہوتا تو وہ تعلیم بھی نہ حاصل کرتا۔ بسر اوقات کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ملازمت بھی نہ کرتا۔ اگر وہ جاندار نہ بنایا گیا ہوتا تو وہ جیتا بھی نہیں۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کو ہم چھوٹتے ہی بڑا گھٹیا کہہ دیں گے مگر وہ اس حد سے زیادہ گھٹیا پن کی وجہ سے نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے ہم وطنوں سے یعنی لاہور اور امرتسر کے جوار کے لوگوں سے ملئے تو ان میں ہر شخص ہر شریف خاندان اوسط طبقہ کا فرد ایلی معلوم ہوگا۔ ایک قصباتی ماحول کے ایک خاص گھر میں پلا ہوگا۔ والد معمولی ملازمت پر رہے ہوں گے مگر مستعد اور کام میں چوکس ہوں گے جس کی وجہ سے اس کی زندگی ایک معمولی دھرے پر لگ گئی ہوگی۔ بچپن کھیل میں، یا گھر کے معمولی کام بددلی سے کر آنے میں گزرا ہوگا۔ زبردستی اسکول اور کالج بھی گیا ہوگا اور کسی نہ کسی طرح تعلیم نپٹا کر معمولی ملازمت پر بھی آ گیا ہوگا۔ رسمی طور پر اس کی منگنی اور شادی بھی ہو گئی ہوگی۔ اگر اس میں کوئی غیر معمولی بات ہوگی تو وہ اس کی عورتوں کی طرف توجہ سے نمایاں ہوگی مگر یہ بات بھی غیر معمولی نہ کہی جا سکے گی کیونکہ اس کے خاندان میں ہر شخص اور اس کے ساتھیوں میں ہر شخص کو اسی طرح کی جنسی دلچسپی رہی ہوگی۔ عشق و حسن کا معیار اگر پست نہیں تو اعلیٰ بھی نہیں ہوگا۔ زندگی سے لگاؤ بھی جبلی سطح کا ہوگا اور اس میں ان خاص جذبات کے زور کی کوئی گنجائش نہ ہوگی جو اعلیٰ انسانیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ہم اچھا آدمی نہیں کہہ سکتے تو برا بھی نہیں کہیں گے۔ اس میں خود غرضی بھی واہی واہی ہوگی۔ وہ ایک گھٹیا سا علم ہوگا جو زمین پر اپنا جسم بڑھاتا گھٹاتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ اچھائیوں اور

بلائیوں میں پڑنے کا برابر اہل اور نا اہل ہوگا۔ اسے ہم خالص جذباتی IMPULSIVE بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ جذباتی طور پہ بالکل ٹھنڈا نظر آئے گا اور اگر کوئی زور میں اس کے جذبات ابھار بھی دے گا تو وہ تھوڑی دیر بعد پھر ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ جانوروں سے بہتر اور انسانوں کے دائرے میں اسی لئے لایا جا سکے گا کہ وہ ایک نئی تہذیبی انسانیت کے طریقوں میں بچپن ہی سے رچا ہوا ہوگا۔ مفتی صاحب ایلی کو اسی قسم کا آدمی دکھانا چاہتے ہیں جب بھی ایک جگہ وہ اسے بجھاتے ہوئے کیڑے سے بھی تشبیہ دے جاتے ہیں۔ غرض ایلی کوئی خاص آدمی نہیں ہے۔ وہ ہر آدمی EVERY MAN کی تصویر ہے۔

اس کے حالات بھی ایسے ہی معمولی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان شہروں اور ان قصبوں اور ان گاؤں سے مخصوص ہیں جہاں ایلی جاتا ہے۔ اس کی لاتعداد مردوں اور عورتوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان میں وہ سب سے مختلف اور اس طرح مختلف نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ تولا جا رہا ہے اور اس کا وزن سب سے کم نکل رہا ہے اور ناولوں کے ہیرو اس لئے دلچسپ ہوتے ہیں کہ وہ وزن میں سب سے کچھ نہ کچھ زیادہ ضرور نکلتے ہیں۔ ایلی کی دلچسپی یہی ہے کہ وہ ہر کام میں نا اہل ثابت ہوتا ہے اور ہر شخص سے ہر بات میں کم نظر آتا ہے۔ یہ ایک عجیب راز ہے جس کو مفتی صاحب نے دریافت کر لیا ہے اور اسی کی بنا پہ ہم ایلی کو حد سے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ اس کی باتیں حماقت ہیں مگر ہم کو ان پر ہنسی نہیں آتی۔ نہیں وہ ہرگز احمق نہیں ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی خاص تاثر بھی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ہم اسے سپاٹ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں بے پناہ سادگی ہے اور خلوص ہے۔ وہ تکڑم بازی کر ہی نہیں سکتا۔ وہ کسی کو برا نہیں سمجھتا۔ وہ مردم شناس بھی نہیں ہے مگر کسی کے دھوکے میں بھی نہیں آتا۔ شہزاد کے سلسلے میں اس کے اندر ڈھلملاہٹ کے باوجود ایک عزم اور استقلال آ جاتا ہے اور وہ اس سے ہر مخالفت کے باوجود شادی کر لیتا ہے یوں تو اسے دل پھینک کہہ سکتے ہیں مگر شہزاد سے اس کی محبت میں استقلال ہے۔ وہ کسی سے جھگڑتا نہیں مگر شہزاد ہی سے اس کا جھگڑا ہو کر رہتا ہے شہزاد سے عشق اور آخر میں شہزاد سے جھگڑا ہی اسے جذباتی سطح پر نہایت درجہ معمولی رویہ کے انسان سے اوپر لے آتے ہیں۔ آخر میں اس کے ملاقاتیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس کی "ذہنی" قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں جن میں وہ کچھ زیادہ مستقل کردار دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مذہب کے بابت مفتی صاحب بتلاتے ہیں۔

غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈرپوک تھا لیکن اللہ پہ اس کا ایمان ڈر کی بنیاد پر قائم نہ تھا۔

اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا۔ وہ جنیس جینز کی فلکیات بالڈس ہکسلے کے سائنس کا عجز سے متعلق مضامین برٹرینڈ رسل کے فزکس سنتیانا کے جذبات کاونٹ کویمین کے مشاہدات اور ایچ جی ویلز کی سائنٹیفک فکشن کتابوں سے اخذ تھا۔

ڈر کے بجائے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا۔۔۔۔۔۔

یہودیت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لئے قابل قبول تھا۔ اسلام کے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا عظمت عظمت عظمت عظمت محبت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا

تھا اور اس بے پناہ غفلت کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی علما کی تحریروں سے اخذ کیا تھا اسلام سے نہیں۔

لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایلی ویسا معمولی نہیں ہے جیسا کہ وہ اپنی سرگزشت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی دنیا بھی ہے اور وہ جدید ترین خیالات سے ہم آہنگ بھی ہے مگر وہ ایسی واقعاتی دنیا میں ہے جہاں وہ محض انسان ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ایلی کی اور اس کی دنیا کی ذہنی اور کردار کی سطح ایک ہے۔ اس لئے وہ نمائندہ اور نارمل انسان ہے۔ آخری دور میں وہ معمہ بھی ہو جاتا ہے اور یہیں خیال آتا ہے کہ کب وہ معمہ نہیں تھا۔ سب سے بڑا معمہ یہی ہے کہ ہر چیز صاف اور معمولی ہو مگر پھر بھی وہ ہمیں ہر قدم پر تعجب میں ڈالے اور معمہ سے زیادہ معمہ ہوتی جائے۔ ایلی اپنی تمام سادگی کے باوجود اور سادگی کی وجہ ہی سے ایسی ہی چیز ہے۔

سطحی نظر سے دیکھنے پر یہ محسوس ہوگا کہ یہ ایلی کی ظاہری سرگزشت ہے اور اس طرح کردار نگاری کے سلسلے میں بیسویں صدی سے پہلے ہی کی راہ پر چل رہی ہے مگر غور سے دیکھنے کی ایسی ضرورت نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید ناول کی طرح یہ مرکزی کردار کی اندرونی زندگی کو بھی ہر قدم پر سامنے لاتی ہے ظاہرہ واقعات کے ساتھ ساتھ ایلی کی اندرونی دنیا بھی سامنے آتی رہتی ہے۔ شروع ہی سے اس کا اپنی سوتیلی ماں صفیہ کی طرف ردعمل اور اس کے مہندی لگے ہوئے ہاتھوں سے اسے نفرت کا بھی تجزیہ ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد کا عشق ایلی کی اندرونی یا ذہنی کشمکش کا اظہار ہے وہ گوگو کا عالم وہ یقین اور بے یقینی کا چکر جو اس کے ذہن میں چل گیا ہے پوری نفسیاتی تحلیل کے ساتھ بیان ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد اس کے سر پر بری طرح سوار ہوتی ہے اور جب وہ دوسری عورتوں کی طرف بھی متوجہ ہے اور ان سے عشق بھی لڑا رہا ہے تو بھی شہزاد چپکے سے اس کے سامنے آتی رہتی ہے۔ اس کی اندرونی اور بیرونی دنیائیں ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں اور اس کی کردار نگاری اس طرح دو سطحوں پر کردار نگاری کی مثال ہے جیسی جدید ترین ناولوں میں خاص طور پر جیمس جوائس کی "یولیسس" میں ملتی ہے مفتی صاحب INTERNAL MONOLOGUE کے فن سے بھی واقف ہیں اور اسے بھی بڑی چابک دستی سے برتتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے جدید نفسیات کو افسانہ سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس سلسلے میں کمال پر ایلی کے کردار کو واضح کرنے میں پہنچے ہیں۔ مر جانے کے بعد بھی شہزاد ایلی کے لئے ایک زندہ حقیقت ہے جو اسے جگہ جگہ پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ تقسیم کے نتیجے میں ترک وطن کر کے بھاگ رہا ہے تو اس کے تصور میں شہزاد اسی طرح آتی ہے۔

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی "میں رکاوٹ تھی۔ میں دور ہو گئی۔ میں دور ہو گئی" وہ بولی "ایلی نیا جیون جیو۔ نیا جیون جیو"

شہزاد کے بعد اس کی محبت کا ظاہری مرکز اس کا شہزاد سے لڑکا عالی ہو جاتا ہے۔ وہ بمبئی میں یہ سن کر کہ گمرداس پور ہندوستان میں آگیا۔ پاگل سا ہو جاتا ہے۔ ہزار جتن کرتا ہے کہ امرتسر اور علی پور پہنچ جائے۔ تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ وہ تھک جاتا ہے۔

اس کی آنکھوں تلے عالی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا......

پرمٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے "عالی عالی" اس کے دل میں کوئی رو رو کر تھکا ہوا بچہ بلک رہا تھا۔

بہر حال ناول کے آخری صفحات میں یہ دوہری کردار نگاری بڑی فراوانی سے نمایاں ہے اور ناول کا خاتمہ یوں ہوتا ہے :۔

حضور، حضور —— ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا ۔

مفتی صاحب نے پیش لفظ میں اپنے فن کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں کیا۔ ناول میں ایک جگہ وہ دوستوفسکی کے "برادر کارمازاف" کا ذکر کرتے ہیں اور ہم کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی کردار نگاری دوستوفسکی سے گہرے طریقہ پر متاثر ہے ۔ ایلی کے کردار میں دوستوفسکی کے فن کا والہانہ پن اور فن سے بے نیازی ہے مگر وہ اپنے کردار کی تحلیل نفسی میں جدید ناول نگاروں کے لئے ماڈل ہے ۔ مفتی صاحب بھی اس ماڈل پہ چلنے میں پورے کامیاب ہیں ۔ اور یہ کامیابی کسی ملک کی ناول میں بھی عظیم ہو سکتی ہے ۔ اردو ناول نگاری میں تو یہ ایک مستحکم جھنڈا گاڑ دیتی ہے ۔

(۵)

مجھے محسوس ہوا کہ اس ناول پر تنقید کرنے میں تنقید کے پر جل ہی نہیں گئے بلکہ جل کر راکھ ہو گئے اور وہ راکھ بھی اڑ گئی ۔ اس کا رخ واقعیت کی طرف ہے جو ناول کی جان اور واقعیت بھی یہاں انگریزی اور فرانسیسی والے سے زیادہ روسی ناول کی تفصیل اور جزویات میں گہری دلچسپی کے ساتھ برتی گئی ہے اور پھر جدید واقعیت کی پیچیدگی یا پیچیدہ عالموں سے دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ناول کا ضخیم ہو جانا لازمی تھا اور اس دور کی ضخیم ترین ناول ہو بھی گئی ہے مگر مفتی صاحب نے جو کمال دکھایا ہے اسے جانچنے وقت تمام اصول ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک فن اپنی پوری زندگی کے ساتھ موجود ہے اور اپنا تخیلی اثر جماتا چلا جاتا ہے ۔ یعنی اس ناول میں وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے میتھو آرنلڈ کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ ادب کو زندگی پر تنقید ہونا چاہیے مگر ٹولسٹوئے کی "انا کارینہ" پر مضمون میں اسے اپنا اصول توڑتے ہوئے اس کی تعریف میں یہ کہنا کہ یہ تنقید حیات نہیں ہے بلکہ ہو بہو حیات ہے ۔ مفتی صاحب کی واقعیت نگاری اور نفسیات نگاری کے بابت بھی ایسا ہی کچھ کہہ دینا پڑتا ہے ۔ یہاں زندگی کا نقشہ نہیں ہے جس کے حدود ناپے جا سکیں یا جس کے تاثرات کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگایا جا سکے ۔ یہاں زندگی ہے زندگی ہی ہے اور مکمل زندگی ہے ۔ مفتی صاحب اسے "ڈھیر" کہتے ہیں مگر یہ محض ڈھیر نہیں ہے ۔ اس میں ترتیب ہے مگر وہ ترتیب ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ وہ ہو بہو زندگی کی طرح ہے اور اسی طرح اپنے زور سے پڑھنے والے کو پسپا کر دیتی ہے ۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ فن کاری میں ناکامیاب ہیں ان کا کوئی مقصد نہیں ہے اور وہ فضول کی بکواس کا ایک ڈھیر لگا گئے ہیں ۔ مگر ان کی ناول کا منظر ہمیں یہ کہنے سے روک دیتا ہے بلکہ منہ بند کر دیتا ہے اور ہم اس کے خلاف کچھ کہنا نادانی مان لیتے ہیں ۔ یہ ناول ہے ۔ ان معنوں میں ناول نہیں جو ایک دلچسپ قصہ سنا کر ہمیں محظوظ کرتی ہے بلکہ اس معنے میں ناول کہ یہ ایک زندگی کی اور ایک گروہ کی زندگی کی مکمل تصویر ہے اور یہ تصویر خاص طور پر ایک مرکزی کردار کے ضمن میں لائی گئی ہے ۔ اس میں وہ پھیلاؤ ہے اور جزوئیات کی طرف وہ توجہ ہے جس کے برتنے میں روسی ناول نگار سب سے آگے ہیں ۔ اس میں زندگی کا سا چڑھاؤ اور اتار ہے اور قصہ ہیرو کے بچپن سے شروع ہو کر ایک نئی زندگی کے آغاز تک جاتا ہے ۔ اس کی کوئی ٹکی بندھی ہیئت نہیں ہے مگر وہ وسیع ہیئت کا تاثر ضرور دیتا ہے ۔ یہ ایک عظیم ندیا کی طرح ہے جس کا مخرج ایلی کا گھر ہے اور پھر وہ پھیلتا ہوا اصلی محلے، علی پور، امرت سر، لاہور تک جاتا ہے ۔ وہ سارا خطہ جو گرد و پیش

سے لے کر لاہور تک سے اس کی وسعت میں آجاتا ہے۔ پھر یہ بمبئی تک پھیل کر سمندر کو بھی اپنے میں ملا لیتا ہے۔ اس کی سطح پر کثرت سے انسان پھیلے نظر آتے ہیں۔ جتنی وسعت بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی انسانوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ انسان مرکزی ہو جاتے ہیں اور بار بار آتے رہتے ہیں۔ یہ ایلی کے قریبی عزیز ہیں۔ سب سے زیادہ ایلی خود ہے جس کو ہم اس سیلاب میں ہر جگہ ڈبکی کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کو اس کا شناور کہنے کو جی چاہتا ہے مگر وہ شناوری سے طبیعت اور مقصد نہیں رکھتا۔ وہ بہا چلا جاتا ہے سب لوگوں کی طرح کا ہے مگر سب سے مختلف ہے۔ وہ فرد بھی ہے مگر اس کی انفرادیت کی حد متعین نہیں ہو سکتی البتہ ہم اسے ہر جگہ اور ہر وقت محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ناول میں بس وہی وہ ہے اور شہزاد تک اس کے ذہن کی پیداوار ہے۔

یہ محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اور ایلی ایک ہی شخص اور مفتی صاحب کے جاننے والے یہ تصدیق کرتے ہیں کہ "علی پور کا ایلی" ایک خود نوشتہ سوانح ہے مگر میں سوال کرتا ہوں کہ کیا ممکن ہے؟ یہ کتاب تاریخ نہیں ناول ہے اور ناول میں اس کا مصنف اپنے کو ضرور پیش کرتا ہے مگر وہ پورا کا پورا اپنے کو اتار نہیں سکتا۔ نام بدلنے سے اور تخیل کے دائرے میں آنے سے مصنف خود دوسرا آدمی ہو جاتا ہے اس لئے ایلی اور مفتی صاحب ایک نہیں ہو سکتے اور ایلی تاریخ کا فرد نہیں بلکہ تخیل کی تخلیق ہے اس لئے اس کی سرگزشت کتنا ہی واقعیات کا نقشہ ہو مگر وہ زندگی کی ایک نظریہ حیات کے مطابق اور ایک فنی نظر کے مطابق تعمیر ضرور ہے۔ علی پور کے اصلی محلہ کی سماجی اور اخلاقی قدریں ہیں۔ ان کا مذہب عالم اسلام ہے جو ہندویت اور تصوف سے متاثر ہے۔ ایلی اس مذہب پر اٹھایا جاتا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے بالاتر ہو گیا ہے۔ وہ توہمات میں عقیدہ کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اسلام کا دینی درجہ یہ اسے کوئی علم نہیں ہے مگر جدید یورپین فلسفیوں سے اس نے ایک عظیم تصور خدا حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کے ساتھ اخلاقی قدریں وابستہ نہیں کرتا مگر اس کی عظمت کا احساس رکھتا ہے۔ اس کے والد عورتوں کے شائق ہیں۔ وہ ان کی عیاشی کو دیکھ رہا ہے اور اسے عورت سے جسمانی تعلق سے نفرت ہو جاتی ہے۔ شہزاد کے حسن کا وہ گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں اعلیٰ عشق اور پست عشق کے درمیان کشمکش ہوتی ہے اور وہ شوہر والی چھ بچوں کی ماں سے شادی کر ہی لیتا ہے۔ اس کا ادب کی طرف دھیان ہے اور وہ اعلیٰ ترین شاہکار سے دلچسپی لیتا ہے اور آخر میں وہ صحافی ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں پیش کرتا مگر ظلم زدوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس میں احساس کمتری کے باوجود ہمت اور استقلال بھی آجاتا ہے۔ اسے سیاست سے کوئی غرض نہیں ہے مگر پاکستان بننے پر وہ خوش ضرور رہتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے لگاؤ ضرور ہے مگر وہ پاکستان میں آجانے کو نیا جیون سمجھتا ہے۔ اس کے ذریعہ کوئی مستقل نظریہ حیات اس طرح سامنے نہیں آتا کہ خواہ مخواہ کو ٹھونس ٹھانس معلوم ہو مگر اس کا ایک جدید نظریۂ حیات ضرور ہے۔ اس میں قوتِ ارادہ کی کمی صاف صاف نمایاں سہی مگر وہ اپنے ارادے کا پکا بھی ہے اسے اپنی طرح پر جو کچھ کرنا ہے وہ کر گزرتا ہے اور اپنے ماحول کی خلاف ورزی کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ اس کے نقطۂ نظر کو مفتی صاحب نے بالکل خارجی کر دیا ہے اور کہیں تجریدی نہیں ہونے دیا۔ اس کے واقعیات اور عمل نقطۂ نظر سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ واقعیات ہی واقعیات دکھائی دیتے ہیں اور نظریات بالکل چھپ جاتے ہیں۔ یہ ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری کی حد ہے شیکسپیر کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کردار کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان سے کوئی واضح نقطۂ نظر نکال لینا ناممکن ہے۔ مفتی صاحب نے ایلی کو بھی اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنا اور اس کا

نقطۂ نظر بالکل چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اسی طرح وہ تخلیق کے سلسلے میں بھی ہر فنکاری سے اپنی بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ناول کو ایک ڈھیر کر دیتے ہیں یعنی فنکارانہ ترتیب۔ انتخاب ارتفاع سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر اس ناول کے مختلف حصوں میں بیانات میں جو بہت کم ہیں اور مکالموں میں جو بڑی فراوانی سے لائے گئے ہیں زبردست ڈرامہ نگاری کا شعور نظر آتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی قوت اور اُس میں مشق مسلم ہے اور بیان طویل چیز کو ربط دینے میں بھی وہ کامیاب ہیں۔ وہ کسی فن کے تابع نہیں ہیں گر فن ان کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتا ہے اور وہ اس کا احترام کرتے ہوئے جدھر چاہتے ہیں ادھر اس کی باگ موڑ دیتے ہیں۔ وہ صرف ایک اصول کے قائل ہیں جو حافظ کے اس شعر سے ادا ہوتا ہے ؂

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

مگر وہ ایسی طوطی ہیں جس کو استادِ ازل نے ناول نگار ہونے کی صلاحیت دی ہے اور پھر شعور اور مشق سے انہوں اس صلاحیت کو آگے بڑھا کر وہ اس مقام پر آ گئے ہیں۔ وہ بے ساختگی سے اور ظاہرہ بے پرواہی سے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے تجربہ کا دریا امڈتا چلا آ رہا ہے اور وہ اسے بغیر شعوری زور لگائے ہوئے فن میں تبدیل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فن اپنی قدرتی جگہ لئے ہوئے ہے اور زندگی کے سیلاب میں ایسا چھپ گیا ہے کہ اس کی طرف توجہ جانا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ فن کاری مشکل کام ہے اور اس میں کامیابی کی داد دی جا سکتی ہے مگر فن کو چھپانا کمال ہے اور مفتی صاحب اس کمال پر پہنچ گئے ہیں۔ سطحی نظر یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ "علی پور کا ایلی" میں کوئی فن نہیں اور اس کے مصنف نے فن سے بے نیازی کا اعلان بھی کر دیا ہے مگر غور کی نظروں کو یہاں وہ فن نظر آئے گا جو فن سے اوپر چلا جاتا ہے اور حقیقت کو اس طرح سامنے لاتا ہے جہاں فنکار بول اُٹھے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آخر میں میں اس بات پر واپس آتا ہوں کہ "اُسے آدم جی انعام نہیں دیا گیا"۔ ممکن ہے کہ اس بات میں پبلک سے شکایت ہو مگر اس سے انعام دینے والوں کی نااہلی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مصلحتوں کے ماتحت انعام دیتے ہیں اور اس کتاب کو کسی مصلحت سے انہوں نے انعام نہیں دیا ہوگا۔ اس بات کو طے کرنے والے "نقاد" ہوں گے اور میں ان کو ہی نہیں بلکہ ان کے اچھے اچھوں کو ناول پر تنقید کرنے کا نااہل قرار دے چکا ہوں۔ وہ ناول کا کوئی ذوق نہیں رکھتے اور اسے کچھ بندھے ٹکے اصولوں سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ "علی پور کا ایلی" کے ایسے اوریجنل شاہکار کو کیسے محسوس کر سکتے ہیں اور عام طور پر بھی نقاد کسی نئے راہ کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے پروست نے اپنی عظیم اور ضخیم ناول کے بابت کہا ہے۔ "مجھے اس کی قدر کرنے کی نقاد سے کوئی امید نہیں ہاں ان صاحبان ذوق سے امید ہے جو بجائے اصولوں کے اپنے ادبی پرٹیک لیتے ہیں۔" "آکار شر سے دوتالی بارود" کی ضخامت سے لوگ ڈر گئے ہمارے نقاد بھی اس کی ضخامت کی شکایت کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ شکایت کی ان سے مل کے کہا "آپ کو پڑھنے کا شوق تو ہے ہی نہیں ورنہ ضخامت اس کے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہوتی۔" اصل بات یوں ہے کہ ہمارے بعض نقاد کے لیے

ادب لکھنے بنانے کا سودا ہے اور وہ جو طالب علم نکل رہے ہیں وہ بھی ان کے سب بہتے ہیں۔ "علی پور کا ایلی" کو وہ مقبولیت بھی حاصل ہے جو آج دوسری ناولوں کو ملی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جائے گی اور اس سے لوگ ناول کے آشنائے راز ہوتے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ناول نگاری کے سلسلے میں ماڈل ہو جائے کیونکہ یہ اس سب آلائش سے پاک ہے جو فن و فکر کے بجلنے ناول سے وابستہ کی جا رہی ہے۔ میں نے ایک کتاب "ناول کیا ہے؟" پچیس برس پہلے لکھی تھی۔ اس وقت تک "علی پور کا ایلی" وجود میں نہیں آئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرے تو اس کا جواب میں یہ دوں گا "علی پور کا ایلی کو پڑھ ڈالو معلوم ہو جائے گا کہ ناول کیا ہے۔ کیا ہونا چاہیے کہ وہ عظیم ناول کے دائرے میں آ جائے۔" حقیقت یہ ہے کہ کسی ناول میں ناول کی روح نہایت آزادی سے وسیع اور عظیم سفر طے کرتی نظر آتی ہے۔ اس دور کی ناولوں میں یہی اس کی انفرادی صفت ہے۔

گھاس کا سانپ

بانو قدسیہ

ممتاز مفتی بالکل گھاس کا سانپ ہیں۔

سارا رنگ روپ پھنکار کوڑیالا پن سانپ کا مگر زہریلے دانت ندارد۔ چاہے گلے میں جب مالا بنا کر ڈال لیجیے۔ چاہے بچوں کی محفل میں ربڑ کی گیند کے ساتھ بھول جائیے۔ ممتاز مفتی بنیادی طور پہ بے ضرر ہے۔ پھنکار بہت، رنگ روپ دبدبہ، جاہ و حشمت بہت۔ لڑائیاں بہت ناتفاقیاں ملنے لگے تنکا تیلی۔ دھمکیاں جاسوسیاں، یہ سب اس کو برا سانپ کی نشانیاں ہیں۔ جسے بدقسمتی سے زہر نصیب نہیں ہو سکا۔

دراصل ممتاز مفتی ہر غلط جگہ تعلق خاطر کو ہنرمندی سے چھپا کر غلاف میں لپیٹ کر استادی داؤ پیچ دکھا کر قائم رکھتا ہے اسے انوکھے رہنے کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ اگر اُس کی محبوبہ اس کے سامنے آ بیٹھے تو وہ خود پیٹھ موڑ کر پان بنانے میں مشغول ہو جائیگا۔

ممتاز مفتی کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو آن کا ایک سکینڈل ٹیانے سے لے کر گوردا سپور تک زبان زد تھا۔ سکولوں کی لڑکیاں ممتاز مفتی کا نام لے کر ایسے لرزتی تھیں جیسے صرف ہمارے زمانے کی لڑکیاں جنسی کتاب کا نام سن کر کانپنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ ممتاز مفتی کو اس سکینڈل نے وقت کا میٹنی آئیڈل بنا دیا تھا۔ یہ ممتاز کی ہنرمندی تھی کہ صنف نازک کا ہر دل اُسے زمانے کا انمول عاشق سمجھنے لگا تھا۔ دراصل عورتوں کو ایک بیماری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے عاشق کو کم اور کسی دوسری عورت کے عاشق کو زیادہ آئیڈیل سمجھتی ہیں۔

اس سکینڈل سے لے کر "لبیک" کے سکینڈل تک کئی مرحلے کئی منزلیں کئی چھوٹے چھوٹے راز ایسے ہیں جن کو میں صرف اس لیے فاش نہیں کر سکتی کہ ممتاز مفتی نے کمال ہنرمندی سے مجھے اپنا دوست بنا رکھا ہے۔ اور دوستوں کے راز فاش کرنا۔ دوستوں کے دشمنوں سے پیار کرنا، دوستوں کے رشتہ داروں کو دوست بنانا اُن کے مسلک کے خلاف ہے اور چاہے میرا مسلک نہیں لیکن مجھے گھاس کے سانپ سے خوف آتا ہے کیونکہ میں بنیادی طور پہ ڈسے جانے سے کہیں زیادہ پھنکار سے ڈرتی ہوں۔

بظاہر ممتاز مفتی اپنے متعلق بات نہیں کرنے دیتے۔ بات نہیں ہونے دیتے۔ ان کی تعریف کرنے لگو تو وہ پنکھے کی طرف دیکھ کر کہیں گے واہ واہ اشفو یار بہترین بلیڈوں والا پنکھا تو میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ہو سکے تو اسلام آباد جانے سے پہلے مجھے بھی ایک ایسا پنکھا خرید دے۔ میں غلطی سے کہہ بیٹھوں مفتی جی دیکھئے آپ کی تصویریں کتنی خوب صورت آئی ہیں تو فوراً کہیں گے بتا تیرے پیروں کا کیا حال ہے بہتر تو یہ ہوتا کہ تو میرے ساتھ مل کر کرشن نگر والے بابا سے مل لیتی۔

شہاب صاحب کہہ بیٹھیں کہ مفتی جی نے ہماری بہت خدمت کی۔ صبح کا سفر گھر کی باتوں سے بھر گیا تو فوراً رخ دوسری طرف موڑ کر کہیں گے ڈائری میں کچھ اور قسم کی روحانیت ہم اُسے سمجھے نہیں۔ کیوں بھئی قدسیہ؟"

اس بڑے اور اصلی مفتی کے نیچے ایک اور مفتی رہتا ہے جسے اسکینڈل سے عشق ہے۔ جسے صرف ایک آرزو ہے کہ بات ہوتی رہے ایک گھر سے دوسرے گھر تک ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگ کانوں میں بھلتے پھریں صرف یہ بتانے کے لئے کہ شہر میں ایک ایسی بھاری کتاب چھپ رہی ہے جس کے ہر صفحے پر ادیب نے اپنی زندگی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ بھائی صاحب کیا حوصلہ ہے اس نے تو اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑا —— بات کچھ ہو کیسی ہو لیکن مرکزی خیال ممتاز مفتی ہو۔

یہ سکینڈل گویا سپورٹ جانے میں گھومنے والے سکینڈل سے زوردار تھا۔

"علی پور کا ایلی" ابھی خوب چھپ رہا تھا کہ مفتی جی نے "لبیک" جیسی کتاب لکھ کر ہر طبقے کی بولتی بند کر دی اور صرف اپنا نام یک بارگی کر دیا۔

غالباً اس جیسی SCANDALOUS کتاب عرصہ تک نہیں لکھی جا سکتی۔

میری ادھیڑ عمر کی پھوپھی کانوں پر انگلیاں رکھ کر میرے کمرے میں آئیں۔ "توبہ توبہ توبہ خانۂ کعبہ کو یہ تمہارے مفتی جی کالا کوٹھا کہتے ہیں۔ ان کی شفاعت کون کرے گا —— یہ کیسے بخشے جائیں گے بھلا۔"

میرا خیال تھا کہ پھوپھی جان اس کے بعد لبیک کو ہاتھ نہیں لگائیں گی لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب ان کے کمرے میں گئی تو وہ کانوں کے دونوں طرف دوپٹہ اڑسے دھڑا دھڑ لبیک پڑھ رہی تھیں اور اپنے بخشے جانے کا سامان کر رہی تھیں۔ میں نے اس کی وجہ صرف یہ سمجھی کہ بڑی عمر کی عورتوں کو سکینڈل سے بڑا قلبی لگاؤ ہوتا ہے۔

کچھ دن بعد ایک درمیانی عمر کے مہمان نے شیو کا پانی مانگنے کے ساتھ ساتھ مجھ سے کہا —"یہ تمہارے دوست ہیں؟"

"کون؟"

"مفتی صاحب۔"

"ہاں لوگ یہی سمجھتے ہیں۔"

"ان کی کتاب اچھی نہیں —"

"کونسی کتاب؟"

"لبیک —"

"اچھا —"

"میں نے یونہی چلتے چلتے ذرا اس کا مطالعہ کیا تھا —"

میں اس چلتے چلتے کی ذرا وضاحت کر دوں۔ اشفاق صاحب کے ایک عزیز دوست ہیں۔ جو ٹیلی ویژن کے ہر پروگرام پر پوری ردّ و کد کے ساتھ تمام تفاصیل سمیت بڑی سیر حاصل بحث کیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں ان سے پوچھ لیا جائے کہ بھائی جی

آپ نے نکھار دیکھا تھا۔" تو وہ فوراً کہیں گے۔ "نہیں جی اُس وقت تو میں مہمانوں میں بیٹھا تھا بس صرف چلتے چلتے چند سیکنڈ کے لئے دیکھا امانت کچھ بے سُرا گا رہا تھا۔"

اس کے بعد وہ نکھار پروگرام کی ساری ہی تفاصیل سے آپ کو کوئی پون گھنٹہ نوازتے رہیں گے ۔

"ٹیپو کا پانی ذرا جلدی بنا دو ——" میرے مہمان نے آرڈر دیا ۔

" اچھا جی ——"

" رات میں نے ذرا یونہی چلتے چلتے لبیک کا مطالعہ کیا عجیب کتاب ہے نہ دینی ہے نہ افسانوی نہ رپورتاژ ہے نہ ناول —— کتاب کی ایک فارم ہونی چاہیے ورنہ ادیب SERIOUS نہیں لگتا مسخرہ لگتا ہے ——"

جب مفتی جی موجود نہ ہوں تو مجھے ان کے خلاف باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا ہے کیونکہ اس طرح مجھے ان کے مسلک پر نہ چلنے سے آزادی کا احساس ہوتا ہے ۔

" فارم کیا ہونا ہے ایسی کتابوں کا ——"

" میرا خیال تھا کہ تم بُرا مان جاؤ گی —کیتلی اتار دو - میں رات سے سو نہیں سکا —— "

میں نے کیتلی اتار دی ۔

" کیوں نہیں سو سکے ؟"

" میں ذرا یونہی لبیک کا مطالعہ کرنے بیٹھ گیا تھا۔ یہ کتاب JOLTS دیتی ہے یہ اچھی کتاب نہیں ہے —— تم نے پڑھی —— دوسروں کے جذبات سے کھیلتا ہے مفتی ۔"

" پڑھوں گی جی ——"

" مت پڑھنا ——"

" کیوں ؟ ——"

" تمہارا ایمان کمزور ہے ۔ جس طرح نوبالغوں کو جنسی کتابیں نہیں پڑھنی چاہئیں اسی طرح کمزور ایمان والوں کے لئے یہ کتاب بے راہ روی کا باعث ہو سکتی ہے ——"

" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی ——"

" اس کتاب میں عزت اور توقیر کے الفاظ کی بڑی کمی ہے ۔ سوائے شہاب صاحب کے جن کے مفتی صاحب سائیکوفینٹ لگتے ہیں انہوں نے اچھے الفاظ استعمال نہیں کئے ۔"

" کس کے لئے ——"

" اللہ میاں کے لئے —— اُس مقدس سرزمین کے لئے ——"

" لیکن عزت اور توقیر الفاظ میں تو نہیں ہوتی ——"

" تم بحث کرنا چاہتی ہو حالانکہ میں نے یہ کتاب اچھی طرح سے نہیں پڑھی —— میں اس پر بحث نہیں کر سکتا ۔

" ٹیپو کا پانی ڈال دوں ——"

"[illegible] پر ایک شدید اعتراض ہے ـــ"

" فرمایئے ـــ"

" مفتی جی نے زائرین کے جذبات کو بڑا مجروح کیا ہے گیا وہ سمجھتے ہیں کیا ایک وہی جذبے والے ہیں ـ

" ہاں یہ بڑی غلطی ہے ـــ"

" کہیں بندوبستی قافلوں کا ذکر ہے۔ کہیں زائرین معلموں سے جھگڑ رہے ہیں۔ کہیں دوکاندار کے منہ پر چیزیں مار رہے ہیں صرف مفتی صاحب کا رُخ درست ہے صرف وہی وعظ سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں ؟ وہ کون ہوتے ہیں لوگوں کی عقیدت سے کھیلنے والے کوئی تسبیحیں خریدے کھجوریں خریدے جانماز مول لے ـــ یہ طعنے لگتے ہیں حج کے ـــ"

" میں منع کروں گی آئندہ ایسے نہیں کریں گے ـ"

" حالانکہ شہاب صاحب نے ایک جگہ غالباً ۲۳۸ صفحے پر انھیں منع بھی کیا ہے کہ مسجد نبوی میں کسی خصوصی حیثیت سے آنا اچھا نہیں لگتا اس کے باوجود اُن کی انا کہیں ٹکنے نہیں دیتی ـــ وہ ہر جگہ V.I.P بنے بیٹھے ہیں ـ"

" آپ نے ۲۳۸ صفحے تک کتاب پڑھ لی ـــ"

" ساری نہیں کہیں کہیں سے BY THE WAY یہ شہاب صاحب کون ہیں ؟

" شفاق صاحب کے دوست ہیں ـــ

" اشفاق تو مفتی جی کی طرح اُن کی سائیکوفینسی نہیں کرتا ـــ" اشفاق بھی کرتے ہیں لیکن وہ محسوس نہیں ہونے دیتے۔ مفتی اناڑی ہیں ـ

" BIG OFFICER ہیں ؟ کیا DESIGNATION اُس کا ـــ"

" مجھے تو معلوم نہیں ـ"

" کیا وہ واقعی ایسے آدمی ہیں جیسا کہ مفتی جی نے PAINT کیا ہے۔ کیا واقعی شہاب کے جانے کے بعد مفتی کو ریورس گیئر لگ گیا تھا صفحہ ۲۷۲ پر مفتی صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے ـــ"

" آپ نے کتاب وہاں تک پڑھ لی ہے ؟ ـــ"

" نہیں بیچ بیچ میں سے ٹھونگا ٹھانگی کی ہے ـــ"

" شہاب صاحب واقعی بزرگ آدمی ہیں کہ مفتی صاحب انھیں BUILD کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ـ"

" میں شہاب صاحب سے واقف نہیں ہوں ـ" میں نے جواب دیا۔

" لیکن ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ وہ اشفاق صاحب کے دوست ہیں ـ"

" کم و بیش اشفاق صاحب اس [illegible] میں مبتلا ہیں ـ

انہوں نے [illegible] وہ ہر سال حج کر رہے ہیں ـ میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ اس کتاب کو لکھنے کی کیا ضرورت تھی ـ"

" آپ پریشان نہ ہوں غالباً کسی کتاب کو لکھنے کی کوئی [illegible] نہیں ہوتی بیچارے ادیب کا حال اُس بندکرے جیسا ہوتا ہے



بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی

جن میں آتش دان کی گیلی لکڑیوں سے دھواں بھر جائے۔ کوئی نہ کوئی کھڑکی کھولنی پڑتی ہے۔

" تم اگر چند دن کے لئے مجھے یہ کتاب LEND کردو تو میں اس کا اچھی طرح سے مطالعہ کرکے تم سے بات کروں گا۔"

میری آٹوگراف شدہ کاپی وہ صاحب لے جا چکے ہیں اور کئی اور لوگوں کو پڑھنے کے لئے مستعار دے چکے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس کتاب کے خلاف تحریک چلانے کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھ سکیں۔

میری ایک بھانجی اس کتاب کو پڑھ کر بڑی متفکر سی نظر آئیں۔ وہ بیچاری ہر وقت قول و فعل کی مطابقت میں لگی رہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ادیب کو ویسی ہی زندگی بسر کرنا چاہیے جیسی اس کی تحریر ہے۔

اس کی اس دیرینہ آرزو نے اس کے شغل مطالعہ میں زہر گھول رکھا ہے۔ وہ کتاب کے پیمانے کو پکڑ کر ادیب کا قد ناپتی رہتی ہے اور ادیب کے فٹ لے کر کتاب کے گھیرے کا اندازہ لگاتی رہتی ہے اور عموماً بے حال رہتی ہے۔

" مامی جی — یہ کتاب مفتی جی نے لکھی ہے —"

" ہاں کیوں —"

" کمال ہے حد ہو گئی۔ ہم تو مفتی جی کو اور طرح کا آدمی سمجھتے ہیں —"

" کیسا آدمی ؟ —"

" جیسے وہ علی پور کے ایلی میں ہیں جیسے وہ اسمارائیں کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ ان کی دیکھ لیجئے۔ یہ تو — یہ تو اور طرح کے مفتی جی نکلے —"

" کیسے ؟ —"

" وہ مفتی جی تو جنسی کہانیاں لکھتے تھے CASE HISTORY جیسی اور یہ — مفتی جی —"

" یہ کیسا لکھتے ہیں ؟"

" لکھتے تو اچھا ہیں۔ لیکن کون سے سچے ہیں آپ تو انھیں جانتی ہیں کون سے مفتی جی سچے ہیں — ان کی کون سی کتاب ان کے کردار کے مطابق ہے —"

" میرا خیال ہے دونوں مفتی جھوٹے ہیں۔"

" ہیں مامی جی — ؟"

" ادیب کا ذہن اس کا جذبہ اس کی سوچ تھوہر کے پھول کے ہیں۔ پھول کتنے بھی خوشبودار کیوں نہ ہوں تھوہر کا پودا بدل نہیں سکتا —"

" ہم تو سمجھتے تھے کہ ایلی پڑھ کر مامی جی خیال تھا کہ مفتی جی بڑے عیاش کھلے کھلے آدمی ہوں گے۔"

" ہیں —"

" تو یہ کتاب انہوں نے کیسے لکھی۔ اس کے تو ایک ایک صفحے پہ عقیدت کا جال بچھا ہے یہ . . . . . یہ مومن کا دل ان کا

کیسے ہوا؟ ـــــ

"۔۔۔ یہ دل بھی اتنی سینے میں دھڑکتا ہے ـــ"

" یہ کیسے ہو سکتا ہے ماسی جی ـــ"

" یہی تو مشکل ہے کہ ایسے ہی ہوتا ہے ـــ"

" علی پور کا ایلی لکھنے والا ایسا کیسے لکھ سکتا ہے ـــ"

" ایسا ہی شخص تو یہ دو کتابیں لکھ سکتا ہے۔ دراصل تو دریا میں زور چاہیے طغیانی کی صورت اختیار کرے یا شہر بھر کو بجلی مہیا کر دے یہ اوپر والے کی مرضی ہے۔ جن پانیوں میں زور شدت نہیں ہوتا اُن کے رُخ تو کوئی نہیں موڑتا۔ ان کے سروں پہ کوئی انجینیئر بند باندھنے نہیں آتے یہ تو اپنے سمرن سمرن کرتے بڑے پانیوں سے ملنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں چھوٹے پانیوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔"

" یہ شہاب صاحب مجھے اچھے نہیں لگے ـــ"

" شہاب صاحب کسی کو بھی اچھے نہیں لگتے ـــ"

" مفتی جی کو بھی نہیں ـــ ہیں ماسی جی ـــ"

" غالباً مفتی جی کو بھی نہیں ـــ"

" ہائے بیک پڑھ کر تو یہ اندازہ نہیں ہوتا ـــ"

" اپنے سے بڑے آدمی کو پسند کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس میں اپنی ہیٹی ہوتی رہتی ہے ـــ"

" آپ شہاب صاحب سے ملی ہیں ؟

" ملی ہوں ـــ"

" کیسے ہیں ؟"

" کم سم سے رہتے ہیں جیسے کار کا چالان کروا کے آئے ہوں ـــ"

" مفتی جی نے اُن کے متعلق ایسی باتیں کیوں لکھی ہیں یہ صریحاً خوشامد لگتی ہے ـــ"

میں اپنی بھانجی کو یہ نہیں سمجھا سکی کہ مفتی جی کو سکینڈل کے بعد حجاب پسند ہے۔ پردہ برقعے کی شکل میں ہو آئینے کی شکل میں ہو چق کی اوٹ ہو نظریے کا سراب ہو مفتی جی کو حجاب ہر رنگ ہر سائز ہر MAKE کا پسند ہے۔

جب دو شخص آپس میں قریب آنے پر ٹوٹ جانے کا احتمال رکھتے ہوں: اُن کی چھٹی حس بار بار لال سگنل دیتی ہو تو عموماً وہ ایک دوسرے کو چھوڑ کر کوسوں دُور نکل جاتے ہیں اگر یہ وجہ کشش زیادہ ہو اور بھاگنے کے امکانات کم ہوں تو وہ اپنے درمیان خوشامد کا پردہ ڈال لیتے ہیں۔ یہ پردہ جام سے جام ٹکرانے کی طرح بڑا لطیف سا شور پیدا کرتا رہتا ہے۔ طالقون کے گھروں میں شیشے کی نلکیوں سے بنے ہوئے پردوں سے بھی ایسی ہی آوازیں آیا کرتی ہیں ـــ

مفتی کو خوشامد کے پردے سے عشق ہے۔

اگر مفتی کسی حرم کا مالک ہوتا تو دنیا میں یہ اکلوتی حرم ہوتی جہاں مفتی کی گھر والیاں سب کی سب آپس میں محبت سے رہتیں اور انھیں علم نہ ہوتا کہ مفتی کہاں رہتا ہے۔

کیونکہ مفتی خوشامد کے پردے میں خود بیٹھ کر اپنا وجود ہر ایک سے چھپا لیتا۔ ہر زوجہ دوسری زوجہ کے سامنے بے نقاب ہوتی لیکن مفتی اور اُس کے درمیان خوشامد کے جام کھنکتے رہتے اور کسی کو کبھی بھی علم نہ ہوپاتا کہ مفتی اُس سے کوسوں دُور رہے۔

مفتی نے اپنے اور شہاب صاحب کے درمیان بھی تعریف کا بڑا خوب صورت پردہ لٹکا رکھا ہے اس کی ہر تکی شفاف بنتے کی ہے اس کی ہر تکی بانسری کی طرح سُرکی ہوئی ہے ——لیکن غالباً شہاب صاحب بھی جانتے ہیں کہ پردے کی دوسری جانب طرّے مفتی نے بڑے سلیقے بڑی دانشمندی بڑی ہنرمندی سے یہ پردہ لٹکا رکھا ہے۔

پتہ نہیں مفتی جی خود مجروح ہونے سے ڈرتے ہیں کہ انھیں سومناتھ کے بڑے بُت کے ٹوٹنے کا خدشہ ہے۔ بہر کیف یہ بات میں اُن سے پوچھ نہیں سکتی کیونکہ اُن کے مسلک دوستی میں سوال پوچھے تو جا سکتے ہیں لیکن اُن کا جواب ضروری نہیں

میں مفتی جی سے یہ پوچھ تو سکتی ہوں کہ شہاب صاحب اصل میں کون ہیں۔

لیکن وہ جواب دیں نہ دیں اس کی انھیں مکمل آزادی ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک دوستی کی اصل جان آزادی ہے۔

میں اُن سے یہ پوچھ سکتی ہوں کہ پچ پچ بتائیے کیا واقعی آپ اس راہ کے رہرو ہیں۔ لیکن جو جواب وہ دیں مجھے ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اُن کے نظریے کے مطابق دوستی میں جبر اچھی چیز نہیں۔

میں اُن سے یہ سوال تو کر سکتی ہوں کہ کیا واقعی لبیک کے پس منظر میں کچھ روحانی قوتیں کارفرما ہیں۔ اور کیا وہ کچھ ذاتی تجربات حاصل کر چکے ہیں۔

لیکن اگر وہ یہ سن کر خاموش ہو جائیں تو مجھے بھی خاموش ہونا پڑے گا۔ کیونکہ دوستی میں ایک دوسرے کی خاموشی کا احترام کرنا اخلاقی فرض ہے۔

اور یوں سمجھیے جب تک میں اس سوسائٹی کا دیا کھاتی ہوں اور اس میں رہتی ہوں مجھے ہر اخلاقی فرض کے سامنے سارے ہتھیار ڈالنے ہی پڑیں گے۔

حجاب کی بات ہو رہی ہے تو مجھے ایک اعتراف کرنا پڑے گا کہ جب مفتی جی مُصر ہوئے کہ میں اس کتاب پر کچھ لکھوں تو میں نے بڑی انکساری سے کہا "مفتی جی یہ کتاب میری گرفت میں نہیں آسکتی کیونکہ یہ میرا سبجکٹ نہیں میں سادہ سادہ سوشل مسائل کی تیراک ہوں۔ چھوٹی چھوٹی کمینی باتوں کو سمجھتی ہوں۔ اس کتاب اور میرے درمیان ایک گہرا حجاب ہے —

"بیان دو کوئی بہانہ نہیں سنا جائے گا۔"

"مفتی جی اوّل حجاب یہ ہے کہ میں عورت ہوں اور میں اس کتاب کے جذبے کو نہیں سمجھتی۔"

"کیا مطلب؟ —"

"آپ نے سنا ہوگا کہ عورت طالب دنیا ہے مخنث طالب عقبیٰ ہے اور مرد طالب مولیٰ ہے میں مولیٰ سے لگن کی باتیں نہیں سمجھتی مجھ سے آپ کے ڈ کی قیمت پوچھ لیں۔ کوٹھی کتنے کینال کی اچھی لگتی ہے میں اس پر بات چیت کر سکتی ہوں۔ بچوں کے مستقبل کے لئے کون کون سے معززین شہر اچھے دوست ہو سکتے ہیں مجھے اس کے متعلق بہت کچھ پتہ ہے ——"

"خیر خیر باوجودیکہ تم عارف دنیا ہو تمہیں لکھنا پڑے گا کوئی اور وجہ؟ ——"

"دوسری وجہ ہے کہ میں ڈرامے لکھتی ہوں چھوٹی موٹی ادیب ہوں مجھے اپنی تعریف کا شوق ہے میں کسی دوسرے شخص کی تعریف کو وقت کا زیاں سمجھتی ہوں ——"

"اس بار ایک دوست کی خاطر تمہیں قربانی دینی ہوگی —— اور کوئی وجہ؟ ——"

"ایک وجہ اور بھی ہے لیکن وہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گی؟ ——"

"بتاؤ بتاؤ دوستوں میں کیسا پردہ؟"

مفتی جی جب کوئی اچھا ادیب ایک خوب صورت کتاب لکھتا ہے تو میں مارے حسد کے سو نہیں سکتی۔ میں آپ کی کتاب کو سمجھتی تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ انوکھی اچھی اور بڑی مزہ لینے والی کتاب ہے۔ اگر آپ مجھے اس کی تعریف سے بری کر دیں تو کچھ لکھ دوں۔"

"تم بے شک اس کی تعریف نہ کرنا ——" مفتی جی نے PANICKY ہو کر اجازت دے دی۔

دیکھ لیجئے میں نے پوری کوشش کی ہے کہ کتاب کا کوئی مثبت پہلو آپ کے سامنے نہ آسکے۔ اور دیکھ لیجئے مفتی صاحب اس وقت دل ہی دل میں پچھتا رہے ہیں کہ انہوں نے مجھے لبیک پر لکھنے کے لئے کیوں کہا۔

احرام تلے

مسعود قریشی

مفتی بہت ظالم ہے۔ بےپردہ در۔ ایذا پسند۔ اپنی اس حرکت سے حرم میں بھی باز نہیں آیا۔ احرام تلے تانک جھانک جاری رکھی۔ دوسروں کے بھی پردے کھولے ۔ اپنے بھی۔

اُس کے ہاتھ میں قلم نہیں کیمرہ ہے۔ لوگ خوش ہوتے ہیں کہ تصویر اُترے گی۔ خوبصورت کپڑے پہنتے ہیں ۔ بناؤ سنگھار کرتے ہیں۔ پوز بناتے ہیں۔ مسکراہٹ اور خوشں اخلاقی کا مُلمع چڑھاتے ہیں۔ لیکن مفتی کے کیمرے میں فلیش لائٹ نہیں ، ایکسرے لائٹ ہے۔ تصویر اُترتی ہے تو بیرونی پردے اور مُلمع بالکل غائب۔ یہاں تک کہ کھال بھی اُتر جاتی ہے ننگی حقیقتیں۔ وہ بھی جسم کی نہیں (اس حد تک تو تصویر کافی لوگوں کو قابلِ قبول ہوتی بلکہ خوش آئند) بلکہ دل کی۔ دماغ کی۔ روح کی ننگی تصویریں۔ جنہیں دوسروں سے تو کیا لوگ خود اپنے سے چھپاتے چھپائے پھرتے ہیں۔ اب اس حرکت پر لوگ اسے گالیاں نہ دیں تو کیا اُس کا مُنہ چومیں؟ میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے کہ جب اُسی کا آئینہ کسی نے اُس کو دکھایا تو یہ خود بھی مُرجھا کر رہ گیا اور قہقہوں کے پردے میں گالیاں بکنے لگا۔ یہ حرکت ہی ایسی ہے۔

مفتی نے سفاک مسیحا کی طرح نشتر زنی کا یہ عمل اپنی تمام ادبی زندگی میں جس اُستواری سے جاری رکھا ہے اُس کا کریڈٹ اسے نہ دینا ظلم ہوگا۔ اِسی لیے اِس بُت خانے کے مُردار کو کعبے میں گاڑنے کا فتویٰ بجا ہے۔ اِسی اُستواری کے انعام میں شاید کعبے والے نے اسے وہاں بُلا لیا۔ وہ تو محض ایک اتفاق سمجھیے کہ شہاب کی شامت آئی اور وہ اسے حج پر لے گیا۔ اپنے بھی پردے کھلوائے دوسروں کے بھی۔ یہاں تک کہ دامنِ یزداں بھی سلامت نہ رہا۔ اگر کوئی رند اسے نائٹ کلب لے جاتا تو سفاک عکاسی کا یہ عمل مفتی وہاں بھی جاری رکھتا ، اور ممکن ہے کہ عریاں جسموں کے نیچے کسی رندِ پارسا کی عبا و قبائے تقویٰ کی تصویر کھینچ لیتا۔

شعور و لاشعور کی تہوں میں چھپی حقیقتوں کی عکاسی کا عمل مفتی نے "اَن کہی" سے لے کر " لبیک " تک ایمانی جنون کیساتھ جاری رکھا ہے ۔اس دوران اپنے بیگانے ہوگئے ۔ دوست دشمن بن گئے ۔تہمتیں جھیلیں ۔تیز لفظوں اور تند نظروں کے سنگریزوں سے لہولہان ہوا لیکن شہیدوں کی شانِ بے نیازی سے اپنے راستے پر گامزن ہے ۔ وہی پہلے سی لگن ۔ وہی حق گوئی میں نتائج سے بے پرواہی ۔ وہی نشتر کی تیزی ۔ وہی ماہرانہ چابکدستی سے

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

فیض کو شروع زندگی میں جب ہلکے پھلکے سطحی رومانوی جذبات کے شاعرانہ اظہار سے زندگی کے گنجلک ، پیچیدہ واقعات و

تجربات کے موزوں پیرایۂ اظہار کا مرحلہ درپیش تھا تو اُس نے ان فنی دشواریوں کا ذکر یُوں کیا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ تجربات کا قصور نہیں، شاعر کے ذہن کا عجز ہے۔ ایک کامل اور قادر الکلام شاعر ان مشکلات کو آسانی سے سر کر لیتا ہے۔ اسے اظہار کے یا نئے اسالیب ہاتھ آجاتے ہیں یا وہ پُرانے اسالیب کو کھینچ تان کر اپنے مطالب پر موزوں کر لیتا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ "ان کہی" کے مصنف کو "لبیک" کی تحریر میں اس دشواری، اس عجز یا کم از کم اس "کھینچ تان" سے دو چار ہونا پڑا ہوگا۔ کہاں "ان کہی" کی آپا اور کہاں "لبیک" کی حیلہ کور۔ لیکن کتاب پڑھتے وقت اس کشمکش کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ لفظ اور مطلب میں کہیں کھینچا تانی نہیں۔ تجربات کی قدرت نئے اندازِ بیان کو ساتھ لائی اور تاثر انتہائی تُنک رَوی سے قلبِ قاری پر نازل ہوتا ہے۔ یہ شاید اس لیے ممکن ہوا کہ مفتی تحت الشعوری محرکات کا عکاس ہے۔ رومان و محبت کی محفل ہو یا ایمان و عقیدت کی مجلس۔ اُس کی نظر انسان کے ظاہری عمل پر نہیں اندرونی ردِعمل پر ہوتی ہے۔ اسی لیے تو "میزاب رحمت" کے نیچے ہمہ وقت کھڑا رہنے والا فقیر اور اس کا مذاق اُڑانے والا نظم و نسق کا متوالا سرفراز بظاہر مختلف ہوتے ہوئے بھی اصل میں ایک ہیں اور بدلی برستی ہے تو دونوں "میزابِ رحمت" کے نیچے گُتھم گُتھا نظر آتے ہیں۔

اس رپورتاژ کے کچھ حصے مفتی سے سُنے۔ پھر چند قسطیں سیارہ ڈائجسٹ میں پڑھیں اور اب اسے کتابی صورت میں اوّل تا آخر پڑھا۔ بالکل آخر تک۔ یعنی قاسم محمود کی آپ بیتی بھی پڑھ ڈالی اور اس کتاب میں سب سے زیادہ تعجب خیز یہی گیارہ صفحے ہیں۔ اس سے پہلے اس رپورتاژ کے بارے میں مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال ہوا۔ جن میں ادیب، غیر ادیب، حاجی، غیر حاجی، دُنیا دار اور دیندار سبھی شامل تھے۔ کسی کی بات میں اس مقدس ہیجان کا شائبہ تک بھی نہ تھا جس کا بکثرت اظہار قاسم محمود کی آپ بیتی میں درج خطوط سے ہوا۔ جن صاحب نے لکھا کہ "مفتی صاحب کی تحریر کفر ہے ان کے نظریات باطل ہیں" ان سے تو کوئی گلہ نہیں، کیونکہ ان کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ لیکن اعتراض بالکل غیر متعلق ہے۔ مفتی نے اپنے اسلامی نظریات تو تراشے ہی نہیں۔ وہ تو سیدھا سادھا پیدائشی مسلمان ہے۔ اگر یہ اعتراض زندگی کے بارے میں مفتی کے نظریات پر ہوتا تو میں سب سے پہلے آمنّا و صدقنا کہتا۔ میں خود قائل ہوں کہ سخت بے ہودہ اور باطل نظریے رکھتا ہے۔ جن سے کئی دفعہ دوست مشکل میں پھنسے۔ عظیم فنکار محمود حسین مرحوم اس کی واضح مثال ہے۔ لیکن "لبیک" میں مفتی نے کوئی نئے اسلامی نظریات پیش ہی نہیں کیے۔ اگر وہ یہ حرکت کرتا تو سب سے پہلے قدرت اللہ اس کی سرزنش کرتے۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ بیوی اور دوست اس کا ساتھ چھوڑ دیتے۔ اُس نے احکامِ حج یا نظریاتِ اسلام سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ صرف حاجیوں سے واسطہ رکھا، ان کے جذبات، ان کے ردِعمل اور اپنی اندرونی کشمکش سے، یا پھر ایک بے پایاں جذب و مستی ایک ہمہ گیر سرشاری کی فضا پیدا کی ہے۔ اس بنا پر اسے سفاک پردہ دری کا طعنہ تو دیا جا سکتا ہے، الحاد کا نہیں۔ یہ تو رہا باطل نظریاتِ اسلام کا معاملہ۔ لیکن کمال تو اُن لوگوں نے کیا جنہوں نے مفتی پر اشتراکیت کی مقصد براری کا الزام لگایا۔ اشتراکی، مفتی سے یوں ناراض، کہ سخت رجعت پسند ادیب

ہے ، مگر وہ حضوری اور معجزاتِ روحانی کی باتیں کرتا ہے اور ان صاحبان کو یہ شکوہ کہ اشتراکیت کا پرچار کرتا ہے اس ستم ظریفی پر اور کیا کہا جائے کہ ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

حجرۂ مبارک میں بیٹھا مفتی سوچتا ہے :۔

" میرا جی چاہتا ہے کہ میں تیرے قدموں میں کھڑا ہو کر نعرہ لگاؤں کہ اے عظیم ترین انسان ۔ میں جو ننگِ انسانیت ہوں میں تجھے سلام کرتا ہوں ۔ تو جو میرا سلام قبول کر لے تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے ۔ اور تجھے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ایسے شخص کا سلام کیوں قبول کیا جو انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ہے ۔"

(صفحہ ۲۲۸ باب حجرۂ مبارک)

کیا یہ سوچ کسی لادین اشتراکی کی ہے یا عاشقِ رسول کی ۔
مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت اس کے جذبات یہ ہیں ۔

" اس روز مکہ معظمہ میں میری تمام تر توجہ خانۂ خدا پر مرکوز تھی ۔ میرے خیالات اور جذبات اللہ کے لیے وقف ہو چکے تھے ۔ ہر جگہ ہر محاذ پر مجھے اللہ دکھائی دے رہا تھا ۔ وداع ہونے والے زائرین کے چہروں پر ، اُن کی نگاہوں میں ، حرم شریف کے دروازے پر ، مکے کی گلیوں میں ، کوچوں میں ، سڑکوں پر ، اللہ نے چاروں طرف سے میرا محاصرہ کر رکھا تھا ۔ میں اُس سے یوں بھرا ہوا تھا جیسے مالٹا رس سے بھرا ہوتا ہے ۔ مجھ میں کسی غیر کی گنجائش ہی نہ رہی تھی ۔"

(صفحہ ۳۰۳ باب طوافِ وداع)

حرمِ کعبہ میں جس پر یہ کیفیتیں گزری ہوں مجھ جیسا محروم مسلمان تو اسے اللہ کا مقبول بندہ سمجھتا ہے ۔ چلیے آپ مقبول بندہ نہ بھی سمجھیے کیونکہ آپ کو اس کے الفاظ و تراکیب سے اختلاف ہے ۔ آپ کو گوارا نہیں کہ وہ خانۂ خدا کی بجائے اللہ کا کوٹھا کہتا ہے ۔ لیکن اتنی سی بات پر اس پنجابی زدہ اُردو ادیب پر اشتراکیت کا الزام تو نہ لگائیے ۔

اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے ۔ وہ بھی ہیں کہ محض کھوکھلے نعروں سے ہی شیرِ اسلام بن جاتے ہیں اور وہ بھی ہیں کہ جذب و مستی کی کیفیت اور جذبۂ ایمانی کی انسانی تصویر کھینچ کر ملعون و مقہور ٹھہرائے جاتے ہیں ۔ اور ان کی کھال کھینچ لی جاتی ہے ۔

غیر مرئی احساسات کی محسوس عکاسی مفتی کی طرزِ نگارش کا جوہر ہے۔ مشاہدہ حق گوئی کی گفتگو سنیے۔

" کوٹھے کی چھت سے کسی نے سر نکالا۔ چہرے کی جھریوں میں محبت کا طوفان امڈ سمٹ رہا تھا۔ آنکھیں ہمدردی کے بے پناہ جذبے سے پُرنم تھیں۔ پیشانی منور تھی۔ ہونٹوں پر لگاوٹ بھری مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ نے میرے وجود کے فتیلے کو گویا چنگاری دکھا دی . . . . . میرے وجود کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ صرف کوٹھا رہ گیا۔ پھر وہ کوٹھا ابھرا، ابھرتا گیا۔ ابھرتا گیا حتیٰ کہ ساری کائنات اس کی اوٹ میں آگئی۔" (صفحہ ۸۴ باب مکّہ معظمہ)

مشاہدۂ حق کی یہ محسوساتی لذت اور جذباتی کیفیت ذات و صفات کے عالمانہ سرد الفاظ میں کہاں ملے گی۔ مفتی محسوسات کا عکاس اور اشارات کا رسیا ہے۔ سیدھی اور بری بات اسے نہیں بھاتی۔ لبیک میں یہ اشاراتی اندازِ تحریر اپنے عروج پر ہے۔ روحانی سرشاری کے ذکر کے لیے وہ تذکروں کی مروجہ ترکیبیں استعمال نہیں کرتا۔ کیا عام انسانوں کو سمجھانے کے لیے صاحب حال بزرگوں نے یہی انداز نہیں اپنایا۔ کیا خود خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لیے قرآن مجید میں انسانی محسوسات کو مدِنظر نہیں رکھا؟ یہاں تک کہ اپنے بے پایاں نور کو طاق میں رکھے روشن چراغ سے تشبیہ نہیں دی؟

مفتی نے مکہ معظمہ سے حاجیوں کی روانگی کے وقت اس اشاراتی اندازِ بیان سے کیا لرزتی تصویریں کھینچی ہیں۔ بات فلسفۂ حج کی ہے۔ حج کے بعد انسان سے معصیت ڈھل جاتی ہے۔ زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ایسے باب کا جو ماضی کی مادیت سے کٹ کر روحانی پاکیزگی کا عملی نمونہ بن جائے۔ اس کیفیت اس بنیادی فلسفے کو کتنا خوبصورت انسانی پیراہن دیا ہے۔

" ایسے لگتا تھا جیسے اللہ اپنے گھر سے نکل کر وداع ہونے والے قافلے میں تحلیل ہو گیا ہے۔ وہ پچاس افریقی اس وقت اللہ سے لت پت ہو رہے تھے۔ ان کے چہرے اللہ کی محبت سے یوں نچڑ رہے تھے جیسے جلیبیاں شیرے سے نچڑتی ہوں۔ اُن کی آنکھوں سے اللہ آنسوؤں کی پھوار بن کر بہہ رہا تھا۔ پیشانیوں پر نور بن کر چمک رہا تھا . . . . جب اس قافلے کا آخری فرد بیرونی دروازے سے نکل گیا تو مَیں چونکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اللہ کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔"

(صفحہ ۱۹۴ باب طوافِ وداع)

سرشاری اور مقدس ماہیتِ قلب کا کیا خوبصورت نقشہ ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے وہ جو اس مقدس کیفیت سے عاری رہی حج سے فارغ ہو صرف "حاجی" بن کر لوٹتے ہیں۔ مراجعت پر دنیاداری میں کھو جانے کے لیے۔

"جب بھی کوئی وداع ہونے والا دروازے سے باہر نکلتا تو اللہ محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتا ہے اور اپنی اُنگلی آگے بڑھا کر کہتا، مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ، مجھے ساتھ لے چلو۔" (صفحہ ۱۹۵ باب طواف وداع)

اور کس بے دردانہ تکنیک سے اپنی محرومی کا ذکر کیا ہے۔

"اس نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا اور انگلی بڑھا دی۔ "نہیں نہیں مَیں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔" مَیں نے کہا "..... مَیں تیرے دوا۔ پر آ سکتا ہوں، مَیں تیرے حضور حاضری دے سکتا ہوں، مَیں تجھے سجدہ کر سکتا ہوں، تیرے پاس رہ سکتا ہوں، لیکن صرف چند ساعتوں کے لیے، چند لمحات کے لیے، چند دنوں کے لیے۔ مَیں تجھے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ مَیں تجھے ہمیشہ ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

(صفحہ ۱۹۶ - ۱۹۵ باب طواف وداع)

یہ کتاب تین ہستیوں سے بھرپور ہے۔ اللہ، رسول اللہ اور اللہ کا ایک بندہ قدرت اللہ۔ باقی سب لوگ سب واقعات انہی کے واسطے سے اُبھرتے ہیں۔ قدرت اللہ اتنے نہ اُبھرتے تو اچھا ہوتا۔ قدرت اللہ کی ذات کے لیے، مفتی کی عزت کے لیے اور قاری کی ذہنی آسودگی کے لیے۔ لیکن پھر شاید مفتی یہ رپورتاژ ہی نہ لکھتا۔ سخت خوشامدی ہے اور یہ اُردو ادب کی بڑی محرومی ہوتی۔

مافوق الفطرت واقعات کا سچ جھوٹ مفتی کی گردن پر۔ ماننے کو عقل زدہ دل نہیں مانتا۔ نہ ماننے سے اس نازک باب میں مفتی پر دروغ گوئی کا الزام آتا ہے۔ اور یہ الزام دینے کا الزام مَیں اپنے سر لینا نہیں چاہتا، اس لیے ماننے نہ ماننے کا معاملہ ہر قاری کی اپنی افتادِ طبع پر چھوڑتا ہوں۔

ایک بات جو سمجھ نہیں آئی وہ پیراگراف کے عنوانات ہیں۔ اتنی رواں ~~[illegible]~~ تحریر پر لیبلوں کی بندشیں لگانے اور پڑھنے والے کی سوجھ بوجھ کی توہین کرنے کی کیا ضرورت درپیش تھی۔ یہ عنوان تو چیخنے لگتے ہیں کہ "اے پڑھنے والو! شاید تم سمجھ نہ پاؤ، اس پیرے میں دراصل مرکزی خیال مَیں ہوں۔ اب تو سمجھ گئے نا؟"

مفتی بوڑھا ہو کر اب سب کو بچہ سمجھنے لگا ہے شاید۔

نظمیں

غزلیں

○

فراق گورکھپوری

بہتر یہی کہ ربط نہ رکھیں کسی سے ہم
تنگ آ گئے ہیں دوستی و دشمنی سے ہم

دنیا کے آبگینے ہیں آنے نہ پائے بال
لیتے ہیں سانس بھی بہت آہستگی سے ہم

اِس جا تو ہر دریچہ و دروازہ بند ہے
نکلے صدا لگاتے ہوئے کس گلی سے ہم

ماتم کی انجمن ہو کہ بزمِ نشاط ہو
شامل ہیں اک ادائے کنارہ کشی سے ہم

کچھ پوچھنا نہیں ہے بتانا بھی کچھ نہیں
واقف ہیں چشمِ یار تری آگہی سے ہم

مشہور ہیں جہاں میں وہ نامِ فراقؔ سے
آؤ تمھیں ملائیں گے اک آدمی سے ہم

جب دل ٹکڑے ہو جائے گا

فیض احمد فیض

اب کیوں اُس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے
یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اُجڑ گئے
سو بار لُٹے اور بھر پایا

اب کیوں اُس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف و خطر سے در گزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے
گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہوگا دیکھا جائے گا

فیض احمد فیض

○

یہ موسمِ گُل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گُل و لالہ غم انگیز بہت ہے

خوش دعوتِ یاراں بھی ہے یلغارِ عدو بھی
کیا کیجیے دل کا جو کم آمیز بہت ہے

یوں شیخِ حرم پیرِ مغاں سے ہوئے یک جاں
میخانے میں کم ظرفیٔ پرہیز بہت ہے

اِک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اِک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

کیوں مشعلِ دل فیضؔ چھپاؤ تہِ داماں
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے

میں دیکھتا ہی رہ گیا

ایس اے رحمٰن

دیروز میرے چُھٹ گئے
امروز فردا لُٹ گئے
دل کے سہارے گُھٹ گئے
آنسو کہانی کہہ گیا
میں دیکھتا ہی رہ گیا!

چھائے ہیں اندھیرے گھنے
کچھ چوہدری ایسے بنے
ہر اک کو چبوائیں چنے
دل میرا سب کچھ سہہ گیا
میں دیکھتا ہی رہ گیا!

دھن ہی خدا کیسے ہُوا
مَن بے سوا جیسے ہُوا
گُم رہنما ایسے ہُوا
دریا ہی اُلٹا بہہ گیا
میں دیکھتا ہی رہ گیا!

ایس اے رحمٰن

ہوئے صیدِ ستم چپ، چشمِ نم چپ
ہے چپ ہر سُو، زبانیں چپ، قلم چپ

ستمگر ہے ستم کاری پہ نازاں
رہیں گے عدل کے کب تک قدم چپ

کچھ ایسی بات تھی میرے بیاں میں
ہُوا ہے سامعِ رودادِ غم چپ

نشانِ زندگانی غلغلہ ہے
جو رکھتے ہیں زباں رہتے ہیں کم چپ

مفر کس کو یہاں رسمِ فغاں سے
جہاں میں ہے فقط راہِ عدم چپ

جفا کا ہاتھ جب اُٹھے کسی پر
نہیں ممکن رہیں تا دیر ہم چپ

جھکیں گے سر وہیں سب خود سروں کے
جہاں ہوتا ہے ہر دارا و جم چپ

سخن معیارِ ظرفِ آدمی ہے
کبھی رکھتی ہے انساں کا بھرم چپ

جتائے محسنوں نے اپنے احساں
کرم کر کے رہے اہلِ کرم چپ

کبھی جرمِ ضعیفی کا ہے پردہ
کبھی عہدِ وفا کی ہے قسم چپ

زبانِ دل سمجھتے ہیں وہی کچھ،
جنھیں کر دے لگن کا زیر و بم چپ

ہے ناطق چشم، لب خاموش میرے
سخن سے ہو گئے آخر بہم چپ

کھُلا اب تک نہ رازِ ذوقِ سجدہ
گپھائیں چپ، اندھیرے چپ، صنم چپ

پتا منزل کا پوچھا ہی کیے ہم
رہے رستے کے سارے پیچ و خم چپ

صدا

ایس اے دشمن

حالات میں، خیالات میں
چھپ چھپ کر
تم
دیکھتے رہتے ہو مجھے
بڑھتا ہوں تمھاری طرف
میں نصف قدم
اور تم
گم

انگ میں، رنگ میں، آہنگ میں
مسکراتی سی نظر
گاتی سی نظر
تم!
رِم جھم، رِم جھم
بوندیاں پیاسی زمیں پر ٹپکیں
بجلیاں چمکیں
بڑھتا ہوں دے کے صدا

میں
لمحات میں ضم!
اور تم
گم!

قوس ست رنگ، فضا میں اُبھری
پر کھلے سمٹی ہوئی تیتلی کے
گوشش میں مبہم قُم
تم!
جال پھیلا، ہوئے حلقے تنگ
کھُل گئے رنگ
میری ویران نگاہوں میں الم
یک دم
رازوں کے راز، طلسموں کے طلسم
تم
نور کی لے کے ردا
گم!

ایس۔ اے رحمٰن

آؤ کوئی علاجِ غمِ آرزو کریں
نوکِ مژہ سے چاکِ گریباں رفو کریں

ڈھونڈیں سراغِ منزلِ جاناں جو گم ہوا
پھر راہِ یار میں کفِ پا کو لہو کریں

مسدود راستوں نے پکارا ہے شوق کو
پھر اہتمامِ دار و رسن کو بہ کو کریں

کرتی ہے بار بار تقاضا نمازِ عشق
خونِ جگر سے اہلِ تمنا وضو کریں

پھیلائے مکر و زور نے ہیں دور تک غبار
شمعِ یقیں جلائیں، زباں وقفِ ہُو کریں

اُٹھے جفا کا ہاتھ تو سالم نہ رہ سکے
پھر گوہرِ وفا کی بحالِ آبرو کریں

رہبر اگر ہوں راہزن، ہم اپنے خون سے
پاسِ وفا کی اُن کے دلوں میں نمو کریں

چھینی ہو جس سے وقت نے احساس کی متاع
اُس قلب کو پھر آشنائے رنگ و بو کریں

کھوئے ہوئے وقار سے تجدیدِ ربط ہو
آؤ پھر اپنے آپ کی ہم جستجو کریں

پھر فرد کا ہو رشتہ جماعت سے استوار
پھر دورِ جام کے لیے مرکز سبو کریں

سرگشتہ پھر رہے ہیں کئی تشنہ جاں ابھی
پیش اُن کو میرا سادہ سفالی کدو کریں

ایس۔ اے رحمٰن

سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے   ناگہانی پہ کوئی کیا بولے
بات کرنے سے پہلے لازم ہے   ہر کوئی اپنی بات کو تولے
علم بالا ہے خود نمائی سے   اپنے لفظوں میں قید بڑ بولے
چلتی رہتی ہے وقت کی بہلی   ساتھ چلتے ہیں اس کے ہچکولے
یار لوگوں کو مل گئی شاہی   بدھو گولے کے رہ گئے گولے
جن کی جھولی پھٹی تھی، کیا کرتے   بخت والوں نے بھر لیے جھولے
سچ کا سادہ سا اک لبادہ ہے   جھوٹ کے ہیں مگر کئی چولے
گوش آشوب کیوں صدا واعظ ؟   بات وہ کان میں جو رس گھولے!
کہنے سننے کی ریت اچھی ہے   دل کی گرہیں مگر کوئی کھولے
یا کسی کو بنالے تو اپنا   یا کسی دوسرے کا خود ہو لے
راہِ حق میں جو سر کٹے تو کٹے   پر نہ ایمان کا قدم ڈولے
ہلکا ہوتا ہے اس سے اکثر جی   دل جو بھر آئے، تھوڑا سا رو لے
شیخ بھی ہو گئے زمانہ شناس   گاتے پھرتے ہیں آج کل ڈھولے
لوٹ آئی ہے ندی توبہ کی   دامن آلودہ! وقت ہے دھو لے

راکھ میں ڈھونڈتے ہو چنگاری
تم بھی زرّواں ہو کس قدر بھولے

احسان دانش

○

ہم عقیدہ نہیں رکھتے کسی سادھو کی طرح
اپنی درویشی ہے سلطانیٔ باہُو کی طرح

منصفی کون کرے گا ترے ابرو کی طرح
یہ مرے عشق و ہوس میں ہے ترازو کی طرح

میرے سجدوں کو ضد ہے کوئی بیجا تو نہیں
کچھ تو محرابِ حرم ہے ترے ابرو کی طرح

ہم قدم ان کا تصوّر ہو تو آتا ہے نظر
دشت بے آب گزرگاہِ لبِ جُو کی طرح

لَوٹ کر آہی گیا نشو و نما کا موسم
ورنہ ہر شاخ تھی سُوکھے ہوئے بازو کی طرح

باغ کی پُشت پہ چھوڑا تو ہے فطرت نے انار
چاند نکلا تو ہے اک شاہدِ خوشرو کی طرح

صبح سبزے پہ وہ آہستہ خرامی اس کی
دھان کے کھیت میں چرتے ہوئے آہو کی طرح

دل تری یاد سے شاداب، نگاہیں ویران
ہونٹ ہیں خشک، قدم تر ہیں لبِ جو کی طرح

اُن کے آنے کا پتہ دیتی ہے ہر موجِ نفس
من کے مندر میں سلگتے ہوئے خوشبو کی طرح

بام و در بھی تمھیں دیکھیں یہ کہاں ان کی مجال
چاندنی اوڑھ کے آجاؤ کبھی خوشبو کی طرح

ہائے رُک رُک کے وہ زینے سے اُترنا ان کا
بوئے بارود سے سہمے ہوئے آہو کی طرح

تذکرہ چھڑ گیا اُن کا جو کبھی اے دانش
اشک پلکوں پہ لرزنے لگے جگنو کی طرح

احسان دانش

○

اشک افشانی کو شغلِ زندگانی کر دیا — کتنے مشکل مسئلے کو تم نے پانی کر دیا
میرے اسلوبِ نگارش کو دعا دو دوستو — معتبر یہ کارِ الفاظ و معانی کر دیا
اس میں کھیتوں کی خطا کیا، شامتِ اعمال ہے — جس نے بازاروں کو مفلس کی جوانی کر دیا
کوچے کوچے اب انہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں لوگ — ہم نے ہر اہلِ نظر کو اپنا ثانی کر دیا
آج کی تاریخ سے سب نامہ و پیغام بند — اُن سے جو کچھ عرض کرنا تھا زبانی کر دیا
علم والوں سے بھی جب کشکول میں آئی نہ بھیک — میں نے اپنا مشغلہ آوارہ خوانی کر دیا
دورِ نو نے مصر کے بازار کو دے دی شکست — ہر جوانی کو زلیخا کی جوانی کر دیا
تشنہ لب رکھا جو موسم نے سمندر پر مجھے — میں نے اپنی فرصتوں کا خون پانی کر دیا
کندنی کرنوں نے دن بھر بالیوں کو چاٹ کر — کھیتیوں کے سبز قالینوں کو دھانی کر دیا
جب مری بیداریوں سے روشنی چھننے لگی — میں نے نیندوں کو سپردِ باغبانی کر دیا
بے توقف آنسوؤں کے سوت جاری ہیں ہنوز — تو نے یکجا کتنے دریاؤں کا پانی کر دیا
ہم سے دیوانے تو مر جاتے مگر تیرا کرم — شدتِ غم کو دلوں کی شادمانی کر دیا

تھا جو دو روحوں میں باہم فیصلہ دانش کبھی
ہم نے اس کو بھی رقم کر کے کہانی کر دیا

احسان دانش

○

اوّل سے آدمی ہے خدا کی تلاش میں — جلوہ ہے اپنے جلوہ نما کی تلاش میں
دل کو سرورِ شیلی و سرمد کی جستجو — آنکھیں نگارِ لالہ قبا کی تلاش میں
میں اُس جگہ ہوں کربِ پیمبر سے سرفراز — خود چارہ گر جہاں ہے دوا کی تلاش میں
ہر موڑ پر ہیں لاکھ یزیدانِ کج نہاد — جانِ حسین و دشت بلا کی تلاش میں
جب اُن سے پہلی بار ملی تھی نگاہِ شوق — اب تک ہوں میں اُس آب و ہوا کی تلاش میں
ہوں گے وہ کوئی جن کو ملی رہنما سے راہ — ہم کھو گئے ہیں راہ نما کی تلاش میں
اس میری جستجو کا نہ جانے ہو کیا مآل — نکلا ہوں میں حرم سے خدا کی تلاش میں
یہ اور بات ہے کہ میسّر کہیں نہیں — اہلِ وفا ہیں اہلِ وفا کی تلاش میں
قسمت بُری تھی گرم بگولوں نے آلیا — نکلے تھے گھر سے بادِ صبا کی تلاش میں
کس سامری نے دُھول یہ آنکھوں میں جھونک دی — انساں ہے خوار اپنی اَنا کی تلاش میں

دانش یہاں بُتوں کا نظارا بھی ہے بہت
تم گھر سے چل پڑے ہو خدا کی تلاش میں

○

احمد ندیم قاسمی

کتنے سر تھے جو پروئے گئے تلواروں میں
گنتیاں دب گئیں تاریخ کے طوماروں میں

شہر ہیں یہ کہ تمدّن کے عقوبت خانے
عمر بھر لوگ چُنے رہتے ہیں دیواروں میں

دن کو دیکھا غمِ مزدور میں گریاں ان کو
شب کو جو لوگ سجے بیٹھے تھے درباروں میں

آپ دستار اُتاریں تو کوئی فیصلہ ہو
لوگ کہتے ہیں کہ سر ہوتے ہیں دستاروں میں

آج بھی ملتے ہیں منصور ہزاروں ۔ لیکن
اب انا الحق کی صلابت نہیں کرداروں میں

نہ کرو ظلِ الٰہی کی بُرائی کوئی
دوستو کفر نہ پھیلاؤ نمک خواروں میں

وہی ہر دور کے نمرود کے مجرم ہیں جنھیں
پھول کھلتے نظر آ جاتے ہیں انگاروں میں

جو بھی آتا ہے وہ ہنستا ہُوا لُٹ جاتا ہے
بس گیا ہے کوئی آسیب سا بازاروں میں

انقلاب آنے سے پہلے کا یہ منظر ہے عجیب
دشت میں پھول، بگولے ہیں چمن زاروں میں

رُت بدلتی ہے تو معیار بدل جاتے ہیں
بلبلیں خار لیے پھرتی ہیں منقاروں میں

یوں تو کہنے کو بس اک بار ہی میں کڑکا تھا
دیر تک کون گرجتا رہا کہساروں میں

چُن لے بازارِ ہنر سے کوئی بہروپ ندیمؔ
اب تو فن کار بھی شامل ہیں اداکاروں میں

○

احمد ندیم قاسمی

میں اس فریب ہی میں رہا مبتلا سدا
ہر آشنا رہے گا مرا آشنا سدا

حیراں ہوں: یہ کون سا معیارِ عدل ہے
جو مجھ میں بس گیا، وہی مجھ سے جُدا سدا

یوں مجھ پہ ٹوٹ ٹوٹ کے برسی ہیں رحمتیں
کٹ کٹ کے گر پڑا مرا دستِ دعا سدا

میں بولتا نہیں ہوں مگر دیکھتا تو ہوں
لب مرے سل چکے مگر آنکھیں ہیں وا سدا

یا رب! تو اوجِ عرش سے اُترے تو یہ بتاؤں
اس عدل گہ میں مارا گیا بے خطا سدا

یہ زندگی تو جیسے فقط مشقِ مرگ ہے
میں تو غمِ حیات میں مرتا رہا سدا

مر جاؤں گا کہ صرف خدا کو ثبات ہے
مانگوں گا میں خدا سے مگر خوں بہا سدا

صدیوں کے کارواں بھی کہیں آس پاس ہیں
کانوں میں گونجتی ہے صدائے درا سدا

سچا ہوں میں کہ مجھ پہ مسلط ہے سچ کا خوف
لہرائے میرے سامنے یہ اژدھا سدا

کچھ آگے کفر ہے، تو چلو کفر ہی سہی
کیوں نارسا رہے مری فکرِ رسا سدا

ہر حادثے کے بعد یہ الجھن رہی ندیمؔ
بندے سے بے نیاز رہا کیوں خدا سدا

افریقہ

احمد ندیم قاسمی

دھرتی نے بدل لیا ہے محور
صحراؤں پہ برف گر رہی ہے
قطبین پہ ریت اُڑ رہی ہے
یورپ کے افق پہ — لڑکھڑاتی
اک فوج سیاہ سورجوں کی
گر گر کے غروب ہو رہی ہے
شب رنگ جبینِ افریقہ سے
اک صبح طلوع ہو رہی ہے
حبشی نے زمیں کی باگ تھامی
اعزاز بنی سیاہ فامی

دن آگئے

احمد ندیم قاسمی

دب کے رہنے کے دن جا چکے
کچھ نہ کہنے کے دن جا چکے
وار کرنے کے دن آ گئے
وار سہنے کے دن جا چکے

اب تو قدریں پگھلنے لگیں   اور معیار گلنے لگے
جو جواہر لہو سے ڈھلے   مٹھیوں سے پھسلنے لگے
جن کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے   اب وہی ہاتھ ملنے لگے
اب تو سورج اُترنے لگا   اور سائے تو ڈھلنے لگے
اب تو پتھر بھی مڑنے لگا   اب تو پربت بھی چلنے لگے
گرم صحراؤں کی کوکھ سے   سرد چشمے اُبلنے لگے
جو دلوں میں چھپے تھے ڈرے   اب تو آنکھوں میں جلنے لگے
وقت پیچھے کہیں رہ گیا   لوگ آگے نکلنے لگے
اِدھر اُدھر کا کیا تذکرہ   اندر اندر بدلنے لگے

دب کے رہنے کے دن جا چکے
کچھ نہ کہنے کے دن جا چکے
وار کرنے کے دن آ گئے
وار سہنے کے دن جا چکے

○

جمیل مظہری

ممنونِ انتظارِ گوشِ شعور ہوں میں
پہنچوں گا دیر سے کچھ آوازِ دور ہوں میں

جو کچھ ہُوا وہ بیشک میرا قصور لیکن
اے نازِ کبریائی کس کا قصور ہوں میں

اب تو یہی قلق ہے میرا بھی مجھ پہ حق ہے
تجھ سے قریب ہو کر اپنے سے دور ہوں میں

ابلیسیت بھی مجھ میں قدسیت بھی مجھ میں
دونوں کے رابطے کا پہلا فتور ہوں میں

اک میرا دل چکائے کس کس کا قرض آخر
ممنونِ نار ہوں میں ممنونِ نور ہوں میں

ہستی کا کارخانہ بگڑے تو کیوں نہ بگڑے
کچھ ناصبور ہو تم، کچھ ناصبور ہوں میں

اُٹھتی نہیں ہے ساقی مجھ سے تیری امانت
شیشے کو کیا بچاؤں خود چور چور ہوں میں

ہم میں جمیل شاید صدیوں کا فاصلہ ہے
اہلِ شعار تم ہو اہلِ شعور ہوں میں

رباعیات

اختر انصاری

○

آیا یہ غم و یاس کا بھبکا کیسا!
شعلہ یہ کسی ٹیس کا لپکا کیسا!
او نغمۂ انبساط گانے والے
آنسو یہ تری آنکھ سے ٹپکا کیسا!

○

کس درجہ رہے بے خود و بے راہ نہ پوچھ
کس قہر کی غفلت رہی اللہ نہ پوچھ
اب جا کے ہوا شعورِ ہستی پیدا
بالغ ہوئے کس عمر میں ہم آہ نہ پوچھ

○

احساس کے تاروں کو جھنجھوڑا میں نے
غفلت کی کلائی کو مروڑا میں نے
ٹپکے مہ و خورشیدِ درخشاں کیا کیا
جب اپنی شبِ غم کو نچوڑا میں نے

○

واعظ! مرے اوراد کی لذت مت پوچھ
مخمور وظائف کی حلاوت مت پوچھ
کل پچھلے پہر عالمِ مدہوشی میں
جو مجھ کو ملا لطفِ عبادت مت پوچھ

○

ہنس ہنس کے زمانے کو ہنسانے والے!
گفتار کو عنبر میں بسانے والے
کیوں تو نے نظر بچا کے آنسو پونچھا
محفل کو طرب زار بنانے والے!

○

یہ عمر کی بل کھاتی ہوئی چڑھتی ندی
ہو جائے گی کل لقمۂ سیلِ ابدی
تو جشنِ حیات آپ منا لے اپنا
دنیا نہ منائے گی تری جشنِ صدی

○

گر گر کے سنبھلتے ہیں سنبھلنے والے
ہر سانچے میں ڈھل جاتے ہیں ڈھلنے والے
گلخن بھی کہیں گل کدہ ہے اور کہیں
جلتے ہیں بغیر آگ کے جلنے والے

○

دیتا ہوں غمِ عشق کی باہوں کو خراج
اس زیست کی اُلجھی ہوئی راہوں کو خراج
مجھ سے نہ رکھے چشمِ تضرع خالق
ویرانے سے ملتا نہیں شاہوں کو خراج

○

ہاتھوں میں مرے ساغرِ جم بھی ہوتا
بہرہ ورِ ذوقِ نعم بھی ہوتا
شہ رگ سے بھی جو قریب تر ہے میرے
اے کاش وہ نزدیکِ شکم بھی ہوتا

○

حالات کو روبراہ کر لیتا ہوں
ناجنسوں سے نباہ کر لیتا ہوں
ابلیس کی بھی دل شکنی خوب نہیں
گاہے گاہے گناہ کر لیتا ہوں

○

بالیدگیٔ جسم کی خاطر نہ جیے
چاکِ جگرِ زیست ہی دن رات سیے
یہ جانِ نزار و بدن کاہ نما
یوں بھی ہے بہت قبر کے کیڑوں کے لیے

○

تقدیر سے فرصت نہ ملی پر نہ ملی!
تنشیط کی دولت نہ ملی پر نہ ملی
دیتے ہی رہے نفس کو اپنے مہلت
ہے ہے ہمیں مہلت نہ ملی پر نہ ملی

○

ترکیبِ زماں ہے کس کی سازش یا رب
ہر نقش یہاں کس کی تراوش یا رب
یہ ہستیٔ برباد، یہ جانِ ناشاد
میری ہے کہ تیری آزمائش یا رب

○

اب زہر ہی مرغوب ہے، پینے دے مجھے
زخمِ جگرِ زیست کو سینے دے مجھے
راس آئے گی یا رب نہ مجھے راحتِ مرگ
میں خوگرِ آزار ہوں، جینے دے مجھے

○

اک روز مرا وقت بھی آجائے گا
ہر بزم میں ماتم بھی کیا جائے گا
کچھ کام بھی آئے گا مرے حشر کے دن؟
اخبار میں شذرہ جو لکھا جائے گا

○

گلشن مرے خوابوں کے دہکتے ہی رہے
تخئیل کے طائر بھی چہکتے ہی رہے
اس دل نے بہت خاک اُڑائی لیکن
سینے میں جو تھے زخم مہکتے ہی رہے

○

ناظورۂ نیکی و بدی کی چھل بل
گندم کے خمارِ سرمدی کی چھل بل
آزردہ و دل تنگ ہیں پچھلی صدیاں
اللہ رے بیسویں صدی کی چھل بل

○

توفیقِ ازل ہے اک فسانہ اے دل!
تقصیر کے وعدے پہ نہ جانا اے دل!
اب وقت کے مرہم کی توقع بھی نہیں
زخموں سے ہے چُور خود زمانہ اے دل!

○

افکار کی گرمی سے پگھلے جاتے ہیں!
دم سیلِ حقائق سے رُکے جاتے ہیں
اللہ رے افزونیِ سرمایۂ ذہن
اس بوجھ سے دوش نے جھکے جاتے ہیں

○

جیسے شبِ غم بیت رہی ہو کوئی
یا وقت نے خود چوٹ سہی ہو کوئی
یہ کرب، یہ لذّت، یہ تفکر، یہ نشاط
خالق نے غزل جیسے کہی ہو کوئی!

○

اُس حال پہ تُف جس میں یہ حالت ہو جائے
مائل بہ کرم جورِ مشیت ہو جائے!
اللہ کرے فطرتِ سفاک مجھے
غارت کرے اور خود بھی غارت ہو جائے!

ادا جعفری

راستہ روک رہی ہو جیسے
یاد راہوں میں کھڑی ہو جیسے

نکہتِ موجۂ گل یوں آئے
بھید سا کھول رہی ہو جیسے

اُٹھتے اُٹھتے کوئی محبوب نگہ
اپنے سائے سے ڈری ہو جیسے

یا کسی خواب نے آنکھیں کھولیں
یا عبادت کی گھڑی ہو جیسے

گھر کے آنگن میں نہ اُترے سورج
رات گھبرا سی گئی ہو جیسے

وہ جو دیوار میں چنوائی گئی
کوئے جاناں کو چلی ہو جیسے

وہ جو گیتوں کی دھڑکتی لو تھی
شعلۂ جاں میں ڈھلی ہو جیسے

قرض تھا حرفِ تمنا کس پر
زندگی پوچھ رہی ہو جیسے

ہم جسے سنگِ گراں سمجھے تھے
اپنی ہی سادہ دلی ہو جیسے

پھر شرارہ کوئی ارزاں ہوگا
راکھ پلکوں پہ جمی ہو جیسے

مہرباں چشمِ گہربار ادا
اور کسی شے کی کمی ہو جیسے

مگر مجھے بتاؤ کیوں

ادا جعفری

مجھے یہ آئینہ دکھاؤ کیوں
ازل کے دن سے آج تک
مری تمام زندگی بس ایک حرفِ آرزو
مرا غبار چار سُو
تمھارے پاس کیا نہیں
تمھارے پاس کیا نہ تھا
جو میں نہ تھی تو کیا ہُوا

تمھاری بزمِ ناز میں جمال بھی جلال بھی
جو التفاتِ جاوداں تو اجتنابِ بیکراں
تمام آفتابِ جاں
وہ روشنی وہ خیرگی
کہ تم کہاں
تمھاری بزمِ دلبری میں اپنی سمت دیکھ لوں
نہیں مری مجال بھی
کہ لڑکھڑا کے رہ گیا مرا ہر اک سوال بھی
مرا ہر اک خیال بھی
تو پھر مجھے بلاؤ کیوں
محبتوں کی آڑ میں
جنوں کو آزماؤ

میں بے قرار و خستہ تن
بس اک شرارِ عشق میرا پیرہن
مرا وجود اک نگاہِ مضطرب
نگاہ جس کے پاؤں میں ہیں بیڑیاں پڑی ہوئی
کہ باوجودِ سرخوشی
میں ناتمام داستاں
جو دلربا نہیں تو پھر
یہ داستاں سناؤ کیوں
میں بے نوا میں نارسا
مگر مجھے بتاؤ کیوں !!

ادا جعفری

○

گھر کا رستہ بھی ملا تھا شاید
راہ میں سنگِ وفا تھا شاید

اِک ہتھیلی پہ دیا ہے اب تک
ایک سورج نہ بجھا تھا شاید

اس قدر تیز ہوا کے جھونکے
شاخ پر پھول کھِلا تھا شاید

لوگ بے مہر نہ ہوتے ہوں گے
وہم سا دل کو ہُوا تھا شاید

خونِ دل میں تو ڈبویا تھا قلم
اور پھر کچھ نہ لِکھا تھا شاید

تجھ کو بھُولے تو دعا تک بھُولے
اور وہی وقتِ دعا تھا شاید

موجۂ رنگِ بیاباں سے چلا
یا کوئی آبلہ پا تھا شاید

رُت کا ہر آن بدلتا لہجہ
ہم سے کچھ پوچھ رہا تھا شاید

کیوں اداؔ کوئی گریزاں لمحہ
شعر سننے کو رُکا تھا شاید

○

حال کھُلتا نہیں جبینوں سے
رنج اُٹھائے ہیں کن قرینوں سے

رات آہستہ گام اُتری ہے
درد کے ماہتاب زینوں سے

ہم نے سوچا نہ اُس نے جانا ہے
دل بھی ہوتے ہیں آبگینوں سے

کون لے گا شرارِ جاں کا حساب
دشتِ امروز کے دفینوں سے

تُو نے مژگاں اُٹھا کے دیکھا بھی
شہر خالی نہ تھا مکینوں سے

آشنا آشنا پیام آئے
اجنبی اجنبی زمینوں سے

جی کو آرام آ گیا ہے اداؔ
کبھی طوفاں کبھی سفینوں سے

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا

ظہیر کاشمیری

خزاں کی سانسیں اُکھڑ چکی ہیں، بہار دھومیں مچا رہی ہے
گلوں کے چہرے دمک اُٹھے ہیں، نسیم بھیروے بجا رہی ہے
چمن کی سرخ و کبود وسعت قدم قدم جگمگا رہی ہے
بکھر چکا ہے غبارِ شب، آفتابِ تازہ اُبھر رہا ہے   جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

گرسنہ چہروں، دریدہ جاموں پہ بارشِ رنگ ہو رہی ہے
فراخ دنیا شہنشوں کے غرور پر تنگ ہو رہی ہے
غلام و آقا کے درمیاں ایک بے اماں جنگ ہو رہی ہے
جو ریگِ ماضی میں دب چکا ہے، وہ آدمی پھر اُبھر رہا ہے   جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

سروں سے آخر کو ٹل گئے ہیں، فراقِ دیروز کے زمانے
مؤرخِ عشق لکھ رہا ہے، وصالِ امروز کے فسانے
جنوں نے امکاں کی وسعتوں میں سجا دیے ہیں نگار خانے
شکن شکن گیسوئے زمانہ، نئی پھبن سے سنور رہا ہے   جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

نئے عزائم کی سرخوشی سے، دیار و صحرا چہک اُٹھے ہیں
روایتوں کی گھٹی فضا میں گلِ بغاوت مہک اُٹھے ہیں
جہانِ کہنہ کی وادیوں میں شرارِ فردا لہک اُٹھے ہیں
بشر کا قاتل نظامِ باطل، خود اپنی جاں سے گزر رہا ہے   جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

ہے آدمِ نو کی آمد آمد، ہجومِ رجعت بکھر رہا ہے
پرانی قدروں کا ہر محافظ، خود اپنے سائے سے ڈر رہا ہے
زمیں پہ لرزہ ہوا ہے طاری، سروں سے پانی گزر رہا ہے
یہ انقلابِ اُمم کا لمحہ، رقم نیا باب کر رہا ہے   جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

آمدِ رفتگاں

ظہیر کاشمیری

ہجر کے دشت کا فاصلہ کٹ گیا　　وصل کی محفلیں پھر فروزاں ہوئیں
آنگنوں میں کھلے پھول امید کے　　بام و در کی فضائیں چراغاں ہوئیں
راستے سر بسر مشکبو ہو گئے

آملے پھر سے بچھڑے ہوئے قافلے

جاں سے پیاروں کی آمد کا چرچا ہوا　　منتظر صورتیں نغمہ خواں ہو گئیں
جاگ اٹھیں، گئے دور کی خواہشیں　　دلربائی کی رسمیں جواں ہو گئیں
چھڑ گئے ناز و انداز کے سلسلے

آملے پھر سے بچھڑے ہوئے قافلے

یوسفو! خوابِ زنداں کا موسم گیا　　لو کشادہ ہے دامانِ مصرِ وطن
ہے زلیخا جمالوں سے نسبت تمھیں　　آؤ تازہ کرو پھر سے جشنِ کہن
نوجواں ہو گئے عشق کے حوصلے

آملے پھر سے بچھڑے ہوئے قافلے

عشرتِ رقص و مستی کی رُت آگئی　　رنگ خوشیوں کے گلزار پر چھا گئے
آرزوؤں کی باہیں کشادہ ہوئیں　　حلقۂ بزمِ یاراں میں تم آگئے
اب نہ ہوں گے جدائی کے شکوے گلے

آملے پھر سے بچھڑے ہوئے قافلے

رنگیں سویرے

ظہیر کاشمیری

صحنِ چمن پر، بادِ سحر نے، شبنم کے موتی لٹائے
دشت و دمن کی اُجلی زمیں پر کرنوں نے سہرے سجائے
پنگھٹ پہ لہرائے خوش رنگ آنچل، ساحل پہ جاگے پھریرے
آئے ہیں رنگیں سویرے

ڈھوروں کو لے کر نکلے گوالے، ماضی کے قصّے سناتے
کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر رواں ہیں، دہقان تانیں اُڑاتے
محنت کشوں نے دھرتی پہ ہر سُو، محنت کے موتی بکھیرے
آئے ہیں رنگیں سویرے

پھوٹے ہیں خوشیوں کے دلکش ترانے، آسودہ دیوار و در سے
سینوں میں چاہت کے ارماں سجائے، نکلے ہیں لوگ اپنے گھر سے
تازہ اجالوں کی تازہ فضا میں ہنستے ہیں خوش باش چہرے
آئے ہیں رنگیں سویرے

اُڑتے اندھیروں کے ساتھ اُڑ چلے ہیں، خوابِ گراں کے زمانے
بزمِ جہاں میں چھڑنے لگے ہیں، آئی رُتوں کے فسانے
آئی رُتوں نے لہرا دیے ہیں، خوشیوں کے چنچل پھریرے
آئے ہیں رنگیں سویرے

اپنے پائیں باغ کو دیکھ کر

ظہیر کاشمیری

صبح کے ساتھ اُٹھے، رُوئے نہالاں سے نقاب
نورِ تازہ سے بڑھی، سرو سمن کی تب و تاب
گل بر انداز خلاؤں میں چھڑے چنگ و رباب
شاخساروں پہ سرِ شام ہوا کھیلتی ہے
کُنج در کُنج بہاروں کی ادا کھیلتی ہے
بند کلیوں پہ حسینوں کی حیا کھیلتی ہے

بارشِ ابر سے خوش پوش ہُوا سبزۂ تر
بہرِ نظارۂ گُل مل گئی نرگس کو نظر
آج کانٹوں پہ بھی تلنے لگے شبنم کے گُہر
ہر طرف کیف لُٹاتے ہیں زرِ گُل کے ایاغ
ہر روش پر ہیں فروزاں، رُخِ لالہ کے چراغ
یہ چمن آنکھ کی ٹھنڈک، یہ چمن دل کا فراغ

ہر ثمر بار شجر، دعوتِ نظارہ ہے
ہر ثمر فطرتِ فیّاض کا شہ پارہ ہے
یہ چمن لذّت و الوان کا گہوارہ ہے
یہ چمن اصل میں تحریکِ نمو ہے لوگو
رجعت و مرگ و تساہل کا عدو ہے لوگو
اس کے ذرّوں میں شہیدوں کا لہو ہے لوگو

خاموش رہو

ابن انشا

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ ــــ کچھ نہ کہو، خاموش رہو
اے لوگو خاموش رہو ـــ ہاں اے لوگو، خاموش رہو

سچ اچھا، پر اس کے جلو میں، زہر کا ہے اِک پیالا بھی
پاگل ہو؟ کیوں ناحق کو سقراط بنو، خاموش رہو

حق اچھا ـ پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سُولی پہ چڑھو؟ خاموش رہو

اُن کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سر آنکھوں پر، سورج ہی کو گھومنے دو ـــ خاموش رہو

مجلس میں کچھ حبس ہے اور زنجیر کا آہن چبھتا ہے
پھر سوچو ـ ہاں پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں
اِس بگیا کے بھید نہ کھولو، سیر کرو، خاموش رہو

آنکھیں موند کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ
انشا جی لو دھاگا لو اور لب سی لو، خاموش رہو

شانُ الحق حقی

○

وہ مزا رکھتے ہیں کچھ تازہ فسانے اپنے
بھولتے جاتے ہیں سب درد پرانے اپنے

حال میں اپنے کچھ اس طرح مگن ہیں گویا
ہم نے دیکھے ہی نہیں اگلے زمانے اپنے

کر کے اک بار تری چشمِ فسوں گر کے سپرد
پھر نہ پوچھا کبھی بندوں کو خدا نے اپنے

ہم وہی ہیں کہ جہاں بات کسی نے پوچھی
خوش گماں ہو کے لگے داغ دکھانے اپنے

بزمِ یاراں ہیں وہ اب کیف کہاں ہے باقی
روز جاتے ہیں کہیں جی کو جلانے اپنے

ہمنشیں دوست کی صورت تو کہاں ملتی ہے
چین سے وہ ہے جو دشمن کو نہ جانے اپنے

دور کتنا ہی ترے بام سے بھٹکا ہو خیال
طائروں کو کبھی بھولے ہیں ٹھکانے اپنے

بستیاں دل کی بھی ویراں ہیں نگاہوں کی طرح
ہیں ابھی ہم کو بہت شہر بسانے اپنے

نو بنو روز دکھاتی ہے کرشمے دنیا
آسماں کے وہی انداز پرانے اپنے

ذکر سے اُس کے سنوارا ہے سخن کو حقیؔ
خوش مزا لگتے ہیں کانوں کو ترانے اپنے

شان الحق حقی

○

یوں تو ہر سمت سے اُٹھتی ہیں بڑی آوازیں
نہ کوئی جوت نہ جھنکار، نری آوازیں
گونج اُٹھیں تو سرِ بزم قیامت کر دیں
یہ گلوگیر شکستوں میں کسی آوازیں
کھوج کیا لیجیے، ہیں صرف لہو کی لہریں
وہ جو بنتی ہیں کبھی رنگ کبھی آوازیں
پھوٹ نکلیں گی کسی دن گل و گلشن کی طرح
ہیں بہت خاک کے تودوں میں دبی آوازیں
کبھی ملتے ہیں نہ تیغ تڑپتے ہُوئے بول
کبھی ہوتی ہیں صلیبوں پہ چڑھی آوازیں
جا کے منجدھار میں کیا موج سے ٹکرلیں گی
یہ کناروں سے بندھی گھاٹ لگی آوازیں
وہ بھی دن تھے کہ کھنچے رہتے تھے ساز ان کے لیے
اِن دنوں ساز سے رہتی ہیں کھنچی آوازیں
کان ہر چند ترستے ہیں مگر دھیان میں ہیں
وہ لہکتے ہُوئے بول اور وہ کھلی آوازیں
تم اُلجھتے ہو وہاں اپنی الاپیں حقی
نہ سنی جائیں جہاں کان پڑی آوازیں

○

جس نے اِک خس کے لیے صحرا کو چھانا ہوئے گا
کون ہوگا کوئی ہم سا ہی دِوانہ ہوئے گا

تم کو دل کی راہ سے خلوت میں آنا ہوئے گا
چشمِ وا میں تو سجن سارا زمانہ ہوئے گا

خود رہو دنیا میں یا پہلو میں بسا دُ!
سُن رکھو، پھر ایک دن پیچھا چھڑانا ہوئے گا

تو نہ اَن داتا سہی پر من کا داتا کون ہے
دل نے جو کھویا صنم تجھ سے ہی پانا ہوئے گا

ہائے وہ دل دس دا دم بھر نہ نظروں میں رہی
یاد میں اب جس کی اک جیون بِتانا ہوئے گا

اللہ اللہ خاکِ گلشن کی کرشمہ زائیاں
اِس کی تہہ میں، سوچیے، کیا کارخانہ ہوئے گا

جن کو آتی ہے نظر اب بھی کشش تاروں کے بیچ
اُن کی نظروں میں وہی عالم پرانا ہوئے گا

اور نکتے اِک طرف، کھلتا نہیں اُس تل کا بھید
تم کہو حقی بھلا کچھ تم نے جانا ہوئے گا

○

رضی اختر شوق

اے خدا صبر دے مجھ کو نہ شکیبائی دے
زخم وہ دے جو مری روح کو گہرائی دے

خلقتِ شہر یونہی خوش ہے تو پھر یونہی سہی
ان کو پتّھر دے مجھے ظرفِ پذیرائی دے

جو نگاہوں میں ہے کچھ اس سے سوا بھی دیکھوں
یا ان آنکھوں کو بجھا یا انھیں بینائی دے

تہمتِ عشق تو اس شہر میں کیا دے گا کوئی،
کوئی اتنا بھی نہیں طعنۂ رسوائی دے

جو ترے دل میں ہے اِس بات سے منکر تو نہ ہو
حرف مشکل ہے تو آنکھوں ہی کو گویائی دے

بارِ دنیا نہ سہی بارِ صداقت اُٹھ جائے
ناتواں جسم کو اتنی تو توانائی دے

مجھ کو اس شہر کی درماندہ خرامی سے الگ
پھر مرے خواب دے اور پھر مری تنہائی دے

رضی اختر شوق

○

یہ نخلِ جاں کا ثمر تلخ عمر بھر کا ہے
نہ پوچھ ہم سے کہ کیا ذائقہ ہنر کا ہے

ہجومِ سنگ میں بھی اس خیال سے خوش ہوں
کہ میری ذات سے اک جشن رہگزر کا ہے

جو مثلِ خاک سرِ راہگزار بیٹھے ہیں
ابھی نظر میں کوئی سانحہ سفر کا ہے

عجب تھے شہرِ چراغاں کے دیکھنے والے
دھویں کی سمت نہ دیکھا کہ کس کے گھر کا ہے

ابھرتی دھوپ میں میں بھی ذرا سی دیر کو ہوں
مرا وجود بھی سایا سا رہگزر کا ہے

دیے جلے ہیں مگر دل بجھے بجھے سے ہیں شوقؔ
بہت دنوں سے یہ منظر ہمارے گھر کا ہے

○

یہ کہہ رہا ہے کوئی میرے ساتھ جل جاؤ
تم اپنے دائرہ ذات سے نکل جاؤ

بکھیر دو مری موجِ نفس میں نغمے سے
مرے لہو میں کوئی گیت بن کے ڈھل جاؤ

سب ہی درخت نئے برگ و بار لائے ہیں
بدل رہی ہے ہوا تم بھی اب بدل جاؤ

سلامتی سے سوا ہے شکستگی کا نشہ
پگھل رہے ہو تو سوچو نہیں پگھل جاؤ

کسی کو راس نہیں جن محبتوں کی فضا
تم اس فضا میں بہت دُور تک نکل جاؤ

اب اس ہوا سے گزر جاؤ ایک بار ہی شوقؔ
یہ کیا کہ تم کبھی بکھرو، کبھی سنبھل جاؤ

رضی اختر شوق

○

میں ترے جبرِ بصارت کی گواہی دوں گا
تو نہ چاہے بھی تو میں تجھ کو دکھائی دوں گا

کچھ دنوں موسمِ جاں کا ہے یہی رنگ تو میں
ہر لبِ زخم کو اک تازہ نوائی دوں گا

اور پہیلوں گا جو لوٹاؤ گے آواز مری
اتنا گونجوں گا کہ صدیوں کو سنائی دوں گا

تو بچھڑنے کو بچھڑ جائے مگر تیرے بعد
سب خدا رکھتے ہیں میں کس کی دہائی دوں گا

میں کہ اس شہر میں پرچھائیں کی مانند ہوں شوق
اس اندھیرے میں بھلا کس کو سجھائی دوں گا

○

ایک ہی آگ کے شعلوں میں جلائے ہوئے لوگ
روز مل جاتے ہیں دو چار ستائے ہوئے لوگ

وہی میں ہوں، وہی آسودہ خرامی میری
اور ہر سمت وہی دام بچھائے ہوئے لوگ

خواب کیسے کہ اب آنکھیں ہی سلامت رہ جائیں
وہ فضل ہے کہ رہیں خود کو بچائے ہوئے لوگ

تیرے محرم تو نہیں اے نگہِ ناز مگر
ہم کو پہچان کہ ہیں تیرے بلائے ہوئے لوگ

زندگی دیکھ یہ انداز تری چاہت کا
کن صلیبوں کو ہیں سینے سے لگائے ہوئے لوگ

پھر وہی ہم ہیں وہی حلقۂ یاراں بھی ہے شوق
پھر وہی شہر وہی سنگ اٹھائے ہوئے لوگ

نور بجنوری

○

شہر یاروں کے غضب سے نہیں ڈرتے یارو
ہم اصولوں کی تجارت نہیں کرتے یارو

خونِ حسرت ہی سہی، خونِ تمنا ہی سہی
ان خرابوں میں کوئی رنگ تو بھرتے یارو

پھر تو ہر خاک نشیں، عرشِ بریں پر ہوتا
صرف آہوں سے مقدر جو سنورتے یارو

سولیاں جھوم کے ہوتی ہیں ہم آغوشِ جہاں
کاش ہم بھی انہی راہوں سے گزرتے یارو

سر کہیں، سر پہ سجائی ہوئی دستار کہیں!
زندگی کے لیے یوں بھی نہیں مرتے یارو

چاند تسخیر کیا، قلب نہ تسخیر کیا
اس جزیرے میں بھی اک بار اُترتے یارو

○

تجھے مشہور ہونا تھا مجھے بدنام ہونا تھا
مری جاں اپنی چاہت کا یہی انجام ہونا تھا

تجھے شمعِ فروزاں کی طرح جلنا تھا محفل میں
مجھے ویرانۂ دل میں چراغِ شام ہونا تھا

تری آنکھوں کی جھیلوں میں کئی مہتاب ڈھلنا تھے
مرے ہاتھوں میں اپنے آنسوؤں کا جام ہونا تھا

بھٹکنا تھا بگولے کی طرح ہر دشت میں مجھ کو
تجھے مسند نشینوں کے لیے انعام ہونا تھا

نہ ہوتے بند کیوں مجھ پر ترے محلوں کے دروازے
مجھے آخر حریفِ گردشِ ایام ہونا تھا

بٹھانا چاہتا تھا مسندِ یزداں پہ میں تجھ کو
مجھے ناکام ہونا تھا مجھے ناکام ہونا تھا

○

نور بجنوری

سر وہی، سنگ وہی، لذّتِ آزار وہی
ہم وہی، لوگ وہی، کوچۂ دلدار وہی

اک جہنّم سا دہکتا ہُوا تا حدِّ سفر
وقت کی آگ وہی، شعلۂ رفتار وہی

شیشۂ چشم پہ چھایا ہُوا اک زلف کا عکس
قریۂ دار وہی، سایۂ دیوار وہی

عرصۂ حشر کبھی ختم بھی ہوگا کہ نہیں
وہی انصاف کی میزان، گنہگار وہی

تم سلامت رہو، یوسف کی ضرورت کیسی
اہلِ فن! آج بھی ہے رونقِ بازار وہی

میں بھی زندہ ہوں، ترا حسن بھی تابندہ ہے
چاند سے زخم وہی، پھول سی مہکار وہی

نورؔ میں اب بھی محبّت کو عبادت جانوں
ہے مرے ہاتھ میں ٹوٹی ہُوئی تلوار وہی

○

نور بجنوری

روح چٹخی ہوئی ، جسم درکا ہوا
دستِ سائل میں کاسہ بھی ٹوٹا ہوا
میرے باہر زمان و مکاں نوحہ گر
میرے اندر کوئی مجھ پہ ہنستا ہوا
ہر نظر نیم جاں عقل کے زہر سے
ہر صحیفے میں اک سانپ بیٹھا ہوا
وحشیوں کو بگولے اُڑا لے گئے
شہر کی طرح صحرا بھی سونا ہوا
ایک اندھی کرن بین کرنے لگی
قریۂ دل میں شاید سویرا ہوا
کوہکن ، تیشہ و سنگ سے بے نیاز
قیس ، پھولوں کے بستر پہ سویا ہوا
اس جنم میں بھی جسموں کی منڈی لگی
اس جنم میں بھی چاہت کا سودا ہوا

تیر بن کر لگا آج احساس پر
ایک پتّہ ہواؤں میں اُڑتا ہوا

○

بشیر بدر

ہماری شہرتوں کی موت بے نام و نشاں ہو گی
نہ کوئی تذکرہ ہوگا نہ کوئی داستاں ہو گی

اگر میں لوٹنا چاہوں تو کیا میں لوٹ سکتا ہوں
وہ دنیا ساتھ جو میرے چلی تھی اب کہاں ہو گی

پرندے اپنی منقاروں میں سب تارے چھپا لیں گے
جوانی چار دن کی چاندنی ہے پھر کہاں ہو گی

درختوں کی یہ چھالیں بھی اُتر جائیں گی پتے کیا
یہ دنیا دھیرے دھیرے ایک دن پھر سے جواں ہو گی

ہوائیں روئیں گی سر پھوڑ لیں گی ان پہاڑوں سے
کبھی جب بادلوں میں چاند کی ڈولی رواں ہو گی

کسے معلوم تھا ہم لوگ اک بستر پہ سوئیں گے
حفاظت کے لیے تلوار اپنے درمیاں ہو گی

پسینہ بند کمرے کی اُمس کا جذب ہے اس میں
ہمارے تولیے میں دھوپ کی خوشبو کہاں ہو گی

کسی گمنام پتھر پر بہت سے نام لکھ دو گے
تو قربانی ہماری اس طرح سے جاوداں ہو گی

زمینیں تو مرے اجداد نے ساری گنوا دی ہیں
مگر یہ ایک مٹھی خاک خود اپنا نشاں ہو گی

سمندر بوڑھے ہو جائیں گے اور اک فاختہ مچھلی
ہمارے ساحلوں اور جنگلوں کی حکمراں ہو گی

بشیر بدر

قدم جمانا ہے اور سب کے ساتھ چلنا بھی
ہم اپنی راہ کے پتھر ہیں اور دریا بھی

مگر جو فاصلہ پہلے تھا اور بڑھتا گیا
میں اُس کے پاس گیا وہ اِدھر سے گزرا بھی

بہت ذہین و زمانہ شناس تھا لیکن
وہ رات بچّوں کی صورت لپٹ کے رویا بھی

یہ خشک شاخ نہ سرسبز ہو سکی اُس نے
مجھے گلے سے لگایا پلک کے چوما بھی

چراغ جلنے سے پہلے ہمیں پہنچنا ہے
ڈھلکے ہوئے ہے پہاڑوں کو آج کُہرا بھی

ہزاروں میل کا منظر ہے اس نگینے میں
ذرا سا آدمی دریا ہے اور صحرا بھی

اثر وہی ہُوا آخر اگرچہ پہلے پہل
ہوا کا ہاتھ گلوں کے بدن پہ پھسلا بھی

انھیں تو حفظ تھے سب لوگ اپنے نام بنام
ہمیں کو یاد نہ آیا کسی کا چہرہ بھی

ابھی زمانے سے شاید ہو سو برس پیچھے
تمھارا دل بھی سلامت ہے اور چہرہ بھی

کوئی نہ جان سکا وہ کہاں سے آیا تھا
اور اُس نے دھوپ سے بادل کو کیوں ملایا تھا

یہ بات لوگوں کو شاید پسند آئی نہیں
مکان چھوٹا تھا لیکن بہت سجایا تھا

وہ اب وہاں ہے جہاں راستے نہیں جاتے
میں جس کے ساتھ یہاں پچھلے سال آیا تھا

سنا ہے اس پہ چہکنے لگے پرندے بھی
وہ ایک پودا جو ہم نے کبھی لگایا تھا

چراغ ڈوب گئے کپکپا کے ہونٹوں پر
کسی کا ہاتھ ہمارے لبوں تک آیا تھا

بدن کو چھوڑ کے جانا ہے آسماں کی طرف
سمندروں نے ہمیں یہ سبق پڑھایا تھا

تمام عمر مرا دم اسی دھوئیں میں گھٹا
وہ اک چراغ تھا میں نے اُسے بجھایا تھا

فضا ابن فیضی

سب کو خوابوں کے نہ ایوان میں رکھ
میں حقیقت ہوں، مجھے دھیان میں رکھ

راہزن پھرتے ہیں بستی بستی
گھر کا سرمایہ، بیابان میں رکھ

شب پرستوں کی ہے دنیا پیارے
اپنے سورج کو گریبان میں رکھ

دیکھ پھر، لوگ ہیں کتنے باوزن
میں ہوں پتھر، مجھے میزان میں رکھ

کیا کرے گا تو یہ مٹھی بھر دھوپ
آگ سینے کے خیابان میں رکھ

عقل و دل میں ہے توازن لازم
یوں نہ جذبات کو ہیجان میں رکھ

تیرے امروز پہ جو کچھ بیتے
اپنے فردا کو نہ بحران میں رکھ

بے صدا قریۂ احساس ہوا
انگلیاں اب نہ یہاں کان میں رکھ

کسی دستک کا اُجالا نہ سہی
شمع یادوں کی تو دالان میں رکھ

فرحت انگیز ہے باہر کی ہوا
کھڑکیاں ذہن کے ایوان میں رکھ

ہے در و بستِ معانی ان سے
ملکہ، لفظوں کی پہچان میں رکھ

شہر تا شہر ہے زخموں کا پڑاؤ
اپنا خیمہ ابھی میدان میں رکھ

تو ہے غالبؔ کے لیے شیفتہ سا
منتخب شعر ہوں، دیوان میں رکھ

اے فضاؔ لے کا یہ شعلہ نہ بجھے
اتنا آہنگ تو اوزان میں رکھ

○

مظہر امام

کوئی نگاہ و دل کا خریدار ہی نہ تھا
ہم نے دکاں سجائی تو بازار ہی نہ تھا

لے دے کے ایک وصل کی خیرات مانگ لی
جیسے کچھ اور، شوق کو، آزاد ہی نہ تھا

نایاب تھے گہر ہی کی مانند خشت و سنگ
یا اس نگر میں کوئی گنہگار ہی نہ تھا

اک دوسرے کے غم میں تھے سب اس طرح شریک
جیسے کسی کو مجھ سے سروکار ہی نہ تھا

سب ساتھ لے کے آئے تھے اپنی متاعِ جاں
میری طرح وہاں کوئی دلدار ہی نہ تھا

وہ کیا بدلتے حسن کا معیار اے امامؔ
اہلِ ہوس کے سامنے معیار ہی نہ تھا

○

افضل منہاس

شوق سے دے فاقہ مستی، لیکن ارزانی نہ دے
پیاس کے بدلے مجھے مانگا ہوا پانی نہ دے

میری سوچوں کو بخشا میں نے محسن کا گداز
مجھ کو ہر دُکھ دے مگر ان کو پریشانی نہ دے

آنچ دے کر میں نے کنکر کو بنایا ہے گُہر
تو کسی نا مستحق کو اس کی تابانی نہ دے

میں نے منزل پر لگایا ایک پھل والا درخت
ہوں مگر تنہا، مجھے تو اس کی دربانی نہ دے

ہر بھنور سے بچ نکلتا ہوں یہ تیری دین ہے
اب بہت ہی تھک چکا ہوں سانس طوفانی نہ دے

میں نے شعروں کا کفن اپنے لیے خود سی لیا!
دنیا چاہے بھی کوئی تو مجھ کو عریانی نہ دے

میں نے اپنا سب اثاثہ دوسروں کو دے دیا
کیسے ممکن ہے کہ ابراہیمؑ قربانی نہ دے

میرے کاسے میں تری رحمت کے تازہ پھول ہوں
یہ اگر مل جائیں، بیشک مجھ کو سلطانی نہ دے

اس قدر بھٹکے ہُوئے ظالم کو میں کیا نام دوں؟
تیر جو مارے، مگر معصوم کو پانی نہ دے

کر لیا افضلؔ نے ہر پیوند پہ سورج طلوع
اس فقیری کا مگر اُس کو کوئی ثانی نہ دے

یوسف جمال انصاری[1]

گل و شبنم ہوں ترا خون پسینہ جیسے
تجھ پہ نازاں ہو بہاروں کا مہینہ جیسے

کوئی دیکھے تو سرِ شام یہ اُڑتے بادل
بال بکھرائے ہوا اک شوخ حسینہ جیسے

یوں تجھے آئینۂ دل میں لیے پھرتا ہوں
کہ محبت کی انگوٹھی پہ نگینہ جیسے

سوز کو ساز کے پردے میں چھپانے والے
ختم ہو تجھ پہ محبت کا قرینہ جیسے

میرے ہر شعر میں دھڑکن ہے تری چاہت کی
شاعری ہو مرے احساس کا زینہ جیسے

تجھ پہ پہلی وہ نظر ثبت ہر اک یاد پہ ہو
وہ گھڑی اور وہ دن اور وہ مہینہ جیسے

دل میں ہے یاد تری، دھیان میں عالم تیرا
کسی ویرانے میں پوشیدہ دفینہ جیسے

چین لینے نہیں دیتی تری چاہت کی خلش
خونِ دل میں ہو رواں کوئی سفینہ جیسے

بات یہ ہے کہ گلے اُن کو لگایا تھا کبھی
اب ہے گیتوں کا سمندر مرا سینہ جیسے

[1] افسوس کہ ۲ ستمبر کو وفات پا گئے۔

سجاد باقر رضوی

درد کے ساگر کو لہریں دے، دکھ کے پہاڑ کو حرکت دے
روح کے بے حس سناٹوں کو گویائی کی قوت دے

ہجر کی کڑوی نیندوں میں بھی خواب ہیں میٹھی یادوں کے
خوابوں کو تعبیر عطا کر اور یادوں کو صورت دے

خالی رہنے والا کیسہ اور بھر آنے والا دل
اپنا تو مقسوم یہی ہے اب آگے جو محبت دے

تو رازق ہے عالمین کا دنیا کو دے سیم و زر
دل کے عالم پر بھی نظر رکھ، ہم کو درد کی دولت دے

اہلِ ہوس کا حاصل دنیا، دنیا کا حاصل ہے ہوس
اے غمِ دل، ہم تیرے اہل ہیں، جو کچھ تیری عنایت دے

سنگ سروں کو دلوں کو وحشت کانٹے آبلہ پاؤں کو
گل چہروں کو رنگت و نکہت، شعلہ لبوں کو تمازت دے

کیسے کیسے موسم دل سے بے آواز گزرتے ہیں
اے مرے دل اب کے خوں ہو کر موسمِ گل کی شہادت دے

اس کی اک تصویر بنا لوں دل کے صورت خانے میں
یادوں سے کچھ رنگ نچوڑوں اے غمِ دنیا مہلت دے

لفظ کی کاشت کرے گا باقرؔ اب کے موسمِ باراں میں
معنی کی یہ فصل ہو دونی، دل کی زمیں کو طاقت دے

اقبال ساجد

○

دنیا کی کیا مجال چمن سے نکال دے
مجھ کو حدودِ ملکِ سخن سے نکال دے

طاقت تو ہے عدو میں مگر حوصلہ نہیں
ورنہ مری زبان دہن سے نکال دے

کیا سوچتا ہے کاٹ رگ و پے کی رسّیاں
اب خون کا عذاب بدن سے نکال دے

ہاتھوں کو خود صلیب بنا اپنے واسطے
موقع ہے زندگی کو گھٹن سے نکال دے

سورج کو سب کے سامنے اب بے نقاب کر
ظلمت کا زہر پہلی کرن سے نکال دے

پہنائے وسعتوں کو نیا دائرہ کوئی
اس چرخ کو نظامِ کہن سے نکال دے

پھر دوسروں کے واسطے خوشبوں کا باب کھول
خود کو تو قید رنج و محن سے نکال دے

مانگی ہے مجھ سے کس نے نئی نیکیوں کی بھیک
کس نے کہا زکوٰۃ سخن سے نکال دے

سینے سے پھر لگائیں گے تجھ کو پرانے لوگ
ساجد جدیدیت کو تو فن سے نکال دے

اقبال ساجد

کیا آن کا ذکر، انا بھی شہید کی
نام آوری کے شوق نے مٹی پلید کی
مجھ کو ادب کی دار پہ کھینچو کہ میں نے کیوں
شہزادیٔ سخن سے محبت شدید کی
کل رات میرے ساتھ ستارے بھی رو پڑے
دیکھی گئی نہ اُن سے تباہی اُمید کی
اُجڑے ہوئے مکان کے نقش و نگار دیکھ
سینے میں مرے جھانک جو خواہش ہے دید کی
اُس میں بھی اب نہیں رہا بکنے کا حوصلہ
مجھ میں بھی ختم ہو گئی قوت خرید کی
ماتم سرائے دہر میں ایسے بھی لوگ ہیں
نام حسینؑ لب پہ ہے خو ہے یزید کی
جذبوں نے آنکھ کھول کے پہلی کرن کے ساتھ
ہر صبح جمع کی ہے اکائی اُمید کی
یوں خواہشوں نے خواب میں میلے لگا لیے
بچے منا رہے ہوں خوشی جیسے عید کی
ساجد میں اُس کے حسن کی توصیف کیا کروں
کافی ہے جیتی جاگتی خواجہ فرید کی

کھلتے ہیں جستجو کے یہ در کس کے واسطے
نکلی حصارِ شب سے سحر کس کے واسطے
خوابیدہ بستیوں میں نہ جانے شعاعِ مہر
کس کس کا کھٹکھٹائے گی در کس کے واسطے
چُنتے ہیں گلستانِ اُفق سے گلِ شفق
مہتاب خو، ستارہ نظر کس کے واسطے
یہ کون پانیوں کے سفر پر نکل پڑا
پڑتے ہیں موج موج بھنور کس کے واسطے
لکھوں میں جاگنے کا عمل کیوں ورق ورق
ترتیب دوں کتابِ ہنر کس کے واسطے
پھر جمع کر رہے ہیں بُرائی کے شہر میں
لوگ اپنی نیکیوں کے ثمر کس کے واسطے
ہے جاہلوں کے سامنے تخلیق کا زیاں
رکھوں نمائشوں میں ہُنر کس کے واسطے
اچھا نہیں ہے دل میں عمل ٹوٹ پھوٹ کا
جذبوں کو کر رہا ہے کھنڈر کس کے واسطے

اقبال ساجد

○

سرخ لہو سے یہ پھلواڑی کرتا ہوں
میں لفظوں کی کھیتی باڑی کرتا ہوں

شعر و سخن کی دنیا میں اک مدت سے
نئے نئے تیار کھلاڑی کرتا ہوں

آڑے وقت میں سایہ ہی کام آتا ہے
خود کو پیچھے اُسے اگاڑی کرتا ہوں

تو بھی اب اندر سے خارِ بغض نکال
صاف میں دل سے شک کی جھاڑی کرتا ہوں

تو بھی اپنے جسم کے اندر ایندھن ڈال
میں بھی تیز لہو کی گاڑی کرتا ہوں

وحشت رہتا ہوں اپنے خوں کے نشے میں
رقص خوشی سے پی کے تاڑی کرتا ہوں

ویسے تو انساں ہوں سیدھا سادہ میں
باتیں لیکن ترچھی آڑی کرتا ہوں

○

عارض کی آنچ، گرمیٔ لب جسم سے چھین لے
خوشبو، مٹھاس، ذائقہ سب اُس سے چھین لے

اک صبح اُس کے بازو بدن کی شفق چرا
اک شام روشنی کا سبب اُس سے چھین لے

[illegible] سے مرمر نکال دے
اور پھول [illegible] سے چھین لے

تتلی کے بازوؤں پہ رنگوں کی دھوپ چھاؤں
جتنا بھی اُس کا حسن ہے سب اُس سے چھین لے

سادہ ورق پہ [illegible] کی تصویر [illegible]
پھر اُس کے [illegible] اُس سے چھین لے

وہ ذائقے میں رقص [illegible] منجمد
پچھلی نظر میں موجِ طرب اُس سے چھین لے

ساجد زرِ بدن پہ اُسے ناز ہے بہت
گاہک نہ بن لگا کے نقب اُس سے چھین لے

لاحاصل [illegible]

یحییٰ امجد

صبح کی ٹھنڈی روشنیوں کی خواہش ہے
اس خواہش کی رتھ میں بیٹھے دُکھے ہوئے سب دل!
رات کی سرحد لامحدود،
وجود
عمل کی خواہش میں جیتا ہے
عمل کی ہمت سے ڈرتا ہے
میں تو ہار چکا سو بار اذانِ سحر پہ ایمان لائے سے
دلیشم کے فرغل میں جو افلاک سے [illegible]
سب شہروں میں اذانِ سحر کا شور مچاتے [illegible]
رات ہیں ان ہنگاموں سے یہ ڈرتا [illegible]
جادو بھری صداؤں کے باطن سے [illegible]
اور اندھے پن میں روتا ہوں
اپنے سے تنہا ہوتا ہوں
آہوں اور اشکوں میں جیتا ہوں
اور ڈرتا ہوں
میرے لہو کا دیپ جلے تو رات [illegible] اگر بجھی جل جائے
آدھی رات کا سورج ہو پھر شب کی [illegible]
ان سوچوں سے اور عمل کی رنگیں خواہش [illegible]
اور ہمت سے میں ڈرتا ہوں
اس منزل سے دل ڈرتا ہے
لاحاصل لمحے دل کو ڈرتا ہے

سچ سچ ثابت ہوگا میرے دل کا کہا بھی !

مجید امجد

رات کی گھمبی میں ہم بیٹھے اونگھتے ہیں
اور کہتے ہیں :
صبح کے روشن میدانوں میں جا کے رکیں گے
یہ پاپی دل ایسی ہی باتوں سے تو جل جاتا ہے
جب دن اپنے پر پھیلائے میدانوں پہ اُترتا ہے
رات کی گھمبی غاروں کے پاتالوں میں گر جاتی ہے
تم کن نیندوں، کن خوابوں میں کھیل رہے ہو
اس گھر کی دیواریں دلوں پہ خدا کا سایہ ہیں
گھر کو جلا کر روشنیوں میں جینے کی خواہش کرتے ہو
مورکھ !
پھر تو رات کی گھمبی کا یہ اونگھنا بھی باقی نہ رہے گا
تم ہو گے اور غاروں کی دہشت ہوگی
میں تو اپنے لہو کی شمع جلا کر اک فصیلِ نور میں گھر جاؤں گا
تم دیکھو گے چاروں اور بکھرتی ہوگی
دن کی تیسیار بھی
بجھتے ہوئے چہروں سے کھیلتی ـــــــ نئی نئی خوشبوؤں کی ہوا بھی
سچ سچ ثابت ہوتا میرے دل کا کہا بھی !

ہاں چلے حلقۂ زنجیر کی بات

(سمیع القاسم کی نظم "ما تیسر من سورۃ السلاسل" کا آزاد ترجمہ)

امجد اسلام امجد

نہیں سلاخوں کے بس میں مجھ کو ہلاک کرنا
فصیلِ زنداں نہ روک پائے گی راہ میری
فضول ہے یہ شبِ سیہ کی تباہ کاری
کہ میرے خوں میں چمکتے دن کی نفیریاں ہیں
نظر میں اپنے ہی رنگ چھائے ہیں
اور ہونٹوں پہ جو صدا ہے وہ حرفِ جاں ہے
گئے ہُوؤں کی عزیز روحو،
کبھی تو برزخ کی سرحدوں سے نکل کے آؤ
کبھی تو میرے زفاف کی شب میں مجھ کو دیکھو
کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے فنا سفر میں
جبین اپنی بلند رکھی،
کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے
پسِ پیبدۂ غم میں جانے والوں کی مغفرت کی دعائیں مانگیں
مغنّیوں کی صدائیں راتوں میں گونجتی ہیں
لرز رہے ہیں تمام سازوں کے تار جیسے
کبھی نہ سوئیں گے اہلِ نغمہ
مرے وطن اے متاعِ ہستی — کبھی تو سُن لے
کہ ذرّہ ذرہ تری سماعت کا منتظر ہے
قبول کر لے ہمارا نغمہ
جو پھُول بن کر نواحِ زنداں کی شور مٹی میں کھِل اُٹھا ہے

بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں
اور ایک بے باک نغمہ لیے ...
جو اس کی بندش کے مدعی ہیں
(بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں ...)
میں ان کے آخر کے ظلم صفحوں کو ایک اک کرکے پھاڑتا ہوں
کبھی کبھی جب مری بصیرت شکست کھاتی ہے اور سوچیں،
جہت بھلا کر بھٹکنے لگتی ہیں، میری آنکھوں
میں کوند جاتا ہے اپنے والد کا وہ تبسم
جو موت ملنے پہ اُس کے چہرے پہ ضو فگن تھا
دکھائی دیتے ہیں قاتلوں کے سیاہ چہرے
جو خوف و دہشت کے سرد جالے میں کانپتے ہیں
مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے
کہ اُن کے بس میں نہ گیت میرے نہ پھول میرے نہ میری چاہت
مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے
کہ دسترس میں نہیں ہیں اُن کی وہ کھڑکیاں جن سے میری
جبیں ابھری ہوئی ہیں
مجھے کسی عارضے کا ڈر ہے نہ ان فصیلوں میں جو حریت
کے شاہکاروں کا خوف کرتی
کہ جب بھی چاہوں ...
نئی مسرت سے پُر زمینوں کی طرح ... میں ... چھپا ...
... میں ...
نہیں ہے کچھ بھی سلاخِ زنداں کی دسترس میں
کہ میری ساری حیات لمحہ ہے ایک لمحہ
زمانِ چاہت کے لاکھ قرنوں میں ایک لمحہ
یہ قید میری، مرے لیے ہے فقط تماشا
قضا ہے جس طرح کھیل کوئی ...

۵۵

امجد اسلام امجد

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

اُس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اُسے اصل میں مر جانا ہے

جو گہر تھا اُسے پتھر کی طرح ہم نے کیا
وہ جو پتھر تھا اُسے ہم نے گہر جانا ہے

بول اے شام سفر رنگ رہائی کیا ہے
دل کو رکنا ہے کہ تاروں کو ٹھہر جانا ہے

کس لیے اٹھتے ہوئے چاند کا رستہ روکیں
اس کو ہر طور سوئے دشت سحر جانا ہے

گُل کھلا ہے تو اسی خاک میں ملنا ہے اُسے
وہ تو خوشبو ہے اُسے اگلے نگر جانا ہے

وہ ترے حسن کا جادو ہو کہ میرا غم دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اُتر جانا ہے

○

سجّاد رضوی

غالبؔ ہوئے ہیں خستہ و ناچار ان دنوں
پھرتے ہیں میرؔ گلیوں میں کیا خوار ان دنوں

سوداؔ کا آشنا نہیں کوئی زمانے میں
ناسخؔ کا نام لینا ہے بے کار ان دنوں

انشاؔ و مصحفیؔ کو نہیں پوچھتا کوئی
آتشؔ کے شعر پڑھنا ہے آزار ان دنوں

بےرنگ ہے کلامِ انیسؔ و دبیرؔ آج
بیکار سحرکاریِ اشعار ان دنوں

اقبالؔ کو بھی کوئی نہیں جانتا یہاں
ان کا بھی کتنا سرد ہے بازار ان دنوں

دولخت زندگانی ہوئی ہے، عجب نہیں
سایے سے اپنے بھاگے جو دیوار ان دنوں

منصور کو شعورِ انا الحق نہ ہو تو پھر
آئے کہاں سے حوصلۂ دار ان دنوں

بزمِ سخن میں رونقِ محفل نہ بن سکیں
لطفِ کلام و لذتِ گفتار ان دنوں

جینا تو کام اہلِ جنوں کا ہے آج کل
جو مر چکے ہیں، ہیں وہی ہشیار ان دنوں

اب مردہ دل تو مرتے ہیں جینے کے واسطے
اور زندہ دل ہیں جینے سے بیزار ان دنوں

دل کو نگہ کی برف نے ماؤف کر دیا
ٹھنڈی پڑی ہے آتشِ افکار ان دنوں

یا دل کی برف ہی کا پگھلنا محال ہے
یا بجھ گیا ہے شعلۂ رخسار ان دنوں

ہر صیقلِ خیال سے بڑھتا ہے دمبدم
آئینۂ شعور پہ زنگار ان دنوں

جلوے تو منتظر ہیں کہ دیکھے کوئی مگر
خالی پڑا ہے روزنِ دیوار ان دنوں

شہروں کی تنگ گلیوں سے اب جائیے کہاں
ملتے نہیں ہیں دشت کے آثار ان دنوں

اک نقطۂ خیال سے آگے نہ بڑھ سکے
یوں رُک گئی ہے گردشِ پرکار ان دنوں

چہرے جو رشکِ لالہ و گل تھے کبھی وہ ہیں
بے رنگ مثلِ صفحۂ اخبار ان دنوں

چلنا ہو بزم کو تو کفن باندھ کر چلو
چلتی ہے بات بات پہ تلوار ان دنوں

سُونی پڑی ہیں بزمِ تمنّا کی خلوتیں
ٹھنڈا پڑا ہے شوق کا بازار ان دنوں

فرصت کہاں کہ بزمِ تمنّا سجائیں اب
ہیں اہلِ بزم برسرِ پیکار ان دنوں

ہر ہر قدم پہ دست و گریباں ہیں راہرو
بے دست و پا ہے قافلہ سالار ان دنوں

سب لوگ نرگسی ہوں جہاں میں تو کیا کرے
حیراں نہ ہوں جو نرگسِ بیمار ان دنوں

ہر موڑ پر ہے تاک میں اک رہزنِ خیال
راہِ طلب میں چلنا ہے دشوار ان دنوں

شہرِ کمال میں کوئی مسکن نہ مل سکے
سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں گھر بار ان دنوں

سر پھوڑنے کو منّتِ اعدا اُٹھائیے
ملتا نہیں ہے سنگِ درِ یار ان دنوں

جاتے ہو چاند پہ کہ زمیں تنگ ہوگئی
یا بڑھ گئی ہے سرعتِ رفتار ان دنوں

اب گردشِ فلک کا گلہ کس طرح کریں
ہیں دیدنی زمین کے اطوار ان دنوں

لرزاں ہیں چاند اس کی نحوست کے خوف سے
اپنی زمیں ہے کوکبِ دُم دار ان دنوں

چرخِ کہن کو اب تو زمیں مات دے گئی
حیراں کھڑا ہے گنبدِ دوّار ان دنوں

گم سم ہیں طائرانِ چمن خوفِ زیست سے
رکھتے ہیں زیرِ پر سبھی منقار ان دنوں

لٹتی ہے آج عصمتِ الفاظ چوک میں
خاموش ہے زبانِ گہربار ان دنوں

خوش ہے، غمِ کشاکشِ دنیا نہیں رہا
کرتا ہے رقصِ مرغِ گرفتار ان دنوں

خاموشیوں میں ڈوب گئے وادیوں کے گیت
نوحہ کناں ہے نغمۂ کہسار ان دنوں

فصلِ بہار میں چمنستاں اُداس ہے
چڑیوں کو یاد ہی نہیں چہکار ان دنوں

ہے محتسب کمالِ معاصی کے باوجود
اوروں کے احتساب پہ تیار ان دنوں

ہے کاروانِ اہلِ نظر فرد فرد آج
کچھ یوں بڑھی ہے شورشِ پندار ان دنوں

اس کے بغیر بن نہیں پڑتی ہے بزم میں
عاشق بنے ہیں سادہ و پرکار ان دنوں

معشوقِ تندخو کو بغرضِ نیازِ عشق
کرتے ہیں جوڑ توڑ سے ہموار ان دنوں

اُستاد نورِ علم سے بیگانہ ہوگئے
بیزار شوق سے ہوئے فنکار ان دنوں

محرومِ آہِ نیم شبی سے ہے زندگی
بے نالۂ سحر ہے دلِ زار ان دنوں

غنچہ لبی نہ ہے باعثِ لذتِ حیات [illegible]
کیا دلفریب رہے ہیں دہن یاران دونوں

ہے گفتگو سے اہلِ تجمل با حسرت ملال [illegible]
ہے دلپذیر خطبۂ لبِ یاران دونوں

عیسیٰ جو خوں چارہ گر تو وہ دشمن جگر کھا گئی دیں
دشمن دکھائی پڑتا ہے غم خواران دونوں

شوکھیل خیر میں یوسفِ کنعاں بعید [illegible]
ملتا نہیں ہے کوئی خریداران دونوں

ہے دامنِ نگاہ پہ ویرانیوں کا راج
یاد دلوں کے آستاں پہ ہے ادبار ان دونوں

مومن ہو چلے ہیں کافر [illegible] گمراہیوں میں [illegible]
ایماں بنا ہے شیوۂ کفار ان دونوں

مورتی میں بہ گئیں سبھی نارک [illegible] لیاں
مٹی میں مل گئیں سبھی اقدار ان دونوں

اک قطرہ سے بہت ہے آئے بھر ہے بخودی
ہے تنگ تنگ ظرفِ قدح خواران دونوں

کیسے کسی نے آبلہ پائی کی [illegible]
راہیں تمام ہو گئیں بے خار ان دونوں

مٹی سے کے عوض ایک [illegible] جو ہر [illegible]
کیا لگ رہے ہیں کلیوں میں طومار ان دونوں

شاعر اپنے تو پھر کیوں جیبک [illegible]
ہے کفر موت بندۂ نادار ان دونوں

انساں کی لاش گلیوں میں کھینچی پھرے مگر
اٹھے جنازہ سنگ زردار ان دونوں

فنکار کی رگوں سے لہو کھینچ کھینچ کر
پیتے ہیں خوب حاشیہ بردار ان دونوں

لب پر شمار [illegible] صد [illegible] ہے مدام
دل ہو گئے ہیں بستۂ زنار ان دونوں

قرآں بلند کرتے ہیں نیزوں پہ رات دن
بنتے ہیں دینِ حق کے طرفدار ان دونوں

واعظ کے لب مذمتِ سلطاں میں خامشی [illegible]
دل ہے ہلاکِ حسرتِ دربار ان دونوں

سب دیکھتے ہیں منہ ہے کوئی بولتا نہیں
دل سو رہے ہیں آنکھیں ہیں بیدار ان دونوں

گزرے ہیں قیامتیں کہیں ان کو خبر نہ ہو
ملتے نہیں ہیں دل کے مگر تار ان دونوں

کتنی کڑی ہے دھوپ مگر بیٹھے کہاں
آئے کہاں سے سایۂ دیوار ان دونوں

آتی ہے قولِ غالبِ آشفتہ سر کی یاد
دیوار و در ہوئے ہیں در و دیوار ان دونوں

[illegible] دکھاتے ہیں دل کے داغ
[illegible] اشعار ان دونوں

کسریٰ منہاس

حال پوچھو نہ دکھ بھرے دل کا — بجھ نہ جائے چراغ محفل کا
بے نیازی نے ان کو سمجھایا — سخت مشکل ہے مرحلہ دل کا
اک تلاطم تھی زندگی جن کی — لے رہے ہیں وہ نام ساحل کا
تیری صورت ہے سامنے میرے — دل ہے آئینہ رابطِ کامل کا
وقت بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے — بڑھ گیا اور زور قاتل کا
کسی امید کا اشارہ ہے — بجھ کے جلنا چراغِ محفل کا
کہہ دو اِن تند و تیز موجوں سے — ڈوب جائے نہ نام ساحل کا
اُٹھ گیا کون لے کے انگڑائی — رنگ بدلا ہُوا ہے محفل کا
دلِ پُر شوق کیا ارادہ ہے — فاصلہ بڑھ رہا ہے منزل کا
رات غم کی کٹی سلیقے سے — ہُوا آسان وقت مشکل کا

دہر میں باوقار ہیں کسریٰ
جن کو پاس عظمتِ دل کا

رشید انور

○

پھول رستے میں جو بکھرا ہوا پایا ہوگا
میرا افسانہ تجھے یاد تو آیا ہوگا

اپنی پلکوں پہ ستارے سے سجائے ہوں گے
جشنِ ہجراں بھی کسی طور منایا ہوگا

میں نے سورج کو ندامت سے ڈوبا دیکھا
دھوپ میں کوئی دیا تم نے جلایا ہوگا

گر تصوّر میں کبھی مجھ سے ملے بھی ہوگے
ایک پرچھائیں کو سینے سے لگایا ہوگا

جب کبھی دیکھ کے حالات کو روٹھے ہوگے
سوچتا ہوں کہ تجھے کس نے منایا ہوگا

ہجر کی آگ میں تم جس سے لپٹ کر روئے
آگ میں جلتا ہُوا میرا ہی سایا ہوگا

آج پھر روح مری مجھ سے جدائی مانگے
اُس نے گھبرا کے مجھے آج بلایا ہوگا

میرے مٹنے کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے
نقش پانی پہ کئی بار بنایا ہوگا

دل میں محشر سا بپا آج ہُوا ہے انورؔ
وقت نے پھر کوئی آئینہ دکھایا ہوگا

امید فاضلی

O

اپنی فضا سے اپنے زمانوں سے کٹ گیا
پتھر خدا بنا تو چٹانوں سے کٹ گیا

پھینکا تھکن نے جال تو کیوں کر کٹے گی رات
دن تو بلندیوں میں اُڑانوں سے کٹ گیا

وہ سر کہ جس میں عشق کا سودا تھا کل تلک
اب سوچتا ہوں کیا مرے شانوں سے کٹ گیا

پھرتے ہیں پھن اُٹھائے ہُوئے اب ہوس کے ناگ
شاید زمیں کا ربط خزانوں سے کٹ گیا

ڈوبا ہُوا ملا ہے مکینوں کے خون میں
وہ راستہ جو اپنے مکانوں سے کٹ گیا

مِل کر جُدا ہُوا تھا کوئی اور اس کے بعد
ہر ایک لمحہ اپنے زمانوں سے کٹ گیا

کِس کے نام کروں؟

احسن علی خاں

مہر و خلوص و غم کی دولت، کس کے نام کروں
سامنے آئیں اہلِ وراثت، کس کے نام کروں

سیر چمن کی، عیش محل کے، میرے پاس نہیں
تپتے دشت، تڑپتی وحشت، کس کے نام کروں

میری جاں ہے ایک ہی سچ کا صدقہ، اور ابھی
قرض بہت ہیں حرفِ صداقت، کس کے نام کروں

کل کی دُکھتی یادیں دفنا دینا میرے ساتھ
آج کے درد و کرب کی شدّت، کس کے نام کروں

اچھا، آج کی محرومی بھی میرے نام سہی
کل کیا ہوگا، کل کی قسمت، کس کے نام کروں

احسن علی خاں

○

یہ اپنی بیچارگی کا عالم، گنہ نہیں ہے تو اور کیا ہے
نہ اپنے بس میں سنوارنا ہے، نہ اپنے بس میں بگاڑنا ہے

جو خواب دیکھا تھا آخرِ شب، وہ صبح ہوتے بکھر چکا ہے
دیا تھا ہم نے ہی خود کو دھوکا، سحر پہ الزام آ گیا ہے

وہ قافلہ تھا کہ کوئی لشکر، یہاں سے گزرا ہے کون ایسا
کہ دور تک آج رہگزر پر غبار کا رقص ہو رہا ہے

میں کھوئے انساں کو ڈھونڈتا ہوں، انا گزیدہ دلوں میں ناصح
تجھے مبارک ہو یہ تجسس، کہاں ہے شیطاں، کہاں خدا ہے

وہ راہبر ہے اگر تو پھر کیا، وہ راہزن ہے اگر تو پھر کیا
جو راہ میں ساتھ ہو لیا ہے، وہ اجنبی میرا آشنا ہے

○

کب تک تری بیداد کا غم کرتے رہیں گے
زندہ ہیں تو امیدِ کرم کرتے رہیں گے

اضداد کا ٹکراؤ ہے فطرت میں ہماری
ہم آب اور آتش کو بہم کرتے رہیں گے

سجدے ہیں جبیں میں تو بایں کعبہ و کاشی
تعمیرِ نئے دیر و حرم کرتے رہیں گے

میخانہ بھی مل جائے تو ہم پیرِ مغاں سے
شکوہ کہ صراحی میں ہے کم کرتے رہیں گے

ہر درد کا درماں ہے یہی دردِ محبت
ہر درد کو اس درد میں ضم کرتے رہیں گے

جمنا پرشاد راہی

○

کہسارِ تغافل کو صدا کاٹ رہی ہے
حیراں ہوں کہ پتھر کی ہوا کاٹ رہی ہے

پیشانیٔ ساحل پہ کوئی نام نہ اُبھرے
ہر موج سمندر کا لکھا کاٹ رہی ہے

الفاظ کی دھرتی پہ ہوں مفہوم گزیدہ
اب جسم پہ کاغذ کی قبا کاٹ رہی ہے

مجبور ہیں مغرور درختوں کی قطاریں
ہر شاخ کو شمشیرِ انا کاٹ رہی ہے

کیا اپنی خبر دوں کہ تری وضعِ خموشی
خود سلسلۂ حرف و نوا کاٹ رہی ہے

فنکار کا خوں دامنِ تخلیق پہ گویا
تصویر مصوّر کا گلا کاٹ رہی ہے

ہر روح پسِ پردۂ ترتیبِ عناصر
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی ہے

○

سمجھ سکا نہ کوئی رازہائے خاموشی
مجھے صلیب ملی بر بنائے خاموشی

اچھالیے نہ ہوا میں صداؤں کے خنجر
کہ چاک ہو نہ سکے گی ردائے خاموشی

کہاں کا ظرف کہ جب دورِ خود نمائی ہے
اُتار پھینک سمندر قبائے خاموشی

خروشِ خواہشِ ہستی لہو میں ڈوب گیا
رگوں میں تیر رہی ہے نوائے خاموشی

اُٹھا لیا ہے جو خنجر تو سوچتا کیا ہے
مری زباں قلم کر برائے خاموشی

اب اس کی اندھی عقیدت عجب مقام پہ ہے
تراش لے نہ کوئی بُت خدائے خاموشی

میں آگہی کی کڑی دھوپ سہہ نہ پاؤں گا
شعورِ ذات نہ دے انتہائے خاموشی

مختار ہاشمی

O

نیک فال آئینے، بدشگون آئینے، سرد و گرم آئینے، نرم و سخت آئینے
یوں مقدس تھے ارباب اوہام میں جیسے کرتے ہوں تعمیرِ بخت آئینے

کوئی بے نام نقشِ جمال آفریں لوحِ گیتی پہ شاید اُبھرنے کو ہے
اپنی شاخوں کے عکاس پتوں پہ بھی ہے سجائے ہوئے ہر درخت آئینے

آئینہ خانوں میں دیکھنا ہے عبث ایک آواز کے زیر و بم کا اثر
بازگشت ان میں کہسار جیسی کہاں، یہ تو ہیں اے صدا لئے کرخت آئینے

کسبِ جلوہ سے اس درجہ گھبرا گیا شیشہ گر سنگ باری پہ مائل ہوا
جلوے بکھرے تو حیرت فزا بن گئے، خیرہ خیرہ نظر، لخت لخت آئینے

شیشہ اپنی جگہ سنگ اپنی جگہ۔ اس توازن میں دونوں کی ہے زندگی،
اور اگر پتھروں میں گداز آ گیا نسبتاً ہو ہی جائیں گے سخت آئینے

منعکس کچھ شعاعیں ہوئیں بھی تو کیا! مرتسم کچھ شبیہیں ہوئیں بھی تو کیا
حظ اٹھانا جب ان کا مقدر نہیں کیوں لیے بیٹھے ہیں کور بخت آئینے

نسبتِ جام و آئنہ سے زندہ ہیں شانِ جمشیدی و نازِ اسکندری
گو نہیں تھے، مگر قدرتاً بن گئے، وجہِ زیبائشِ تاج و تخت آئینے

O

وہ سمندر بڑے فیض آثار ہیں جن میں سیپیں ہوں سیپوں میں گوہر بھی ہوں
اُن سرابوں سے پھر کیسے منہ موڑ لے جن سرابوں کی تہ میں سمندر بھی ہوں

قیدِ زنداں میں اے صاحبانِ جنوں سر کا ٹکرانا بیکار جاتا نہیں
کچھ تو رخنے پڑے کچھ تو روزن ہوئے، عین ممکن ہے دیوار میں در بھی ہوں

سُرخ رُو تو کہیں چل کے ہونا ہی ہے شہرِ خرد ہو کہ دشتِ جنوں
بزمِ شیشہ گراں بھی چلو دیکھ لیں چند ہاتھوں میں ممکن ہے پتھر بھی ہوں

میٹھے الفاظ مفہوم میں تلخیاں، چہرے پتھر کے، دل میں مگر زمیاں
یہ تعارف مکمل نہ کہلائے گا جبکہ تو اپنے سموں کے اندر بھی ہوں

سوچتا ہوں مبادا یہ یکسانیت عشق کی طبعِ آزاد پر بار ہو
چند سجدے قیودِ وفا میں سہی کچھ حدودِ تعین سے باہر بھی ہوں

ماتمِ یکِ شہرِ آرزو

جگن ناتھ آزاد

احتشام حسین کے بعد

ایک ظلمت ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
دوستو، شمع کی لو تیز کرو
یہ اُمنڈتی ہُوئی ظلمت یہ ٹھٹھرتی ہُوئی رات
سارے ماحول کو یخ کر دے گی
ہاتھ ہو جائیں گے سُن
پاؤں ٹھٹھر جائیں گے
قافلے گرمیٔ رفتار کے جب راہ نہ پائیں گے ٹھہر جائیں گے
ولولوں کو تپش انگیز کرو
جذبۂ شوق کو مہمیز کرو
دوستو! شمع کی لَو تیز کرو

بنّے بھائی

کیوں مری آنکھ سے آنسو ہیں رواں
وہ مرا کیا لگتا تھا
نہ مرا بھائی نہ رشتے کا عزیز
نہ ملاقات تھی ہر روز کی اُس سے
مگر اس کے باوصف
اُس کو جس رنگ میں دیکھا وہ بھلا لگتا تھا

(۲)

کیوں مری آنکھ سے آنسو ہیں رواں

وہ مرا کیا لگتا تھا
کیوں مرے دل پہ ہے اک بوجھ سا اِس وقت آزاد
جنسِ نایاب کوئی جیسے گنوا بیٹھا ہوں

(۳)

لوگ کہتے ہیں شرافت میں وہ لاثانی تھا
اور انساں بھی ہیں جن میں اسی خوبی کی فراوانی ہے
لوگ کہتے ہیں وہ سچّا تھا کھرا تھا دل کا
اور انساں بھی ہیں، سچّے بھی کھرے بھی دل کے
لوگ کہتے ہیں سخنور تھا وہ تھا نثر نگار
اُس کا مشرق و مغرب کے ادیبوں میں شمار
لیکن اِس دور میں
شاعر ہو کہ ہو نثر نگار
جس میں ہو اس کی کمی کون سا ایسا ہے دیار

(۴)

کس لیے اُس کا تبسم مجھے یاد آتا ہے
مسکراتا ہُوا چہرہ اُس کا
بات کیا ہے کہ مری آنکھوں سے ہٹتا ہی نہیں
اُس کے چہرے سے حسیں تر چہرے
دیکھے ہوں گے مری آنکھوں نے نہ جانے کتنے
مگر اس وقت کوئی یاد نہیں
فقط اس وقت وہی چہرہ مرے سامنے ہے

(۵)

کیا وہ یاد آتا ہے لہجے کی حلاوت کے سبب
اپنے بہتے ہُوئے دریائے محبّت کے سبب
یہ محاسن مگر اوروں میں بھی اکثر ہوں گے

(۶)

اتنی باتوں میں کوئی بات یہ مانا نہ سہی
پھر بھی کوئی بات تو ہے
جو سمجھ میں مری آتی ہی نہیں
اور میں سوچتا ہوں
کیوں مری آنکھ سے آنسو ہیں رواں
وہ مرا کیا لگتا تھا
کیوں مرے دل پہ ہے اِک بوجھ سا اس وقت آزاد
جنسِ نایاب کوئی جیسے گنوا بیٹھا ہوں

میرا دشمن میرا دوست

(سلام مچھلی شہری کی یاد میں)

وہ خرد مند کہ دیوانہ رہا ساری عمر — اپنی محفل کا وہ دیوانہ ہشیار گیا
یار جانی کہ جو تھا ہوش میں اک پیکرِ حلم — اور تھا نشے میں چلتی ہوئی تلوار گیا
ہائے وہ دوست کہ مجموعۂ اضداد تھا ایک — پیکرِ حسنِ خلق گیا پیکرِ آزار گیا
گالیاں جب تری یاد آتی ہیں کھلتا ہی نہیں — پیکرِ صلح کہ مجموعۂ پیکار گیا
کتنے آداب ترے جینے کے یاد آتے ہیں — خاکِ خاموش گئی شعلۂ گفتار گیا
تجھ سے لینا تھا مجھے کتنے ہی جھگڑوں کا حساب — اب تو ہوتا ہے گماں جیسے کہ میں ہار گیا

عمر آزاد! تری جس سے لڑائی نہیں کٹی
وہ ترا ایک عدو وہ ترا اک یار گیا

نیک تھا، بد تھا کہ اچھا کہ بُرا، یار سلام — آج کے دور میں تجھ ایسے کہاں ملتے ہیں
ترے دشنام سے لبریز مرے نام خطوط — ان میں بھی عظمتِ آدم کے نشاں ملتے ہیں
جیسے ظلمات کے عالم میں بلندی پہ رواں — نور برساتے ستاروں کے جہاں ملتے ہیں
پھر مرے دل کو ہے ظالم اُسی لذت کی تلاش — ترے ہر لفظ میں جو تیر نہاں ملتے ہیں
تو نے ہم کو نہ کبھی ہم نے تجھے پہچانا — وہم جس طرح دماغوں میں رواں ملتے ہیں
کیا کوئی جذبہ حسد کا ہے کہ ہے جذبِ خلوص — جس میں ہوتے ہیں فقط وہم گماں ملتے ہیں

ہم میں دو رشتے تھے اک قرب کا اک بُعد کا تھا
دورِ کم ظرف میں یہ رشتے کہاں ملتے ہیں

یاد آتا ہے ترا جوشِ رقابت مجھے آج — کتنی دلچسپ یہ سب بات نظر آتی ہے
اس کو چوبیس برس آج گزرتے ہیں مگر — رات وہ آج کی ہی رات نظر آتی ہے
وہ حقیقت وہ ٹھٹھرتی ہوئی کشمیر کی رات — محض تصویرِ خیالات نظر آتی ہے
اب بھی وہ پھول کراچی میں شگفتہ ہے سلام — اب بھی اس پھول میں اک بات نظر آتی ہے
دور وہ ختم ہوا آج مگر اب بھی وہ آنکھ — ایک تصویر مدارات نظر آتی ہے
جو آکہ وابستہ ہیں اُس حسن کی یادیں تجھ سے — جس سے ہر رات وہی رات نظر آتی ہے

جیت کیسی تھی وہ کیا ہار تھی اب تو پیارے
بازیٔ بزمِ وفا مات نظر آتی ہے

مرے شاعر! اب ہے گئے فیصلہ، یہ سچ ہے کہ نہیں — تجھ کو عنواں نہ ملا تیرے فسانے کے لیے
جو کھلونے تو نے بنائے تھے ترے پاس مگر — کوئی تصویر نہ تھی ان میں سجانے کے لیے
تجھ کو وہ لمحۂ نایاب میسر نہ ہوا — تو نے جس کے لیے الزام زمانے کے لیے
صرف تیرا ہی نہیں ہے یہ مرا بھی خیال — وقت سازش ہے فقط ہم کو مٹانے کے لیے
ترکِ مے نوشی ہو یا کثرتِ مے نوشی ہو — مضطرب ہے ملک الموت بہانے کے لیے
ترے انجام کو دیکھا ہے تو پایا ہے ثبوت — قدردانی ہے یہاں محض دکھانے کے لیے

فقط آماجگہِ تیر و تبر ہے یہ چمن
نہ تو نالے کے لیے ہے نہ ترانے کے لیے

تو تو اب روٹھ گیا اور میں یہ سوچتا ہوں — "بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں"
یاد آتا ہے یہ مصرع بھی تری یاد کے ساتھ — "اب تجھے اے ستمِ یار کہاں سے لاؤں"
یوں تو دنیا ہے دل آزار مگر یار سلام! — تجھ سا محبوبِ دل آزار کہاں سے لاؤں
تو عداوت کا مرقع تھا محبت کی شبیہ — اب تری زیست کے اطوار کہاں سے لاؤں
آج مٹتی ہوئی تہذیب کے لب پر ہے سوال — "تجھ سا اس دور میں فن کار کہاں سے لاؤں"
جس میں تجھ سے نظر آجاتے تھے اکا دکا — آج وہ کوچہ و بازار کہاں سے لاؤں

اپنے ہی آپ سے اب بزمِ سخن پوچھتی ہے
"مجمعِ سبحہ و زنار کہاں سے لاؤں"

موت فن کار کی اعزاز لیے آتی ہے — زندگی بے کسیِ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
آشنا موت ہے، فن کار کی ہر خواہش سے — زیست بیچاری پہ یہ بھید کھلا کچھ بھی نہیں
ہم فقیروں کی سمجھ میں نہ کبھی آئی یہ بات — نام ہے محض ہوا اور ہوا کچھ بھی نہیں
یہ جو توصیفِ سخن ہے یہ جو ہے نثر کی داد — غور سے دیکھیں تو جھولی میں پڑا کچھ بھی نہیں
خار تلووں کو ملے ہیں کہ نہیں آنکھوں کو پھول؟ — کیوں تجھے وہم ہے یہ تجھ کو ملا کچھ بھی نہیں
موت جس راز کے ہر نکتے کو پہچان گئی — زندگی کو ابھی اس شے کا پتا کچھ بھی نہیں

موت لائے گی صلہ تیری جگر کاری کا
زندگی میں ترا فن کار صلہ کچھ بھی نہیں

سراج الدین ظفر

کراچی ہو کہ پنڈی ہو کہ ہو لاہور کی دنیا
اُٹھے جاتے ہوں جب ایک ایک کرکے ہم صفیر اپنے
تعلق ٹوٹتا جاتا ہے تجھ سے اے وطن میرا
تو پھر آزاد میں کیسے کہوں برہم ہے چمن میرا

ابھی تازہ تھا غم یوسف ظفر کا اور ناصر کا
مرے اخلاص میری دوستی کو ناز تھا جس پہ
خبر آئی سراج الدین ظفر بھی ہو گیا رخصت
وہ میرا یار، میرا ہم نظر بھی ہو گیا رخصت

خراباتی تھا اور اسرار کا گنجینہ رکھتا تھا
بباطن مستِ جامِ مصطفیٰ تھا اور ظاہر میں
کرامت ایک زیرِ خرقۂ پشمینہ رکھتا تھا
غزالِ شہر سے رسم و رہِ دیرینہ رکھتا تھا

کراچی کا سفر ہے اور پہلے کی طرح اب بھی
مگر دل ڈوبتا جاتا ہے میرا اس تصور سے
ہزاروں نزہتیں میرے دل و جاں میں سمائیں گی
سراج الدین ظفر تجھ کو مری آنکھیں نہ پائیں گی

سخن کی محفلیں ہوں یا سمندر کا جزیرہ ہو
نیا ماحول ہوگا اور نئی بزمِ سخن ہوگی
نظر آئے گی مجھ کو چار جانب ایک ویرانی
سمجھ پائے گا کون اس میں مرے دل کی پریشانی

ابھی تو موسمِ گل کے بہت انعام باقی تھے
ابھی تشریح کا محتاج ہر مصرع تھا کاکل تھا
ابھی تو شعر کے پردے میں سو الہام باقی تھے
ابھی تو اِس نوشتے میں بہت ابہام باقی تھے

میں اے دانندۂ رازِ گُل و مُل ہوں اس الجھن میں
نسیمِ صبح کا لہجہ لیے لفظوں کے ہونٹوں پہ
گُل و مُل کے اب اسرارِ کہن تک کون پہنچے گا!
غزالوں کے تعاقب میں ختن تک کون پہنچے گا

عبودیت کا عالم اور رازِ ہُو کے پردے میں
مئے عشقِ محمدؐ سے بیاں سرشار ہے تیرا
ہمیشہ یاد رکھے گا غزل کا سازِ نو تجھ کو
ترستا ہی رہے گا نعت کا اندازِ نو تجھ کو

صدیق کلیم اور ان کا فن

مظفر بخاری

پروفیسر صدیق کلیم ہمارے دور کے معروف شاعر اور نقاد ہیں۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے انہیں شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید سے بھی شغف رہا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری اور تنقید کی عمریں تقریباً یکساں ہیں۔ اسی سبب وہ پختہ شعری شعور کے ساتھ ساتھ کڑی تنقیدی نگاہ کے حامل بھی ہیں۔ تنقید کے میدان میں ان کی "شیلے" اور "شیکسپیئر" پر دو کتابیں پہلے شائع ہوئی تھیں۔ اور اب حال ہی میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "فکرِ سخن" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شیلے پر انگریزی میں لکھی گئی کتاب اس شاعر کے فکری ارتقاء کی داستان ہے جسے یورپ میں بھی سراہا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے مختلف زبانوں سے اردو میں ترجمہ شدہ تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "نئی تنقید" کے عنوان سے بھی شائع کروایا تھا۔ یہ کتاب اردو تنقید میں ایک بہت ہی اہم دستاویز ہے جس میں دنیا کے بہترین تنقیدی مقالات کا معیاری ترجمہ شامل ہے۔ اس کتاب نے اردو تنقید کو ایک نئی جہت اور زبان بخشی ہے۔

"فکرِ سخن" میں اہم ادبی موضوعات اور شخصیات پر نہایت اوریجنل اور پُرمغز مقالے شامل ہیں۔ کلیم صاحب نے خود کو کسی مدرسۂ فکر سے منسلک کیے بغیر ایک نہایت متوازن نظریۂ تنقید پیش کیا ہے۔ جو اس کتاب کے آخری مضمون "جدید ادبی تحریک" میں واضح طور پر سامنے آتا ہے۔

شاعری کے میدان میں کلیم صاحب کا پہلا مجموعہ "دمِ نیم سوز" کے نام سے ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ شائع ہوا تھا۔ اور دوسرا مجموعہ "روشنیوں کا سفر" کے عنوان سے ۱۹۷۲ء میں چھپا۔ پختہ تنقیدی نظر کے سبب وہ تمام عمر ایک کم گو اور نسبتاً خاموشی سے لکھنے والے رہے ہیں۔ بطورِ شاعر نام پیدا کرنے کی خواہش آغاز میں ضرور تھی لیکن رفتہ رفتہ دب سی گئی۔ چنانچہ ان کا شمار ان شعراء میں کیا جا سکتا ہے جو شدید تخلیقی ضرورت کے تحت ہی لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ کامل احساسِ ذمہ داری کا مظہر ہے۔

باوجود اس امر کے کہ انہیں زبان پر مکمل عبور حاصل ہے، ان کے ہاں قاری کو محض الفاظ کی گھن گرج سے متاثر کرنے کا رجحان قطعاً دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی زبان ان کے شعری تجربے کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔ وہ اپنے تجربات اور عہدِ جدید کے تقاضوں کی اس حد تک پابندی کرتے ہیں کہ ان قارئین کی ایک بڑی اکثریت کے ردِ عمل سے بے نیاز ہو جاتے ہیں جن کے ذوق کی پرورش و تربیت روایت پر اور روایتی انداز میں ہوئی ہے۔ چنانچہ جب عام قاری کو الفاظ اور رمزیہ تصاویر (IMAGES) کے استعمال کا ڈھنگ نامانوس نظر آتا ہے تو وہ ابہام اور بھیکے پن کی شکایت کرتا ہے۔ یہ صورتِ حال بالخصوص صرف ان چند نظموں کے بارے میں ہے جو "دمِ نیم سوز" کی اشاعت کے بعد کے کچھ عرصے میں لکھی گئیں۔ لیکن یہ نظمیں اس لحاظ سے بہت اہم تھیں کہ ان کے

جذبے کلیم صاحب کی شاعری نئے زور سے مربوط اور ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

"دمِ نیم سوز" میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۵ء تک کے زمانے کی نظمیں شامل ہیں۔ یہ زمانہ تحریک ترقی پسند مصنفین کے عروج کا زمانہ تھا اور اس دور کے شعرا کی اکثر و بیشتر نظموں پر اس تحریک کی چھاپ واضح دکھائی دیتی ہے۔ نوجوان شعرا بالخصوص اس تحریک سے متاثر تھے مجھے اس وقت اس تحریک کے حسن و قبح سے قطع نظر یہ کہنا ہے کہ اس دور میں بھی کلیم صاحب کی نظر ادب کی دائمی اقدار پر تھی۔ اکثر ترقی پسند شعرا کی نظموں کے برعکس ہمیں دمِ نیم سوز کی نظموں میں موضوعات کا تنوع، تجربے کی ہمہ گیری، ایک نوع کی آفاقیت اور ایک رومانی اور جمالیاتی انداز نظر آتا ہے۔ کچھ نظموں میں ترقی پسند آدرشوں کی جھلک بھی ملتی ہے لیکن نہایت فن کارانہ خوب صورتی کے ساتھ۔ مثال کے طور پر "ترغیب"، "شاہکار"، "عہدِ محبت"، "مہارانی" اسی قبیل کی نظمیں ہیں ؎

ہوک جرّاح کے گلتے ہوئے نشتر کی طرح
یا کسی زہر میں بجھتے ہوئے خنجر کی طرح
میری دکھتی ہوئی آنتوں میں چبھی جاتی ہے
اور تو ہے کہ پسِ پردہ چھپی جاتی ہے
اور فسردہ ہیں طرب خیز چراغاں راہیں
یہ گھنی شاخوں میں بہکی ہوئی شاداں راہیں
ایک ناکام محبت ہے ہوس کار نہیں
تیری الفت کا طلب گار، گنہگار نہیں

(شاہکار)

"مہارانی" کا آخری بند ملاحظہ ہو ؎

نئی رانی کی مسرت کے یہ ساماں ہوں گے
ایک روز اس کے مقدر یہ بھی خنداں ہوں گے
زیست کیوں مفلس و نادار کے پہلو میں کٹے
میری محبوب نے چاہا کہ مہارانی بنے

(مہارانی)

کلیم صاحب نے آنکھیں بند کر کے مروجہ طریقہ اور اسلوب نہیں اپنایا۔ بلکہ ایک حساس اور باشعور فن کار کی مانند روحِ عصر کو جانا پہچانا اور اس کا اظہار کیا ہے۔ اُن کا عصری شعور اور مخصوص اندازِ فکر اُن کے الفاظ بندش و تراکیب اور رمزیہ تصاویر میں جھلکتا ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے "دمِ نیم سوز" کی نظمیں کم و بیش کلاسیکی تکنیک ہی میں ہیں لیکن یہ مجموعہ کئی اور لحاظ سے بہت اہم ہے

اِن نظموں سے کلیم صاحب کا روایت کے بارے میں رویہ متعین ہوتا ہے۔ اور پھر اِس رویے کا مکمل اور پختہ اظہار اُن کے دوسرے مجموعۂ کلام "روشنیوں کا سفر" میں ہوا ہے۔ وہ اِس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ جس طرح ماضی حال کو متعین کرتا ہے، اسی طرح حال ماضی کو بدلتا رہتا ہے لیکن حال و ماضی میں فرق یہ ہے کہ شعوری حال ایک طرح سے اور کسی حد تک ماضی کی آگاہی کا نام ہے۔ چنانچہ کلیم صاحب تنقید میں بھی اور شعر میں بھی، روایت کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ اُن کے ہاں روایت کا مطلب اپنے سے پہلی نسل کے طریقوں اور کامیابیوں کا آنکھ بند کرکے اتباع کرنا یقیناً نہیں ہے۔ روایت کا وہ حصہ جو عہدِ نو کا ساتھ نہیں دے سکتا وہ بلا جھجک رد کر دیتے ہیں لیکن روایت کے زندہ اور توانا عنصر کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ روایت کے اِسی زندہ اور توانا عنصر میں جب وہ اپنے عصری شعور، تخلیقی ضرورت اور تجربے کی صداقت کو شامل کرتے ہیں تو نہایت جاندار شاعری معرضِ وجود میں آتی ہے ؎

گر رہے ہیں گھنیری ٹہنی سے
زرد پتے ندی کے دھارے پر
اور مچلتی ہیں آب کی موجیں
کونپلوں کے سبک اشارے پر

دور تک کھیت کی لکیروں سے
ذہن پر خواب آفریں لہریں
پھر اُبھرتی ہیں یاس و حرماں سے
میرے تخیل کی غمیں لہریں

زندگی اک گداز ہے گویا
میرے سینے پہ چلتا رہتا ہے
زندگی اک لپک ہے شعلہ ہے
میرے سینے پہ جلتا رہتا ہے

(کنارِ آب)

کلیم صاحب کی نظموں کی ایک اور خصوصیت اُن کا اعتدال پسندی کا رویہ ہے۔ زبان ہو یا اظہار، اسلوب یا رمزیت، شاعر کہیں بھی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوتا۔ نہ تو شاعر قاری کو الفاظ کے شکوہ سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نہ ہی بے جا جدت پسندی سے اُسے چونکانے کی ؎

رقص گاہوں میں جواں جسم،
تھرکتے ہیں مچلتے ہیں کہیں،
کہیں ذریاد کناں خود ہی لپٹ جاتے ہیں،
تلخئ مے سے تھکن دُور ہوئی،
گردشِ خون کی اِس بے خبری میں،
کیسے معلوم کہاں رات بسر ہو جائے؟

("لندن کی ایک شام" اردشنیوں کا سفر)

اِس میانہ روی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کلیم صاحب کو بڑا شاعر کہلانے کا شوق نہیں اور دوسری بڑی وجہ اُن کا ناقدانہ ذہن اور وسعتِ مطالعہ ہے۔ ان دونوں عوامل نے اُن میں ایک احساسِ ذمہ داری اور محتاط رویے کو جنم دیا ہے۔ یہ احساسِ ذمہ داری اور محتاط رویہ اگرچہ کلاسیکی ذہن کی نمایاں خصوصیت رہی ہے لیکن جدید ذہن بہت حد تک اِس سے عاری ہے۔

کلیم صاحب کی نظموں میں جدید دور کے مسائل، الجھنیں اور جدید انسان کے اندر کی توڑ پھوڑ کا اظہار تو ہے لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے اپنے فن کو بے راہروی، توڑ پھوڑ اور بے مقصد بغاوت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اُن کی نظموں میں اُبھرنے والا انسان شکست و ریخت کا شکار سہی، آدھا سہی لیکن اُن کی ہر نظم آدمی نہیں پوری ہے شکست و ریخت کی شکار نہیں بلکہ ایک مکمل اکائی ہے۔

شاعر اپنے اردگرد ایک گمبھیر قسم کی ابتلا، معاشی بحران، اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت، افراد میں ہزیمت اور شکست خوردگی کا احساس دیکھتا اور محسوس کرتا ہے لیکن اِن عوامل کو براہِ راست شعر میں منتقل نہیں کر دیتا۔ بلکہ یہ سارا مواد قلبِ ماہیت کے عمل سے گزرتا ہے اور مکمل، جامع اور خوب صورت فن پاروں کا رُوپ دھار لیتا ہے اور پھر یہ فن پارے دلوں میں خوف، ہزیمت، شکست خوردگی اور ٹوٹ پھوٹ کے احساس انشراح (CATHARSIS) کا سبب بنتا ہے اور ایک نوع کا حظ عطا کرتا ہے (جسے میں اب بھی ادب کا بنیادی فریضہ سمجھتا ہوں) اور رجائی کے ڈولتے ہوئے ایمان کو تقویت دیتا ہے اور پھر زندگی اپنی تمام تر بدنمائیوں کے باوصف حسین نظر آنے لگتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اب تو اک اک سانس پر جی کی دُکھن ہے ناگزیر
موت کی بے مہر ظلمت روشنی پر چھا گئی
دھیرے دھیرے کس نہج پر آ گئی یہ زندگی
دھیرے دھیرے بجھ گئی گہنا گئی یہ زندگی
ہم ہیں اک سلجھی ہوئی گمبھیر الجھن کے اسیر

یہ سنہری دلکشی زہراب ہو کر رہ گئی
پھر بھی انساں کی قسم اِس زندگی سے پیار ہے
شاید اب بھی آرزو کی روشنی بڑھتی رہے
شاید اب یہ تیرگی خود ہی سحر پیدا کرے
حُسن کی تخلیق ہی انسان کا اظہار ہے
شوق پھر زندہ ہُوا ہے آس پھر بیدار ہے

"اُلجھن" (روشنیوں کا سفر)

شاعری میں کلیم صاحب کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُن کی نظمیں ایک طرف تو اُن اذہان کو مطمئن کرتی ہیں جو شاعری پر مقصد کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں چاہتے اور دوسری طرف اُن قارئین کو بھی جو شاعری کو بامقصد دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا ہی جوکھوں کا کام تھا جو کلیم صاحب نے بطریقِ احسن سرانجام دیا ہے۔

زبان کے بارے میں کلیم صاحب کے رویے پر بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔ "دم نیم سوز" کی زبان کے بارے میں ایک فاضل نقاد نے کہا تھا کہ "زبان اپنی حدود سے باہر چھلانگیں مارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔" اُن کا یہ احساس اپنی جگہ بالکل درست تھا۔ لیکن یہ حدود ہمارے روایتی اور پھر ترقی پسند شعرا کی متعین کی ہوئی تھیں۔ دوسرے درجے کے شاعر ہمیشہ پہلے سے متعین حدود کے اندر رہ کر ہی شاعری کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ نئی ہئیت اور زبان کی نہ ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور نہ ہی انھیں وضع کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ یہ ضرورت ایک نہایت ہی حساس اور خود مختار ذہن کو پیش آتی ہے۔ جو اپنے دور کی تیزی سے لیکن خوشی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کر سکے۔ اور اُن کا اظہار اُس کی زبردست تخلیقی ضرورت بن جائے۔

لیکن نئی لسانی تشکیل میں کلیم صاحب نے بے جا اسراف سے قطعاً کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں غیر ضروری ابہام راہ نہیں پاتا۔ کلیم صاحب کی چند نظموں میں جو تھوڑا بہت ابہام ہے، وہ ہمیشہ سے شاعری کا جزو رہا ہے کیونکہ اِس کے بغیر شاعری سپاٹ اور سامنے کی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ تخلیقی ابہام ہے اور اُس شعوری ابہام سے بالکل مختلف جو ہمارے جدید تر شعرا قارئین کو چونکانے کے لئے پیدا کرتے ہیں۔

"خلوص" کلیم صاحب کی ذات اور فن کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ نہ خود کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں نہ قارئین کو انہوں نے ہئیت اور زبان دونوں میں اپنے تجربات کے تقاضوں کو اوّلیت دی ہے۔ جب تک نظم آزاد اُن کی تخلیقی ضرورت نہیں تھی، انہوں نے پابند نظم لکھی۔ جب نئی ہئیت کی ضرورت پیش آئی، انہوں نے نئی ہئیت اپنائی۔ لیکن پابند نظم ترک نہیں کی۔ ان کے ہاں تجربہ ہی ہئیت کو متعین کرتا ہے۔

"روشنیوں کا سفر" میں ہمیں پابند، معرّیٰ اور آزاد، ہر قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ کہیں کہیں ہئیت کے تجربات بھی ہیں۔ لیکن زبان کی تازگی، شگفتگی اور مناسبت، نیز طرزِ احساس و اظہار کی ندرت اور میانہ روی نے اِن سب نظموں کو ایک لڑی میں پرو کر ایک

مجوب صورت وحدت کی شکل بخش دی ہے نظموں کے متنوع تجربات بالآخر ایک نقطے پر مرکوز ہوتے نظر آتے ہیں اور اس روشن نقطے سے وہ نظریۂ حیات پھوٹتا ہے جو اپنے اندر دائمی اخلاقی اقدار لئے ہوئے ہے اور جس کا اظہار ادب کی دائمی اقدار کے ذریعے ہوا ہے۔

کلیم صاحب اپنی شاعری میں کسی پرانے، نئے یا خود ساختہ فلسفے کی آمیزش نہیں کرتے اور اس لحاظ سے جمالیاتی مدرسہ شاعری کے بہت قریب ہیں لیکن شاعری کو محض ذہنی تعیش کا ذریعہ بھی نہیں بناتے۔ ان کی شاعری میں مقصدیوں گھل مل اور رچ بس گیا ہے جیسے پھولوں میں خوشبو۔ اور یہ مقصد اخلاقی اقدار کا احیا اور ایک بہتر انسانی معاشرے کی تشکیل ہے۔ حریتِ فکر اور حُبّ الوطنی جس کے امتیازی اوصاف ہیں اور یہ وہ مقصد ہے جسے کوئی بھی حساس شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس مقصد کا اظہار کلیم صاحب نے ہمیشہ تخلیقی سطح پر کیا ہے اور کہیں بھی ان کی شاعری پراپیگنڈہ کی سطح پر نہیں آتی۔

ان کے فن کی ایک اور صفت اس کا مسلسل ارتقا ہے۔ "دم نیم سوز" کے مطالعے کے بعد جب ہم "روشنیوں کا سفر" پڑھتے ہیں تو سب سے پہلے ابھرنے والا خوشگوار تاثر یہ ہے کہ شاعر کہیں رکا نہیں۔ بالکل ایسے جیسے وقت نہیں رکتا۔ چنانچہ ان کے فن میں سال خوردگی یا کہنگی کے قطعاً آثار نہیں ملتے۔ ان کا اپنا ایک مخصوص اسلوب ہے جو مسلسل ارتقا پذیر بھی ہے۔ وہ ادب کی دنیا میں اٹھنے والی وقتی روشنیوں کی چکا چوند سے متاثر نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کے پاس خود اعتمادی اور خلوص کے علاوہ ایک تجزیاتی ذہن ہے جو انھیں تشکیک اور بے راہروی کا شکار نہیں ہونے دیتا۔

امن اور جنگ

صدیق کلیم

امن اور جنگ کی پھر بات چلی چلتی گئی
زاویے بدلے بدلتے ہی رہے
امن کا دور ہے یہ
جنگ ہو سکتی نہیں
جنگ انسان کی گھٹی میں سہی
امن ہو سکتا نہیں
جنگ ہو کے ہی رہے گی آخر
امن انسان کی جبلت میں نہیں
امن کا دور نہیں
زاویے دائرے بن جاتے ہیں

لوگ سرگوشی میں ہیں پوچھتے ہیں
در و دیوار سے بھی پوچھتے ہیں
جنگ کب ہوگی؟ نہیں ہوگی؟ بتاؤ ہوگی؟

حکم ہے جنگ کرو
صبح سے شام تلک

خون ـ میدان میں ـ افلاک میں خون
حکم ہے بند کرو
اپنے خوں خوار جیالے شہباز
ہاتھ کو روکتے ہیں
دل مگر رکتا نہیں

امن اور جنگ کے رسیا لوگو!
امن اور جنگ کے مابین سیہ رنگ فضا
صبح کی پہلی کرن کا دھارا
سرخ بکھیرا اُفق شام ڈھلے
یہ ہر اک لمحہ سیہ رنگ فضا
ساتھیو! ہم وطنو!
آج اس کالی فضا میں خاموش
اپنے شہباز کبوتر نہ بنیں
فاختہ آ جائے
تو بہار آ جائے
امن اور جنگ کی پھر بات چلی چلتی گئی

شاید اب کوئی مسیحا آئے

صدیق کلیم

تشنگی اور بڑھی
پیاس بجھتی ہی نہیں
رقص کی لَے تیز کرو
سرخ لہروں کی نئی راہ غبار آلودہ
خون کا پیاسا ہر اک بار پئے خون کا پیاسا ہی رہے
مرے شہباز جھپٹ!
یہ نہیں مانتے ہیں
آج کیوں بحث میں ہیں؟
کالے کوّے جو چلیں ہنس کی چال
مرے شہباز جھپٹ!
دوستو! ساتھیو!
شاید اب کوئی مسیحا آئے
کوئی تدبیر کرو
پیاس بجھتی ہی نہیں
ہونٹ ہونٹوں سے جدا ہوتے نہیں
مرے شہباز جھپٹ!
شاید اب کوئی مسیحا آئے
آخری بار مگر داؤ چلے
مرے شہباز جھپٹ!

ملاقات

صدیق کلیم

یہاں آس پاس اِرد گرد
لرزتے دِیے ناچتے ہیں
یہاں باغ میں ہر طرف
جگنوؤں کی امر مشعلیں ہیں
مدھر گیت ہیں
اٹل ناس ہے
جہاں ہم ملے ہیں
کبھی بادلوں کے جھکولوں میں دل جاگتا ہے
سحر جاگتی ہے
پرندوں کے نغمے رسیلی خوشی بخشتے ہیں
یہاں پانیوں پر دھنک ناچتی ہے
یہاں تم مرے ساتھ ہو
کوئی کون ساگر میں اُترے
جہاں سیپ منہ کھولتے ہیں
جہاں آنسوؤں کی لڑی ہے
مگر لہر ساحل سے ٹکرا کے کہتی رہے گی
"یہ دم بھر کو آکر یہاں مل گئے ہیں"
یہ وحشی، یہ آزاد دنیا
سنہری رات روشن ستاروں کا سونا اُگلتی رہے گی
سدا چاند کی ناؤ چلتی رہے گی
اور رقصاں رہے گی امر جگنوؤں کی برات
کہ ہم تم یہاں پر ملے ہیں

جان پہچان

صدیق کلیم

دکھ سہنے والوں سے کون ملے گا ؟
کون کہے گا ؟ کیسے ہو ؟
ہر جانب ۔ خوشبوؤں کا سیلاب
سانسوں کی نرم ہوائیں
تیز تنفس
اپنا سندر سپنا مخمل کا اک جنگل ہے
اپنا حاصل لیکن
کالی راتوں کا اک زہریلا جام
زیست کا پیکر ہر دم اک ہنگام
ہر جانب ہے اک ہیجان !
کس کو کس کی ہے پہچان ؟

صدیق کلیم

○

اپنے پیاروں پر جو گزری، آنا جانا بھول گئے
ایسا ایسا کھیل رچا تھا، کھیل تماشا بھول گئے

پیاری مدھ ماتی صورت والے سندر سپنا بھول گئے
کیسا میٹھا زہر پیا ہے؟ زہر پلانا بھول گئے

مخمل ایسے تن پر ہُن جب برسا من مندر ٹھہرا ہے
مست مدھر اندھیارے جاگے، ہم دیا جلانا بھول گئے

کون کہے گا؟ کون کسی کا! کس کا ہاتھ اور کس کا دامن
ہاتھوں ہاتھ چکا سودا، بے کار فسانہ بھول گئے

بلبل چہکے، کوئل کوکے، سمے سمے یاد ستائے!
کیوں آدھی رات کو رونے والے جوت جگانا بھول گئے

○

ہم پہ اس بار جو گزری ہے وہ ہم جانتے ہیں
بکھرے پتّوں کی کھنک ہی کو ارم جانتے ہیں

روح میں اُتری ہوئی آگ کی وحشی تلخی
ہم تو اس وعدۂ فردا کا بھرم جانتے ہیں

دِیے بجھتے بھی رہے بجھ کے جھلکتے بھی رہے
یہ بھی اپنا ہی کرم اہلِ ستم جانتے ہیں

وہ بھی ان کیلیے دنیا بھی اُن کی خاطر
لوگ بت خانے کو صدیوں سے حرم جانتے ہیں

کون پھر آئے گا دروازے پہ دستک دے گا
ایسی مشکل ہے کہ سب اہلِ قلم جانتے ہیں

ایک گوشہ

مہندر ناتھ

کے بارے میں

ورق ورق کھو گئی زندگی میری

کرشن چندر

چند دن پہلے میں نے خواب دیکھا کہ مہندر جی شب خوابی کا لباس پہنے اپنے بستر پر اکڑوں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں - ایک فل سکیپ کاغذ ان کے گھٹنوں پر پھیلا ہوا تھا - میں نے قریب جا کر ان سے پوچھا - مہندر جی کیا لکھ رہے ہیں ؟ ــــــ اکدم بھڑک کر بولے دیکھئے نا بھائی صاحب لوگ سمجھتے ہیں چونکہ میں مر چکا ہوں - اس لئے اب میں لکھنے سے بھی قاصر ہوں - حالانکہ دیکھئے اب بھی میں برابر لکھ رہا ہوں -

میں نے جھک کر ان کے گھٹنوں پر پھیلے ہوئے کاغذ کو دیکھا - دائیں بائیں دونوں طرف وہ کاغذ ان کی تحریر سے پُر تھا اور کاغذ کے عین مرکز میں ان کی تحریر کا عنوان تھا میں نے اور جھک کر اس عنوان کو پڑھا -

"ورق ورق کھو گئی زندگی میری"

یکایک میری آنکھ کھل گئی - دل کی کیا حالت ہوئی بتا نہیں سکتا - جب طبیعت اعتدال پر آئی - تو اٹھا - باتھ روم میں جا کر آنکھیں دھوئیں - پھر ایک نوٹ بک پر اس عنوان کو لکھ لیا - سوچا - اس سفرنامے کا یہی عنوان ہوگا - اس سفرنامے کے چند باب یہاں پیش کئے جا رہے ہیں -

---

جب فلمز ڈویژن نے یہ طے کیا کہ کرشن چندر کے ادب اور زندگی پر بیس منٹ کی ایک دستاویزی فلم تیار کی جائے۔ تو انہوں نے مہندر جی کو بلوا کے یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ کچھ دن بمبئی میں شوٹنگ ہوتی رہی۔ پھر پونا اس مقصد کے لئے گئے۔ پھر پونا سے لوٹنے پر کشمیر جانے کا پروگرام بنا۔ جہاں ہم دونوں بھائیوں کے بچپن اور جوانی کی گم شدہ تصویریں تھیں۔

فلمز ڈویژن کا دیا ہوا ہزار روپیہ خرچ ہو چکا تھا۔ کشمیر جانے کے لئے ایک معقول رقم کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے اس دستاویزی فلم پر ایک بینک نے مہندر جی کو پچاس ہزار روپے قرض دیئے۔ کشمیر کا پروگرام بننے لگا۔ کون کون لوگ جائیں گے مہندر جی بولے۔ "آپ ہوں گے اور سلمیٰ بھابھی۔ میں اور درگا۔ کپور صاحب اور پونم۔ جس کمپنی سے فلم کیمرہ کرائے پر لیا جائے گا اس کا کیمرہ مین اور ایک اسسٹنٹ اور ہاں رام چند۔ ڈائریکٹر آف فوٹوگرافی بھی ہو گا۔ اور جس بلڈنگ کے مالک کے فلیٹ میں وہ رہتا ہے۔ اس کی بیٹی اپنی بھی چلنے کو کہہ رہی تھی اور درگا کا دل ستیش اور نوتن کے بغیر نہ لگے گا۔ اس لئے ان دونوں کو بھی لے جانا پڑے گا۔ اور ہاں اپنے دوست مدھوسودن کا تو نام ہی بھول گیا۔ جو یہ فلم ڈائریکٹ کر رہا ہے۔ پریتم بیلی چلنے کو کہہ رہا ہے اس کی بیوی بھی جائے گی اور........"

میں نے انہیں ہاتھ سے روک کر کہا "بس بس۔ پندرہ آدمی تو یہی ہو گئے۔ کس کی بارات لے جا رہے ہو؟"

مہندر جی مسکرا کر بولے۔ "ابھی فہرست مکمل کہاں ہوئی ہے؟ بہن سرلا کو لکھ دیا ہے اور اس کے دونوں لڑکے دینو اور منا بھی۔ یونی جی بھی چلیں گے۔ بھائی آدم کو لکھ دیا ہے۔ اس کی بیوی کملا بھی چلے گی اور اس کا بیٹا ہلکی اور بچی انیلا اور......"

میں نے تعجب سے ان پر اک نگاہ ڈالی۔ کہا "اتنے لوگوں کو پہاڑ پر لے جانا؟ کوئی لکھ پتی ہی کر سکتا ہے!"

مہندر جی نے بینک کا چیک میرے سامنے پھرا کر کہا۔ "آدھا لکھ پتی تو ہو چکا ہوں۔" — وہ مسکرا رہے تھے۔

"سب چٹنی ہو جائے گا۔ کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ روپیہ کہاں گیا۔ میری سنو تو صرف چھ آدمی لے جاؤ۔ تم چلو۔ میں چلتا ہوں ڈائریکٹر چلے گا اور کیمرہ مین۔ دو آدمی اور ساتھ لے لو۔ کل ملا کے چھ آدمیوں کا یونٹ ہو گا بیس پچیس ہزار میں سب معاملہ نپٹ جائے گا۔ باقی رقم آپ اپنے لیے بچا سکتے ہیں۔ تیس ہزار کی رقم کم نہیں ہوتی۔"

مجھے سنجیدہ دیکھ کر مہندر جی کے چہرے پر اداسی کی لہر دوڑ گئی بولے۔ "بھائی صاحب۔ مجھے روپیہ بچا کر کیا کرنا ہے۔ بال بچے میرے نہیں۔ رہی درگا۔ اس کا کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ کیا کروں گا روپے جمع کر کے۔ جی چاہتا ہے اس موقع پر سارا خاندان چلے۔ سارے دوست چلیں۔ اور آپ کاٹ چھانٹ کر رہے ہیں۔ رہنے دیجئے۔ مجھے میری خوشی پوری کرنے دیجیے۔"

پھر میں کچھ نہ بولا۔ کشمیر جانے کی تیاریاں زوروں سے ہونے لگیں۔ پھر بھی کچھ دوست رہ گئے۔ پریتم بیلی اور اس کی بیوی، رام مہندر کو عین وقت پر کسی دوسری شوٹنگ پر جانا پڑ گیا۔ ریوتی جی روس چلے گئے۔ ممتا اور ونو بھی تیار نہیں ہوئے۔ پھر بھی جموں ریلوے اسٹیشن پر جب ہمارا قافلہ اترا تو بائیس آدمی تھے۔ مجھے معلوم تھا۔ بائیس آدمیوں میں پچاس ہزار کی رقم کم پڑے گی۔ اس لئے کچھ رقم میں اپنی جیب میں ڈال کر لے آیا تھا۔ مہندر جی کو میں نے نہیں بتایا۔ روپے پیسے کے معاملے میں وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔

اسٹیشن پر ہمارے محترم غلام رسول رینزو ڈائریکٹر آف انڈسٹریز مع اپنے رفقائے کار لینے کے لئے آئے تھے۔ حکومت کی جانب سے انہوں ہی نے سب انتظام کر رکھا تھا۔ جموں ہوٹل میں آٹھ کمرے بک تھے۔ باقی لوگوں کے رہنے کے لئے سرکٹ ہاؤس میں انتظام کیا گیا تھا۔ مہندر جی کے بچپن کے دوست گوری دت رینہ اور ان کے بڑے بھائی بھی آئے تھے۔ اس رات جموں ہوٹل کے بار اور اس کے ڈائننگ ہال میں بڑی گہما گہمی تھی۔ مہندر جی سب کی خاطر و تواضع میں مشغول چہکتے پھر رہے تھے۔ ان کی وہ موہنی مسکراہٹ سب کے لئے تھی اور سب کو خوش دیکھ کر وہ خود بھی خوش تھے۔

جموں میں ایک دن شوٹنگ کی۔ (بعد میں جموں کے سارے مناظر کاٹنے پڑے کیونکہ فلم بہت لمبی ہو گئی تھی) دوسرے دن جموں سے پونچھ کے لئے روانہ ہو گئے۔

انفارمیشن کے مہتمم پوری صاحب نے ایک اسٹیشن ویگن کا انتظام کیا۔ اپنے محکمے کی طرف سے۔ ایک موٹر اور ایک جیپ ویگن، رینزو صاحب نے اپنے محکمے سے عنایت کی اور حکومت کشمیر نے اس قافلہ کے دورۂ کشمیر کے لئے ایک انفارمیشن آفیسر سردار نریندر سنگھ کو ہماری دیکھ بھال کے لئے مامور کیا۔ یوں تو ساتھ چلنے کا وعدہ رینزو بھائی نے بھی کیا تھا اور وزیر مالیات گردھاری لال ڈوگرا نے بھی۔ مگر عین وقت پر سرکاری کاموں میں الجھ کر رہ گئے۔

ہمارا قافلہ جب جموں سے پونچھ کی جانب چلا تو کچھ دیر دریائے چناب کی نہر نے ہمارا ساتھ دیا۔ راستے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں خیمے دکھائی دیئے۔ ان میں چھمب کے علاقے کے وہ ریفوجی رہتے تھے۔ جن کے گھر بار ہندوستان اور پاکستان کی پچھلی لڑائیوں نے تباہ کر دیئے تھے۔ یہاں سے سرحد بہت قریب تھی۔ مگر ریفوجیوں کے بچے آس پاس کی نفرت سے بے خبر دھوپ میں چلاتے ہوئے ریت میں کھیل رہے تھے۔ عورتیں قمیص شلوار پہنے نہر سے پانی کے گھڑے بھر رہی تھیں۔ شہتوت کے پیڑ کے نیچے ایک بڈھا حقہ پی رہا تھا۔ اس کے قریب اس سے منہ موڑ کر ایک نو بیاہتا جوڑا ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے مہندر کی طرف دیکھا۔ کچھ کہا نہیں۔ چلتے چلتے اتنا بتا دوں کہ میرے اور اس کے درمیان بہت کم بات ہوتی تھی۔ گفتگو تو دراصل ٹاٹ کی دیوار ہے جس کے پار دونوں فریق ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے ہیں مگر میرے اور مہندر کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی۔ اس لئے کوئی گفتگو نہ تھی۔ بس ہوں، ہاں، چند جملے پھر ایسی خاموشی۔ جس کی قوت اظہار گویائی سے بڑھ کر ہوتی تھی۔ اس سے جو بھی گفتگو تھی۔ ایک طرح کی خود کلامی تھی۔ اور اب کہ جب وہ اس جہاں میں نہیں ہے۔ میں گھنٹوں اس سے باتیں کیا کرتا ہوں۔ اپنے آپ سے بات کرنا کیا مشکل ہے۔ میں نے مہندر سے پوچھا: کچھ یاد آ رہا ہے؟

"سیالکوٹ"

سیالکوٹ یعنی سیالوں کی بستی۔ سیال ہندو بھی ہوتے ہیں اور مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں سیال قبیلہ اس علاقے کا مشہور قبیلہ تھا۔ سیال عورتیں اپنی خوب صورتی اور زنانہ کشش کے لئے مشہور تھیں۔ اور مرد اپنی وجاہت کے لئے پھر وہ سب تاریخ میں گھل گیا۔ لاہور میں ہمارا ایک سیال دوست رہتا تھا۔ برج موہن سیال وہ ہمارے کالج کی ایک لڑکی دلیپ کور پر عاشق تھا اور فلائنگ کلب میں شامل ہو کے روز اس کے گھر کے اوپر اپنا ہوائی جہاز دوڑایا کرتا تھا۔ ایک روز اپنے ہوائی جہاز میں اڑان کے کرتب دکھلاتے دکھلاتے اپنی محبوبہ کے گھر کے سامنے ڈائیو کرتے کرتے گر گیا اور ہوائی جہاز سمیت جل گیا۔

"جل رہا ہے!" مہندر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے کہا ہاں عشق کی آگ کبھی بجھتی نہیں۔ اس سیال کی چتا آج بھی جل رہی ہے۔ مگر کیا بات ہے۔ مہندر جی۔ آج کل کسی کو کسی سے عشق نہیں ہوتا۔ بس ایفر (AFFIAR) ہوتے ہیں۔"

"سب ٹیلیفون کا قصور ہے۔" سلمیٰ نے اچانک کہا۔

میں نے اور مہندر نے چونک کر سلمیٰ کی طرف دیکھا۔

"ہاں سلمیٰ نے دہرایا۔" سب ٹیلیفون کا قصور ہے۔ آج کل محبت ٹیلی فون سے شروع ہوتی ہے۔ ٹیلی فون پر کاٹ دی جاتی ہے۔ لطیف جذبہ کہاں سے آسکتا ہے۔"

مہندر جی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ پھر چپ ہو گئے۔ مگر نگاہیں اس طرف تھیں جدھر سیالکوٹ تھا۔ ڈاکٹر اقبال کا وطن۔ ایک دفعہ ہم دونوں بھائی اپنے باؤجی کے ساتھ سیالکوٹ گئے تھے۔ (ہم اپنے پتاجی کو باؤجی کہا کرتے تھے) ہم دونوں بہت چھوٹے تھے اور ڈاکٹر اقبال کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ سیالکوٹ کے قریب قصبہ گھرنل میں اپنے قرابت داروں میں ایک شادی تھی۔ شادی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مگر جس دن ہم وہاں پہنچے۔ رات گذرنے کے بعد صبح ہوئی تو میں نے باؤجی کو چپکے چپکے اپنے بستر کے کنارے روتے دیکھ لیا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ کیا بات ہوئی۔ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مہندر سے بات کی اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ بہت سال گزر گئے۔ وہ آنسو معمہ ہی رہے۔ پھر ایک دن جب مہندر کی محبوبہ کی شادی اچانک قرار پائی۔ تو مہندر نے بڑے دل گداز لہجے میں مجھ سے کہا۔ "آج سمجھ میں آیا باؤجی کیوں رو رہے تھے۔" پھر آہ بھر کر بولے انسان کو سمجھنا آسان ہے۔ بھائی صاحب آنسوؤں کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔"

ہمارا قافلہ اب جموں کے مضافات سے دور نیلی سڑک پر بھاگ رہا تھا۔ دو رویہ ریتیلے میدان تھے۔ یا ہرے کھیت یا جلی پہاڑیاں۔ جن میں کانٹے دار جھاڑیوں کے سوا کچھ اگتا نہ تھا۔ ہمارے قافلے کے سب لوگ تین گاڑیوں میں سمانہ سکتے تھے۔ اس لئے نو آدمیوں کو صبح کی بس میں پونچھ کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ گرمی دم بدم بڑھتی جارہی تھی۔ جموں سے راجوری لب دریا پہونچے تو وطن کے پہاڑوں سے ٹھنڈی ہوائیں آنے لگیں اور جھاگ اڑاتی ہوئی نیلی لہریں خوش آمدید کے پیام دینے لگیں۔

ڈاک بنگلے میں کھانے کا انتظام تھا۔ اتفاق سے وہ بس جس میں باقی کے نو ساتھی سوار تھے۔ یہیں راجوری کے بازار میں

مسافروں کے کھانے کے لئے رک گئی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے ایک اسٹیشن ویگن بازار بھیج کر باقی ساتھیوں کو بھی یہاں کھانے کے لئے بلوا لیا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا۔ ڈاک بنگلے والوں نے ہمارے لئے چار کمرے کھول دیئے تھے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جو باہر نکلا تو مہندر جی کو چپ چاپ نچلی منزل کے برآمدے کے فرش پر بیٹھا ہوا پایا۔ میں بھی ان کے قریب جا کے بیٹھ گیا۔ انہوں نے قریب میں بچھی ہوئی بجری کی چند کنکریاں اٹھا رکھی تھیں اور انھیں ایک ایک کر کے چھوٹے بڑے وقفوں کے بعد لان کی گھاس پر پھینک رہے تھے۔ چھوٹا وقفہ۔ چھوٹی یاد۔ بڑا وقفہ۔ بڑی یاد۔ لمحہ جو بجلی کی طرح کوند جائے یا وہ لمحہ جو ماہ و سال کی کوئی خوب صورت تصویر بن کر دل کے دریچے میں اتر جائے۔

میں نے مسکرا کر کہا "مہندر جی! یہ کس شیطان کو کنکریاں مار رہے ہو؟" وہ بولے "دل کے شیطان کو بھائی صاحب۔ مچلا جاتا ہے اور مجھے لاہور لئے جا رہا ہے۔ یاد ہے ہم لوگ رات کی گاڑی سے لاہور نکلتے تھے اور صبح راولپنڈی پہنچ جاتے تھے۔ پھر صبح کا ناشتہ راجہ بازار میں روپ سنگھ کے ڈھابے پر کرتے تھے اور پھر ——؟"

"اور پھر" میں نے کہا "کوہ نور بس سروس کی کسی لاری پر سوار ہو کر راولپنڈی سے مری۔ مری سے کوہالے۔ کوہالے سے اُڑی اور اُڑی سے براستہ علی آباد پونچھ پہنچ جاتے تھے۔ وہ راستہ کتنا خوب صورت تھا۔

پھر میں نے کہا "اب تک تو یہ راستہ پھیکا اور بد رنگ رہا گرمی سے جھلس گئے۔ جموں پونچھ روڈ پر سفر کرنے کا ہمارا یہ پہلا موقع ہے۔"

مہندر جی مسکرا کر بولے "یہی سوچ کر میں نے اس سڑک کو صاف کر دیا کہ اس راستے پر ہماری کوئی یاد نہیں۔ اور یادیں ہی تو ہیں جو ہر سفر میں رنگ بھرتی ہیں۔ میں اس کے لئے اجنبی۔ یہ میرے لئے اجنبی۔ لیکن اس اجنبی کے لیے اجنبی نہیں جس نے چند میل پہلے ایک چھوٹے سے نخلستان میں تپتے ہوئے سفر سے گزر کر گاڑی روک کر چودہ سال کی نوخیز کلی سے پانی کے لیے پوچھا تھا اور ہم وہ سب لوگوں کو ایک ڈھلوان سے ایک پرانی باؤلی پر لے گئی تھی۔" مہندر نے ایک کنکری پھینک کر کہا "اس کی آنکھیں گہری سبز تھیں۔"

"اور اب وہ کبھی بڑی نہ ہو سکے گی۔ ہمیشہ چودہ سال کی رہے گی۔ اور دوسری بار جب ہم اس سڑک سے گزریں گے اور اس نخلستان کی باؤلی کا پانی پئیں گے۔ تو شاید وہ وہاں نہ ہو گی لیکن اس دوسرے سفر پر اس کی سبز آنکھوں کا افسوں دیر تک جادو جگاتا رہے گا۔" میں یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

مہندر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "مگر یہ تو سچ ہے کہ سڑکیں بھی پالتو جانوروں کی طرح ہوتی ہیں۔ دھیرے دھیرے مانوس ہوتی ہیں۔ پالتو جانوروں کی طرح کبھی کبھی کھو بھی جاتی ہیں۔ جیسے وہ سڑک ہم سے کھو گئی ...... ہماری بچپن سے جوانی تک کی سڑک۔"

اس کے بدلے میں یہ نئی سڑک ہمیں مل گئی۔ ٹھیک ہے ہمارے لئے یہ اجنبی ہے لیکن اس سڑک کی انسیت ان لوگوں سے پوچھو۔ جو بار بار اس سے گزرے ہیں۔ اس پر چلے ہیں۔ راستے کے ندی نالے جنھوں نے پیدل پار کئے ہیں ان کے لئے کسی

ندی کے ہاتھوں میں جل پری تھی۔ کسی کچے کوٹھے کے آنگن میں کوئی شمع فروزاں تھی.......“

مہندر ہنس کر بولے ”ارے بھائی صاحب آپ کی شاعری...... بس اب اٹھئے۔ چلنے کی تیاری کریں۔ شام ڈھلتے پونچھ پہونچ جانا چاہیئے۔

سندر بنی کا ذکر ہی بھولتا جا رہا ہوں۔ اونچے اونچے پہاڑ سے لدے ہوئے پہاڑوں کے خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے جب سندر بنی راستے میں آئی تو پہاڑ یک لخت پیچھے ہٹ گئے۔ اور ایک خوبصورت دور دور تک پھیلی ہوئی وادی نظر آئی۔ میلوں تک کھیت تھے اور جنگل پیچھے ہٹ گئے تھے۔ کسی زمانے میں یہ سب کھیت جنگل ہوں گے اسی مناسبت سے لوگوں نے اس کا نام سندر بن رکھ دیا ہو گا۔ جو اب بگڑ کر سندر بنی ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ اسے سنٹر بنی بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ سندر بن۔ ایک سندر بن بنگال میں بھی ہے۔ وہاں تو ابھی گھنے جنگل موجود ہیں۔ مگر یہاں کاٹ ڈالے گئے ہیں۔ اور اب وہ کھیتوں سے دور دور بچے کھچے کھڑے انسان کی اس بربریت کے گواہ ہیں جو اس نے جنگلوں اور اس کے باسیوں پر روا رکھی ہے۔

مہندر نے کہا ”دیکھئے سلمیٰ جی یہاں کے درخت کیسے شکست خوردہ نظر آتے ہیں۔ ڈرے ڈرے سے مظلوم اور مجبور نظر آتے ہیں۔ جیسے گیر کے جنگلوں کے شیر۔ مگر ابھی پیچھے جو گھنا جنگل ہم چھوڑ کر آئے وہاں ان درختوں کا مزاج ہی کچھ اور تھا۔ کتنے خوددار اور آزاد نظر آ رہے تھے۔ اپنے آپ میں مگن، مغرور، سر بفلک بلند اور مضبوط، وہاں انھیں اپنی اہمیت کا احساس تھا اور یہاں اپنی ہزیمت کا......“

سرلا بولیں ”ہائے انسان نے جنگلوں کو تباہ کر کے بڑا پاپ کیا ہے۔ جہاں جہاں سے جنگل کٹتے جا رہے ہیں بارش کم ہوتی جا رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ گھنے بھرے پُرے جنگل میں چرواہے کی بنسی کی تان کا جو مزا ہے۔ وہ میدانوں میں نہیں۔“

”آپ کو تو ہمیشہ بنسی کی تان کی پڑی رہتی ہے۔ کہیں کوئی چرواہی نظر نہیں آئی کیا؟“ سلمیٰ نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر مہندر سے مخاطب ہو کے بولی ”مہندر جی راستے میں کہیں کوئی چرواہی نظر آ جائے تو گاڑی رکوا لیجئے گا۔ کرشن جی کے ساتھ اس کی ایک تصویر لے لیں گے۔ سب ہنسنے لگے۔

اب پہاڑ بلند ہوتے جا رہے تھے اور چٹانوں کے ٹیرس نما کھیت نمودار ہو رہے تھے کس طرح تین چار ہزار فیٹ نیچے کے پانیوں کو چھوٹی چھوٹی کولیں کھود کر اوپر لایا گیا تھا بجلی یا ڈیزل کی طاقت کے بغیر۔ اس سے یہاں کے ان پڑھ کسانوں کی محنت اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ کھیتوں کے کنارے کنارے پھل دار پیڑ بھی نظر آنے لگے تھے۔ خوبانی، ہاڑی۔ سیب اور چیری کے بوٹے کہیں کہیں کیلوں کے جھنڈ۔ یہاں کے کیلے دیکھنے میں زعفرانی رنگ کے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے۔ مگر مزے میں لیس دار ہوتے ہیں۔ وہ ذائقہ نہیں جو ہری چھال کے کیلے میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر پیڑ خوبانیوں اور ہاڑیوں کے ہیں۔ بہت اونچائی پر

ہمیں ایک لڑکا خوبانیاں بیچتا ہوا ملا۔ سر پر گول ٹوپی۔ گلاب سے رخسار اور ٹوکری اشرفیوں کی طرح چمکنے والی سنہری خوبانیوں سے بھری ہوئی سلمیٰ نے جب قیمت پوچھی تو حیرت سے چیخ کر رہ گئی۔

"ایک روپیہ؟ — ارے اس خوبانیوں سے بھری ٹوکری کے لئے صرف ایک روپیہ۔

مہندر جی نے اس بچے کو جب دو روپے دیئے تو پہلے تو وہ حیرت سے دو روپوں کو دیکھتا رہا۔ پھر مارے خوشی کے ٹوکری سمیت خوبانیوں کو چھوڑ کر اوپر بھاگ گیا۔ جہاں قریب دو سو فیٹ کی اونچائی پر ہم اس کا خوبانیوں کے پیڑوں میں گھرا ہوا گھر دیکھ سکتے تھے۔

سرلا مہندر جی سے بولی — دیکھو بھاپا جی — ہم لوگ اڑتیس برس کے بعد یہاں آئے ہیں۔ مگر خوبانیوں کی قیمت نہیں بدلی۔ یہ لڑکا دو روپے پا کر کتنا خوش ہوا۔ شاید اُسے یقین نہ آیا ہوگا۔ سوچتا ہوگا کہیں ہم اس سے دو روپے نہ چھین لیں یا اپنا ارادہ نہ بدل لیں۔

مہندر جی کہنے لگے۔ یہاں دو روپے کی ٹوکری اور بمبئی میں یہی پھل چار روپے کیلو ملتا ہے۔

ایک موڑ پر شادی کا دولہا نئے کپڑے پہنے عورتوں میں گھرا نظر آیا۔ پنجابی شلوار اور قمیض کا فیشن جواب تک سارے راستے میں عورتوں میں نظر آتا رہا۔ یہاں آ کر یکایک مغلئی شلوار اور گھیرے دار قمیض میں بدل گیا۔ سر پر پاکستانی ٹوپی۔ عورتیں پہاڑی گیت گا رہی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں دولہا سے مذاق کر رہی تھیں۔ چند لمحوں میں یہ منظر بھی تحلیل ہو گیا۔ کیونکہ ہم نے گاڑی روکی نہیں تھی۔ اس کی رفتار بہت دھیمی کر دی تھی۔ ایسا لگا جیسے ماضی کا ایک پیارا لمحہ چند پل کے لئے آنکھوں میں چمک گیا اور پھر اسی ماضی کے دھندلکے میں کھو گیا۔

"لگتا ہے فلمی گیت ابھی یہاں تک نہیں پہنچے"۔ مہندر نے طنزاً کہا اور گاڑی موڑ سے گزر گئی۔

اب ہماری سڑک اور اونچائی پر جا رہی تھی۔ اور پہاڑ ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے جا رہے تھے۔ جیسے گھیرا باندھ کر ہمارے گرد ایستادہ ہوں۔ ہوا میں برف اور چیڑھ کی مہک تھی۔ اور جب ہوا سرسراتی تو چیڑھ کے جھومروں کی پائلیں اُفق تا اُفق رقص کناں ہو جاتی۔ اس پہاڑ کی چوٹی کے قریب ایک جھرنا نظر آیا جس کے پانی کو ایک باؤلی میں باندھ کر لوہے کے ایک بڑے نل سے گزار دیا تھا۔ اور اب یہ پانی اس نل سے ایک موٹی دھار بن کر آ رہا تھا۔ کئی فوجی گاڑیاں یہاں کھڑی پانی لے رہی تھیں۔ ہم نے بھی یہاں گاڑی روکی۔ خوبانیاں دھو کر کھائیں۔ پانی کیا تھا پگھلی ہوئی برف تھی۔ ٹھنڈا مصفا اور شیریں۔ چاروں طرف کوئی آبادی نہ تھی۔ کوئی گھر نہ تھا۔ بس چیڑھ کے درختوں کے مزین جنگل اور ان کے اوپر سورج چمکتا ہوا مگر اتنی بلندی پر اس کی چمک میں کوئی حدت نہ تھی۔

آگے بڑھے تو قریب ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد بھمبر گلی نظر آئی۔ بھمبر کا درہ۔ اس درے سے تین راستے پھوٹتے ہیں ایک راستہ پونچھ کو جاتا ہے۔ جو ہماری منزل تھی۔ دوسرا راستہ تتا پانی کو جاتا ہے۔ تیسرا راستہ مہنڈر کی جانب مڑ جاتا ہے۔

"گاڑی روکو"۔ مہندر نے کہا۔

مہندرا ور میں دیر سے سے گاڑی سے نکل کر ذرے پر کھڑے ہو گئے۔ ایک دوسرے کے بہت قریب بہت ہی تنہا یادوں کا ایک ہجوم تھا۔ جو غول بیابانی کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو تتا پانی گئے تھے۔ اپنی ماں جی کے ساتھ۔ تتا پانی میں کچھ نہیں تھا۔ ایک دھرم شالہ تھی۔ ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ اور گرم پانی کا ایک نالہ تھا جو چند سو گز کے فاصلے پر پونچھ کے دریا سے مل جاتا تھا۔ چاروں طرف سے آپ و گیاہ مغرور پہاڑ کھڑے تھے۔ کسی آتش فشاں سلسلے کی مانند۔ سرلا ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی، ہم دونوں ہی بھائی تھے جو سخت سردی کے موسم میں دن بھر اس گرم پانی کے نالے میں نہاتے رہتے تھے۔ اس نالے کے کنارے کنارے پگھل گندھک کا بودار مراد زرد بالائی کی جھالروں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں اس نالے کی چھوٹی چھوٹی ڈابوں میں پانی کی اندرونی حدت سے اس قدر ابلتا تھا کہ ہم لوگ جب کپڑے کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں میں بیسے چاول باندھ کر ڈال دیتے تو چند منٹ میں وہ چاول پک جاتے تھے۔ کئی طرح کے درجۂ حرارت رکھنے والے چشمے تھے۔ گرم۔ معتدل گرم، شدید گرم۔ ابلتا ہوا پانی کہ ہاتھ ڈالو تو آبلا پڑ جائے۔ اور چند سو گز کے فاصلے پر دریائے پونچھ کا پانی برف کی طرح سرد تھا۔ ہمیں بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ ماں جی ہمیں یہاں لے کے آتی تھیں کھانے پینے اور دیگر رسد کا سامان ہم پونچھ سے لے کے آتے تھے۔ باؤجی ساتھ نہیں آتے تھے۔ انھیں سفر کی صعوبتیں زیادہ راس نہیں آتی تھیں۔ پنجاب بھی وہ ماں جی کی طرح ہر سال ہمارے ساتھ نہیں جاتے تھے۔ پانچ سات سال کے بعد جاتے تھے۔

دوسرا راستہ مہنڈر کو جاتا تھا۔ اور جب اس ذرے پر کھڑے ہو کر ہماری نگاہ تتا پانی سے مہنڈر کی طرف مڑی تو بے اختیار میں نے اور مہندر نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے اور ہر لحظہ یہ گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ کہیں یادوں کے اس سیلے میں ہم کھو نہ جائیں پھر نہ جانے کس وقت گاڑی سے نکل کر سرلا بھی ہمارے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ کیونکہ سرلا مہنڈر ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ یہیں پر اس کا بچپن گزرا تھا۔ باؤجی ڈاکٹر تھے۔ مہنڈر کے مقام پر دو مرتبہ ان کا تقرر ہوا۔ ایک بار جب ہم بچے تھے دوسری بار جب ہم جوان تھے۔

اس مہنڈر کی وادی میں مہندر کا پہلا عشق ہوا۔ مہنڈر اور مہندر میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ لگتا تھا سامنے سے پہاڑ پھٹ گئے ہیں۔ اور وہ نم آنکھوں سے اس وادی کو دیکھ رہا ہے۔ سیب کے اس باغ کو جہاں وہ حسین و جمیل ونتی کے ساتھ ٹہلا کرتا تھا۔ کھیلا کرتا تھا۔ ونتی جسے میں بھی دل ہی دل میں چاہتا تھا مگر میں نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ پہلی بار ایک ہی لڑکی سے ہم دونوں نے پیار کیا۔ ونتی کا نام میں نے نہیں بدلا۔ اس کا نام ونتی ہی تھا اور میرے پہلے ناول "شکست" کی جو ونتی ہے یہ وہی ونتی ہے چمپئی رنگت، گدرایا ہوا بدن، کمر اور کولہوں کی زیبائی دلکش، ہنستی تھی تو فضا میں سیب کے پھول کھل جاتے تھے اور گالوں میں گڑھے پڑتے تھے۔ اس لئے وہ اکثر ہنستی تھی۔ اور بات بے بات پہ ہنس دیتی تھی۔ اس کی شادی پوٹھوہار کے کسی خاندان میں ہوئی تھی۔ مگر مہندر اس کا مائیکہ تھا۔ وہ چند مہینوں کے لئے اپنے مائیکے آئی تھی۔ اور محبت کے جال میں اس طرح الجھ گئی جس طرح چیل کی شاخیں ایک دوسرے سے الجھ جاتی ہیں۔ ونتی تو شکست ہی کی ونتی ہے۔ لیکن "شکست" کا میں — میں نہیں ہوں۔ مہندر ہے۔ شاید زیادہ تر مہندر ہے اور کہیں کہیں میں ہوں۔ کسی عجیب کیمیاوی عمل سے میں نے دونوں کرداروں کو ملا کر ذہن کی کٹھالی میں ایک

نیا مرکب تیار کیا ہے۔ مگر ونتی تو خالص ونتی ہے۔ جیسی وہ تھی، جیسی وہ ہمیشہ رہے گی۔ "شکست" میں اگر مہندر کا کردار ہے۔ تو "یرقان" کے افسانے میں میرا کردار ہے۔ ان دنوں میں واقعی یرقان کے موذی مرض میں گرفتار تھا۔ اور مہینوں بستر پر لیٹا رہا تھا۔ وہ اکثر مجھے دیکھنے آئی تھی اور میرے سرہانے بیلے کے پھول رکھ جاتی تھی۔ کتنے برسوں کے بعد بیلے کے ان پھولوں کی مہکتی صدا میرے کانوں میں آ رہی ہے، چاندی کی گھنٹیاں سی بج رہی ہیں باؤجی کو معلوم تھا کہ ونتی، مہندر سے محبت کرتی ہے، اس لئے جب وہ باغ سے گزرتی تو وہ اس کی جھولی پھولوں سے بھر دیتے تھے۔

پھر وہ دن آیا۔ جب ونتی کو مائیکے سے سسرال جانا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور روز کی طرح اس نے میرے سرہانے بیلے کے پھول رکھ دئیے تھے۔ اور کہا "میں جا رہی ہوں"۔ جانے کیسے اس سمے میں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور مسکرا کر اُسے الوداع کہی۔ ان آنسوؤں سے تکیہ تو بعد میں گیلا ہوا تھا۔ مگر وہ اُس وقت میرے آنسو نہ دیکھ سکی تھی۔ شاید اُس نے وہ آنسو محسوس کر لئے ہوں گے۔ کیونکہ دیر تک اس کا ہاتھ میری گرم پیشانی پہ لرزتا رہا تھا۔ اور مہندر اسے مہنڈر سے نئی پیر کے میدان تک یعنی کم و بیش سات میل کی دوری تک چھوڑنے گیا تھا اور جب واپس آیا تو اُس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اُس رات مجھ سے وہ گلے لپٹ کر رویا بھی تھا اور میں اُس کا کندھا تھپتھپاتا رہا۔ جانے دونوں چاہنے والوں میں کیا عہد و پیمان ہوئے میں نے مہندر سے کبھی نہیں پوچھا۔ شاید ونتی نے دوسرے سال کی چھٹیوں میں بھی آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ نہیں آ سکی اس سے پہلے وہ پونچھ کی کسی ندی میں نہاتے نہاتے ڈوب گئی اور اسی طرح مہندر کی پہلی محبت کا ستارہ بھی ڈوب گیا۔

مہنڈر کی اس وادی میں مہندر نے پہلی بار جوانی میں قدم رکھا۔ اب تک وہ بہت دُبلا پتلا لڑکا تھا جو اکثر بیمار رہتا تھا۔ پھر یکایک اُسے ورزش کی سوجھی اور چند سالوں میں وہ کڑیل تومند جوان بن گیا۔ جس کے بدن کی خوب صورتی کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔
اسی مہنڈر کے ہسپتال میں وہ دق زدہ عورت آئی تھی۔ جس سے باؤجی نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ اور وہ سپیرن جس کا ذکر "یادوں کے چنار" میں ہے اور جس نے باؤجی سے پیار کیا تھا۔ اور وہ گوری چٹی پگلی جو کسی کے قابو میں نہیں آتی تھی۔ باؤجی بڑی محنت سے اُس کا علاج کرتے تھے۔ آٹھ دس دن کے بعد جب وہ ٹھیک ہو جاتی تو اس کے رشتے داروں کو بلوا کر اس کے گاؤں روانہ کر دیتے۔ جہاں سے وہ دو چار دن بعد پھر پاگل ہو کر واپس آجاتی۔ یہ کس طرح کا پاگل پن تھا؟ اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج آتا ہے۔ کس کس کو یاد کیا جائے؟ یادوں کے اودے انگور ہوا میں جھول رہے ہیں اور ہر انگور کا قطرہ ماضی کی نلکی سے چھن کر مے ناب بن گیا ہے۔

سرلا نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا کہ "جی چاہتا ہے۔ یہ سامنے کے پہاڑ پھٹ جائیں اور مہنڈر کی وادی سامنے آجائے۔"
مہندر نے اپنی بھیگی آنکھیں اُلٹے ہاتھ سے پونچھیں۔ پھر میرا ہاتھ چھوڑ کر چپ چاپ گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔
بھمبر گلی سے سورن کوٹ کا راستہ اونچے اونچے پہاڑوں اور چیڑ کے گھنے جنگلات سے ہو کر گزرتا ہے، راستے میں آبادی بھی نہیں۔ کہیں کہیں اکا دکا گھر نظر آتے اور پہاڑ کو کاٹ کے چند کھیت، اور مکمل سناٹا، جیسے فطرت نے سانس روک لیا ہو۔ مجھے اور مہندر کو یہ اکا دکا گھر بہت پسند تھے۔ گرمی کی چھٹیوں میں جب بھی ہم لاہور سے پونچھ آتے کچھ دنوں کے لئے پک نک منانے کے لئے

جنگل کے ان اکیلے باسیوں کے گھروں میں قیام کرنے کے لئے نکل جاتے۔ پہاڑوں، جنگلوں، ندی نالوں چشموں اور آبشاروں سے محبت اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور انسان نے جنگل کے ساتھ کس طرح اپنا تعلق جوڑا تا کہ نہ جنگل کا نقصان ہو نہ اس کا اپنا۔ آج یہ بات ہم بھول چکے ہیں اور فطرت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح اپنی تباہی کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ کیونکہ فطرت کے بغیر اور درخت کے اور پتوں کے بغیر اور کھلی صاف ہوا کے بغیر انسان جی نہیں سکتا۔ آج ٹوکیو ایسے متمدن شہر میں ہوا اتنی گندی ہو چکی ہے کہ جاپانی بچے اسکول جاتے ہوئے لمبی ناک سمیت کا نقاب پہن کر جاتے ہیں۔

مگر اڑتیس برس کے بعد بھی یہاں امن ہے اور چین ہے اور فطرت اپنے پُرسکون انداز میں چاروں طرف پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ ایک پہاڑ کا موڑ کٹتا ہے تو دوسرا پہاڑ سامنے آ جاتا ہے۔ پھر یکایک حیرت انگیز اور چونکا دینے والے انداز میں پہاڑ یکایک پھسل کر ایک خوب صورت وادی کو سامنے لے آتے ہیں۔ یہ سوہرن کوٹ کا مقام ہے۔ نیم دائرے میں پھیلی ہوئی ایک وسیع آبادی۔ پونچھ کا دریا دو تین دھاروں میں بہہ کر ایک جگہ سنگم بناتا ہوا۔ دریا کے کنارے کنارے کمچا لڑل کے کھیت اور ٹیرس نما کھیتوں کی منڈیروں پر پھل دار درختوں کی گھنی قطاریں۔ کچے کوٹھوں کی چھت پر لال مرچوں کے غالیچے اور سانگن میں مائیں اور بہوئیں گھیرے دار مغلئی شلواریں پہنے کام میں مصروف اور پیڑ اتنے شریر کہ بچوں کی طرح دھومیں مچاتے ہوئے دریا کے کنارے تک چلے گئے ہیں۔

سہ پہر ختم ہو رہی تھی۔ درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارے قافلے نے سوہرن کوٹ کے ڈاک بنگلے میں چائے پی۔ یہیں پر افسانہ نگار شبنم سوہرن کوٹی سے ملاقات ہوئی اور محمد دین باندے ایم۔ ایل۔ سی بھی بڑی محبت سے ملے۔

سوہرن کوٹ جس کا اصلی نام کبھی سورن کوٹ (سنہری وادی) رہا ہوگا۔ پونچھ کی سب سے خوبصورت وادی ہے۔ اور پہلگام سے ٹکر لے سکتی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے پہلگام سے بہتر ہے۔ کیونکہ ابھی یہاں سیاحوں کی آمد و رفت نہیں ہے۔ یہ ابھی تک اسی طرح صاف شفاف دھلی دھلائی ان چھوئی فطرت کی بہاریں وادی ہے۔ جیسے آج سے چالیس برس پیشتر تھی۔ کوئی ہوٹل نہیں۔ کوئی ٹورسٹ لاج نہیں۔ سیاحوں کی کوئی کھلواڑ نہیں۔ ٹوٹے ہوئے ڈبے نہیں۔ لالچی نگاہیں نہیں۔ بھیک مانگتے ہوئے فقیر نہیں۔ جیب کاٹنے والے دکاندار نہیں۔ جسم بیچنے والی قحبائیں نہیں۔ فطرت خود دار، آسودہ اور سادہ مزاج ہے۔

چائے پی کر مہندر جی نے کہا "آئیے بھائی صاحب۔ اخروٹ کا وہ پیڑ ڈھونڈیں۔"

زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں سمجھ گیا۔ بہت عرصہ ہوا جب ہم بچے تھے تو سوہرن کوٹ کی خوب صورتی کا حال سُن کر ضد پکڑ لی تھی۔ ہم سوہرن کوٹ جائیں گے، سوہرن کوٹ جائیں گے۔ اس قدر اصرار کیا۔ اتنی ضد کی ایسے چیخ چیخ کر روئے کہ باؤ جی اور ماں جی کو ہمیں پک نک پر سوہرن کوٹ لانا پڑا۔ حالانکہ یہ جگہ پونچھ سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ باؤ جی سفر سے ہمیشہ گھبراتے رہے۔ چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ مگر آخر انھیں ایک دن ہمارے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ ہمیں سوہرن کوٹ لے جانے پر مجبور ہو گئے۔

پو پھٹنے سے پہلے ہم پونچھ سے روانہ ہوئے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے سوہرن کوٹ میں ایک اخروٹ کے گھنے سایہ دار پیڑ کے نیچے کھایا۔ کیا کھایا یہ تو سب یاد نہیں ہے۔ لیکن ماں جی کے ناشتے دان میں کلاڑی کی بھجیا کس قدر لذیذ تھی کہ

زبان پر آج تک اس کا مزہ باقی ہے۔ کلاڑی ایک طرح کی گول روٹی کے مانند موٹی ٹکیا ہوتی ہے۔ جو کاٹیج پنیر کو سکھا جاتی ہے۔ دیہات کے اکثر گھروں میں یہ پنیر کی روٹیاں ایک موٹی رسّی سے گزار کر آنگن یا گھر کے اندر ٹانگ دی جاتی ہیں۔ پکانے کے لئے اُسے پھر سے پانی میں کئی گھنٹے رکھ کر نرم کرنا پڑتا ہے۔ بعد میں اسے یا تو شوربے کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔ یا کی بھجیا کے مانند۔ مگر بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ اس دن تو ہم اسے کھاتے کھاتے مرغی بھی بھول گئے کھانا کھا کے ہم نے ا سے سبز سبز اخروٹ توڑے اور ان کی چھال پتھر سے کوٹ کر علاحدہ کرلی۔ پھر اندر کے بالائی ایسے نرم گودے کو نکال کر کھاتے یہ باؤجی اور ماں جی کی جوانی کا زمانہ تھا۔ باؤجی کی گوری رنگت۔ ماں جی کا گیہواں رنگ۔ باؤجی کی چوڑی پیشانی اور ماں جی کی بڑی بڑی آنکھیں آج بھی یاد ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے تین بچے تھے۔ میں اور مہندر اور مہندر سے چھوٹا بھوشن جو چ ہو کے مر گیا۔ مگر وہ دن کتنا خوبصورت تھا کہ ہم تینوں بھائی دریا کے کنارے کے پتلے پانیوں میں بار بار نہاتے رہے اور ما کے تنکوں کی پن چکی بنا کر پانی میں چلاتی رہیں۔ آج سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ ضرور اس اخروٹ کے درخت کو ڈھونڈا جائے گا ایک تصویر کی طرح ہمارے ذہن میں بند تھا۔

مگر آج وہ درخت نہیں ملا۔ اخروٹ کے پیڑ کی عمر تو لمبی ہوتی ہے۔ ماں باپ نہیں رہے۔ بھوشن نہیں رہا مگر امید تھی کہ وہ اخروٹ کا درخت زندہ ہوگا تو ہم ایک پل دو پل اس کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے ماں باپ کو اپنے بھائی کو اس پک نک کے دن کو واپس لے آئیں گے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے جو جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے۔ صرف ان کی یاد کے چھتے کے مانند ذہن کی ٹہنیوں پر لٹکتی رہ جاتی ہیں۔

ایک بار پھر اسکول کے چند لڑکے پک نک منانے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان دنوں ہم پر کرکٹ کا کھیل سوار آٹھ نو اور لڑکوں کو جمع کر کے کرکٹ کی ایک ٹیم بنا ڈالی تھی۔ اسے ہسپتالی ٹیم کہتے تھے۔ BLIND HITTER اور مہندر تیز باؤلنگ کے لئے مشہور تھا۔ پک نک بھی ہوئی۔ میچ بھی کھیلا گیا۔ دریا کے کنارے گھاس کے ایک خوب صورت قطع میں گاڑی گئیں اور کھیل شروع ہو گیا۔ کھیل کے بعد کھانا اور کھانے کے بعد دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لڑکے بٹ گئے۔ کو پہاڑوں کو نکل گیا۔ کسی نے جنگل کی راہ لی۔ کوئی دریا کے کنارے کنارے اوپر چلنے لگا۔ میں نے اور مہندر نے چلتے کے جھنڈ سے گھرا ہوا ایک خیمہ ڈھونڈ لیا۔ مگر ہمیں اس خیمے کے زیادہ نزدیک جانے کی اجازت نہیں ملی۔ ایک با نے بتایا کہ پونچھ کے اسسٹنٹ ریزیڈنٹ بہادر پک نک کے لئے اپنی دونوں بچیوں کو لے کر آئے ہوئے ہیں، یہ زما کا تھا اور پونچھ کے راجاؤں نے جو دراصل کشمیر سرکار کے ماتحت تھے۔ لڑ جھگڑ کر یہاں ریزیڈنسی کی ایک شاخ کھلوا اس کے ذریعے اس علاقے کے سارے بڑے افیسر پنجاب سے یہاں آتے تھے۔ کشمیر سے نہیں۔

وہ دونوں سفید فام لڑکیاں دریا میں پیڑوں کی اوٹ میں نہا رہی تھیں۔ میں نے اور مہندر نے بید مجنوں کے پیڑ ڈالیوں میں چھپ کر وہ منظر دیکھا۔ وہ دونوں عمر میں ہم سے بڑی تھیں، جوان، حسین۔ سنہرے بالوں والیاں اور سم جل پریاں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ اس سے پہلے ہم نے کسی جوان لڑکی کو اس حد تک ننگا نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے ان

بھونچکے سے رہ گئے تھے۔ اتنی خوب صورت ہوتی ہیں انگریز لڑکیاں۔ ان دنوں ہم پر یہی کیا سب پر گوری رنگت کا رعب طاری تھا اور اس کی فوقیت بھی اور اس کا۔ CATHERSIC اس وقت ہوا جب مہندر نے بمبئی میں آ کر مراٹھی لڑکیوں کا حسن دیکھا اور میں نے کیرالا جا کر وہاں کی سیاہ فام سندریاں دیکھیں۔ یا پھر جمیکا کی حبشی حسینائیں۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ حسن رنگ کا محتاج نہیں ہوتا۔ مگر اس وقت تو ہم مبہوت سے ہو گئے تھے اور بہت دیر تک ان انگریز لڑکیوں کو نہاتے ہوئے دیکھتے رہے تھے۔

ایک بار اور ہم سونبرن کوٹ آئے تھے۔ یہ جوانی کا زمانہ تھا۔ تین چار خاندان مل کر پک نک منانے آتے تھے۔ گیان چند اور دیوان چند دو نوں بھائیوں کے خاندان اور گوربخش سنگھ کا خاندان اور رام لال مینی کا خاندان اور ہم لوگ کچی بکی۔ کھٹی میٹھی جوانیاں تھیں۔ جذبے کنوؤں کے سایوں کی طرح ذہن پر لرزاں تھے۔ نگاہوں میں محبت کی نوخیز کلیاں پھوٹی تھیں اور جھجک، گریز، اضطراب اور اجتناب نے رنگ آنچ اور چبھن کے سامان پیدا کر دیئے تھے۔ آج وہ چبھن باقی نہیں ہے جس طرح شرابیں وقت گذرنے کے بعد پختہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح یادیں ایام کے تہ خانے میں میٹھی ہوتی جاتی ہیں مجھے مہندر اور رملا کا بار بار ایک دوسرے کو چور نگاہوں سے دیکھنا یاد ہے۔ اور ماں جی کی ڈانٹ "اوں ہوں۔ چھوٹے کاکا۔ اُدھر لڑکیوں میں مت کھیلو" ماں جی مجھے بڑا کاکا اور مہندر کو چھوٹا کاکا کہتی تھیں۔ آج ماں جی اس جہاں میں نہیں ہیں مگر میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں "ماں جی کیا مہندر تمہارے پاس ہے؟ کیا وہاں بھی وہ لڑکیوں میں کھیلتا ہے۔ وہ فاسٹ باؤلر!"

شام کے سائے گھنیرے ہو چلے تھے۔ اسی لئے سونبرن کوٹ میں زیادہ دیر رکنا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے پونچھ کی جانب چل پڑے۔ کافی فاصلے تک دریائے پونچھ کی جانب چل پڑے۔ کافی فاصلے تک پونچھ کی خروش روانی ساتھ رہی بیچ میں نگالی صاحب کا نالہ پڑا۔ پھر اکا دکا بجلی کے قمقمے نظر آنے لگے! ہم پونچھ کے مضافات میں تھے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا جب ہم پونچھ کے ڈاک بنگلے میں داخل ہوئے تو ڈپٹی کمشنر غلام نبی نائیک اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دیگر افسر اور عمائدین شہر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ پرانے اور نئے ڈاک بنگلے کے سارے کمرے ہمارے لئے کھول دیئے گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں اوم (میرا سب سے چھوٹا بھائی) اور اس کی بیوی کملا اور کملا کا بھائی پروین کمار مینی اور اس کی بیوی چارو مینی۔ روندر جانی اور تلک راج جانی اور جگن ناتھ مصری اور دوسرے احباب بھی آ گئے۔ ہم لوگ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے اس لئے مے نوشی کا شغل مختصر ہی رہا۔ کھانا کھا کے جلد ہی سو گئے۔

صبح جب میں اٹھا تو مہندر جی مجھ سے پہلے جاگ رہے تھے۔ اور برآمدے میں ڈاک بنگلے کی اس روش پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ چو طرفہ یوکلپٹس کے پیڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ وہی پیڑ تھے جنھوں نے ہمارا بچپن دیکھا تھا۔ ہماری جوانی اور اب اڑتیس سال کے بعد ہم انھیں دیکھ رہے تھے۔ یہ پیڑ کتنے سر بلند اور تناور ہو چکے تھے۔ بچپن میں باؤ جی مجھے انگلی سے لگائے اور مہندر کو کندھے پر بٹھائے یہاں رابرٹ کے ساتھ آتے جو عیسائی لیڈی ڈاکٹر کا شوہر تھا۔ اور خود کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ باؤ جی کو شروع ہی سے عجیب و غریب کردار عام نارمل حالات سے ہٹے ہوئے کردار بہت پسند تھے۔ رابرٹ سے ان کی دوستی تھی اور وہ دونوں اپنے بچوں کو لے کر ہفتے میں ایک بار اس ڈاک بنگلے تک سیر کرنے کے لئے آتے تھے کیونکہ اس ڈاک بنگلے کے باغیچے کے پھول دور دور تک مشہور تھے۔

میں اور مہندر کچھ کہے سنے بغیر سحر کے نیم اُجالے میں پونچھ کے ڈاک بنگلے سے باہر چل دیئے۔ قریب ہی میں ہمارا پلے گراؤنڈ تھا۔ وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول کا پلے گراؤنڈ۔ مگر اب اس کھیل کے میدان کے آدھے حصّے میں کالج تعمیر ہو چکا تھا اور دریا کی جانب اس پلے گراؤنڈ کے کنارے جو پائین کے پیڑ تھے۔ وہ سب کاٹ ڈالے گئے تھے۔ آگے چلے تو سوچا فوارے والا باغ آئے گا۔ جس کے دو رویہ بلند قامت سرو سربلند ہوں گے۔ سرو تو موجود تھے مگر باغ تباہ ہو چکا تھا وہ انار کے پیڑ کہاں تھے۔ اور وہ ناشپاتیوں کے پیڑ، خوبانی، سیب، پلم اور بگوگوشوں کے درخت جن پر ہم پلے گراؤنڈ آتے یا جاتے یلغار کیا کرتے تھے اور باغ کے مالی دور دور تک ہمارے پیچھے بھاگتے تھے۔ مگر وہ چست لڑکوں کے دستے کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔ وہ فوارہ باغ جو نشاط باغ کی نقل میں بنایا گیا تھا۔ اس کا اب کچھ باقی نہ تھا۔ نہ فوارے نہ ٹینس کورٹ، نہ انگور کی چھتی ہوئی بیلیں کچھ تو باقی نہ تھا۔ سُنا ہے کہ جب قبائلی اِدھر حملہ آور ہوئے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تو شہر میں ایندھن کی سخت کمی محسوس ہونے لگی۔ لوگوں نے مجبور ہو کر تمام باغات کے پیڑ کاٹ کر ایندھن کے لئے چولہے میں جھونک دیئے۔ اخروٹوں والی سڑک پر اخروٹ کا ایک پیڑ باقی نہ بچا تھا۔ کون جیتا کون ہارا اس کا فیصلہ تو تاریخ کرے گی۔ لیکن دو طرفہ درختوں کا جس طرح صفایا ہوا اور قتلِ عام ہوا اس کا فیصلہ کون کرے گا؟

اب ہم ڈیوڑھی سے گزر کر قلعہ مبارک کی طرف جا رہے تھے۔ آنکھیں پُرنم تھیں۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے چلے جا رہے تھے۔ قلعہ مبارک سے ذرا پہلے ٹھاکر نین سنگھ کی کوٹھی ہوا کرتی تھی جو پولو کا بہت عمدہ کھلاڑی تھا۔ جانے وہ کوٹھی کہاں گئی۔ قلعے سے ایک فرلانگ کے بعد چھوٹی سی پہاڑی پر وزیر زراعت کا بنگلہ تھا۔ پہاڑی کے نیچے سڑک کے کنارے جس جھرنے کی ہمیں تلاش تھی۔ وہ ہمیں مل گیا۔ حکومتیں بدلیں۔ حالات بدلے۔ تاریخ بدلی مگر یہ جھرنا اسی طرح رواں دواں تھا۔ ماں جی جب راج محل کو رانی جی کے ہاں جاتی تھیں تو اسی جھرنے کا پانی پیا کرتی تھیں اور دربار میں حاضر ہونے سے پہلے باؤجی بھی یہیں رک کر اس جھرنے کا میٹھا پانی پیا کرتے تھے۔ آج ماں جی نہیں۔ باؤجی نہیں ہیں مگر میں اس جھرنے کی دھار میں ان کا شیریں لمس محسوس کر سکتا ہوں۔ جیسے ماں جی میرا منہ چوم رہی ہوں۔ مہندر اوک بڑھائے اس جھرنے کا پانی پی رہا ہے۔ اٹھائیس سال کی پیاس آج بھی ہے۔ شاید کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے چھوٹے کا کا چھوٹے کا کا......!

میں نے مہندر سے کچھ نہیں کہا۔ ایسے لمحوں میں کچھ کہنا ایسے لمحوں کی تقدیس کو تباہ کر دیتا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے چپکے سے واپس ہو لئے۔ پھر وہی قلعہ، وہی ڈیوڑھی۔ وہی پلے گراؤنڈ وہی ڈاک بنگلہ۔ مہندر چپکے سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں۔ آدمی بچپن سے بڑھاپے تک جانے میں ساٹھ برس لیتا ہے۔ ہم نے بڑھاپے سے بچپن تک جانے میں صرف ساٹھ منٹ لئے تھے۔

ناشتے کے بعد بہت سے لوگ ملنے کے لئے آ گئے۔ درشن سنگھ اکالی، خواجہ منیر حسین میر، ڈاکٹر نذیر حسین۔ ڈاکٹر بھٹی۔ سردار بدھی سنگھ، بشیر احمد شیخ، حزاں چند وکیل، تحصیلدار غلام محمد گگڑو، چودھری بدری ناتھ، منموہن سنگھ وھیر، سکھ راج بالی، مہتہ راجہ رام، خواجہ غلام قادر باندے۔ جہانگیر میر، بابو ہری کرشن رینہ اور دوسرے بہت سے نئے پرانے چہرے، اسکول اور کالج بند تھے۔ مگر ہمارے یونٹ کی آمد

کی خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل چکی تھی اور لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ ڈاک بنگلے کے سارے لان ان لوگوں سے بھر چکے تھے۔ گوری ورت رینہ، مہندر جی کا تعارف ان کے پرانے ساتھیوں سے کرا رہا تھا۔ لوگ آنکھوں میں خوشی کے آنسو لئے گلے مل رہے تھے۔ زور زور سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ کمر میں ہاتھ ڈال کر بغل گیر ہو رہے تھے۔ جیسے اٹھتیس برس کی جدائی کو چند لمحوں میں ملیامیٹ کر دینا چاہتے ہوں۔

کچھ دیر کپور صاحب نے ہماری شوٹنگ ڈاک بنگلے میں کی۔ نئے گیسٹ ہاؤس میں نہیں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ بلکہ پرانے ڈاک بنگلے میں جہاں ہم سکول اور کالج کے دنوں میں ٹھاکر موہن سنگھ اور ٹھاکر سکھ چین سنگھ کے ہمراہ پلے گراؤنڈ میں کھیلنے کے بعد آتے تھے۔ یہ دونوں ٹھاکر بچے راجہ صاحب والیٔ ریاست کے قریبی رشتہ دار تھے۔ اس لئے ان کی وجہ سے ہمارے لئے ڈاک بنگلہ کا ایک کمرہ کھول دیا جاتا۔ یہاں ہم قریب کے ڈونگس کے چشمے کا پانی منگواتے اور لیمو کا شربت پیتے یا لیمونیڈ۔ پھر گراموفون کے ریکارڈ بجائے جاتے۔ مہندر کو گانے کا بہت شوق تھا اور وہ بہت اچھا گاتا بھی تھا۔ سہگل کے اکثر ریکارڈ بجائے جاتے اور جانکی بائی الٰہ آباد والی اور کالو قوال، ٹھاکر موہن سنگھ کو فلم لیلیٰ مجنوں کے گانے بے حد پسند تھے۔ جنھیں ماسٹر نثار اور مس کجن نے گایا تھا۔ کبھی کبھی ہم چاروں شاہی اصطبل سے گھوڑے نکلواتے خوب صورت بے صبر گھوڑے۔ میں تو گھوڑے پر چڑھنے سے ہمیشہ ڈرتا تھا۔ مگر ٹھاکر موہن سنگھ، مہندر اور سکھ چین اچھے شہسوار تھے اور اکثر گھوڑے دوڑاتے ہوئے نکالی صاحب کے نالے تک چلے جاتے تھے۔ میں صرف ڈاک بنگلے تک آتا تھا اور یہاں ان کی واپسی کا انتظار کرتا تھا۔

مہندر کو سب کچھ یاد آ رہا تھا کہہ رہا تھا "بھائی صاحب۔ موہن سنگھ کس غضب کا کھلاڑی تھا ٹینس کا۔ فوارے والے باغ میں راجہ صاحب کا ٹینس کورٹ تھا۔ اس میں ٹھاکر موہن سنگھ راجہ صاحب کے ساتھ ٹینس کھیلا کرتا تھا اور ہم لوگ کورٹ کے قریب کرسیوں پر بیٹھے تکا کرتے تھے۔ ہمیں ٹینس کورٹ میں کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کورٹ میں صرف شاہی خاندان کے افراد کھیل سکتے تھے موہن سنگھ بہت عمدہ شکاری بھی تھا۔ اس نے مہندر کو بندوق چلانا سکھایا۔ مہندر جنگل میں اڑتے ہوئے تیتر اور جھیل سے اٹھتی ہوئی مرغابی کو اپنے نشانے سے گرا لیتا تھا۔ جبکہ میرا نشانہ مرغابی یا تیتر سے سو فیٹ دور نکل جاتا تھا۔ اور بندوق کے فائر کے دھچکے سے کندھے میں شدید درد ہوتا تھا۔ مہندر نے ان دنوں کی یاد سے محظوظ ہو کر میری طرف مسکرا کر کہا۔ "آج پھر ٹھاکر موہن سنگھ کے ساتھ شکار پر جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ٹھاکر موہن سنگھ ہے کہاں؟ جنت کی کسی وادی میں فرشتوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہا ہوگا" میں نے مہندر سے کہا۔ اور مہندر کا چہرہ چند لمحوں کے لیے افسردگی کے غبار میں کھو گیا۔

شوٹنگ دیکھنے کے لئے بھیڑ لگ گئی تھی اور ہماری حفاظت کے لئے چند فوجی بھی تعینات کر دیئے گئے تھے مگر یہاں ہیں کس سے ڈر تھا سب اپنے تھے۔ سب سلیقے اور قاعدے سے شوٹنگ دیکھ رہے تھے۔ مدھو سودن اور مہندر ایک دوسرے سے مختلف شاٹ کے متعلق مشورہ کرتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ہر شاٹ میرے۔ مہندر اوم اور سرلا کی زندگی کا ورق تھا۔ ورق الٹتے الٹتے ہم ڈاک بنگلے سے نکل کر توپ خانے کے میدان میں پہنچے۔ یہاں ہر روز ٹھیک بارہ بجے توپ داغی جاتی تھی۔ اب وہ توپ خانہ کہاں ——ہاں جیل موجود ہے۔ اور وہیں موجود ہے کہ جہاں وہ تھا۔ وہیں ڈاک خانہ ہے۔ وہی پولیس لائنز، وہی ہسپتال کو جاتی ہوئی درختوں

سے گھری ہوئی سڑک ہے۔ اب ہم ہسپتال کے برآمدے کے قریب آ پہنچے ہیں ارے وہی تو ہسپتال ہے۔ وہی اس کا چھتا ہوا برآ
کے سامنے وہی پھولوں سے بھرا ہوا باغیچہ اس برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر بائیں طرف باؤجی کمرے میں ایک میز کے سامنے بیٹھا کر
تھے۔ مریضوں کو دیکھنے کے لئے ایک عجیب شوق اور اضطراب کے عالم میں ہم تینوں بھائی اس چھتے ہوئے برآمدے کی جانب
بڑھ گئے۔ جب سب کچھ وہی ہے تو باؤجی بھی وہیں ہوں گے۔ میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے نسخے لکھتے ہوئے مریضوں کو دیکھتے ہوئے
کبھی کبھی کچھ گنگناتے ہوئے۔ گورا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں چوڑی پیشانی اور ہاتھ بالائی سے بھی زیادہ ملائم . . . . . . اور آگے بڑھ
تو عجیب دھچکا سا لگا۔ وہاں تو کوئی اور ہی ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ دریائے پونچھ کے دونوں کناروں کے بیچ بہت سا پانی بہہ گیا تھا۔
کتنی ہی پرانی تصویریں بہا لے گیا تھا۔

"یہ ہیں ڈاکٹر شرما۔" ایک آواز آئی۔

مہندر نے ہاتھ ملایا۔ میں نے بھی۔ چند لمحے تو ہم ساکت سے کھڑے رہے۔ نوجوان اور ہنس مکھ ڈاکٹر تھا۔ جیسے کسی زما
میں میرے والد رہے ہوں گے۔ شرما جی اپنے علاقے کے بہترین پلاسٹک سرجن مانے جاتے ہیں۔ اُن کی بیوی اما
بھی ڈاکٹر ہیں۔

ہسپتال میں کافی بھیڑ ہو گئی تھی۔ اسکول اور کالج کے بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو گئے تھے۔ اور اپنا تعارف خو
کرا رہے تھے یا میرے چھوٹے بھائی اوم کا ٹرالڑکا ملکی اور اس کی بہن انیلا ان کا تعارف ہم سے کرا رہی تھی۔ معزز شہریوں میں سے اب تک
کچھ نام یاد آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر سروپ ناتھ آفتاب۔ کرشن لال گپتا، چمن لال ورما۔ سجاد حسین۔ بخشی بھوشن شرما۔ مہتہ بھگوان داس۔ شہزادہ
عبدالعزیز مستری۔ سردار نند سنگھ۔ اودھم سنگھ۔ سردار سنگھ۔ چوہدری بدری ناتھ۔ خواجہ غلام محی الدین۔ اے پسی سیوا سنگھ۔ ارجن ناتھ مہ
اس موقع پر بھی خاص طور سے اپنی دکان سے پان بنوا کر لائے تھے۔ جتنے دن ہم پونچھ میں رہے۔ مصری صاحب مفت سوڈا او
پان سے ہماری تواضع کرتے رہے۔ ان کی دکان پروین کمار سینی کی دکان کے بالکل سامنے ہے۔ میرے بچپن کے زمانے میں
دکان کتابوں اور کاپیوں کی ہوا کرتی تھی اور دیوالی اور دسہرے کے دنوں میں ہم یہاں سے پٹاخے اور پھلجھڑیاں خریدا کرتے تھے۔

ہسپتال میں شوٹنگ کرنے کے بعد ہم پا پیادہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ دائیں طرف سے ایک پگڈنڈی گھوم کر او
ایک ٹیکری میں جاتی تھی۔ سب سے اوپر چیف میڈیکل آفیسر رام گوپال ماتھر کا گھر ہوا کرتا تھا۔ نیچے ہمارا۔ دونوں او
بنگلے گھنے باغات سے گھرے ہوئے تھے۔

کسی گائیڈ کی مدد کے بغیر ہم چاروں۔ میں۔ مہندر۔ اوم اور سرلا اُدھر چلے گئے۔ جدھر بچپن۔ لڑکپن اور جوا
کے خوب صورت ایام بیتے تھے۔ ہاں وہی گھر ہے۔ وہی دیوار ہے۔ دیوار سے اوپر اٹھا ہوا وہی خوبانی کا پیڑ ہے۔ یا شاید کوئی دوسرا
ہے۔ جوں جوں ہم گھر کے قریب پہنچتے جاتے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی۔ اب گھر کی دیوار مڑنے کو ہے۔ موڑ کے بعد گھر کا در
آئے گا۔ موڑ پر رک کر میں نے مہندر سے کہا۔ یاد ہے مہندر اس کونے پر دیوار سے لگ کر تم پتھروں سے کھیلا کرتے تھے اور جب
سکول سے واپس آتا تھا۔ تو تمہیں یہاں اس جگہ انگور کے بیل کے نیچے پتھروں سے محو گفتگو پاتا تھا۔ وہ انگور کی بیل اب نہیں رہی

مگر گھر کا دروازہ تو وہی ہے ۔ دل کی عجیب حالت تھی ۔ اچانک ہم دروازے سے چند قدم پہلے رُک گئے ۔ اور عجیب محویت کے عالم میں کھلے دروازے کی طرف تکنے لگے ۔ وقت پیچھے کو لوٹ گیا تھا اور ہر دم یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی گلابی کنارے والی کریم رنگ کی ساڑھی پہنے ماں جی اس دروازے سے برآمد ہوں گی اور کہیں گی " اتنے برس کہاں رہے بڑے کاکا ۔ چھوٹے کاکا ۔ مرلا ۔ ادما ادھر کہاں تھے تم ۔ چلو جلدی سے اندر آجاؤ ۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی ۔ میں نے تمہارے لئے مکھن اور شہد بھرے پراٹھے تیار کئے ہیں ۔ ایک ایک گلاس میٹھے کا بھی پی لو " ہم چاروں کو ماں جی کے ہاتھ کے تیار کئے پراٹھے بہت پسند تھے ۔ جن پہ آدھا انچ سے زیادہ مکھن کی تہہ جما کر وہ اس پہ شہد انڈیل دیتی تھیں ۔

مگر ادھ کھلا دروازہ اُدھ کھلا ہی رہا ۔ ماں جی اس دروازے سے باہر نہ آئیں ۔ ہم لوگ اک دھچکے سے ماضی سے حال میں آگئے ۔ اور دروازے کے اندر چلے گئے ۔ وہی آنگن تھا ۔ مگر اب اس آنگن میں بمباری سے بچنے کے لئے ایک بنکر بھی بنا دیا گیا تھا ۔ شہد میں زہر گھل گیا تھا ۔ پہاڑ کی ایک چوٹی پر اگر پاکستانی چوکی تھی تو بالمقابل دوسرے پہاڑ کی ایک چوٹی پر ہندوستانی چوکی تھی اور ہم دونوں چوکیوں کو صاف صاف دیکھ سکتے تھے ۔ اسی قدر قریب تھی باہمی نفرت !

ڈاکٹر شرما گھر دکھانے لگے تو مہندر نے بے قرار ہو کر کہا ۔ آپ نہ دکھائیے " سنئے یہاں ماں جی کی رسوئی تھی " مہندر نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا ۔

ڈاکٹر شرما بولے " آج بھی ہم لوگوں کی یہی رسوئی ہے ۔

ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے مہندر نے کہا " اور یہ باتھ روم ہونا چاہیے "

" ہاں " ڈاکٹر شرما بولے " یقیناً اب بھی یہی باتھ روم ہے "

پھر ہم اندر کے تین کمروں میں گئے ۔ جی چاہتا تھا کہ ماں جی کو آواز دوں ۔ باؤ جی کو آواز دوں ۔ مرحوم بھائی بھوشن کو بلاؤں بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا ۔ پھر چوتھے کمرے کی طرف چلے گئے جو ہمارا اسٹڈی روم تھا ۔ اور جس کا ایک دروازہ باہر باغ میں کھلتا تھا ۔

اس دروازے سے باہر گئے ۔ کدھر گئیں وہ سیب کے پیڑوں کی قطاریں ۔ کدھر گیا وہ باغ ۔ ۔ ۔ ۔ چاروں طرف پھیلا ہوا جس میں ہمارے بچپن کی شرارتیں بکھری پڑی تھیں ۔ معلوم ہوا کہ قبائلی حملے کے دوران یہ باغ بھی کاٹ ڈالا گیا ۔

ڈاکٹر شرما بولے ۔ یہاں پھر سے باغ لگایا جائے گا ۔ میں نے دہلی سے تین سو پودے منگائے ہیں ۔

گھوم گھام کے پھر ہم بے اختیار رسوئی کے سامنے کھڑے ہو گئے ۔ ڈاکٹر شرما کی بیوی مسز اوما شرما ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی ہیں مگر ہم انھیں نہیں دیکھ سکتے ۔ عالم رویا میں ماں جی رسوئی میں بیٹھی چار تھالیوں میں ہمارے لئے کھانا پروس رہی ہیں ۔ ایک کونے میں نوکر برتنوں سے کچھ کھڑ بڑ کر رہا ہے ۔ حالانکہ اس وقت دوپہر ہونے کو ہے لیکن چشم تخیل میں شام ہو گئی ہے ۔ رسوئی میں لالٹین جگ رہی ہے ۔ ماں جی سر پہ پلو ڈالے طلائی چوڑیوں سے بھری کلائی والے ہاتھ سے پانی کے گلاس رکھتی ہیں کھانے کو کہتی ہیں ۔ مگر ہم ضد کرتے ہیں ۔ ہمیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤ ماں جی ۔ ماں جی پہلے تو ڈانٹتی ہیں ۔ پھر ممتا بھرے جذبے سے سرشار ہو کر کھانے کے

پہلے لقمے تیار کرتی ہیں۔ چڑیا کے بچوں کی طرح ہم باری باری اپنا منہ کھول دیتے تھے اور اس میں لقمہ ڈال دیتی تھیں اور کتنا مزے دار کتنا میٹھا کتنا لذیذ ہوتا تھا وہ لقمہ۔ حالانکہ وہی روٹی تھی۔ وہی دال تھی۔ وہی آلو۔ وہی گوبھی۔ وہی مٹر گوشت۔ مگر جانے کیا بات ہے اپنے ہاتھ سے کھانے میں وہ مزا نہ تھا جو ماں جی کے ہاتھ سے کھانے میں تھا اور بہت دیر کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ مائیں جب اپنے پیارے بچوں کے لئے کھانا پکاتی ہیں تو وہ ہر سالن میں اور روٹی کے ہر ٹکڑے میں اپنی محبت کی مٹھاس بھر دیتی ہیں۔ کھانا تو تاج انٹر کانٹی نینٹل اور فائیو سٹار ہوٹل میں بھی عمدہ ملتا ہے مگر وہ آگ پر پکایا جاتا ہے اور یہ روح کی مدھم مدھم آنچ پر تیار ہوتا ہے۔

سرلا رو رہی تھی۔ مہندر جی دم بخود تھے۔ اوم آبدیدہ۔ اس وقت سب نے ہم کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ جیسے ہم کسی غیر مرئی ہستی کے روبرو پیش ہوں۔ ماضی سے آنے والی ہواؤں میں ماں جی کے آنچل کی خوشبو تھی۔

دوسرے دن علی الصبح میں اپنے محترم دوست دیانند کپور سے ملنے گیا۔ ان کا گھر ڈاک بنگلے کی سڑک پار کر کے دریا کے قریب ہے۔ اس سے پہلے ان کا گھر کشمیری محلے میں ہوا کرتا تھا اور شری رام لال مینی مرحوم کی دکان کے قریب ہی ان کی کتابوں کی دکان تھی۔ مگر میں نے دیانند کپور کو کبھی اپنی دکان پر کچھ بیچتے نہیں دیکھا۔ مقامی شعراء اور ادیبوں کا ان کی دکان پر جمگھٹا رہتا تھا۔ ان کی دکان پر ہی میری ملاقات پہلی بار چراغ حسن حسرت مرحوم سے ہوئی۔ دیانند جی سے میں اور مہندر اکثر ادبی رسالے پڑھنے کے لئے مانگ کر لے جاتے تھے خصوصاً مستانہ جوگی اور مانسرور اور مانسرور رسالے کو ہم دونوں بھائیوں نے اس لئے پڑھنا شروع کیا کہ اس کے ایڈیٹر کا نام گوری شنکر لال اختر تھا اور ہمارے باؤجی کا نام بھی گوری شنکر تھا۔

کپور صاحب کے ہاں چائے پی۔ گذری ہوئی باتوں کی یاد تازہ کی۔ اور انھیں شام کے لئے شوٹنگ میں شریک ہونے کی دعوت دے کر چلا آیا ——— واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کئی گھروں سے ناشتہ آ چکا ہے۔ پونچھ کی دو چیزیں بہت مشہور ہیں۔ مکی اور موٹھی۔ چنانچہ ناشتے پر یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ مکی کے ڈوڈے مکی کے پراٹھے۔ موٹھی کا سالن اور کئی قسم کے ساگ۔ گیسٹ ہاؤس والوں نے نان وغیرہ ناشتہ تیار کیا تھا مگر ہم لوگ تو مکی کے پراٹھوں اور موٹھی پر بری طرح گرے۔

اتنے میں کیپٹن اروڑہ بھی آ گئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ صاحب اردو کے مشہور نقاد مالک رام کے قریبی رشتے دار ہیں اور چونکہ ایک ادبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اردو شعر و شاعری سے بے حد شغف ہے۔ ہزاروں شعر زبانی یاد ہیں۔ جنھیں ایک فوجی کے منہ سے سن کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ یہ مجھے، مہندر، سیلی، کملا، ملی اور انیلا کو اپنے ساتھ موتی محل لے گئے۔ جو کبھی راجگان پونچھ کا خاص محل تھا۔ میں نے وہ کمرہ بھی دیکھا۔ جو راجہ بلدیو سنگھ کی خواب گاہ رہ چکا تھا۔ آج بھی اس کمرے میں راجہ بلدیو سنگھ کا ہی پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جس کی مچھر دانی کے پیتل کے چوکھٹے پر پیتل ہی کے حروف میں انگریزی میں B-S لکھا ہوا ہے۔

میں نے کپتان صاحب سے کہا "راجہ بلدیو سنگھ بڑی آن والا راجہ تھا۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا"

کیپٹن صاحب ہنس کر بولے: "صاحب آج بھی اس کی یہی حالت ہے۔"

"کیا مطلب؟" مہندر نے پوچھا۔

کیپٹن صاحب ہنس کر بولے "ایک دن میں رات کو اس پلنگ پر سو گیا۔ دوسری صبح کو میں نے اپنے آپ کو پلنگ کے بجائے فرش پر سوتا ہوا پایا۔"

"نہیں نہیں۔"

"نہیں۔ واقعی سچ کہتا ہوں۔"

میں نے کہا: "ممکن ہے کسی نے آپ سے مذاق کیا ہو اور سوتے میں آپ کو بستر سے اٹھا کر فرش پر ڈال دیا ہو۔"

"اب حقیقت جو بھی ہو۔" کیپٹن ایوڑہ بولے: "واقعہ یہی ہے۔ جو میں نے بیان کیا۔ اس واقعے کے چند روز بعد ہی ہمارا ایک دوست میجر اس پلنگ پر سو گیا۔ رات کو اس کے لحاف میں آگ لگ گئی۔ خود بخود اور وہ جلتے جلتے بچا....."

مہندر نے کہا: "ممکن ہے میجر صاحب شراب کے نشے میں اپنا جلتا ہوا سگریٹ بجھانا بھول گئے ہوں۔"

کیپٹن اروڑہ بولے: "آپ اس کی توضیح جس طرح چاہے کر لیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اب اس بستر پر رات کے وقت کوئی نہیں سوتا۔"

سلمیٰ بولیں: "کیپٹن صاحب۔ یہ دونوں بھائی دہریئے ہیں۔ یہ تو مانیں گے نہیں۔ لیکن میں ان باتوں کو مانتی ہوں ابھی اس دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی سائنسی توضیح محال ہے۔"

موتی محل سے واپس آئے۔ تو قلعہ مبارک کے علاوہ شہر کے مختلف مقامات پر شوٹنگ کرتے رہے۔ لنچ سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے واپس ڈاک بنگلے میں پہنچے۔ تو لڑکے لڑکیوں اور پرانے دوستوں اور نئے چہروں کا ایک ہجوم تھا۔ ماسٹر دینا ناتھ رفیق بھی ملنے کے لئے آ گئے تھے۔ جنھوں نے اسکول میں مجھے اور مہندر کو پڑھایا تھا۔ ہم دونوں نے اُن کے پاؤں چھوئے ماسٹر جی بناوٹی غصے سے ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "دو ایک چانٹا؟ کہاں گم رہے اتنے دن؟" ــــ پھر یکدم ہنس پڑے اور ہم دونوں کو گلے سے لگا لیا۔ اس ہجوم میں سائیں داس جی بھی تھے۔ جو اپنی بیوی کے ساتھ ہمیں دیکھنے آئے تھے۔ سائیں داس جی۔ باؤ جی کے کمپاؤنڈر ہوا کرتے تھے۔ مسز سائیں داس بولیں۔ تم دونوں اتنے چھوٹے سے تھے۔ وہ اپنے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولیں اور میرے گھر آ کر میری رسوئی میں شوق سے میرے ہاتھ کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ میرے گھر کی مکی کے لڈو تمھیں بہت پسند تھے۔ پھر اپنے پرانے ساتھی مہتر ایلجرام ملے۔ ماسٹر محمود الحسن۔ راجندر سنگھ۔ بابو ٹکو رام بنو ترہ۔ پرسرام گھئی۔ ترلوک ناتھ بھسین۔ چودھری لچھمن داس کپور اور رتن لال کپور اور اپنے ہم جماعت ٹھاکر پنجاب سنگھ اور ہربنس لال ٹنڈن۔

کالج کے بہت لڑکے لڑکیوں نے فرمائش کی کہ ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی جائے چنانچہ ان لوگوں کے ساتھ بھی شوٹنگ ہو گئی۔ شوٹنگ کے بعد ایک شوخ و شنگ حسینہ شانوں پر بال بکھرائے ہماری طرف بڑھی اور بولی۔

"مجھے افسانے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں کیسے ایک اچھی افسانہ نگار بن سکتی ہوں؟"

پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ مہندر جی مسکرا کر بولے۔

"دیکھئے ایک اچھی افسانہ نگار بننے کے لئے آپ افسانے تو کرشن جی کے پڑھا کیجیے۔ لیکن خط مجھے لکھا کیجئے۔"

اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ مگر وہ لڑکی ذرا نہیں جھینپی فوراً بولی۔

"اچھا چاچا جی۔"

اس پر وہ قہقہے بلند ہوئے کہ کچھ نہ پوچھیے سلمیٰ نے اس لڑکی کی پیٹھ تھپک کر کہا۔ "اب آپ کو کسی سے افسانہ نگاری کے گُر سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کچھ دیر سرجن کلدیپ چندر شرما۔ شری شام لال نائب تحصیلدار۔ چودھری جیالال سہنی اور چودھری مہیشر ناتھ کپور سے باتیں ہوتی رہیں پھر لنچ کا وقت ہو گیا۔ شام کو پانچ بجے گیتا بھون میں شہریوں نے ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اور اس سے پہلے چار بجے کے قریب ہمیں ایک جلوس کی صورت میں بازار سے گیتا بھون لے جایا جائے گا۔ سب پروگرام طے کرکے لوگ رخصت ہوئے۔ تو ہم نے لنچ لیا۔ پھر پونے چار بجے کاڑیوں میں سوار ہو کے قلعہ مبارک پہونچ گئے وہاں سینکڑوں شہری استقبال کے لئے موجود تھے۔ جلوس چلا تو فضا کرشن چندر زندہ باد۔ مہندر ناتھ زندہ باد۔ سرلا دیوی زندہ باد۔ سلمیٰ صدیقی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ ہمیں ہاروں سے لاد دیا گیا۔ رادھا رام ٹی اسٹال سے لے کر پروین کمار مینی کی دکان تک سارا بازار دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ اور چپّے چپّے پر خوشنما ڈیوڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک سو پچاس ڈیوڑھیاں سجائی گئی تھیں۔ جہاں ہم سب کو روک کر ہار پہنائے جاتے تھے۔ اور شری اندر راج شرما اور لالہ ہنس راج، وجے گپتا اور ستدیو گپتا اور کمار صاحب اپنے اپنے کیمروں سے فوٹو لئے جاتے تھے۔ بہت کم وقت میں لوگوں کو اطلاع دی جا سکی۔ پھر بھی گیتا بھون میں سینکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے جناب محمد دین بانڈے نے تقریر کی۔ پھر ہمارے محترم رفیق استاد دینا ناتھ نے ایک نظم پڑھی۔ ارجن ناتھ مصری نے ایک گیت سنایا۔ پھر مہندر جی نے ایک جذباتی تقریر کی۔ میں نے بھی۔ مگر سرلا تو جذبات میں اس قدر ڈوب چکی تھی کہ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ ورکا بھی خاموش رہی۔ صنف نازک کی نمائندگی سلمیٰ نے کی۔ اور لوگوں کو بتایا کہ جب یہ دونوں بھائی بیمار ہوتے ہیں تو مرنے سے پہلے پونچھ کے درشن کرنے کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں اور اب کہ جب میں نے پونچھ کے لوگوں کی محبت اور یہاں کے علاقے کی خوبصورتی دیکھی ہے میں سمجھتی ہوں ان کا تذکرہ بے جا نہیں ہے۔ سلمیٰ تو زبردست مقرر ہیں اس لئے انہوں نے ایک ہی تقریر میں اہلِ پونچھ کے دل جیت لئے۔

جلسے کے خاتمے کے بعد چائے مٹھائی سے تواضع ہوئی۔ اس چائے پارٹی میں کوئی ڈھائی تین سو افراد شریک تھے۔

پھر جب شام ڈھلنے لگی اور رات بڑھنے لگی تو ہم لوگ چائے کی پارٹی سے فارغ ہو کر پا پیادہ شری پروین کمار مینی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے جہاں رات کا کھانا تھا۔ یہ گھر کملا کا مایکہ ہے جو میرے سب سے چھوٹے بھائی اوم کی بیوی ہے کملا کی بڑی بہن بملا سے مہندر جی کی شادی کی بات چلی تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند بھی کرتے تھے۔ اور دونوں خاندان کے افراد میں بہت میل ملاپ بھی تھا اور اس امر کی زبردست خواہش بھی تھی کہ مہندر اور بملا کی شادی ہو جائے لیکن اس زبردست خواہش اور اصرار کے

باوجود یہ شادی نہ ہو سکی۔ کیونکہ بملا ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ اور مہندر جی اردو کے فری لانس ادیب بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یعنی انہوں نے ادب کے لئے غریبی قبول کرتے ہوئے اپنی محبت کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ماستے پھر خزاں چندجی شکایت کرتے رہے۔ دیکھئے کل شام آپ نے سردار بدھی سنگھ کے ہاں چائے کی دعوت قبول کر لی۔ وہاں آپ کے والد کے دوست سردار سنت سنگھ تھے۔ سردار بدھی سنگھ تھے۔ آپ کے دوست سردار گوربخش سنگھ کی ہمشیرہ موجود تھی۔ سردار بدھی سنگھ کی بڑی لڑکی جو رحوری میں لیڈی ڈاکٹر ہے وہ اور اس کی چھوٹی بہن جو یہاں کالج میں پڑھتی ہے وہ موجود تھی۔ اور آپ کا سارا خاندان اس چائے پارٹی میں موجود تھا۔ مگر آپ نے میرے گھر کا کھانا قبول نہیں کیا۔ حالانکہ آج رات آپ پروین کے ہاں کھانا کھا رہے ہیں۔

مہندر ناتھ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔" بھائی صاحب اس وقت تو ہم صرف تین دن کے لئے پونچھ آئے ہیں۔ مگر اگلے سال تیس دن کے لئے آنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ پھر ہم آپ کے ہاں ایک دن نہیں سات دن کھانا کھائیں گے۔ اس بار معافی دے دو بھائی صاحب!" خزاں چندجی نے مہندر کو گلے سے لگا لیا۔ شکایت دھل گئی۔

پروین کے گھر میں بڑی رونق تھی۔ شہر کے عمائدین۔ ہندو۔ مسلم۔ سکھ سبھی حضرات موجود تھے۔ چارو، کملا، اینلا اور پروین کی ماتاجی سبھی اصرار سے سب کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ مہندر ایک پلیٹ میں کھانا ڈال کے پلیٹ اٹھا کے کھانے کے کمرے سے باہر آ گیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ یادوں کے آنگن میں وہ اس وقت اکیلا کھڑا ہے۔ اور ماضی کی تمام ناآسودہ آرزوئیں اور حسرتیں اپنا آنچل پھیلائے اس کے سر پر سایہ فگن ہیں۔ کیا سوچ رہے ہو مہندر؟ گیا وقت واپس نہیں آتا۔ بملا بیوہ ہو چکی ہے۔ اب تو اس کی یادوں کا سہاگ بھی لٹ چکا ہے۔ اور اب وہ بھی اتنی اکیلی ہے کہ جتنے اکیلے تم ہو۔ اس راکھ کو مت کریدو۔ شاید کسی چنگاری سے تمہاری روح جل جائے ....

ہنگھم میں شور ہے۔ صحن میں شور ہے۔ کھانے کے کمرے میں شور ہے۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے۔ پونچھ سے واپسی پر آپ کو سوہرن کوٹ میں دو گھنٹے کے لئے رکنا ہوگا۔ مہندر جی نے ہم سے وعدہ کر لیا ہے۔ مہندر جی نے ہم سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اگلے سال سوہرن کوٹ میں چھ مہینے رہ کر آپ کی سوانح حیات لکھیں گے ...... کچھ عورتیں کھل کھلا کر ہنس رہی ہیں۔ قہقہے کھنک رہے ہیں۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں ـــ مہندر یادوں میں گھرا اکیلا کھڑا ہے ....

قریب ایک ماہ کی شوٹنگ کے بعد کشمیر کے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ہم لوگ واپس بمبئی آ گئے۔ چندا فلم کی ترتیب و تدوین میں لگ گئے۔ پہلے چھ ہزار فیٹ کی فلم بنی۔ پھر چار ہزار فیٹ کی۔ پھر تین ہزار فیٹ کی۔ آخر میں کاٹ پیٹ کے انیس سو فیٹ پر فلم تمام ہوئی اور فلم ڈویژن کے حوالے کر دی گئی۔ فروری ۷۷ء میں مہندر جی کو فلمز ڈویژن سے پچپن ہزار کا چیک مل گیا۔ جو ہاتھوں ہاتھ بٹ گیا۔ بلکہ چودہ ہزار قرضہ اوپر رہا۔ میں نے مہندر جی سے بہت کہا۔ آپ آدھی رقم دے دیجئے۔ تین چوتھائی دیجئے۔ مگر کچھ رقم اپنے پاس رکھ لیجئے۔ باقی قرض دوسری دستاویزی فلم میں اتار دیں گے۔

مگر یہ بات مہندر جی کے اصول کے خلاف تھی۔ کہنے لگے بھائی صاحب آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ امید ہے کہ مجھے فلم ڈویژن سے

ایک دستاویزی فلم مل جائے گی۔ ایک علم کشمیر کی حکومت سے۔ دو ایک جگہ اور بات کر رہا ہوں۔ دیکھ لینا دو ایک سال میں آپ کو ایسی فراغت دے دوں گا کہ آپ اس دن رات کی محنت سے بچ کر آرام سے سورن کورٹ میں رہ کر باقی زندگی صرف لکھنے پڑھنے میں گزار سکیں گے ——— میں کیا کہتا۔ مہندر کو بس میری فکر تھی۔ اپنی نہیں۔

دس مارچ کو ساحر کے ہاں ڈنر تھا۔ تنی اچھی صحت ہو چلی تھی مہندر جی کی کہ کلکتے سے آیا ہوا میرا دوست امرت لعبوتی گجرال کہہ اٹھا۔ "مہندر بھائی میں نے آپ کو اتنا بشاش کم دیکھا ہے۔ ٹپ ٹاپ ویل۔ صحت بھی بہت عمدہ ہو رہی ہے۔"

مہندر ہنس کر بولے "شراب چھوڑ دی ہے۔ اچھا کھانا کھاتا ہوں۔ اور ٹہلی سیر کو جاتا ہوں۔ میں نے اتنے سالوں میں خود اپنے آپ کو اتنا تندرست محسوس نہیں کیا تھا۔"

ان دنوں راہی صاحب سے میں اُردو کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ اخباروں میں بیانات پہ بیانات آرہے تھے انہی دنوں میں دلی یونیورسٹی نے مجھے نظام خطبات کے لئے مدعو کر لیا۔ انیس مارچ کو میں دلی فرنٹیئر میں سے روانہ ہوا۔ چلنے سے پہلے میں نے مہندر کو فون کیا۔ ہمیشہ کا قاعدہ یہ تھا کہ بمبئی سے باہر جانے سے پہلے میں ضرور ان سے مل کر جاتا تھا۔ مگر آج بہت دیر میں اٹھا تھا۔ دیر میں تیار ہوا تھا۔ اگر مہندر جی کے گھر جاتا ہوں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔ سوچا فون پہ ہی بات کر لوں۔

مہندر جی سے فون پہ معذرت چاہی۔ وہ بولے میں اسٹیشن پہ آیا جاتا ہوں۔ میں نے آپ کے لئے ریشم کا ایک کاڑھا ہوا کرتا سلوایا ہے۔ وہ بھی لیتا آؤں گا۔"

میں نے کہا "مہندر جی۔ چند دن کے لئے تو جا رہا ہوں۔ واپسی پہ آ کر پہن لوں گا۔" بس یہ آخری گفتگو تھی۔

بیس مارچ کو دلی پہنچا۔ سیدھا بھائی ادم کے گھر گیا۔ ناشتہ کیا۔ کھانا کھایا۔ پھر بھائی کشن لال جی کے ہاں سری رام روڈ چلا گیا۔ پُرسہ دینے کے لئے۔ کیونکہ ان کے بڑے بیٹے جگ موہن کا ایک موٹر ایکسی ڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ سلمیٰ کا فون آیا تھا۔ میں آتے ہی فون کر لوں۔ میں نے بمبئی فون لگایا۔ کچھ عرصہ تک فون نہیں ملا۔ جب فون ملا تو سلمیٰ کی آواز سنائی دی۔ کہہ رہی تھیں "فوراً آئیے۔ مہندر کو ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ حالت نازک ہے۔ فوراً پہلا ہوائی جہاز پکڑ کر آ جائیے۔"

دو تین گھنٹے بھاگم بھاگ سیٹ حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا رہا۔ کسی ہوائی جہاز پر جگہ نہ ملی۔ چار بجے کے قریب سلمیٰ کا فون آیا۔

"مہندر جی کی حالت بہتر ہے۔ کے۔ ای۔ ایم ہاسپٹل کے INTENSIVE وارڈ میں داخل کیا ہے۔ ابھی ابھی ان کو چائے اور ٹوسٹ کھلا کے آئی ہوں پھر جا رہی ہوں۔ آپ فوراً آ جائیے۔"

میں نے کہا "ابھی تک تو کسی ہوائی جہاز میں سیٹ نہیں ملی۔ کوشش کر رہا ہوں۔ اس وقت نہیں تو صبح کے پلین سے آ جاؤں گا۔"

"پہلا پلین پکڑ کر آ جائیے۔"

اس وقت میں خلا میں تھا۔ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کیا ہو رہا ہے۔ کشن لال جی کے ساتھ بیٹھے کو بیٹھا تو پتا نہیں گیا۔ رات کے ساڑھے نو بجے یکایک میں نے کشن لال جی کے گلے سے لگ کر رو رو کر کہا "نہیں ہے۔ نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ میرا بھائی اس

دنیا میں نہیں ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ بھائی صاحب میرا بھائی اس دنیا میں نہیں ہے۔ (بعد میں معلوم ہوا ٹھیک ساڑھے نو بجے ان کا انتقال ہوا تھا۔)

رات بھر جاگتا رہا۔ کبھی باتھ روم جاتا۔ کبھی بستر پہ لیٹتا۔ کبھی اٹھ کر ٹہلتا۔ بہن کملا (کشن لال جی کی دھرم پتنی) ساتھ والے پلنگ پہ بیٹھی بار بار میری نگہداری کر رہی تھیں۔ لاکھ دل کو سمجھایا۔ سلمیٰ نے فون پہ کہا ہے۔ مہندر جی کی حالت بہتر ہے۔ میں صبح جاؤں گا۔ کل صبح ان کو ٹھیک کر دوں گا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

کب صبح اٹھا۔ کیسے اٹھا۔ کب گاڑی میں بیٹھا۔ کب گاڑی پالم پہنچی۔ کب ہوائی جہاز میں سوار ہوا۔ کب سنتا کروز کے اڈے پہ اترا۔ میں نہ دلی میں تھا نہ بمبئی میں تھا۔ میں خلا میں تھا۔ یکایک ایئرپورٹ کے دروازے پہ سامنے عباس کھڑے نظر آئے۔ ان کے پیچھے سلمیٰ۔ ان کے پیچھے راجی۔ ان کے پیچھے شیام کشن نگم ان کے ساتھ کملیشور۔ بھارتی۔ بیسیوں دوست انہیں دیکھ کر میں سمجھ گیا۔ آگے ایک قدم نہ بڑھ سکا۔ ایئرپورٹ کی سیڑھی پر دھم سے بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دبا لیا۔ وہ لوگ مجھے تھام کر اندر ہال میں لے گئے۔

ساری زندگی وہ پتھروں سے کھیلا۔ پتھروں میں رہا۔ پتھروں سے لڑتا رہا۔ پتھروں سے سر ٹکراتا رہا۔ اور ساری زندگی پتھر کی اسی دیوار میں کوئی دریچہ اس کے لئے نہیں کھلا۔ وہ میرا ساتھی۔ میرا یار۔ میرا دوست۔ میرا بھائی۔ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ جو بے لڑاؤں کا ہمنوا تھا۔ غریب ادیبوں کا غمگسار تھا۔ فلمی ادیبوں کا خدمت گذار تھا۔ ہم سب سے روٹھ کر ایک ہی دن میں چلا گیا۔ اور زندگی اور موت کے اس دوراہے پر کھڑا میں سوچتا ہوں کیسے تجھ کو واپس بلاؤں اور کہاں سے تجھ کو ڈھونڈوں اور کیسے تجھے پکاروں اور ایسا کہاں سے لاؤں ....

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"

مہندر ناتھ — ایک یاد

جاں نثار اختر

مہندر سے میری پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۴۸ء میں ہوئی جب ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لئے وہ بھوپال آیا تھا۔ میں اس وقت حمیدیہ کالج بھوپال میں شعبۂ اردو کا صدر تھا۔ اس کانفرنس کا پروگرام بھی میری صدارت میں بنایا گیا تھا۔ بمبئی سے کرشن چندر، عصمت چغتائی، مہندر ناتھ، مجروح سلطان پوری، عادل رشید وغیرہ آئے تھے۔ کرشن چندر نے افتتاحیہ جلسہ کی صدارت کی جس کا افتتاح علامہ سلیمان ندوی نے کیا تھا۔ ۲۸ دسمبر کی شام جو ادبی تخلیقات کا دوسرا اجلاس تھا اس کی صدارت مہندر ناتھ کے سپرد تھی۔ مہندر نے ادب اور جنس کے موضوع پر بہت بلیغ اور بصیرت افروز خطبۂ صدارت پڑھا اس موضوع کا تاریخی جائزہ پیش کرتے ہوئے مہندر نے اس کا اعتراف کیا تھا کہ ترقی پسند ادب اپنے ابتدائی دور میں جنسی مریضانہ ذہنیت کا علاج کرنے کے بجائے خود اس کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ مہندر ناتھ نے افسانوں میں جنسی محبت کے ساتھ روحانی رفاقت اور خیال کی ہم آہنگی پر زور دیا۔ ایسی رفاقت جو ایک نئے سماج کی بنیاد بن سکے یہ پہلا دن تھا جب میں نے مہندر کو ایک باشعور ادیب کی حیثیت سے پہچانا مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے مہندر کا یہ مضمون رسالہ 'افکار' میں شائع ہوا تھا جو اُس وقت بھوپال سے نکلتا تھا۔ غالباً اس کے کسی مجموعے میں یہ مضمون شامل نہیں۔ میں نے اس وقت تک مہندر کی بہت کم کہانیاں پڑھی تھیں لیکن اس ملاقات کے بعد مجھے جس رسالہ میں اس کی کہانی مل جاتی ضرور پڑھتا تھا۔

مہندر سے دوسری ملاقات بھیمڑی کانفرنس میں ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ مہندر ایک ایسا جوشیلا اشتراکی ادیب ہے جو "شکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں" کا دلدادہ ہے۔ کانفرنس میں اس کا وجود ادیبوں اور فن کاروں کی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے علیحدہ نظر آ رہا تھا۔ جب سارے ادیب اپنے اُن ساتھیوں کو جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند تھے یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر روپوش تھے۔ نام لے لے کر پکار رہے تھے مہندر کی آواز سب سے اونچی اور الگ سنائی دے رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ یہ آواز تمام حدبندیوں کو توڑ کر ان تک ضرور جا پہنچے گی۔

اس کانفرنس کے مبنی فیصلوں میں جس انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اور ادیبوں کو جس طرح سرخ رنگ میں رنگ جانے کے احکام صادر ہوئے تھے اُس کے نتیجے میں بہت سے ساتھیوں کا انجمن سے الگ ہو جانا یقینی تھا۔ اس غلط اقدام پر میری اور مہندر کی خاصی بحث ہوئی۔ نہ مہندر مجھے قائل کر سکا نہ میں مہندر کو۔ میں تو خیر دو دن بعد بھوپال لوٹ گیا لیکن وقت نے خود بتا دیا کہ رندیوے کی پالیسی پر مبنی ادیبوں کا منشور کتنا غلط تھا۔ میں نے اس زمانے میں بہت سوچا کہ مہندر ایک متوازن دماغ رکھتے ہوئے میری بات کیوں نہ مانا۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس میں پارٹی سے وفاداری کا جذبہ اس حد تک تھا کہ وہ اسے وقتی طور پر اندھا بنا دیتا تھا۔ میرے دل میں اس کی عزت بڑھ گئی کیونکہ جذبہ چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو ہر چیز سے بڑا ہوتا ہے اور اس کی عظمت سے انکار نہیں

کیا جا سکتا۔

مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

سنہ ۱۹۵۱ء میں جب میں سنٹرل گورنمنٹ کے ایک آرڈی ننس کے تحت اپنی سروس چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور بمبئی چلا آیا تو مہندر ناتھ سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مجھے اس کو پاس سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری تھا۔ انجمن کے اجلاسوں کا سلسلہ بہت باقاعدہ چلتا تھا۔ دیودار ہال میں، پھر کوٹھاری مینشن میں، پھر عرب بلڈنگ میں ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوتے رہے جس کے لئے پوری دوڑ دھوپ مہندر کو کرنی پڑتی تھی۔ عرب بلڈنگ میں تو اکثر ہال کی صفائی کرتے اور دریاں بچھاتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا۔ بلکہ بعض اوقات مجھے اس کا ہاتھ بٹانا ہوتا تھا۔

مہندر شدید قسم کا جذباتی انسان تھا۔ اس کی وہ کہانیاں جن میں اس کی جذباتیت اُبھر کر سامنے آئی ہے "جہاں میں رہتا ہوں"۔ "ڈیڑھ روپیہ"۔ "چائے کی پیالی"۔ "اگر میں مر جاؤں"۔ "جنوب کا ساتھی"۔ "چاندی کے تار"۔ "حنائی انگلیاں" اس کے ادبی شاہکار ہیں۔ وہ اپنی عملی زندگی میں بھی جذباتی تھا۔ جس کی سب سے بڑی مثال کرشن سے اس کا زندگی بھر کا نباہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری کرشن چندر رہا۔ اُس کے معاملے میں وہ زندگی بھر جذباتی رہا۔ کرشن کا ہر دکھ درد اُس کا اپنا دکھ درد تھا۔ وہ ہنس راج رہبر ہو یا کوئی اور، وہ کرشن کے مخالف کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ شاعر نے جب 'کرشن چندر نمبر' شائع کیا اُس وقت ایک مضمون محمد طفیل نے پاکستان سے بھیجا تھا جو سعادت حسن منٹو کا لکھا ہوا تھا اور جسے طفیل نے اپنے رسالے میں شائع کرنا مناسب نہ سمجھا تھا اور منٹو سے خرید کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ یہ مضمون بہت کچھ کرشن کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ مہندر کیسے گوارا کرتا کہ اسے کرشن نمبر میں شامل کیا جائے جس کی تکمیل اور ترتیب میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ مہندر نے وہ مضمون مجھے دکھایا تھا اور بے طرح بگڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ منٹو تو اب ہے نہیں، تم یہ ناراض کس پر ہو رہے ہو، نہیں چھاپنا چاہتے ہو تو نہیں چھاپو، بات ختم ہو جاتی ہے مگر وہ دیر تک نارمل نہ ہو سکا۔

اُس کی یہی جذباتیت تھی جس سے اس کے قریبی دوست پیار کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کے لئے کیا غیروں تک کی مدد کے لئے وہ اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور جو کچھ اس سے بن پڑتا اُس سے دریغ نہ کرتا تھا۔ ایسا اس کی زندگی میں بہت کم ہوا کہ کسی مسئلے پر اس کا کسی دوست سے جھگڑا ہو گیا ہو۔ ایک مرتبہ جب ساحر فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے صدر تھے اور مہندر سکریٹری، اُن کا آپس میں اختلاف ہو گیا۔ مہندر میرا جتنا دوست تھا اتنا ہی ساحر بھی تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ بیچ میں پڑ کر ان دونوں کا آپس میں میل کرا دوں۔ اس سلسلے میں بات چیت کی غرض سے میں دو چار بار مہندر سے ملنے گیا۔ اس دوران مہندر مجھے خوش مذاقی سے TYRANT کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ بہرکیف میل تو آخر میں ہونا ہی جانا تھا البتہ اس تلخی کا اثر مہندر پر کافی دنوں تک رہا۔

ایک کمزوری جو مہندر میں زندگی بھر رہی وہ یہ تھی کہ وہ دوسروں کے حق کے لئے تو لڑ سکتا تھا، اپنے حق کے لئے لڑنا نہیں جانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں اسے کچھ نہ مل سکا۔ نہ کوئی خطاب، نہ وہ شہرت جس کا وہ مستحق تھا۔ آخر زمانے میں البتہ مہندر میں کبھی کبھی تلخی ابھر آتی تھی۔ وہ جس طرح دوسروں کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا تھا، شاید اس کے دل کے

کسی گوشے میں یہ خواہش بھی چھپی ہو کہ کوئی دوسرا بھی اس کے لئے کچھ کر دکھائے۔ اس کے انتقال سے پندرہ بیس دن پہلے کی بات ہے، میں اس شام اس کے پاس بیٹھا تھا کہنے لگا الماری میں سے بوتل نکال لو۔ میں نے کہا تم نہ پیوگے تو میں بھی نہیں پیوں گا۔ بولا "چلو یار! ایک پیگ آج میں بھی پی لیتا ہوں۔" نہ جانے شراب پیتے ہوئے اس میں کیا بات ابھر آئی کہنے لگا "سمجھ میں نہیں آتا ہم میں ایسی کیا کمی ہے کہ نہ ہماری کتابوں پر کبھی کوئی انعام ملتا ہے، نہ کوئی خطاب سے نوازتا ہے۔ نہ باہر ہی سے کوئی بلاوا آتا ہے۔ اب اتنا بھی بُرا ہم نہیں لکھتے۔" میں نے ہنس کر کہا "یہ سارے انعام و اکرام ہم لوگوں کو بھی ملیں گے ضرور، لیکن ملیں گے POS THOMUS AWARDS۔ کہنے لگا "یار تم لکھ کر رکھ لو۔ یہ مرنے کے بعد مجھے اور تمھیں کچھ نہیں دیں گے، آج جب مجھے سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیا گیا اور دو ہفتہ کے لئے روس آنے کی دعوت، تو مجھے بے طرح مہندر کی یاد آئی۔ کاش وہ تھوڑے دن اور انتظار کر لیتا۔

مہندر کے تعزیتی جلسوں میں میرے بہت سے دوستوں نے یہ بات بڑے فخر سے کی کہ مہندر بیس سال تک انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری رہا اور بارہ سال تک فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا سکریٹری رہا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہ بات کم سے کم ہمارے لئے شرمناک ہے آخر وہ کون ہے جو یہ لکیر کھینچتا ہے کہ اس ادیب کو اس سے زیادہ آگے نہیں دیا جانا چاہیے، مہندر ناتھ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا کبھی وائس پریسیڈنٹ یا پریسیڈنٹ کیوں نہیں چنا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی اعزازی عہدہ ہو، انعام ہو، خطاب ہو یا بیرونی ممالک کے دعوت نامے ہوں، اُن کے لئے بڑے جوڑ توڑ کرنے ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بغیر کچھ کوشش کئے سب کچھ مل جائے۔ مجھے اپنا کہا ہوا ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

انعام ہو، خطاب ہو ویسے ملے کہاں
جب تک سفارشوں کو اکٹھا کیا نہ جائے

مہندر جہاں دوستوں کے دکھ درد میں شریک ہو جاتا تھا وہاں اُن کی خوشیوں سے بھی خوش ہونا اُسے آتا تھا۔ میں نے ۱۹۶۳ء میں جب مہندر سے ایک دن برسبیل تذکرہ کہا کہ میں ایک فلم پروڈیوس کرنے جا رہا ہوں تو وہ ہنسنے لگا کہ یہ عذاب تمہارے بس کا نہیں، لیکن جب میں نے بیس ہی دن بعد اُسے "بہو بیگم" کا مہورت کارڈ دے جا کر دیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا "یار تجھے مان گئے۔" پھر ہنس کر بولا "مہورت کا دن اور وقت جوتشی سے نکلوایا ہے یا خود ہی نکال لیا ہے۔" میں نے کہا، جوتشی کا تمھیں کیوں خیال آیا، کہنے لگا۔ یونہی، تمہارا بس چلتا تو تم مہورت ہی کیوں کرتے۔"

مہندر کبھی توہم پرست نہیں رہا، لیکن نہ جانے ایک دفعہ کیوں محاتی طور پر وہم اس کے دل میں جاگ اٹھا تھا۔ یہ بات ہے اُس دن کی جب مجھے پہلا دل کا دورہ پڑا تھا۔ آناً فاناً کتنے احباب گھر پر جمع ہو گئے مجھے جب اسٹریچر پر ایمبولنس کار میں اسپتال لے جانے لگے تو کسی نے مجھے چادر اڑھا دینی چاہی، اُسی لمحہ مہندر نے چیخ کر کہا "نہیں، چادر نہیں اڑھاؤ۔"

مرنے سے آٹھ دن قبل اس نے مجھے افسانوں کا مجموعہ "تنہا تنہا" بھیجا تھا۔ اس مجموعے کی کئی کہانیاں مجھے پسند آئیں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں زبانی مہندر سے ان کہانیوں کے بارے میں اظہار خیال کروں گا لیکن وہ موقع نہ آسکا۔ اچانک رات کو مجھے خبر ملی کہ

مہندر پر دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مہندر مر جائے گا۔ لیکن وہ واقعی مر گیا۔ بہت سے دوستوں نے اس کی میت پر پھول چڑھائے، مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ میں تو صرف اپنے آنسوؤں ہی کے پھول اس کے نذر کر سکتا تھا۔

دنیا اتنی بے مروت اور زمانہ اتنا مصروف ہے کہ دوست دوست کو بھول جاتے ہیں، ادیب ادیب کو بھول جاتے ہیں انسان انسان کو بھول جاتا ہے۔ البتہ تاریخ ادب ان ناموں کو ضرور اپنے سینے سے لگا کر رکھتی ہے جنہوں نے اپنی جذباتی اور ذہنی زندگی ادب کی آبیاری میں صرف کر دی مہندر کا نام بھی ادبی تاریخ کے صفحوں میں زندہ رہے گا۔ وقت کے ساتھ ہر یاد دھندلی پڑ جاتی ہے۔ مجاز اور مخدوم جیسے ساتھیوں کی یاد کبھی کبھی ہمیں چونکا کر گزر جاتی ہے۔ یوسف ظفر جس کے بارے میں ہمارے بڑے افسانہ نگاروں کی رائے تھی کہ "اب اردو ادب میں ایک گورکی پیدا ہوا ہے۔" آج کسے یاد ہے۔ مہندر بے چارہ تو "گورکی" بھی نہ تھا اسے اگر کوئی بھول جائے تو کس کو کس سے گلہ ہوگا۔ پھر بھی مجھے اعتبار ہے کہ مہندر بحیثیت ایک انسان اک نہ اک دل میں ضرور زندہ رہے گا۔ مجھے اپنے بیٹے سلمان کا ایک مصرعہ یاد آ رہا ہے۔ مہندر کا کوئی نشان مزار نہ سہی۔ کوئی کتبہ نہ سہی شاید اس سے زیادہ مناسب ہم اس کے لئے کچھ نہ سوچ سکیں گے۔ ؎

اک نہ اک دل میں تو یہ آدمی زندہ ہوگا۔

مہندر ناتھ کی شخصیت

(خطوط کے آئینے میں)

محمد طفیل

بھائی کرشن چندر، تسلیمات!

آپ کا حکم سر آنکھوں پر ——— مگر ———

میں مہندر ناتھ سے بغیر اُن کا مدّاح ہوں۔ اُن کی انسان دوستی کا گرویدہ، اُن کے فن کا دلدادہ۔ مگر میں اُن سے ایک بار بھی ملا ہوتا تو باقی باتیں اپنے "کشف" سے کہہ ڈالتا۔ مگر افسوس ایک بار بھی ملنا نصیب نہ ہوا۔

انھوں نے مجھے متعدد بار بمبئی بلایا۔ لیکن وہ خود اتنی جلدی میں تھے کہ انھیں دھیان ہی نہ رہا کہ میں نے کسی کو بلا رکھا ہے۔

اِن حالات میں میں کیا عرض کروں؟

آپ کا

محمد طفیل

۱۹۶۶ء میں مہندر ناتھ نے لکھا تھا۔

حضور! آپ کو کرشن چندر پر مضمون لکھنا ہی ہوگا۔ یوں تو ایک ہی ملاقات کافی ہوتی ہے ایک مضمون کے لئے، آپ تو تین چار بار مل چکے ہیں۔ کرشن جی سے! مجھے یقین ہے۔ جب آپ کرشن جی پر مضمون لکھیں گے تو واقعی ایک معرکے کی چیز ہوگی۔ اب ٹالنے کی کوشش نہ کیجئے گا بس لکھئے!

۱۹۷۰ء میں کرشن چندر نے لکھا:

پہلے لکھ چکا ہوں کہ بیس مارچ کو مہندر جی کی پہلی برسی ہے۔ اِس موقع پر ہم لوگ ایک خصوصی "مہندر ناتھ یادگار نمبر" شائع کر رہے ہیں۔ جس میں تمہاری شرکت اشد ضروری ہے۔ کوئی مضمون، کوئی خاکہ جو چاہو بھجوا دو۔ تمہارے پاس تو مہندر جی کے خطوط بھی ہیں۔ اُن کا حوالہ بھی اپنے مضمون میں دے سکتے ہو۔ تمہارے مضمون

کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔

[میں سوچنے لگا۔
جب مہندر ناتھ نے مضمون مانگا تھا نوعیت اور تھی جب
کرشن چندر نے مضمون مانگا ہے۔ صورت اور ہے۔
بہر حال میں نے مہندر ناتھ کے خطوط اکٹھے کیے اور بچشم تر
پڑھنے لگا۔]

۱۹۵۸ء میں لکھا:۔

گھر میں صرف میں ہوں اور میری بیوی اور بیوی سیواجی کی اولاد ہے یعنی مراٹھن ہے۔ وہ بھلا بیمار کیا ہوگی۔ اس لئے خدا کا قہر مجھ ہی پہ نازل ہوتا ہے۔ شاید دہریہ ہونے کی وجہ سے، اور کیا عرض کروں کہ قوتِ برداشت اتنی ہے کہ خدا سے بھی گلہ نہیں کر سکتا۔

[مہندر ناتھ کی عادت کسی سے شکایت کرنے کی نہ تھی۔
وہ اپنی آگ میں خود بھسم ہونے کے قائل تھے۔]

۱۹۶۱ء میں لکھا:۔

آپ کا ہونے والے بچوں کو سلام تا قیامت ملتا رہے گا۔ ہندوستان کی آبادی ۴۴ کروڑ ہو گئی ہے۔ ایک دو بچے پیدا کرکے میں کونسا تیر ماروں گا۔ خدا آپ کے اور باقی ادیبوں کے بچے سلامت رکھے۔

[مہندر ناتھ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ بڑھتی ہوئی آبادی سے
بھی پریشان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے چپکے سے اپنے وجود کی
نفی کر دی۔]

۱۹۶۲ء میں لکھا:۔

ادھر دو تین تازہ نمبر ملے۔ صرف لاہور نمبر نہیں ملا۔ اگر بھیج دیا ہے تو یہ نمبر مجھے ملنا چاہیے تھا۔ لاہور سے میری یادیں وابستہ ہیں۔ بچپن اور جوانی کے دن اسی شہر میں گزرے۔ ایم۔ اے تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ اس لئے لاہور نمبر سے مجھے محروم مت کرو۔ نہیں بھیجا ہے تو بھیج دو پیارے!

[مہندر ناتھ نے لاہور کا نام لیا۔ میرے بھی دل کی دھڑکن تیز

ہوگئی ۔ اب میں انھیں ڈھونڈھنے بھی نکلوں تو ڈھونڈھ نہ سکوں گا ۔]

۱۹۵۸ء میں لکھا :۔

اس وقت سورج درختوں کی اوٹ میں ہے ۔ میرے کمرے کی دیواریں سورج کی روشنی میں جاگ رہی ہیں ناریل کے پتے اس نرم ہوا میں ناچ رہے ہیں ۔

آج کل بمبئی کا موسم بڑا ہی خوشگوار ہے ۔ اتنی خوبصورت دھوپ! آسمان صاف شفاف اور روشن ہے کہ آدمی اپنا چہرہ آئینے کی بجائے آسمان میں دیکھے لیکن دیکھنے کی ہمت نہیں ۔ آئینے میں چہرہ دیکھنا آسان ہے ۔ لیکن آکاش کی کھلی بے داغ پیشانی کے سامنے اپنا چہرہ رکھنا حوصلے کا کام ہے ۔

کچھ دنوں سے گرمی بہت کم ہے ۔ سردیوں کا آغاز ہے ۔ یہاں تو سردیوں کا موسم ہوتا نہیں ۔ بڑی ہلکی ہلکی سی ٹھنڈک بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہے کہ گرم گرم سی ٹھنڈک!

[انسانوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ جو شخص مناظر قدرت سے دلچسپی رکھتا ہے ۔ وہ لغویات سے دلچسپی نہیں رکھتا ۔]

۱۹۶۰ء میں لکھا :۔

ادب عالیہ نمبر مل گیا ہے ۔ یہ نمبر سب نمبروں سے بازی لے گیا ۔ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ خوبصورت، حسین اور حسین تر نمبر نکالنے کا سہرا تمہارے ہی سر ہے ۔ اس سے پہلے اور شاید اس کے بعد کوئی ایڈیٹر اتنے شان دار، باوقار اور با مقصد نمبر نہ نکال سکے گا ۔ نمبر نکالنے میں جس ذوق جمال کا تم نے ثبوت دیا اور اُردو ادب کی جیسی تم نے تاریخ مرتب کی اس کی وجہ سے اُردو ادب میں تم تو امر[۱] ہو گئے ہو ۔

[کسی کی تعریف کرنا دل گردے کا کام ہے ۔ یہ شیوہ یا تو اداروں کا ہے یا اُن کا، جن کے مزاج میں شرافت ہے اور دل کشادہ!]

۱۹۶۰ء میں لکھا :۔

میری ایک اور عرض ہے کہ مرنے سے پہلے تم ایک ایسا نمبر نکالو جس کی وجہ سے تمہیں گالیاں ملیں یعنی اتنا خراب، اتنا بدصورت، اتنا بے مقصد، اتنا بے معنی نمبر کہ اس سے بے ادبی کی شاندار روایات قائم ہوں ۔ بھی ہر بڑا

---

۱ آنجہانی نے اپنے خطوط میں میری اتنی تعریف کر رکھی ہے کہ انھیں پڑھ کر شرمندہ ہوتا رہا ۔ کیا وہ سب سے ایسی ہی اٹوٹ محبت کرتے تھے؟ جواب! جی ہاں!

افسانہ نگار یا شاعر اچھی خاصی بیہودہ نظمیں اور افسانے لکھتا ہے ۔ اس لئے تمہیں پورا حق ہے کہ اس طرف بھی دھیان دو تاکہ اس میدان میں بھی تمہارا کوئی ثانی نہ ہو ۔

[وہ مزاجاً بقراط نہ تھے ، بلکہ مسخ مزاج رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ چہل کو بھی ان کی زندگی میں دخل تھا ۔ ویسے بھی کردار کی بے عمل خوبیوں سے باعمل شرارتیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں ۔]

۱۹۵۴ء میں لکھا :-

ادھر بیماریوں نے گھیرا ۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کرشن جی کی چھوٹی بچی پاگل ہو گئی ہے ۔ وہ خود کچھ عرصے سے بیمار ہیں ۔ ادھر میں بیمار ہوں ۔ بھیا ! اس جھنجھٹ میں کچھ نہ لکھ سکا ۔ اب یہ لکھا کہ کرشن چندر پہ مضمون لکھ کر بھیجو ۔ یا کسی سے لکھواؤ ۔ میں کرشن چندر پر مضمون تو لکھ سکتا ہوں لیکن مواد اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایک کتاب ہی میں سما سکتا ہے ۔

[مہندر ناتھ سب سے پیار کرتے تھے ۔ بماشما سے بھی ۔ لیکن کرشن چندر سے تو ان کی محبت بے مثال تھی ۔ قابلِ رشک حد تک بے مثال ۔]

۱۹۵۹ء میں لکھا :-

طبیعت ناساز تھی اور ابھی تک ہے ۔ معدہ خراب ہے اور خراب رہتا ہے ۔ ذرا گیس کی شکایت ہے ۔ لوگ زیادہ شراب پی کر اپنا معدہ خراب کر لیتے ہیں ۔ یہاں میرا اُلٹا ہی حال ہے یعنی شراب نہ پی کر معدہ خراب کر لیا ہے ۔ خیر یہاں تو بھگوان کی کرپا سے شراب پینا ممنوع ہے ۔ گو دیسی شراب ملتی ہے اور کافی سستی ملتی ہے ۔ لیکن ایسی شراب کا بھی کیا پینا جو معدے کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی خراب کر دے ۔ ــــــ تمہاری کوئی تازہ تخلیق ؟ کتابی ، جسمانی ، یا روحانی ؟ ادھر میں تینوں چیزوں سے منکر ہو گیا ہوں ۔

[کسی کا شراب نہ پینا ، شرافت و نجابت کی دلیل تو نہیں مگر ایسے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں ۔ مہندر ناتھ کے بارے میں میرا خیال تھا کہ چسکی لگا لیتے ہوں گے لیکن وہ تو مدظلہٗ نکلے ۔]

۱۹۶۶ء میں لکھا :-

ایک زمانے کے بعد آپ کا خط ملا ۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ہم سب زندہ ہیں ۔ خدا کرے معاہدۂ تاشقند کی طرح زندہ و تابندہ رہے اور دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کی راہ و رسم جاری رہے ۔ اور اس فانی دنیا سے کوچ

کرتے وقت تک ہم ایک دوسرے سے مراسلات کا سلسلہ تو قائم رکھ سکیں۔

[یہ سوچ کسی صلح کُل قسم کے انسان ہی کی ہو سکتی ہے۔ اگر ان کی جگہ کوئی متعصب ذہن ہوتا تو وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہتا۔]

۱۹۶۲ء میں لکھا:-

خدا کرے آپ مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہوں۔ دراصل میں بیمار ہو کر مرنا نہیں چاہتا۔ شہید ہونا چاہتا ہوں۔ کسی ادیب کے ہاتھوں شہید ہو جاؤں تو میری موت کے بعد اچھے خاصے نمبر نکل سکیں گے۔ یوں سسک سسک کر مرنا کہاں کی شرافت ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ابھی شہید ہونا عقل مندی نہیں۔ کچھ عرصہ اور انتظار کیا جائے۔ اس لئے کہ اس دوران میں ایک افسانہ ہو گیا اور وہ بھی بہت اچھا اور شاندار افسانہ جسے پڑھ کر آپ ضرور میری درازیٔ عمر کے لئے خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائیں گے اور قتل کرنے کی تمنا جو آپ کے دل میں ہے اُسے فوری طور پر ملتوی کر دیں گے۔

[میں نے بے تکلفی کی فضا میں لکھا ہو گا کہ افسانہ بھیج دیجیئے ورنہ قتل کر دوں گا۔ فن کار مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اچھی تخلیق کی آمد آمد ہو تو وہ اپنے سورگ باشی ہونے والے ارادے کو بھی ملتوی کر سکتا ہے۔]

۱۹۵۲ء میں لکھا:-

ایک فلمی ادارے میں نوکری کر لی تھی۔ اور اسی مہینے اُس فلمی ادارے سے چھٹکارا نصیب ہوا ہے۔ ایک فلم "زلزلہ" تیار کی ہے۔ اس میں بطور ایک ایکٹر، ڈائیلاگ رائٹر اور ساتھ ہی چیف اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے کام کیا ہے۔ یعنی پیٹ بھرنے کے لئے ایک ادیب کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔

[فلمیں تو کئی بڑے ادیبوں نے بنائیں۔ مثلاً کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس نے مگر بطور ایکٹر یا تو مہندر ناتھ نے کام کیا یا سعادت حسن منٹو نے۔]

۱۹۵۲ء میں لکھا:-

اِس دورِ ابتلا میں ذہن کے سامنے کئی تصویریں اُبھرتی ہیں۔ ماضی حال اور مستقبل نگاہوں کے سامنے گھوم جاتے

ہیں۔ زندگی کی مشکلات اتنی بڑی اور زیادہ ہیں کہ اُن کا سامنا آسان نہیں ۔

بمبئی کے ادیب بھی آج کل بہت کم لکھتے ہیں۔ پیٹ کی بھوک نے لاچار کر دیا ہے اور ہم سب لوگ بے بس سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر بھی ہمت نہیں ہارتے ۔

[بمبئی کے ادیبوں سے ادب کو کوئی گلہ نہیں جیسے تیسے بھی لکھا۔
خوب لکھا۔ اور ناموں کے ساتھ مہندر ناتھ کا نام بھی نمایاں ہے ۔
مفلسی زحمت ضرور ہے مگر ذلّت نہیں ۔]

۱۹۵۸ء میں لکھا :-

آپ کی والدۂ محترمہ کی اچانک موت کی خبر پڑھ کر بے حد رنج ہوا۔ ماں کی محبت عجیب و غریب ہوتی ہے۔ بڑی نایاب، حسین اور دلفریب چیز، یہ واقعی ایک المناک ٹریجڈی ہے۔ جس کا سامنا ہر انسان کو کرنا پڑتا ہے سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اپنے غم میں مجھے بھی شریک کرو۔ کیونکہ ماں سب کی سانجھی ہوتی ہے۔

[جو شخص کسی کے دکھ درد میں شریک ہو۔ صرف وہی شخص انسان کہلانے
کا مستحق ہے۔ باقی سب دوستی کے فریب، مہندر ناتھ ان معنوں میں
قابلِ پرستش تھے ۔]

۱۹۵۹ء میں لکھا :-

آج کل ہندوستان میں مشاعروں کا زور ہے۔ اس دوران کافی غزل گو شعرا اِدھر تشریف لائے۔ کاش آپ بھی شاعر ہوتے تو اس طرح آپ سے ملاقات ہو جاتی یا میں شاعر ہوتا تو اسی بہانے پاکستان کا ایک چکر لگا لیتا۔ نہ ہوئی قسمت ۔

[مہندر ناتھ یاروں کے یار تھے۔ متعدد مرتبہ مجھے بمبئی بلایا مگر
میں ہمیشہ بات کو کل پہ ٹالتا رہا۔ اب تو بات واقعی کل پہ ٹل گئی
ہے ۔]

۱۹۶۶ء میں لکھا :-

بمبئی میں پچھلے دنوں کافی ہنگامہ رہا۔ پانی کی اتنی قلّت تھی کہ پینے کے لیے ذرا کم ملتا تھا۔ نہانے کے لئے سمندر ہے لیکن پینے کے لئے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ مون سون دغا دے گئی تھیں۔ قیامت کا سماں تھا۔ لیکن اب بارش اتنے زوروں سے ہو رہی ہے کہ خدا بچائے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ جھیلیں پانی سے بھری پڑی ہیں۔ اب ہر شخص خوش ہے۔ خدا نے اپنے وجود کا احساس انسانوں کو کرا دیا ہے۔ اب بھی لوگ اس کی ہستی کے منکر ہوں تو کیا ہو سکتا ہے ۔

[ایک خط میں مہندر ناتھ نے لکھا تھا کہ دہریہ ہوں - اس لئے خدا کا
تھر مجھ پہ ہے - اقرار وہاں بھی خدا کی ہستی کا تھا - اقرار یہاں پر بھی ہے
باقی اللہ جانے -]

۱۹۵۷ء میں لکھا :-

تم وعدہ کیوں کرنے لگے - خطوط نمبر چھاپا - اس میں سے مہندر ناتھ کا نام غائب تھا - شخصیات نمبر چھاپا اُس میں ہمارا نام غائب ! ارے بھئی کیا ہماری شخصیت شخصیت ہی نہیں ؟ اتنی بے اعتنائی کیوں ؟ پھر اتنا پیار کیوں ؟ بتاؤ تو ! کبھی کبھی تم سے گلے شکوے کرنے کو جی چاہتا ہے - ویسے زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ تم سے گلہ کر رہا ہوں یا کسی سے گلہ کیا ہے -

مجھے یہ گمان تھا کہ مہندر ناتھ ابھی ہمارا لمبا ساتھ دیں گے - اس لئے کھٹکنے والے دوستوں کو راضی کر لیا جائے یا ان کا حق ادا کر دیا جائے مگر انہوں نے تو اتنی جلدی کی کہ میں شرمندہ ہو گیا -

۱۹۵۸ء میں لکھا :-

ارے بھئی ایک عرصہ سے بیمار تھا - سلسلۂ کلام سے شروع ہوا اور انجام بہت برا ہونے والا تھا کہ آپ ایسے دوستوں نے آواز دی " ٹھہر او جانے والے راہی ! کہ میں ٹھہر گیا اور پھر تندرست ہو گیا "۔
وقت سے پہلے مرنا بھی کونسی بہادری ہے - جب تک سانس آتا ہے - جیئے جاؤ - مرنے کے بعد کس نے پوچھا ہے - اگر کوئی پوچھ بھی لے تو فائدہ ؟

[غالباً مہندر ناتھ بھی میرے ہمنوا تھے کہ موت سے کیا ڈرنا ، زندگی سے خبردار رہنا چاہیے -
افسوس کہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۴ء کو ، ہم نے آواز نہ دی اور وہ چلے گئے - دوستی کا باب ختم ہو گیا - ادب کی رونق مدھم پڑ گئی -]

جیکم ناشاد عرف مہندر ناتھ

راہی معصوم رضا

جنوری ۷۴ء تک مہندر ناتھ تھے۔ جنوری ۷۴ء سے مہندر ناتھ نہیں ہیں۔ جب مہندر ناتھ تھے تو ان پر لکھنے کا خیال نہ آیا اور جب مہندر ناتھ نہیں ہیں تو لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ کیونکہ جس عہد میں ہم تمام ادیب اپنے آپ کو روشنائی کے لئے بیچ رہے تھے اس عہد میں مہندر ناتھ نے روشنائی کے لئے بھی اپنے آپ کو نہیں بیچا۔ ہم سب نے اپنے بکنے کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈھ لیا۔

روشنائی کے لئے اپنے کو بیچا کئے ہم
تاکہ صرف اس لئے کچھ لکھنے سے باقی رہے
کہ قلم خشک تھے اور لکھنے سے مجبور رہے تھے ہم!

پر مہندر ناتھ نے کسی شرط پر حالات سے صلح نہیں کی۔ ایک شعر یاد آیا!

مصلحت کی شرطوں پر رہن دل نہیں رکھتے
جان بیچ دیتے ہیں، قرض اتارنے والے

مہندر نے جان دے کر زندگی کا قرض اتار دیا اور ہم لوگ آڈیٹوریم میں بیٹھے ہیرو کی ہیروئک موت پر خوش ہو کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ رو رہے ہیں کہ وہ مر گیا۔ خوش ہیں کہ ہم نہیں مرے۔ ویسے بھی کھاتہ دیکھا جائے تو مہندر ناتھ کے مرنے سے نقصان کم ہوا۔ فائدے زیادہ ہوئے۔ درگا (مہندر کی بیوہ) کو ۲۴ انچ کا ایک ٹیلی ویژن مل گیا۔ یہ ٹیلی ویژن اسے مہندر ناتھ کی زندگی میں نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ مہندر کے پاس ٹیلی ویژن پر خرچ ہونے والے روپے ہی نہیں تھے۔ آج درگا کی تین چار سو روپے ماہوار کی مستقل آمدنی ہے۔ مہندر کی زندگی میں یہ آمدنی نہ تھی نہ ہو سکتی تھی۔ دوستوں کو غم غلط کرنے کے لئے شراب پینے کا بہانہ مل گیا۔ ریوتی۔ راہی معصوم رضا آنند رومانی۔ نیاز حیدر ...... سب کو مہندر کی زندگی پر تقریر کرنے کا موقع —— اس چال کے دن پھر گئے جس میں مہندر ناتھ زندہ تھے۔ اور بالکل شریف بہوؤں کی طرح جس چال سے پھر ان کی لاش نکلی میرے خیال میں شری سادھو کے پیچھے والی گلی نے اپنی زندگی میں اتنی کاریں اور اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ دیکھے ہوں گے۔ فلمی اور غیر فلمی ادیب۔ ہندی۔ اردو۔ انگریزی اور مراٹھی کے صحافی کئی بڑے ڈائرکٹر۔ کئی ہیرو۔ کئی بڑے رسالوں کے ایڈیٹر ..... بڑا ہنگامہ تھا۔ بڑی چہل پہل تھی۔ لوگ الگ ٹکڑیوں میں کھڑے تھے۔ بات ہر جگہ مہندر کی بے وقت موت سے شروع ہوتی اور پھیل جاتی فلمی اسکینڈلز۔ ریلیز ہونے والی فلمیں ... سلیم جاوید اور کے۔ نارائن وغیرہ کی برائی۔ درگا کی فکر۔ کرشن جی کی تنہائی کا خیال .... ریوتی کہہ رہے تھے کہ وہ مہندر میموریل فنڈ کے لئے لاکھ دو لاکھ جمع کر سکتے ہیں۔ صابر دت اس حسن نمبر کا ذکر کر رہے تھے جو مہندر کے اظہار تمنا پر انہوں نے ترتیب دینا شروع کر دیا تھا ..... عاقل ہزالوی اپنی بھاری آواز میں اپنے آپ کو مہندر کا پرسہ دے رہے تھے۔ ادریس دہلوی چپکے چپکے ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں شامل ہو رہے تھے جیسے چل رہے ہوں سرگوشی کر رہے ہوں ......

اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ مرنا شاید جینے سے زیادہ دلچسپ اور کار آمد کام ہے کیونکہ شاید ہم سب کو مہندر کے مرنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ کتنا اہم آدمی تھے۔ وہ دس پانچ برس پہلے مر گئے ہوتے تو جوانا مرگ کا خطاب بھی مل گیا ہوتا۔ موت زیادہ دھوم دھام کی بھی ہوئی ہوتی کیونکہ تب انجمن ترقی پسند مصنفین کی پوری طاقت بھی بڑے اہتمام سے مہندر کا سوگ منا رہی ہوتی۔ پر یہ مہندر ناتھ نے بارے میں سوچتے ہی نہیں تھے یعنی آدمی مرنے کے لئے صحیح زمانہ تک انتخاب نہ کر سکا۔ مہندر میں دنیوی سمجھ داری تھی ہی نہیں۔ سابق کلاس فیلو اور حال منسٹر آئی کے گجرال نے باندرہ میں دو بیڈ روم ہال کا فلیٹ دینے کا وعدہ کیا تو یہ پاگل آدمی خوش ہو گیا کہ میں تو نہیں بچتا۔ چار سو فلیٹ دو میں بن نہیں۔ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن ہوں! ...... " ٹھینگا ہیں آپ مہندر جی۔ دو بیڈ روم کا فلیٹ آپ سے بڑا تھا اور آپ کے مرنے کے بعد بھی آپ سے بڑا ہے۔ ورنہ آج اس فلیٹ کو بیچتیں تو لکھ پتی ہو گئی ہوتیں! پر مہندر کو تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ لاکھ روپے ہوتا کیا ہے۔ کیونکہ مہندر ناتھ پیدائشی پاگل تھے ان کے ناول 'رات اندھیری ہے' میں ایک کردار ہے حکیم ناشاد کا جو بڑے پرخلوص اور صاف گو آدمی تھے۔ یہ خیال ہے ناول کے ہیرو جگدیش کا جو بی۔ اے پاس ہے۔ مہندر جی بھی بی اے پاس تھے! پر مجھے جگدیش سے زیادہ حکیم ناشاد میں مہندر کی جھلک ملی۔ حکیم ناشاد کی آواز بھی مہندر سے ملتی ہے۔ سنئے!

"اس کمرے میں بھی لکھتا ہوں۔ اس غربت کے باوجود کتابیں پڑھتا ہوں ...... میں پاگل نہیں ...... ہوش مند انسان ہوں کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتا ہوں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں کسی کی چاپلوسی نہیں کر سکتا۔ کیا کروں یہ میری فطرت ہے" (رات اندھیری ہے ص: ۹۱)

مہندر ناتھ کا المیہ یہی تھا کہ وہ پاگل نہیں، ہوش مند تھے کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتے تھے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ کسی کی چاپلوسی نہیں کر سکتے تھے۔ مہندر ناتھ بھی تو ٹھیک نہیں تھا۔ کیونکہ یہی ان کی فطرت تھی —— ارے یہی تو ٹھیک نہیں تھا!

وہ چلائی! جگدیش۔ جگدیش ...... اس کی آواز سارے محلہ میں پھیل گئی ایک آدمی دوسرے کمرے سے نکل آیا۔

"کیا بات ہے میڈم"

"یہ جگدیش دروازہ نہیں کھولتا"

"دیکھتی نہیں ۔ دروازہ بند ہے۔ تالا لگا ہوا ہے۔ اندر کوئی نہیں ۔ صرف روشنی ہے"

(رات اندھیری ہے ۔ ص ۱۳۶)

اور باہر کیا ہے مہندر جی۔ نہ دروازہ ہے، نہ تالا، نہ روشنی، نہ جگدیش ...... باہر تو صرف اندھیرا ہے اور پونچھ سے بھاگ کر مہندر ناتھ کے پاس آئی ہوئی کنواری آتما کا دم گھٹ رہا ہے ...... کوئی اسے چوتھے مالے سے نیچے دھکیل دیتا اور وہ مر جاتی تو شاید مہندر جی جیتے ...... پر مہندر اس قیمت پر جینا چاہتے ہی نہیں تھے۔ اچھا ہوا مر گئے کیونکہ اس جیا وکم ویش میں جینا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔

مقالے

خیر البشرؐ کے حضور میں

ممتاز حسن

میرے نزدیک ہر وہ شعر نعت ہے جس کا تاثر ہمیں حضور رحمت اللعالمین کی ذاتِ گرامی سے قریب لائے، جس میں حضورؐ کی مدح ہو یا حضورؐ سے خطاب کیا جائے۔ صحیح معنوں میں نعت وہ ہے جس میں محض پیکرِ نبوت کے صوری محاسن سے لگاؤ کی بجائے مقصدِ نبوت سے دل بستگی پائی جائے، جس میں جنابِ رسالتمآب سے صرف رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو بلکہ حضورؐ کی شخصیت سے ایک قلبی تعلق موجود ہو۔ وہ مدح یا خطاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اور وہ شعر نظم ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا مثنوی، رباعی ہو یا مثلث، مخمس ہو یا مسدس اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدر و قیمت کا دار و مدار اس کے نفسِ مضمون پر ہے۔ اگر اس کا مقصد ذاتِ رسالت کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا اور آقائے دوجہاں کی بعثت کی جو اہمیت نوعِ انسانی اور جملہ موجودات کے لیے ہے، اسے نمایاں کرنا ہو تو وہ صحیح طور پر نعت کہلانے کا مستحق ہے۔ پیغمبرِ رسالت سے قرب کا جذبہ یقیناً ایک نعتیہ پہلو رکھتا ہے۔ البتہ اگر شاعر کی توجہ صرف حضورؐ کے حسن و جمال ظاہری پر رک جائے، اور اس سے آگے نہ بڑھ سکے کہ حضورؐ کے قد کا سایہ نہ تھا، یا حضورؐ کے سر کے بال آخر وقت تک سیاہ تھے، تو اس شاعری کا درجہ وہ نہیں ہوگا، جو حقیقی نعتیہ کلام کا ہے۔ کسی نے کہا ہے:

معراج کی رتیا دھوم مچی اک راج دلارا آوت ہے

یا ایک اور نعت ہے:

بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آ جا
کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے آ جا

اسی طرح کچھ اور گیت ہیں جو اس عاشقانہ اور جذباتی شاعری کی یاد دلاتے ہیں جو ہندوؤں کے ہاں، عام ہے اور جس کا مرکز کرشن جی مہاراج کی ذاتِ والا صفات ہے۔ مثلاً:-

مدینے میں مورا پیا بالا ہے رے

یا

مستی ہے یاد چشمِ رسولِ انامؐ کی

اس سے بھی آگے بڑھیے تو اس قسم کے شعر نظر آئیں گے:

اے دوستو فرقت میں مری مرتے ہو ناحق
اے چارہ گرو فکرِ دوا کرتے ہو ناحق

اچھا نہ کبھی ہوں گا میں بیمارِ نبیؐ ہوں

دراصل ذاتِ گرامی کے متعلق کہا گیا ہے جو جسم و روح کی بالیدگی اور توانائی کا سرچشمہ ہے!

تقریباً یہی حال ہماری میلاد کی محفلوں کا ہے جہاں اکثر تاریخی واقعات اور مقصدی تذکرے کی بجائے ذکرِ رسولؐ ایک افسانوی اور جذباتی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور سننے والے نوعِ بشر کے سب سے بڑے نمائندے کی زندگی اور پیغام سے بڑی حد تک ناآشنا رہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیماتِ رسالت سے قلبی تعلق پیدا ہونے کے بعد ذاتِ رسالت اور پیکرِ رسالت سے دل بستگی بلکہ ایک والہانہ شیفتگی پیدا ہونا لازم ہے اور اس مقام پر پہنچ کر جذبۂ دل جو کچھ کہلوائے وہ سننے کے لائق ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اسلامی تعلیمات پورے طور سے نہیں بھی اتری ہیں مگر وہ حضورؐ کا نام سنتے ہی بے قرار ہو جاتے ہیں ان کا درجہ بڑے بڑے علما اور فقہا سے بلند ہے، اور شمعِ رسالتؐ کے ان پروانوں کا تو کیا کہنا جنھوں نے اپنی جانیں دے دیں مگر حضورؐ کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ سننا گوارا نہ کیا۔

اردو نعت کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ ہم ایک اہم مسئلے پر غور کر لیں جس کی نزاکت اس کی اہمیت سے کم نہیں۔ یہ مسئلہ ذات و صفات کا ہے جو خدا اور رسولؐ دونوں میں مشترک ہے اگرچہ خدا معبود ہے اور رسول عبد مگر اپنے اپنے مقام پر دونوں وحدہٗ لاشریک ہیں۔ شرک دونوں جگہ گناہ ہے۔ شرک فی اللہ بھی اور شرک فی الرسولؐ بھی۔

ذات اور صفات کا باہم گہرا تعلق ہے۔ صفات ذات کی مظہر ہیں۔ مگر اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں، جس طرح کسی انسان کی عکسی تصویر اس کی شخصیت کا پتا تو دیتی ہے مگر اس پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح صفاتِ خداوندی ذات کی نشان دہی تو کرتی ہیں مگر ہمیں از خود عینِ ذات تک پہنچا نہیں سکتیں۔

اس میں شک نہیں کہ ذاتِ خداوندی کا جلوہ کائنات کے ہر مظہر میں جھلکتا ہے اور یہ سب مظاہر ایک حد تک رہنمائے ذات ہیں لیکن یہ رہنمائی بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ادراکِ صفات کو شعورِ ذات کا وسیلہ سمجھا جائے۔ اگر اس کی بجائے تماشائے صفات مقصود بالذات کی حیثیت اختیار کر لے تو یہی وسیلہ راستے کی رکاوٹ بن جائے گا۔ یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، یہ ستارے، یہ کائنات کے دلکش اور نظر افروز منظر، یہ سب کے سب ذاتِ خداوندی کے پرتو ہیں۔ البتہ اگر انسان ان کی رنگا رنگی میں محو ہو جائے تو یہی پرتو اس کی آنکھ کا پردہ بن جائے گا۔ کسی نے کہا ہے:

آستانِ یار را پنہاں زچشم می کند
صد تفو بر ہستیٔ دنیا و ما فیہا تفو

یہی وجہ ہے کہ صفات کو ایک بتکدہ کہا گیا ہے جہاں جبینِ شوق صنم پرستی پر مائل نظر آتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

اس نکتے کی مزید وضاحت انھوں نے معراجِ نبوی ؐ کے سلسلے میں ایک اور شعر میں کی ہے:

مردِ مومن در نسازد با صفات
مصطفیٰ راضی نشد الّا بذات

لیکن یہ لازم نہیں آتا کہ انسان دنیا کے کام کاج میں ہاتھ ڈالنے کے بعد خدا سے غافل ہو جائے۔ ہمیں تو دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے لیے بہتری چاہنا ہے۔ فی الدنیا حسنۃً و فی الاخرۃ حسنۃً۔ اکابر صوفیہ کا مقولہ "دست در کار و دل بایار" اسی مسلک کا اظہار ہے یعنی دنیا سے دلچسپی تو صحیح ہے مگر دل باختگی صحیح نہیں۔ اکبر الہ آبادی نے اسی طریقِ فکر و عمل کی تشریح کی ہے۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اگر ذاتِ خداوندی سے قرب حاصل کرنے کے لیے صفات کے نگارخانے سے گزرنا لازم ہے تو ذاتِ رسالت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ صفاتِ رسالت ذاتِ رسالت کی پردہ پوشی کرنے کی بجائے حقیقتِ رسالت کو نمایاں کرتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول کا ایک انسان کی حیثیت سے پیدا ہونا اور دوسرے انسانوں کے درمیان رہ کر ان کے ساتھ زندگی بسر کرنا بے معنی ہو جاتا۔

صفاتِ رسالت محض پیکرِ نبوی ؐ کے حسن و جمال کا نام نہیں ہے۔ یہ نام ہے اس خُلقِ عظیم کا جو ساری نوعِ انسانی کے لیے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم مقصدِ بعثت سے اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم پر حضور خیر البشر ؐ کی سیرت کے مختلف پہلو منکشف نہ ہوں۔ جنابِ رسالتمآب ؐ کی زندگی سارے انسانوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے خواہ ہم انھیں ایک بچے کی حیثیت سے دیکھیں یا ایک جوان اور بوڑھے کی حیثیت سے۔ حضور ؐ ایک شہری، ایک فرمانروا، ایک خاوند، ایک باپ، ایک قائد، ایک مجاہد، ایک سپاہی، ایک سپہ سالار، ایک جج، ایک مقنن، ایک معلم سبھی کچھ ہیں۔ ہم اس زندگی کے جس پہلو پر نظر ڈالیں وہ اسی اسوۂ حسنہ کا مظہر ہے جس کا ذکر خود قرآن نے کیا ہے۔ اگر حضور ؐ کی زندگی چند مافوق الفطرت واقعات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہوتی اور اس میں عام انسانوں کے رنج و راحت، مسرت و غم، مصیبت اور کامرانی یہ سب موجود نہ ہوتے تو ہم بحیثیت انسان اس زندگی سے کوئی سبق نہ سیکھ سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور ؐ کی زندگی میں انسانی رنج و غم اور کرب و الم کی ساری کیفیتیں ساری اذیتیں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتِ رسالت کے شعور کے لیے صفاتِ رسالت کا ادراک اور سیرتِ رسول ؐ کی پیروی ناگزیر ہے۔ اصل چیز یہاں بھی ذاتِ رسالت ہے۔ مگر ذات و صفات لازم و ملزوم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ نعتِ رسول ؐ کی بنیاد یا تو عشقِ ذات

ہے، یا ادراکِ صفات۔ یا تو وہ ذاتِ رسالت سے ایک گہرے اور والہانہ جذبے کا اظہار ہے، یا صفاتِ رسالت کی عکاسی۔ دونوں کا مقصد اور حاصل یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کی شخصیت اور کردار ہمارے سامنے آئیں اور ایک مثالی حیثیت سے زندگی میں ہمارے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں۔

جنابِ رسالت مآبؐ پر درود و سلام بھیجنا نہ صرف تسکینِ خاطر اور فلاحِ دارین کا باعث ہے بلکہ یہی ایک ایسا عمل ہے جس میں فرشتے اور خود ذاتِ خداوندی دونوں انسان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔

خدا کے جتنے احسان اولادِ آدم پر ہیں ان میں سب سے بڑا احسان ظہورِ محمدی ہے اور اولادِ آدم ہی پر کیا یہ احسان ساری کائنات پر ہے۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ۔ محمدؐ بن عبداللہ محسنِ اعظم ہی نہیں خود احسانِ اعظم بھی ہیں ذاتِ محمدیؐ کا ظہور کون و مکاں کی تخلیق کا نقطۂ عروج ہی نہیں بلکہ منتہائے مقصود بھی ہے۔ ذاتِ محمدیؐ الطافِ ایزدی کی سب سے بڑی مظہر ہے۔ وہ بجائے خود ایک رحمت ہے، سب سے بڑی رحمت، جس کے بغیر زندگی اور کائنات کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

هر کجا هنگامهٔ عالم بود
رحمةٌ للعالمینی هم بود

آج ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ ہم نے سیرتِ رسولؐ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس مثالی سیرت کی رہنمائی سے محروم ہو گئے ہیں۔ غور فرمایئے کہ صداقت اور امانت وہ صفات ہیں جو رسالت مآبؐ میں بعثت سے قبل موجود تھیں اور جن کے دوست دشمن سب قائل تھے۔

کہا تیری ہر بات کا یاں یقین ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے

آج ہمارے نام نہاد اسلامی معاشرے میں کتنے آدمی ایسے ملتے ہیں جنھیں صادق اور امین کہا جا سکتا ہے۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس مملکتِ پاکستان میں جسے اسلامی ہونے کا دعوےٰ ہے جب آئینی قرار دادِ مقاصد منظور کی گئی تو خدا اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کا نام تو لیا گیا مگر اس رسولؐ کا کہیں ذکر نہ آیا جس کے توسط سے ہم نے خدا کو پہچانا اور جس کی تعلیمات کا یہ کرشمہ ہے کہ ہم میں محمد علی جناحؒ جیسے حق پرست مجاہد پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔

جہاں تک اُردو نعت کا تعلق ہے اُردو کے بعض اساتذہ کے نعتیہ کلام میں زیادہ تر اُستادانہ صنعت گری پائی جاتی ہے۔ مثلاً امیر مینائی نے جو غزل کے شاعر تھے اور اس حیثیت سے مشہور ہیں معراج پر جو کچھ کہا ہے اس میں زیادہ تر الفاظ پر زور ہے:

کس کے آنے کی فلک پر ہے خبر آج کی رات
آنکھ سورج سے ملاتا ہے قمر آج کی رات
کہکشاں کہتی ہے قسمت کا ستارہ چمکا

ہوگا اس راہ سے حضرت کا گزر آج کی رات

حوریں فردوس سے نکلی ہیں نچھاور کرنے

سر پہ رکھے طبق لعل و گہر آج کی رات

مگر میں ایسی نعتوں کی مثالیں زیادہ دینا نہیں چاہتا جو میرے خیال کے مطابق نعت کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اُردو نعت کے چند ایسے نمونے آپ کی خدمت میں پیش کروں جو میرے نزدیک نعت کہلانے کے مستحق ہیں۔ میری رائے میں اُردو میں کوئی نعت حالی کے مسدس کی برابر موجود نہیں ہے:۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ

یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

ان چند شعروں میں کوئی تکلف کوئی مبالغہ کوئی طباعی کوئی صنعت گری نہیں۔ مگر جو تاثر ان میں موجود ہے اس کی نظیر اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔ حضور رسالت پناہ کا اپنا ارشاد ہے کہ اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللّٰهِ وَاَحَبُّهُمْ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَنْفَعُهُمْ اِلَى الْخَلْقِ یعنی ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور خدا کو سب سے عزیز وہ انسان ہے جو خلقِ خدا کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ حالی کے یہ شعر اسی حدیث اور صاحب حدیث کی تصویر ہیں۔ اور اس قدر پُراثر ہیں کہ انسان کی ساری زندگی کا رُخ بدل سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو خلوص اور سادگی حالی کے ان اشعار میں جھلکتی ہے، وہ خود حالی کی روحانی پاکیزگی کی آئینہ دار ہے۔ حالی کی زندگی سراپا خلوص ہے۔ اور جب تک کسی انسان کی زندگی سراپا خلوص نہ ہو، حضور رسالت مآبؐ سے کسی قسم کے قلبی تعلق کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ ان اشعار کو نعت کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئے گی کہ ہر شعر میں رسالت کا پرتو ہے۔ سرکارِ دوعالمؐ کو گیسوؤں والا اور کسی ایسے ہی پیارے نام سے خطاب کرکے جذباتِ عقیدت کی تسکین کی کوشش کرنا اور بات ہے اور حضورؐ کی بشر دوستی اور انسان نوازی کی طرف توجہ دلا کر دنیا کو مقصدِ نبوت سے آگاہ کرنا اور بات۔ یہی حالی کی عظمت ہے۔ اُن میں عشقِ ذات اور شعورِ صفات دونوں بیک وقت موجود ہیں۔ حالی کی دوسری نعت جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اُس میں سرورِ کونینؐ سے خطاب ہے۔ حالی سرکارِ دوجہاںؐ کے دربار میں اُمت کی فریاد لے کر پہنچتے ہیں:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے — پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

شاید درد و غم کی یہ عرضداشت بہت طول پکڑ جاتی مگر ایک مقام پر پہنچ کر حالی اپنے آپ کو روک دیتے ہیں، کہ کہیں فریاد

شکایت کی صورت اختیار نہ کرے:

ہاں حالی گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے
ہے تجھ کو خبر یہ بھی کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

یہ عجز، یہ انکسار، یہ ادب، یہ سب محبت ہی کے کرشمے ہیں۔ میر کا کہنا سچ ہے کہ:

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

حالی کے بعد میرے ذہن میں جس شخص کا نام آتا ہے وہ ظفر علی خاں ہیں۔ ان کی طبیعت کا سا تنوع کہیں اور کم ملے گا۔ طنز و ظرافت ہجو و مذمت، قومی جذبہ، سیاسی نعرہ بازی، غرض شاعرانہ طباعی اور قادر الکلامی کا کون سا مظاہرہ ہے جو ان کے کلام بلاغت نظام میں نہ ملتا ہو۔ یہ ان کی سعادت ہے کہ وقتی اور ہنگامی قافیہ پیمائی کے ساتھ ساتھ خدا نے نعت گوئی بھی ان کے لیے مقدر کی۔ وہ ایک آدھ نعت تو ایسی لکھ گئے ہیں جو اُردو کے کسی انتخاب سے الگ نہیں رکھی جا سکتی:

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

یہ اور اس نعت کے دوسرے اشعار اُردو کے مشہور ترین نعتیہ اشعار میں سے ہیں۔ ان کی دوسری مشہور نعت وہ ہے، جس کا مطلع ہے:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو

یہ نعت جہاں اپنی معنویت کے اعتبار سے بلند ہے، وہاں اپنے والہانہ جذبۂ محبت کی وجہ سے نعتوں میں بے نظیر ہے۔ ہر شعر جوشِ عقیدت اور خلوصِ بیان کا بھرپور نمونہ ہے۔ پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔

اکبر الٰہ آبادی کے کلام میں حکمت اور معرفت کے جو موتی ہیں وہ بیشتر طنز و ظرافت کی نذر ہو گئے ہیں، لیکن اُنھوں نے نعت میں جو کچھ کہا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

دُر فشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا، آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے رہبر بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

اقبال کا شمار باقاعدہ نعت گویوں میں نہیں ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں ایک آدھ روایتی نعت ملتی ہے جسے انھوں

نے اپنے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں کیا۔ جیسے:

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

اس قسم کی نعت گوئی خدا ادب ہی سے متجاوز نہیں ہے، دین کے دائرے سے بھی باہر ہے۔ کوئی اور شاعر تو صاف صاف کہہ گیا ہے:

ذکی کیونکر نہ ہر دم احمدِ بے میم کی رٹ ہو
کہ اُلفت میں لحاظِ کفر و ایماں ہو نہیں سکتا

اس قسم کے افکار و اقوال اکثر صوفیا اور ان کے معتقدین پر وارد ہوتے ہیں، اور ان کی صفائی یہ پیش کی جاتی ہے کہ یہ حالتِ "سکر" کے واردات ہیں۔ اور ہم بھی عقیدت کی رو میں بہ کر انھیں قابلِ مواخذہ نہیں سمجھتے۔ یہاں صحو اور سکر سے بحث نہیں البتہ یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوّل تو معتبر صوفیہ حالتِ سکر کی کہی ہوئی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرے یہ کہ سکر اور جہاں کہیں بھی جائز سمجھا جائے دربارِ نبوی میں جائز نہیں ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

با خدا دیوانہ و با مصطفیٰ ہشیار باش

بارگاہِ رسالت مقامِ ادب ہے۔ یہاں کسی قسم کی گستاخی اور بیباکی خطاکاری ہے۔ یہاں جو باریاب ہو اسے احتیاط سے سنبھل کر بیٹھنا ہوگا۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

خدا اور بندے کا فرق اسلام کے بنیادی تصورات میں سے ہے۔ رسول کی بشریت پر قرآن نے اور خود رسولؐ نے بار بار زور دیا ہے۔ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اور مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ اس پر شاہد ہیں۔ البتہ ہمارے نعت گو تصوّف کی سکر انگیز روایتوں سے متاثر ہو کر اس بنیادی حقیقت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ خود حضور سرورِ انبیاؐ کی زندگی میں ایک لمحہ بھی سکر کا نہیں ہے۔ اقبال کا مندرجہ بالا شعر بھی روائتی نعت کا نمونہ ہے اور ابتدائی کلام ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دینے کے لائق ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اسے اپنے مرتب کردہ مجموعے میں جگہ نہیں دی۔

اقبال کی ابتدائی غزلوں میں کہیں کہیں نعتیہ اشعار ملتے ہیں:

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بتا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ماعرفنا پہ
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

ایک آدھ مقام کے علاوہ اقبال نے عام طور پر اردو میں براہِ راست نعت گوئی نہیں کی۔ جہاں حضورؐ کی محبت کا جذبہ اُمڈ آیا ہے، وہاں بھی حدِ ادب ملحوظ ہے۔ تعریف کی ہے تو مؤذنِ رسول کی یاد بار بار بلالؓ میں پہنچے ہیں تو طرابلس کے شہیدوں کے لہو کا آبگینہ لے کر۔ یہ دونوں نظمیں عشقِ رسولؐ سے معمور ہیں۔ بلالؓ والی نظم کے دو شعر سنیے:

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اُٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

بلالؓ پر اقبال کی ایک اور نظم بھی ہے جس سے پہلے اسکندرِ رومی اور اس کی فتح یابیوں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد اسکندر کا مقابلہ بلالؓ سے کیا گیا ہے۔ دوسرا بند یہ ہے:

لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امینِ ازل سے ہوا سینۂ بلالؓ
محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخِ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

یہاں دو شخصیتوں کا تقابل کیا گیا ہے۔ ایک تو وہ شخصیت ہے جس کا شمار دنیا کے سب سے بڑے فاتحین میں ہوتا ہے، جس کی شہرت کی بنیاد قوتِ اقتدار اور دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش پر ہے اور چونکہ یہ خواہش اور یہ غلبہ خود بے بنیاد ہے، اس لیے وہ شخصیت اور اس کی شہرت بھی بادِ ہوا ہے۔ آج اسکندرِ رومی کو تاریخ کے اوراق میں تو دیکھا جا سکتا ہے، مگر عام انسانوں کے دلوں سے اس کی یاد اُٹھ گئی ہے۔ آج نہ اس کی سلطنت باقی ہے نہ قصرِ سلطنت۔ اس کے برعکس اس دوسری شخصیت کو دیکھیے۔ ایک ادنیٰ نسل کا حبشی دنیا کے سب سے بڑے انسان کی صحبت سے فیض یاب ہو کر فضا میں ایک ایسی صدا بلند کرتا ہے جو آج بھی ہمیں ہر روز سنائی دیتی ہے۔ اذان اور اس کا پہلا مؤذن دونوں زندۂ جاوید ہیں اور وہ اس لیے کہ اس صدا کا مقصد انسانوں کو فاتح اور مفتوح یا کالے اور گورے میں تقسیم کرنا نہیں ہے، بلکہ بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، محتاج اور غنی، بندہ

اور آقا کی تمیز کو دُور کرنا۔ سب کو ایک دوسرے سے ملانا اور ایک ہی صف میں لا کھڑا کرنا ہے۔ اور ان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ وہ کچھ ہی کیوں نہ سمجھیں، انسانوں کی حیثیت سے سب برابر ہیں، اور وہ خدا جس کے وہ سب بندے ہیں، ان سب سے بڑا ہے اور اس سے بڑا کوئی نہیں۔

"طرابلس" والی نظم ایک خاص جذبۂ عقیدت سے معمور ہے۔ آخری بند ہے:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ایک ابتدائی نظم میں ہندوستان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

"ترانۂ ملی" میں ملتِ اسلامیہ کا سرچشمۂ الہام وہی ایک ذاتِ رسالت ہے جو تسکین اور توانائی دونوں کی ضامن ہے:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا　　اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

یہی جذبہ آپ "نغمۂ حجاز" میں بھی پائیں گے:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

حضورؐ کی ذات سے اقبال کو جو لگاؤ ہے وہ اتنا گہرا اور مستقل ہے کہ ان کا فکر و خیال اکثر بے ساختہ نعت کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ مثلاً اُن کا یہ شعر جو ایک مشہور غزل کا مقطع ہے۔

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

اقبال نے خدا سے مسلمانوں کی بد حالی کا شکوہ کیا اور اس شکوے کا جواب بھی سنا۔ "جوابِ شکوہ" کیا ہے، سارا جواب تو ایک ہی شعر میں موجود ہے، اور وہ اس نظم کا آخری شعر ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہی کیفیت "صدیقؓ" والی نظم کی ہے جس میں ابوبکر صدیقؓ کا حضورِ رسالت مآب کی خدمت میں اپنا سارا اثاثہ دین کے لیے قربان کر دینے کا ذکر ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

"جنگِ یرموک کا ایک واقعہ" میں یہی جذبہ جھلکتا ہے:

اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب
آکر ہوا امیرِ عساکر سے ہم کلام
اے بو عبیدہ رخصتِ پیکار دے مجھے
لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام

یہ جذبۂ سرفروشی، یہ شہادت کی تمنا، ذاتِ رسالت سے یہ والہانہ عقیدت نعت کی انتہا ہے، مگر یہاں بھی نعت براہِ راست نہیں کہی گئی ہے یعنی شاعر نے براہِ راست حضورِ رسالت مآب سے خطاب نہیں کیا۔ "بالِ جبریل" کی ایک غزل کا شعر ہے:

خبر ملی ہے یہ معراجِ مصطفٰےؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس طرح کی بالواسطہ نعت ایک فنی نزاکت اور شاعرانہ بلاغت کی حامل ہے، جو براہِ راست مدحِ رسولؐ میں مشکل سے ملتی ہے۔ براہِ راست اور بلاواسطہ نعتیہ خطاب ہر شاعر کے بس کی بات بھی نہیں۔ یہ کام حالیؔ، اقبالؔ، سعدیؔ اور جامیؔ جیسے شاعر ہی کر سکتے ہیں۔ اقبالؔ نے بلالؓ کے واسطے سے بھی رسولؐ کو دیکھا ہے۔ اور خود بھی حضورِ رسالت مآبؐ میں باریابی کی سعادت حاصل کی ہے۔ "بالِ جبریل" ہی میں دو ایک مقام ایسے ہیں جہاں شاعر خود دربارِ رسالت میں حاضر ہے، اور دل کے جذبے کو الفاظ کا جامہ پہنا کر خیر البشرؐ کے حضور میں زبان کھول رہا ہے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

اور حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کے بعد انھوں نے جو نظم کہی ہے، اس کے چند شعر تو ایسے ہیں کہ انھیں نعت کی معراج کہنا چاہیے:

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل جس نے غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ جذب و مستی میں وہی اوّل وہی آخر وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

اس کے بعد وہ منزل ہے جہاں اقبال مسلمانوں کے تشتت و افتراق اور ان کی زبوں حالی سے افسردہ خاطر ہو کر ذاتِ رسالت سے توجہ اور امداد کے ملتجی ہیں۔ یہاں ان کی التجا فریاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ شاید وہ مقام ہے جہاں وہ آقائے دوجہاں کی ذاتِ گرامی سے بہت زیادہ قریب ہیں۔

شیرازہ ہُوا اُمتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

اس راز کو کر فاش اب اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ خدا سے امداد کا طالب ہوتا ہے مگر سہارا رسولؐ کا لیتا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کسی وقت بھی ادبیا۔ اللہ کے زمرے میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں سمجھے گئے۔ ساری عمر ڈرامے لکھے۔ شعر کہے اور زندگی کی رنگینیوں سے وابستہ رہے۔ مگر جب قوم کی زبوں حالی نے انھیں بے قرار کیا اور دُکھے ہوتے دل کی پکار نے "شکریہ یورپ" کی صورت اختیار کی تو اُنھوں نے خدا کو رسولؐ ہی کا واسطہ دیا۔

خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوبؐ کی اُمت میں ہیں

نعت گویوں کا کوئی تذکرہ کرامت علی شہیدی رحمتہ اللہ علیہ کے ذکرِ خیر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ وہ حج کو گئے اور بعد ادائے حج مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے اثنائے راہ میں بیمار ہُوئے لیکن بیماری کی حالت میں بھی مدینے تک پہنچ گئے۔ وہاں روضۂ مبارک کو دیکھتے ہی اُس عاشقِ رسولؐ نے فرطِ اشتیاق سے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ پروانہ اپنی ہی آگ میں جل بجھا۔ ان کا ایک شعر ہے :۔

تمنّا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

یہ شعر خدا جانے کس وقت کہا تھا کہ پیش گوئی کی طرح پُورا ہوا۔ اقبال نے حجاز میں موت مانگی تھی، شہیدی کو خاص مدینے میں ملی :

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدای بخشندہ

ہمارے زمانے میں محمد علی جوہر مرحوم عشاقِ رسول میں سے ہوگزرے ہیں۔ ان کی زندگی اخلاص اور ایثار سے پُر تھی۔ ان کا ایک نعتیہ شعر تبرک کے طور پر ہدیۂ قارئین ہے:

جب اپنی پُوری جوانی پہ آگئی دنیا
تو زندگی کے لیے آخری پیام آیا

حسرت موہانی اپنی مستقل مزاجی اور عشقِ رسول میں محمد علی سے بھی آگے ہیں۔

حسرت مجھے اس جانِ جہاں سے ہے تعلق
سمجھے کہ نہ سمجھے کوئی جانے کہ نہ جانے

پاکستان کے قومی ترانے کے شاعر نے ولادت رسولؐ پر جو چند شعر کہے ہیں وہ بھی عقیدت کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشعار کا حفیظ کی شاعری اور اُردو کے نعتیہ کلام میں ایک خاص مقام ہے۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبؐ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے ظلِّ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی

نعت مشہور نعت گویوں کے کلام میں کم ملتی ہے، اور غیر نعت گو شعرا کے ہاں مقابلتہً زیادہ۔ غالب کے تین شعر جنھیں لوگ اکثر غزل کے شعر خیال کرتے ہیں، غور سے دیکھیے تو نعت کے سوا کچھ نہیں ہیں، اور نعت بھی کس پائے کی!

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

پہلے شعر میں "الفقر فخری" کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے دو شعروں میں معراج کی طرف۔

محسن کاکوروی عمر بھر دامنِ رسولؐ سے وابستہ رہے۔ ان کا کلام تقریباً تمام تر نعت ہی پر مشتمل ہے، لیکن جو نعتیں انھوں نے رسمی اہتمام اور روایتی شان و شکوہ سے کہی ہیں ان کا وہ رُتبہ نہیں، جو ان کے بے ساختہ کلام کا ہے۔

"سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل" والا قصیدہ بڑے ٹھاٹھ کی چیز ہے اور اس کا حسن مطلع بہت مشہور ہے۔

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل　　میرے ایمانِ مفصل کا یہی ہے مجمل

مگر محسن کے اس قصیدے اور ان کی بہت سی دوسری نعتوں سے زیادہ مؤثر ان کی وہ نظم ہے جو انھوں نے ایک لمبی اور خطرناک بیماری سے شفا پانے کے بعد فی البدیہہ کہی اور جو نظرِ ثانی سے بھی محروم رہی۔ ابتدا کے چند شعر سنیے :-

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا تڑپنے لگا دل اچھلنے لگا ۔
زمیں پر مرے آنسو آنے لگے فلک تک مرے نالے جانے لگے

محسن اپنے مرض الموت کا ایک خیالی نقشہ کھینچتے ہیں :-

چلی آتی ہیں ہچکیاں دم بدم
مجھے یاد کرتے ہیں اہلِ عدم

اس کے بعد انھوں نے چار یا پانچ شعر ایسے کہے ہیں جو ان کے سارے نعتیہ کلام کا حاصل ہیں :

خفا ہو کے محسن نہ پھیریں مجھے فرشتوں سے کہہ دو نہ گھیریں مجھے
زمیں نے کیا کچھ نہ جانا کبھی بجز سجدۂ آستانِ نبی

جس بے تکلفی، جس عقیدت، جس اعتماد سے محسن کاکوروی نے یہ شعر کہے ہیں وہ ان کی نجات کے لیے کافی ہیں ۔

سیّد انشا ایک بحرِ مواج تھے۔ جدھر جی چاہا چل دیے۔ غزل، ہزل، مدح، ہجو سبھی کچھ کہا۔ مگر ایک آدھ نعت بھی ایسی کہہ گئے ہیں، جو ان سے یادگار ہے۔ دیکھیے کیا پاکیزہ کلام ہے۔

آپ خدا نے جب کہا صلِّ علیٰ محمدٍ کیوں نہ کہیں پھر انبیا صلِّ علیٰ محمدٍ
عرش سے آتی ہے صدا صلِّ علیٰ محمدٍ نورِ جمالِ مصطفےٰ صلِّ علیٰ محمدٍ
صلِّ علیٰ نبیّنا صلِّ علیٰ محمدٍ

چودھری دلورام کوثری کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ آخر عمر میں کوثر علی کوثری ہو گئے تھے۔ مگر ہندو رہے جب بھی اور مسلمان ہوئے جب بھی، ان کی ساری عمر مدحِ رسول میں گزری۔ اپنے آپ کو فخریہ حسّانِ ثانی کہتے تھے۔ ایک نعت کے چند شعر ہیں :

مجھے نعت نے شادمانی میں رکھا
کہ مدحت نے شیریں بیانی میں رکھا
میں ملکِ سخن کا ہوں شاہ ....
قلم کو مری .... میں رکھا

کوثری اپنی نعت گوئی پر نازاں ہیں۔ دیکھیے انھوں نے اپنا مقابلہ حسان بن ثابت سے کس طرح کیا ہے :

نبیؐ کے ہوئے نعت گو دو برابر کہ دونوں کو ...... میں رکھا
ہے حسّان پہلا تو میں دوسرا ہوں! نہیں فرق اوّل میں ثانی میں رکھا

ہندو شعرا اور بھی بہت سے ایسے ہیں جن کے ہاں نعتیہ کلام موجود ہے اور بلند پایہ ہے اور اس لحاظ سے قابلِ داد ہے کہ انھوں نے اختلافِ مذہب کے باوجود جناب رسالت مآب کے مرتبے کو جانا اور پہچانا۔

ہمارے زمانے میں تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، بال مکند عرش ملسیانی اور دوسرے ہندو شعرا نے نعتیں کہی ہیں مگر ان میں سب سے اونچا مقام پنڈت ہری چند اختر مرحوم و مغفور کا ہے۔ ان کی وہ نعت بڑی مشہور ہے جس کا مطلع ہے:

کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

اور اس کا آخری شعر تو نعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا:

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

اس میں کسے شک ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی بعثت کا مقصد خود انسانیت کے معیار کو بلند کرنا تھا، مگر اس غیر مسلم کی سعادت کا کیا کہنا جس کی بصیرت نے ہم مسلمانوں سے بڑھ کر حضورؐ کی سیرت کے اس پہلو کو دیکھا، سمجھا اور سمجھایا۔

ہماری نئی نسل کے شعرا کا کلام بھی نعت کی دولت سے خالی نہیں ہے اور یہ ہمارے اور اُن کے لیے باعثِ سعادت ہے۔ اُن کی نعتوں میں رسم و روایت کی وضعداری کی بجائے ایک دلی خلوص نظر آتا ہے۔ اور یہ اردو زبان کے لیے ایک درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

اب تک میں نے اُردو نعت کا ذکر کیا ہے لیکن اُردو کے شاعروں کی نعت گوئی کے مقام کا اندازہ کرنے کے لیے بہتر ہوگا کہ فارسی اور عربی کی نعت پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ یہ اس لیے بھی مفید ہے کہ اُردو نعت پر عربی اور فارسی دونوں کا اثر ہے۔ عربی کا کم اور فارسی کا زیادہ۔ فارسی شاعری میں سعدی، خسرو، جامی اور اقبال کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ سعدی کہتے ہیں:

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور دیکھیے:

کریم السجایا جمیل الشیم — نبی البرایا شفیع الامم
امامِ رسل پیشوائے سبیل — امینِ خدا مہبطِ جبرئیل
شفیع الوریٰ خواجۂ بعث و نشر — امام الہدیٰ صدرِ دیوانِ حشر
یتیمی کہ ناکردہ قرآں درست — کتب خانۂ چند ملت بشست
تو اصلِ وجود آمدی از نخست — دگر ہرچہ موجود از فرعِ تست

ان کے نزدیک حق و باطل کی تمیز کا معیار بھی محض رسول کی تعلیم اور اسوۂ رسول کی پیروی ہے:

محال است سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز در پیِ مصطفیٰ
خلافِ پیمبر کسی رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

یہی بات ہمارے زمانے میں اقبال نے کہی:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

سعدی کے ہاں شاید فارسی سے بھی بڑھ کر ان کے عربی اشعار کا درجہ ہے اور ان کے یہ شعر تو زندۂ جاوید ہیں:

بلغ العلےٰ بکمالہٖ   کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ   صلوا علیہ و آلہٖ

جتنی شہرت ان شعروں کو ہوئی ہے وہ غالباً کسی بھی زبان میں نعت کے کسی اور شعر کو نہیں ہوئی۔ خسرو سراپا سوز ہیں اور جس انداز سے حضور کا تذکرہ ان کی زبان پر آتا ہے وہ ان کی سوختہ جانی کا آئینہ دار ہے:

نمی دانم چہ منزل بود شب جای کہ من بودم
بہ ہر سو رقصِ بسمل بود شب جای کہ من بودم
خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جای کہ من بودم

ان کی ایک مشہور غزل بھی اصل میں نعت ہے اور کس درجے کی نعت:

اے چہرۂ زیبای تو رشکِ بتانِ آزری
ہر چند وصفت می کنم در حسن ازاں بالاتری
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
آفاقہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری
خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہرِ شما
باشد کہ از بہرِ خدا سوی غریباں بنگری

رہے اقبال تو انھوں نے براہِ راست نعت اُردو سے زیادہ فارسی میں کہی ہے۔ "رموزِ بیخودی" کے آخر میں "عرضِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ جوشِ عقیدت کا مرقع ہے۔

اے ظہور تو شباب زندگی جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
اے زمین از بارگاہت ارجمند آسمان از بوسہ بامت بلند
شش جہت روشن ز تاب روی تو ترک و تاجیک و عرب ہندوی تو

محمد عربیؐ کی شخصیت اور ان کے پیغام کی آفاقی اہمیت کو اقبال کے سوا اور کون ایسے مختصر اور رسیدہ سادے لفظوں میں بیان کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس کا حق تھا اسی کو ملا۔

اقبال کے فارسی کلام میں جابجا جو اشارے ملتے ہیں وہ ایک مستقل نعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً مصطفےٰ کمال پاشا کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

امتی بود کہ ما از اثر حکمت او
واقف از سر نہانخانۂ تقدیر شدیم

وہ پہلی جنگ عظیم کے بعد حجازی عربوں کی دنیائے اسلام کے مفاد سے بے وفائی کا گلہ کرنا چاہتے ہیں، مگر اپنے آپ کو روک دیتے ہیں اور کیوں؟

متاع قافلۂ ما حجازیاں بردند
ولی زبان نہ کشائی کہ یار ما عربی است

ایک اور شعر میں یہی دل کی بات اور انداز سے کہی ہے:

در قبای عربی خوشترک آئی بہ نگاہ
راست بر قامت تو پیرہنی نیست کہ نیست

اقبال جہاں ذاتِ خداوندی سے مخاطب ہیں وہاں بھی ان کے لیے نعت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے:

تو بر نخل کلیمی بی محابا شعلہ می ریزی تو بر شمع یتیمی صورت پروانہ می آئی

عبد اور معبود کے فاصلے کے باوجود خدا اور رسول اقبال کے لیے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں:

با خدا پوشیدہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ او پنہاں و تو پیدای من

"اسرارِ خودی" میں جہاں ارتقائے خودی کا بیان ہے وہاں اس ارتقا کی منزل بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔

شعلہ ہای او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت

مسلمان کا جو تعلق رسولؐ کی ذات سے ہے اُسے اقبال ہی بیان کر سکتے تھے:

در دلِ مومن مقامِ مصطفیٰ است آبروی ما ز نامِ مصطفیٰ است

اور اگر کہیں یہ خیال آتا ہے کہ اپنے اعمال کی وجہ سے قیامت کے دن رسولؐ کے سامنے میں پناہ نہ ملی تو کیا ہوگا:

ست مٹی گر بدست مولای ما

وای ما لے وای ما اے وای ما

جاوید نامے میں اقبال نے جنت کی بزم سجائی ہے اور بہتوں کو جمع کر دیا ہے۔ اس محفل میں بہت کچھ ہے اور جو کچھ ہے بہت خوب ہے۔ میں صرف تین اشعار پر اکتفا کروں گا۔

غالب کی زبان سے اقبال نے کہلایا ہے:۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتد است

رحمت للعالمینی انتہا است

یہ غالب کے اسی شعر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ للعالمینی ہم بود

پھر وہ حلاج کی زبان سے کہلاتے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

ان چند شعروں میں حقیقت اور معرفت عشق رسالت اور عرفانِ محمدؐ سورج کی طرح تاباں اور درخشاں ہے۔ اقبال کے لیے تخلیق کائنات کی ساری غرض و غایت ذاتِ مصطفویؐ ہے۔ اور سارا عالم امکان اسی ایک محور کے گرد گھوم رہا ہے۔

اقبال نے نعت میں بہت کچھ کہا ہے، اور اپنی انفرادیت کی شان پورے طور سے برقرار رکھتے ہوئے کہا ہے، لیکن ذیل کے اشعار میں پوری سیرت النبیؐ بیان کر دی ہے:۔

طور موجی از غبارِ خانہ اش کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

در شبستانِ حرا خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز دیدۂ او اشکبار اندر نماز

در دعای نصرت آمین تیغِ او قاطعِ نسلِ سلاطین تیغِ او

از کلیدِ دین درِ دنیا کشاد ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد

در نگاہِ او یکی بالا و پست

با غلامِ خویش بر یک خوان نشست

اس سے بڑھ کر "ارمغانِ حجاز" کی رباعیوں پر نظر ڈالیے تو وہاں سوزِ عشق کی کچھ اور ہی کیفیت ہے ۔ سرکارِ دو عالم کے خوف سے اقبال خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کے اعمال کا سرکار کو علم نہ ہو ۔

به پایان چون رسد این عالم پیر
شود بی پرده هر پوشیده تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجه ما را
حساب من ز چشم او نهان گیر

ان کی وہ رباعی بھی دیکھیے جہاں وہ عالمِ تخیل میں حج کو گئے ہیں اور کعبے سے مدینے جانے کا قصد رکھتے ہیں:

تنم وا ماند و جانم در تگ و پوست
سوئے شہری کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش این جا و با خاصان بیامیز
کہ من دارم ہوای منزلِ دوست

فارسی میں غالباً اقبال کی بہترین نعت "جوئے آب" ہے جو جرمن شاعر گوئٹے کی مشہور نظم "نغمۂ محمد" کا آزاد ترجمہ ہے ۔ گوئٹے اسلام، قرآن اور جنابِ رسالتمآبؐ کی ذات سے گہرے طور پر متاثر ہے ۔ "نغمۂ محمد" ایک غیر مسلم کی تصنیف ہونے کے باوجود دنیا کی بہترین نعتوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے ۔ اقبال کا فارسی ترجمہ اقبال اور گوئٹے دونوں کی روحانی بصیرت اور شاعرانہ عظمت کا آئینہ دار ہے ۔

در راهِ او بهار پری خانه آفرید　　نرگس دمید و لاله دمید و سمن دمید
گل عشوه داد و گفت یکی پیشِ ما بایست　　خندید غنچه و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنای جلوه فروشانِ سبز پوش　　صحرا برید و سینهٔ کوه و کمر درید

زی بحرِ بیکرانه چه مستانه می رود
در خود یگانه از همه بیگانه می رود

صد جوی دشت و مرغ و کهستان و باغ و راغ　　گفتند ای بسیطِ زمین با تو سازگار
ما را که راه از تنک آبی نبرده ایم　　از دستبردِ ریگِ بیابان نگاه دار
وا کرده سینه را به هواهای شرق و غرب　　در بر گرفته همسفرانِ زبون و زار

زی بحرِ بیکرانه چه مستانه می رود
با صد هزار گوهرِ یک دانه می رود

دریای پرخروش ز بند و شکن گذشت　　از تنگنای وادی و کوه و دمن گذشت

یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را　　از کاخ شاہ و بارہ و کشت و چمن گزشت
بیتاب و تیز و تند و جگر سوز و بیقرار　　در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

جس وضاحت اور خوب صورتی سے یہ نظم جناب رسالت مآبؐ کی سیرت کی یکسوئی، انسانیت نوازی اور ایک مسلسل اور مستقل تخلیقی جدوجہد کی عکاسی کرتی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ آخری بند کا تیسرا شعر خود حضورؐ کے اس قول کا آئینہ دار ہے کہ من استوی یوماہ فھو مغبون۔ جس شخص کے دو دن ایک ہی جیسے گزر جائیں وہ بڑے گھاٹے میں ہے۔

فارسی کے سارے نعت گو شعرا کا تذکرہ کرنا میرے محدود علم اور وقت سے باہر ہے۔ مگر ایک آدھ اور شعر کے ذکر کے بغیر تسلی نہیں ہوتی۔ حافظ نے کوئی مستقل نعت نہیں کہی، مگر غالب کی طرح غزل میں چلتے چلتے ایک آدھ نعتیہ شعر کہہ جاتے ہیں تو بڑے بڑے نعت گویوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں:

نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت　　بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

یا

اگرچہ عرض ہنر پیش یار بی ادبیست　　زباں خموش و لیکن دہاں پر از عربیست

جامی کا پایہ نعت میں بلند ہے۔ نمونے کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

نسیم الصبح زرمنی ربی نجد وقبلہا　　کہ بوی دوست می آید ازاں پاکیزہ منزلہا

اور یہ شعر بھی غالباً انہی کا ہے۔

لا یمکن الثناء کما کان حقہ　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جامی کے دو اور شعر سنیے:

خوشا مسجد و منزل و خانقاہی　　کہ در وی بود قیل و قال محمدؐ
بہ صدق و صفا گشتہ بی چارہ جامی　　غلام غلامان آل محمدؐ

جامی کی فریاد بھی سننے کے قابل ہے۔ اور آج بھی حسب حال ہے:

اے بہ سراپردۂ یثرب بخواب　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب
دیدۂ عالم بہ تو روشن شود　　گلخن گیتی بہ تو گلشن شود

اور یہ فریاد کرنے والا شاعر اپنے رسول سے کیسے دل میں کھب جانے والے انداز میں خطاب کرتا ہے:

بندۂ تو ہم عجم و ہم عرب　　اے عربی نسب و امی لقب
گرد سرت بطحی و یثربی　　خاک درت مشرقی و مغربی

فیضی کے افکار اور کردار کے بارے میں لوگوں کی جو رائے بھی ہو، اس میں شبہ نہیں کہ اس کا دل حبِ رسولؐ سے معمور تھا۔ اس نے جو نعتیہ اشعار کہے ہیں وہ محض الفاظ کی صنعت گری نہیں، واردات قلبی ہیں۔

فیضی کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

اُمّی و دقیقہ دانِ عالم ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ بی سایہ و سائبانِ عالم

اور ذیل کے اشعار تو تاریخِ نعت کا قابلِ فخر حصہ ہیں:

ما طائرِ قدسیم نوا را نہ شناسیم ‌‌‌‌ مرغِ ملکوتیم، ہوا را نہ شناسیم
برہانِ ثبوتیم زما نہی نیاید ‌‌‌‌ از ما نغم آموز کہ لا را نہ شناسیم
با اہلِ جدل نکتۂ توحید نہ گوئیم ‌‌‌‌ در وحدتِ حق چون و چرا را نہ شناسیم
در کشفِ حقائق سبق آموزِ ضمیریم ‌‌‌‌ ترتیبِ دلیلِ حکما را نہ شناسیم

اصحابِ یقینیم گمان را نہ پسندیم
اربابِ صوابیم خطا را نہ شناسیم

اور آخر میں یہ کہ:

بر دانشِ ما انجم و افلاک بخندند
گر صاحبِ لولاک لما را نہ شناسیم

غالب کے ہاں فارسی میں بھی نعتیہ کلام موجود ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہر کس قسم بہ آنچہ عزیز است می خورد ‌‌‌‌ سوگندِ کردگار بہ جانِ محمدؐ است
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است ‌‌‌‌ اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

اور مقطع کیا خوب کہا ہے:

غالب ثنای خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

گرامی۔ فارسی زبان کے مایۂ فخر شاعر تھے۔ متاخرین میں اقبال کے علاوہ ان سے بڑا کوئی شاعر برصغیر میں نہیں پیدا ہوا۔ ان کے دو شعر ہیں:

خاور دمد از شبم بہ این تیرہ شبی ‌‌‌‌ کوثر چکد از لبم بہ این تشنہ لبی
اے دست ادب کہ در حریمِ دلِ ماست ‌‌‌‌ شاہنشہِ کونین رسولِ عربیؐ

اور قدسی کی نعتیہ غزل کس کو یاد نہ ہوگی، جس کا مطلع ہے۔

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی ‌‌‌‌ دل و جاں بادفدایت چہ عجب خوش لقبی

کسی اور کا شعر ہے۔ یاد نہیں کس کا:

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمی

ایک اور شاعر نے دیکھیے کیا البیلا شعر کہا ہے:

دل از عشقِ محمدؐ ریش دارم
رقابت با خدای خویش دارم

فارسی کے نعتیہ اشعار کا تذکرہ ایسا ہے کہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اُردو کی وہ نعتیں، جن میں سے بعض کا تذکرہ میں نے کیا ہے اور جنھیں میں اُردو کی بہترین نعتیں سمجھتا ہوں، ایک مجموعے کی صورت میں خوشنما انداز سے چھاپی جائیں تاکہ ہم ان کے ذریعے از سرِ نو محمد عربیؐ کی شخصیت سے آشنا ہو سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ موجودہ مجموعے کی اشاعت سے میری یہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ اس مجموعے میں کوشش کی گئی ہے کہ اُردو کی قابلِ قدر نعتیں یکجا کر دی جائیں۔ غیر مسلم شعرا کا کلام خاص طور پر شامل کیا گیا ہے۔ مسلمان شعرا کا کلام جس حد تک حاصل ہو سکا اس کا انتخاب مجموعے میں شامل ہے۔ البتہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ایسے نعتیہ کلام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس میں خدا اور بندے کا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس مجموعے میں ان نعتوں کو جن کا تعلق یا تو کردارِ رسالت اور ختمی مرتبت کے اسوۂ حسنہ سے ہے یا ذاتِ رسالت سے گہری دل بستگی کا اظہار ہے عام روایتی غزل نما نعتیں جو ذاتِ رسالت کو زیب نہیں دیتیں انھیں حتی الامکان منتخب نہیں کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب ایک ذاتی نوعیت کا ہے جس کی بنیاد لازماً میرے ذاتی ذوق پر ہے۔ اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور میری تو یہ تمنا ہے کہ ایسے اور انتخاب بھی چھپیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے اس سے بہتر ہوں گے۔

یہی کام اب فارسی، بنگالی اور پاکستان کی دوسری زبانوں میں بھی انجام پانا چاہیے۔ بنگالی میں قدما کے علاوہ خود ہمارے زمانے میں قاضی نذرالاسلام نے یادگار نعتیں لکھی ہیں اور ان میں کہیں کہیں ایسے شعر بھی ہیں جنھیں اردو بھی کہا جا سکتا ہے اور بنگالی بھی۔ ایک نعت کا پہلا مصرع ہے:

نامِ محمدؐ بول

اسی طرح پنجابی، سندھی اور پشتو میں ایسی ایسی نعتیں موجود ہیں جن کی سادگی اور بے ساختہ پن کا تقاضا ہے کہ انھیں یکجا کیا جائے۔
عربی میں غالباً سب سے پہلی نعت حضرت ابو طالب بن عبدالمطلب کی ہے جس کا ایک شعر بہت مشہور ہے۔

وعرضت دیناً لا محالة انه
من خیر ادیان البریة دینا

اور غالباً سب سے بے ساختہ وہ اشعار ہیں جو مدینے کی لڑکیوں نے حضورؐ کی آمد پر گائے۔

طلع البدر علینا — من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا — ما دعی للہ داع

نعتیہ اشعار حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب، جناب خدیجۃ الکبریٰؓ، جناب سیدۃ النساءؑ، جناب ابوبکر صدیقؓ، جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام، جناب عائشہ صدیقہؓ اور بہت سے اصحاب کبار اور ائمہ اطہار سے بھی منسوب ہیں۔

عربی میں چند نعتیہ قصیدے زبان زد خلائق ہیں یا تھے۔ ان میں بوصیری کا قصیدہ بردہ

امن تذکر جیران بذی سلم

اور کعب بن زہیر کا "بانت سعاد"

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول

سب سے زیادہ مشہور ہیں، مگر ان کے علاوہ بے شمار اشعار اور قصیدے نعت کے مضمون میں موجود ہیں۔ اگر ان کا انتخاب ایک مجموعے کی صورت میں چھپ سکے تو بہت اچھا ہو۔

میں لکھتے لکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لازم ہے کہ اپنی طبیعت پر جبر کرکے اس ذکرِ جمیل کو مختصر کروں۔ البتہ جی یہ ضرور چاہتا ہے کہ حسانؓ بن ثابت کا ایک ایسا شعر ادب پیش کروں جس سے بڑھ کر آج تک کسی زبان میں نعت کا کوئی شعر نہیں کہا گیا ہے۔ حسانؓ فرماتے ہیں:

خلقت مبرأ من کل عیب
کانک قد خلقت کما تشاءُ

یعنی اے محمدؐ تو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے، گویا تو بعینہٖ ایسا پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ تو خود چاہتا تھا۔

اس شعر کے کیا کہنے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ اجازت ہوتی کہ اللہ میاں سے یہ کہہ سکیں کہ ہمیں کیسا بنایا جائے، تو خدا معاف کرے بہت سی فرمائشیں کرتے۔ اپنی جسمانی، دماغی اور روحانی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا کس کو احساس نہیں ہے، اور ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کسی نہ کسی وقت یہ خواہش نہ کی ہو کہ کاش خدا نے مجھے یوں نہیں یوں بنایا ہوتا۔ مگر یہ تو ہم عام آدمیوں کی باتیں ہیں دنیا کے سب سے بڑے انسان نے اپنے متعلق کیا سوچا، یہ کون جان سکتا ہے اور پھر یہ تصور کہ اس انسان کو خدا نے اس کی اپنی خواہش اور معیار ہی کے مطابق بنا دیا، تو اس کو اور اس کی ذات کے کمالات کو کون پہنچ سکتا ہے؟

کراچی
۲۶ دسمبر ۱۹۷۳ء

دیباچہ "نعتوں کا مجموعہ خیر البشرؐ کے حضور میں"

تاریخ گوئی کے بارے میں

(ایک خط حفیظ ہوشیارپوری کے نام)

حامد حسن قادری

جناب مکرم۔ السلام علیکم

کرم نامہ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کا تذکرہ عزیزی خالد حسن قادری نے اکثر لکھا۔ مگر تعارف کی کوئی تقریب نہ نکلی۔ مدت کے بعد یہ بہانہ خوب نکل آیا۔ آپ کی تاریخ اخبار "الجمعیۃ" میں چھپی تھی۔ یہاں بھی لوگوں نے بہت پسند کی۔ میں نے طاہر فاروقی صاحب کو تعریف لکھی کہ اس مصرع پر خوب نظر پہنچی۔ بہترین تاریخ نکلی۔ اس کے بعد رسالہ "نقش" کراچی میں بھی آپ کی تاریخیں دیکھیں یہ بھی خوب ہیں تاریخ کا ایک تاریخی عنوان بھی نکلتا تھا ——— "شہادت کی تاریخ"

۱۵ ۱۹

میری تاریخ گوئی کا عجیب عالم ہے۔ علم و ادب کے مشاغل میں شاید تاریخ گوئی سے زیادہ فضول و غیر نافع کوئی شغل نہ ہوگا۔ مگر میں نے اس میں بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ پچاس سال سے زیادہ اس خبط میں مبتلا ہوں۔ کئی ہزار مادے نکالے ہیں۔ صدہا تاریخیں نظم میں ہوں اور مرتب ہیں تین ضخیم مجلدات قلمی تیار ہیں۔ قرآن مجید کی کم سے کم ۱۰۰ آیتوں سے تاریخیں نکالی ہیں۔

آپ نے میری جو تاریخیں ملاحظہ فرمائیں وہ مشہور لوگوں کی وفات کی ہوں گی۔ لیکن میں نے ان کے علاوہ بے شمار تاریخیں دوسرے حالات و واقعات کی لکھی ہیں۔ اپنے حالات۔ گھر کے واقعات۔ اعزہ و احباب کے معاملات روزمرہ کے اتفاقات کے متعلق کثرت سے تاریخیں کہی ہیں۔ بات سے بات، بات بات پر تاریخ کہی ہے۔ تاریخ گوئی کے لئے مجھے ہمیشہ کاغذ قلم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کالج جا رہا ہوں۔ راستے میں کوئی بات دیکھی۔ تاریخ کہہ دی۔ سونے کو لیٹا ہوں۔ کوئی بات یاد آگئی اور تاریخ ہوگئی۔ بعض تاریخیں آپ بھی سنیئے :-

۱- ایڈورڈ ہشتم کی تاج سے دست برداری کی تاریخ ——— "نذر سودائے عشق تاج کیا"

۱۹ء ۳۶

۲- خالد حسن کے بڑے بھائی ساجد حسن قادری کو امتحان میں یونیورسٹی سے طلائی تمغا ملا تو کہا :-

یافت او تمغا ز یونیورسٹی ——— یافتم تاریخ "تمغا یافتہ"

۱۹ء ۴۷

۳- ایک شخص نے آگرہ میں یہ کرتب دکھایا کہ دو شب و روز سے زیادہ برابر بائیسکل پر چکر لگاتا رہا۔ میں نے کہا۔

بریں مردانہ ہمت آفریں باد

مشہور مصرع ہے "آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ تو" اس میں سے (تو) نکالا تو سنہ نکل آیا۔ اور مصرع بھی مرتب ہوگیا۔

۴- خالد حسن قادری نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں دوسرے لڑکوں کی شرکت سے بڑی شاندار نمائش کی۔ میں نے تاریخ کے پورے شعر میں تاریخ نکالی۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے   مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

۳۲۴ + ۱۶۱۳ = ۱۹۴۱ء

۵۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے ایک جوتا بنوایا تھا۔ ان کے ایک عزیز کو پسند آیا۔ انہوں نے کہا تم لے لو۔ انہوں نے انکار کیا۔ میں بھی وہیں تھا جتنے میں ان کا اصرار و انکار ختم ہوا میرا قطعہ تاریخ تیار ہو گیا۔ اور سنا دیا۔

آپ نے کر لیا پسند اسے   ورنہ تحفہ یہ کیا ہے اور کیا نذر
آپ سمجھیں اگر نہ گستاخی   تو یہ تاریخ ہے کہ جوتا نذر

۱۳۹۰ھ

۶۔ ایک بزرگ صوفی شاعر کے دیوان کی تاریخ کہی تھی جو دیوان میں شائع ہوئی۔

"تاریخ یہ مجمع لطافت کہیے"

۱۹ ۔ ۴۴

اک مخزن انوار شریعت کہیے   آراستہ بستان طریقت کہیے
۱۴۰۲ ہجری   ۱۹۸۰ عیسوی
رنگ طرب راز حقیقت کہیے   کہیے کیا شاعری کرامت کہیے
۱۳۵۲ فصلی   ۱۳۹۳ ہجری

۷۔ سیماب اکبرآبادی مرحوم کے منظوم ترجمہ قرآن مجید کی تاریخ: "آگئی وحی نظم اردو میں" ۱۳۶۶ھ

۸۔ مجھے کئی ہفتے مسلسل بخار رہا تو کہا: کہ آجکل میرے پیچھے پڑا ہوا ہے بخار
۱۳۹۷ھ

۹۔ شفا ہوئی تو کہا:۔ کہ "شکر خالق عزوجل" "مجھ کو شفا بخشی"
۱۳۹۷ھ   ۱۳۹۷ھ

۱۰۔ بہت سے اعزہ چلے گئے تو کہا:۔ "ہو گئے خاندان بارہ باٹ" ۔ ۱۳۹۸ھ۔

۱۱۔ پرمٹ جاری ہوا تو کہا:۔ "ہوا ہے بیٹنے پرمٹ ضروری" ۱۹۴۹ء

۱۲۔ کراچی میں ایک عزیز میرے جن کا چھوٹا کم عمر لڑکا مظہر الحق نام گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ پکڑ لانے پر پھر بھاگ گیا۔ ایک مرتبہ میں نے ان کو متعدد تاریخیں لکھی تھیں ایک یہ تھی۔ "اک یہ بھی ہے منظہر العجائب گویا۔" (آج کل بھی فرار ہے۔)
۱۳۹۶

۱۳۔ میں ہوائی جہاز میں اڑا تو کہا۔ "تخت پریوں کا ہوا پر دیکھو" ۱۹۴۸ء

۱۴۔ ایک عزیز بڑی عمدہ داڑھی رکھے ہوئے گئے۔ وہاں جا کر صاف کر دی۔ میں نے طویل دلچسپ قطعہ لکھا تاریخ یہ تھی:

"خس و خاشاک داڑھی کا نہیں آج"
۱۹

۱۵۔ ایک اور نوجوان عزیز وہاں ہیں بڑے متقی پرہیزگار عابد و زاہد لیکن داڑھی منڈاتے تھے۔ ابھی چند مہینے ہوئے انہوں نے داڑھی رکھ لی میں نے جستہ جستہ تاریخیں کہہ کر بھیجیں وہ یہ ہیں:۔ ۱۔ "با ریش و متقی و عابد و شاہد" ۲۔ "تقوے پہ کیا اضافہ ریش"
۱۳۷۰ھ   ۱۹ ۔ ۵۱

۱۶ - ایک سال عید میں قربانی نہ ہو سکی تو کہا — "عید اضحیٰ کیا جو قربانی نہو" - ۱۳۶۷ھ

۱۷ - گرمیوں میں ایک رات کو میں صحن میں بجلی کی روشنی میں بڑی دیر تک پڑھتا رہا، دو بجے کے قریب بجلی بند کی تو دیکھا کہ تمام صحن چاندنی سے بھرا ہوا ہے - پورا چاند ہے - بجلی کی تیزی میں چاندنی معلوم ہی نہ ہوتی تھی میری زبان سے نکلا۔ "سامنے بجلی کے غائب چاندنی" فوراً تاریخ کا خیال آگیا - اس مصرعے کے عدد نکالے تو پورے ۱۳۶۷ھ ہوئے!

۱۸ - ایک رات کو جب سونے کے لئے لیٹ گئے - باہر دروازے پر کسی فقیر نے صدائیں دینی شروع کیں - جاڑوں کا زمانہ - فقیر چلائے جاتا ہے اور یہاں کوئی اٹھتا نہیں - آخر بیوی اٹھیں اور چھوٹے لڑکے کو زبردستی اٹھا کر فقیر کو روٹی دلوائی - مجھے تاریخ کی سوجھی -

یہ شکر ہے نعمت خدا کا — محتاج کے دستگیر ہو تم
تاریخ کا یاد رکھو مضمون — "اک وہ ہے غنی فقیر ہو تم"
۱۹ — ۴۸ء

۱۹ - کالج کے لڑکوں نے امتحان سے اسٹرائک کر دی - میں نے کہا :-

یہ لڑکوں کی ہڑتال کیا اور کیوں — نہ عقل آئی تعلیم و تادیب سے
ہے آزادی ایسی تو تاریخ ہے — کہ "آزادیِ اخلاق و تہذیب سے"
۱۹ — ء — ۴۸

۲۰ - لڑکی کے ہاتھ میں بچھو نے کاٹ لیا - میں نے کہا - "یہی طبیعتِ کژدم کا اقتضا ہے یہی" ۱۹۵۰ء

۲۱ - ایک عزیز کو پچاس سال سے زیادہ کی عمر میں پہلی مرتبہ پتلون پہننے کا شوق ہوا میں نے خدمت میں عرض کیا -

تن گئے بھائی بھی پتلون میں آج — ان کی ٹانگوں کو سلاخیں کہیے
خوب پتلون کی نکلی تاریخ — "شجرۂ شوق کی شاخیں کہیے"
۱۹ — ء — ۵۰

۲۲ - گذشتہ رمضان میں اکثر مقامات پر ۲۹ روزے ہوئے آگرے میں ۳۰ ہوئے میں نے کہا -

روزوں میں ہمیں ہیں سب سے افضل — کیا کوئی ہماری کر سکے ریس
تاریخ یہ قادری ہے کیا خوب — "تیس ایک ہمارے سب کے انتیس"
۱۳ — ھ — ۷۰

۲۳ - ایک عزیز کو تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کا بہت افسوس تھا - میں نے کہا -

"ثالث بالخیر جاتیے آپ"
۱۹ — ۵۰

۲۴ - میں چھتری لگائے کالج جا رہا تھا - اتفاق سے بازار میں کسی کی پگڑی میں چھتری کی کانپ الجھ گئی اور ذرا مشکل سے نکلی راستے ہی میں یہ قطعہ ہو گیا -

آج الجھ کر کسی کی پگڑی سے — کانپِ چھتری کی بہ جبتی تھی مزاج
چلتے چلتے یہ ہو گئی تاریخ — "میری چھتری اٹک گئی خوب آج"
۱۹ — ۵۰

۲۵- اس کے بعد ایک دن مطلع صاف تھا۔ چھتری نہ لی۔ راستے میں یکایک بڑے زور کی گھٹا آگئی اور چند منٹ میں یہ تاریخ ہو گئی ——

"نہیں ہے آج ہی بارش میں چھتری" —— ۱۳۲۰ھ

۲۶- چند احباب میرے لئے آگرہ آرہے تھے۔ مگر حالات ایسے تھے کہ میں پذیرائی کے لئے تیار نہ تھا۔ تار دے کر روک دیا اور کہی میں نے تاریخ بھی ضمن تار "کہ سیر و تماشا کا موقع نہیں"

۱۳۲۰ھ

۲۷- ایک دوست ماش کی دال بالکل نہیں کھاتے۔ اور میں روہیل کھنڈ کا رہنے والا ہوں جہاں ماش کی دال اور ماش کی کھچڑی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ مہمان بے تکلف تھے۔ میں نے یہ تاریخ کہہ کر سنائی۔

ماش لاپرسوز روہیل کھنڈی — قدر نشناسیدا اگر غیر بود
دال آں خوردم و گفتم تاریخ — ماش الدال علی الخیر بود

یہ میں نے دو چار، پندرہ سال کی تاریخیں لکھ دی ہیں۔ شروع کے تیس پینتیس سال میں بھی اس طرح کے متفرقات ہیں۔ میری تاریخ گوئی کا آغاز اس صدی کے ساتھ ہوا۔ انیسویں صدی کے ختم اور بیسویں صدی کے آغاز پر چند ماہ کے اندر بعض بڑے آدمیوں کا انتقال ہوا۔ ملکہ وکٹوریہ، امیر عبدالرحمان خان والئ کابل۔ امیر مینائی۔ حکیم عبدالحمید خاں دہلوی (برادر حکیم اجمل خاں) رستم ہند غلام پہلوان۔ میں نے ہر ایک کی تاریخ کہی تھی۔ اور ان کے ساتھ ایڈورڈ ہفتم اور امیر حبیب اللہ خاں کی تخت نشینی کی بھی۔

امیر مینائی کی تاریخ ایک مشہور مصرع سے خوب نکلی تھی —— "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"
۱۸ ھ ۱۳

اور تاریخیں معمولی تھیں۔ مثلاً حکیم صاحب کی —— شد ہا غروب مہر طب یونان —— ۱۹۰۱ء

رستم ہند کی —— ندا آمد پئے سال از دل زار "شجاع و رستم ہندوستان مرد"
د = ۱ — ۱+۱۹۰۰ – ۱ = ۱۹۰۱ء

ایک عزیز کے مکان میں پانی کا ہینڈ پمپ لگا تو کہا:- "خزانہ آب شیریں کا ہے یا پمپ" ۱۳۲۷ھ

میں پہلی مرتبہ لاہور گیا تو شالامار باغ سے واپسی میں راستے میں تاریخ ہوئی —— "دیکھ کر آئے ہیں شالامار باغ"
۱۹۱۱ء

ایک بھائی پاس ہوئے "ہو گئے بی اے ظہیر عالم" —— ۱۳۳۰ھ

دوسرے بھائی نے الہ آباد سے ایل ٹی کیا —— "فریدی واہ تم استاد نکلے" ۱۳۳۲ھ

ایک دوست نے منشی فاضل پاس کیا —— "منشی فاضل ہوئے" ۱۳۳۲ھ

یہ خرافات کہاں تک لکھوں گا۔ مگر ایک لطیفہ اور سن لیجئے۔ میرے ایک کرم فرما ہیں۔ سید عابد کانپوری۔ بڑے عابد و زاہد۔ دراز ریش کسی اتفاق سے بچپن میں ان کا عقیقہ نہ ہو سکا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں ان کو خواب میں بشارت ہوئی کہ "عقیقہ کرو" انہوں نے فوراً تعمیل کی۔ سر منڈوایا۔ دو بکرے ذبح کئے۔ جشن کیا۔ لڈو بانٹے۔ مجھے کانپور سے صرف عقیقے کی اطلاع ملی۔ بشارت کا علم نہ تھا۔ ان حضرت سے میری ایسی بے تکلفی نہ تھی مگر اس لطیفے نے گدگدی پیدا کر دی اور میں نے یہ قطعہ ان کو لکھ بھیجا۔ انہوں نے جواب میں تعریف بھی کی۔ اور برا بھی مانا اور بشارت کا حال لکھا۔

مسنون ہے عقیقہ کوئی فرض تو نہیں — پیری میں کیا ضرور اسے لائیے بجا
زیبی دلی سے دور نہیں ہے مگر یہ جشن — ہاں شادیانے گائیے ڈھولک بجا بجا

عابد میں زہد خشک کا ہوا نہیں ضرور　　زندہ وہی ہے عیش کو جس نے نہیں تجا
تو شکل بن جواں تو بنا ہی سکے ہیں پیر　　تو ریشخند خلق پہ اے زندہ دل تجا
تاریخ یہ کہے جو کرئی تو برا نہ مان
"ریش دراز پہ یہ عقیقہ دیا عجب"
۴۹ ـــ ۱۲

ان تاریخوں کی مشق ہو گئی ہے۔ بے وقت ہو جاتی ہیں۔ مگر کبھی کبھی میں نے دشوار او مشکل تاریخیں بھی کہیں ہیں۔ ایک مرتبہ کسی تحریک پر صنعت زبر و بینات میں چند تاریخیں کہی تھیں۔ آپ واقف ہوں گے کہ یہ بڑی محنت کا کام ہے۔ اس میں ہر حرف کے اسم ملفوظ کے عدد لئے جاتے ہیں یعنی الف کا ایک نہیں بلکہ ۱۱۱ عدد لیتے ہیں مصطفیٰ کمال پاشا کو ۱۹۲۳ء میں لوزان کانفرنس کی سلح میں کامیابی حاصل ہوئی تو میں نے کہا تھا۔

اے کمال اکمل عصر بن لاریب　　عادل و شیر دل و دریا دل
ناخن زیرکی و ہمت تو　　حل کند عقدۂ کار مشکل
صلح در مجلس لوزان کردی　　بحقیقت شدہ فتح کامل
حامد اندر زبر و بینہ گفت　　کردۂ فتح بنیے حاصل
۱۳۴۱ھ

کاف ۔ را ۔ دال ۔ ہا ۔ فا ۔ تا ۔ حا ۔ میم ۔ با ۔ یا ۔ نون ۔ یا ۔ حا ۔ الف ۔ صاد ۔ لام

۱۰۱ + ۲۰۱ + ۳۵ + ۶ + ۸۱ + ۴۰۱ + ۹ + ۹۰ + ۳ + ۱۱ + ۱۰۹ + ۱۱ + ۹ + ۱۱۱ + ۹۵ + ۸۱ = ۱۳۴۱ھ

کبھی نئی ترکیب سے تاریخیں مرتب کی ہیں۔ مولانا احسن مارہروی کی تاریخ وفات کہی تھی۔

حضرت احسن نقاد و حکیم و عالم　　ہو گئے منزلت افزائے خلود جنت
بکرمی، عیسوی، ہجری و فصلی ہیں یہ سال "پاک دل" "قدوہ سادات" "دہ" "فخر حکمت"

۱۳۴۸ + ۱۱ فصلی
۱۳۵۹ + ۵۸۱ ہجری
۱۹۴۰ + ۵۷ عیسوی
۱۹۹۷ بکرمی

میں اپنی رو میں لکھتا چلا گیا۔ اب ملا کر سوچتا ہوں تو اپنے اوپر ہنسی آتی ہے۔ کہ لمبی چوڑی خود ستائی ہوئی بہر حال آپ کو تاریخ گوئی کا خاص ذوق و شوق ہے۔ اس لئے امید ہے کہ یہ تحریر دلچسپی سے خالی نہ رہی ہوگی۔

اس طرح کی متفرق اور معمولی باتوں کی تاریخیں میرے علم میں کسی نے اس کثرت سے نہیں کہیں۔ قدیم زمانے میں بھی مجھے ایک ملا عبدالقادر بدایونی ملے جنہوں نے بات بات پر تاریخ کہی ہے۔ اُن کی "منتخب التواریخ" اکبر بادشاہ کے عہد کی مشہور تاریخ ہے۔ یہ ۱۰۰۴ھ میں تمام ہوئی۔

اسی سال ملا صاحب نے رحلت کی۔ اکبر بادشاہ سے دو سال بڑے تھے اور دس سال پہلے وفات پائی۔ اکبر کے درباری و مصاحب تھے تاریخ کی دوسری جلد میں اکبر کی حکومت و سیرت کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ ملا صاحب نے اکبر کی دینداری بھی دیکھی اور بے دینی بھی۔ حالات کے ذیل میں جا بجا واقعات تاریخ یا صرف مادے بھی لکھے ہیں۔ اکثر اپنے بعض دوسروں کے۔ آپ بھی چند تاریخیں دیکھئے۔ میں نے تمام تاریخیں مع واقعات کے ایک عنوان یا کتاب کی صورت میں جمع کرلی ہیں۔ ۱۴۲ تاریخیں ہیں۔

۱۔ خان زمان جس سے اکبر بادشاہ کو سرکشی کا اندیشہ تھا خود حاضر ہو گیا تاریخ ہوئی — "الصلح خیر" ۹۶۹

۲۔ مولانا علاء الدین لاری نے آگرہ آکر درس و تدریس کے لیے خس پوش مدرسہ بنایا۔ "مدرسہ خس" ۹۶۹ھ

۳۔ کوہ سوالک کے پہاڑیوں نے حسین خاں کے لشکر پر زہر آلود تیر برسائے ملا صاحب نے تاریخ نکالی — "تیغ بے مزہ" ۱۰۳۰ – ۵۲ = ۹۷۸ھ

۴۔ اکبر بادشاہ ہر سال اجمیر شریف حاضر ہوتا تھا۔ آگرے سے اجمیر تک جا بجا مینار اور چاہ بنوائے تھے اور بادشاہ نے عمر بھر میں جو ہزاروں ہرن شکار کئے تھے ان کے سینگ ان میناروں میں لگوائے تھے اس مناسبت سے ملا صاحب نے تاریخ کہی "میل شاخ"۔ ۹۸۱ھ

۵۔ بادشاہ نے دین الٰہی کی بنیاد ڈالی تو کہا — "کفر شائع شد"۔ ۹۸۵ھ

۶۔ اس کے بعد راہ اجتہاد کھلی۔ تحلیل و تحریم موقوف ہوئی۔ اسلام کا نام تقلید رکھا گیا۔ وحی، نبوت، ملائکہ، معجزات وغیرہ سے انکار کیا گیا۔ تو ملا صاحب نے فرمایا — "فتنہائے امت"۔ ۹۸۷ھ

۷۔ پھر احکام شرع میں تغیر کیا گیا تو کہا — احداث بدعت۔ ۹۹۰ھ

۸۔ یہ فرمان شاہی صادر ہوا کہ علوم عربیہ ترک کرکے بجز نجوم و طب فلسفہ کچھ نہ پڑھا جائے ملا صاحب کیا خوب تاریخ نکالتے ہیں — "کساد فضل"۔ ۹۹۵ھ

۹۔ نوروز کی تقریب میں دیوان عام کو باتصویر پردوں سے آراستہ کیا گیا — "شبوت معصیت" — ۹۹۴ھ

۱۰۔ ایک شخص ملا احمد کی بے دینی بیان کرنے کے بعد ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ انہی حرکتوں کی وجہ سے ایک دن میرزا فولاد بیگ نے آدھی رات کے وقت اس شخص کو گھر سے باہر بلا کر قتل کر دیا۔ اس کی ایک تاریخ ہوئی — "زہے خنجر فولاد"، ۹۹۶ھ اور دوسری "خوک سقر" ۹۹۶ھ۔ اس کے بعد ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے یہ واقعہ سنا تو نہایت غضب ناک ہوئے۔ لیکن میرزا فولاد کی شجاعت کے قائل تھے اور تمام اہل حرم میرزا کی سفارش کرتے تھے اس لیے بادشاہ جان بخشی پر راضی معلوم ہوتے تھے۔ مگر اتفاق یہ ہوا کہ بادشاہ نے حکیم ابوالفتح کو میرزا کے پاس بھیجا کہ اس سے پوچھو "تو نے تعصب مذہبی کے سبب سے ملا احمد کو مارا ہوگا؟" میرزا نے جواب دیا کہ تعصب ہوتا تو اس سے بڑے پر ہاتھ ڈالتا۔ یہ جواب سن کر بادشاہ نے کہا "بد حرام زادہ ایست نباید زندہ گذاشت"۔ چنانچہ میرزا فولاد کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر تمام شہر لاہور میں گشت کرائی گئی حتیٰ کہ وہ درجہ شہادت کو پہنچے۔ اس کے بعد ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ملا احمد کی قبر پر محافظ مقرر کر دیئے گئے تھے۔ اس پر بھی اہل لاہور نے اس کی لاش کو قبر سے نکال کر جلا دیا۔

۱۱۔ تحویل نوروز اور آغاز سال جلوس شاہی سی و ہشتم کی تقریب میں بادشاہ نے کوشش اور اہتمام سے لوگوں کی داڑھیاں منڈوائیں ملا

صاحب نے تاریخ کہی ——— بگفتہ "ریش را بر باد دادہ مفسدے چندے" ۱۰۰۰ھ

۲۔ فیضی و ابوالفضل نے چار ابرو کا صفایا کرایا۔ تاریخ ہوئی "شریعتِ جدید" ۱۰۰۱ھ

۳۔ ملا صاحب اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ حق سبحانہ نے نبعض ملاہی و مناہی سے جن میں فقیر مبتلا تھا توبہ کرامت فرمائے۔ بطریق تفاؤل لفظ استقامت (۱۰۰۲ھ) سے تاریخ نکالی ملک الشعرا فیضی نے اس کی یہ تاریخ کہی۔

لَقَدْ تابَ شَیْخٌ مِنَ الحَوْبَۃِ فَتَارِیْخُہٗ: "سَابِقُ التَّوْبَۃ"

فیضی نے توبہ کی دوسری "ت" کے بھی ۴۰۰ عدد لئے ہیں۔ یہ اصل میں "ہ" ہے اور اس "ۃ" کے عدد اکثر پانچ لئے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے زمانے میں بھی بعضوں نے اس کے ۴۰۰ لئے ہیں مثلاً سر سید احمد خاں کی تاریخ کسی نے نکالی ہے۔ اِنَّ العَاقِبَۃ للمتّقِین اس میں "عاقبہ" کی "ت" کے ۴۰۰ لینے سے ۱۳۱۵ھ نکلتے ہیں۔

۴۔ بعض بڑے لوگ بادشاہ کے مرید اور چیلے ہوئے اور دین الٰہی قبول کیا اور داڑھی کو خیرباد کہہ کر جرد مرد (لنڈ منڈ) ہو گئے تو ملا عبدالقادر نے تاریخ کہی ——— مُوتراشِ چند ——— ۱۰۰۴ھ اس خامہ فرسائی کی آپ سے معذرت نہ کروں گا۔ اس لئے کہ ملا صاحب کی یاد تازہ کی ہے اور اس میں آپ کو شریک کیا ہے۔ یہ تو ملا جی کے لطائف التواریخ تھے۔ ان کے علاوہ معظم واہم واقعات ولادت و وفات و فتوح وغیرہ کی تاریخیں بڑی کثرت سے ہیں۔

ان باتوں میں آپ کے خط کا جواب رہ گیا۔ آگرے میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا اب صفر ہے۔ انتہا یہ کہ کچھ شعرا اچھے تھے وہ بھی ہجرت کر گئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آگرے میں اردو فارسی کی کتابوں کی کوئی بڑی دکان کبھی ہوتی ہی نہیں۔ چالیس سال سے تو میں دیکھ رہا ہوں۔ پہلے بھی نہ تھی۔ اس زمانے میں ایک دکان درسیات کے سلسلے کی تھی اس کے ذریعے سے ہم کالج کے لئے دوسری علمی کتابیں بھی دہلی لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ سے منگا لیتے تھے۔ اب وہ دکان بھی ختم ہوئی۔ اس کے مالک حال ہی میں ہجرت کر گئے۔

لیکن آپ کو جن کتابوں کی ضرورت ہو وہ میں مہیا کر سکتا ہوں۔ یعنی کتابوں کے نام آپ لکھئے میں نول کشور لکھنؤ اور دہلی وغیرہ سے منگا کر آپ کو بھیج دوں گا۔ قیمت ادا کرنے کی دشواری اس طرح حل ہو سکتی ہے کہ میں آپ کو کتابیں رجسٹرڈ بھیج دوں گا۔ آپ قیمت وہاں کسی کو بھیج دیجئے گا جس کو میں لکھوں۔ اس میں تبادلہ زر کا سوال پیدا نہ ہوگا اس لئے کہ یہاں کا روپیہ یہاں رہے گا وہاں کا وہاں دونوں روپے برابر سمجھ لئے جائیں گے۔ اس لئے آپ اس معاملے میں تردد نہ کریں۔

جامعہ ملیہ دہلی کی فہرست اس خط کے ساتھ بھیجتا ہوں اور فہرستیں بھی آپ کہیں تو حاصل کر کے اور بھیجوں۔

"جلوۂ خضر" عنقا ہے۔ مجھے اپنے لیے بھی نہ ملا۔ کالج میں بھی نہیں۔ قدیم تذکروں میں نکات الشعرا۔ ریاض الفصحا۔ تذکرۂ ہندی مصحفی۔ گلزار ابراہیم۔ چمنستانِ شعرا۔ گل عجائب غالباً مل جائیں گے۔ سب انجمن ترقی اردو کے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے پاس موجود ہوں۔ تصوف کے تذکرے۔ مکتوبات ملفوظات نئے کتبوں میں تو کہیں نظر نہیں آئے۔ ہاں نول کشور کے ان ہیں۔ اس کی فہرست منگا کر بھیجوں گا۔

والسلام

احقر حامد حسن قادری

وارداتِ سرمد

ڈاکٹر سید عبداللہ

واردات سرمد میں ہمیں ایک ایسا شاعر ملتا ہے جس نے "برائے شعر گفتن" شاعری نہیں کی بلکہ واردات قلبی کی سچی ترجمانی کرتے ہوئے جو کچھ لکھا بانداز خلوص لکھا۔ اس کے کلام میں، حسن و عشق کے تجربات بھی ہیں اور حیات و کائنات کے بارے میں فکری و جذباتی تصورات اور تجزیے بھی ہیں۔ میر تقی میر کے مانند یہ شاعر بھی "یا محبت" کہہ کے، غم دین و دل کا بارگراں بڑے حوصلے سے اٹھاتا نظر آتا ہے۔ وہ شعلوں میں شبنم اور آگ میں پھول اگانے کی حکمت جانتا ہے ..... زندگی کے راز جذبے کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ اور بھرپور سادگی و بے تکلفی سے فن کے دیئے روشن کرتا دکھائی دیتا ہے ...... وہ روایت کی لطافتوں کا شناسا ہے اور اس کے فن کی نمود روایتوں کے آئینے میں ہوئی ہے ..... اس کے یہاں الفاظ کا طلسم، بیان کا جادو، تغزل کی شیرینی اور لہجے کی شرافت، غرض ہر وہ شے موجود ہے جو اچھی غزل کے لئے ضروری اور برتر تہذیب کے لئے لازمی ہے۔ اس کے یہاں ہجر و وصل کے قصے، حکایتیں اور شکایتیں و نیازمے عاشقی کی پرانی ریت کے مطابق ہیں مگر شاعر کا اندازِ بیان بہرحال اپنا ہے ؎

ہیں وہی وصل و جدائی کے فسانے لیکن
پھر بھی سرمد کا ہے اندازِ جُدا کہتے ہیں

میں سرمد اور ان کی شاعری سے پہلی دفعہ روشناس ہو رہا ہوں اور یہ قدرتی بات ہے کہ نئے شاعر سے ذہنی تعارف پیدا کرنے میں خاصی دیر لگتی ہے اور یہ بھی قدرتی ہے کہ ایسے شاعر کی تخلیقات سے گہرا رابطہ پیدا ہونے سے پہلے قاری اس کے کلام کے بارے میں بیگانگی سی محسوس کرتا ہے بلکہ شاید صحیح یہ ہو کہ وہ اپنے مطالعہ کا آغاز قدرے تعصب سے کرتا ہے .... یہ تعصب (شاید نادانستہ) یوں پیدا ہوتا ہے کہ قاری کے نگارخانہ ذہن میں پہلے ہی بہت سی تصویریں موجود ہوتی ہیں۔ لہٰذا کسی نئے نقش کے ابھرنے پر اس کے سامنے اہم یہ سوال ہوتا ہے کہ اس نئی تصویر کو اس نقش کدے میں جگہ کہاں دی جائے اور یہ بھی کہ جگہ دینے کے لئے کوئی جواز بھی ہے یا نہیں۔ خصوصاً جب کہ اس شاعر کا نام اس سے پہلے ایک مرتبہ بھی سننے میں نہ آیا ہو۔

میں نے کچھ ایسے ہی جذبات سے "وارداتِ سرمد" پر نظر ڈالی مگر یہ حقیقت ہے کہ میں اس دیوان کے مطالعہ میں جتنا آگے بڑھتا گیا میرا تعجب دلچسپی میں بدلتا گیا... تعجب اس امر کا تھا کہ یہ شاعر اب تک کیوں چھپا رہا؟ اس کے جاننے والوں نے اس گنج مخفی کو باہر کیوں نہ نکالا ...... اور خود شاعر کے لئے (جو اظہار و ابلاغ پر مجبور اور اس کے لئے مضطرب ہوا کرتا ہے) یہ کیونکر ممکن ہوا کہ اس نے اتنی دیر... ...... بلکہ تمام عمر، پردے میں رہنا گوارا کیا اور وہ اپنے کلام و پیام کو باہر کی دنیا سے چھپاتا رہا.... یہ بڑے بڑے سوال تھے جن کو سوچ کر میں تعجب کرتا رہا۔ ان سوالوں کے باوجود، کلام مانوس ہوتا گیا اور وہ لطائف سامنے آتے گئے جو کسی شاعر کو قاری کا منظورِ نظر بنا سکتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ وارداتِ سرمد کے شروع میں شاعر کے فرزند یحییٰ امجد کا لکھا ہوا ایک دیباچہ ہے۔ میں نے اسے دانستہ نہ پڑھا تاکہ میں اس نئے شاعر سے براہِ راست آگاہی حاصل کروں ..... اور دیوان کے داخلی نقوش کے ذریعے سے نقش کار (نقاش) تک خود پہنچنے کی کوشش کروں۔

مجھے ان نقوش کے اندر ایک پرکشش شخصیت نظر آئی - یہ وارداتِ سرمد کے شاعر کی شخصیت ہے .... محبتوں اور عقیدتوں کے شاعر کی شخصیت جس کے نزدیک زندگی ذوقِ نظر اور ناموسِ وفا کا نام ہے اور حسن و عشق ادب گاہِ زندگی کے چند ایسے لمحوں سے عبارت ہیں جن میں پھول کھلتے ہیں مگر یہ وہ مقام ہے جہاں گل چینی کے آداب، اپنی ایک شریعت رکھتے ہیں .... یعنی بقولِ عرفی یہاں کا معمول دیدن ہے چیدن نہیں - ہاں نگاہ اور ذوقِ نگاہ کے لئے اس چمن کی ساری وسعتیں کھلی ہیں ؎

عشق کیا ہے فقط ایک ذوقِ نظر
حسن کیا، ایک طرزِ بیاں دوستو

سرمد کے نزدیک زندگی بذاتِ خود بھی ذوقِ نظر کے سوا کچھ نہیں ؎

ہے حقیقت میں سرمد یہ ذوقِ نظر
ورنہ کیا خیر و شر، ورنہ کیا زندگی؟

حسن و عشق .... بلکہ "خود زندگی" کے بارے میں، یہ نقطۂ نظر، قلب کی ایک خاص تہذیب اور نظر کے بعض خاص آداب سے ابھرا ہے جس پر مسلمانوں کے پچھلے معاشرے میں خاص زور دیا جاتا تھا - اس زمانے میں کردار ایک خاص سانچے میں ڈھالے جاتے تھے اور وہ سانچا خود اخلاقی صوفیانہ مشرب اور دین داری کے اصولوں اور ضابطوں کے ذریعے تیار ہوتا تھا۔

سرمد کی شاعری میں ایک ایسی ہی شخصیت، ایک ایسا ہی کردار بڑا نمایاں نظر آتا ہے - وہ شاعر ہے جو زندگی کی حقیقت دیا ہے وہ محبت کرتا ہے مگر آدابِ محبت کا بھی پاس کرتا ہے ..... وہ ایک ذمے دار شاعر ہے، وہ زندگی کو ایک تفویض ایک امانت خیال کرتا ہے۔ وہ دل کی توقیر رکھتا ہے اور اس کے معنی سمجھتا ہے ..... وہ غمِ دل کا شاعر ہے مگر غمِ دین سے بھی بے نیاز نہیں ...... وہ ہستی کی ناپائیداری کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کے حسن و دلکشی کا بھی معترف ہے ...... زندگی اس کی نظر میں شعلہ بھی ہے اور شبنم زادہ بھی ...... یہ شاعر ان تینوں وادیوں سے گزر کر شاعر بنا ہے۔

سرمد کے کلام میں (مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں) ایک طرح کی "انتخابیت" ہے یعنی اس میں پرانے اساتذہ کے مختلف رنگ ملتے ہیں (... اور شاعر نے اس کا بھرپور اعتراف بھی کیا ہے) ..... میں نے یہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کہ سرمد پچھلے شعرا میں سے کن خاص شاعروں سے زیادہ متاثر یا فیض یاب ہوئے ہیں - سرمد کے یہاں میر، مصحفی، درد، حسرت، اقبال، فراق اور فیض کے لہجے بہت نمایاں ہیں۔ سرمد ان میں سے میر تقی میر کے سب سے زیادہ مداح ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ میر کی ہمہ رنگی، گہرا المیہ احساس، حقائقِ زندگی کے گوناگوں انکشافات، زبان و بیان کی سادگی و پرکاری .... یہ سب ناقابلِ گرفت اور ناقابلِ احاطہ خصوصیات ہیں جن کے بارے میں سرمد نے خود کہا ہے ؎

کس درجہ منفرد رہا اندازِ میر کا
یاروں نے زورِ طبع دکھایا تو کیا ہوا

سرمد مقامِ میر کسی کو نہ مل سکا
کتنے ہی یوں تو صاحبِ دیوان ہو گئے

اگرچہ یہ تسلیم ہے کہ میر کا انتخابی رنگ اپنانا سہل نہیں (بلکہ سچ یہ ہے کہ ناممکن ہے)، تاہم اگر سرمد کے لئے ممکن ہوتا تو وہ میر ہی کے نقشِ قدم پہ چلنے کی کوشش کرتے .... چنانچہ ایک موقعہ پر صاف کہہ بھی دیا ہے کہ ؎

یہ سوز و سازہ، یہ اندازِ سرمد
مرا دل بھی ہے گویا میر کا دل

سرمد نے میر کی زمین میں متعدد غزلیں لکھی ہیں میر کے کئی لہجے اپنائے ہیں مگر بعض لمحات میں یہ بھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ میر ان کے لئے ذوق افزا نہیں چنانچہ ؎

سرمد کلامِ میر سے تسکیں نہ ہو سکی
میں گرچہ معترف بھی ہوں اُن کے کلام کا

..... بایں ہمہ یہ امر واقعہ ہے کہ میر کے نقشِ قدم پہ چلنے کی آرزو سرمد کو ستاتی رہی لیکن یہ ممکن اس لیے نہ ہوا کہ جہاں میر کا کلام رنگ رنگ کے مضامین کا بحرِ ناپید کنار ہے وہاں سرمد کے کلام میں ایک طرح کی یک رنگی ہے، لہٰذا ان کے یہاں رنگِ میر کچھ کھلا نہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود سرمد تغزل کا ایک خاص معیار قائم کرتے نظر آتے ہیں .... اور جس میں روایت کی چاشنی کے ساتھ نئے دور کے ایک آدمی کا مزاج کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔

سرمد کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ وہ دین و دل کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں دین و دل کی سرگزشت ملی جلی ملتی ہے۔ جذبۂ دینی و حمیتِ قومی کا یہ رویہ انھیں، اقبال کی قومی شاعری کی طرف لے جاتا ہے اور ان سے خطاب بہ مسلمان لکھواتا ہے .... کبھی امیر جماعتِ اسلامی سے اظہارِ عقیدت کرتا ہے اور کبھی اظہارِ ناراضگی۔ کبھی پاکستان کے حق میں نظمیں لکھواتا ہے۔ گویا کلام میں جذبۂ محبت کی لطافتوں کے ساتھ اس ذمے داری کا احساس بھی ہے کہ وہ مسلمان ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ مسلمان ہو کر اس کے سماجی فریضے کیا ہیں؛ وہ ملت کی سربلندی اور دین کی اقامت کا طلب گار ہے اور ان سب غایتوں کا پُرجوش داعی ہے جو دینِ اسلام سے وابستہ ہیں۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سچا دینی جذبہ بھی بہرحال (بلکہ حقیقتاً و اصلاً) جذبۂ عشق و محبت ہی کا ایک انعکاس ہے۔ اس جذبے کا منبع بھی وہ خلوصِ عقیدت ہے جس کا دوسرا نام عبودیت اور نیازِ عشق ہے، یہ جذبہ قلبِ انسانی کو سرشار رکھتا ہے اور عاشقانہ اوصاف پیدا کرتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کی اعلیٰ ترین شاعری کسی نہ کسی دینی جذبے ہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ سرمد کا دینی جذبہ ان کی حمد و نعت میں کھل کر نمودار ہوتا ہے۔ ان کی حمدیہ نظموں میں ایک عارف کا عرفان اور ایک عاشقِ حقیقی کی عبودیت نظر آتی ہے .... ان کی نعتوں میں ایک اضطرابِ شوق ہے

جو ادب کے دامن سے بندھا ہوا ہے...... ذاتِ رسول کا یہ عاشق مقامِ رسالت کا شناسا ہے۔

ان کے دیوان میں اگرچہ ایسی نظموں کی تعداد کم ہے مگر جتنی ہیں ان میں وہ ایک نیاز آئین، صاحبِ عشق و عرفان شاعر معلوم ہوتے ہیں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ سرمد دین و دل کے شاعر ہیں اور اس معاملے میں اگر وہ مظہر جانجاناں کی صف میں رکھے جائیں تو شاید یہ غلط فیصلہ نہ ہوگا۔ مظہر وہی برگزیدہ ہستی ہیں جنہوں نے عاشقی بھی کی اور شاعری بھی، اور اس تیغِ ستم کو بھی چوم لیا جو آشفتگی کے ہر میدان میں، اہلِ دل کی منتظر رہتی ہے۔ وہ جرمِ دین داری میں شہید ہوئے اور حیاتِ ابد پا گئے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

غزل گو سرمد

سرمد کے کلام سے فوراً یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ شاعر غزل گوئی کی تمام مسلمہ روایتوں سے آگاہ اور فنِ غزل کے جملہ تقاضوں سے باخبر ہونے کے علاوہ، فیاضِ ازل سے وہ مزاج بھی لے کر آیا تھا جو رچی ہوئی غزل گوئی کے لیے ضروری ہے۔

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ سرمد کے یہاں انتخابیت ہے یعنی ایک خاص قسم کی اثر پذیری..... اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ شاعر جس روایت یا جس خاص شاعر سے متاثر ہوتا ہے اس کا رنگ اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ مصحفی اور آگے چل کر حسرت کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کا نقش جلد قبول کرتے ہیں..... بلکہ فارسی شاعری کی حد تک اور اسلوب کے دائرے میں اقبال بھی سابقوں کے نقش قبول کرتے ہیں..... تو یہ کوئی عیب کی بات نہ ہوئی۔ چنانچہ کلامِ سرمد میں، کہیں اعتراف کے ساتھ اور کہیں بلا اعتراف بہت سے شعرا کے نقوش موجود ہیں۔

سرمد نے پرانے شعرا میں سے، میر، جرأت، مصحفی اور نئے زمانے کے شعرا میں حالی و اقبال اور جدید میں فراق، فیض اور جگر کا اعتراف کیا ہے..... حسرت کی زمین میں بھی چند غزلیں ہیں اور کئی غزلوں میں اس کی غزل کے خاص لہجے اپنائے گئے ہیں۔

مقصد اس گفتگو سے یہ ہے کہ سرمد غزل کی روایت سے بخوبی آشنا اور اچھی غزل کے رموز و لطائف سے پوری طرح باخبر ہیں۔

مگر اس سے یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ سرمد نے مذکورہ شعرا کی محض نقل کی ہے یا ان کا رنگ چرایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ سرمد کی غزل کا ایک منفرد شخصی نقش بھی ہے جو کچھ تو مخصوص طرزِ احساس میں اور کچھ خاص طرزِ بیان اور خاص لہجے میں منعکس ہوا ہے۔

یہ طرزِ احساس، ''آگ میں پھول کھلانے'' کی حکمت ہے یعنی غم اور کرب کو (بزنگِ تسلیم و رضا) شادمانی بنانے کا تجربہ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ؎

سینے میں چراغِ درد روشن چہرے پہ سکون کی ضیائیں

کیا جانے وہ آئیں یا نہ آئیں ہم آگ میں پھول کیا کھلائیں

تو معلوم ہوا کہ شاعر کا دل درد و کرب سے معمور ہے مگر ماتھا کھلا ہے..... چہرے پر سکون ہے..... گفتگو میں وقار بھی ہے اور گھلاوٹ

ہو ..... شاعر ایک جگر دار آدمی ہے جو آگ کے شعلوں کو گل گلزار بنا رہا ہے ...... یہ جگر داری کا رویہ شاعر نے زندگی کے مکتب سے سیکھا ہے ۔ وہیں سے یہ تربیت بھی پائی ہے کہ صد ہزار غموں اور دکھوں کے باوجود، اوروں کے لئے غم کا زہر نہیں گھولنا چاہیے، بات میٹھی اور حوصلہ افزا ہی کرنی چاہیے ..... یہ طرزِ احساس اور یہ رویہ شاعر کی غزل میں مسلسل اور ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے، وہ خود کہتے ہیں :

ہم کرب کو نغموں میں سموتے رہے سرمدؔ
اس حسنِ تغزل کا صلہ جانیے کیا ہے ؟

سرمدؔ کا غزلیہ کلام ایسے ہی کرب سے نکلے ہوئے نغموں پر مشتمل ہے ...... اور یہ نغمے زندگی کے بارے میں اس نظریے سے پیدا ہوئے ہیں ۔ زندگی طوفان تو ہے مگر اس کے عقب میں، لطافتوں کے چمن بھی کھلے ہوئے ہیں ..... اور زندگی کے شعلوں کے متوازی شبنم کی آسودگی بخش لطافت بھی ہے ؎

زندگی شعلہ بھی ہے شبنم بھی ہے طوفاں بھی ہے
گرچہ پل بھر کا بھی سرمد آسرا کوئی نہیں

اب معلوم ہوا کہ سرمد کی نظر میں زندگی کرب آمیز ہونے پر بھی بڑی سہانی ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ ناپائیدار ہے، اس کی حیثیت ایک "نیم نگاہ" سے زیادہ نہیں ..... یعنی وہ حسین ادا جسے آدمی عمر بھر یاد رکھے، اسے یہ بھی احساس ہو کہ اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے مگر مقدر میں بس یہی ہے یہی ایک چھلک ..... یہی ایک تبسم ..... یہی ایک رکی ہوئی نگاہ (اور بقول میر ۔ ع ۔ ہے مگر اس میں بھی تامل سا) ۔

بیان ہو چکا ہے کہ سرمد کے احساس کے مطابق، زندگی محض ذوقِ نظر ہے ..... مگر اسے کیا کہیے کہ یہ ذوقِ نظر بھی "نیم نگاہ" تک ہی ہے ۔ سرمد نے اپنے اس احساس کی تشکیل و تجسیم کے لیے آنکھ اور نگاہ کی دو علامتوں سے کام لیا ہے ۔ خصوصاً نیم نگاہی کی، چنانچہ انہوں نے اپنی غزل میں حسن کی جو بھی اور جتنی بھی ستایش کی ہے اس میں سب سے زیادہ نیم نگاہی کی ادا کو موضوعِ سخن بنایا ہے ۔ یہ نیم نگاہی، حیا اور مجبوری کی ترجمان ہے ۔ یہ وہی ہے جسے غالب نے بھی تیرِ نیم کش کہا تھا ۔

سراپائے محبوب میں آنکھ اور نگاہ کی کشش کا کون معترف نہیں مگر سرمد کے کلام میں اس نرگسِ بیدار کے لئے توصیف[1] کا جو عالم ہے وہ اپنا خاص رنگ رکھتا ہے ۔ اور اس سے بڑھ کر وصف کیا ہو سکتا ہے کہ شاعر کی نظر میں وہ "چشمِ سرمہ سا" گویا خدا کی کتاب ہے ؎

---

[1] نیم نگاہی کے اشعار :

کم نگہی کی آن سلامت — اک عالم کو یونہی تڑپاؤ
وہ اک خموش نگہ ایک داستانِ جمال — یہ سوچتے ہی رہے ترکِ مدعا کرتے
نگہ اٹھاؤ کہ رک جائے ایک پل شاید — کہ زندگی تو اڑی جاتی ہے ہوا کی طرح

—

ہے باعثِ زیست بلکہ خود زیست — اور یوں وہ سادہ سی نظر ہے

تقدیرِ حسن و عشق اسی میں ملی مجھے
وہ چشمِ سرمہ سا بھی خدا کی کتاب ہے

اس شعر کو پڑھ کر ولی دکنی (یا اورنگ آبادی) کی ستایشِ حسن کے انداز یاد آ جاتے ہیں جن میں اسی قسم کی لطیف تشبیہات سے کام لیا ہے۔ سرمد نے شرمسار آنکھ کی کرشمہ زائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا ۔

سرِ مد جھکی وہ آنکھ ندامت سے جس گھڑی
نظارہ دیدنی تھا دلِ بے قرار کا

حجاباتِ شوق کی روش گذر رہی آن پہ بارسی   چہرہ بھی تھا ملول سا چشم بھی شرمساری سی

دل میں یوں ڈوب گئی شامِ فراق   تیری خاموش نظر ہو جیسے

دل پہ سو بار قیامت گزری   ہر نظر پہلی نظر ہو جیسے

کچھ تم بھی دے نہ سکے سہارا نگاہ کا   کچھ تھے بھی بے پناہ ستم روزگار کے

گذارش ہے کہ چشم سرمہ سا اور نیم نگاہی کی بات ضمناً آگئی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ سرمد کے طرزِ احساس میں تشنہ کامی اور محرومی کی ایک دبی دبی لہر پائی جاتی ہے ۔ اور یوں خیال گزرتا ہے کہ زندگی ان کے لئے ناتمام بھی ہے اور اس میں بھی ایک طرح کا جبر اور مجبوری ہے جس کی ترفیع کے لئے وہ قدیم عارفوں کی طرح، رضا تسلیم کو وسیلہ بناتے ہیں ۔ یہ "جبر رضا آفریں" کوئی نیا مسلک یا مشرب نہیں اکثر اہل درد اور اہلِ استقامت نے بالآخر، اسی نسخۂ شفا سے دوا پائی ہے اور اسی کی مدد سے وہ زندگی کے زہر کو اکسیر بنا کر مقاصدِ حیات کے لئے توانائی حاصل کرتے رہے ...... سرمد نے اپنے حالات و حوادث میں یہ تجربہ حاصل کیا ہے جو نظری نہیں عملی تحصیل ہے ۔ بہر حال مجبوری کا یہ احساس سرمد کی کئی غزلوں میں نمایاں ہے ۔ درجِ ذیل شعر والی ساری غزل، اس خاص شعور کی ترجمان ہے ؎

ستم بھلانے پڑے، آہ تھام لینی پڑی   بپاسِ خاطرِ احباب مسکرانا پڑا

اسی مجبوری و محرومی کی ایک شکل یہ ہے کہ باہمہ قرب اور باہمہ نزدیکی، تشنہ کامی کا احساس غالب ہے ۔

میں انتہائے قرب میں بھی ان سے دور تھا   دل کا قصور تھا کہ نگہ کا قصور تھا

بے مہر کتنی گردشِ لیل و نہار ہے   رہ کر ترے قریب بھی دل سوگوار ہے

سرمد کے یہاں احساس کا یہ تموج بے جہت اور حادثاتی نہیں ایک فلسفۂ زندگی سے ابھرا ہے جس کی تہذیب تجرباتِ حیات اور حوادث

سے ہوتی ہے۔ ان کی غزل کے برگ ہائے پریشاں کو جمع کیجیے تو ان کی تالیف سے آگہی . . . . یعنی منظم شعور کی ایک صورت نمودار ہوتی ہے۔

جو لوگ غزل کو محض حسن و عشق کی کہانی سمجھتے ہیں وہ اس صنف کی رمز سے بے خبر ہیں۔ غزل صرف شیریں فرہاد کی داستان محبت نہیں، یہ ایک اجتماعی اسلوب، ایک تہذیب، ایک طرزِ زندگی، ایک طورِ احساس، ایک مشرب، ایک منہاجِ دانش، ایک میزانِ ادب ہوتی ہے جس میں شاعر (غزل گو) باندازِ لطف و ایما رموزِ حیات و کائنات بیان کرتا رہتا ہے کسی کے یہاں۔ یہ آگاہی واضح اور واضح تر . . . . اور کسی کے یہاں مخفی اور زیرِ سطح ہوتی ہے۔ مگر ہوتی ضرور ہے اور اس کا انکشاف ہمدردانہ تجزیے ہی سے ہو سکتا ہے۔

سرمد کی غزل میں آگہی کے کچھ آئینے چمک رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو احساس کا فیض ہیں اور کچھ تعبیر و شعوری تجزیے کا فیضان۔

شاعری میں جب بھی آگہی کا ذکر آتا ہے وہاں اس سے مراد وہ آگہی نہیں ہوتی جو کسی فلسفی کی منطق یا حکیم کی برہان سے پیدا ہوتی ہے بلکہ اس سے مراد جذبے کی وہ ترفیع و تطہیر ہوتی ہے جو قلب کی سچائی سے مل کر یقین کی ایک شکل اختیار کر لیتی ہے خواہ منطق اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ یہ کبھی محض سادہ اور معلوم حقیقتوں کو تعبیرِ نو کے ذریعے نئی صورت عطا کرتی ہے۔ کبھی فکر کی مدد سے، ان حقیقتوں کا تجزیہ کر کے مخفی سچائی کا منہ دکھاتی ہے، کبھی تجزیے کے بعد اپنا ایک نظامِ استدلال تیار کرتی ہے جس سے صداقت ایک منظم فکر کی صورت میں برآمد ہوتی ہے

سرمد کی آگہی میں احساس کے آئینے جذبے کے پرتو سے روشن ہوتے ہیں مگر ان جذبوں میں حد درجہ سچائی، حد درجہ خلوص ہے۔ ان کی نظر میں زیست لذتِ احساس کا دوسرا نام ہے ؎

زیست ہے لذتِ احساس وگرنہ انسان   ہے وہ تنکا کہ ہوا جس کو اڑا لے جائے

وہ اپنی غزل میں صرف یہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے زندگی میں کیا دیکھا، کیا پایا . . . . اور اس "پانے" کے لیے کیا کچھ کھویا۔ زندگی کی حد کیا ہے؟ کیا اس میں کچھ ہے بھی یا یہ محض فریبِ نظر (ذوقِ نظر) اور فریبِ خیالی (طرزِ بیان) ہی ہے یا کوئی برتر حقیقت بھی اس میں جلوہ فگن ہے؟

سرمد نے متعدد غزلوں میں اس راز سے (اپنے احساس کی روشنی میں) پردہ اٹھایا ہے چنانچہ درج ذیل شعر والی پوری غزل نکتۂ زندگی کی تفسیر پیش کرتی ہے ؎

بے تعارف زندگی بے وفا زندگی   ہے کسی ماہ جبیں کی ادا زندگی

یہ اشعار بھی ساتھ ہی پڑھ لئے جائیں تو مدعا زیادہ واضح ہو جائے گا ؎

ہو اگر بے نیازِ منا زندگی   ہے یہ خواب حقیقت نما زندگی

ہے حقیقت میں سرمد یہ ذوقِ نظر   ورنہ کیا خیر و شر، ورنہ کیا زندگی

مگر شاعر کو یہ احساس بھی ہے کہ اس ذوقِ نظر کے سلسلے میں کہیں بہاریں ہیں تو کہیں خارزاریں بھی ہیں ؎

یہ زندگی ہے شعلہ بھی شبنم بھی آہ بھی   عنوان بے شمار مری داستاں کے ہیں

کتنے طویل سلسلے وہم و گماں کے ہیں   نازک ہے دل کا آئینہ، غم دو جہاں کے ہیں

جو نقش ہے جاذبِ نظر ہے   کیا جانیے کس کی رہگزر ہے ؟

کتنی حسین ہے زندگی فانی نہیں ہے زندگی   کس کی یہ جلوہ گاہ ہے کس کی یہ رہگزار ہے

یہ سفرِ ہستی ہے جو وقت کی ناؤ میں کائنات کو منزل بہ منزل پے بہ پے اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے . . . . تغیر، وقت (دہر) کا مقدر ہے اور تلون احوال، دنیا کی ہر شے کا نصیبہ . . . . . اسی کا نام سلسلۂ خیر و شر ہے ، یہی فراق و وصال کی کہانی ہے ، اسی کے اندر غم و طرب کے قصے ، ورق و ورق پھیلے ہوئے ہیں - سرمد کی یہ غزل ان سب خیالات کی آئینہ دار ہے ؎

وقت گو کروٹیں بدلتا رہا   آرزو کا چراغ جلتا رہا

یاس تھی ہر قدم پہ دامنگیر   دل اُلجھتا رہا سنبھلتا رہا !

تھی کٹھن بے حساب راہِ حیات   تو مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا

ہم نشاط و غمِ فراق میں گم   سلسلہ خیر و شر کا چلتا رہا

لذتِ آگہی غنیمت تھی   لحظہ لحظہ جہاں بدلتا رہا

رہگزر اجنبی سی تھی لیکن   دل بڑی تمکنت سے چلتا رہا

آرزو تو حسین تھی سرمد
زیست کا رنگ کیوں بدلتا رہا

سرمد کے یہاں آگہی کی حد یہی ہے . . . . اور اس کے باوجود انہیں اس امر کا بھی پورا احساس ہے کہ ان کی یہ آگہی کہیں محض پندارِ آگہی ہی نہ ہو . . . . . یہ سرمد کا انکسار ان کا خلوص ہے !

بہرحال یہی سفینے ، یہی آبگینے ، یہی آئینے وارداتِ سرمد کے اوراق میں ہیں . . . . . اور دیوان کے ہر ہر صفحے کو روشن کر رہے ہیں -

اب بات اسلوبِ غزل اور زبان و بیان کی آتی ہے - پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سرمد غزل کی روایت اور اس کے لہجوں سے پوری طرح باخبر ہیں . . . . . اور اس اسلوب پر قادر ہیں جو ایک اچھے غزل گو اور معیاری تغزل کے لیے ضروری ہے اور پوری ذمے داری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرمد فنِ غزل گوئی کے باخبر شناساؤں میں سے ہیں ، وہ یہ جانتے ہیں کہ غزل کے مزاج سے متناسب الفاظ چرب و تراکیبِ نغز و شیریں سے کلام میں کس طرح گھلاوٹ پیدا کی جا سکتی ہے - ان کی غزل میں ایما و اشارہ استعطاف و التفات اور کنایہ و رمز کے وہ جملہ لطائف موجود ہیں جو کلام کو بامزہ بنا رہے ہیں - وہ بار بار جن پرانے اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں ان کے کلام کے پہلو میں ، ان کا کلام بھی تربیت اور تہذیب اور حسنِ بیان کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے . . . . . اور اس پر تواضع ، بے تکلفی ، انکسار اور خلوص و نیاز کا یہ عالم ہے کہ شاعر کے بیان تعلی اور پندارِ فن کا شائبہ تک نہیں ملتا - گویا سرمد کا فن ، اظہارِ عجز ہے نہ کہ پندارِ آگہی . . . . . یہی شرافت سرمد کو ایک امتیازی مقام عطا کرتی ہے - وہ اپنی غزل کے بارے میں خود کہتے ہیں ؎

نہ تھا عرضِ غم کا جو حوصلہ تو غزل مسلکِ بحر رہا   جو امینِ رازِ نشاط تھے ، وہی اشکبار چلے گئے

ایک خاص بات یہ ہے کہ میں سرمد کی بے ساختگی اور سہل نگاری سے خاص طور سے متاثر ہوا ہوں . . . . . شاعری ایک ایسا فن ہے جس کے ہزار پہلو ہیں مگر سہولت اظہار پر قدرت، ایک ایسی ودیعت ہے جو کسی کسی کو میسر آتی ہے ۔

یہ معلوم ہے کہ سہل نگاری کی بھی کئی قسمیں ہیں' ایک سہل برائے خواص ہوتا ہے یعنی خواص ادبا جسے سہل سمجھتے ہیں، دوسرا سہل برائے خاص و عام ہوتا ہے کہ عام خواندہ اہل ذوق اسے سہل سمجھتے ہیں اور خواص بھی اسے عامیانہ نہیں سمجھتے ۔ تیسرے سہل برائے عام ہے جو خواص کی نظر میں عامیانہ بن جاتا ہے یعنی جس میں سہولت کی خاطر ادبی لطافت ضائع کر دی گئی ہو اور آخر میں چوتھے سہل ممتنع ہے کہ جس کی سہولت لطافت ادبی کی ہم رکاب رہتی ہے ۔ اسی حد تک کہ اس کی تقلید ممکن نہیں ہوتی یا کلام کو سہل رکھ کر اس سے زیادہ بلیغ اور سہل نہیں بنایا جا سکتا ۔

یہ آخری مرتبہ بہت کم شاعروں کو ملا ہے . . . . . سرمد نے چونکہ میر تقی میر سے فیض خاص پایا ہے اس لئے سہولت کے وہ انداز جو میر سے مخصوص ہیں کچھ سرمد کے یہاں بھی آ گئے ہیں ۔ صرف فرق یہ ہے کہ میر کے سہل اشعار پہلو دار اور تہ دار ہیں اور سرمد کے کلام میں پہلو داری زیادہ نہیں . . . بیان ایک ہی معنی تک پہنچاتا ہے اس میں دوسرے مطالب کی طرف چھپے ہوئے اشارے نہیں پائے جاتے ۔

دامن کو جھٹک کے جانے والے   تو جاں سے بھی قریب تر ہے ۔
ہر گام نئی تڑپ نیا جوش   کیا جانیے کون ہم سفر ہے
دل مائل گریہ پھر ہے سرمد   شاید شب غم کی یہ سحر ہے
دل میں ہیں ہزار آرزوئیں   اور فرصت عمر مختصر ہے

سرمد کے حسن بیان میں مناسب اور توجہ خیز ردیف بندی کا بڑا حصہ ہے، مگر ان کی ردیفیں ہیجانی و طوفانی اور گھن گرج والی نہیں بس ابر دیا معنی کے سلئے ہیں اور ان کی مدد سے لطیف سا ترنم پیدا کرنا مقصود ہے . . . . . ان کے یہاں لمبی بحروں والی بھی چند غزلیں ہیں ان میں بھی ملائمت، اور "نرم سیر" آہنگ ہے جو شاعر کی طبیعت کی لطیف رومانیت کے مطابق دھیمی موسیقی کا اہتمام کرتا ہے . . . . . بہت سی ردیفیں جدید شعرا کے انداز کی ہیں . . . . اور کچھ پرانے شاعروں (میر، حسرت اور فیض و فراق وغیرہ) کی ۔

اچھی غزل کو پرکھنے کا میرا ایک ذاتی معیار بھی ہے . . . . . اور وہ یہ ہے کہ دوران مطالعہ جس شاعر کے بہت سے اشعار خود بخود دل میں سما جائیں اور بلا سعی و تکلف یاد ہو جائیں میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ کم از کم میرے اپنے تاثراتی معیار کے مطابق، یہ میرے قلب کے ترجمان ہیں ۔ یہ بالکل قدرتی امر ہے کہ یہ محض ذاتی پسند کا معاملہ ہے مگر اس ذاتی پسند کے مسئلے کو بھی سرسری سمجھ کر ٹالا نہیں جا سکتا کیوں کہ اس ذاتی پسند میں گہری جاذبیت اور کشش شامل ہوتی ہے جو بلا سعی اور بے ساختہ (بلکہ جبر سے) قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے ۔ شعروں کا از خود یاد ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں . . . . . . اس میں قاری سے زیادہ شاعر کی قوت تسخیر کا عمل دخل ہوتا ہے ۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس میں شاعری کے اس بڑے حصے کا مطالعہ بھی شامل ہوتا ہے جس نے کم از کم یہ تو سکھا ہی دیا ہے کہ کس شاعر اور کس شعر کو یاد رکھا جا سکتا اور کیسے اشعار از خود دل میں بیٹھ جاتے ہیں . . . . . قبول شعر میں یہ قاری کا حصہ ہے مگر شعر کی اپنی تسخیر و تاثیر کے بغیر یہ بھی ممکن نہیں ۔ اگر اس معیار کی کوئی وقعت ہے تو اس اعتراف میں کوئی مضائقہ نہیں کہ واردات سرمد کے مطالعہ کے دوران مجھے بہت سے اشعار از خود یاد ہو گئے تھے جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس شاعری میں کوئی نہ کوئی جادو ضرور ہے ۔

ایک معیار اور بھی ہے اور وہ ذاتی تاثر سے ذرا وسیع تر دائرے سے متعلق ہے۔ میں نے اساتذہ سے سنا ہے کہ جو اشعار اتنے زبانزد ہو جائیں کہ خطاب و مدعا کا مقبولِ عام عنوان بن سکیں ان کی خوبی میں کلام کی گنجائش نہیں ہوتی ..... کلام کا عنوان وہی اشعار بن سکتے ہیں جن میں کسی تجربے کی آفاقی سچائی اور حسنِ بیان نے مدعا کو قبولِ عام کی سند دے دی ہو۔

اب میں وارداتِ ترمذ سے اپنا ایک انتخاب پیش کرتا ہوں جس میں مذکورہ بالا معیاروں والے اشعار بھی شامل ہیں۔

تھے دور تو دل سے بھی قریں تھے
ہیں پاس تو کتنے فاصلے ہیں

ستم بھلانے پڑے آہ تھام لینی پڑی
بپاسِ خاطرِ احباب مسکرانا پڑا

محبت جھک گئی سجدے میں آخر
بجھا کر شمعیں علم و آگہی کی!

فنا انجامِ مسجودِ ملائک ۔۔۔ کوئی حد بھی ہے آخر دل دہی کی
بہت مشکل ہے انکارِ حقیقت ۔۔۔ حقیقت کون سمجھا گمرہی کی
کسی کا حسن بے پایاں بھی ترمذ ۔۔۔ کرامت ہے مری صنعت گری کی

ہے باعثِ زیست فکرِ خود زیست ۔۔۔ اور یوں تو وہ سادہ سی نظر ہے
جو نقش ہے جاذبِ نظر ہے ۔۔۔ کیا جانیے کس کی رہگذر ہے
ہر گام نئی تڑپ نیا جوش ۔۔۔ کیا جانیے کون ہمسفر ہے

تم جن راہوں کی منزل ہو، ہم ان راہوں پہ ہو لیں گے
تم چاہے کوئی آواز نہ دو، رستے کے نشاں خود بولیں گے

جہاں میں آئے تو جنت سی چیز کھو بیٹھے ۔۔۔ چلے جہاں سے تو اب نقدِ جاں لٹا کے چلے
چمن میں رہ کے کسی کا بھی دل نہیں توڑا ۔۔۔ گلوں کی قدر کی کانٹوں سے بھی نبھا کے چلے

وفا شعار تھے رسمِ وفا نبھا کے چلے　　ترے فقیر سوئے دار مسکرا کے چلے

کتنے طویل سلسلے وہم و گماں کے ہیں　　نازک ہے دل کا آئینہ غم دو جہاں کے ہیں

ہو اپنے آپ سے غافل کوئی تو کیا کیجے　　بشر کا دل تو خدا کی کتاب ہے ساقی

جب دل ہوا اداس جہاں ہو گیا اُداس　　دل شاد کام تھا تو جہاں شاد کام تھا

غمِ جاں کو غمِ جاناں کا بتلاتے ہیں علاج　　کوئی بتلاؤ یہ اندازہ خود ہے کہ جنوں
داغِ الفت بھی بڑی چیز تھی اے دل ورنہ　　حوصلے اس دلِ ناداں کے نہایت تھے فزوں

مزاجِ دل نہ سمجھ پائے ایک عمر میں ہم　　تجھے بھلا بھی دیا تیرا انتظار بھی ہے

وہ مہرباں رہے کبھی نامہرباں رہے　　غافل وہ تیرے حال سے غافل کہاں رہے

تم کیا گئے کہ روٹھ گئے زندگی سے ہم　　اجڑے ہیں کس خلوص سے وارفتگی سے ہم

ہنس ہنس کے سنے نالے بھی آہیں بھی فغاں بھی　　بلبل کو سنا ہے گلِ خنداں سے گلہ ہے

چلے بھی آؤ کہ پھر یہ سماں رہے نہ رہے　　دعا قبول، فلک مہرباں رہے نہ رہے

ہے ربط تیرے تصور سے میرے سجدوں کو　　جبیں جھکے گی کوئی آستاں رہے نہ رہے

لٹا بھی دے کسی در پہ متاعِ دل سرمدؔ　　نہیں ہے دم کا بھروسہ یہ جاں رہے نہ رہے

مت بے وفا کہو دلِ خانہ خراب کو　　ایسا نہ ہو کہ تم بھی نہ دامن بچا سکو

دل کے آئینے میں تصویر سی ہے　　آؤ نزدیک سے آکر دیکھو
وہ تو ہیں اب بھی رگِ جاں سے قریب　　غم کو سینے میں چھپا کر دیکھو
دل کو آئینہ بنا کر دیکھو　　زنگِ افکار ہٹا کر دیکھو

وقتِ رخصت تری محتاط نگاہوں کا سکوت　　دل میں پیوست ہوا تیرِ نظر کی صورت
غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ، غمِ ہر سود و زیاں　　کیا یہی ہے غمِ جاناں سے مفر کی صورت

اے چارہ گر نہ چھیڑ مرے دل کے زخم کو　　اک یادگار سی یہ کسی مہرباں کی ہے
کیونکر نہ ہو مجاز و حقیقت میں کشمکش　　کعبے کی رہ وہی ہے جو کوئے بتاں کی ہے

ماحول نہیں ہے تیرا دشمن　　ماحول پر اعتبار کر لے
آئیں گے بہار کے زمانے　　کچھ اور بھی انتظار کر لے

گلوں کو نیند آتی جا رہی ہے　　محبت داستان درد استاں ہے

ہر اک کے بس میں نہیں منزلوں کی قطع نظر　　بڑا خلوص ہے درکار رہبری کے لئے
خیالِ دوست کے لمحوں کو جاوداں کر لے　　سکوں نہیں ہے زمانے میں آدمی کے لئے

رکتا تو نہیں ہے وقت سرمد　　روئیں کہ جناب مسکرائیں

تھی کٹھن بے حساب راہِ حیات　　تو مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا

ہم کسی اجنبی راہ میں رک گئے　　لوگ آتے رہے لوگ جاتے رہے
زندگی اک فریضہ تھا نبھتا رہا　　زخم کھلتے رہے مسکراتے رہے
آپ تو خیر دامن چھڑاتے رہے　　آرزو کے دیئے جھلملاتے رہے

اجنبی دیس ہے اجنبی لوگ ہیں
کس سے پوچھیں کسی کا نشاں دوستو

یہ انتخاب میرا انتخاب ہے۔ دوسرے قاری اس باغ سے درد کے کچھ اور پھول چن سکتے ہیں —— ان اشعار ہی سے یہ واضح ہو جائے گا کہ شاعر کی دل شکستگی میں بھی وقار اور استقامت کے پرعزم لہجے موجود ہیں جو غم حیات کو لذتِ زیست کا رتبہ دے رہے ہیں، عرفان بھی ہے اور آگہی بھی، ایمان بھی ہے اور ایقان بھی —— وہی ذوق نظر —— اور وہی طرزِ بیان جو سربد کو زمانے کے اچھے غزل گوؤں میں مقامِ بلند کا مستحق قرار دیتا ہے —— گم نامی اور اس کے بعد یہ بلند مقامی اور نیک نامی یہ نصیبے کی بات ہے۔ یحییٰ امجد نے یہ دیوان مرتب کر کے، سعادت مندی ہی کا ثبوت نہیں دیا ادب پر خاص احسان کیا ہے۔

مطالعۂ میرؔ کے امکانات

نثار احمد فاروقی

میر تقی میرؔ کی شاعرانہ عظمت و رفعت کے سامنے سب نے عقیدت سے سر جھکایا ہے۔ انھیں اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں شہرت و مقبولیت نصیب ہو گئی تھی۔ وہ ایک مسلمہ روایت کے مطابق ۱۱۳۵ھ / ۲۳-۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے تھے،[1] اور انہوں نے ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء کے بعد کسی وقت دہلی میں سکونت اختیار کی، اور یہاں سید سعادت علی امروہوی کی ترغیب و تحریک سے "زبانِ اردوے معلّیٰ شاہجہان آباد" میں شعرگوئی کا آغاز کیا۔[2] گویا خود میرؔ نے اپنے قول کے مطابق ۱۶-۱۷ سال کی عمر میں ریختہ کہا۔ ۱۱۶۵ھ / ۵۲-۱۷۵۱ء کے لگ بھگ جب وہ اپنا تذکرہ نکات الشعرا مرتب کر رہے تھے،[3] اُن کی عمر ۳۰ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ خواجہ میر دردؔ کے بیان میں اُنہوں نے دردؔ کے والد بزرگوار خواجہ محمد ناصر عندلیب (متوفی ۱۱۷۲ھ / ۵۹-۱۷۵۸ء) سے اپنی ملاقات کا بھی حوالہ دیا ہے:

"ایامے کہ فقیر بخدمتِ آں بزرگوار شرف اندوز می شد، از زبان مبارکش می فرمود کہ میر محمد تقی تو میرِ مجلس خواہی شد الحمد للہ والمنۃ کہ حرفِ آں سر سلسلۂ خاک نشیناں مؤثر اُفتاد۔"[4]

گویا نکات الشعرا کی تالیف کے وقت تک خود میرؔ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ "میرِ مجلس" ہو چکے ہیں۔ اُن کا کلام گلی کوچوں میں پڑھا جاتا تھا اور اُس کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا:

میر دریا ہے سُنے شعر زبانی اُس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی

خاطرِ بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں
خاک مانند بگولے کے اُڑانی اُس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُس کی

---

[1] اس کا مدار "نوادر الکلام" کی ایک عبارت پر ہے تفصیل کلیاتِ میرؔ مرتبہ عبدالباری آسی کے مقدمہ میں ملے گی۔

[2] سید سعادت علی کے بارے میں ایک مضمون دہلی کالج میگزین میر نمبر میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں جو میری کتاب "تلاشِ میرؔ" میں بھی شامل ہے۔

[3] نکات الشعرا کے زمانۂ تالیف کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ دستور الفصاحت۔ مرتبہ امتیاز علی عرشی۔ صفحات ۴۳-۴۶

[4] نکات الشعرا (طبع اول) ۱۴۵

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو
شہرِ دلی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی

لیکن وہ ایک ایسے پُرآشوب دور میں پیدا ہوا کہ اُسے فراغِ خاطر کے ساتھ اپنے فن پہ ریاض کرنے کے مواقع نہیں ملے۔ مغلیہ سلطنت کا زوال، بہت ہی خلفشار، سیاسی ہیجان، ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کا عہد ہے۔ میر خود ان حالات کی بے رحمی کا شکار ہوا، اور اسے حوادث کے سیلاب میں ایک بے سہارا تنکے کی طرح بہنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُس نے اپنی سوانح عمری "ذکرِ میر" لکھی تو اپنے بارے میں ضروری اور بنیادی باتیں بھی نہیں بتائیں، تمام تر اپنے عہد کے سیاسی واقعات کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ "ذکرِ میر" کو پڑھنے والا کوئی شخص بھی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اِس کتاب کا نام "ذکرِ عہدِ میر" ہونا چاہیئے تھا۔ اس میں میر اپنے دادا اور پردادا کے نام تک نہیں بتاتا، اپنی ولادت، تعلیم، تربیت، سکونت، کسی بات کا ذکر وضاحت سے نہیں کرتا۔ والد کا نام بھی ایک موقع پر ضمناً بیان کر دیا ہے۔ وہ اگر کسی نواب کے دربار سے متوسّل رہا تو اُس کا منصبی کام کیا تھا؟ تنخواہ کتنی تھی؟ اُس نے کب اور کہاں شادی کی؟ کتنا بڑا کنبہ تھا؟ حلقۂ احباب کیسا تھا؟ اس کے مکروہات و مرغوبات کیا کیا تھے؟ غرض کوئی ایسا سوال سوچ لیجیے جس کا جواب کسی کی سوانح عمری میں ڈھونڈا جاتا ہے، وہ جواب آپ کو "ذکرِ میر" میں نہیں ملے گا۔ اِس کے برعکس آپ دیکھیں گے کہ میر نے بہت سرسری انداز میں اپنے اجداد کے حجاز سے گجرات اور وہاں سے آگرہ کو منتقل ہونے کا بیان کیا ہے، پھر اپنے باپ کی صوفیانہ طرزِ زندگی کا ذکر اور اُن کے مختصر حالات و ملفوظات ہیں۔ یہ ملفوظات تمام تر میر کے خلاق ذہن کی اختراع ہیں ساگر اُن کے باپ اوسط درجے کے درویش یا صوفی بھی ہوتے اور آگرے میں اُن کی وہ مقبولیت ہوتی، جو میر نے بتائی ہے، تو اُن کا حال کہیں نہ کہیں ضرور ملتا۔ اُس عہد کے تمام تاریخی اور نیم تاریخی ماخذ اُن کے وجود سے بے خبر ہیں۔

والد کے انتقال کے بعد میر نے نادر شاہی حملے کا بیان کیا ہے، اور یہاں سے جو تاریخی وقائع کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو بس تاریخ ہی لکھتے چلے گئے ہیں۔ کہیں کہیں درمیان میں سرسری اور ضمنی طور پر اُن کی اپنی شخصیت بھی نمودار ہو جاتی ہے مگر اس کی حیثیت کسی ڈرامے کے غیر اہم کردار کی ہے۔ پھر وہ وقائع سیاسی کے یلغار میں گم ہو جاتے ہیں۔

جس شاعر کے کلام میں ایسی خود پسندی اور اتنی انانیت ہو، وہ اپنی سوانح عمری لکھتے ہوئے خود کو اپنے ماحول میں اتنا گم کر دے، یہ عجب طرح کا تضاد ہے۔ لیکن آپ اس پر غور و تامّل کریں تو معلوم ہوگا کہ میر اُس ماحول کی پیداوار تھا، جو بے یقینی، تشکیک، ناپائیداری اور کس مپرسی سے عبارت تھا۔ اُس وقت حالات کی کشاکش شخصیتوں کو بگاڑ رہی تھی بنا نہیں رہی تھی ـــــ میر کے ذہن و مزاج، شخصیت و افکار، اور افتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے اِس سے بہتر پیرایہ اور اِس سے زیادہ بلیغ ترسیل ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اُس کے عہد کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا آئینہ سامنے رکھ دیا جائے۔ تاریخ میں بڑی وسعتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ یہ صرف سیاسی وقائع ہی نہیں ہوتے۔ اِس میں پورا سماج، اُس کی طرزِ بود و ماند، آدابِ خورد و نوش، میلے، ہنگامے، رسوم، رواج، میلے، تہوار، عقاید، توہمات، سب کچھ شامل ہوتے ہیں۔ اِسی طرح اقتصادی عوامل، تہذیبی رشتے، ثقافتی محرکات اور اِن سب کا فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر مل کر تاریخ کو معنی خیز اور عبرت انگیز بناتے ہیں۔ سیاسی حالات بھی اپنے سماجی پس منظر اور معاشرتی تعبیروں سے جدا ہو کر

سمجھ میں نہیں آ سکتے۔

جس طرح میر کی زندگی اُس کے عہد کے سیاسی خلفشار اور سماجی مظاہر میں گُم ہوگئی ہے اسی طرح یہ دور اُس کی شاعری کا جُزو بن گیا ہے۔ خود میر کو بھی اس کا احساس ہے کہ وہ "دل اور دِلّی" کے مرثیے لکھتا ہے۔ یہ "دلّی" دراصل اُس ہند ایرانی شائستگی کی علامت ہے جس کے آثار میر کی نگاہوں کے سامنے برباد ہو رہے تھے۔

پہلا تاریخی واقعہ جس کا حوالہ "ذکرِ میر" میں آیا ہے[1] وہ نادر شاہ کا حملہ (مارچ ۱۷۳۹ء) ہے۔ اس میں میر کے اولین مربی نواب صمصام الدولہ کام آئے تھے۔ آخری واقعہ غلام قادر روہیلہ کا قلعۂ معلّیٰ پر قبضہ کرنا اور پھر مادھوجی سیندھیا کے ہاتھوں گرفتار ہونا ہے[2] (مارچ ۱۷۸۹ء)۔ اِس طرح ذکرِ میر میں پورے پچاس سال کی تاریخ کے اہم واقعات کا حوالہ ملتا ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ سرجادو ناتھ سرکار کی مشہور کتاب "زوالِ سلطنتِ مغلیہ" (FALL OF THE MUGHAL EMPIRE) کی پہلی جلد بھی مارچ ۱۷۳۹ء سے شروع ہوتی ہے اور تیسری جلد کا اختتام مارچ ۱۷۸۹ء کے وقائع پر ہوتا ہے۔ اِس طرح سرکار کی کتاب کو ہم "ذکرِ میر" کی تاریخی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ اِن دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ بھی اہم نتائج کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

میر جتنا عظیم شاعر ہے اُتنا ہی بڑا بدنصیب بھی ہے۔ غالب اور اقبال کو بہترین دماغ اور قلم مل گئے، اور اُن کی تشریح و تعبیر کے اتنے پہلو سامنے آ گئے کہ اب اُنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میر عظمتِ شاعرانہ میں ان دونوں سے کم پلّہ نہیں ہے۔ مگر اُس کی زندگی اور فن پر ابھی تک کوئی سنجیدہ تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا۔ مولانا عبدالباری آسی کا مرتبہ کلیاتِ میر اور اُس کا مقدمہ مولوی عبدالحق مرحوم کے مضامین جو ذکرِ میر اور نکات الشعرا کے مقدموں کی صورت میں شامل ہیں، اثر لکھنوی کی مرتبہ مزامیرؔ کا دیباچہ — یہ سب کام اچھے ہیں، مگر ابتدائی اور اشاراتی ہیں۔ تنقیدِ میر کے موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "نقدِ میر" اُن کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ اگرچہ میر کے طالب علموں کے لیے بہت نافع ہے، مگر کوئی مربوط اور منظم مطالعہ یہ بھی نہیں ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر تقی میر: حیات اور شاعری" اِس موضوع پر پہلی باضابطہ کتاب ہے، جسے اُنھوں نے بقول خود سولہ سال تک خونِ جگر کھا کر اور اُس کا ایک تیار مسوّدہ کھو کر دوبارہ لکھا ہے۔ اِس کتاب پر ساہتیہ اکاڈمی کا انعام بھی بخشا جا چکا ہے۔ مصنف کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اُنھوں نے میر کو "تاریخی چوکھٹے" میں دیکھنے اور اُس کی سماجی تعبیر کرنے کی طرف پہلا قدم اُٹھایا ہے۔ لیکن اِسے دیکھ کر بھی افسوس ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اِس کتاب سے زیادہ نئی معلومات اُس تبصرے میں مل جاتی ہیں جو قاضی عبدالودود صاحب کی تصنیف "عیارستان" میں شامل ہے۔ فاروقی صاحب نے میر کے عہد کا مطالعہ تو خیر کیا ہی نہیں، کلیاتِ میر کو بھی اوّل سے آخر تک شاید ہی پڑھا ہو۔ اِس کتاب میں نہ تنقیدی بصیرت ہے، نہ تحقیقی ژرف نگاہی۔ بس کمال ہے تو یہ کہ اِتنی ضخیم

---

[1] میر کی آپ بیتی: ۹۲۔

[2] میر کی آپ بیتی: ۱۹۲۔

کتاب کو کہیں انھوں نے میر کو ویسا ہی "ادھورا" چھوڑ دیا ہے، جیسا کہ وہ اِس کتاب کے چھپنے سے پہلے تھا۔
تصانیفِ میر کے اچھے اور قابلِ استناد متون بھی موجود نہیں ہیں۔

۱- نکات الشعرا :- تین بار چھپ چکا ہے[1] لیکن ضروری حواشی اور مستند حوالوں کے ساتھ اُس کے ایک انتقادی متن کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

۲- ذکرِ میر :- صرف ایک بار ۱۹۲۹ء میں چھپی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں اُس کا اُردو ترجمہ شائع ہوا۔ مگر فارسی متن تمام قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد تیار ہونا چاہیئے تھا۔ ابھی تک کسی نے اِس کی اہمیت کا احساس نہیں کیا۔

۳- کلیاتِ میر :- متعدد بار چھپ چکی ہے۔ نسخۂ فورٹ ولیم تو میر کی زندگی میں مرتب ہوا تھا اور اُن کی وفات سے چھ ماہ بعد شائع ہوا۔ مگر یہ بھی جدید اصولِ ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ اِس نسخہ کو علمی مجلس دہلی نے ۱۹۶۸ء میں چھاپا ہے۔ مگر اِس کی دوسری جلد ہنوز باقی ہے۔ ایسا کوئی نسخہ ابھی تک مرتب نہیں ہوا جس میں دستیاب قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہو۔

۴- فیضِ میر :- دو بار چھپی ہے۔ ساتھ ہی ترجمہ بھی ہے۔ اِسے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے مرتب کیا ہے، اور تصانیفِ میر میں یہی ایک ایسا رسالہ ہے جو سلیقے سے چھپ گیا ہے۔

۵- دیوانِ فارسی :- ابھی تک نہیں چھپا۔

۶- دریائے عشق (نثر) : اِس کا متن دہلی کالج میگزین ؛ میر نمبر میں شامل ہے۔

متون کی انتقادی ترتیب و تدوین کے بعد دوسرا مرحلہ اُن کی تاریخی بازیافت کا ہوتا ہے۔ یعنی یہ طے کیا جائے کہ کون سا دیوان کب مرتب ہوا؟ اِس سے فنکار کے شعوری ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جزوی طور پر کلامِ میر کی تاریخی ترتیب کا کام تذکروں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً نکات الشعرا میں میر نے اپنی جن غزلوں کو انتخاب کیا ہے اُن کے بارے میں یہ طے ہو جاتا ہے کہ وہ غزلیں ۱۱۶۵ھ / ۵۲ - ۱۷۵۱ء تک کہی جا چکی تھیں۔ اِسی طرح جو کلام "مخزنِ نکات"، "چمنستانِ شعرا"، "تذکرۂ میر حسن" یا "طبقات الشعرا" قدرت اللہ شوق" میں ملتا ہے وہ سب میر کے سفرِ لکھنؤ سے پہلے کا قرار پاتا ہے۔ اُن کا یہ سفر ۱۱۹۶ھ / ۸۲ - ۱۷۸۱ء میں ہوا ہے۔ کلامِ میر کی تاریخی ترتیب کے موضوع پر ابھی تک کسی نے قلم اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ حالانکہ یہ مطالعہ اہم نتائج تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

---

[1] مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی - مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق اور طبع سوم مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی (گورکھپور)

میر کا پہ غیر مطبوعہ کلام بھی قدیم بیاضوں اور تذکروں میں محفوظ ہوگا۔ اُسے تلاش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ میر کے بعض مراثی اور مثنویاں دریافت ہو کر چھپ بھی چکی ہیں۔

پھر میر پر ایک جامع فرہنگ اردو اور فارسی کی تیار ہونا باقی ہے۔ اس سے اُن کے کلام کی لسانیاتی مطالعہ کرنے میں مدد ملے گی۔ میر سے پہلے کون سے الفاظ اور محاورات استعمال ہوئے ہیں اور کن الفاظ کو خود میر نے چلن دیا ہے؟ کون سے محاوراتِ اُس نے فارسی سے ترجمہ کیے ہیں اور زبان کے بنیادی ڈھانچے میں کون سی تبدیلیاں کی ہیں جن کی وجہ سے اُس کی زبان اور اُسلوب اس کے معاصرین و متقدمین سے ممتاز ہو گیا ہے۔ اُس کے اُسلوبِ نظم و نثر کا فنی اور تکنیکی مطالعہ و تجزیہ بھی ہنوز باقی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعض مضامین میں اس طرح کی کوشش ملتی ہے مگر یہ اور زیادہ سائنٹفک سطح پر ہونا چاہیے۔

میر کی غزل، قصیدہ، مثنوی اور دوسری اصنافِ سخن کا علیحدہ علیحدہ انتقادی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی فارسی نثر و نظم پر ابھی بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ "ذکرِ میر" سوانح عمری کی تعریف پر کہاں تک پوری اُترتی ہے اور معاصر تاریخ کے ماخذ کی حیثیت سے کتنی قابلِ اعتماد ہے۔ یہ دونوں موضوع ابھی تک تشنہ ہیں۔ مورخوں نے ذکرِ میر کی طرف بہت کم اعتنا کیا ہے۔ سرکار کی کتاب "زوالِ سلطنتِ مغلیہ" میں اس کا حوالہ کتابیات میں تو موجود ہے مگر متنِ کتاب میں اس سے استفادے کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ سب سے آخر میں میر کے افکار کا تجزیہ ہے۔ اُن کے مذہبی عقائد، صوفیانہ افکار، اخلاقی تصورات، فلسفیانہ نظریات، معاشرتی اور تہذیبی اقدار، کس حد تک روایاتی ہیں اور کہاں اُن کی جڑیں گہرے علم و عرفان کی زمین میں پیوست ہیں؛ یہ سب جانے بغیر ہم میر کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ جب ان سب پہلوؤں پر گفتگو ہو جائے گی تب میر کے اصلی خط و خال اُجاگر ہوں گے اور اُسے کسی ابہام کے بغیر سمجھنا ممکن ہوگا۔

میر پر جو کام ہونا باقی ہیں انھیں ہم تنقید اور تحقیق کے دو بڑے خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تحقیقِ میر کے تین اہم پہلو ہیں: پہلا تو ذاتی اور سوانحی ہے۔ اس میں ابھی تک اُن کے خاندان کا مسئلہ ہی طے نہیں ہو سکا ہے۔ اُنھوں نے ذکرِ میر کے آغاز ہی میں لکھا ہے:

> "میرے آبا و اجداد ملکِ حجاز کو خیر باد کہہ کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندستان میں پہلے پہل دکنی ساحلوں کی طرف آئے تھے اور وہاں سے یہ پورا قبیلہ احمد آباد (گجرات) میں آکر بس گیا۔ پھر ان میں سے کچھ تو مستقل طور پر وہیں رہ پڑے اور کچھ نے آگے بڑھ کر تلاشِ روزگار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میرے جدِ اعلیٰ دارالخلافہ (اکبر آباد) آ گئے ۔ ۔ ۔" [1]

میر نے شیخ عبدالعزیز عزت اور اُن کے فرزند سے اپنی "قرابتِ قریبہ" کا اعتراف کیا ہے[2]۔ اور عزت کے حوال میں لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی نے لکھا ہے:

---

[1] میر کی آپ بیتی (طبع اوّل، ۱۹۵۷ء): ۳۱۔

[2] میر کی آپ بیتی (طبع اوّل، ۱۹۵۷ء): ۳۹۔ فارسی متن میں غلطی سے نام قمرالدین خاں چھپا ہے۔ صحیح فخرالدین خاں ہے۔ تاریخ محمدی: ۷۵۔

"نسبش به محمد بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما می رسد، یکے از اجداد او بتصاریف ایام از مکہ معظمہ بہ ہند افتاد بعضے آبائے او در قصبہ ڈھبائی از توابع اکبرآباد توطن گرفت[1]"

عزت کا شجرۂ خاندان اس طرح بنتا ہے:-

ملا عبدالرشید اکبرآبادی
(ف ۱۰۹۹ھ)

- شیخ عطاءاللہ (ف ۱۱۱۰ھ)
- شیخ عبدالعزیز عزت[1] (ف ۱۰۸۹ھ)
  - سعدالدین خاں (ف ۱۱۱۸ھ)
    - قطب الدین خاں
    - حفیظ الدین خاں[3] مخاطب بہ سعد الدین خاں
  - فخرالدین خاں[2] (ف ۱۱۴۴ھ)

اگرچہ صحیح ہے کہ عزت اور میر تقی کے اجداد ایک ہی قبیلے کے تھے، تو میر بھی "شیخ صدیقی" ہوئے۔ وہ اپنے اور اپنے برادرِ خورد محمد رضی کے ناموں کے ساتھ التزاماً لفظ "میر" لکھتے ہیں۔ اپنے برادرِ علاتی حافظ محمد حسن یا اُن کے بیٹے محمد محسن کو میر نہیں کہتے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمد علی نے دوسری شادی کسی شیعہ خاتون سے کی ہوگی جو سیادت کا دعویٰ بھی رکھتی ہوں گی۔ اس بارے میں یہ لحاظ رہنا چاہیے کہ تورانی میں سلسلۂ نسب ماں کی طرف بھی ملایا جاتا ہے اور سیادت کی حد تک ایرانیوں نے بھی اس رسم کو قبول کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو "ذیالہ سادات" کہا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہندستان میں شیعیت کے فروغ کا ایک دور آیا تھا۔ خود اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ

---

[1] تین تذکرے (مرتبہ: نثار احمد فاروقی) شائع کردہ مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۸ء صفحہ ۲۴۲ قصبہ ڈبائی آج کل ضلع بلند شہر میں ہے اور آگرہ سے قریب ہے

[2] یہ عہدِ اورنگ زیب کی مشہور شخصیت ہیں اور اس زمانے کی تقریباً کل تاریخوں میں ان کا حال ملے گا۔

[3] ان کا حوالہ ذکرِ میر میں دو جگہ آیا ہے۔ مگر نام غلطی سے قمرالدین خاں لکھا ہے۔ نظر بظاہر یہ طباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے ستر سال کی عمر میں ۱۱۴۴ھ میں انتقال کیا۔ تاریخ محمدی: ۷۵

[4] نسخۂ لاہور (ملوکہ پروفیسر محمد شفیع مرحوم) میں جو عبارت زائد ہے اور جسے ہم نے میر کی آپ بیتی کے دیباچے میں نقل کیا ہے۔ اس میں انہیں حفیظ الدین خاں کا حوالہ ہے۔ میر کی آپ بیتی ۱۱۲-۱۱۴۔

اصلاً شیعی عقائد اختیار کر لیے تھے اور ماں کی طرف سے سیّد ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ بہادر شاہ اوّل کی ماں ایک کشمیری راجا (راجوری) کی لڑکی تھی، جو اورنگ زیب کو نذر کی گئی تھی۔ اس کے بارے میں یہ افسانہ گھڑا گیا کہ حضرت غوث الاعظم کی اولاد میں سے ایک نہایت مقدس بزرگ "سید شاہ میر" کشمیر میں وارد ہوئے تھے اور راجا ان کا اس حد تک معتقد ہو گیا تھا کہ اپنی ایک بیٹی ان سے بیاہ دی تھی، جس کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر سید شاہ میر حج کرنے کی غرض سے روانہ ہو گئے اور کبھی واپس نہیں آئے۔ ان بچوں نے اپنے نانا کے پاس پرورش پائی اور جب شاہجہان نے راجا سے خراج طلب کیا تو اس نے یہی لڑکی بادشاہ کو "ڈولے" کی رسم کے طور پر بھیج دی، جو شاہزادہ اورنگ زیب سے بیاہ دی گئی۔ اس کا نام "کلمۃ النسا بیگم" تھا، مگر نواب بائی بیگم کہلاتی تھی۔ اس کے بطن سے بہادر شاہ اوّل پیدا ہوا۔ لہٰذا اس نے بھی سیّد ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ نواب بائی کے نسب کا یہ افسانہ بہادر شاہ اوّل کے عہد میں نہیں گھڑا گیا، بلکہ اورنگ زیب کے زمانۂ اقتدار میں بنایا گیا تھا اور اسی لیے سلسلۂ نسب بھی حضرت غوث الاعظمؒ سے ملایا تھا۔ زمانۂ ما بعد میں اگر یہ بات شائع کی جاتی تو ظاہر ہے کہ یہ نسب کہیں اور جا کر ملتا۔

میرا خیال ہے کہ اتنی کم سنی میں شیعی عقائد کی طرف میر کا مائل ہونا تعلیم یا مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ انھوں نے یہ اثر اپنی ماں سے قبول کیا[1]۔ اور مادری سلسلے سے ہی وہ اپنے تئیں سیّد سمجھتے رہے۔ انھوں نے اپنے باپ سے جو کلمات منسوب کیے ہیں غالباً ان میں سے دو چار فی صد کا انتساب بھی محمد علی عرف علی متقی سے درست نہیں ہے۔ لیکن یہ ملفوظات یا واقعات و اشارات بے مقصد بھی نہیں ہیں۔ ان کے لکھنے سے میر کا منشا کچھ اور باتوں کا ثابت کرنا ہے جنھیں ان واقعات کے بین السطور میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ میرے باپ بھی تفضیلی عقائد رکھتے تھے۔ اس کے ثبوت میں ایک واقعہ تو انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ "ایک دن (میرے والد نے) اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں رہ کر اپنے عقائد جیسا کچھ درست کر لیے ہیں وہ آپ پر واضح ہی ہیں لیکن حاکمِ شام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "کسی دن بتائیں گے"۔

مدت بعد، ایک صبح، منہ اندھیرے، محترم خاں خواجہ سرا شاہجہانی کی مسجد میں تشریف لائے۔ میرے والد کے ملازم ان کے وضو کے لیے پانی لانے کو دوڑے۔ مگر والد صاحب خود اٹھے، لوٹا لیا اور شاہ صاحب کو وضو کرانے لگے۔ اس وقت شاہ صاحب نے فرمایا: "میاں علی متقی۔ تمام عمر اس کا نام میری زبان پر نہیں آیا۔ اس کے لیے میں خدا کا شکر کس طرح ادا کروں۔" میرے والد کہتے تھے خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی کبھی اس کا نام نہیں لیا"[2]۔

یہاں حاکمِ شام سے حضرت امیر معاویہؓ (ف ۶۰ھ/ ۶۷۹ء-۶۸۰ء) مراد ہیں۔ میر نے غالباً اپنے باپ کے تفضیلی عقائد اختیار کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی میں خلفائے ثلاثہ پر حضرت علی کی فضیلت تو مانتا ہی ہوں، مگر حضرت معاویہ کے باب میں کیا عقیدہ رکھوں؟ یہ سمجھ

---

[1] ایک امکان یہ بھی ہے کہ سید امان اللہ جنھیں میر نے "منہ بولے چچا" کہا ہے، میر کے عقائد پر اثر انداز ہوئے ہوں۔ وہ بیانہ کے رہنے والے تھے اور بیانہ قدیم زمانے سے سادات کی بستی رہی ہے۔ بیانہ کے سادات کا ذکر ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں بھی ملتا ہے۔

[2] میر کی آپ بیتی ۳۲-۳۳۔

میں نہیں آیا کہ مرشد نے اتنی سی بات کا جواب دینے کے لیے مہلت کیوں طلب کی تھی؛ محرم جان خواجہ سرا بن کی مسجد کا حوالہ ہے خواجہ ذوالفقار مخاطب بہ محرم خاں (ف ۱۰۹۵ھ) ہے اور یہ غالباً شیعی عقیدہ رکھتا تھا۔ خواجہ حسن اکبر مودودی (ف ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء) کے ملفوظات "لطائف اکبری"[1] میں بھی ایک ایسی ہی عبارت ملتی ہے:

> "ایک روز الہ آباد میں ایک شخص فقیر کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ پسر ح کہ شام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں نے کہا کہ اسے جو بھی آپ کہیں اس سے بھی وہ بدتر ہے مگر میں کچھ نہیں کہتا۔ مجھے اس سے کیا سروکار۔ میں اس کا نام اپنی زبان پر کیوں لاؤں؟ مجھے اس کا نام لینے سے کراہیت آتی ہے۔"

ان ملفوظات کے جامع خواجہ حسن مودودی کہاری ہیں[2]۔ جو میر کے ہم عصر بھی ہیں ہو سکتا ہے کہ میر نے یہ واقعہ اُن سے سُن رکھا ہو۔

اپنے باپ کی شیعیت کے اثبات میں دوسرا اشارہ انھوں نے "رویتِ باری" کا مسئلہ چھیڑ کر کیا ہے۔ شیعی عقیدہ یہ ہے کہ "لا تدرکہ العیون بمشاھدۃ العیان ولکن تدرکہ القلوب بحقائق الایمان۔" (خدا کو یہ ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں بلکہ اس کا دیدار حقائق ایمان کے ذریعے سے قلب کو ہو سکتا ہے۔)

میر نے لکھا ہے کہ ایک دن اسد اللہ نامی درویش نے اُن کے باپ سے سوال کیا کہ مجھے خدا کی رؤیت کے مسئلے میں کچھ تردد ہے۔ درویشوں کی دو جماعتیں ہیں ایک کا خیال ہے کہ ایک دن ہم اس غیرتِ ماہ (خدا) کو بدرِ کامل کی طرح (عیان و برملا) دیکھیں گے اور دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اس آفتاب کا دیکھنا انسانی بصارت کے امکان میں نہیں۔" والد نے فرمایا کہ ہم فقیروں کو کچھ فکر نہیں۔ جب یہ طے شدہ ہے کہ وہ عینِ کائنات ہے تو جدھر نظر ڈالتے ہیں وہ دکھائی دیتا ہے اور جس کسی میں دیکھتے ہیں جلوہ دکھاتا ہے" وہ معنی ہے اور ہر صورت میں جلوہ گر ہے۔ نظر ہو تو اس کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔"

رؤیتِ باری کا مسئلہ بحث و تمحیص کے گرماگرم مسائل میں سے ایک رہا ہے۔ اسے معتزلہ نے اتنی ہوا دی کہ یہ تسنن اور اعتزال کے درمیان حدِ فاصل بن گیا۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ رؤیت کے لیے جسمانیت، جہت، اور لون وغیرہ لازم ہیں اور خدا ان سب سے منزہ ہے پھر قرآن میں بھی ہے: "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ" (الانعام ۱۰۳/۶) اسی طرح حضرت موسیٰ نے خدا سے رؤیت کا مطالبہ کیا تو ارشاد ہوا کہ "لن ترانی" (الاعراف ۱۴۳/۷) ان کے مخالفین یعنی اشاعرہ کہتے تھے کہ قرآن میں نص صریح موجود ہے "وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (القیامۃ ۲۳/۷۵) اور حضرت موسیٰ سے خدا نے یہی تو کہا تھا کہ تم مجھے نہیں

---

[1] لطائف اکبری ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی تلخیص مفتی محمد رضا انصاری نے رسالہ برہان دہلی میں شائع کی تھی مذکورہ بالا اقتباس کے لیے دیکھیے برہان جلد ۶۷ شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۷۱ء) ص ۵۱۔

[2] خواجہ حسن مودودی کے لیے دیکھیے انیس الاحباء (قلمی۔ علی گڑھ) طبقات سخن (قلمی) ورق ۱۷۔الف سفینہ ہندی ۶۲-۶۳۔ مسرت افزا: ۵۸ مخانہ جاوید ۲: ۴۲۸ صحیفہ (لاہور) شمارہ ۳۹۔

دیکھ سکتے۔ یہ کب کہا تھا کہ "میں دیکھا نہیں جاتا"[1] یعنی حضرت موسیٰ نے بھی رؤیتِ باری کو محال نہیں سمجھا تھا ورنہ وہ خدا سے ایک امرِ محال کے لیے خود ہی مطالبہ نہ کرتے۔ وہ بہرحال معتزلہ سے زیادہ علم رکھتے تھے کہ کیا ممکن ہے اور کیا محال ہے[2]۔

جن احادیث سے رؤیتِ باری کا اثبات ہوتا تھا اُن سے معتزلہ منکر ہو گئے اور جہاں حدیث کی صحت میں شک کرنے کی گنجائش کم نظر آئی وہاں کہتے تھے کہ حدیث ناسخِ قرآن نہیں ہو سکتی۔ اشاعرہ کا کہنا تھا کہ خدا "موجود" ہے اور ہر موجود کو دیکھنا ممکن ہے۔ باقی رہیں رؤیت کی قیود، جہت، زمان، لون وغیرہ، یہ تو اس عالم کی شرائط ہیں۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آخرۃ میں رؤیت کس شان کی ہوگی[3]۔

اصل عقیدہ رؤیتِ باری کے مستحیل ہونے کا دراصل معتزلہ کا ہی ہے مگر اس پر اتنی جرح و تعدیل ہوئی کہ اسے "اہلِ سنت والجماعت" ہونے کی نشانی سمجھ لیا گیا۔ اسی وجہ سے شیعوں نے بھی مسلکِ معتزلہ اختیار کر لیا۔

میر نے اپنے والد کا جو نظریۂ توحید پیش کیا ہے وہ صرف رؤیت کی حد تک معتزلہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں بھی میر نے "جوابِ گریز" دینے کی کوشش کی ہے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کا معتزلہ یا امامیہ فرقہ سے کچھ سروکار نہیں۔ یہ مسلک اشاعرہ کا ہے۔ میر کے باپ رؤیت کے مسئلے میں تو معتزلی ہیں اور نظریۂ توحید میں اشعری، اور دوسرے امور میں شیعہ۔ یہ ایسا تضاد ہے جو میر کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ میر خود اس مسئلے کو پورے فلسفیانہ سیاق و سباق میں سمجھے ہوئے نہیں ہیں انھیں یہ معلوم تھا کہ مسئلہ رؤیت حضراتِ اہلِ سنت اور امامیہ کے درمیان وجہِ امتیاز ہے لہٰذا انہوں نے ایک ایسا مکالمہ تیار کیا جسے دونوں طرح معنی پہنائے جا سکیں۔

یہاں ایک بات پر اور توجہ کر لیجیے۔ میر کے والدِ بزرگوار سے یہ سوال کس نے کیا ہے؟ یہ ایک درویش ہے جس کا نام اسد اللہ ہے۔ یہ میر کے والد کا پیر بھائی ہے۔ رہنے والا "کبود جامہ" کا ہے بپیشہ "سیرابہ پز" یعنی نہاری پکا کر بیچنے والا۔ میر کے والد نے اپنے پیر سے کہا تھا کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ مجھے اپنی موت کا علم پہلے سے ہو جائے۔ پیر نے کہا کہ جب تم اس "سیرابہ پزِ کبود جامہ" کو دیکھو تو سمجھ لینا کہ سالِ آئندہ تک زندہ نہ رہو گے۔ ۱۱۴۵ھ/۳۲-۱۷۳۱ء میں کسی وقت اسد اللہ نے خواب میں اپنے پیر سے ہدایت حاصل کی کہ تم فوراً آگرہ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میرے اور علی متقی کے درمیان ایک اشارہ ہے جو وہ تمہارے پہنچنے سے سمجھ جائیں گے۔

اسد اللہ بہت معمولی حیثیت کا آدمی ہے۔ ہندوستان میں جس طرح صبح کو نہاری پکا کر بیچنے کا رواج ہے اسی طرح ایران میں "سیرابہ" پکاتے ہیں یہ غالباً سر اور آب کا مرکب ہے۔ خانِ آرزو نے اہلِ زبان سے تحقیق کر کے اس کے معنی لکھے ہیں۔ اس میں "کلہ و پارچہ" (یعنی سری) ہوتی تھی۔ میر نے ایک لفظ چراغِ ہدایت میں نیا دیکھا جو عام کتبِ لغات میں نہیں تھا اور جس کی تشریح آرزو

---

[1] الاشعری: مقالات الاسلامیین

[2] تفسیر الکشاف ۱/ ۱۹۸

[3] ظہر الاسلام ۴/ ۹۲

[4] میر کی آپ بیتی۔ ص۶۴

سے ذاتی تحقیق کرنے کے بعد کہی ہے تو انہوں نے یہ لفظ استعمال کرنے کے شوق میں شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی سے اسے
ب یہ ضروری تھا کہ اس کا ایران سے کچھ رشتہ پیدا کیا جائے تاکہ "سیرابہ چہ" کھلانے کا جواز پیدا ہو ہذا اُسے "کبود جامہ"
- اس میں لباس درویشی سے نقل مناسبت بھی اتفاق سے موجود ہے ۔ یا ایران میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ۔ عموماً
ی فروش کی دکان نہیں ہوتی ۔ خیر یہ مان لیا کہ اس کی دکان تھی ۔ خود میر نے لکھا ہے کہ کساد بازاری تھی اور تجارت بالکل
: اس عالم میں شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی آگرے سے کبود جامہ تک اُسے خواب میں یہ حکم دینے پہنچ گئے کہ تمہیں علی متقی
ینے کے لیے آگرہ جانا ہے یہی بشارت وہ خود آگرہ ہی میں علی متقی کو بھی دے سکتے تھے ۔ اتنا سا رمز بتانے کے لیے ایک
رویش کو تقریباً ڈھائی ہزار میل پیدل چلا کر آگرہ بھجانے کی کیا ضرورت تھی ؟

نہاری فروش اسداللہ اتنی علمیت کا آدمی بھی ہے کہ رویت باری جیسے دقیق فلسفیانہ مسائل پر علی متقی سے گفتگو کرتا ہے آج
علیم یافتہ حضرات اس مسئلے پر آسانی سے بحث نہیں کر سکتے ۔ میر نے یہ قطعاً نہ سوچا کہ وہ کون سا مکالمہ کس کردار کی زبان
سے ہیں ۔

طرح کی ایک مثال وہ ہے کہ علی متقی ایک دن رنج کے عالم میں سیدامان اللہ کی موت کا حلوہ تقسیم کر رہے تھے کہ ایک
روش وضع نوجوان جس کا نام احمد بیگ تھا، آیا اور "شکر انگور" کے کچھ دانے ہاتھ پر رکھ کر نذر گذرانے اور کہا کہ ابھی تازہ ولایت
ور حج کو جانے کا ارادہ ہے ۔ اس شہر میں آیا تو آپ کی درویشی کا آوازہ سنا مشتاق دیدار ہو کر خدمت سامی میں حاضر ہوا

مہی شاید ہی کبھی خارج میں واقع ہوا ہو ۔ میر نے "شکر انگور" کا لفظ استعمال کرنے کے شوق میں پوری داستان وضع کر لی ۔ یا انگور
اور ایران سے مخصوص ہے ۔ احمد بیگ اگر ایران سے حج کرنے کی خاطر نکلا تھا تو ظاہر ہے اس سفر میں آگرہ تک پہنچنے کے
زمہ درکار ہے اتنی مدت تک انگوروں کا محفوظ رہنا ممکن نہیں ۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس نے ان کی حفاظت کے لیے
ر احتیار کی ہوں گی تو اس شبہ کا رفع کرنا کس طرح ممکن ہے کہ ایران سے عرب کی طرف جاتے ہوئے آگرہ کسی طرح درمیان
تا وقتیکہ اس کا سفر بالقصد نہ کیا جائے ۔

لے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دن ماموں (سراج الدین علی خان آرزو) نے مجھے کھانے پر بلایا اور پھٹکارنا شروع کر دیا ۔ میں بہت
ہ میں ہاتھ ڈالے بغیر اٹھ گیا ۔ جب اُن سے سختی نہ دیکھی تو شام کو اُن کے گھر سے نکلا اور جامع مسجد کا رستہ لیا ۔ اتفاق سے
ر قاضی حوض پر آ نکلا جو وزیرالممالک اعتمادالدولہ کی حویلی کے پاس ایک چھوٹی سی نہر ہے ۔ یہاں میں نے پانی پیا ۔ کسی نہر یا
پینا کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے کہ اس کا تذکرہ کسی سوانح عمری میں کیا جائے ۔ یہاں "آب کشیدن" کے محاورہ کا استعمال
ں واقعہ اتنا ہوگا کہ حافظ محمد حسن نے خان آرزو کو کوئی خط لکھا ہوگا جس سے متاثر ہو کر انہوں نے میر کے ساتھ "دشمنوں کا سا"

بیتی ، ۷۷ -

بتانا شروع کر دیا۔ میر کے باپ کا جب انتقال ہوا تو میر ۱۰ - ۱۱ سال کے تھے اور اسی زمانے سے انھیں فکرِ معاش میں سرگرداں ہونا پڑا۔ سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے باپ کے ترکے کی تین سو کتابوں میں سے بھی میر کو کوئی حصہ نہیں دیا اور باپ کی زندگی ہی میں یہ کہہ دیا تھا کہ میر ان کتابوں کا کیا کریں گے۔ پھر میر دلی آئے تو یہاں بھی محمد حسن نے اپنے حقیقی ماموں خان آرزو کو لکھ بھیجا کہ میر تقی فتنہ روزگار ہے اس کی تربیت ہرگز نہ کی جائے ۔۔ خانِ آرزو نے بھی ایک کم سن یتیم پر رحم نہ کیا اور بھانجے کے ورغلانے میں آگئے۔ آخر اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیئے کہ ہمارے سامنے صرف میر کا بیان ہے اور محمد حسن یا خانِ آرزو کا بیانِ صفائی موجود نہیں ہے۔ یک طرفہ بیان پر جو فیصلہ کیا جائے گا وہ ظاہر ہے کہ منصفانہ نہیں ہو سکتا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ محمد حسن اور آرزو کے سلوک کا سبب میر کا مذہب رہا ہوگا۔ انھوں نے اپنے ابتدائی ماحول ہی میں تشیّع کے اثرات قبول کر لیے تھے اور یہ بات اُن کے باپ کی زندگی ہی میں ظاہر ہو چکی ہوگی کہ میر شیعیت کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ حافظ محمد حسن (ان کے نام کے ساتھ لفظِ حافظ ہی بتا رہا ہے کہ یہ شیعہ نہیں تھے اور میر نے بھی کہیں ان کے نام کے ساتھ لفظ میر نہیں لکھا) نے اِسی وجہ سے باپ کی متروکہ کتابوں میں سے انھیں حصہ نہیں دیا۔ انہوں نے باپ سے بھی یہی کہا ہوگا کہ محمد تقی شیعہ ہو گیا ہے آپ کی سب کتابیں تصوف کی ہیں یا مذہب تسنّن سے علاقہ رکھتی ہیں، میر ان کتابوں کا آخر کیا کرے گا؟ اِسی لیے شاید انھوں نے خان آرزو کو بھی لکھ بھیجا ہو کہ میر کی تربیت نہ کریں۔[له]

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اسلامی ہند کی معاشرت میں مذہبی عقائد کی بہت اہمیت تھی۔ ایک ہی فرقے میں فروعی اختلافاتِ عقائد بھی اکثر افتراق کا سبب بن جاتے تھے۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں بھی اہلِ سنّت ہی کے دو گروہ "دیوبندی" اور "بریلوی" کہلاتے ہیں ان میں عقائد کی سطح پر کبھی کبھی اتفاق بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اکثر یہ اختلافات شادی بیاہ یا دوسرے سماجی روابط کے قیام میں خاصی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ میر اگر اُسی خاندان کے تھے جس سے عبدالعزیز عزت اکبرآبادی (ف ۱۰۸۹ھ) کا تعلق تھا تو یہ خاندان عقائدِ اہلِ سنّت میں بہت راسخ رہا ہے۔ خود عزت نے شیعیت کے ردّ میں ایک کتاب "کشف الغطا" لکھی تھی اور وہ عملاً بھی اپنے عقائد کی ترویج میں کوشاں رہتے تھے چنانچہ ان کی ترغیب سے اینِد بخش رسا (ف ۱۱۱۹ھ) نے مذہبِ تشیّع چھوڑ کر عقائدِ اہلِ سنّت کو اختیار کیا تھا ایک ایسے خاندان کا فرد اگر اپنے عقائد تبدیل کرے تو اُس دَور کی سماجی زندگی میں اُس کے لیے دشواریاں پیدا ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔۔

اِس کے باوجود جب میر پر جنون کا حملہ ہوا تو عزت کے بیٹے فخرالدین خان کی بیوی نے اُن کے علاج پر بہت روپیہ صرف کیا تھا۔

میر نے بہت سی باتوں کو وضاحت سے نہیں لکھا۔ وہ یہ نہیں بتلاتے کہ ان کے والد کی وفات کے بعد سارے طول نے اُن کے خلاف کیوں بغاوت کر دی اور اتنے کم سن بچوں (محمد تقی اور محمد رضی) کو زمانے کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا؟ صرف میر

له حافظ محمد حسن کے بیٹے محمد محسن تھے جن کا حال نکات ۱۰۰ (طبع اوّل) میں ہے۔ تالیفِ تذکرہ کے وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ اِس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ ۱۱۴۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ اس سے حافظ محمد حسن کی عمر کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محمد علی کی وفات (۱۱۴۰ھ) کے وقت وہ شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھے۔

کے مبہم بیانات کی بنیاد پر دوسروں کو ظالم اور بے رحم مان لینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میر نے اُس زمانے میں کسی سے عشق یا محبت شدومد کے ساتھ کیا تھا اور اُس جذباتی ہیجان کی لہریں اُن کی شاعری میں بھی نظر آتی ہیں جسے وہ "جنون" بتاتے ہیں وہ اسی "حضرتِ عشق" کی کرامات معلوم ہوتی نہیں۔ انہوں نے چاند میں ایک صورت کے نظر آنے اور اُس سے تنہائی میں گفتگو کرنے کا بیان کیا ہے۔ میر کی شاعری میں "چاند"، "چاندنی"، "مہتاب"، "مہتابی"، "گل مہتابی"[1] "قمر" اور "ماہ" کے الفاظ اتنی کثرت سے آئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر مجھے گمان ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی سے میر عشق فرماتے تھے اُن کا نام بھی کچھ "چاندنی" یا "مہتاب" یا "قمر" وغیرہ رہا ہوگا۔ عالم جنون میں میر اس کا نام لے کر اُس کے تصور سے باتیں کرتے تھے اور یہ نام لے کر سوتے سے چونک اُٹھتے تھے۔[2] اس کی تاویل اپنی سوانح عمری میں وہ اس طرح کر رہے ہیں کہ "چاندنی رات میں ایک حسین پیکر ..... کرۂ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا۔ جدھر بھی آنکھ اٹھتی اُسی رشکِ پری پر پڑتی جس طرف دیکھتا اسی حیرت حور کا تماشا کرتا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورقِ تصویر ہو گئے تھے یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا چہرہ نظر آتا۔ کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے کبھی سیر گاہِ دل میں محوِ خرام اگر گل مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بے قرار ہو جاتی۔ ہر رات اُس پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اُس کی جدائی میں وحشت ..... چار مہینے تک وہ گل شب افروز نت نئے انداز دکھاتا رہا اور اپنے فتنۂ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا ..... وہ خیالی صورت ہر وقت نظروں کے سامنے رہتی اور اُس کی مشکیں زلفوں کا دھیان سر میں۔"[3]

خان آرزو سے اُن کے تعلقات شاید اسی معاشقے کی وجہ سے خراب رہے ہوں۔ ورنہ ان سے اتنی تنگ دلی کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک یتیم بچے کی نہ صرف پرورش سے گریز کریں بلکہ وہ بیمار ہو تو اُس کی دوا دارو سے بھی کوئی دل چسپی نہ رکھیں۔ اس موقع پر سراج الدین خاں کی بیوی کا ہمدردانہ رویّہ بھی ایک عورت کی نفسیات کا اشاریہ ہے جو ایسے حالات میں فطری طور پر دلسوزی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اُس دَور کے سماج کا گہرا مطالعہ اسی لیے ضروری ہے کہ اِس کے بغیر یہ راز سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ اُس زمانے میں کسی شریف گھرانے کی لڑکی سے معاشقہ کرنا آسان کام نہیں تھا اور اس کا صریح مطلب پورے ماحول کی مخالفت کو دعوت دینا ہوتا تھا۔ اب میر کے اس معاشقے کی تفصیلات کا دستیاب ہونا تو ممکن ہی نہیں، لیکن میر کے سوانح کی دلکشی اور رنگینی میں اضافے کی خاطر اگر کچھ اشارات بھی مل سکیں تو غنیمت ہے، اور میرا خیال ہے کہ یہاں داخلی شواہد کا اصول سب سے زیادہ معاون ثابت ہوگا۔

میر نے اپنے اوّلین اُستادوں میں میر جعفر علی عظیم آبادی اور سید سعادت علی امروہوی کا تذکرہ کیا ہے یعنی وہ خان آرزو کو اپنا استاد بھی تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ میر جعفر ایک مجہول شخصیت ہیں اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ شیعی مسلک رکھتے ہوں گے۔ سعادت علی

---

[1] گل مہتاب کو ہندی میں "چاندنی" کہتے ہیں۔

[2] میر کی آپ بیتی: ۹۷۔

[3] میر کی آپ بیتی: ۹۷-۹۹۔

کے بارے میں ہمیں معلوم ہے[1] کہ وہ امروہہ کے مشہور بزرگ حضرت سید شاہ شرف الدین نقوی الواسطی معروف بہ "شاہ ولایت" کی اولاد میں تھے اور امروہہ کے محلہ حقانی میں بستے تھے[2] شاہ ولایت ابن بطوطہ کے معاصرین میں سے ہیں ان کی اولاد میں بعض نے مذہب امامیہ قبول کر لیا تھا اور سعادت کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔

میر نے خانِ آرزو کے تلمذ سے اپنی برأت کا اظہار کرنا بھی شاید اسی اختلافِ عقائد کی وجہ سے ضروری سمجھا ہو۔ ورنہ خود میر کی فارسی تحریریں اس کی گواہ ہیں کہ انہوں نے فارسی کی حد تک جو کچھ سیکھا ہے وہ سب خانِ آرزو کا فیضان ہے۔ اور نکات الشعرا میں جو خانِ آرزو کی زندگی میں مرتب ہوا ہے، انہوں نے خود بھی آرزو کو "استاد و پیر و مرشد" لکھا ہے[3]

میں نے ۱۹۵۷ء میں "ذکرِ میر" کا اردو ترجمہ "میر کی آپ بیتی" کے نام سے شائع کیا تھا، اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ "ذکرِ میر" میں جو فارسی محاورات استعمال کیے گئے ہیں وہ فارسی کی مروجہ کتبِ لغات میں عام طور سے نہیں ملتے اور خانِ آرزو کی مرتبہ "چراغِ ہدایت" میں لازماً موجود ہیں اور ان میں سے بھی اکثر محاورات کے لئے خانِ آرزو نے لکھا ہے کہ اہلِ زبان سے تحقیق کر کے لکھا گیا۔ غور سے مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوا کہ "ذکرِ میر" کا پہلا تہائی حصہ میر نے اس طرح لکھا ہے کہ ایک ہی صفحے کے محاورے اپنی کتاب کے ایک پیراگراف میں استعمال کر لیے ہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کتاب چراغِ ہدایت ان کے سامنے کھلی ہوئی رکھی ہو۔ مثلاً یہ جملے دیکھیے:-

"دستے بہم رساں کہ او پسندد، جائے پیدا کن کہ باد بپیوندد۔ دست بدست بہ از خوردے دہ کہ از یں راہ، ایں راہِ فکر دست، دست بدست است۔ زینہار دست بر دست منہ، کہ چوں دست و پا خشک شوند، راہ پست است۔"[4]

دوسرے موقع پر "دست" کے محاوروں پر یوں ہاتھ صاف کیا ہے:

"دست دستِ ظالماں بود۔ دست کجی سے کردند دست پشتی سے نمودند دستِ چرب بر سرے کشیدند، دست بیاروے زباں میرسیدند تیغ ہا می آختند دست گاہ می ساختند، از دستِ شہریاں ہیچ نمی آمد زیرا کہ دست و دلِ ایشاں سرد شدہ بود لا کسے دست پاچہ می شد و کسے دست بزیر سرستون می نمود۔۔۔"[5]

---

[1] حضرت شاہ ولایت کے لئے ملاحظہ ہو: مقاصد العارفین (قلمی) مولفہ حضرت شاہ عضد الدین جعفری۔ نسخہ مملوکہ راقم نیز نخبۃ التواریخ، تاریخ اصغری، تذکرۃ الکرام اور تاریخ سادات امروہہ۔

[2] اصغر حسین: تاریخ اصغری۔

[3] نکات الشعرا، (ترجمہ میر معز فطرت)۔

[4] ذکرِ میر/۲۹ - میر کی آپ بیتی / ۵۵۔

[5] ذکرِ میر صفحہ ۸۰ - میر کی آپ بیتی / ۱۲۲۔

میر کی آپ بیتی کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت میر کی فارسی نگاری کے اس پہلو پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں تھا میں نے صرف مقدمے میں اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ ذکرِ میر کے محاورے چراغِ ہدایت کے سوا کسی دوسری لغت میں شاذ ہی ملتے ہیں۔ اب اس موضوع پر دوسرے ایڈیشن میں خاصی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے ایک مرتبہ یہ لکھ دیا تھا کہ "میر نہ منصف ہیں نہ راست گفتار۔ اُن کا حافظہ بھی زیادہ مضبوط نہیں[1]" بعض حضرات نے اس ریمارک پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسے میر کے تخفیف پر محمول کیا۔ اس ناگواری کا ایک سبب تو مشرق کی روایتی "میر پرستی" ہو سکتی ہے اور دوسری وجہ میر پر علمی تحقیق کا فقدان بھی ہے۔ اگر ہمارا علم میر کے بارے میں اتنا محدود نہ ہوتا جتنا کہ وہ آج ہے تو اس ریمارک پہ خفگی کا اظہار نہ کیا جاتا۔

میر نے اپنی سوانح عمری کے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ اُن کے دادا کو "فوج داری نواح" اکبر آباد کا عہدہ مل گیا تھا اور یہ کہ انہوں نے ملازمت کے زمانے ہی میں گوالیار میں انتقال کیا۔ دادا کا نام اُنہوں نے ظاہر نہیں کیا۔ "فوجداری نواح" خاصا بڑا عہدہ تھا اور آج کل کے ڈپٹی کمشنر کی برابر تھا۔ اگر اُن کے دادا واقعی "فوجدارِ نواح" تھے تو اُن کا زمانہ اورنگ زیب کا عہد رہا ہوگا اور عہدِ عالمگیری کے بیشتر اُمرا کا حال تاریخوں میں دستیاب ہے اُن میں کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے نواح اکبر آباد کی فوجداری کا عہدہ حاصل ہو اور اُس پر جدِ میر ہونے کا گمان کیا جا سکے۔

پہلے یہ اندازہ کر لیجیے کہ "فوجدار" کس حیثیت کا حاکم ہوتا تھا۔ شکر اللہ خان خاکسار (ف ۱۱۰۸ھ) جو میرزا عبدالقادر بیدل (ف ۱۱۳۳ھ) کے مربی اور ممدوح اور نواب عاقل خان رازی (ف ۱۱۰۸ھ) کے داماد ہیں، ۱۰۹۸ھ میں "فوجدار نواحی جہان آباد" یعنی نواح دہلی کے فوجدار تھے اور اُن کا زمانہ وہی ہے جو میر کے دادا کا عہد ہونا چاہیے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر جدِ میر اس عہدے پر تھے تو وہ کس مرتبے کے حاکم ہوں گے۔

اسی طرح بہادر شاہ اوّل کے عہد میں چین قلیچ خاں گورکھپور کے فوجدار تھے۔ یہ ہفت ہزاری تھے۔ نواب محمد امین خان بہادر جو بعد کو محمد شاہ کے وزیر اعظم ہوئے پہلے مراد آباد کے فوجدار تھے۔ عہدِ عالمگیری میں نواب ارادت خان واضح "نواح اورنگ آباد" کے فوجدار تھے۔ اُنھیں ارادت خان خطاب اور ہفت صدی ہزار ذات منصب ملا ہوا تھا۔

فوجداری کا عہدہ عموماً منصب کے ساتھ ملتا تھا یعنی خطاب بھی عطا ہوتا تھا اور جاگیر بھی۔ میر کے دادا ہفت ہزاری نہ سہی ہزاری منصب پر بھی ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اُس دور کے معاصر تاریخوں میں اُن کا حوالہ نہ آتا۔ دوسرا نکتہ یہ کہ وہ بقول میر حالتِ ملازمت میں مرے تھے۔ مغلیہ طریقِ کار کے مطابق اگر کوئی حاکم سرکاری ملازم خدمت کی حالت میں فوت ہوتا تھا تو قاضی کا مصدقہ وراثت نامہ داخل کرنے پر اُس کے ورثا کے نام پوری تن خواہ جاری ہو جاتی تھی یا اُس متوفی کے بیٹے کو وہی خطاب اور منصب دے دیا جاتا تھا۔ اگر میر کے دادا نواح اکبر آباد کے فوجدار ہوتے تو اُن کے انتقال پر یہ منصب محمد علی عرف علی متقی کو اور پھر خود میر کو ملنے میں بظاہر کوئی مانع ہونا نہیں چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ میر نے اپنے دادا کا عہدہ بڑھا کر بیان کیا ہے۔

---

[1] دلی کالج میگزین، میر نمبر (مرتبہ نثار احمد فاروقی) ۱۹۶۲ء

دوسری مثال حافظے کی کمزوری کی بھی دیکھ لیجیے۔ انھوں نے ایک درویش احسان اللہ کی خدمت میں اپنی حاضری کا بیان لکھا ہے۔ اس میں ہے کہ "شہر کے صوبیدار کا مصاحب آیا اور اُس کی درخواست پیش کی کہ نصرت یار خاں قدم بوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہے ۔ ۔ ۔ جب صوبیدار دروازے پر آیا ہاتھی سے اُتر پڑا اور دوڑ کر شرف پابوسی حاصل کیا اور پانچ اشرفیاں نذر کیں ۔ ۔ ۔" [1]

اسی میں ایک عبارت سے مترشح ہے کہ میر امان اللہ اس ملاقات کے وقت وہاں موجود تھے اور میر بھی اُن کے ساتھ گئے تھے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ہدایت اللہ بیگ ناصر الدولہ نصرت یار خاں سادات بارہہ میں سے تھا۔ یہ نواب شہامت خاں کا بھتیجا اور ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ اس نے ۲۲ رمضان ۱۱۴۴ھ کو ساٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کی وفات سے تقریباً ایک سال کے بعد میر کی ولادت ہوئی ہے۔ نصرت یار خاں نام کا دوسرا کوئی صوبیدار آگرہ میں نہیں ہوا۔ میر نے اُس کا نام سن رکھا ہوگا لیکن ذکرِ میر لکھتے وقت انھیں یہ دھیان نہ رہا کہ جس گورنر کو وہ درویش کی خدمت میں حاضر کر رہے ہیں وہ اُن کی ولادت سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اسی طرح بابا بدنامی ایک فقیر سے ملاقات کرنے گئے ہیں تو لکھتے ہیں کہ "ایک دن عصر کی نماز کے بعد اُن سے ملاقات کرنے گئے۔" مگر لکھتے لکھتے حافظے نے دھوکا دیا اور چار صفحوں کے بعد لکھتے ہیں "اسی دوران میں عصر کا وقت ہو گیا ہم اُٹھے اور اُن کے ساتھ نماز پڑھی۔"

"ذکرِ میر" کے سلسلے میں دو باتیں خاص طور سے بحث و نظر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کتاب میں جو تاریخی واقعات آئے ہیں وہ میر نے اپنی معلوماتِ عامہ سے فراہم کیے ہیں یا اُن کا کوئی ماخذِ تحریری بھی رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ذکرِ میر کا زمانۂ تالیف کیا ہے؟ ساتھ ہی یہ تعین کرنا بھی ضروری ہے کہ تاریخی ماخذ کی حیثیت سے ذکرِ میر کا پایۂ استناد کیا ہے۔ اس کی بحث میں نے میر کی آپ بیتی طبع ثانی کے مقدمہ میں کی ہے۔

(۲)

یہ اُن امور کی طرف کچھ سرسری اشارے ہیں جن کا تعلق میر کی سوانح اور اُن کے عہد کے وقائعِ تاریخی سے ہے۔ ان کا تذکرہ اسی لیے کیا گیا کہ اس امر کو ثابت کیا جا سکے کہ میر کی تحقیق اور اُس کے بارے میں معلوم حقائق کی تاویلات میں ابھی بہت کچھ بحث و نظر کی گنجائش باقی ہے۔

میر کا کلام سمجھنے کے لیے اُس عہد کے معاشی اور سماجی ڈھانچے کو اچھی طرح دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اور اس کے لئے سب سے پہلے حکومت اور سرکاری نظام کا علم ہونا چاہیے۔ میر اور سودا کی شاعری میں ایسی اصطلاحیں بکثرت استعمال ہوئی ہیں جن کے مفہوم کو اب سمجھنا ممکن نہیں رہا ہے تاوقتیکہ تاریخ کی کتابوں سے رجوع کیا جائے۔ مثلاً سرکاری عہدوں میں بخشی، میر بخشی، اور اس عہدے کے دوسرے مراتب، یا احدی، والاشاہی، یساول، کمبل پوش، میردہ، نجیب، بارگیر، مینگ باشی، قدر انداز، ذوالقدر، ذہلیت، سہ بندی وغیرہ۔ اسلحہ میں بان، جزائر، رہکلہ، غازی خان، شیر دہان، زنبورک، فوجی اصطلاحوں میں آتش، برغنار،

---

[1] میر کی آپ بیتی: ۵۸

چنڈول، قول وغیرہ ۔ اسبابِ شاہی میں تختِ رواں، کوکبہ، اختر بیگی، ماہی مراتب، چتر، ترغ یہ ایسے الفاظ ہیں کہ عام کتابوں میں بھی ان کی قابلِ اطمینان تشریح نہیں ملتی ۔ اگر اُس سماج کی کوئی مفصل تاریخ لکھی جائے یا اُس عہد کے کسی فنکار کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنا مقصود ہو تو ان الفاظ کا پس منظر ذہن میں رکھنا ضروری ہے ۔

معاشی ڈھانچے پر گفتگو کرتے ہوئے یہ ملحوظ رکھا جائے کہ آج کی حکومتوں کے زیرِ انتظام جو محکمات ہیں وہ اُس زمانے میں تمام تر عوام کی ذمہ داری تھے۔ تعلیم اور صحتِ عامہ کا محکمہ بھی سرکاری نہیں تھا۔ صنعت و حرفت کے کارخانوں کا بھی حکومت سے سروکار نہیں تھا، بلکہ بادشاہِ وقت اپنی ضروریات کی چیزیں عوام کے کارخانوں سے حاصل کرتا یا سرکاری کارخانہ جات میں ہنرمندوں کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ جاگیرداروں کی مالی حالت خراب ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اہلِ حرفہ بے روزگار ہو جاتے تھے۔ شہر آشوب کا موضوع اِسی لیے مختلف پیشہ وروں کی بے روزگاری اور کساد بازاری ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر حکومت کی اقتصادی کمزوری کا براہِ راست اثر پڑتا تھا۔

میر کے عہد میں عام لوگوں کے لیے معاشی ذرائع یہ تھے :

۱۔ سرکاری منصب و جاگیر ۔ ۲۔ زراعت ۔ ۳۔ صنعت و حرفت۔ ۴۔ سپاہ گری۔

میر کے عہد میں جاگیرداروں کا حال بہت ابتر ہو چکا تھا اور آئے دن کی یورشوں اور خانہ جنگیوں نے زراعت اور صنعت و حرفت کو بھی بہت نقصان پہنچایا تھا۔ سپاہ گری ایسا پیشہ تھا جسے آج کل کی اصطلاح میں سرکاری ملازمت کی برابر سمجھا جا سکتا ہے مگر مرکز کی کمزوری سے یہ بھی "نیم سرکاری" اور پہلے سے زیادہ غیر یقینی ہو گیا تھا۔ چند امرا تو خود مختار ہو کر اور اپنی الگ فوج رکھ کر مرکز سے دور جا بیٹھے تھے باقی امیروں کا حال کسی جواری کا سا تھا جو ہمہ وقت طالع آزمائی میں مصروف رہتا ہے ۔ اُس کی سپاہ کو بروقت تنخواہ نہیں ملتی تھی تو وہ ڈیوڑھی پر دنگا کرتے تھے ۔

اِن امرا میں دراصل اقتصادی شعور کی کمی تھی اور یہ اپنی فوج کی تنظیم بھی کسی پلان کے تحت نہیں کرتے تھے۔ اپنے روپوں کی وصولیابی کی فکر ہی میں ایک فوجی اپنے سردار کی حفاظت آخر وقت تک کرتا تھا کیوں کہ اُس کے مارے جانے کا مطلب کئی کئی ماہ کی بقایا تنخواہ کا بھی سوخت ہو جانا تھا۔ سپاہی کے گھر والے اِس عرصے میں بنیے سے اُدھار لے کر کھاتے رہتے تھے اور آہستہ آہستہ گھر کا سب اثاثہ و سامان بنیے کے پاس رہن ہو جاتا تھا۔ اگر سپاہی مالِ غنیمت لے کر واپس آ گیا تب تو اُس کا بڑا حصہ بنیے کی اصل اور سود میں چلا گیا ورنہ گھر والوں کے لیے فاقہ کشی کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا ۔

اُس وقت فوج میں رجمنٹ بھی نہیں تھے۔ ہر سپاہی کسی منصب دار کا نوکر ہوتا تھا اور وہ منصب دار اپنے سے بڑے امیر سے الحاق کر لیتا تھا اس طرح چھوٹی بڑی ٹکڑیاں مل کر پوری فوج بن جاتی تھی مگر اُس فوج کی ایک متحدہ کمان نہیں تھی ہر گروہ کا سپاہی صرف اپنے آقا ہی کا حکم مانتا تھا اور اُسی کا اعتماد دیکھتا تھا اُس کے کمزور ہونے کی صورت میں وہ باغیانہ سرگرمیاں بھی اختیار کر لیتا تھا اور اس سے خلق آزاری کا آغاز ہوتا تھا جس کی مثالوں سے ذکرِ میر بھی خالی نہیں ہے ۔

ہر منصب دار جو فوج رکھتا تھا اُسے مختلف کاری گر اور ماہرینِ فن بھی رکھنے ہوتے تھے مثلاً لوہار، بڑھئی، جرّاح، نعل بند وغیرہ۔

ایک سہ ہزاری امیر کے پاس کم سے کم دو جراح، دو آہن گر، اور چھ نعلبند ضرور ہوتے تھے۔ معاشی بدحالی کے زمانے میں یا اس منصب دار کا زوال ہو جانے پر یہ سب بے روزگار ہو جاتے تھے۔ میر اور سودا کی شاعری میں جہاں معاشی زبوں حالی کا، طلب یا اس عہد میں اہلِ حرفہ کی ناقدری کا بیان آیا ہے اس کا عالمانہ تجزیہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک ان سب کی صحیح پوزیشن اور اس سماج میں ان کے رول کا پورا علم نہ ہو۔

ایک اور پہلو رسوم و رواج کا ہے۔ یہ رسمیں کچھ تو مذہبی عقائد سے پیدا ہوتی ہیں اور کچھ کا سرچشمہ عوام کے میل جول میں تلاشیے۔ جاگیردارانہ عہد کی بہت سی رسمیں اور رواج اب ختم ہو چکے ہیں، بہت سے توہمات بھی دم توڑ گئے ہیں مگر شاعری میں ان کا حوالہ موجود ہے۔ لباس، گفتار، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے آداب سمجھنے سے بھی کلام کا پس منظر اور اس کا مفہوم ذہن نشین ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت صرف میر کی شاعری کی بازیافت ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ عمومی طور پر اس عہد کے شاعروں کا کلام ان تفصیلات کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔ میر کی شاعری میں چونکہ سماجی روابط کے حوالے بکثرت اور ان حالات کا عکس زیادہ شدت سے آیا ہے اور انہوں نے طویل عمر بھی پائی ہے اور اتفاق سے وہ پوری عمر اسی زوال آمادہ دور میں صرف بھی ہوئی ہے اس لیے انہیں ایک علامت مان کر اس طرح کا جو مطالعہ کیا جائے گا وہ دوسرے شاعروں کو سمجھنے میں بھی اتنا ہی مفید ہوگا۔

قاطع برہان کی حمایت میں

(مولوی رجب علی ارسطو جاہ کا ایک معرکہ آرا مکتوب)

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

سید رجب علی نام، نشان بہادر ارسطو جاہ خطاب و والد گرامی کا نام سید علی بخش۔ ارسطو جاہ جگر انو ضلع لدھیانہ پنجاب میں لگ بھگ سنہ ۱۲۲۴ ہجری مطابق سنہ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتب درسیہ ریاست مالیر کوٹلہ میں ختم کیں۔ ۲۵ برس کے سن میں دہلی گئے اور تین سال تک مفتی صدر الدین خان آزردہ کے مدرسے میں مزید تعلیم حاصل کی۔ تحصیل علوم کے بعد تلاش روزگار کے سلسلے میں بھوپال گئے۔ اور وہاں ملازمت کی کچھ عرصہ کے بعد کپور تھلہ گئے یہاں ۳۰ روپے ماہوار کے نوکر ہوئے۔ ایک دن راجہ کپور تھلہ نے اپنی ریاست کے معاملے میں تمام اہل کاروں سے صلاح و مشورہ کیا لیکن انھیں پوچھا نہیں۔ مہاراجہ کے اس طرزِ عمل پر ارسطو جاہ خفا ہوئے اور فوراً ملازمت کی پوشاک اتار دی۔ انہی ایام میں لارڈ لارنس گورنر پنجاب انبالہ میں مقیم تھے۔ ارسطو جاہ یہاں تشریف لائے اور صاحب ممدوح کے دفتر میں ۳۰ روپے ماہوار پر ملازمت کی قسمت کی یاوری دیکھیے کہ ایک دن لارڈ لارنس کو عرب سے ایک خط آیا۔ اور وہ زبان عربی میں تھا صاحب بہادر نے اپنے منشیوں سے اس خط کا ترجمہ کروانا چاہا تھا لیکن کوئی قابل آدمی نہ ملا۔ جو اس کا جواب ان کے منشا کے مطابق لکھتا آخر کار ارسطو جاہ نے قلم برداشتہ اس کا جواب لکھا۔ صاحب بہادر اس جواب سے اس قدر مانوس ہوئے کہ انہوں نے ارسطو جاہ کو میر منشی کے عہدہ پر ممتاز کیا اور انھیں مبلغ پانچ ہزار روپیہ بطور انعام دیا۔

ارسطو جاہ اپریل سنہ ۱۸۵۳ء میں اس جلیل القدر عہدے سے مستعفی ہو کر وطن آ گئے۔ سنہ ۱۸۵۴ء میں وہ لارڈ لارنس ریذیڈنٹ راجستان کی ملاقات کے لئے گئے۔ اس زمانے میں ان کے صاحبزادے مولوی سید شریف الحسن خان صاحب ریذیڈنٹ کے میر منشی تھے۔ ارسطو جاہ پٹیالہ، انبالہ، دہلی، ریواڑی اور جے پور کی راہ سے جہاز پور کے متصل ریذیڈنٹ کے لشکر میں جب کہ وہ دورہ پر تھے پہنچے اور پھر اودے پور سے رخصت ہو کر براہ ٹونک و اکبر آباد وغیرہ دلی میں آئے یہاں مولوی حیدر علی (متوفی ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء) صاحب منتہی الکلام سے مباحثے اور مناظرے ٹھہرے۔

ارسطو جاہ دلی میں کچھ عرصے کے لئے قیام کر کے جگرانو گئے۔ دریں اثنا ہنگامۂ غدر رونما ہوا۔ اور وہ برطانوی حکام کی ہدایت پر انبالہ پہنچے اور وہاں سے فوج لے کر دلی آئے اور دلی کو تسخیر کیا۔

ارسطو جاہ سنہ ۱۲۷۸ھ مطابق سنہ ۱۸۶۲ء میں سکھر، کراچی اور بمبئی کے راستے سے حج کرنے کے لئے گئے۔ یہ سفر تقریباً دو سال کی مدت میں ختم ہوا۔

ارسطو جاہ کو مذہب سے بڑی واقفیت تھی۔ اسی لئے مولانا اور مولوی کہلاتے تھے۔ انھیں لکھنؤ کے مشہور و معروف مجتہد مولانا حامد حسین صاحب قبلہ فردوس مآب (متوفی سنہ ۱۳۰۶ھ) سے گہرا رابطہ قائم تھا۔ مولانا موصوف سنہ ۱۲۸۴ھ میں ان کی دعوت پر جگرانو

گئے تھے۔

ارسطو جاہ عربی اور فارسی کے ایک جید عالم تھے۔ ائمہ معصومین کی مدح میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں :۔
کشف العطاء، تفسیر سورۂ ہل اتیٰ و سراکبر، تفسیر سورۂ والفجر، و افادات علیہ۔
ان کا انتقال ۷۰ برس کی عمر میں ۲۰ جمادی الآخر ۱۲۹۶ھ ہجری مطابق ۱۸۷۹ء میں جگراؤں میں ہوا۔ تاریخ وفات یہ ہے ؎

جاہ است لقب پس ارسطو مولہ پنجاب اہل ایمان
از دہر چو رفت گفت جعفر راہی جناں رجب علی خاں[1]

ارسطو جاہ نے دو فرزند چھوڑے۔ دونوں علم و فضل سے آراستہ تھے۔ مولوی شریف الحسین خان شریف العلماء اور مولوی شریف الحسن
ریاض الجناں میں ارسطو جاہ کی شان میں ایک قصیدۂ طولانی درج ہے۔ چند شعر یہ ہیں ؎

ہزار حیف کہ از سر صر حوادث دہر نماند سایہ آن ابر خلق را بر سر
ہزار سال اگر چرخ چرخ بہا یہ زند نیامدش بہ نظر آں چناں بلند اختر
یتیم پرور و مسکین نواز و مہماں دوست فلک طبیعت و قدسی نہاد و نیک سیر
وظیفہ اش ہمہ یاد خدائے عزوجل وتیرہ اش ہمہ احیائے دین پیغمبر
ہمیشہ ماند بصدق و صفا مروج دیں کہ داشت نیت صادق بمذہب جعفر

ارسطو جاہ اور مرزا غالب کے درمیان گہرے تعلقات قائم تھے۔ آپس میں خط و کتابت بھی جاری تھی۔ مرزا ان کا نام نہایت ادب و احترام سے لیتے تھے۔ جب احباب کے نام خط لکھتے تھے تو ارسطو جاہ کی خیریت بھی دریافت کیا کرتے تھے۔ مرزا یکم دسمبر بروز جمعہ ۱۸۴۹ء مطابق ۴ محرم ۱۲۶۵ھ کو منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام خط کے اختتام میں لکھتے ہیں کہ :۔

"نیز سلام من لبشوق تمام بخدمت سیدی و مولائے مولوی رجب علی خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ رسانند[2]"

مرزا غالب ارسطو جاہ کی غیر معمولی قابلیت اور جوہر شناسی کے مداح تھے۔ انہوں نے موصوف کی تصانیف خاص کر "تفسیر سورۂ ہل اتیٰ" اور "تفسیر سورۂ والفجر" کی بے حد تعریف کی۔ وہ مارچ ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں ارسطو جاہ کو ان کی تصانیف اور اپنی کتاب مہر نیمروز کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"خدائے دادگر را سپاس و بخت خداداد را آفرین کہ خواجہا خستہ نوازند۔ رہی پرورست بابستگان کند سری وار و با آوینختگان فتراک نظرے۔ فرد ؎

---

[1] ارسطو جاہ کے حالات تذکرۂ بے بہا صفحہ ۱۴۰ - ۱۵۰ مولفہ سید محمد ترکانوی سے ماخوذ ہیں۔
[2] کلیات نثر غالب صفحہ ۱۱ مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۳ء

خود پیش خود کنیسل گرفتاری ہفت
ہر دم بہ پرسش دل مایوس می رسد

آہنگ آنست کہ نامہ بنگارش ساز دادہ آید۔ وہنوز ندانستہ ام کہ زخمہ بریں تار بچہ ہنجار روان توان کرد واز پردۂ شکنجہام سخن کدام نوردازہم باید کشود۔ یارب آں نیایشنامہ کہ در ماہ مارچ سال یک ہزار و ہشتصد و پنجاہ و یک عیسوی روان داشتہ ام تا ماہ پنج سال دگر روان نہ نامہ ہرزہ عنوان دنہ فرستند کہ عبارت از موفا محمہ با قراءت نارسا بہا تا آں نامۂ خود دانہ فراوانی بار مضامین شوق بر برندگان آنمایہ گرانی کرد کہ تاں بسکبروی گراں پایگاں یعنی بدیدن ڈاک انگریزی راہی بطول دو صد کروہ جز بلغزش یکساں نتوانستند برید۔ بارے گلہ دیر رسیدن عرضداشت آں چناں دل نشین نیست کہ سپاس زود رسیدن ایں منشور عطوفت کہ ہمیدوں پاسخ نگارنم آں را از یاد بندہ وادانست کہ در نگرانی نیز بار گہ گرانی نہ داشت۔ اگر گاہے ناگاہے در اندیشہ گذشتہ باشد کہ خدام مخدوم پاسخ چرا نہ نبشتند۔ خود را بداں فریفتہ باشم کہ چوں نگارش من در گزارش سپاس روحانی ارمغانی یعنی تفسیر سورۂ ہل اتی بود۔ ہر آئینہ جواب نہ داشت۔ ایں بار از میرزا خاور نیز سپاس پذیرفتم کہ بسخن دلیری کرد۔ و بندہ را پیش خواجہ نام برد تا یاد آوردند۔ بروان داشتن نامہ روان پرور دند۔ فرمان رفتہ است کہ جزوی از تاریخ تاجداران تمرخانیہ بنظرگاہ آں والی ولایت ولائے مرتضوی فرستم ذرہ پرور را مہر گستر آں سواد جزوی چند بیش نیست۔ بعد حمد و نعت و منقبت و مدح والی عصر و سبب تالیف کتاب کہ آئین نامہ طرازاں ہنگامہ آراست از کشور کشایان تا نصیر الدین سلطان ہمایوں بسخن راندہ ام۔ باقی داستان بہ فرو است۔ امید کہ اگر مرگ اماں دہد بندۂ فرمان پذیر بزودر فرستادن آن اجزا از بندگی و فرماں پذیری نشان دہد اوراق تفسیر سورۂ والفجر در سر آغاز ایں ماہ نظر فروز آمد و سواد آں بیاض از راہ مردمک دیدہ بہ سویدائے دل فرو رفت نشگفت کہ فصلے از اں باب در ورقی جداگانہ رقم پذیرد و غازۂ عارض نامۂ اعمال من گردد۔"[1]

ارسطو جاہ کا خط قاطع برہان کی حمایت میں

ایام غدر میں مرزا اپنے گھر میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ ان کے پاس دساتیر[2] اور مولوی محمد حسین تبریزی ثم دکنی کی مشہور

[1] کلیات نثر غالب ص ۱۱۳۔

[2] دساتیر کی شرح غالب کے دوست مولوی نجف علی خان نے ۱۸۶۵ء میں "سفر نگ دساتیر" کے نام سے شائع کی تھی۔ اس کا اشتہار اودھ اخبار

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحے پر)

فرہنگ برہان قاطع کا ایک ایک نسخہ موجود تھا۔ مرزا نے بقول حالی جب برہان کو اٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا تو پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی ...... طریقہ بیان اکثر بھونڈا اور اصول صنعت لغات نگاری کے خلاف پایا۔ انہوں نے یادداشت کے طور پر اعتراضات قلمبند کئے اور آخر کار ایک کتاب مرتب ہو گئی جس کا نام قاطع برہان رکھا گیا[1]

مرزا ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء بروز جمعہ کو مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"برہان قاطع کی اغلاط بہت نکالی ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے اس کا نام قاطع برہان رکھا ہے۔ اب اس کے چھاپے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو گیا تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دوں گا۔ ورنہ کاتب سے نقل کروا کر تم کو ایک جلد بھیج دوں گا۔ بہت سودمند نسخہ ہے۔"[2]

قاطع برہان پہلی مرتبہ ۱۸۶۲ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے چھپی۔ امیر اللہ تسلیم نے تاریخ طباعت کہی ؎

مرتب شد چو این نادر کتابے ز فکر غالب عالی جنابے
زہے غالب شہ ملک معانی خداوند جہان نکتہ دانی
گہر ہائے وقت انجاش منالش خیال آمد پے تاریخ سالش
نوشتم مصرعی شرح مطالب
عجائب معجزہ تحقیق غالب[3]

قاطع برہان کے چھپتے پر ادبی حلقوں میں گویا قیامت برپا ہو گئی۔ اور بقول غالب معتقدان برہان قاطع برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ معترضین نے قاطع کے جواب میں کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نمبر ۱۲ جلد ۱، ص ۲۱۹ مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۶۵ء مطابق ۲۹ شوال ۱۲۸۱ھ روز سہ شنبہ میں ان الفاظ میں چھپا تھا۔

"اہل خرد کو مژدہ ہو کہ کتاب دساتیر کی شرح تصنیف کی ہوئی اشرف الفضلا مولوی نجف علی خان صاحب قاضی زادہ جھجھر کی جن کی تصنیف ہر علم میں قابل تحسین ہے۔ چنانچہ شرح غیر منقوط ان کی تعلقات تحریری جلد بر قریب سو جز کے ہے۔ علی الخصوص قدیمی اور پارسی زبان کو موبدان زردشتی سے سیکھا۔ طبع ہو کر مع عبارت دساتیر کے۔ نسخہ دساتیر کی احتیاج باقی نہ رہے۔ واقع شہر دہلی بلی ماروں کے محلے میں حکیم محمد حسن خان مرحوم کے مکان میں نواب محمد حسین خان عرف چھوٹے مرزا صاحب کے پاس موجود ہیں۔ شرح اس کی قیمت کی محصول ڈاک کے ایک روپے دو آنہ ہے۔ جن صاحبوں کو مطلوب ہو قیمت بھیج کر طلب فرما دیں اور لطف اٹھاویں۔"

[1] یادگار غالب ص ۳۵ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

[2] اردوئے معلی حصہ دوم ص ۳۲ مطبع مجتبائی ۱۸۹۹ء

[3] نظم اردو جلد ص ۳۵۶۔

قاطع القاطع (مولوی امین الدین پٹیالوی) محرق قاطع (مولوی سعادت علی)
ساطع برہان (مرزا رحیم بیگ) مؤید برہان (مولوی احمد علی)
مندرجہ بالا تصانیف کے جواب میں درج ذیل کتابچے غالب اور ان کے حامیوں نے لکھے۔
دافع ہذیان (مولوی نجف علی خان) لطائف غیبی (سیف الحق) سوالات عبدالکریم (غالب)
نامۂ غالب (غالب)۔
تیغ تیز (غالب)

مرزا غالب نے قاطع برہان مزید اضافوں کے ساتھ دوسری مرتبہ دسمبر ۱۸۶۵ء میں چھپوائی اور اس کا نام درفش کاویانی رکھا۔ مرزا اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"قاطع برہان کہ صنعت نقش بند خیال من ست۔ نہ نامۂ اعمال من ست کہ دراں جہاں بمن خواہند سپرد۔ ہمدریں جہاں خواہد ماند۔ دردل فرود آمد کہ بہ مقامے چند کلامے چند بیفزایم۔ وایں مجموعہ را کہ قاطع برہان نام نہادہ ام سپس درفش کاویانی خطاب دہم ۔

نازم بجز ام کلک وطرز رقمش
ماناست ز تیزی بدم تیغ دمش

چوں اسم کتاب قاطع برہاں بود
گردید درفش کاویانی علمش

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔ کاش کوئی صاحب قلم قاطع برہان، قاطع القاطع، محرق قاطع، ساطع برہان، شمشیر تیز تر، لطائف غیبی، تیغ تیز اور دافع ہذیان وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد درفش کاویانی کا متن مرتب کرکے شائع کرتا۔ یہ بات قابل فکر ہے کہ مرزا نے جو اعتراضات برہان قاطع پر کئے ان کی جابجا تائید ایرانی مصنف رضا قلی خاں کی فرہنگ ناصری سے بھی ہوتی ہے۔ قاطع برہان کی اہمیت وافادیت پر حالی نے اپنی جچی تلی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ۔

" اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قاطع برہان کے لکھنے سے مرزا کی سلامتی طبع اور ذوق صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ اور جیسا کہ وہ (مرزا) ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ :

" فارسی زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اسی طرح جاگزین ہیں جیسے فولاد میں جوہر[1]"

ارسطو جاہ نے قاطع برہان کا مطالعہ بغائر نظر کیا تھا۔ وہ مرزا کی اس تصنیف سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے کتاب کی حمایت

---

[a] آزاد (آب حیات صہ ۱۹۵) حالی (یادگار غالب صہ ۱۵) مالک رام (ذکر غالب صہ ۱۲۹) اور عرشی رامپوری (مکاتیب غالب صہ ۳) کی رائے میں مخفی طور پر مرزا غالب کی تصنیف ہے۔ [1] یادگار غالب صہ ۱۲

میں مرزا کو ایسی قابلِ قدر تصنیف پر آفرین کہی - اور ایک معرکہ آرا و معلوماتی مکتوب مورخہ ۱۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو غالب کے نام لکھا جو ۲ مئی ۱۸۶۵ء مطابق ۵ ذی حجہ بروز سہ شنبہ ۱۲۸۱ھ کو اودھ اخبار لکھنؤ میں شائع ہوا تھا - یہ خط ایک عشقک برابر ہے اور اس کا حوالہ راقم الحروف کی نظر میں کہیں نہیں گزرا ہے - ماہرینِ غالبیات کے لئے اس کا مطالعہ کرنا بے حد سود مند ہوگا - ذیل میں یہ خط من و عن درج کیا جاتا ہے -

* اودھ اخبار - نمبر ۱۸ ۲ مئی ۱۸۶۵ء مطابق ۵ ذی حجہ ۱۲۸۱ھ روز سہ شنبہ جلد ۷ صفحہ ۲۹۸ کالم ۱ - جناب مرزا اسد اللہ خان بہادر غالب دہلوی ۔

نقل مکتوب جناب معلی القاب زبدۂ اولادِ حضرت خاتم المرسلین بحر مواج علم و یقین مولانا و بالفضل اولینا ارسطو جاہ مروی سید رجب علی خان بہادر بنام نامی فخر متاخرین وارث منطق ایران زمین رشک عرفی و فخر طالب مولانا اسد اللہ خان غالب -

سرنامہ

بعون تعالیٰ در شاہجہان آباد بسامی مطالعۂ فخر زماں و زمانیاں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ

اسد اللہ خان بہادر غالب تخلص عرف مرزا نوشہ سلمہ اللہ والبقاہ موصول باد - راقم آثم

سید رجب علی عفی عنہ از جگراؤں یازدہم اپریل ۱۸۶۵ء ٹکٹ چسپانیدہ شد -

عبارت مکتوب

ہو المستعان فی کل حین و آن   لائح خاطر اشراقات مظاہرہ

تاباں اختر سپہر فصاحت درخشاں نیر سمار بلاغت فروغ انجمن ہمہ دان مسلم الثبوت ہفت زبانان آرایش وسادۂ فارسیان مصداق ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا - دریں زمان غالب الشعراء مرزایان مرزا حصل اللہ مرامہ اعلی اللہ مقامہ - بعد از سلامی کہ مدسینش از ایوان کیواں برتر باشد و شوقی کہ در وسعت آباد چرخ اطلس نگنجد یاد کہ قاطع برہان را از آغاز تا انجام دیدم - سوگند برابطہ کہ دلہائے ایمانیاں باہم دگر از روز ازل مستحکم و مشید کردہ انداز تحقیقات و تدقیقات آں یگانہ گوہر دریائے معنی خطی بر داشتہ ام کہ خامہ از شرحش بوجوہ قاصر سیما افادات طبع نقاد و ذہن وقاد کہ در خاتمہ لقالب عبارات سحر آیات ریختہ اند و خاصۃً نکات فرزانہ سرمرزدم عبد الصمد و شعر نظیری کہ حسب حال خود نوشتہ اند - ز فلک آمدہ بودی چو مسیح ائے خواندہ - دلم بدرد آمدہ دیواش آنکہ اگرچہ ہرزہ گرداں کوئے سفاہت را کہ سعادت مساعد ایں طائفہ نشدہ باشد - راہ حسد بیہودہ باشند - محل تردد نیست کہ لقرت از خورشید رخشاں مانع افاضۂ انوار نتواند شد و کم مایہ دوں فطرت کہ از عروج براوج افلاک معانی بمراحل پست بودہ باشد - بسان کدر بجمال سرنیدگی خود با سرو باغ ارم دعویٰ برابری کند - درنگاہ مایہ شناسان چقدر رسوا شدہ باشد حسب حال آں علوی خیال این ست ؎

خاقانی آنکساں کہ براہ تو می روند   زاغ اند و زاغ را روش کبک آرزوست

گیرم کہ مار چوبہ کند تن بشکل مار   کو زہر بہر دشمن و کو مہرہ بہر دوست

حرف ناشناس بے سعادت اعتراض بر او الہوس کردہ شگفت - بوالہوسی بدرد شکار آوردہ - شرح عبد الواسع ہانسوی بر بوستاں

ہم ندیدہ - اولفظ بوالہوس را از غلط نساخ گفتہ - بل بلا واو بمعنی بسیار نوشتہ - والمن قائل می دوست دوامان آل رسول را بنادرستی ترکیب عربی و فارسی از تہمت بوالہوس بمعنی کنیت پاک ساختہ - فاضل وحید العصر فرید الدہر مولوی نجف علی خان رفع مہوزہ ملزی معترض در شرح معنی آیات چنانچہ می بایست کردہ و سیف الحق در رسالہ غیبی شمشیری کشیدہ کہ از زبانہ اش سنگ خارا خاکستری شود - حال مورد چہ بودہ باشد - در قاطع برہان اکثر بیان غلطی ہمچناں دیدم کہ زعفران زار خندہ حضار را بوجہ آوردہ - و تاب و طاقت خود نماند منجملہ آن در لفظ قافلہ سالار رفت و مبارش انچہ نوشتہ اند معاذ اللہ نسبت بہ وفات حضرت قاب قوسین مرتبت صلوات اللہ علیہ و آلہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ - قلم این وقت ہم از بیانش از دست می افتد - عجب خبطی و طرفہ مالیخولیائے است - استغفر اللہ نعت ما ہوچی شمہ مختصر تفصیلی کہ دریں باب کردہ اند - بخدا کہ اگر طابع کتاب این صنعت را بکار بردہ این شعر بحالش صادق ؎

من و مرغی من ہر دو آں چناں مجہول
کہ ہر دو را دو مرغی خوب می باید

وغیرہ برہمہ ہویدا ست - دریں بارہ جواب آں جناب صحیح کہ بہ زبان برندہ دلیان کوہ قاف باشد - از فرط خندہ سرشارم پس لغزش قلم را معذور خواہند داشت -

دو غلطی کہ از آں مکرم در تمام این کتاب در اشتقاق و اشتراک بوقوع آمدہ - بر سبیل شذ و ذو ندور است - قابل التفات نیست - چرا کہ در کتاب درۃ الغواص فی اغلاط الخصوص غلطی ہائے علمائے متبحر درج است - منجملہ آں لفظ جدہ بضم جیم است کہ دو منزل ایں طرف از مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً بر ساحل دریائے شور است و اکثر علماء و فضلائے عرب و عجم و ہند جدہ بفتح جیم بتلفظ می آرند و می گویند کہ قبر حضرت حوا در آں جا است کہ نسبت بہر انسان جدہ است - بفتح جیم باید خواند و عند التحقیق غلط است و ایں کتاب نزدم موجود و از ایں جنس دران مندرج - لیکن کثرتی کہ دکنی در اغلاط بکار بردہ مصداق الاکثر حکم الکل است و طرفہ کہ آں مکرم سر رشتہ لغات در ہمہ برہان قاطع را بہ براہین متین قطع کردہ اند - ناطقہ را یارا سائے شرحش نیست کہ غلط و جدائی است -

دل من داند و من دانم و داند دل ما

للہ درکم والسلام علیکم و قلبی لدیکم - چہارم ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق یازدہم اپریل سنہ حال مقام جگراؤں ضلع لودھیانہ ؎

سالک کی اداریہ نگاری کا اوّلین دَور

ڈاکٹر عبد السلام خورشید

عبدالمجید سالک کی صحافتی زندگی کا آغاز مجلاتی صحافت سے ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں "فانوسِ خیال" کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا۔ وہ بند ہوا۔ تو وہ ہو کر شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کے ادبی معاون بنے۔ "تہذیبِ النسواں" اور "پھول" کی ادارت کرتے رہے۔ سید امتیاز علی تاج نے ۱۹۱۰ء میں "کہکشاں" کے نام سے ایک علمی اور ادبی مجلہ نکالا۔ تو اُس میں "گمنام" کے قلمی نام سے افسانے، نظمیں غزلیں اور مضامین لکھتے رہے۔ وہ سیاست سے قطعی طور پر لاتعلق تھے کہ ایک دن مولانا ظفر علی خان سید ممتاز علی سے مل کر سالک کے کمرے میں آئے۔ کہنے لگے۔ آپ جیسا ادیب اور شاعر اور بچوں اور عورتوں کے رسالوں میں محدود ہو کر رہ جائے۔ یہ دردناک بات ہے۔ اب ذرا کھلی فضاؤں میں کام کیجیے اور گلدستہ بہار ہو کر قلم کے جوہر دکھائیے۔ ہر چند سالک نے کہا کہ میں نے تو آج تک کسی روزانہ اخبار کا دفتر بھی نہیں دیکھا۔ میں روزانہ اخبار نویسی کیا جانوں اور سیاسی مقالہ نگاری سے مجھے کیا واسطہ؟ لیکن مولانا کا اصرار غالب آیا اور وہ یکم اپریل ۱۹۲۰ء کو "زمیندار" سے وابستہ ہو گئے۔ "سرگزشت" میں لکھتے ہیں: "پہلے ہی دن سے مجھے مقالہ افتتاحیہ لکھنے اور کسی قدر ترجمہ کرنے کی خدمت تفویض ہو گئی۔ اور میں ملک کے سب سے بڑے اخبار کا ایڈیٹر بن گیا۔" مولانا ظفر علی خان نے چند دن ان کا کام دیکھا۔ تو ادارت کی پوری ذمہ داری انھیں سونپ دی اور خود سیاسی دوروں میں مصروف ہو گئے۔ ۱۵ مئی ۱۹۲۰ء کو وہ ایک تقریر کے سلسلے میں گرفتار ہو گئے اور پانچ سال کے لئے اسیرِ فرنگ ہو گئے۔ تین چار مہینے بعد اُن کے فرزند مولانا اختر علی خان بھی گرفتار ہو گئے۔ کیونکہ حکام نے انھیں "زمیندار" کا ایڈیٹر قرار دے دیا تھا۔ سالک اپنی "سرگزشت" میں لکھتے ہیں: "میں نے اپنی شہادت میں کہہ بھی دیا کہ اختر علی خاں کو ایڈیٹری سے کوئی تعلق نہیں۔ لکھنے والا تو میں ہوں۔ لیکن قانون نے تسلیم نہ کیا۔ اور اختر تین سال کے لئے مرتبۂ اسیری پر فائز ہو کر لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیئے گئے۔" ۴ نومبر ۱۹۲۱ء کو مولانا عبدالمجید سالک بھی گرفتار ہو گئے اور انھیں ایک سال قید کا حکم سنایا گیا۔ گرفتاری کا سبب ایک اداریہ تھا۔ جس کا عنوان تھا "خونخوار انگریز"۔ ۱۹۷۴ء کے آغاز میں مجھے ایک صاحب نے "مشرق" کے فیچر نگار ریاض بٹالوی کے توسط سے ۱۱ ستمبر ۱۹۲۱ء سے ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۱ء تک کے کچھ شمارے بھیجے۔ حسنِ اتفاق ملاحظہ فرمایئے کہ پہلا پرچہ اُٹھایا۔ تو "خونخوار انگریز" کے عنوان سے اُن کا اداریہ مطالعے میں آگیا۔ اس کا پورا متن پیش کرتا ہوں:۔

"جس قوم میں روحانیت کا شمہ بھی باقی نہ رہے۔ اور جس کے افراد شب و روز مادیت کی متعفن ہوا میں سانس لیتے ہوں۔ ان کے اخلاق اور ان کی انسانیت کو بعض ایسی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ جن سے وہ انسان نہیں رہتے۔ بلکہ خون آشام درندے بن جاتے ہیں۔ خونخوار کا لفظ بعض انسانوں کے لیے اب

تک مجازی معنوں میں استعمال ہوتا رہا اور ظالم و سنگ دل اشخاص خونخوار کہلاتے رہے۔ لیکن ان سطور کے عنوان میں لفظ خونخوار اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۲۳ر اگست کو ملکھوا کے اجلاس کانگرس میں سیکرٹری صاحب ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی میرٹھ نے یہ واقعہ بیان کیا کہ اُن کے شہر میرٹھ میں ایک انگریز تھا۔ جو بچوں کو ذبح کر کے اُن کا خون پیا کرتا تھا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر کے اُس کا چالان کر دیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے سول سرجن کی سفارش پر اس کو کسولی بھیج دیا اور اپنے فیصلے میں تحریر کیا کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے۔ علاج سے تندرست ہو جائے گا۔ اس کو دو سو روپے ماہوار علاج کے لئے دیا جائے۔ سُنا گیا ہے کہ اس انگریز نے تقریباً پچاس بچے محض اپنی خونیں پیاس بجھانے کی خاطر قتل کئے اور ان کی نعشیں کسی نامعلوم مقام پر پھینک دیں یا گاڑ دی ہیں۔

"مجازی معنوں میں تو بارہا سُنا کہ انگریز محکوم قوموں کا خون چُوس رہے ہیں۔ لیکن حقیقی و لغوی معنوں میں سُننے کا اتفاق آج ہی ہُوا اگر یہ واقعہ درست ہے تو ایک خونی کو دو سو روپے ماہوار وظیفہ دے کر کسولی کے سرد مقام پر بھیج دینا کہاں کا انصاف ہے؟ اگر یہ انگریز دیوانہ تھا۔ تو صرف بچوں ہی کو کیوں قتل کرتا تھا۔ ذرا کسی بڑے آدمی پر بھی حسنِ خون آشامی کی کوشش کر کے مزہ دیکھتا۔ لیکن پھر بھی کیا ہوتا۔ پھر بھی دیوانہ قرار دیا جاتا، اور دو سو روپے ماہوار مقرر ہو جاتے جس حکومت کے با اختیار حکام اپنے اختیارات کا ایسا ناجائز استعمال کریں۔ اس قسم کے طرفدارانہ فیصلے لکھیں۔ پھر جو ان فیصلوں پر نکتہ چینی کرے۔ اُسے ۱۵۳۔ الف کے ماتحت ماخوذ کر لیں۔ ایسی حکومت سے کس احمق کو اُمیدِ فلاح ہو سکتی ہے؟" —

[۱۱ر ستمبر ۱۹۲۱ء۔ صفحہ ۲، ۳]

سالکؔ "سرگذشت" میں لکھتے ہیں کہ" اس زمانے میں جمعیت العلما قائم ہوئی۔ جس کے صدر مفتی کفایت اللہ اور ناظم مولانا احمد سعید قرار پائے اور پانسو علمائے جلیل القدر کے دستخطوں سے ترکِ موالات کا ایک فتویٰ صادر ہُوا۔ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا۔ لیکن میں نے دوسرے ہی دن زمیندار میں وہ تمام آیات و احادیث مع ترجمہ شائع کر دیں۔ جن کی بنا پر اس فتویٰ کی ایک ایک دفعہ مرتب کی گئی تھی اور حکومت کو چیلنج دیا کہ زمیندار کے اس پرچے کو ضبط کرے۔ لیکن اربابِ حکومت اس چیلنج کو پی گئے۔" زمیندار کے جو شمارے میرے زیرِ نظر ہیں۔ اُن سے اس واقعے کی تفصیلات کا علم ہو جاتا ہے یاد رہے کہ فتوے اگست ۲۰ء میں صادر ہُوا۔ اس کے دس مہینے بعد ضبطی کا حکم جاری ہُوا اور قریب قریب تین مہینے بعد اُن اخبارات کی ضبطی کا فیصلہ ہُوا۔ جن میں یہ فتوے درج کیا گیا تھا۔ حکومت نے ستمبر ۲۱ء میں اس کا جواز یہ بتایا کہ فتویٰ مذہبی نہیں سیاسی تھا۔ اس لئے ضبطی سے یہ منشا نہیں تھا کہ مسلمانوں کے احکامِ مذہبی میں دست اندازی کی جائے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سالکؔ نے لکھا۔

"— سبحان اللہ کیا منطق ہے۔ فتوے پر تقریباً پانسو علمائے دین کے دستخط ہیں۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسول سے نصیں پیش کی گئی ہیں۔ سرتاپا ایک مذہبی تحریر اور ایک دینی حکم ہے اور اس کے متعلق ارشاد ہوتا

ہے کہ یہ سیاسی فتوےٰ ہے۔ لہٰذا اس کا ضبط کرنا جائز ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سیاسی فتوےٰ اور مذہبی فتوےٰ کی تقسیم چہ معنی دارد۔ اگر کسی مسئلہ سیاسی میں ہم اپنے مذہب کے احکام معلوم کرنا چاہیں اور علماء قرآن و حدیث سے بدلائل قطعی ہمیں ایک حکم دیں۔ تو کیا اس حکم اور اس فتویٰ کی حیثیتِ مذہبی ساقط ہو جاتی ہے؟ ـــــ جن لوگوں کے نزدیک قسطنطنیہ، مکہ، مدینہ، جزیرۃ العرب اور تمام مقاماتِ مقدسہ کو غیر مسلم فوجوں کے قدموں سے ناپاک کر دینا بھی مذہب میں دست اندازی کا مترادف نہ ہو۔ ان کے لئے فتویٰ کیا شے ہے؟ وائے برحالِ ما۔ وائے بر بے حرمتی دینِ خدا۔"

[۱۱ر ستمبر ۲۱ء ۔ صفحہ ۲]

۱۶ر ستمبر ۲۱ء کو پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے "زمیندار" کے دفتر کی تلاشی لی۔ اور تیرہ مہینے گیارہ دن پہلے "زمیندار" کی تہتر کاپیوں پر قبضہ کر لیا اور مدیر "زمیندار" کو ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا کہ وہ اس فتوے سے کوئی اقتباس بھی شائع نہ کرے۔ نوکر شاہی کی سستی ملاحظہ ہو کہ اتنا عرصہ خاموشی رہی اور اس دوران میں صرف مجلس خلافت پنجاب اس فتوے کی باون ہزار کاپیاں پمفلٹ کی شکل میں اور تیس ہزار کاپیاں اشتہارات کی شکل میں صوبے بھر میں تقسیم کر چکی تھی۔ ۱۸ر ستمبر کے شمارے میں مولانا ظفر علی خاں کی ایک نظم اس موضوع پر چھاپی گئی۔ چونکہ یہ جیل سے بھیجی گئی تھی۔ اس لئے اس پر اُن کا قلمی نام "مسلم" درج تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

باقی نہ رہا جب کوئی ڈھنگ اور جفا کا ۔۔۔ فتویٰ ہی لیا چھین انھوں نے علماء کا

فتویٰ تو پھر اک پُرزۂ کاغذ ہے کہ اس کو ۔۔۔ بازیچہ بنا سکتی ہے سر کار صبا کا

قرآن کی آیات کو کاغذ سے مٹا دو ۔۔۔ اور چھاپ دو اس پر سبق اقرارِ وفا کا

مٹتا ہے مٹائے سے کبھی نامۂ تقدیر؟

قانون کہیں ضبط ہوا بھی ہے خدا کا؟

ایک دن بعد اس موضوع پر سالک نے ایک مفصل افتتاحیہ قلمبند کیا۔ فتوے کی ضبطی کو مداخلت فی الدین قرار دیا اور لکھا:

"مسلمانانِ ہند سے ہماری یہ استدعا ہے کہ وہ اپنی اس مذہبی توہین کا نہایت مردانہ وار صبر و استقلال سے مقابلہ کریں اور اس کے جواب میں موجودہ نظامِ حکومت کی تباہی و بربادی کے وہ وسائل و ذرائع استعمال کریں جن کا حکم جمعیت العلماء، خلافت کانفرنس اور کانگرس نے دے رکھا ہے یعنی ترکِ موالات کے تمام مدارج و منازل مکمل کر دیں۔ کھدر پہن لیں۔ جیل میں جانے کے لئے تیار رہیں اور اس حکومت کے خلاف امن پسندانہ جنگ کرنے کے لئے اپنے تحمل و برداشت کی طاقتوں کو مجتمع کر لیں۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ پروردگارِ عالم اپنے دینِ قیم کی اس تمام بے حرمتی کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ جو طاقتیں اسلام کی توہین پر تلی ہوئی ہیں ان کے لئے آخر میں ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں۔"

[۱۹ر ستمبر ۲۱ء]

اس افتتاحیے میں علمائے کرام سے اپیل کی گئی کہ "وہ اپنے زاویہ ہائے عزلت سے نکلیں اور ترک موالات کی تبلیغ و منادی کے لئے کمربستہ ہو جائیں کیونکہ صرف فتویٰ دے دینا اور اس کے ضبط ہو جانے پر خاموشی سے بیٹھے رہنا علمائے حق کی شان سے بعید ہے۔"

اس کے بعد "ہمارا آئندہ نظام عمل" کے عنوان سے ایک اور افتتاحیہ لکھا۔ اور فتوے کی ضبطی اور بزرگانِ ملت کی گرفتاریوں کی مذمت کرتے ہوئے اپیل جاری کی کہ "خطاب یافتہ اپنے خطاب چھوڑیں۔ سکولوں اور کالجوں کے وہ طلبہ جنھیں اپنے مذہب اور اپنی قوم کی حرکت کا ذرہ برابر بھی خیال ہے، وہ تعلیم ترک کر کے ہمہ تن خدمت خلافت پر کمربستہ ہو جائیں۔ جن وکلا کے دلوں میں ذرا بھی غیرت ملی کی جھلک باقی ہے۔ اُن پر لازم ہے کہ اب وہ عقل و شعور سے کام لیں اور ضروریات ملت کا احساس کر کے اپنے اس پیشہ موش کو چھوڑ دیں۔ جو بروئے فتویٰ حرام قرار دیا جا چکا ہے۔" اس کے بعد کہا گیا کہ سیاسی آزادی معاشی آزادی سے جنم لے گی اور معاشی آزادی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ وہ ایک ارب بیس کروڑ روپے دشمنانِ اسلام اور دشمنانِ خلافت کی جیب میں نہ چلے جائیں۔ جو ہم بدیشی چیزوں پر صرف کرتے ہیں۔ لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ نہ صرف غیر ملکی کپڑے، بلکہ ہر غیر ملکی چیز کا استعمال ترک کر دیں۔ اس کے بعد لکھا:-

"اب ترکِ موالات کی صرف دو شقیں باقی ہیں۔ جن پر ہمیں آئندہ عمل کرنا پڑے گا۔ یعنی خلاف ورزی قانون اور عدم ادائے محصولاتِ سرکاری لیکن جب تک جمعیت العلماء، خلافت کمیٹی اور کانگرس ان تدابیر کے اختیار کرنے کا قطعی حکم نہ دیں۔ اس وقت تک خاموش رہنا اور ان تدابیر کے اختیار کرنے کی تیاری کرنا لازم ہے کہ ہم اپنے دل سے قید و بند کا خوف بالکل دور کر دیں اور جیل کو اپنی آزادی کا گھر سمجھیں۔ تکالیف و مصائب کی پروا نہ کریں اور عدم تشدد کو اُس وقت تک اپنا عقیدۂ مذہبی سمجھیں۔ جب تک علمائے کرام اس کے خلاف فتوے نہ دے دیں۔ اگر عدم تشدد اور تحمّل مصائب کی رُوح سرتاپا ہمارے اندر حلول کر جائے۔ تو یقیناً ہم قانون کی خلاف ورزی اور ٹیکس ادا کرنے سے انکار۔ یہ دونوں کام نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔"

[۲۴ ستمبر ۲۱ء]

اگلے دن اسی موضوع پر ایک اور افتتاحیہ چھاپا گیا۔ جس میں مرکزی قانون ساز کونسل کے اُن مسلمان ممبروں کی مذمت کی گئی جنھوں نے فتوے کی ضبطی میں حکومت سے تعاون کیا۔ اُسی دن کے شمارے میں جمعیت العلمائے ہند کے اس فیصلے کی اطلاع دی گئی کہ فتویٰ بدستور چھپتا رہے اور اُس کی تبلیغ و اشاعت جاری رہے ۲۸ ستمبر کے شمارے میں اسی موضوع پر ایک افتتاحیے کے دوران میں تجویز کی گئی کہ اس فتوے کو اشتہار کی صورت میں چھاپ کر ایسے مقامات پر چسپاں کیا جائے۔ کہ حکومت "فتوے کی ضبطی کے بے سُود شغل سے کنارہ کش ہونے پر مجبور ہو جائے۔" اس افتتاحیے میں حکیم محمد اجمل خان سے اپیل کی گئی کہ تحریک کی رہنمائی اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ کیونکہ "محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خان اور ڈاکٹر کچلو کی مفارقت کے بعد اب مسلمانوں کی نگاہیں رہ رہ کر آپ ہی کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔"

۷ اکتوبر ۲۱ء کے شمارے میں سالک کا وہ معرکۃ الآرا افتتاحیہ درج ہے جس کی طرف انہوں نے "سرگذشت" میں اشارہ کیا تھا۔ اس کا عنوان ہے "خدا کا کلام اور دُنیا کی حکومت، ضبطیٔ فتوے سے کیا مراد ہے؟" پہلے وہ نو آیاتِ قرآنی مع ترجمہ پیش کی گئیں۔

جو فتوٰی میں مندرج تھیں۔ نمونے کے طور پر پہلی آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو: "جن کافروں نے دین کے معاملہ میں تم سے قتال کیا۔ تم کو اپنے ممالک سے بے دخل کر دیا اور تمہارے اخراج یعنی بے دخل کرنے میں مدد دی۔ ان سے دوستی اور باہمی امداد کرنے سے خدا تمہیں روکتا ہے اور جو لوگ ایسے کفار سے موالات رکھیں وہ سب ظالم ہیں۔" آیات کے بعد جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمایئے ضبطیٔ فتوے کے سلسلے میں پولیس کے حکام کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ متعلقہ فتوے کی نقول اور وہ تمام تحریریں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ جن میں فتوٰی مذکور کل یا اس کا کچھ حصہ مندرج ہو۔ بحقِ ملکِ معظم ضبط کر لی جائیں۔ مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی اور ان کا ترجمہ بھی اسی فتوے کا ایک حصہ ہے۔ اگر وہ تمام کاغذات اور کتابیں، جن میں یہ آیات مندرج ہیں، قابلِ ضبطی قرار دی گئی ہیں۔ تو پھر زمیندار کا یہ پرچہ اور ہندوستان بھر کے قرآن مجید بھی اسی تحت میں آجاتے ہیں اور ان کی ضبطی بھی بروئے اعلانِ حکومت ضروری ٹھہرتی ہے۔" اسی سلسلے میں جمعیت العلمائے ہند کی تعریف کی گئی کہ اس نے ضبطی کے بعد فتوے کی دس ہزار کاپیاں چھاپ کر تقسیم کر دیں۔ اور اس خلاف ورزی کے لئے کانگرس سے بھی مشورہ لینا ضروری نہ سمجھا کیونکہ یہ ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے جس میں کانگرس کوئی رائے نہیں دے سکتی اور مسلمان اس مسئلے میں کسی دنیاوی مصلحت یا سیاسی دُور اندیشی پر عمل نہیں کر سکتے۔"

قومی مسائل پر دوسرے اداریے

غلّے کی گرانی

اناج کی کمی اور گرانی کا سبب یہ بتایا گیا کہ انگریزوں نے ہندوستان سے اناج بہت بڑی مقدار میں برآمد کر دیا۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ برآمد روک دے۔ اور بلدیات، مزدور جماعتوں اور رفاہِ عام کی انجمنوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ مہنگے داموں اناج خرید کر عوام کے ہاتھ سستے داموں بیچیں۔ اور خسارہ خود برداشت کریں۔ تاکہ لوگ بھوکوں نہ مریں۔ اس کے ساتھ ہی لکھا کہ "یہ مصیبتیں چند روزہ ہیں۔ خدائے تعالیٰ عنقریب ہندوستان کو آزادی بخشے گا۔ درآمد و برآمد کا نظام ہمارے اپنے قبضے میں ہوگا۔ پھر انشاء اللہ تمام مشکلیں رفع ہو جائیں گی اور ہندوستان کی زرخیز سرزمین پر رہنے والوں کو کبھی قحط کی بلائے آسمانی سے واسطہ نہ پڑے گا۔ خدا وہ مبارک دن ہندوستان پر جلد لائے۔" (۱۷ ستمبر)

بیوی کرے، میاں بھرے

اُس زمانے میں برما ہندوستان ہی کا جزو تھا۔ وہاں کے بعض افسروں کی بیگمات نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ تو حکومت کی طرف سے افسروں کے نام ہدایت جاری ہوئیں کہ وہ اپنی بیویوں کو ایسے کاموں سے روکیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ اب "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی ہندوستانیوں کے حرم کی چار دیواری میں بھی گھسی جا رہی ہے۔ اور میاں بیوی کے درمیان نفاق و شقاق کے اسباب پیدا کئے جا رہے ہیں۔" (۱۷ ستمبر)۔

مسلمان اور عدمِ تشدد

علی برادران کی گرفتاری کی افواہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے حکومت کو بتایا گیا کہ اگر یہ دو رہنما نہ ہوتے تو مسلمان تشدد پر اُتر آتے۔ خفیہ انجمنیں بناتے۔ انقلاب پسند جماعتیں مرتب کرتے۔ بم پھینکتے۔ قتل و خونریزی سے اپنے دل کا بخار نکالتے اور خدا جانے کیا کچھ کرتے۔ ایسے ذی اثر اور حیرت انگیز اقتدار رکھنے والے رہنماؤں کو گرفتار کرنا دانش مندی اور عاقبت اندیشی سے بالکل بعید ہے اور اس امر کا اندیشہ ہے کہ ان کی گرفتاری کے بعد مسلمان عدمِ تشدد پر عامل نہ رہ سکیں اور

جذبات کی برانگیختگی کچھ اور رنگ لائے ۔ (۱۸ ستمبر)

مذہبی رہنماؤں کی گرفتاری

سناتن دھرمی ہندوؤں کے بہت بڑے پیشوا جگت گورو سری شنکراچاریہ، مولانا حسین احمد مدنی اور پیر غلام مجدد (سندھ) کی گرفتاریوں کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا ۔ اور مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ "اٹھو اور ترکِ موالات کے تمام مدارج پر عمل پیرا ہو جاؤ ۔ ایسی حکومت کے ساتھ، جو تمہارے خدا اور رسول ؐ کے نام کی بے حرمتی کر رہی ہے، موالات رکھنا یقیناً کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ۔ عدم تشدد پر سختی سے عامل رہو تاکہ تمہارے مخالفین کو تمہارا خون بہانے کا موقعہ آسانی سے نہ مل سکے ۔ اور پھر ملازمتیں چھوڑ دو ۔ دکانیں چھوڑ دو ۔ بدیسی کپڑا چھوڑ دو ۔ غرض ہر شعبہ زندگی میں ترکِ موالات کر لو اور آزادی حاصل کرو ۔ کہ یہی تمہارے تمام امراض کا علاج ہے ۔ (۲۲ ستمبر)

سرزمینِ بے آئین

صوبہ سرحد کو سرزمینِ بے آئین کا نام دیا گیا ۔ جو لغوی اعتبار سے بھی درست تھا ۔ کیونکہ اس صوبے کو آئینی اصلاحات سے محروم رکھا گیا تھا ۔ ایک شذرے میں اس بات کے خلاف احتجاج کیا گیا کہ پنجاب سے کسی کو بنوں جانا ہو ۔ تو ماڑی انڈس تک کا ٹکٹ دیا جاتا ہے اس سے آگے کا ٹکٹ نہیں دیا جاتا ۔ کیونکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بنوں نے داخلہ ممنوع کر رکھا ہے ۔ (۲۴ ستمبر) صوبہ سرحد کے بزرگ حاجی جان محمد اور اُن کے ساتھیوں سے اخلاقی قیدیوں کے سے سلوک کی مذمت کی گئی ۔

قومی درس گاہوں کو ترجیح

جب تحریکِ عدم تعاون کے دوران میں سرکاری درس گاہوں سے طلبہ نکل گئے ۔ اور اُن کے لئے رہنماؤں نے الگ یونیورسٹیاں بنا لیں ۔ تو ان سے بھی فارغ التحصیل طلبہ گریجویٹ بن کر نکلنے لگے ۔ سالک نے ایک اداریے میں بلدیات سے اپیل کی کہ وہ خالی اسامیوں کو پُر کرتے وقت اُن نوجوانوں کو ترجیح دیں ۔ جنھوں نے آزاد قومی درس گاہوں میں تعلیم پائی ہو ۔ اسی قسم کا مطالبہ تجارتی اداروں سے بھی کیا گیا ۔ (۲۶ ستمبر)

عورتیں اور کھدر

۲۴ ستمبر کو لاہور کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمان عورتوں کا ایک اجتماع برکت علی اسلامیہ ہال میں ہوا ۔ جس سے علی برادران کی والدہ اُم الاحرار بی اماں نے خطاب کیا ۔ اُنہوں نے عورتوں سے کہا کہ تم اپنے مردوں سے کمخواب، اطلس، مخمل اور لٹھا مت مانگو ۔ بلکہ کھدر پہنو ۔ گاڑھا پہنو ۔ اور سوسی پہنو ۔ ۲۶ ستمبر کے شمارے میں لاہور کی ایک خاتون ف ۔ ب صاحبہ کا ایک مضمون چھاپا گیا ۔ جس میں مسلمان عورتوں کو چرخہ کاتنے اور کھدر پہننے کی تلقین کی گئی ۔ "زمیندار" نے اس پر ایک اداریہ چھاپا ۔ جس میں موصوفہ کی تائید میں آواز بلند کی ۔ اور عورتوں سے اپیل کی کہ وہ "زمیندار" میں اپنے خیالات کا اظہار کریں

تاجور نجیب آبادی

"خواتینِ نجیب آباد کی سرگرمی" کے عنوان سے ایک شذرے میں مولانا تاجور نجیب آبادی کی ہمشیرہ اور اہلیہ محترمہ کو خراجِ عقیدت ادا کیا گیا کہ وہ خواتین کی مجلسِ خلافت میں پیش پیش ہیں اور مولانا تاجور سے کہا گیا: "آپ دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں ۔ حضرت مولانا محمود الحسن ؒ سے آپ کو شرفِ نیاز حاصل ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خدا کا کلام فتوے کی صورت میں ضبط ہو چکا ہے اور ہندوستان کے آسمان کے نیچے اسلام کی انتہائی توہین کی جا چکی ہے ؟ غالباً آپ کو یہ سب کچھ معلوم ہوگا ۔ پھر یہ کیا ہے کہ آپ اب تک سرکاری یونیورسٹی سے تعلق برقرار رکھے بیٹھے ہیں اور دیال سنگھ کالج سے، جو سرکاری یونیورسٹی سے

محق ہے، چند روپوں کے عوض تعلیم دے کر اس حکومت سے صریح موالات کر رہے ہیں جس نے دنیا بھر میں ہماری مذہبی روایات کو پامال کر دیا۔ کاش آپ اپنی محترم ماں، بہن اور بیوی ہی کی جرأتِ ایمانی و حرارتِ دینی سے سبق حاصل کرتے۔" (۰ اکتوبر)

لارڈ لارنس کا بُت لاہور کی مال روڈ پر لارڈ لارنس کا ایک بت عرصے تک نصب رہا جس پر لکھا تھا "کیا تم اپنے آپ پر تلوار سے حکومت کرانی چاہتے ہو یا قلم سے؟" مجسمے کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں قلم۔ اسے عوام اپنی غیرت کے لئے ایک چیلنج قرار دیتے تھے۔ اس لئے بلدیہ لاہور نے فیصلہ کیا کہ مجسمے کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے۔ "زمیندار" نے اس پر بلدیہ کو مبارک باد دی اور لکھا "ہمارے نزدیک تو اس کا اچھا مصرف یہ ہے کہ اسے از سر نو ڈھلوا کر اس کا ایک فوارہ بنایا جائے۔ جو جلیانوالہ باغ کے بیچوں بیچ نصب کر دیا جائے۔ اور اس پر لکھا جائے:

"اس سرزمین کی مٹی میں اُن غیرت مند محبانِ وطن کا خون موجود ہے جنھوں نے موت گوارا کی لیکن قلم کی محکومی اور تلوار کی غلامی کو پسند کرنا اپنے وقارِ قومی کے منافی سمجھا۔" (۱۶ اکتوبر)

متفرق مسائل گوجرہ کے سید مہدی شاہ اور کالڑا کے ملک عمر حیات خان ٹوانہ کی مذمت کی گئی کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے وائسرائے کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حکومت کو بتایا گیا۔ کہ اُس نے دو لاکھ روپے کی جو رقم امریکہ میں تحریک آزادیٔ ہند کو ختم کرنے کے لئے منظور کی ہے وہ کسی کام نہیں آئے گی۔ راولپنڈی کے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنا جمود ترک کر دیں۔ اور تحریک میں شامل ہو جائیں۔ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ایک پارسی رہنما کے ایک کروڑ روپے کے عطیے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندو اور مسلمان دولت مندوں سے کہا گیا کہ وہ بھی اپنی دولت اپنی اپنی قوم کے فائدے کے لئے صرف میں لائیں۔ کسی زمانے میں کانگرس کے ممتاز رہنما سریندر ناتھ بنرجی کی خلافت دشمن حرکتوں پر نکتہ چینی کی گئی۔ اور اُن سے مطالبہ کیا گیا کہ غلط بیانات سے حکومت کو دھوکا نہ دیں۔" اس حکومت کے خزانے سے گراں قدر تنخواہ لینا اور اس کو دھوکا دینا شریفوں کا قاعدہ نہیں جس کا نمک کھاؤ۔ اُس کی بہی خواہی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دو۔" (۸ اکتوبر)

بین الاقوامی سیاست پر تبصرے

اُس زمانے کے "زمیندار" میں بین الاقوامی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر بھی ادارتی تبصرے کئے جاتے تھے کبھی افتتاحیے کی صورت میں کبھی شذرات کے روپ میں اور کبھی مضامین کی شکل میں۔ اس سلسلے میں چند اداریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عقدہ آئرلینڈ آئرلینڈ کے حریت پرستوں کے قائد ڈی ویلرا کے اس مطالبے کی حمایت کی گئی۔ کہ آئرلینڈ کو اُسی قسم کا درجۂ نوآبادیات دیا جائے۔ جیسا آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا کو حاصل تھا۔ اور اس میں یہ شق شامل ہو کہ آئرلینڈ چاہے۔ تو قلمرو برطانیہ سے انقطاعِ تعلق کرے۔ حکومتِ برطانیہ پر نکتہ چینی کی گئی کہ وہ السٹر اور جنوبی آئرلینڈ کے درمیان منافرت کو فروغ دے رہی ہے اور مطالبہ کیا گیا کہ ڈی ویلرا کو السٹر کے پروٹسٹنٹ فرقے کے ساتھ براہ راست رابطہ پیدا کرنے دیا جائے۔ تاکہ دونوں حصوں میں مفاہمت ہو جائے اور ایک متحدہ آئرلینڈ آزادی کی زندگی بسر کر سکے۔ (۱۰ ستمبر)

توسیعِ سلطنت یا لینن کی حکومت؟

برطانیہ میں بے روزگاروں اور مزدوروں کے اضطراب اور ہنگامہ آرائی کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ برطانیہ صنعت و حرفت پر توجہ دینے کی جگہ توسیعِ سلطنت اور جوع الارض کے امراض میں مبتلا ہے اور اُس نے قلمروِ برطانیہ کے طول و عرض میں اپنے لئے طرح طرح کے مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ برطانیہ کے وزیراعظم لائڈ جارج سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا "کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ تو جغرافیہ میں برطانی اقتدار کا حلقہ وسیع کرنے میں مصروف رہیں اور ادھر بیکاروں کا شور و غل غیر مطمئن مزدوروں کے ہیجان سے مل کر شورِ محشر برپا کر دے۔ اگر ایسا ہُوا۔ تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اول: کشت و خون۔ دوم: انقلابِ حکومت۔ سوم: آخر میں بولشوزم۔ اب مسٹر لائڈ جارج بتائیں کہ ان دونوں چیزوں میں کونسی پسند ہے۔ توسیعِ سلطنتِ برطانیہ یا لینن کی حکومت؟" (۱۰ ستمبر)

ڈیڑھ کروڑ کنواریاں

پہلی عالمی جنگ کے دوران میں جو عظیم جانی ضیاع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مردوں کی آبادی کم ہوگئی اور عورتوں کی زیادہ اور اندازہ کیا گیا کہ کم و بیش ڈیڑھ کروڑ عورتوں کو کنوارا رہنا پڑے گا اور اس طرح بداخلاقی کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یورپ کی توجہ اس طرف دلائی گئی کہ اگر اسلام کی پیروی کرتے ہوئے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت ہو جائے۔ تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں ترکیہ کی مثال پیش کی گئی۔ جہاں پے در پے تین جنگوں میں جانی ضیاع کے باوجود یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ (۱۷ ستمبر)

وسطی ایشیا میں آزادی کی ہوائیں

۲۵ ستمبر کو ایک شذرے میں بتایا گیا کہ "بولشویک بیرونی ممالک میں اپنے اثر و اقتدار سے غلامی کے اثرات دور کرنے میں برابر مصروف ہیں۔ ریاست ہائے قفقاز، جارجیا، آرمینیا اور آذربائی جان میں جمہوریتیں قائم ہو چکی ہیں اور ریاست ہائے ترکمان، بخارا، مرو، سمرقند اور خیوا میں بھی آزادی کی ہوائیں چل رہی ہیں۔" یہ بھی کہا گیا کہ ایران اور افغانستان پر دباؤ بڑھ رہا ہے اور حکمرانوں سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر وہ یہ خطرہ قریب نہیں لانا چاہتے۔ تو ہندوستان کی اندرونی بے چینی دور کرنے کی تدابیر اختیار کریں۔

یونانیوں کی شکستِ فاش

مصطفےٰ کمال پاشا (کمال اتاترک) کے ہاتھوں یونانیوں کی شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک افتتاحیے میں ہندی مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ انگورہ فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیں۔ اور لکھا: "اگر آج ہم نے اس فرض کو نہ پہچانا۔ تو یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان آئندہ دنیا میں عزت، حرمت، آزادی و حریت کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ انگورہ میں مصطفےٰ کمال پاشا کی طاقت خدانخواستہ کمزور پڑ گئی۔ تو ہندوستان کے مسلمان مغربی طاقتوں کے گوناگوں اثرات اور بوقلموں اقتدارات کے ماتحت تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اور ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بھی ایک مدت دراز تک کھٹائی میں پڑ جائے گا۔" (۲۹ ستمبر)

افغانستان

۱۹۱۹ء میں افغانستان اور برطانیہ کے درمیان جنگ کے بعد جو متارکہ ہُوا۔ وہ عملاً اس بات کا مظہر تھا کہ برطانیہ نے افغانستان کی آزادی اور خودمختاری تسلیم کر لی ہے۔ اس کے بعد فریقین میں صلح کے مستقل سمجھوتے کے لئے بات چیت شروع ہوئی۔ جو ۱۹۲۱ء کے آواخر میں کامیابی کے مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس دوران میں افغانستان نے سردار ولی خان کو لندن میں اپنا ایلچی مقرر کیا۔ تو برطانیہ نے یہ تقرر اس بناء پر ٹھکرا دیا کہ حکومتِ افغانستان کا معاملہ برطانیہ سے نہیں، حکومتِ ہند کے ساتھ ہے۔

۲۱ اکتوبر کے "زمیندار" میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا کہ جب برطانیہ اور افغانستان کے تعلقات مساویانہ ہیں تو پھر افغانستان حکومتِ ہند کے ساتھ کیوں گفتگو کرے اور مستقل سمجھوتے کے لئے بات چیت کے دوران میں ایلچی نہ قبول کرنے کو "نہایت غیر مہذب اور توہین آمیز" قرار دیا گیا۔

۲۷ اکتوبر کے شمارے میں ایک مفصل افتتاحیہ دیا گیا۔ اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ افغانستان نے بالشویکوں کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیا ہے اور ترکیہ اور ایران کے ساتھ باہم امداد کے سمجھوتے کر لئے ہیں۔ لیکن اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ حکومتِ ہند اور افغانستان کے درمیان جو بات چیت ہو رہی ہے۔ اس بارے میں عوام کو اعتماد میں نہیں لیا جاتا۔

اتحادِ عالمِ اسلامی

ایران سے انگریزوں کی بے دخلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ ایشیا میں دو ممالک یعنی ایران و افغانستان تو انگریزی اثر سے آزاد ہوئے۔ اب خدا تعالےٰ کہیں عراق، عرب، فلسطین، شام اور حجاز کی بھی سن لے تاکہ ہم خلافتِ اسلامیہ کا نظام از سرِ نو استوار کریں۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ اور اسلام کی فتح و نصرت کا وقت قریب ہے۔" (۲ اکتوبر) اس کے بعد ۲۷ اکتوبر کے شمارے میں ایک اور افتتاحیہ درج ہوا جس کا یہ اقتباس خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ "سلطنتِ عثمانیہ کے بکھرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکوں نے بولشویکوں کی دوستی اختیار کی۔ افغانوں نے آزادی حاصل کی اور ایرانی، افغانی اور ترک متحد ہو گئے۔ وسطِ ایشیا کی ان طاقتوں کا اتحاد اور بولشویکوں کی امداد نے اگر سرحدِ ہندوستان پر کوئی نیا گل کھلا دیا۔ اور ادھر مضطرب جرمنی اپنی مظلوموں میں شامل ہو گیا تو ظاہر ہے کہ ایشیا میں انگریزی اقتدار کا قائم رہنا ایک امرِ محال ہے۔" ایسے میں برطانیہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ترکوں کے مطالبات مان لے۔ اُن کا وطن لوٹا دے۔ جزیرۃ العرب سے اپنی فوجیں ہٹا لے۔ اور ہندوستان کو آزاد کر دے تاکہ اُسے چین نصیب ہو۔

ایران میں آزادی کی لہر اور کمیونسٹ

"ایران میں آزادی کی لہر" کے عنوان سے ۲۶ اکتوبر کا افتتاحیہ اسلوبِ نگارش اور مطالب اور تجزیۂ مطالب کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے اس کا آخری پیراگراف درج ذیل ہے:۔

"آپ لکھتے ہیں کہ بولشویکوں نے ایران میں اپنے اغراض و مقاصد کی اشاعت کی اس لئے ایران برطانیہ کو اپنا دشمن خیال کرنے لگا۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ خود بالشویکوں کے سالارِ اعظم موسیو لینن کا قول ہے کہ "جنگ یورپ نے تمام دنیا کے ممالک میں شہنشاہیت پسند طاقتوں کی دست بُرد کے طفیل سے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ ان کی مادی و اخلاقی ذلت حدِ انتہا تک پہنچ چکی ہے اور یہی وجہ انقلابی تحریکات کی ہے۔ یاد رکھو کہ جو ملک خوشحال ہو۔ جہاں کے لوگ سیاسی حقوق کے اعتبار سے خوش و خرم ہوں۔ جس ملک میں لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا ہو۔ وہاں بولشویکوں کا پروپیگنڈا ہزار سال تک بھی انقلاب پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں موسیو لینن کا یہ قول سراپا صداقت پر مبنی ہے۔ اچھا یہ تو بتائیے کہ ایران میں تو بولشویکوں نے انقلاب کا فتنہ برپا کیا۔ لیکن کیا ہندوستان، مصر، آئرلینڈ میں بھی انقلابی

تحریکات کا باعثِ حقیقی بولشویکوں کی مبلغانہ کارپردازیوں کا نتیجہ ہے؟ ہندوستان نے اُس زمانے میں ہوم رول کا مطالبہ زور و شور سے کیا تھا۔ جب بولشویت کا نام و نشان تک نہیں تھا اور لینن کے خواب کی تعبیر عقلِ انسانی سے بعید نظر آتی تھی۔ مصر اُس زمانے سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ جب روس میں انقلاب کی تحریک کرنے والے سُولی پر لٹکائے جا رہے تھے۔ آئرلینڈ اُس وقت سے انگلستان کے خلاف جد و جہد کر رہا ہے۔ جب زارِ روس خدا کی طاقت اور رائے جمہور کی قوت کو سرپلئے تغافل سے ٹھکرا کر روسی کسانوں کے سامنے انا ربکم الاعلیٰ کے فرعونی ادعا میں بلند آہنگ ہو رہا تھا۔ حقیقت میں آج کل حکومت برطانیہ کے شہنشاہیت پسندوں کا یہ شیوہ ہو رہا ہے کہ جب وہ کسی محکوم ملک و قوم کی جد و جہد آزادی کے اصلی وجوہ، اسباب دُنیا پر ظاہر کرنے میں اپنی سُبکی اور ذلت دیکھتے ہیں۔ تو اس تمام جد و جہد کی ذمہ داری بولشویکوں کے سر پر ڈال کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہم تو بالکل بے گناہ اور معصوم ہیں۔ یہ سب کارستانیاں تو لینن کے چیلے چانٹوں کی ہیں۔ حالانکہ سارا کیا دھرا خود انہی کا ہوتا ہے۔ اور بولشویک غریب خواہ مخواہ بدنام کئے جاتے ہیں۔"

شریفِ مکہ حسین

پہلی عالمی جنگ کے بعد بھی چند سال تک حجاز کی حکمرانی رسوائے زمانہ شریفِ مکہ حسین کے ہاتھ میں رہی ہندوستان کے مشہور اخبار "سٹیٹسمین" نے خبر دی کہ حسین فلسطین کو عربستانیہ بنانے کی فکر میں ہے۔ اور برطانیہ اُس پر نازاں ہے ایک اداریے میں حسین کے اس ارادے کو اُس خطرے سے منسوب کیا گیا۔ جو عراق میں برطانیہ کے ہوائی اڈے کی وجہ سے دنیائے عرب کے لئے پیدا ہوا۔" زمیندار" نے لکھا:

"شریف اور اُس کے صاحبزادوں کے لئے اب بھی موقعہ ہے کہ وہ اپنی گذشتہ غلط کاریوں کی تلافی کریں۔ اور اپنے وجود کو اسلام کے لئے اور خلافتِ مقدسہ کے لئے مفید بنائیں۔ اگر وہ اب بھی صراطِ مستقیم پر آجائیں۔ تو ملتِ اسلامیہ اُن کے قصور معاف کرنے کو تیار ہے۔" (۱۶ر اکتوبر)

بین الاقوامی سیاست کے اور بہت سے مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا۔ مثلاً تیل کے سلسلے میں برطانوی استعمار کی سرگرمیاں، اہلِ مراکش پر ظلم، ترکیہ اور یونان کے درمیان تو ہین معرکے وغیرہ۔

حاصلِ بحث

مولانا عبدالمجید سالک کی اداریہ نگاری کے اولین دَور کا یہ تجزیہ نہایت نامکمل ہے۔ کیونکہ وہ یکم اپریل ۱۹۲۰ء کو "زمیندار" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ۴ر نومبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار ہو گئے۔ گویا انہوں نے ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصے تک اداریہ نگاری کے فرائض انجام دیئے۔ اس دَور کے "زمیندار" کے فائل نہیں ملتے۔ صرف ستمبر، اکتوبر ۱۹۲۱ء کے اکیس بیس متفرق شمارے حاصل ہو سکے۔ جن کی بنا پر یہ تجزیہ مرتب کیا گیا ہے۔ گرفتاری کے بعد انہیں ایک سال قید بامشقت کاٹنی پڑی۔ واپس آئے، تو مولانا غلام رسول مہر بھی ادارۂ "زمیندار" سے منسلک تھے۔ دونوں کے درمیان دائرۂ کار کی تقسیم اس طرح ہوئی کہ افتتاحیہ مہر صاحب لکھتے اور شذرات سالک قلمبند کرتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "افکار و حوادث" کے نام سے ایک مستقل مزاحیہ کالم لکھنا شروع کر دیا۔ مارچ ۲۷ء تک یہ کالم "زمیندار" میں چھپتا رہا۔ ۴ر اپریل ۱۹۲۷ء کو "انقلاب" جاری ہوا۔ تو یہ کالم نئے اخبار میں منتقل ہو گیا۔ اور نومبر ۴۹ء تک جاری رہا۔

"افکار و حوادث" کے آغاز کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مزاح نگاری کا سلسلہ اولین دور ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ کیونکہ بعض اداریے اسی رنگ میں لکھے گئے اور "جذبات و افکار" کے عنوان سے بھی کبھی کبھار ایک آدھ مزاحیہ کالم آجاتا تھا۔ اداریہ نگاری کے سلسلے میں یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ اس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ رہائی کے بعد بھی اداریہ نگاری جاری رہی۔ لیکن افتتاحیہ نگاری مہر صاحب کے سپرد ہوئی۔ "انقلاب" کی بائیس سالہ زندگی میں بھی تقسیم کار یہی رہی۔ لیکن مولانا مہر علامہ اقبال کے ہمراہ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں برطانیہ گئے۔ یا آشوبِ چشم کے مرض میں مبتلا ہو کر کسولی میں قیام رکھا۔ یا کبھی وہ بے عیل ہمسیا افغانستان گئے۔ تو سالک افتتاحیہ نگاری بھی کرتے رہے۔

جس دور کا ہم نے تجزیہ کیا ہے وہ نہایت بحرانی اور خطرناک دور تھا۔ جیسا کہ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔ سالک نے بین الاقوامی اور قومی، دونوں قسم کے مسائل پر برطانوی سامراج کے خلاف ڈٹ کر لکھا اور اس سلسلے میں کوئی مصلحت روا نہ رکھی۔ تحریک خلافت کے اُس دور میں "زمیندار" برِعظیم کا اہم ترین روزنامہ تھا اور اُس کی قیادت نہایت مؤثر تھی۔ گویا مولانا سالک نے اداریہ نگاری کے ذریعے سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اور اس کے سلسلے قید بھی کاٹی۔ بحرانی ادوار میں صحافت پر جذباتی اثرات اتنے نمایاں ہو جاتے ہیں کہ استدلال کا عنصر پسپا ہو جاتا ہے۔ لیکن سالک کی اداریہ نگاری میں جذبات کے پہلو بہ پہلو استدلال بھی کار فرما تھا۔ وہ اُس دور میں زبان اور اسلوبِ نگارش کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خان کی تحریروں سے متاثر تو ضرور تھے۔ لیکن جہاں تک ممکن ہوا۔ انہوں نے آسان زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھیں اور تحریکِ ترکِ موالات کو آگے بڑھا سکیں۔

اُردو لغت کی باتیں

ڈاکٹر سہیل بخاری

بولیاں اتنے پرانے جگ میں بنی ہیں کہ نہ ہم اس جگ کو جانتے ہیں اور نہ اسے سوچ ہی سکتے ہیں۔ بولیوں کی جڑیں بیتے دنوں کے گہرے اندھیرے میں گڑی ہوئی ہیں اور ان کی بیلیں کم سے کم لاکھوں برس پہ پھیلتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں۔ اس بیچ میں انہوں نے جو ڈیل پکڑا اور بولوں کی جو جیا جنجھا لکھی کی اس کا حال ان کتابوں سے جانا جاسکتا ہے جو ان کے بولنے یا چاہنے والوں نے لکھی ہیں ایسی کتاب جس میں کسی بولی کے بول ایک خاص ڈھنگ سے اکٹھے کئے گئے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے معنی بھی بتائے گئے ہوں لغت کہلاتی ہے۔

لغت عربی میں یوں تو بول کو کہتے ہیں جس کی جمع لغات آتی ہے۔ پر وہ کتاب بھی جس میں بول اپنے معنی کے ساتھ اکٹھے کر دیئے گئے ہوں لغت کہلاتی ہے۔ فارسی میں اسے فرہنگ کہتے ہیں۔ انگریزی میں یہ گلوسری، ووکیبلری اور ڈکشنری کہلاتی ہے اور سنسکرت ہندی وغیرہ میں اسے کوش۔ ساگر۔ سندھو اور مالا کا نام دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے بال کی کھال نکالنے کے لئے ان بولوں میں فرق بھی مان لیا ہے۔ وہ اصطلاحوں کی فہرست کو ایک نام دیتے ہیں تھوڑے سے بولوں کی فہرست کو دوسرے نام سے پکارتے ہیں ہم معنی یا ہم قافیہ بولوں کی کتاب کا تیسرا نام رکھتے ہیں اور عام بولوں کی کتاب کو چوتھے نام سے یاد کرتے ہیں پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ان میں سے ہر نام ہر بھانت کی فہرست کے لئے بولا جاتا ہے البتہ انگریزی میں ڈکشنری، عربی فارسی اور اردو میں لغت، سنسکرت میں کوش اور ہندی میں مالا نام زیادہ رکھا جاتا ہے۔

لغت لکھنے کی ریت بہت پرانی ہے اور دنیا کی ہر بولی میں سدا سے چلی آ رہی ہے اس لئے یہ بات پورے بھروسے سے نہیں کہی جاسکتی کہ کس بولی کا لغت سب سے پہلے لکھا گیا اور کس گھڑی لکھا گیا کیوں کہ تاریخ کال سے پہلے کی کوئی ایسی لکھاوٹ ہم تک نہیں پہنچی جس سے اس بات کا نیاؤ کیا جاسکے۔ اس لئے جس بولی میں جو سب سے پرانا لغت ملتا ہے اسی کو پہلا لغت سمجھنا اور کہنا پڑتا ہے۔ یونان کے اتھینیس نے ایسے ۲۰ لوگوں کے نام گنائے ہیں جنھوں نے یونانی بولی کے لغات لکھے ہیں پر یہ سب لغات اب نہیں ملتے۔ اس لئے زینوڈوٹس نے جو ایک لغت "گلوسا" کے نام سے لکھا تھا اسی کو ہم یونانی بولی کا پہلا لغت کہہ سکتے ہیں۔ یہ شخص اسکندریہ کے بڑے کتب خانے کا پہلا مہتمم تھا اور اس نے بطلیموس اوّل اور دوم کا زمانہ دیکھا تھا۔ انگریزی بولی میں کوک ریم نے پہلا لغت لکھا جو لندن میں ۱۶۲۳ء میں چھپا تھا۔ اس کے پیچھے اس بولی میں بہت اچھے اچھے لغت لکھے گئے تھے جن میں بلاؤنٹ، فلپس، بیلی، جانسن، ٹاڈ اور شیریڈن کے لغات کے ساتھ ساتھ ویبسٹر (نیویارک ۱۸۲۸ء) کا نام بھی لیا جاسکتا ہے ان لغات کے علاوہ امپیریل ڈکشنری (گلاسگو ۵۵-۱۸۵۰ء) مرے اور بریڈلے کی کتاب آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، وٹنے کی کتاب سینچری

ڈکشنری (نیو یارک ۱۸۸۸ء-۹۱) اور اسٹینڈرڈ ڈکشنری (نیو یارک ۱۸۹۴ء) وغیرہ کے نام بھی کافی مشہور ہیں۔

انگریزی میں اب تک جو لغات لکھے گئے ہیں ان میں عام لغات کے ساتھ ساتھ دوسری بھانت کے لغات بھی ملتے ہیں جن میں کوئی بولوں کا اُچار (تلفظ) بتاتا ہے۔ کسی میں بولوں کی بناوٹ دکھائی گئی ہے۔ کسی میں ہم بولوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ کسی میں ہم معنی بول جمع کر دیئے گئے ہیں۔ کسی میں ہم قافیہ بولوں کا ذکر ہے۔ کوئی بولوں کے ٹکڑے کر کے دکھاتا ہے۔ کوئی تلازمے دیتا ہے۔ کوئی ایک ایک بول کے کئی کئی چالو روپ دکھاتا ہے۔ کوئی بولنے والوں کے خاندانی ناموں سے بحث کرتا ہے۔ کوئی گنوارو بول پیش کرتا ہے اور کسی میں بھانت بھانت کے علوم کی اصطلاحیں جمع ہیں۔

سنسکرت لغات میں امرکوش کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اس کا لکھنے والا امرسنگھ ایک ہزار عیسوی سے پہلے گذرا ہے۔ یہ کتاب اتنی مشہور اور مانی ہوئی ہے کہ ہندوستان میں نگر نگر سے اس کی چھاپیں نکلتی رہی ہیں اور اسے کتنی ہی لپیوں میں چھاپا گیا ہے۔ یہ لغت کلکتے سے ۱۸۰۷ء اور ۱۸۳۴ء میں نکلا۔ بمبئی میں ۱۸۶۰ء اور لکھنؤ میں ۱۸۶۳ء میں چھپا۔ ۱۸۶۰ء میں مدراس سے گرنتھ لپی میں نکلا اور ۱۸۷۳ء میں ملیالم لپی میں چھاپا گیا۔ مہیشور نامی ایک شخص نے اس کی ایک شرح بھی لکھی جو امر وویک کے نام سے ۱۸۶۷ء میں بنارس سے شائع ہوئی۔ سنسکرت کا دوسرا مشہور لغت شبد کلپدرم کے نام سے راجا رادھا کانت دیو نے لکھا جو کلکتے سے ۱۸۲۱ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان آٹھ جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کی دوسری چھاپ ۱۸۷۴ء میں نکلی۔ بھٹاچاریہ نے شبد ستوم مہاندھی سات حصوں میں کلکتے سے ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان میں شائع کیا۔ پل یدھنے ابھیدھان رتن مالا لکھا جو لندن سے ۱۸۶۱ء میں نکلا۔ تارا ناتھ ترک واچس پتی نے واچس پت نامی لغت لکھا جو کلکتے میں ۱۸۷۳ء میں چھپا۔

ان لغات کے علاوہ مدنی کرنے مدنی کوش لکھا جو بنارس میں ۱۸۶۵ء میں اور کلکتے میں ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۲ء میں چھپا۔ اس میں سنسکرت کے ایسے بول اکٹھے کر دیئے گئے ہیں جن کا اچار تو ایک ہے پر ان کی جڑیں الگ الگ ہیں۔ ہیرو چند نے دھاتو منجری کے نام سے ایک لغت سنسکرت بولی کی جڑوں پر لکھا جو بمبئی میں ۱۸۶۶ء میں چھاپا گیا اور بھیم آچاریہ جھلکی کرتے نیائے (فلسفہ) کی اصطلاحات کا ایک لغت نیائے کوش کے نام سے لکھا جو بمبئی سے ۱۸۷۵ء میں نکلا۔ ان مشہور لغات کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے لغات لکھے گئے جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔

عربی لغات میں خلیل ابن احمد (متوفی ۱۶۰ھ) کی کتاب العین کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے جو اس نے ۴۷ سال کی عمر میں لکھی تھی۔ بعد کی کتابوں میں ابونصر اسماعیل جوہری (متوفی ۳۹۵ھ) کی کتاب الصحاح، ابوالحسن علی ابن اسماعیل ابن سیدہ (متوفی ۴۵۸ھ) کی کتاب المحکم، زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی کتاب اساس البلاغت، ابوالفضل ابن منظور جمال الدین (متوفی ۷۱۱ھ) کی کتاب لسان العرب، ابوطاہر مجدالدین ابن یعقوب فیروزآبادی (متوفی ۸۱۷ھ) کی کتاب القاموس، سید محمد مرتضیٰ زبیدی (متوفی ۱۲۰۵ھ) کی کتاب تاج العروس جو قاموس کی شرح ہے۔ بطرس البستانی کی محیط المحیط، صراح، منتخب اللغات شاہجہانی، محمد لاد کی موید الفضلا، اقرب الموارد، منتہی الارب، شمس اللغات، احمد بن محمد ابوالفضل المیدانی (متوفی ۵۱۸ھ) کی السامی الاسامی اور معلوف لیسوعی کی المنجد وغیرہ نہایت مشہور لغات ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ دوسری کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں سے کچھ مصدروں کے معنی بتاتی ہیں جیسے خواجہ محمد اشرف لکھنوی کی فرہنگ تاج المصادر (۱۰۹۶ء) اور امان الحق کی امان اللغات (۱۸۷۰ء) کسی میں تصوف کی اصطلاحیں جمع کر دی گئی ہیں اور ان کا مطلب بتایا گیا ہے جیسے خواجہ شمس الدین کی کتاب اصطلاحات صوفیہ (مطبوعہ مطبع نامی لکھنؤ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء)، کچھ علم طب اور دواؤں کے بارے میں لکھی گئی ہیں جیسے بحر الجواہر (۱۸۶۳ء)، حکیم نور الدین محمد کی الفاظ الادویہ (نولکشور پریس کانپور)، حکیم تالیف محمد کی میزان الادویہ (نولکشور پریس کانپور) حکیم محمد نصیر کی فرہنگ نصیریہ (نولکشور پریس کانپور)، حکیم سید محمد حسین شیرازی کی مخزن الادویہ۔ اور کسی میں کہاوتیں جمع کر دی گئی ہیں جیسے سید حسین شاہ حقیقت کی خزینۃ الامثال (نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۲ء)

فارسی لغت کی کتابوں میں سب سے پہلا نمبر برہان قاطع کا آتا ہے جو محمد حسین تبریزی نے لکھی تھی۔ اس کی کتنی ہی چھاپیں لکھنؤ سے نکل چکی ہیں۔ حال ہی میں اسے ڈاکٹر معین نے نئے سرے سے مرتب کر کے تہران سے چھاپا ہے۔ ایک اور مشہور کتاب اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں ہفت قلزم کے نام سے لکھی گئی جو لکھنؤ سے ۱۸۲۲ء میں سات جلدوں میں نکلی۔ ان کے علاوہ اسدی طوسی کی کتاب لغت فرس، جمال الدین انجو کی فرہنگ جہانگیری، اللہ داد فیضی سرہندی کی مدار الافاضل (۱۰۰۱ھ)، ملا غیاث الدین کی غیاث اللغات (لکھنؤ ۱۲۰۸ھ) گلیڈون کی فارسی ہندوستانی لغت (کلکتہ ۱۸۰۹ء) مولوی کریم الدین کی کریم اللغات، مولوی تصدق حسین کی لغات کشوری، عبد اللہ خویشگی کی فرہنگ عامرہ، حبیب اللہ آموزگار کی فرہنگ آموزگار، فرہنگستان ایران (واژۂ نو)، وجاہت حسین کی نقش بدیع، ہام کی فارسی انگریزی لغت اور جون اینڈ ریو بائل کی پریکٹیکل ڈکشنری آف پرشین لینگویج (لندن ۱۹۴۹ء) کچھ اور مشہور کتابیں ہیں۔

اردو میں جو لغت کی کتابیں لکھی گئیں ان کی ایک فہرست نیچے دی جاتی ہے۔

۱۔ بحر الفضائل فی منافع الافاضل۔ محمد بن قوام کرخی نے ۱۴۹۵ء میں ترتیب دی۔ اس میں اردو بولوں کی ترتیب ابجد پر رکھی گئی ہے اور ان کے معنی فارسی میں دیئے گئے ہیں۔

۲۔ تحفۃ الہند۔ یہ کتاب عالمگیر کے زمانے میں مرزا محمد بن فخر الدین محمد نے کوکلتاش خان کے کہنے پر لکھی تھی۔ اس میں بھی اردو بولوں کے معنی فارسی میں لکھے گئے ہیں اور کتاب کو موضوعات کے اعتبار سے ابواب میں بانٹا گیا ہے۔

۳۔ فرانسسکو ماریہ دو تور کا لغت لیکسیکن لنگوا اندوستانیکا جو پادری جری میں ۱۷۰۳ء میں مکمل ہوا۔

۴۔ جان جوشوا کیٹلر (۱۶۵۹ء سے ۱۷۱۸ء تک) کا ہندوستانی لغت۔ مؤلف پروشیا کا باسی تھا۔ اس نے ہندوستانی بولی کا لغت ولندیزی بولی میں لکھا ہے۔

۵۔ غرائب اللغات۔ مولوی عبد الواسع ہانسوی۔ اس میں اردو بولوں کے معنی فارسی میں لکھے گئے ہیں۔

۶۔ عجائب اللغات۔

۷۔ ڈیلوڈل کا لغت ۱۷۴۳ء۔ یہ ہندوستانی اور فارسی کا مختصر سا لغت تھا۔

۸۔ نوادر الالفاظ۔ سراج الدین علی خان آرزو ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء۔ یہ لغت غرائب اللغات کی غلطیاں درست کر کے لکھا گیا۔

۹۔ زبدۃ الاسما۔ سنہ ۱۱۸۰ھ۔

۱۰۔ فرگوسن کا ہندوستانی لغت۔ پہلی بار سنہ ۱۷۷۳ء میں چھپا۔

۱۱۔ ڈاکٹر ہنری ہیرس کا ہندوستانی انگریزی لغت مدراس سنہ ۱۷۹۰ء۔

۱۲۔ جان گلکرسٹ کا ہندوستانی لغت سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتے سے نکلا۔

۱۳۔ کپتان جوزف ٹیلر اور ڈاکٹر ولیم ہنٹر کا ہندوستانی انگریزی لغت (مولفہ ۱۸۰۵ء) پہلی بار سنہ ۱۸۰۸ء میں کلکتے سے چھپا پھر ایڈنبرا (انگلستان) سے سنہ ۱۸۱۰ء میں نکلا۔

۱۴۔ کپتان ٹامس روبک کا ہندوستانی انگریزی لغت سنہ ۱۸۱۱ء۔ اس کی تیاری میں گلکرسٹ۔ ہنٹر اور ہیرس کے لغات سے مدد لی گئی۔

۱۵۔ مفتاح ساطع۔ سنہ ۱۲۳۶ھ۔

۱۶۔ دلیل ساطع۔ سنہ ۱۲۴۸ھ۔

۱۷۔ نفائس اللغات سنہ ۱۲۵۳ھ۔

۱۸۔ نفائس اللغات۔ علی اوسط رشک لکھنوی سنہ ۱۲۵۶ھ۔

۱۹۔ انفس اللغات۔ اوحدالدین احمد بلگرامی سنہ ۱۲۵۷ھ۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ۔

۲۰۔ انفس النفائس۔ سنہ ۱۲۶۱ھ۔

۲۱۔ منتخب النفائس۔ مولوی عبدالاحد سنہ ۱۲۶۲ھ۔

۲۲۔ جان شیکسپیر کا ہندوستانی انگریزی لغت۔ لندن سنہ ۱۸۱۷ء۔ بار چہارم سنہ ۱۸۴۹ء۔

۲۳۔ جے۔ ٹی۔ تھامسن۔ اردو اینڈ انگلش ڈکشنری۔ دسمبر سنہ ۱۸۲۷ء۔

۲۴۔ ولیم ییٹس۔ ہندوستانی انگریزی لغت۔ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سنہ ۱۸۴۷ء۔

۲۵۔ نامعلوم برائس۔ ہندوستانی انگریزی لغت۔ (رومن لپی) کلکتہ سنہ ۱۸۴۷ء۔

۲۶۔ ڈنکن فاربس۔ ہندوستانی انگریزی لغت۔ لندن سنہ ۱۸۴۸ء۔ مختصر ہندوستانی انگریزی لغت لندن سنہ ۱۸۶۱ء۔

۲۷۔ برٹرینڈ۔ پیرس سنہ ۱۸۵۸ء۔ فرانسیسی زبان میں لکھا گیا۔

۲۸۔ برائس۔ لندن سنہ ۱۸۶۴ء۔

۲۹۔ ایچ آنڈرس۔ اردو انگلش لغت۔ مطبوعہ بار ہفتم بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سنہ ۱۸۶۹ء۔

۳۰۔ جان پلیٹس۔ سنہ ۱۸۷۲ء۔

۳۱۔ فیلن۔ بنارس سنہ ۱۸۷۶ء۔

۳۲۔ فرانسوا ویلوکل۔ ہندوستانی فرانسیسی لغت۔ سنہ ۱۸۷۶ء

۳۳۔ سرمایۂ زبانِ اُردو۔ جلال لکھنوی۔ ۱۳۰۳ھ
۳۴۔ فیلن۔ اردو، ہندی اور انگریزی کا لغت۔ ریمن ٹیکنیک آرٹ پریس سر وصنہ ۱۸۹۲ء۔
۳۵۔ امیر اللغات۔ امیر مینائی۔ ۱۸۹۱ء مفید عام پریس آگرہ۔
۳۶۔ فیروز اللغات۔ مولوی فیروز الدین۔ ۱۸۹۶ء فیروز سنز لاہور۔
۳۷۔ فرہنگ آصفیہ۔ منشی سید احمد دہلوی۔ ۱۹۰۸ء۔
۳۸۔ نور اللغات۔ چار جلدیں۔ مولوی نور الحسن نیر کاکوروی۔ ۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۱ء۔
۳۹۔ جامع اللغات۔ چار جلدیں۔ عبدالمجید بی اے جامع اللغات کمپنی لاہور ۱۹۳۳ء۔
۴۰۔ اسٹینڈرڈ اردو ڈکشنری۔ آغا محمد باقر۔ ۱۹۴۸ء علمی پرنٹنگ پریس لاہور۔
۴۱۔ نسیم اللغات۔ نسیم امروہوی۔ ۱۹۵۵ء۔ استقلال پریس لاہور۔
۴۲۔ فرہنگ اثر۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ ۱۹۶۱ء۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔
۴۳۔ جدید نسیم اللغات۔ فاضل لکھنوی، نسیم امروہوی، آغا باقر۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۱ء۔

ان کے علاوہ کچھ ایسی کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں کتنی ہی بولیوں سے مترادفات لے کر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ان کو عام طور سے نصاب کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ اجے چند نامہ۔ اجے چند بھٹناگر۔ ۹۶۱ھ
۲۔ اللہ خدائی۔ اس کا لکھنے والا شاہجہان بادشاہ کے زمانے میں گزرا ہے۔ اس کا تخلص تجلی تھا۔ اس کتاب کی عبارت اردو اور اس کا سن تصنیف ۱۰۶۰ھ ہے۔
۳۔ مطبوع الصبیان (خالق باری)۔ اس کا لکھنے والا عالمگیر کے زمانے کا خسرو ہے۔
۴۔ مفتاح الافواہ۔ حافظ احسن اللہ لاہوری ۱۱۹۶ھ۔
۵۔ گوہر منظوم۔ محمد علی محمد ۱۲۶۶ھ
۶۔ نصاب فرفری۔ خدا بخش ۱۲۸۰ھ۔
۷۔ خیابان گلشن۔ محمد علی محمد۔ ۱۲۸۰ھ۔
۸۔ قادر نامہ غالب۔ اسد اللہ خاں غالب دہلوی۔ ۱۲۸۰ھ۔
۹۔ نصاب نادر الترتیب۔ عزیز الدین احمد۔ ۱۲۹۴ھ
۱۰۔ نصاب فیض شاہجہانی۔ حافظ غلام احمد فروغی۔ ۱۳۰۸ھ
۱۱۔ نصاب حیات عزیزی۔ " " " ۱۳۰۹ھ
۱۲۔ نصاب بے نظیر — " " " ۱۳۱۶ھ

۱۳۔ نصاب نذر سلطانی ۔ حافظ غلام احمد فروغی ۱۳۲۳ھ ۔

ان کتابوں کے علاوہ کچھ کتابیں اصطلاحات پر لکھی گئیں جن میں فرہنگ اصطلاحات جہاز رانی (کلکتہ ۱۸۱۱ء) کا نام سب سے پہلے آتا ہے ۔ یہ کتاب کپتان ٹامس روبک نے لکھی جو فورٹ ولیم کالج میں نائب سکریٹری تھے ۔ اس کتاب میں انھوں نے جہاز کے حصوں کے نام، جہاز رانی کی اصطلاحات اور بحریہ کی قواعد پریڈ کے بول لکھے ہیں ۔ کچھ کتابیں محاوروں اور کہاوتوں وغیرہ پر لکھی گئیں جیسے مرزا جان طپش کی شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان (۱۲۱۱ھ) اس کتاب میں اردو محاوروں کے معنی فارسی میں لکھے ہیں اور ان کی سند کے لئے شاعروں کے شعر بھی دیئے ہیں ۔ منشی چرنجی لال کی کتاب مخزن المحاورات (۱۸۶۶ء) فیلن کا ہندوستانی امثال کا لغت (۱۸۷۹ء) مولوی سبحان بخش کی کتاب محاورات ہند (۱۸۹۰ء) جس میں مقولے، کہاوتیں اور محاورے جمع کئے گئے ہیں تیلپس کی کتاب ہندوستانی محاورات (لندن ۱۸۹۲ء) فلٹ کی کتاب محاورات اردو (کلکتہ ۱۹۱۰ء) وزیر بیگم ضیا کی کتاب محاورات نسواں (۱۹۱۰ء) جس میں عورتوں کی بول چال کے محاورے اور بول اکٹھے کئے گئے ہیں ۔

ان کتابوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ لغت لکھنے میں بہت سی سکڑی گھاٹیوں سے نکلنا ہوتا ہے ۔ ان میں سے پہلی گھاٹی بولوں کا اکٹھا کرنا ہے ۔ ہر لکھنے والا اپنے بس بھر تو اپنی کتاب کے لئے زیادہ سے زیادہ بول ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا ہے پھر بھی ہر لغت میں بولوں کی بہت کچھ کمی رہ جاتی ہے ۔ سچ پوچھئے تو دنیا کی کسی بولی میں آج تک کوئی ایسا لغت نہیں لکھا گیا جس میں اس بولی کے سارے کے سارے بول ملتے ہوں ۔ کارن یہ ہے کہ کوئی ایک آدمی کسی پوری بولی کو نہ جانتا ہے اور نہ جان سکتا ہے اور جو یہ کام ایک سے زیادہ آدمی کریں تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ جتنے زیادہ آدمی اس کام میں مل جائیں گے لغت میں بول اتنے ہی بڑھ جائیں گے پر لغت میں کچھ نہ کچھ کمی پھر بھی رہ جائے گی اور وہ کبھی سو فی صدی پورا نہیں ہو سکے گا ۔ ہم روزانہ ایسے بول بھی سنتے رہتے ہیں جو لغت میں لکھنے سے چھوٹ گئے ہیں پر لغت سے رہ جانے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بول بولی سے باہر کے ہیں یا باہر کر دیئے گئے ہیں ۔ اس پر بھی جو لوگ ہر بول کے لئے بول چال کی جگہ لغت کی سند مانگیں یا مانیں تو یہ ان کی بھول ہی کہلائے گی ۔

جب دو بولیاں ملتی ہیں تو آپس میں کچھ لین دین بھی کرتی ہیں ۔ ایک بولی دوسری بولی کے دیس میں پہنچ کر اسے کچھ دے دیتی ہے اور اپنے ہی دیس میں دوسری بولی کے آ جانے پر اس سے کچھ لے لیتی ہے ۔ بولیوں میں یہ لین دین سدا سے ہوتا آیا ہے اور ایک کے بول دوسری کے یہاں مانگے جاتے رہے ہیں ۔ اسی لئے آج کی دنیا میں کوئی ایک بولی بھی ایسی نہیں ملتی جو بدیسی بولوں سے خالی ہو ۔

ہندوستان میں جب آریائی ۔ فارسی اور انگریزی بولیاں باہر سے آئیں تو انھوں نے دیسی بولیوں کو بہت کچھ دیا اور بہت کچھ ان سے بھی لیا ۔ جس کے کارن انھیں سنسکرت، ہنک ہندی اور انڈین انگلش کے نام دئے گئے یہی اردو کے ساتھ ہوا کہ ایک طرف تو اس نے باہر سے آنے والی آریائی ۔ فارسی اور انگریزی سے گھر بیٹھے بہت سے بول لے لئے اور دوسری طرف راجستھانی، ہریانی برج بھاشا، پنجابی اور دکنی وغیرہ کے دیسوں میں پہنچ کر ان سے بھی بہت کچھ سمیٹا اس لئے اردو کی بھی آج بہت سی بھانتیں ہو گئی ہیں جیسے اکبر آبادی اردو، دہلوی اردو، لکھنوی اردو، لاہوری اردو، حیدرآبادی اردو، ڈھاکی اردو ۔ اس کا ثبوت اردو کے ان لغات سے ملتا ہے جو آج تک الگ الگ نگروں میں لکھے گئے ہیں ۔ مولوی عبدالواسع ہانسوی کے لغت غرائب اللغات میں ہانسی حصار کی بولی کا پٹ

بھی ملتا ہے جیسا کہ سراج الدین علی خان آرزو نے بھی اپنی کتاب نوادرالالفاظ میں کہا ہے۔ دہلی کے باسی منشی سید احمد کی کتاب فرہنگ آصفیہ میں ہریانی ملی اردو ملتی ہے۔ کاکوری (اودھ) کے رہنے والے مولوی نورالحسن نیر کی کتاب نوراللغات میں اودھی ملی اردو کا نمونہ ملتا ہے اور مولوی فیروزالدین کے لغت فیروزاللغات اور عبدالمجید کے لغت جامع اللغات دونوں میں پنجابی ملی اُردو پائی جاتی ہے کیونکہ دونوں پنجاب کے رہنے والے تھے۔ آگرہ اور حیدرآباد (دکن) میں ایسے بڑے لغت تو نہیں لکھے گئے پر ان گروں کی بول چال سننے سے پتہ چلتا ہے کہ اکبرآبادی اردو میں راجستھانی اور برج بھاشا کا میل ہے اور حیدرآبادی اُردو پر دکن کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور یہ رنگ اُردو کے ٹکسالی لہجے اور اُچار کو بھی بدل گیا ہے۔

سنسکرت اور پراکرت کے گرامر نویسوں نے بول کی تین بھانتیں بتائی ہیں:

۱۔ تت سم: ہماری بولی کے وہ بول جو سنسکرت میں بھی اسی روپ میں ملتے ہیں۔

۲۔ تدبھو: ہماری بولی کے وہ بول جو سنسکرت میں کچھ بدلے ہوئے ملتے ہیں۔

۳۔ دیسی: ہماری بولی کے وہ بول جو سنسکرت میں نہیں ملتے۔

اردو میں مجھے چار بھانت کے بول ملتے ہیں:

۱۔ دیسی:۔ یہ وہ بول ہیں جو ہماری بولی میں سدا سے برتے جا رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو اردو کی کچھ پڑوسی بولیوں میں بھی شروع ہی سے ملتے ہیں جیسے گھوڑا۔ روٹی۔ یعنی وہ ان سب کا ملا جلا مال ہیں اور کچھ بولوں کا چلن اُردو کے سوا کسی بولی میں نہیں ملتا جیسے چلد چار۔ بھڑ بھونجا۔

۲۔ بدیسی:۔ یہ دوسری بولیوں کے وہ بول ہیں جو اُردو میں جیوں کے تیوں سے لئے گئے ہیں اور بول چال میں کام آ رہے ہیں۔ انہیں ٹھیٹھ بھی کہتے ہیں۔ جیسے کتاب۔ منزل۔ شام۔

۳۔ بگاڑ:۔ یہ وہ بول ہیں جن کی دیسی آوازوں کی جگہ عربی فارسی کی بدیسی آوازیں رکھ کر اُردو بولنے والوں نے ہی ان کا روپ بگاڑ لیا ہے اور یہ اب بدیسی لگنے لگے ہیں جیسے عش عش۔ خرانٹ۔ قینچی۔ تخریجہ۔ ان کا ٹھیک ٹھیک حال تبھی کھل سکتا ہے جب ایک طرف تو اردو میں ان کی جڑیں ڈھونڈی جائیں اور دوسری طرف بدیسی (عربی، فارسی، ترکی) بولیوں میں ان کے چلن کا کھوج لگایا جائے۔ لغت لکھنے والوں کے لئے ایسے بول بہت کچھ الجھن کھڑی کر دیتے ہیں کیونکہ ان کی جانچ پرکھ کھوجی کا کام ہے اور لغت کار کھوج کا بوجھ اپنے سر نہیں لے سکتا۔ وہ ایسے کسی بول کو بدیسی لکھ دے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ دوسری طرف جو کوئی اس کی یہ بات نہ مانے تو اس پر بھی کوئی روک نہیں لگائی جا سکتی۔

۴۔ متدو:۔ یہ وہ بدیسی بول ہیں جن کی بدیسی آوازیں اُردو بولنے والوں نے دیسی آوازوں سے بدل لی ہیں یا انہیں اپنے لہجے میں ڈھال لیا ہے اور ان کا روپ کچھ دیسی سا ہو گیا ہے جیسے فیر (انگریزی فائر)۔ چراگ (فارسی چراغ)۔

بول جمع کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرا کام یہ ہے کہ کتاب کو الگ الگ حصّوں میں بانٹا جائے اور بولوں کو الگ الگ بابوں اور فصلوں میں رکھا جائے۔ اس کے لئے عربی کے لغت لکھنے والوں کے یہاں یہ عام ریت ہے کہ وہ بول کے آخری اچھر (حرف) کو باب اور

پہلے اچھر کو فصل مان کر بول بانٹ دیتے ہیں سان کے یہاں جن اچھروں سے باب بنتے ہیں انھیں اچھروں سے فصلیں بھی بنتی ہیں جیسے عرض کے بول کو وہ ض کے باب اور ع کی فصل میں رکھتے ہیں اور ضرع کو ع کے باب اور ض کی فصل میں لکھتے ہیں یوں وہ بابوں کے ناموں کے لئے وہی اچھر کام میں لاتے ہیں جو فصلوں کے ناموں میں کام آتے ہیں اس کا کارن یہ ہے کہ وہ خالی اکھروں (حروف صحیح) سے ہی کام لیتے ہیں اور سروں (حروف علت) کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہ عربی کی لپی کی کمی ہے جس میں سروں کو وہ مقام ہی نہیں دیا گیا جو اکھروں کو ملا ہے۔

بابوں اور فصلوں کے ناموں کی بات سے ہٹ کر ان کی بانٹ دیکھی جائے تو عربی بولی کے لئے اس سے اچھا اور کوئی ڈھنگ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس بولی میں سارے روپ جڑوں کے ہی ہیر پھیر سے بنتے ہیں جن میں جڑ کا آخری اچھر باقی رہتا ہے جیسے "ض ر ب" کی جڑ سے بنے ہوئے ضارب، مضروب، مضراب وغیرہ سبھی بولوں کا آخری اچھر جڑ کی طرح ب ہی ہے۔ یوں ایک جڑ سے بننے والے سارے بول ایک ہی باب میں اکٹھے ہو جاتے ہیں پر بولی بولی کا سبھاؤ الگ الگ ہوتا ہے اس لیے یہ ڈھنگ فارسی اردو جیسی بولیوں میں کام نہیں دے سکتا جنھیں ٹک جوڑ کہتے ہیں اور جن کی جڑوں پہ اگ لگوئے (سابقے) اور پچھ لگوئے (لاحقے) لگا لگا کر بول بنائے جاتے ہیں۔

عربی کی دیکھا دیکھی فارسی کے بھی بہت سے لغات میں بے سوچے سمجھے یہی بانٹ رکھی گئی ہے جبکہ اس میں جڑوں پر لگوئے (سابقے اور لاحقے) چپکا کر بول بنائے جاتے ہیں۔ اس کا پھل وہاں یہ نکلا کہ ایک جڑ سے بننے والے بول اکٹھے ہونے کی جگہ کتنے ہی بابوں میں بکھر گئے۔ اس کی مثال کے لئے فرہنگ جہانگیری کا دیکھ لینا کافی ہوگا۔ اردو میں فارسی سے بھی زیادہ لگوئے (سابقے اور لاحقے) ملتے ہیں اور انھیں کے بل بوتے پر وہ اتنی پھلی پھولی ہے اس لئے یہاں یہ بانٹ اور بھی بے تکی ٹھہرتی ہے پھر بھی میں نے اردو کا ایک آدھ چھوٹا سا لغت عربی کے اسی ڈھنگ پر لکھا ہوا پایا ہے۔

فارسی کے کچھ لغات میں بول کے پہلے اچھر کو بھی باب بنایا گیا ہے۔ انگریزی کے سبھی لغات میں بولوں کی بانٹ اسی ڈھنگ پر رکھی گئی ہے اور اردو میں بھی اکا دکا لغت کو چھوڑ کر یہی ریت ملتی ہے کیونکہ ان تینوں ہی بولیوں میں لگوؤں کا عمل دخل ہے۔ اب رہی فصل کی بات تو اس سے انگریزی لغات سرے سے خالی ہیں۔ ان میں بول اپنے پہلے اچھر پھر دوسرے اور پھر تیسرے اچھر کے حساب سے جمائے جاتے ہیں اور یوں ایک اچھر سے شروع ہونے والے بول آخر تک ایک ہی سانس میں لکھتے چلے جاتے ہیں ہاں فارسی اور اردو کے کچھ لغات میں بول کے دوسرے اچھر کو فصل بھی ٹھیرایا گیا ہے جو عام طور پر اکھر (حروف صحیح) ہی ہوتا ہے کیونکہ ان بولیوں کی لپی بھی عربی ہے جس میں چھوٹے سروں (زیر زبر پیش) کو تو درمیان میں ہی نہیں لاتے اور بڑے سروں کے لئے ا، و، ی سے کام لیتے ہیں جو کہیں سُر اور کہیں اکھر ہوتے ہیں اس سے یہ ہوتا ہے کہ جو بول اُو۔ اُو۔ اَو سے شروع ہوتے ہیں جیسے اُول۔ اَول۔ اَوُل یا ان پر ختم ہوتے ہیں جیسے لَو۔ لُو۔ لَو یا جن کے بیچ میں یہ سُر آ جاتے ہیں جیسے مَول۔ مُول۔ مَوُل وہ ایک ہی جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ تینوں سُر الف اور واو سے ہی لکھے جاتے ہیں

اسی طرح اِے اور اَے سے شروع ہونے والے جیسے اِین اور ایک یا ان پر ختم ہونے والے بول جیسے نے اور سے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور جو یہ سُر بولوں کے بیچ میں آ پڑتے ہیں تو ای کے شروالے بول بھی ان کے ساتھ مل جاتے ہیں جیسے پیر (پ۔ے۔ر۔ پی۔ر) جبکہ ان سب کی جڑیں اور جڑوں کے ساتھ ساتھ ان کے معنی بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس ڈھنگ سے گڑبڑ یہ ہوتی ہے کہ ایک جڑ سے بننے والے

بول پورے لغت میں جگہ جگہ بکھر جاتے ہیں اور کئی کئی جڑوں کے بول اکٹھے ہو جاتے ہیں جس سے جڑوں کا سمجھنا کٹھن ہو جاتا ہے۔

سنسکرت اور دیوناگری لپی میں لکھی جانے والی دوسری بولیوں جیسے ہندی وغیرہ میں پہلے اکشر (حروف صحیح) کو باب اور اس کے پیچھے آنے والے پہلے سُر (حرف علت) کو فصل ٹھہراتے ہیں۔ اردو میں بھی بول ہمزہ سے شروع ہوتا ہے یا اکشر سے اس لئے اردو لغت میں بھی ہمزہ یا پہلے اکشر کو باب اور پہلے سُر کو فصل ماننا چاہیے۔ ہماری بولی کے لغت کے لئے یہی طریقہ سائنٹفک ہے۔ اس سے ایک جڑ کے بول ایک ہی جگہ لکھے جاتے ہیں جیسے بور۔ بورا۔ بوران۔ بورانا۔ بوری وغیرہ اور بولوں کی جڑوں کے معنی اور بول بنانے کے ڈھنگ سمجھنے میں بھی سہارا مل جاتا ہے۔

بولی کی پونجی اکہرے بولوں، سماسوں (مرکبات)، مقولوں، محاوروں اور کہاوتوں سے بنتی ہے۔ ان کو لغت میں لکھنے کے کئی ڈھنگ ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خالی جڑ کی سرخی بنائی جائے اور اس سے بننے والے روپوں، مقولوں اور کہاوتوں وغیرہ کو اس کے پیٹ میں لکھ دیا جائے پر ایسا لغت خالی جڑوں کا لغت بن کر رہ جائے گا کیونکہ بول کی پوری کی پوری پونجی ان جڑوں کے پیٹ میں سما جائے گی۔ دوسرا ڈھنگ یہ ہے کہ سماس کی بھی سرخی بنائی جائے اور خالی مقولوں، محاوروں اور کہاوتوں ہی کو بول کے پیٹ میں رکھا جائے پر اس صورت میں بولوں کی ترتیب کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ اچھا کے بعد اچھائی کا بول پہلے لکھا جائے یا اچھا خاصا کا سماس۔ تیسرا ڈھنگ یہ ہے کہ جڑ اور جڑ کے ساتھ اس سے بننے والے بولوں کی الگ الگ سرخیاں بنائی جائیں اور سماسوں، مقولوں، محاوروں اور کہاوتوں کو اس بول کے پیٹ میں لکھا جائے جو ان میں پہلے آتا ہے۔ اردو لغات کے لئے یہی تیسری اور آخری ترتیب ٹھیک لگتی ہے۔

کسی بولی میں جس گھڑی کوئی نیا بول بنتا ہے اس کے بولنے کا ڈھنگ بھی اس گھڑی طے کر دیا جاتا ہے جسے ہم اُچار (تلفظ) کہتے ہیں اور ایک بول کا اچار سدا ایک ہی ہوتا ہے۔ کم سے کم بیٹوں کے نام تو باپوں نے دو دو اچاروں سے نہیں پکارے ہوں گے پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عرب کے داؤد کو انگریزی میں ڈیوڈ، یوسف کو جوزف یوشع کو جوشوا اور یوحنا کو جون بولا جاتا ہے ایک ایک نام سے ان دو دو اچاروں میں سے ایک اصلی اور دوسرا بدلا یا بگڑا ہوا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ بولنے والوں کے گلے کی خرابی، دیس دیس کی الگ الگ آب و ہوا یا دھرتی کی بناوٹ (پہاڑ۔ جنگل۔ ریگستان وغیرہ) سے اُچار بگڑ جاتا ہے پر میں نے یہ دیکھا ہے کہ یہ بگاڑ خالی لپی سے جنم لیتا ہے۔

بول جب تک کانوں سے سنا جاتا ہے اس کا اچار ٹھیک رہتا ہے پر جیسے ہی وہ کاغذ پر آتا ہے اور پھر کاغذ سے ہی پڑھا جاتا ہے تو اس کا اچار بگڑ جاتا ہے کیونکہ آوازا اور اچھر کا ناتا سماج کی ایک من مانی ریت ہے جسے اس سماج سے باہر کے لوگ نہیں سمجھ پاتے۔ لپی آوازیں بند کرنے کے لیے بنی تھی اور آج سنسار میں بولیوں کی طرح لپیوں کی بھی بہت بڑی گنتی ملتی ہے پر ان میں سے کوئی ایک لپی بھی اتنی پکی نہیں ہے کہ کسی ایک بولی کی آوازوں کو بھی پوری طرح جکڑ سکے اور بولوں کا ٹھیک ٹھیک اچار بتا سکے اس لیے ہر لپی کا کام ریت کے سہارے چلتا ہے جس میں اچھروں کی بناوٹ اور ملاوٹ جیسے کئی موڑ پیچ آتے ہیں۔ ان میں انگریزی کی رومن لپی تو بہت ہی کچی ہے لکھیں موسا پڑھیں خودا کی کہاوت اسی پر ٹھیک بیٹھتی ہے۔ کارن یہ ہے کہ اس میں سُروں کے لئے خالی پانچ ہی اچھر ملتے ہیں اور پانچ اچھروں سے کام نہیں چلتا کیونکہ سُروں کی گنتی اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں نہ تو غنہ کے لئے کوئی علامت یا اچھر ہے نہ ہندوستانی

بولیوں کی بھاری آوازوں (کھ، گھ، بھ، بچھ وغیرہ) کے لئے اور نہ عربی فارسی کے بہت سے اکشروں (خ، ذ، ز، غ، ف، ق وغیرہ) ہی کے لئے کوئی اچھر ملتا ہے۔ اس کے ایک ایک اچھر کی کئی کئی آوازیں مانی جاتی ہیں اور پھر دیس دیس میں اس کے ایک ایک اچھر کی آوازیں بھی الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ترکی میں جلال کو رومن لپی سلال اور مصر میں جمال کو گمال یا گمیل لکھتی ہے۔

اردو کی عربی لپی میں بھی سروں کا کوئی دھیان نہیں ہے۔ چھوٹے سروں کے لئے تین علامتیں (زیر زبر پیش) تو ہیں پر اچھروں پر اعراب لگانے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ لمبے سروں کے لئے ا، و، ی کا سہارا لیا جاتا ہے جو دوسری جگہ اکشر (حروف صحیحہ) کا بھی کام دیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بھول بھلیوں میں پھنسا دیتے ہیں۔ دو چشمی ہے اور ہائے ہوز کی آوازوں میں بھی گھپلا ہو جاتا ہے۔ ی جب بول کے بیچ میں آتی ہے تو یائے معروف اور یائے مجہول کا بل مٹ جاتا ہے۔ شیر کو شی ر اور شے ر دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔ اس لپی میں کئی سروں کی علامتیں ہی سرے سے نہیں ملتیں۔ اس میں ایک ایک بول کو کئی طرح لکھا جاتا ہے او ایک ہی بول پونچ، پہنچ، پہنچ، پہونچ اور پھونچ کے پانچ روپوں میں لکھا ہوا مل جاتا ہے اس لئے اس لپی کی پڑھائی میں بھی اٹکل ہی سے کام چلتا ہے۔

سنسکرت اور ہندی کی دیوناگری لپی ان دونوں لپیوں سے کچھ اچھی ہے کیونکہ اس میں سروں کے لئے علامتیں ملتی ہیں اور زیادہ تر جیسا لکھو ویسا پڑھو کی آسانی رہتی ہے پر اس میں بھی کئی سروں کے لئے علامتیں نہیں ملتیں اور عربی فارسی کے خاص اچھروں (غ، ق، ز وغیرہ) کے لئے بھی اچھر نہیں ہیں۔ چل (متحرک) اور اَچل (ساکن) اچھروں کی لکھاوٹ کا ڈھنگ تو ہے پر اس کی پابندی نہیں ہے۔ یوں اس لپی کے پڑھنے میں بھی بہت کچھ اٹکل سے کام چلانا پڑتا ہے

لپیوں کی کھوٹ کے کارن ہی لکھاوٹی روپ دیکھ دیکھ لوگوں کا اچار بھی بگڑ جاتا ہے۔ وہ جب اردو کے پیار کو اَردو ہی میں پ یار اور بھیڑ کو بھڑ۔ وا بولنے لگتے ہیں۔ انگریزی میں عربی جمل (اونٹ) کو کیمل، قطن کو کوٹن، اَرد دکیتی کو قیش، کھاٹ کو کوٹ، فارسی دیوار کو تعمیر، خاکی کو کھاکی کہنے لگے ہیں، اور ویدک میں فارسی خرامیم (ہم چلیں) کو کرامیم، فارسی خرد کو کرتو اور فارسی دروغ کو دروگھ پڑھتے چلے آ رہے ہیں تو عربی کے اولوالعزم کو اَوْلُو۔ العزم اور فارسی خوار کو خ وار بھی پڑھ سکتے ہیں۔

یوں تو بولی کے سماج میں جہاں ہر ایک بول کا اچار کانوں سے سنا جاتا ہے لغات میں اچار دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی پر دوسرے دیس میں جہاں لوگوں کو اس کا اچار سننے کو نہیں ملتا اور خالی لکھاوٹوں ہی سے کام چلانا پڑتا ہے لغات میں بولوں کا اچار دینا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی کے لغات میں یہ ریت بھی ملتی ہے۔ عربی فارسی میں یہ تمام عبارتوں سے اور انگریزی میں علامتوں سے لیا جاتا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی اردو کے لغات میں بھی کہیں کہیں اس کا جتن کیا گیا ہے پر بہت ہی بے دلی سے کیا گیا ہے کیونکہ ہماری بولی میں سروں کی علامتیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور جب تک علامتیں نہیں بنیں گی یہ کام بھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔

لغت میں معنی لکھنے کے کئی طریقے کام میں لائے جاتے ہیں۔

۱۔ تصویری۔ جس بول کے معنی بتانا ہوتے ہیں اس کی تصویر بنا دیتے ہیں جیسے شیر۔ چرخا وغیرہ۔ یہ طریقہ دوسری بولیوں جیسے عربی اور انگریزی وغیرہ کے لغات میں تو دیکھنے میں آتا ہے پر اردو میں اس کا چلن نہیں ہے۔

۲۔ تعریفی۔ بول کے آگے اس کی تعریف لکھ دی جاتی ہے جیسے مثلث۔ تین خطوط مستقیم سے گھری ہوئی شکل۔ یہ طریقہ اصطلاحوں کے

معنی بتانے میں کام آتا ہے۔

۳۔ تشریحی۔ کبھی اس چیز کی خصوصیات اور اس کا استعمال وغیرہ بتا دیا جاتا ہے جس کے لئے وہ بول گھڑا گیا ہے جیسے ساہل۔ راجوں کا ایک آلہ جو لوہے یا پتھر کے گول ٹکڑے میں لمبی سی ڈوری باندھ کر تیار کیا جاتا ہے اور راج اس کو لٹکا کر دیوار کی سیدھ ناپتے ہیں۔

۴۔ مترادف۔ کبھی کسی دوسری بولی کا کوئی ہم معنی بول بھی لکھ دیتے ہیں یا اسی بولی کا کوئی ایسا بول بھی دے دیتے ہیں جو معنی میں اس سے ملتا جلتا ہو جیسے اچھا۔ خوب۔ مناسب۔ نیک۔ ستھرا وغیرہ۔

۵۔ بہروپ۔ کسی بول کے معنی بتانے کے لیے آوازوں کے اصولوں کی مدد سے اسی بول کا دوسرا روپ گھڑ کر دے دیا جاتا ہے جیسے ڈھانکنا۔ ڈھانپنا۔ یا چھوٹنا۔ چلنا۔

بہت سے لغات سامنے رکھ کر ایک نیا لغت لکھ ڈالنے کی ریت آج کی نہیں سدا کی ہے اور کچھ بری بھی نہیں ہے کیونکہ سنسار میں دئے سے دیا جلتا چلا آیا ہے پر ان میں ایسے لغات کی گنتی بہت تھوڑی سی ہے جن کے لکھنے والوں نے بولوں کے لکھاوٹی روپوں پر کم اور بول چال پر دھیان زیادہ دیا ہو[1]۔ یہ کام بہت محنت اور وقت چاہتا ہے اور جوکھوں کا کام بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ پر سچی بات یہ ہے کہ بولی کا روپ بول چال پر دھیان دے کر ہی نکھارا جا سکتا ہے۔ پراکرت کے ایک نامی گرامر نویس لکشمی دھر نے اپنی کتاب "شڈ بھاشا چندرکا" میں یہ بات کھول کر لکھی ہے اور اسے اپنی گرامر کا ایک اصول بنا دیا ہے کہ جہاں جہاں لکھاوٹی روپ اور بول میں بل پایا جائے وہاں وہاں روپ کو چھوڑ کر بول چال کو اپنایا جائے کیونکہ بولی بول چال کا ہی دوسرا نام ہے۔

اردو کے لغات میں وہ بدیسی بول تو ملتے ہی ہیں جو عام طور پر اردو والوں میں بولے جاتے ہیں پر کچھ لغات میں ایسے ایسے بدیسی بول بھی بھر دیئے گئے ہیں جو اردو میں کبھی بولے سنے نہیں گئے اور جن کی اب بھی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ لکھنے والوں کو ایسے لغات لکھنے میں بہت بڑی آسانی یہ ہے کہ انھیں اردو کے بول ڈھونڈنے کے لئے اردو بولنے والوں کے یہاں مارا مارا پھرنا نہیں پڑتا۔ اور جب انھیں بہت سے بول بدیسی بولیوں کے لغات میں ایک جگہ مل جاتے ہیں جنھیں نقل کر کے وہ اپنے اپنے لغات کو بڑے سے بڑا بنا سکتے ہیں تو وہ اردو کی بول چال سنے بنا ہی لغت لکھ ڈالتے ہیں۔ ایسے لغات میں اچار (تلفظ) سے زیادہ بولوں کے لکھاوٹی روپ پر دھیان اور زور دیا گیا ہے اس لئے لپی اور لکھاوٹ کی جو کھوٹیں اوپر بتائی جا چکی ہیں وہ سب ان میں پائی جاتی ہیں۔ کبھی ان سے جنم لینے والا بگڑا ہوا اچار سامنے آتا ہے تو کبھی ایک ہی بول کے کئی کئی روپ دیکھنے کو ملتے ہیں جو لکھاوٹ کی الگ الگ ریتوں سے بن گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لغات سے بولی کے پیاسوں کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔

اردو ہی کیا دنیا کی ہر بولی کا یہ اصول ہے کہ بدیسی (دخیل) بول کا اصلی اچار کچھ بھی ہو جب وہ ایک بار اس بولی میں چالو ہو گیا تو جس طرح بولنے والے بولیں گے اسی طرح ٹھیک مانا جائے گا۔ انگریزی میں سیکڑوں بدیسی بول اصلی اچار سے ہٹ کر بولے جا رہے ہیں جیسے

---

[1] فاضل لکھنوی صاحب کے لکھے ہوئے لغت "جدید نسیم اللغات" میں بول چال کی طرف زیادہ جھکاؤ ملتا ہے۔

کھاکی - کوٹ - کیمیں اور انگریزی بولنے والے اَن پڑھ اور پڑھے لکھے سب کے سب ان کے چالو اُچار کو ٹھیک مان رہے ہیں - ان میں سے ایک بھی تو یہ نہیں کہتا کہ انھیں خاکی، کھاٹ اور کُل بولا جائے پھر اردو والوں سے ہی یہ تقاضا کیوں کیا جاتا ہے کہ وہ نَقَل کو نقل - شاکر شُغُل اور عَرَبی کو عَرَبی بولیں جبکہ وہ بھی ان بدیسی بولوں کو اپنے دیسی لہجے میں ڈھال کر بول رہے ہیں - اردو کے لغات بھی بدیسی بولوں کا بدیسی اچار تو دیتے ہیں پردیسی اور چالو اچار نہیں دیتے - یہی کارن ہے کہ ہمارے لغات سے اردو بول چال کا رنگ نہیں جھلکتا اور یہی ان کی سب سے بڑی کھوٹ ہے -

انگریزی کے کچھ لغت کار لغت میں بول کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا نام بھی لکھ دیتے ہیں جس میں وہ پہلی بار آیا ہے اور وہ اسی کو تاریخی لسانیات سمجھتے ہیں پر نہ تاریخی لسانیات کے ہی یہ معنی ہیں اور نہ کسی بول کے لکھاوٹ میں آجانے سے اس کی گھڑائی کی تاریخ کا بناؤ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ ہر لکھنے والا ہر بول نہیں لکھتا - پہلے کا مصنف ایک بول کو چھوڑ دیتا ہے اور اس کے پیچھے آنے والا اسے اپنی کتاب میں لکھ دیتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ بول پہلے مصنف کے زمانے تک نہیں بن پایا تھا - پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بول پہلے کی کسی کتاب میں لکھا گیا ہو اور وہ کتاب لغت لکھنے والے کے ہاتھ نہ آسکی ہو یا وہ کتاب ہی مٹ چکی ہو - اس لئے اس بات کا بناؤ کہ کون سا بول پہلے بنا اور کون سا پیچھے بنا خود بولوں پر دھیان جمانے سے ہی ہو سکتا ہے - مثال کے طور پر سب سے پہلے جڑیں بنیں - ان کے پیچھے لگو سے بنے اور پھر جڑوں پر لگو سے بڑھا بڑھا کر دوسرے بول گھڑے گئے ہیں - پھر جڑیں بھی دو بھانت کی ہیں - ابتدائی اور ثانوی - ان میں سے ابتدائی پہلے اور ثانوی پیچھے ڈھالی گئیں - بولی کے ایسے ہی مطالعے کو تاریخی لسانیات کہتے ہیں اور دنیا کی ہر بولی کی طرح ہماری بولی بھی اس مطالعے کا راستہ دیکھ رہی ہے -

کسی بولی کا لغت لکھنے والوں کے سامنے ایک کٹھنائی یہ ہے کہ وہ کس بول کو اپنا اور کس کو پرایا مال سمجھیں - انھیں یہ کون بتائے کہ فلاں بول اسی بولی کا ہے اور فلاں بول بدیسی (دخیل) ہے - اس کے لئے انہوں نے یہ راستہ نکالا ہے کہ وہ کسی مصنف کا جملہ یا کسی شاعر کا شعر لکھ دیتے ہیں جس میں وہ بول آیا ہے - اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں مصنف یا شاعر جس نے یہ بول لکھا ہے اسی بولی کا ہے اس لئے یہ بول بھی اسی بولی کا مال ہے - ایسی سند کو دوسرے لغت کاروں کی طرح ہمارے لغت کار بھی کافی سمجھتے ہیں پر ان کا یہ جتن کھوٹ سے خالی نہیں ہے - آخر یہ کیسے مان لیا جائے کہ جس ادیب یا شاعر نے (چاہے وہ اسی بولی کا ہو) یہ بول لکھا ہے - وہ ٹھیٹھ دیسی بول ہی لکھتا ہے اور کبھی بدیسی بولی نہیں لکھتا یا وہ سدا ٹھیک بول ہی بولتا ہے کوئی کھوٹا بول کبھی نہیں بولتا - پھر اس نے بھی تو یہ بول ٹکسالی کہہ کر نہیں لکھا ہے - بول کے ٹھیک یا ٹکسالی ہونے کا دعویٰ تو لغت کار کرتا ہے اور اپنے دعوے کا بوجھ ادیب یا شاعر پر دھر دیتا ہے - یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے -

اُردو کے ادیب اور شاعر الگ الگ دیسوں کے باسی ہیں اور ان دیسوں کی اردو میں مقامی بولیوں کا پٹ بھی لگا ہوا ہے اس لئے ان لغات میں ہر وہ شعر یا جملہ جو لکھا گیا ہے اس کا شاعر یا ادیب کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کھری اور بے میل اُردو کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا اور اس کی اردو ٹکسالی اُردو نہیں مانی جا سکتی اس لئے سند دینے کا یہ ڈھنگ غلط ہے - مولوی نذیر احمد کی مثال سامنے ہے وہ اپنی کتابوں میں کہیں کہیں اپنی جنم بھوم بجنور (یو پی - بھارت) کی بول چال بھی لکھ گئے ہیں جو ٹکسالی اردو سے ہٹی ہوئی ہے - مولوی صاحب اردو کے بہت بڑے

ادیب بھی ہو ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر بول یا ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر فقرہ ٹکسالی نہیں مانا جا سکتا۔ لغت کار مولوی صاحب کے نام کی دہائی دیتا ہے ایسی بول چال اور ایسے بولوں کو ٹکسالی نہیں سمجھا جا سکتا۔

بولی کا سبھاؤ عوامی ہے۔ اس میں کسی ایک آدمی کا راج نہیں۔ سماج کا سکہ چلتا ہے اور کوئی ادیب یا شاعر پورے سماج کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ہر بولی کے سماج میں پڑھے لکھوں کے ساتھ ساتھ ان پڑھ بھی رہتے ہیں اور گنتی میں ان سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں اس لیے بولی کی سند خالی پڑھے لکھوں ہی سے نہیں ان پڑھوں سے بھی لینا چاہیے۔ یہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ ان پڑھوں کی بول چال پڑھے لکھوں سے زیادہ کھری اور بے میل ہوتی ہے۔ پھر بولی کا دیس بھی نگروں میں نہیں دیہات میں ہوتا ہے۔ ایک نگر میں کتنی ہی بولیاں بولنے والے بستے ہیں اس سے نگر باسیوں کی بول چال میں بدیسی بولوں کا زیادہ میل ہو جاتا ہے اور وہ کھچڑی بولی بولنے لگتے ہیں جبکہ دیہات کے رہنے والوں کی بول چال میں ملاوٹ سے بہت کچھ بچی رہتی ہے۔ محنت اسی لغت کار کی سوارت ہوتی ہے جو مٹھی بھر پڑھے لکھوں کے ساتھ ساتھ ان پڑھوں کی بول چال بھی سنتا ہے اور نگر باسیوں کی بول چال کے ساتھ ساتھ دیہات والوں کی بول چال کو بھی سامنے رکھتا ہے۔ لغت کے لئے ضروری ہے کہ وہ بول چال کا رنگ دکھائے اور یہ رنگ تبھی چوکھا ہو سکتا ہے جب کچھ دکھ بھر کے اسے ڈھونڈنے کا جتن کیا جائے۔ سند میں کسی ادیب کا جملہ یا شاعر کا شعر لکھنے سے یہ کہیں اچھا اور ضروری ہے کہ لغت کار لغت میں اس دیس (علاقے) کا نام لکھ دے جہاں وہ بول یا محاورہ بولا جاتا ہے۔

اردو میں اب تک جتنے لغت لکھے گئے ہیں وہ سب کے سب ادبی ہیں اور ادیبوں اور شاعروں کی ضرورتیں سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اس لئے بولی کے طالب علم کو پورا فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ان سے اردو کی عوامی بول چال کا ٹھیک ٹھیک حال معلوم نہیں ہوتا۔ اردو کے لہجے کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بولوں کے اچار کا پتا نہیں چلتا۔ ان کی اصل نسل ظاہر نہیں ہوتی اور اس علاقے کا کھوج نہیں ملتا جس میں کوئی خاص بول بولا جاتا ہے۔ اس لئے اردو میں ایسے لغات تیار ہونے چاہئیں جن میں اوپر لکھی ہوئی باتوں کی طرف پورا دھیان دیا گیا ہو اور جو بولی کا سچا رنگ روپ دکھا سکیں۔

اردو ادب میں جذبات کا عنصر

محمد شمس الدین صدیقی

اس غرض سے کہ ذہن میں کوئی پراگندگی نہ پیدا ہو پہلے یہ طے کرلینا چاہیے کہ جب ہم ادب اور جذبات کے موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں تو کس کے جذبات مراد لے رہے ہیں۔ کیونکہ ادبی اثرات کی بحث میں تین فریق ممکن ہیں جن کے جذبات پر توجہ دی جاسکتی ہے اور بعض اوقات ہم اپنی گفتگو میں تینوں کے جذبات کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ جذبات، قاری کے بھی ہو سکتے ہیں، مصنف کے بھی اور کسی خیالی کردار کے بھی جسے مصنف نے اپنی تصنیف میں پیش کیا ہو۔ مثال کے طور پر جب ہم امتیاز علی تاج کے ڈرامے انار کلی کی جذباتی قدروں کی بات کرتے ہیں، تو کیا ہم اس سے وہ جذبات مُراد لیتے ہیں جو ہم میں اس ڈرامے کو پڑھتے ہوئے یا اسٹیج پر دیکھتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں، یا وہ جذبات جو مصنف نے اس ڈرامے کو لکھتے وقت محسوس کیے تھے یا خود ڈرامے کے کرداروں کے جذبات؟ عام گفتگو میں یہ ممکن ہے کہ ہم تینوں ہی مُراد لیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ جذبہ سچا اور کھرا ہونا چاہیے تو اس وقت ہمارے ذہن میں یہ خیال ہوتا ہے کہ مصنف کو درحقیقت وہی کچھ محسوس کرنا چاہیے جس کا اس نے اپنی تصنیف میں تاثر دیا ہے یا ادعا کیا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی ڈرامے یا ناول میں پُراثر مقامات واحوال ہونے چاہئیں تو ہمارے ذہن میں یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامے یا ناول کے کردار پُراثر جذبات کا مظاہرہ کریں اور جب ہم کسی نظم یا ادب پارے کو ہیجان خیز یا پُرسوز یا جوش انگیز قرار دیتے ہیں تو اس وقت ہم اپنے ذاتی جذبات و تاثرات کو جو اس نظم یا ادب پارے کے پڑھنے سے پیدا ہوئے ہیں، بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ اور ایک حد تک ان تینوں مفہوموں میں سے ہر ایک بقیہ دونوں کی بھی دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ بات مشکوک ہے کہ کوئی مصنف کسی جذبہ و احساس کو خود محسوس کیے بغیر اپنے تخلیق کردہ کرداروں میں پُراثر جذبات کا اظہار کر سکے۔ اسی طرح کسی مصنف کے لیے اپنے قارئین کے جذبات کو مرتعش کرنے کا یقینی طریقہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ میں یا اپنی تخلیق کردہ تخیئلی شخصیتوں میں اُن جذبات کا مظاہرہ کرے۔ اگرچہ ادب میں جذبات کے عنصر کا ذکر اس قدر مبہم، ڈھیلے ڈھالے انداز میں کیا جاتا ہے تاہم اپنی موجودہ بحث کے لیے ہم اسے زیادہ تر ایک مفہوم کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کریں گے یعنی قارئین کے جذبات۔ گویا ادب میں جذبات کے عنصر سے ہماری بالعموم مراد ہوگی پڑھنے والوں کے جذبات کو بیدار یا مرتعش کرنے کی طاقت جو ادب میں پائی جاتی ہے۔

پہلا سوال ہم یہ اٹھا سکتے ہیں کہ وہ کونسے جذبات ہیں جنہیں ادب اپیل کرتا ہے؟ اس کے جواب میں ہم ادبی جذبات کو شمار کرنے یا ان کی طبقہ بندی کرنے کی لاحاصل کوشش نہیں کریں گے کیونکہ یہ جذبات بہت متنوع اور پیچ در پیچ ہیں اور ان کی طبقہ بندی یا ان کا شمار محال ہے۔ تاہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ دو قسم کے جذبات ایسے ہیں جنہیں ہم جائز دو بجا ادبی جذبات کے دائرے سے خارج قرار دے سکتے ہیں۔ ایک تو نافعِ ذات جذبات ہیں جن کو اپیل کرنا ادب کا کام نہیں۔ دوسرے تکلیف دہ جذبات بھی

ادبی اپیل کے لیے موزوں نہیں۔ نافعِ ذات جذبات سے ایسے تمام جذبات مراد ہیں جو ہمیں کسی چیز کو اپنے ذاتی مفاد یا استعمال کے لیے حاصل کرنے پر اُکسائیں (مثلاً بخل یا لالچی پن یا ہوسناکی)، یا ہمیں ایسے خطرے سے بچنے کے لیے اُکسائیں جو ہماری ذاتی سلامتی کو لاحق ہے (مثلاً ہول یا دہشت) یا ہمیں کسی ایسی مسرت یا گزند یا احسان کا بدلہ لینے یا دینے پر اُکسائیں جو ہمیں شخصی طور پر ملا ہے مثلاً انتقام یا ذاتی شکر گزاری) دوسروں میں ایسے جذبات کا تصور ہم میں ایسا احساس بیدار کر سکتا ہے جو ادبی صفت یا خصوصیت رکھتا ہو لیکن بذاتہٖ ان میں سے کوئی جذبہ خواہ کیسا ہی لائقِ تعریف اور مسرت بخش سہی ادبی جذبہ نہیں ہے۔ کسی شخص نے اگر میرے ساتھ کوئی نیکی کی ہے، مجھ پر احسان کیا ہے۔ مجھے رقمی مدد دی ہے یا کوئی روزگار دلایا ہے تو اس کا شکر گزار رہنا یا احسان ماننا اچھی بات سہی، لیکن یہ کوئی ادبی جذبہ نہیں ہے۔ البتہ کسی کی دیانت داری یا ایثار یا کرم گستری کی صفت کی توصیف کرنا ادبی جذبہ ہے کیونکہ ایک صورت میں یعنی اول الذکر صورت میں جذبہ نافعِ ذات اور شخصی ہے اور دوسری صورت میں عالمگیر۔ ادبی جذبات کو اسی دوسری قبیل سے ہونا چاہیے۔

یہ بات کہ تکلیف دہ جذبات ادبی اپیل کے لیے موزوں نہیں اس قدر واضح ہے کہ اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ مثال کے طور پر تنفر و کراہت، حقارت، حسد، غضب و غصہ، جلاپا جیسے جذبات ادبی اثرات کے دائرے سے خارج ہیں کہ یہ تکلیف دہ ہیں اور کوئی صحت مند ذہنی کیفیت کا حامل شخص کبھی تکلیف دہ احساسات کا آرزومند نہیں ہوتا۔ البتہ بعض مریضانہ ذہنی کیفیت والوں کو مکروہ و ناخوشگوار جذبات میں بھی دلکشی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے جذبات کی آرزو جو صحت مند مذاق کے لیے تکلیف دہ یا مکروہ و ناپسندیدہ ہوں بعض اوقات تھکے ہوئے چور چور اور بہت زیادہ ہیجان زدہ احساسات یا قوائے تاثر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات کسی افسردہ و پژمردہ فلسفے یا حقائقِ زندگی کے بارے میں قنوطی طرزِ نظر کا لیکن وجہ خواہ کچھ ہی ہو اور خواہ یہ جذبات کہیں پائے جائیں۔ کسی فرد میں یا کسی معاشرے میں، یہ ہمیشہ غیر صحت مندی اور بیماری کی علامت ہیں اور ان جذبات کو تسکین دینے کی افتادِ مزاج یا میلان ادبی زوال کا یقینی ثبوت ہے۔ لیکن تخیل کی حقیقت پسندانہ چمک یا شوخی اور ہیئت کی حیرت انگیز برجستگی یا خوش بیانی بھی کبھی ایسی تصویروں سے اچھا ادب نہیں پیدا کر سکتی جس میں روح کی بنیادی سوقیت اور اوچھا پن یا شہوانی جذبات یا واقعات کے آگے مجہول خود سپردگی یا گھناونے، رذیل اور اٹکل پچو مصائب و محن کی نقشہ کشی کی گئی ہو۔ ایسی تصویریں صحت مند ذہن میں سوائے حقارت یا گھن یا تکلیف کے اور کوئی احساسات نہیں پیدا کر سکتیں۔

تاہم ایسی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ تکلیف دہ جذبات اور تجربات و مشاہدات اعلیٰ ادبی اثرات کا پُرمنفعت منبع بن جائیں۔ یہاں ہمارا اشارہ ایسے کی طرف ہے جس پر توجہ دیتے ہوئے ہم سوز و گداز کے مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کا جانا بوجھا خاصہ ہے کہ دوسروں کی تکلیف کا تصور لازماً ہم میں تکلیف دہ جذبات و احساسات نہیں پیدا کرتا۔ ہم المیہ کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں کو ایسے جذبات کے ساتھ پڑھتے ہیں جنہیں تکلیف دہ نہیں قرار دیا جاتا بلکہ ایک لحاظ سے مسرت بخش کہا جاتا ہے۔ درحقیقت ایسے کئی اعلیٰ اور مسرت بخش جذبات ہیں جو تکلیف ہی کے تماشے سے ابھارے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ غیر مستحق تکلیف یا غم ہمیشہ اس ذہن میں جو اسے تصور کرتا ہے۔ ترس اور ہمدردی پیدا کرتا ہے اور ترس اور ہمدردی کا جذبہ دو لحاظ سے مسرت بخش

ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ترس اور ہمدردی یا وہ کوشش جو اس سے تحریک یافتہ ہے درحقیقت اس تکلیف کو کم کرتی ہے جس پر ہم ترس کھاتے ہیں۔ جب ترس اور ہمدردی صاف طور پر لاحاصل ہو تو پھر وہ تکلیف میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً کسی ایسے دوست کی اذیت پر ترس کھانا جو ایک ناقابلِ علاج مرض کی وجہ سے بسترِ مرگ پر پڑا ہے باعثِ تکلیف ہے۔ لیکن کسی ایسے دوست کے رنج و ملال پر ترس کھانا اور اس سے ہمدردی کرنا جسے بے جا طور پر ملامت یا بہتان کا نشانہ بنایا گیا ہو باعثِ تکلیف نہیں ہے کیونکہ ہمارے ترس کھانے اور ہمدردی کرنے سے دوست کا ذہنی اور جذباتی بار ہلکا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ترس اور ہمدردی کے جذبات اس وقت مسرت بخش ہوتے ہیں جب ہم جانتے ہیں کہ جن تکالیف و مصائب پر ہم ترس کھا رہے ہیں اور ہمدردی کر رہے ہیں وہ خیالی و فرضی کردار ہیں کیونکہ وہ نظم یا افسانے یا ناول یا ڈرامے میں پائے جاتے ہیں یا پھر وہ رفتہ و گذشتہ ہیں جیسے کہ سوانح یا تاریخ ہیں۔ ایسی صورتوں میں ہمیں اپنی طرف سے کوئی عملی کوشش کیے بغیر اور اس تکلیف کے عنصر کے بغیر جو حقیقی آلام و مصائب کے علم سے پیدا ہوتا ہے، کریم النفس جذبے کی مسرت ملتی ہے۔ اسی طرح پُرجوش توصیف و پسندیدگی فی الاصل تکلیف و مصیبت کی برداشت پر دلالت کرتی ہے۔ سورما یا وہ صفات جیسے جرأت، جاں نثاری، برداشت، عالی ظرفی، اولوالعزمی اور حالات پر رُوحِ انسانی کی فوقیت وغیرہ، ان سب کا ثبوت تکلیف ہی کے پیمانے سے ملتا ہے اور حقیقت میں انہی صفات کا اظہار نہ کہ محض تکلیف ہے، جو ادبی جذبات کو ابھارتی ہے۔ یہ علم کا انسانی عزم، ہول اور دہشت پر ہنس سکتا ہے اور انسانی محبت موت سے زیادہ طاقت ور ہے بہت خوشی اور طاقت بخشنے والا ہے۔ بعض اوقات پامال شدہ اخلاقی قانون کے صحیح ثابت ہونے کا تماشا ہمیں ایک خاص قسم کی سنجیدہ مسرت بخشتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمدردی کے کسی بھی عمل میں ایک بنیادی مسرت ہوتی ہے خواہ ہمدردی کی اساس کوئی تکلیف دہ تجربہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا ادب بھی سوز و گداز یا شکوک و شبہات پر مشتمل ہوتا ہے پڑھنے والوں کے لیے دل کش ہوتا ہے۔ جدید شعراء میں جو سربرآوردہ نام نظر آتے ہیں ان کی شاعری میں تشکک کا عنصر بھی ہے اور ناآسودگی کا بھی جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا سوز پیدا ہو گیا ہے اور پڑھنے والے ان کی شاعری پڑھ کر ایک قسم کا عمیق اگرچہ نیم ماتمی اطمینان و تسکین محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ علم کہ دوسرا بھی اسی طرح سوچتا اور محسوس کرتا ہے جس طرح ہم کرتے ہیں اور وہ ہمارے ہی تجربے اور تاثر کو ایسے خوبصورت اور پُراثر انداز میں پیش کر رہا ہے کہ ہم نہیں کر سکتے، یہ علم بجائے خود ہمارے انسانی برادری اور روحانی رفاقت کے قلبی احساس میں جوش و سرگرمی بیدار کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے مماثل اسباب کی وجہ سے تجربے اور تاثر کے تمام پہلو، خواہ وہ اندوہگیں ہی ہوں، اگر عالم گیر ہیں اور عام انسانی قسمت کا ایک حصّہ ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک فرحت بخش ہمدردی ابھارتے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی امنگوں اور اس کی واقعی تحصیل میں جو فرق ہوتا ہے یہ ایک عالمگیر تجربہ ہے جو اُداس کرنے والا ہے۔ اسی طرح زندگی کی رفتار اور سرگرمی، وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پیری میں جس طرح کم ہوتی جاتی ہے اور انسان کی تخئیل اور ولولے میں جو زوال آتا جاتا ہے اور آخر میں جس طرح موت سب امتیازات کو مٹا کر بلند ترین اور پست ترین افراد کو ایک ہی مٹی میں پہلو بہ پہلو لٹا دیتی ہے، یہ سب تجربات و مشاہدات دل میں سوز و گداز پیدا کرنے والے ہیں۔ ان طریقوں سے انسانی تکالیف و آلام بہترین ادبی محرکات فراہم کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک عمومی اصول کے طور پر یہ طے کیا جا سکتا ہے

کہ اچھا ادب کبھی تکلیف کو محض اٹکل پچو اور من موجی طور پر نہیں پیش کرتا بلکہ صرف اس لیے کہ کسی ایسے جذبے کو ابھارے جو صحت مند ہے اور اُن وسیع معنوں میں مسرّت بخش ہے جن کی طرف قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اگر ہم نافع فات اور تکلیف دہ جذبات کو مستثنےٰ کر دیں تو ادبی اپیل کے لیے انسانی جذبات و احساسات کا سارا وسیع میدان کھلا ہوا ہے۔ اگر کوئی کتاب کسی بھی انسانی جذبے کو اپیل کرنے کی دائمی قوت رکھتی ہے تو وہ اسی بات سے ادب کے دائرے میں داخل ہے۔ مختلف النوع ادبی جذبات کی طبقہ بندی مشکل بھی ہے اور بے سود بھی، اس لیے کہ جامع و مانع طور پر ممکن نہیں ہے۔ مشہور انگریز نقاد رسکن نے شعر و ادب کی تعریف کرتے ہوئے ایسی طبقہ بندی کرنے کی کوشش کی تھی اور بتایا تھا کہ ادب کے اعلیٰ جذبات کیا ہیں رسکن کے مطابق بنیادی ایجابی جذبات چار ہیں یعنی محبّت، احترام، توصیف اور خوشی، اور بنیادی سلبی جذبات بھی چار ہیں۔ یعنی نفرت طیش، خوف اور غم۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جذبات باہم ممزوج ہو کر شاعرانہ احساس تخلیق کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رسکن کی طبقہ بندی بہت محدود قسم ہے مثلاً بعض نظموں کو پڑھ کر امن و سکون کا تأثر پیدا ہوتا ہے۔ اس تأثر کو رسکن کے دیے ہوئے کسی جذبے یا جذبات کے امتزاج سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ امن و سکون کو ہم خوشی کے جذبے سے ضرور علیحدہ رکھیں گے۔ مثلاً اقبال کی نظم ایک شام (دریائے نیکر کے کنارے پر) کا تأثر امن و سکون کا ہے نہ کہ خوشی کا۔ علاوہ امن و سکون کے مثال کے طور پر دوسرے ادبی اثرات کو دیکھئے جیسے آرزومندی، قناعت، آرام، مزاح، حسن پرستی وغیرہ۔ ان تأثرات و احساسات کو رسکن کی طبقہ بندی کے تحت لانا محال ہے اسی طرح ادبی ہیئت کے جو جذباتی و ذہنی اثرات ہوتے ہیں انہیں بھی اس طبقہ بندی کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا جیسے احساس نغمگی یا آہنگ و قافیے کا تأثر وغیرہ۔

ادبی اثرات کو بعضوں نے صرف یہ کہہ کر محدود و معین کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب، خصوصاً شاعری، احساس حسن کو اپیل کرتی ہے۔ یہ لوگ حسن کے لفظ کو اس قدر وسیع مفہوم میں استعمال کرتے ہیں کہ اس کے ذیل میں تمام ادبی احساسات، جذبات و تأثرات کو گھسیٹ لاتے ہیں۔ چنانچہ وہ منظر کو بھی حسین قرار دیتے ہیں، عورت کو بھی، نغمے کو بھی اور نظم کو بھی، خیال کو بھی اور عمل کو بھی۔ غرض ان لوگوں کے نزدیک حسن کا مفہوم ہے لذت و مسرت جس نے معروضی شکل اختیار کر لی ہو۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ان کے نزدیک لذت و مُسرّت جب وہ کسی شے کی صفت کے طور پر منسوب کی جائے تو حسن ہے۔ حسن کی اس وسیع تعریف میں یقیناً بے شمار ادبی جذبات شامل ہو جائیں گے۔ لیکن ساتھ ہی غیر ادبی جذبات بھی شامل ہو جائیں گے۔ مثلاً اس تعریف کے لحاظ سے ایک صحت مند شخص کو بھوک کے وقت جو غذا ملے گی وہ بھی حسین کہلائے گی۔ ظاہر ہے کہ ہم غذاؤں کو اس طرح حسین نہیں قرار دے سکتے۔ عام استعمال کی رو سے ہم فطری طور پر حسن اور حسین کے الفاظ کو ذرا محدود مفہوم میں برتتے ہیں نہ کہ اتنے وسیع معنوں میں۔ حسن کا مفہوم ہمارے ذہنوں میں جو کچھ ہے وہ ایک ایسی چیز ہے جو ان تمام احساسات و جذبات و تأثرات کا احاطہ نہیں کر سکتی جنہیں ادب اپیل کرتا ہے۔ حسن کا تعلق خصوصیت کے ساتھ بصارت سے ہے اور کسی حد تک سماعت سے۔ میں جب یہ سطور لکھ رہا ہوں تو ایک کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا ہوں جہاں سے دُور تک وسیع منظر دکھائی دے سکتا ہے۔ درمیانی فاصلے پر ایک درخت ہے جس پر میری نظر کاغذ سے اُٹھتے ہی فوراً پڑ جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کے سبز پتے زرد اور سنہرے ہوتے جا رہے ہیں کہ خزاں کی آمد آمد ہے ان پتوں

کا رنگ فرحت بخش ہے اور انہیں دیکھ کر مجھے مسرّت ہوتی ہے۔ پتوں میں مختلف رنگوں کا امتزاج اور کہیں ان کا گھنا ہونا کہیں خالی خالی ہونا بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اس کے علاوہ خود درخت کی شکل بھی فرحت بخش ہے اور میں اسے متناسب و متشاکل قرار دے سکتا ہوں۔ رنگوں اور شکل کی دلکشی میں درخت کی ہلکی ہلکی جنبش جو ہوا کے چلنے سے پیدا ہو رہی ہے۔ یہ بھی مجھے بھلی لگ رہی ہے۔ غرض میں اس درخت کو ایک حسین چیز قرار دے دیتا ہوں۔ اس کا رنگ اور اس کی شکل مل کر میرے دل میں ایک خاص جذبہ پیدا کر رہے ہیں جو نہایت سادہ اور اساسی محسوس ہوتا ہے۔ خواہ وہ کوئی سے طریق عمل ہوں جن کی وجہ سے یہ ادراک ممکن ہوا ہے اور خواہ اس کے عضویاتی تصرفات کی کوئی سی توجیہہ کی جائے، مجھے اس توجیہہ یا تجزیے کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس موقع پر مجھے حسن کا تاثر اپنے سادہ ترین اور مفصل ترین شکل میں محسوس ہو رہا ہے۔ اس کا کوئی تعلق کسی قسم کی اخلاقی صفت سے نہیں ہے اور نہ ہی انسانی عمل یا کردار سے۔ لیکن اب میں اپنی نظر کو درخت سے ہٹا کر سارے وسیع منظر پہ ڈالتا ہوں جو دور تک پھیلا ہوا ہے۔ مجھے تفصیلات کی گونا گونی نظر آتی ہے۔ تاہم میں ان کا ایک کل کی حیثیت سے ادراک کر سکتا ہوں۔ وہ لمبی اور اونچی افقی لائن جو میرے سامنے ایک پہاڑ کی نیم کروی جسمیت کے اوپر نظر آ رہی ہے۔ وہ مشرقی پہاڑوں کے گہرے رنگ کی ڈھلوانیں جن کے دامن میں ایک دریا بہہ رہا ہے۔ دریا کا وسیع پھیلاؤ جو ایک خاموش جھیل کی طرح پڑا ہوا ہے اور آسمان سے زیادہ نیلا نظر آ رہا ہے۔ کھیت ہی کھیت جن کے بیچ میں کہیں کہیں کوئی جھونپڑا بھی ہے اور نیچے کی طرف نظروں کے سامنے قصبے کے مکانات کی چھتیں جو درختوں کے جھڑتے ہوئے پتوں کے بیچ میں سے نظر آ رہی ہیں۔ جب میں اس سارے منظر پہ نظر دوڑاتا ہوں تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہوں "واہ کتنا حسین منظر ہے"۔ لیکن اب جو جذبہ یا تاثر مجھ سے یہ الفاظ کہلوا رہا ہے اگر میں اس کا مقابلہ صرف درخت کے دیکھنے کے تاثر سے کرتا ہوں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ نہ صرف عمیق تر ہے بلکہ زیادہ پیچ در پیچ بھی ہے۔ رنگ اور شکل اور جنبش کی دلکشی اس میں موجود ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ میری قوت تخیّل نے بھی اس میں عمل دخل حاصل کر لیا ہے اور تخیّل کا مقصد ہے مسرّت انگیز ذہنی تحریکات کو افزوں کرنا۔ اس وسیع و عریض منظر کو دیکھ کر ذہن میں دوسرے تجربات و مشاہدات بھی مبہم طور پر مجھے یاد آتے ہیں۔ یہ سامنے کا پہاڑ مجھے ایک اور پہاڑ کی یاد دلاتا ہے جسے میں نے کشمیر میں دیکھا تھا اور پہاڑوں کے بارے میں جن شاعروں اور ادیبوں کے تاثرات میں نے پڑھے ہیں وہ بھی مبہم طور پہ ذہن میں بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کئی غیر واضح مگر فرحت بخش یادیں اُبھر آتی ہیں۔ ان سب باتوں پر مُستزاد یہ کہ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس منظر میں ایک قسم کی اخلاقی تحریکِ ذہنی یا خیال افروزی بھی ہے۔ امن و سکون، پر قرار استحکام، اور سکون بخش طاقت کا اشارہ سا ہے، دریا میں امن و سکون کا مفہوم رکھتا معلوم ہوتا ہے، دور مکانات اور ان کی چھتوں سے نکلتا ہوا دھواں گھریلو زندگی اور محبت اور امن چین کا خیال پیدا کرتا ہے، پہاڑ ایک قسم کی رفعت و طاقت کا تاثر دیتے ہیں۔ غرض بے شمار ذہنی تحریکات اور نیم ساختہ یادیں میرے جذبہ و تاثر میں مل گئی ہیں تاہم اب سب کے مجموعی اثر کو میں لفظِ حسین ہی سے ادا کرتا ہوں۔

اس مثال سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ حسن کا تاثر فطری طور پر ایسے احساس پر منطبق کیا جاتا ہے جو اپنی سادہ ترین اور ابتدائی شکل میں بصارت اور سماعت کی دلپذیر چیزوں سے تحریک پاتا ہے لیکن اس کی بلند تر صورتوں میں یہ سادہ احساس کئی اور مسرّت انگیز

احساسات سے مخلوط ہو جاتا ہے جو کسی دلپذیر شے سے تحریک پاتے ہیں یا اس سے مربوط ہوتے ہیں۔ خارجی اشیاء کی یہ محرکِ خیال یا جذبہ انگیز طاقت اس حقیقت پر منحصر ہے کہ مادی اور ذہنی و روحانی چیزوں سے بے شمار مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً امن چین نہ صرف ایک ذہنی حالت ہے بلکہ جسمانی بھی ہے اور جو کوئی چیز بدیہی طور پر استوار اور غیر متغیر ہے وہ سکون و قرار اور روحانی امن کا نہ صرف اشارہ دے سکتی ہے بلکہ اس کی تحریک بھی کر سکتی ہے۔ مثلاً پہاڑ یہی تاثر دے سکتا ہے۔ ایک گہرے اور آہستہ آہستہ بہتے ہوئے دریا کو دیکھ کر جو جذبہ یا تاثر ہم پر طاری ہوتا ہے اور ایک پر سکون، مبنی بر راستی زندگی پر دھیان دینے سے جو جذبہ یا تاثر پیدا ہوتا ہے یہ دونوں بالکل ایک جیسے تو نہیں لیکن ایک دوسرے کے مماثل ضرور ہیں اور ایک جذبہ دوسرے کا اشارہ دیتا ہے۔ ہم جس طرح دریا کو حسین قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اس کے مماثل زندگی کو بھی حسین قرار دینے لگتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ احساسِ حسن کی ابتدائی اور سادہ ترین شکل طبیعی اشیا سے براہِ راست تحریک پا کر حاصل ہوتی ہے تاہم ہم لفظ حسین ایسی بہت سی چیزوں کے لیے استعمال کر لیتے ہیں جو ہم میں طبیعی حسن والی چیزوں سے پیدا شدہ تاثر کے مماثل تاثرات و جذبات پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح تمام مادی چیزوں کے حسن کا احساس ان کی اخلاقی مشابہتوں کی خیال افروزی کی طاقت کے سبب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ پہاڑ ہمیں اس وقت اور بھی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ جب وہ ہمیں امن چین اور استحکام کی یاد دلاتا ہے۔ دریا اور بھی حسین دکھائی دیتا ہے۔ جب ہم اسے امن و سکون کے مفہوم کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ رسکن کے نظریے کے مطابق تو حسن کے اثر کی توجیہہ ہی یوں ہوتی ہے کہ حسن ایک قسم کی اشارتی زبان ہے جس کے ذریعے روحانی صفات محسوس اشکال میں ظاہر کی جاتی ہیں لیکن اس نظریے پر یہ نئی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ سادہ اور اساسی احساس کی توجیہہ مرکب اور فرعی انداز سے کرتا ہے تاہم یہ درست ہے کہ حسن کے احساس کے تمام برتر اور ترقی یافتہ اشکال بڑی حد تک ایک اخلاقی عناصر سے عبارت ہوتے ہیں۔

قطعیت و صحت کے ساتھ ان چیزوں کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش ترک کر کے جنہیں ہم حسین قرار دیتے ہیں یا ان جذبات کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش چھوڑ کر جو ہم میں بیدار ہوتے ہیں۔ ہم وثوق کے ساتھ اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ ادب جن بے شمار جذبات و احساسات کو استعمال کرتا ہے۔ انہیں احساسِ حسن کی شکلوں میں تحلیل کرنا محال ہے سوائے اس کے کہ ہم لفظ حسن کو من مانے طور پر ایسے وسیع مفہوم میں استعمال کریں کہ عام استعمال اس کی اجازت نہیں دیتا۔

شاید ادبی جذبات کا ایک عمیق تر اور وسیع تر اگرچہ غیر متعین وصف یا خاصہ اس بیان میں مل سکتا ہے کہ یہ سب زندگی سے ہماری دلچسپی کی مختلف صورتیں ہیں، زندگی جو کچھ بھی ہے ہمارے علم کے مطابق وہ ہماری ان طاقتوں اور صلاحیتوں کا خلاصہ ہے جنہیں ہم بروئے عمل دیکھتے ہیں۔ جب یہ طاقتیں اور صلاحیتیں کسی کمزوری یا مزاحمت کے بغیر عمل کرتی ہیں تو ہم اسے لذت یا مسرت قرار دیتے ہیں وہ صلاحیتیں جتنا زیادہ عمل کرتی ہیں اور جتنی سہولت سے عمل کرتی ہیں۔ ہم اتنی ہی زیادہ زندگی کے حامل ہوتے ہیں اور جتنی زیادہ زندگی ہو گی اتنی زیادہ لذت و مسرت۔ جو کچھ بھی ہمارے احساسِ زندگی کو بڑھاتا ہے، ہمیں لذت و مسرت دیتا ہے اور جو کچھ بھی اسے کم کرتا ہے یا اسے خطرے میں ڈالتا ہے ہمیں تکلیف دیتا ہے۔ اب یہ ممکن ہے کہ ادبی یا حسن کارانہ احساس کے مختلف منبعے یا تقریبیں اس بات میں ایک اساسی سبب اشتراک پا لیں کہ یہ سب کسی قسم کی ہمدردی کے ذریعے اس احساسِ زندگی کو اکسانے اور بڑھانے

کی طاقت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر طاقت کے بیے ہمارا جذبۂ توصیف ایک قسم کا ایسا احساس ہے کہ ہم بھی ایک ہمدردانہ یا کم از کم تخیلی حصہ اس طاقت میں بڑھاتے ہیں جس کی ہم توصیف کرتے ہیں۔ اسی لیے کسی بھی قسم کی طاقت ہو ہمیشہ توصیف کا موجب ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ ہماری سلامتی کو محدود کرے یا ڈرے کہ ایسی صورت میں ہمارا جذبۂ توصیف جذبۂ خوف میں بدل جاتا ہے۔ اسی طرح حسن کا احساس ہمیشہ یہ دلالت کرتا نظر آتا ہے کہ اس سے شعوری زندگی کا ایک نیا اور ہیجان خیز احساس، ایک حیاتی احساس مسرت پیدا ہوتا ہے۔ محبت اور خوشی کی سب شکلیں اس سے بھی زیادہ ظاہر طور پر ایسے جذبات و احساسات ہیں جو ہماری سرگرمیوں کو تر و تازہ کرتی اور ہمارے احساس زندگی کو وسیع کرتی ہیں۔ ہمارے عمیق ترین اخلاقی جذبات بھی (جیسے جذباتِ انصاف و احترام اور مذہبی تمنائیں وغیرہ) ہمیں اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ طبیعی روابط سے برتر ایک اور زندگی ہے جو تمام اعمال پر قانون عائد کرتی ہے۔ لیکن خود اس کی تحدید کرنا یا اس کو پابند کرنا مشکل ہے'' اور وہ مبہم، ناقابلِ تعین جذبات جو اکثر اوقات بہت شدید ہوتے ہیں جیسے موسیقی سننے پر یا کسی خاص لمحے میں ایک سہانی منظر دیکھنے پر یا مردوں عورتوں کو ایک بڑے ہجوم کی شکل میں دیکھنے پر یا کسی ایسے موقعے پر پیدا ہوتے ہیں جبکہ انسانیت اور بنی نوعِ انسان کا تصور بڑی قوت کے ساتھ ہم پر طاری ہوتا ہے۔ ایسے احساسات مبہم، نیم واضح، غیر مشخص آرزوؤں سے عبارت ہوتے ہیں جن کا مدعا کسی برتر، خالص تر، بہتر یا تر، چیز پر مرتکز ہوتا ہے۔ ایسے احساسات اپنے ساتھ ایک ہلکا سا حزن بھی شامل رکھتے ہیں لیکن تکلیف دہ نہیں ہوتے۔ یہ احساسات و جذبات ہمارے اندر دل میں ایک ناآسودہ غیر مطمئن روحانی زندگی کی عمیق ہلچل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لمحات میں ہم بہت ہیجان خیز طور پر اپنی زندگی کی شدت اور اصلیت کا اور اپنی تمناؤں اور اشتیاقات کے پُرجوش ہونے کا احساس کرتے ہیں۔

لیکن حسن کارانہ احساس کی ماہیت کی بحث سے قطع نظر کر کے جو دراصل علم جمالیات سے تعلق رکھتی ہے' آئیے تنقید کے زیادہ عملی مسئلے پر متوجہ ہوں کہ ہم کس طرح ادب کے اہم ترین عنصر یعنی ''جذبات'' کی پیمائش اور تخمین کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا تفصیل سے جواب دینے سے قبل ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ بہت سے لوگوں میں ایک خاص قسم کا جذبہ بیدار کر دینے کی عارضی طاقت کسی تحریر کی ادبی قدر و قیمت کا یقینی ثبوت نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر اپنے دور میں قبولیتِ عام حاصل کر لینا کسی تحریر کی دائمی قدر و قیمت کی یقینی علامت نہیں ہے۔ بعض اوقات تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے کیونکہ ایسی مقبولیت عام طور پر حسب ذیل اسباب پر مبنی ہوتی ہے اور یہ اسباب اعلیٰ ترین ادبی صفت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ایک سبب تو جدت ہو سکتا ہے خواہ مواد میں یا طریقِ اظہار میں۔ کوئی نئی چیز یا انوکھی اور نادر وجۂ تحریک یا غیر طبعی نفسیات یا تا حال نادریافت شدہ تجربہ یا اظہار کی ندرت یا ایسی ہی کوئی اور بات کسی کتاب کو کچھ عرصے کے لیے شہرت و اشاعت دے سکتی ہے اور مقبول ہو سکتی ہے لیکن وہ ادب پارہ جو سوائے پڑھنے والوں کے تجسس یا شوقِ دریافت کو جنبش دینے کے اور کوئی چیز اپنے اندر نہیں رکھتا۔ دائمی طور پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ دس بیس سال تک ایک نسل کے افراد کے لیے مقبول رہ سکتا ہے۔ دوسرا سبب کسی تحریر کے مقبولیت حاصل کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی معاصر تحریک کی نمائندگی کرتی ہے خواہ وہ تحریک اقتصادی ہو کہ سیاسی کہ مذہبی۔ ایسی کتاب ایک قسم کی باقاعدہ جدوجہد کی دستاویز ہوتی ہے۔ ناولوں کو اس قسم کی باقاعدہ جدوجہد میں بآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک مؤثر ناول سے زیادہ

کار گر استدلال کسی تحریک کی تائید میں اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس میں متعلقہ سوال کو بھرپور انداز میں اٹھانے کے لیے بہترین مواقع اور سہولتیں میسر ہیں۔ ناول نگار اپنے نظریے کے مطابق معروف اور ازلی حقائق کو مروڑ سکتا ہے۔ حسبِ دلخواہ کردار اور واقعات اختراع کر سکتا ہے اور ہنرمندی کے ساتھ نہایت ہی مایوس کن عقیدے کو بھی بظاہر خوشنما و اتفاقی لباس پہنا سکتا ہے جو لوگ اس تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں اس کی باوضاحت نقشہ کشی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صداقت کو افسانوی لباس میں پیش کرنا اسی کا نام ہے۔ جو لوگ اس تحریک کے مخالف ہوتے ہیں وہ اگرچہ ایسے ناول سے برافروختہ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی یہ دیکھ کر اس میں دلچسپی لیتے ہیں کہ جھوٹ کی حمایت میں بظاہر خوشنما واقعات کو کس طرح اختراع کیا گیا ہے اور کہتے ہیں کہ افسانے کو صداقت کے لباس میں پیش کرنا اسی کا نام ہے۔ اور جو لوگ اس تحریک سے نہ ہمدردی رکھتے ہیں نہ اس کے مخالف ہیں وہ بھی اسے قصے کی خاطر پڑھتے ہیں۔ اس طرح ناول مقبول ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات کوئی کتاب اپنی اصلاحی نوعیت کی وجہ سے مقبول ہو جاتی ہے اور اپنی ادبی خوبی کے مقابلے میں کہیں زیادہ مقبول ہو جاتی ہے کیونکہ جس سماجی یا اخلاقی یا مذہبی یا سیاسی اصلاح کی طرف وہ متوجہ کرتی ہے اس کی ضرورت عام طور پر لوگ محسوس کرتے ہیں اس لیے اس کتاب کو پسند کرنے لگتے ہیں، لیکن اگر مجوزہ اصلاح روبہ عمل آ جائے تو پھر ایسی کتاب کی حیثیت صرف تاریخی یا باستانی رہ جاتی ہے۔ بالفرض تحریکِ اصلاح ناکام ہو جائے تو واقعات کی منطق ہی اس کتاب کو بے سود بنا دیتی اور وہ جلد ہی فراموش کر دی جاتی ہے۔

لیکن مقبولیت حاصل کرنے کا آسان ترین نسخہ ہے دلکش معمولی پن۔ عوام کی بڑی اکثریت بڑی کتابوں کی عظمت کو تسلیم تو کرتی ہے لیکن عام طور پر انہیں پڑھتی نہیں کیونکہ بڑی کتابیں ہلکی پھلکی تفریحی چیز نہیں ہوتیں۔ درآنحالیکہ فوری اور وسیع مقبولیت حاصل کرنے والی کتاب تقریباً ہمیشہ ہلکی پھلکی تفریحی چیز ہوتی ہے۔ عوام اسی لیے ایسی تحریروں کے دلدادہ ہوتے ہیں کہ ان کے پڑھنے میں ذہن و فکر پر ذرہ برابر بار نہیں پڑتا اور وہ سو فیصد توجہ کی متقاضی نہیں ہوتے۔ بڑی کتاب اگرچہ مشکل نہ ہو ہمارے جذبات و احساسات اور ذہن و فکر کو اس طرح اکساتی ہے کہ ہماری قوتیں اور صلاحیتیں اس کتاب پر شوق و خواہش اور لذت و مسرت کے ساتھ متوجہ ہو جاتی ہیں، جس سرگرمی سے ہم اسے پڑھتے ہیں وہ اس کو اور تحریک دیتی ہے لیکن وہ ہلکی پھلکی تفریحی تحریر ہرگز نہیں ہوتی۔ ہم اسے نیم توجہ سے نہیں پڑھ سکتے بلکہ وہ ساری توجہ چاہتی ہے۔ ساری قوتوں اور صلاحیتوں کی متقاضی ہوتی ہے۔ اسی لیے سینکڑوں آدمی اسے مشکل بھی قرار دیتے ہیں، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں بیشمار گھٹیا ناول، افسانے اور رسالے وغیرہ شائع ہوئے ہیں جنہوں نے اگرچہ قارئین کا حلقہ وسیع کر دیا ہے لیکن پڑھنے والوں کی ذہنی ساخت کو ڈھیلا کر دیا ہے اور انہیں سنجیدہ ادب کی طرف غیر مائل کر دیا ہے۔ لیکن یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ ایسی تحریریں جو صرف نیم گرم جذبات کو جنبش دیتی ہیں اور قاری کے ذہن و فکر کو نہیں اکساتیں، زندہ نہیں رہ سکتیں وہ دوسری ایسی تحریروں کے سیلاب میں بہ جاتی ہیں اور جلد ہی فراموش کر دی جاتی ہیں۔

اس ناپائیدار اور سطحی اثر کو جو کسی کتاب کا پڑھنے والوں پر ہوتا ہے اور جسے مقبولیت کہا جاتا ہے نظر انداز کر کے آئیے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ادب کے جذباتی اثرات کی دائمی قدر و قیمت کی جانچ اور پیمائش کن معیاروں سے ہو سکتی ہے۔ ایسے معیار پانچ ہو سکتے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ جذبات کی دیانت یا مناسبت و معقولیت
۲۔ جذبات کی گہرائی یا زور قوت
۳۔ جذبات کا تسلسل یا پختگی و استقلال
۴۔ جذبات کی وسعت یا تنوع
۵۔ جذبات کا رتبہ یا کیفیت و نوعیت

آیئے ان نکات پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں۔

کسی جذبے کو دیانت دارانہ یا مناسب و معقول قرار دینے سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کے لیے مناسب سبب موجود ہو۔ ایک اعلیٰ درجے کا جذبہ محض اس بناء پر کہ اس کے لیے کافی سبب موجود نہیں ہے اپنی ادبی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔ اس طرح بقول رسکن یہ ممکن ہے کہ آتشبازی کا ایک زبردست مظاہرہ یا سڑک پر دو رویہ عظیم الشان دکانوں کی قطار کسی شخص میں پر جوش توصیف کا جذبہ بیدار کرے لیکن یہ جذبہ یا تاثر ادبی نہیں ہے کیونکہ اس کا سبب گھٹیا اور غیر وقیع ہے۔ حقیقت میں آتشبازی کے مظاہرے یا دوکانوں کی شوکت و سجاوٹ ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ توصیف کی مستحق ہوں۔ البتہ کسی کلی کا کھل کر پھول بن جانا جو جذبۂ توصیف بیدار کرتا ہے وہ شاعرانہ تاثر ہے اور روحانی قوت و تاثیر اور حیاتی حسن کے اس مظاہرے کی جس قدر بھی توصیف کی جائے ناکافی ہے۔ لہٰذا کسی کتاب کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت یہ سوال ہمیشہ جائز ہوگا کہ آیا جو جذبہ یا تاثر یہ کتاب بیدار کرتی ہے وہ صحت مند ہے؟ آیا اس کے لیے مناسب و کافی اسباب ہیں جو خود کتاب ہی میں فی نفسہٖ موجود ہیں؟ یہ عین ممکن ہے کوئی کتاب ایسے اسباب کی بناء پر جو حقیقی اور دائمی نہیں وقتی طور پر شدید جذبات و تاثرات کو انگیخت کر دے خصوصاً اگر اس میں معاصرانہ مقبول عام احساس سے فائدہ اٹھایا گیا ہو۔

ادب میں سستی جذباتیت کی تمام تشکیل کافی اسباب کے بغیر مہر و شفقت یا سوز و گداز کے جذبات کو انگیخت کرنے کی کوششوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ یہ تاثرات و احساسات لذت بخش یا مسرت انگیز ہوتے ہیں اور جب وہ بغیر کسی قسم کی محنت و وقت کے صرف کئے حاصل ہو جاتی ہیں جیسے کہ ادب میں، تو فطری طور پر اس بات کی ترغیب ہوتی ہے کہ معمولی سے جواز پر انہیں دل کھول کر بے اعتدالی کی حد تک برتا جائے۔ سستی جذباتیت میں ڈوبے ہوئے مصنف کی مقبولیت کا راز یہی ہے۔ لیکن ہماری معقول تر قوت فیصلہ یہ پہچان لیتی ہے کہ جو احساسات و تاثرات اس آسانی کے ساتھ بیدار کیے جا سکتے ہیں یا خود اپنی خاطر شعوری طور دل کھول کر برتے جاتے ہیں اپنے اندر ایک کھوکھلا پن رکھتے ہیں۔ ہم اپنے عمیق تر اور صادق تر احساسات کو محض اپنے آپ کو گدگدانے کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ جذباتیت پرست مصنف اپنے تاثرات بڑے مبالغے کے ساتھ پیش کرتا ہے اور خارجی مظاہر کے تمام اتفاقات و حوادث کو بروئے کار لاکر ہماری ہمدردی کا شکار کھیلتا ہے۔ لیکن سچا آرٹسٹ اپنے تاثرات و احساسات کو اس قدر ارزاں نہیں کر دیتا اور جو جذبہ یا تاثر وہ ہم میں انگیخت کرتا ہے وہ انسانی زندگی کی عمیق صداقتوں پر مبنی ہوتا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جذبہ و تاثر کی تقریب تو معمولی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا سبب خفیف نہیں ہونا چاہیے۔ عام طور پر یہ تخیلی قوت کا ثبوت ہے کہ مصنف کسی کردار یا شدید جذبے کو اس طرح جامع طور پر سمجھے کہ یہ بھی دیکھ سکے کہ وہ حقیر اور غیر وقیع اعمال و افعال

میں اپنے آپ کو کس طرح ظاہر کر سکتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ہماری ہمدردیوں کو مصنف کی اپیل اور موثر ہو جاتی ہے کیونکہ یہ غیر ارادی معلوم ہوتی ہے۔

گویا ہم ایک عالمگیر قانون کے طور پر یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰ اور دائمی ادبی قدر و قیمت کا حامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جذبات عمیق اور شایانِ شان اسباب سے ابھریں اور یہ کہ جب اس قانون کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو جو جذبہ آرٹ یا ادب کی کسی تخلیق سے تحریک پاتا ہے وہ مریضانہ یا خطیبانہ یا ہیجانی و نمائشی ہو جاتا ہے یا کسی اور طریقے سے باطل ہو جاتا ہے۔

یہ بات تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ جذبات کی ادبی قدر و قیمت ان کی گہرائی یا زور و قوت سے بھی ناپی جاتی ہے یہ ادب کا سب سے فطری اور سب سے زیادہ ناقابلِ تردید معیار ہے۔ کسی کتاب کے بارے میں یہ سوالات بالکل قدرتی ہیں کہ آیا وہ آپ کو متاثر کرتی ہے، آیا وہ آپ کے جذبات کو اکساتی، ابھارتی، ہیجان بخشتی اور وسیع کرتی ہے، آیا وہ آپ کو ایک نیا وژن دیکھنے کی آنکھ اور ایک نئے احساس والا دل عطا کرتی ہے یا نہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ملے تو وہ کتاب بلاشبہ اچھی ادبی کتاب ہے اور جس قدر شدت سے وہ یہ منصب ادا کرتی ہے اتنی ہی بڑی ادبی کتاب قرار پاتی ہے۔ مشہور امریکی مصنف ایمرسن کہتا ہے کہ کتابوں کا کام ہی تخلیقی تحریک پیدا کرنا ہے۔ بظاہر خیال ہے کہ گہرائی اور زور و قوت کا تعلق فاعلی جذبات سے بہ نسبت انفعالی جذبات کے زیادہ ہے اور شدید جذبات پر ان خصوصیات کا زیادہ اطلاق ہو سکتا ہے۔ بہ نسبت احساسات کی نرم و ملائم کیفیات کے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ موخر الذکر جذبات و کیفیات بھی اتنے ہی زور و قوت والے ہو سکتے ہیں جتنے کہ اول الذکر۔ اقبال کی نظم گورستانِ شاہی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ امر تسلیم کیا جانا چاہیے کہ جذبات کی مختلف قسموں کے لیے کوئی قطعی مشترک پیمانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس سوز و گداز کا جو نرم و ملائم اور واجب الرحم ہے اس سوز و گداز سے مقابلہ کیونکر ممکن ہے جو کڑا اور اپنے آپ کو لیے دیئے رہنے والا ہے۔ اور یہ کہنا کیونکر ممکن ہے کہ ایک دوسرے سے زیادہ زور و قوت والا ہے۔ اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ سوز و گداز یا رفعت و جلال یا ابطیلے حسن کے تاثرات و جذبات میں کوئی مشترک قانون دریافت کیا جائے اور پھر جذبات کی وہ صورتیں ہیں جو فکر و خوض سے وجود میں آتی ہیں جو عمیق اور وسیع صداقتوں کے ادراک سے پیدا ہوتی ہیں اور بادی النظر میں یوں لگتی ہیں کہ نرم و ملائم اور فکر سے پرورش یافتہ ہونے کی وجہ سے کم اثر و زور کی مالک ہوں گی لیکن وہ کم ہیجان خیز ہوں تو ہوں بہت خاص ہوتی ہیں۔ مثال کے لیے اقبال کی نظم بچہ اور شمع ملاحظہ کیجیے۔ نیز انفرادی مزاج پر بھی بہت کچھ منحصر ہے۔ ایک شخص فطری طور پر ایک خاص قسم کے جذبے سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور دوسرا شخص دوسرے جذبے سے۔ گویا یہ بات بلا تکلف تسلیم کی جا سکتی ہے کہ جذباتی اثرات کی طاقت کا کوئی پیمانہ یا تخمینہ تقابلی فضیلت کے لیے دقیق معیار کا کام نہیں دے سکتا۔ تاہم یہ درست ہے کہ خواہ کسی قسم کا جذبہ ہو اور خواہ اس کا سبب کچھ ہی ہو مثلاً فطرت کا کوئی نظارہ یا کوئی انسانی عمل یا کوئی صداقت، ہر صورت میں جذبے کی شدت یا زور و قوت کی بات کرنا قرینِ عقل معلوم ہوتا ہے اور تحریر کی قدر و قیمت یقیناً بڑی حد تک اسی سے ناپی جاتی ہے۔

اس کی یہ شدت اکثر صورتوں میں مصنف کی فطرت پر اولین انحصار رکھتی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ خود پہلے دل کی گہرائی

تک محسوس کرے ورنہ وہ ہمیں بھی محسوس نہیں کرا سکتا۔ اس لیے ہر بڑے مصنف کے لیے مزاج کا کس بل اور جذبات کی گہرائی، لطافت، دولت مندی اور ضخامت ضروری ہے۔ بعض اوقات ایک شخص جو بہت اچھی طرح محاسن و صفات سے مزین ہے ادبیات میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے سے اسی لیے محروم رہ جاتا ہے کہ وہ اس اندرونی کس بل کا حامل نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایسے مصنف بھی ہوتے ہیں جن کا اثر تقریباً تمام تر ان کی فطرت کی پُرجوش تندی و شدت سے ماخوذ ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں آخرالذکر کی مثال کے طور پر بائرن کو پیش کیا جا سکتا ہے اور اوّل الذکر کے لیے کو پلا راڈلین کو۔

لیکن ہمیں یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو جذبہ بہت اظہار پسند اور سرکش و پُرشور ہے وہی توانا ترین اور پختہ ترین ہے۔ حق یہ ہے کہ سرکشی، برہمی اور ہنگامہ اکثر وہیں ملتا ہے۔ جہاں ضبطِ نفس کی کمی ہو یا کسی صلاحیت کا اپنے اصلی راستے سے انحراف ہو۔ جو جذبہ حقیقت میں بہت گہرا ہوتا ہے وہ بالعموم خاموش اور بے شور ہوتا ہے۔ جو نکتہ اس وقت زیرِ بحث ہے اس کے لحاظ سے مثالی شاعر یا مصنف کی فطرت بھرپور، پُرجوش، شدید لیکن مستحکم و میانہ رَو ہوتی ہے، اس کی فطرت میں توانا و قوی جذبہ اس کے عزمِ محکم کے تابع ہوتا ہے۔ اس کی مثال کے طور پر شیکسپیئر کا نام لیا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ ہمارے جذبات ہلچل پیدا کرنے کی طاقت ایک حد تک مصنف کے ملکۂ اظہار پر منحصر ہوتی ہے۔ ہیئت کے مسئلے سے کسی اور فرصت میں ہم تفصیلی بحث علیحدہ کریں گے۔ البتہ یہاں اتنا کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کسی شخص کے ذہن میں صاف و واضح ہو وہ اس کا صفائی و وضاحت کے ساتھ تو ضرور اظہار کر سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کا اظہار زور و قوت کے ساتھ بھی کرے۔ بالفاظِ دیگر یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے خیال کو ظاہر کر دے لیکن وہ خیال اس کے دل و دماغ میں جو تاثرات پیدا کرتا ہے انہیں ظاہر نہ کر سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے کئی لوگ موجود ہیں جن کی فطرت میں قوی احساس تو ہے لیکن مناسب ملکۂ اظہار انہیں حاصل نہیں۔ ایسے کئی شاعر اور مصنف ہیں جن کا ملکۂ اظہار ان کے شعری و ادبی جذبے کی ضخامت نہیں ہے۔ انگریزی کے شاعر براؤننگ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

جذبے کی گہرائی یا زور و قوت نہ صرف شعری ادب کے لیے فضیلت کا ایک معیار ہے بلکہ نثری ادب کے لیے بھی۔ نثر کی ایسی قسمیں ایسی ہیں جن میں جذبے کا عنصر تحریر کا اوّلین مقصد نہیں ہوتا اس لیے ذہن و فکر کے عنصر کے مقابلے میں کم اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم جہاں کہیں بھی ہم نثری تحریروں میں زور و قوت، توانائی، جوش و بشاشت اور آب و تاب کی صفات بتاتے ہیں وہ اصل میں مختلف جذبات مرتعش کرنے کی ہی ضمنی طاقت ہے۔ سوائے خالص سائنسی اور علمی تحریروں کے جنہیں ہم کسی طرح ادب میں شمار نہیں کر سکتے ہر تحریر میں جذبات کو متاثر کرنے کی طاقت کم یا زیادہ ضرور ہونی چاہیے۔ یہی مہارت یا استادی ہے جو بڑے بڑے نثر نگاروں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اگرچہ ان کے اثر و تاثیر کے ذرائع ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ شبلی اور محمد حسین آزاد کی مثالیں دیکھیے دونوں کا درجہ بحیثیت نثار کے بہت اونچا ہے لیکن دونوں کے ذرائع و وسائلِ اثر آفرینی مختلف ہیں۔ ہم اس تاریخی کتاب کو درخشاں و تاباں یا پُر اثر و کارگر قرار دیا کرتے ہیں جس میں افراد اور واقعات ہماری ہمدردیوں کو اسی طرح متاثر کرتے ہیں جیسے اگر ہم انہیں درحقیقت اپنے زمانے میں دیکھتے تو متاثر ہوتے۔ ایک تابناک تاریخی کتاب ہم پر وہی تاثر طاری کرتی ہے جو کوئی اچھا

ڈرامائی ہو سکتا ہے لیکن تاریخی تحریروں کی بنیادی خوبی ان کی تابانی یا تاثر آفرینی نہیں بلکہ واقعات کی صحت و صداقت اور رائے کی دیانت داری ہوتی ہے اور جو جذبات انگیخت کیے جائیں اگر ان کے لیے صحیح اسباب موجود نہ ہوں یا وہ جانب دارانہ ہوں یا صداقت کو چھپانے والے ہوں تو جذباتی اثر کی گہرائی تاریخ کے اس اولین مقصد کے لیے رکاوٹ بن جاتی ہے اور ہم اس کتاب کو خواہ اچھی ادبی کتاب قرار دیں اچھی تاریخ قرار دینے میں تامل کرتے ہیں۔

جذبات کی ادبی قدر و قیمت کا تیسرا معیار ان کا تسلسل یا پختگی و استقلال ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کسی تحریر کا یا آرٹ کے کسی کارنامے کا جذباتی اثر ایک سطح پر قائم رہے۔ اگر ہمارا احساس کسی لمحے میں یا افتادہ گھٹیا سطح پر یا یک دم اتر آئے تو نہ صرف ہم جذباتی اثر کو کھو بیٹھتے ہیں بلکہ ہمیں ایک ناخوشگوار بے آہنگی کا بھی تجربہ ہوتا ہے اور یہ ایک اہم نقص ہے۔ بعض اوقات جذبات کو ایک سطح پر قائم رکھنے میں ناکامی کا احساس اس قدر اچانک ہوتا ہے کہ ہنسی آجاتی ہے اور تحریر مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے یہاں اس کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔

ادب یا آرٹ کی ہر تخلیق میں وحدت احساس ضروری ہے لیکن تنوع بھی لازم ہے۔ کسی جذبے کو ایک ہی سطح پر لمبے عرصے تک قائم رکھنا مشکل ہے اور اگر وہ شدید نہیں ہے تو پھر ناقابل برداشت حد تک بکھرا اور اکتا دینے والا ہو جائے گا۔ آرٹ کی ہر تخلیق میں جذبے کا مد و جزر اور روشنی و سایہ ضروری ہے تاہم موسیقی کی اصطلاحوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نغمے میں زیر و بم تو ہونا چاہیے لیکن سُر ضرور قائم رہے۔ گویا بالفاظ دیگر تحریک اپنے مخصوص جذباتی موڈ سے خارج نہ ہو جائے۔ ایسے حصے اس میں نہیں ہونے چاہئیں جن میں مصنف پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر بدقت چلتا ہوا محسوس ہو یا واقعات اور صداقتوں پر تو اس کی توجہ مرکوز ہو لیکن وہ انہیں اس طرح پیش کر رہا ہو کہ ہماری ادبی قوت مدرکہ کو اپیل نہ کریں۔

ادبی تخلیقات میں جذبے کو برقرار رکھنے کی ضرورت کے پیش نظر ہی وحدت کے ادبی و انشائی اصول وضع کیے گئے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آرٹ کی کسی تخلیق میں ایسی کوئی چیز داخل نہیں ہونی چاہیے جو اس کے مقصد اصلی سے غیر متعلق ہو اور غیر متعلق ہر وہ چیز ہے جو اس تخلیق کے جذباتی اثر کو کم کرتی یا اسے منقطع کرتی ہو یا پھر اسے کسی اور ہی موڈ میں بدل دیتی ہو۔ البتہ اصل موضوع سے ہٹی ہوئی باتیں، ضمنی بیانات یا قصے یا اور کوئی چیز جو تعمیری وحدت کے قوانین کے لحاظ سے ناپسندیدہ ہو اس وقت نظر انداز کی جا سکتی ہے جب تحریر کی دلچسپی میں کمی نہ ہو اور جو جذبات و احساسات یہ زائد حصے انگیخت کرتے ہیں وہ بقیہ حصے کے ساتھ ہم آہنگی رکھتے ہوں۔ اس کے برعکس کوئی حصہ خواہ اپنی جگہ کتنا ہی حسین اور مبنی بر صداقت ہو اگر وہ پڑھنے والوں کی جذباتی دلچسپی کو گھٹا دیتا ہے یا تصنیف کے بنیادی و اصلی احساس کے دھارے سے مطابقت نہیں رکھتا تو اسے کتاب سے نکال دینا چاہیے۔

ایک سطح پر قائم اور مسلسل جذبہ قارئین میں پیدا کرنے میں اگر ناکامی ہو تو اس کی وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ خود مصنف کے اپنے جذبات مستحکم و مستقل نہیں اور کافی حد تک شدید نہیں اور وہ اپنے موضوع کو کلی حیثیت سے نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ اس کے صرف چند نمایاں جاذب توجہ یا مؤثر و دلنشین حصوں کو دیکھ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ادھر ادھر گھٹیا سطح پر گر پڑتا ہے اور

ایک سطح پر قائم اثر کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو اصلی احساس کی کمی کی تلافی کے لئے تصنع و آورد سے کام لے کر تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح "بے جان" تحریر وجود میں آتی ہے جو اصلی جذبات سے مطابقت نہیں رکھتی یا پھر ادبی منافقت و عدم خلوص کی کوئی اور شکل وجود میں آجاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ادب کی زیادہ طویل ہیئتوں میں ایک سطح پر قائم رہنے والے جذبے کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ مختصر ہیئتوں میں جیسے داخلی و غنائی شاعری میں شدید اور پُر تاثیر جذبہ ظاہر ہوتا ہے جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ بعض لوگوں نے اسی لیے کہا ہے کہ سچی شاعری ہمیشہ داخلی و غنائی ہی ہوتی ہے کیونکہ اعلیٰ شاعری کے لیے جس درجے کے جذبے کی ضرورت ہے وہ دیر تک قائم رہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن ان تمام رایوں کی تردید بڑے شاعروں کی طویل نظموں میں موجود ہے جیسے کالی داس، ہومر، ڈانٹے، ملٹن، فردوسی وغیرہ کی شاعری میں۔ اسی طرح کئی بڑے ناول نگار موجود ہیں جنہوں نے اعلیٰ درجے کے لمبے لمبے ناول لکھے ہیں۔ یہ سب طویل ادبی تحریریں مصنفین کی اس صلاحیت کی دلیل فراہم کرتی ہیں کہ وہ جذبات کو دیر تک ایک سطح پر قائم رکھ سکتے ہیں

یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ادب کے کسی کارنامے کی قدر و قیمت خاصی حد تک اس کے جذباتی اثرات کی وسعت یا تنوع پر منحصر ہوتی ہے۔ عظیم وسعتِ تاثر نہایت کمیاب خوبی ہے۔ ادب میں بڑا مقام اس کے بغیر بھی حاصل کرنا ممکن ہے جیسے کہ میر تقی میر کی مثال سے ظاہر ہے۔ حسن شناسی و قدر فہمی کی صلاحیت میں وسعت بھی بڑی کمیاب چیز ہے۔ ہم میں سے اکثر آدمی وسیع المشرب مذاق رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ قارئین کی اکثریت ادبی فضیلتوں کے وسیع احاطے سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اکثر اوقات ان فضیلتوں کی نشاندہی کیے جانے کے باوجود ان کی حسن شناسی و قدر فہمی سے وہ قاصر رہتے ہیں۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو ناسخ اور میر دونوں ہی کے کلام سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہوں یا میر امن کی باغ و بہار اور سرور کے فسانۂ عجائب سے یکساں طور پر حظ اٹھا سکتے ہوں؟ اور اگر ایک دوسرے سے مختلف جذباتی اثرات کی حسن شناسی و قدر فہمی کی صلاحیت اس قدر شاذ ہے تو ظاہر ہے کہ ان جذباتی اثرات کے پیدا کر سکنے کی صلاحیت تو اور بھی کمیاب ہوگی۔ ادب جن جذباتی اثرات پر انحصار رکھتا ہے انہیں پیدا کرنے کی طاقت یا صلاحیت اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک کہ مصنف کی فطرت میں کس بل اور تندی و شدت نہ ہو اور نہ ہی موضوعات کے کسی وسیع دائرے میں ان صفات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ جذبات کے وسیع دائرے کے لیے مصنف کے شخصی تجربات و مشاہدات میں وسعت کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر افراد کی صلاحیتیں اور قوتیں چند مخصوص حدود ہی کے اندر اپنے انتہائی کمال پر پہنچا سکتی ہیں۔ کسی ایک سمت میں دلچسپی کی شدت کا عام طور پر مطلب ہوتا ہے۔ دوسری سمتوں میں دلچسپی کی کمی۔ سچ یہ ہے کہ شدت خواہ کسی جگہ ہو اس کا مطلب محدود ہونا ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا جائے گا کہ ایک متناسب، وسیع الادراک اور رواداری کیریکٹر اس شخصی بل یا کس بل میں خام ہوگا جو حقیقی ادبی اثر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے برعکس جن مصنفین کی شخصیت بہت زیادہ نمایاں اور محنتی و جفاکش نظر آتی ہے اور جنہوں نے اپنے زمانے کے ادب پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی حد بندیاں یا مجبوریاں بہت نمایاں ہوتی ہیں۔ مثلاً وہی میر تقی میر کی مثال لے لیجئے کہ وہ صرف غم و عشق اور غم زندگی کے جذبات و تصورات میں اپنا کمال دکھاتے ہیں، دوسرے جذبات و تصورات ان کے ہاں کم ہیں اور اگر ہیں بھی تو ان کے اظہار میں وہ خام ہیں۔

ڈراما اور ناول لکھنے والوں کو جذباتی اثرات کے وسیع احاطے پر قبضہ و اقتدار کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کا

کام غنائی شاعروں کی طرح داخلی نہیں ہوتا بلکہ یہ مصنفین لوگوں کی زندگی کا وسیع غیر جانب دارانہ نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اکثر ناول نگاروں کا میدان زیادہ وسیع نظر نہیں آتا۔ کسی بھی مقبول یا مشہور ناول نگار کا کام دیکھیے۔ معلوم ہوگا کہ وہ صرف ایک دو ہی چیزیں اچھی طرح پیش کر سکتا ہے اور ایک دو ہی قسم کے کرداروں کا ماہر ہے۔ چنانچہ اس کے ناولوں میں بار بار ایسی ہی قسم کے کردار ملتے ہیں حتیٰ کہ ایک ناول نگار سے وہ کردار ہٹا کر دوسرے ناول میں لگا دیا جائے تو کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوگا اور اگر ناول نگار مقصدی ناول لکھتا ہے۔ یعنی کوئی مسئلہ پیش کرنا چاہتا ہے یا کوئی خاص صداقت ذہن نشین کرانا چاہتا ہے تو یہ ناصحانہ رویہ ان کے اعلیٰ تاثرات کے دائرے کو اور بھی محدود کر دیتا ہے۔ یہ اعتراض نہ صرف مقصدی ناولوں پر وارد ہوتا ہے بلکہ ادب کی ہر اس صنف پر وارد ہوتا ہے جس میں ناصحانہ رجحان غالب ہو۔ ان مصنفین کا جذباتی احاطہ بالعموم وسیع ہوتا ہے جو زندگی پر غیر جانب دارانہ نظر ڈالتے ہیں۔ معروضی و غیر شخصی سدیہ رکھتے ہیں اور زندگی کو پیش کرنا یا اس کی ترجمانی کرنا اپنا مقصد بناتے ہیں۔ انگریزی ادب میں والٹر اسکاٹ اور شیکسپیر کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور اردو ادب میں سرشار یا پریم چند کو۔

جذبات کو اپیل کرنے کی طاقت کے لحاظ سے ادب کی قدر و قیمت آخر میں جذبات کے رتبے یا کیفیت و نوعیت سے متعین ہوتی ہے یہ معاملہ ایسا ہے جس پر بڑی تنقیدی بحثیں ہو چکی ہیں۔ کیونکہ یہ کہنا کہ ادبی قدریں ان جذبات کے رتبے یا کیفیت و نوعیت پر منحصر ہوتی ہیں جنھیں اپیل کی جاتی ہے یہ مفہوم رکھتا ہے کہ ان جذبات میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز موجود ہے۔ لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے جانچنے کا معیار کیا ہے؟ کن جذبات کو ہم اعلیٰ قرار دیں گے اور کنھیں ادنیٰ؟ اس مسئلے پر نقادوں میں پورا اتفاق نہیں ملتا۔ یہ تو بدیہی بات ہے کہ ہم فطری و جبلی طور پر بعض جذبات کو دوسرے جذبات کے مقابلے میں اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ادب جن جذبات و احساسات کو اپیل کرتا ہے کسی نہ کسی مفہوم میں اعلیٰ سمجھے جا سکتے ہیں۔ تاہم یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت کہ بعض جذبات اعلیٰ کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں جیسے ہمدردی بنی نوعِ انسان کا جذبۂ محبت اور خصوصاً ممتا اور ایثار و قربانی کا بے خوف حق گوئی کا جذبہ۔ اسی طرح بعض تاثرات بھی اعلیٰ کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ وہ جذبہ یا تاثر جو ادب کے خالص ہئیتی عنصر اور اس کی موسیقی و آہنگ وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ بلاشبہ ایک جائز اور قابلِ قدر جذبہ یا تاثر ہے اور شاعری کا اثر خاصی حد تک اسی تاثر کا مرہونِ منت ہوتا ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ جذبہ یا تاثر اس جذبے اور تاثر سے کم رتبے کا ہے جو نظم کے مفہوم یا نفسِ مضمون سے پیدا ہوتا ہے۔ حفیظ، عظمت اللہ خاں، حامد اللہ افسر وغیرہ کی گیت نما نظموں کی موسیقی و آہنگ قابلِ تعریف و ستائش ضرور ہے لیکن کیا یہ سب نظمیں مل کر بھی اقبال کی نظم ذوق و شوق یا ساقی نامہ یا مسجد قرطبہ سے کمتر درجے کی نہیں ہیں؟ اور کمتر خاص طور پر اسی لیے تو ہیں کہ جو جذبات و احساسات یہ گیت نما نظمیں ہم میں پیدا کرتی ہیں وہ نہ صرف کیفیت و نوعیت میں بلکہ رتبے میں بھی ان جذبات و احساسات سے کمتر ہیں جو اقبال کی کوئی نظم ہم میں پیدا کرتی ہے یہ بات اس قدر روشن ہے کہ اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں لیکن بعض اوقات ایسے نقاد بھی منظرِ عام پر آتے ہیں جو اپنی جمال پرستی کی دھن میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ موسیقی و آہنگ کو اولین اہمیت دیتے گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو صنفِ ادب موسیقی کی طرح براہِ راست جذبات کو اپیل کرنے کی طاقت رکھتی ہے وہی اعلیٰ ترین ہے۔ انگریزی نقاد والٹر پیٹر ایسا ہی نقاد ہے جو کہتا ہے کہ وہ فن جو ذہن و فکر کو چھیڑے بغیر براہِ راست جذبات کو مرتعش کرے وہی موسیقی کے

قریب ترین فن ہے اور اسی لیے برتر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسی لیے غنائی شاعری حسن کارانہ لحاظ سے نظم کی بلند ترین اور مکمل ترین قسم ہے ظاہر ہے کہ ایک فن کے معیاروں پر دوسرے فن کو جانچنے کی یہ کوشش مبالغہ آمیز اور غلط ہے۔ دنیا بھر کے ہوشمند لوگوں نے یہ امر ضروری قرار دیا ہے کہ شاعری محض آوازوں کا کھیل نہ ہو بلکہ کچھ معنی و مفہوم بھی رکھتی ہو۔ سب جانتے ہیں کہ موسیقی و آہنگ اور ہیئت کی دوسری خوبیاں اپنی اہمیت ضرور رکھتی ہیں۔ تاہم یہ ثانوی اہمیت رکھتی ہیں اور اوّلین اہمیت مواد یا نفسِ مضمون کو حاصل ہے اسی لیے جو جذبات یا تاثرات ہیئت کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں وہ ان جذبات و تاثرات سے کمتر درجے کے ہیں جو ادبی تخلیق کے مافیہ یا مشتملات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ شاعری جو محض ٹیکنیک یا موسیقانہ صفات کی وجہ سے ہمیں متاثر کرتی ہے۔ بہت بلند درجے کی شاعری نہیں ہو سکتی۔

ادب کی ایسی شکلیں بھی ہیں جو ہمارے حافظے یا تخیل میں مسرت بخش احساسات کی شبیہہ اُتار کر اپنا اثر پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح کا ادب ہمارے حواسِ خمسہ کی لذتوں کی نقشہ کشی کرتا ہے۔ لیکن حواس کی منزلوں میں بھی ایک درجہ بندی پائی جاتی ہے۔ چونکہ لامسہ اور ذائقہ کے احساسات میں دوسروں کے ساتھ شرکت نہیں کی جا سکتی اس لیے انہیں باصرہ، سامعہ اور شامہ کے مقابلے میں کم تحریک بخش یا جذبہ انگیز تسلیم کیا جاتا ہے چنانچہ وہ شعر و ادب جو لامسہ اور ذائقہ کے احساسات کو نقشہ کشی سے اپنی دلکشی حاصل کرتا ہے اعلےٰ رُتبے کا نہیں قرار پائے گا۔ اسی طرح اگر باصرہ و سامعہ کے لذائذ کی شبیہہ اُتارتے ہوئے اگر کوئی ادبی تحریر صرف ان کی حسی دلآویزی کی حد تک رُک جائے اور اس سے آگے نہ بڑھے تو ایسی تحریر بھی جو جذبات برانگیختہ کرتی ہے وہ اعلیٰ رُتبے کے نہیں ہوتے۔

اخلاقی صفات یا مادی اشیا کی اخلاقی تحریک بخشی و جذبہ انگیزی سے انگیخت پانے والے جذبات رُتبے میں ان جذبات سے بلند ہیں جو محض مادی یا محسوس اشیاء سے انگیخت پاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اخلاقی جذبہ خالص حسی یا جمالیاتی جذبے کے مقابلے میں برتر ادبی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ کسی شجاعانہ عمل یا پایۂ رفعت تحمل یا اور کسی بڑے جذبے کی توصیف کا جذبہ اپنی نوعیت اور کیفیت میں اعلیٰ و برتر جذبہ ہے اور اسی لیے ادب میں زیادہ قابلِ قدر ہے، اس کے مقابلے میں حسی دلآویزی کی توصیف کا جذبہ کمتر اور قابلِ قدر ہے خواہ کتنی ہی نزاکت و نفاست سے محسوس کیا ہُوا ہو اور کتنی ہی لطافت سے اظہار پایا ہُوا ہو۔ اخلاقی جذبے کی اصلاح یہاں اس تنگ اور محدود مفہوم میں نہیں برتی گئی ہے کہ اس سے مراد صرف وہ جذبہ ہو جو کسی فعل کو درست قرار دے کر اس کی پسندیدگی یا نادرست قرار دے کر اس کی ناپسندیدگی سے پھوٹ نکلتا ہو، بلکہ اس کا وسیع تر مفہوم مراد ہے یعنی وہ جذبہ جو زندگی سے ہماری ہمدردی و یگانگت کی ایک شکل ہے۔ مشہور انگریز نقاد میتھو آرنلڈ نے اخلاقی جذبے کو اسی وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے اپنے ایک مقالے میں وہ انگریزی شاعری کو اخلاقی تصورات سے تعرض کرنے والی قرار دے کر کہتا ہے کہ اخلاقی کے لفظ کو وسیع معنوں میں سمجھنا چاہیے، کس طرح جینا چاہیے کے سوال پر روشنی ڈالنے والی ہر بات اخلاقی کہلائے گی۔

گویا ایک کلیے کے طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جو جذبات انصرامِ حیات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں برتر رتبے کے ہوتے ہیں نسبت ان جذبات کے جو انصرامِ حیات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ چنانچہ برترین جذبات وہ ہیں جو زندگی کی فیصلہ کن قوتوں سے یا شفقت و محبت کے احساسات سے اور اچھے بُرے کی اخلاقی تمیز یا ضمیر و ایمان سے متعلق ہوتے ہیں۔ کسی کتاب کی دائمی قدر و قیمت جاننے کے لیے یقینی پیمانہ یہ ہے کہ ہم یہ سوال کریں کہ آیا وہ انسانی زندگی کی عمیق ترین چیزوں کے ساتھ ہماری ہمدلی و ہمدردی کو تحریک دیتی ہے یا

نہیں۔ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو تو خواہ اس کتاب میں اور کتنے ہی محاسن ہوں وہ اعلیٰ ادب میں شمار نہیں ہوگی۔

اگر یہ پیمانہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اعلیٰ ادب ہمیشہ واضح طور پر اخلاقی خاصے کا حامل ہوگا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ دنیا کا جتنا بھی اعلیٰ ادب ہے وہ اخلاقی خاصے کا حامل ہے۔ اخلاقی سے مراد ناصحانہ نہیں ہے بلکہ یہ لفظ ان وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ دوسری خصوصیات اور صفات اگر مساوی درجے کی ہوں تو وہ دو کتابوں میں وہ کتاب برتر قرار پائے گی جو ایسے جذبات کو انگیخت کرے جو ہماری فطرت کو تقویت بخشنے اور وسعت دینے کے باعث ہوں۔ یعنی بالفاظِ دیگر صحت مند جذبات کو انگیخت کرے۔ ان نقادوں سے اتفاق کرنا مشکل ہے جو ادب اور آرٹ کو ایسی لذتوں اور مسرتوں کے بخشنے کے پیمانے سے جانچتے ہیں جن کا کوئی تعلق بقول ان کے اخلاق سے نہیں ہوتا۔ جو بحث ہم نے اب تک کی ہے اس کی روشنی میں آرٹ برائے آرٹ کا مقولہ بے معنی ہے اور بالعموم ایسے آرٹ کی پشت پناہی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو کمزور یا شہوت پرستانہ ہو۔ آرٹ خود اپنی غایت آپ نہیں ہے۔ بلکہ اس لیے ہے کہ انسان کی مسرتوں کا باعث ہو اور ان میں اضافہ کرے۔ چنانچہ آرٹ کے لیے خالص غیر اخلاقی معیار یا پیمانہ مقرر کرنا محض نادانی ہے اور اخلاقی شرائط و احوال سے قطع نظر کر کے فنکارانہ فضیلتوں کے وسیع احاطے کی توقع رکھنا بھی بے سود ہے ایسی کوششیں کرنے والے افراد فروتر یا ادنیٰ آرٹسٹک محرکات کی نچلی سطح پر اتر آتے ہیں یا اپنی محنت و توجہ کو محض صناعی و کاریگری پر بید ریغ لٹانے لگتے ہیں۔ آرٹ یا ادب کا جو دبستان ایسی کوششوں میں مصروف ہو اس کا انجام آخر کار کمزوری و تنگ دامانی ہی ہوتا ہے اور اس دبستان کی تخلیقات اعلیٰ جذبات اور بنی نوعِ انسان کی بلند تر دلچسپیوں سے عاری ہوتی ہیں۔

ادب کو خالص غیر اخلاقی معیار سے جانچنے کا میلان دو وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ دوسرے فنونِ لطیفہ کے اصول و قواعد کو ہو بہو ادب پر منطبق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ موسیقی میں کوئی واضح اخلاقی کیفیت نہیں ہوتی موسیقی سے پیدا شدہ جذبات و احساسات انصرامِ حیات سے کوئی ایسا قطعی ربط نہیں رکھتے کہ انھیں اخلاقی کیفیت قرار دیا جاسکے۔ مصوری اور مجسمہ سازی کے فن بھی ہیئت اور رنگ کی محبت کو تسکین دینا اپنا اہم منصب سمجھتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مصوری اور مجسمہ سازی کے فن کسی قسم کی اخلاقی کیفیت کے حامل نہیں ہوتے لیکن خالص جمالیاتی خواہشات کی تسکین ان فنون میں بہ نسبت ادب کے بہت زیادہ نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ادب کی اعلیٰ ہیئتیں بیشتر اوقات درحقیقت بنیادی طور پر اخلاقی منشا کے منبعے سے نہیں پھوٹتیں۔ اکثر شاعر کسی ناصحانہ نیت کے تحت شعر نہیں کہتے اور جو شاعر ناصحانہ نیت سے شعر کہتے ہیں ان میں سے بیشتر حقیقی شاعری کے بجائے محض منظوم وعظ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ آرٹ برائے آرٹ کے دعویدار یہ کہنے میں تو ضرور حق بجانب ہیں کہ قطعی اخلاقی کیفیت ادب کے لیے لازمی نہیں ہے کیونکہ ایسی شاعری اور ایسا ادب ضرور ممکن ہے جس کے لیے کسی اخلاقی کیفیت کا ادعا یا اثبات کرنا مشکل ہے لیکن ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ صرف ایسی ہی غیر اخلاقی قدروں کے پیمانے سے ادب کو جانچنا چاہیے۔

واقعہ یہ ہے کہ ادب میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی جذبہ کلی طور پر اخلاقی کیفیت سے عاری ہو۔ اگرچہ ہم مادی حسن کے نظارے سے یا اس کی تخیلی نقشہ کشی سے پیدا ہونے والے جذبے کو خالص جمالیاتی جذبہ قرار دیتے ہیں لیکن اس میں بھی تقریباً ہمیشہ کوئی نہ کوئی اخلاقی معنی خیزی یا خیال افروزی ضرور ہوتی ہے۔ جو اس کے لیے جو چیز حسین ہے وہ ضرور کسی جوابی اخلاقی کیفیت کا اشارہ کرتی

ہے۔ اسی لیے محسوس حسن کو آرٹ میں اخلاقی احساس کو بیدار کرنے کے لیے اور جب یہ بیدار ہو جائے تو اُسے عمیق تر بنانے کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اعلیٰ شاعری اخلاقی کیفیت سے مالا مال ہوتی ہے اور ہماری اخلاقی حس کو مؤثر طریقے سے اپیل کرتی ہے وہ کبھی پھیکی اور سپاٹ نہیں ہوتی بلکہ حسین اور متنوع خیالی پیکروں اور تمثالوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ اس طرح ہمارے حافظے میں حسین مناظر اور آوازیں نہایت پُراسرار طور پر ہمارے عمیق اور نرم و نازک تجربات کے ساتھ مربوط ہو جاتے ہیں اور اپنے مطالعے کی یادوں میں ہم محبت، غم اور شدید جذبات کے ساتھ ساتھ ان حسی دلفریبیوں کو بھی ذہن میں تازہ کر لیتے ہیں جن میں وہ جذبات مجسم ہوتے ہیں۔

چنانچہ یہ مانتے ہوئے بھی کہ اخلاقی کیفیت ادب کا لازمہ نہیں ہے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تمام صحت مند جذبات کوئی نہ کوئی اخلاقی نسبتیں ضرور رکھتے ہیں نیز یہ کہ وہ جذبات رتبے کے لحاظ سے بلند ترین ہیں جو واضح طور پر اخلاقی ہیں اور نتیجتاً ادب کی برترین قسمیں کبھی خالص غیر اخلاقی معیاروں سے نہیں جانچی جا سکتیں۔

اعلیٰ ادب میں اخلاقی کیفیت کی اہمیت اُجاگر کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ادبی اصولوں پر نقاد کے نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ نقاد اخلاقی کیفیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا لیکن اسے اخلاقی کیفیت پر اس کی ادبی قدر و قیمت ہی کے حوالے سے توجہ دینی چاہیے اور صرف یہ سوال اُٹھانا چاہیے کہ مصنف بلند ترین اثرات کیونکر پیدا کر سکتا ہے؟ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں جذبات کے عنصر کی بحث ختم کرنے سے پہلے ہم ادب اور عملی اخلاق کے تعلق پر ایک نظر ڈال لیں۔

اخلاق کا مطالبہ بہت سادہ ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مصنف کو ایسی چیز نہیں لکھنی چاہیے' جو انسانی جذبات و کیفیات کو کھوٹا یا ذلیل کرنے' نیک و بد کی تمیز یعنی ضمیر کو کند یا مردہ کرنے اور عزم و حوصلے کو کمزور کرنے کا باعث ہو۔ اخلاق کا یہ مطالبہ قطعی اور لازمی ہے کیونکہ انسانی فطرت میں اخلاق اگر برترین حیثیت نہیں رکھتے تو پھر وہ اخلاق کہلانے کے مستحق ہی نہیں۔ اخلاق کسی قسم کے سمجھوتوں اور مفاہمتوں کے روادار نہیں ہوتے۔ جو چیز بھی اخلاق سے تصادم میں آئے اُسے اخلاق کے آگے سر جھکا دینا چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ادب کے جائز مقاصد و ذرائع اور اخلاق کے اس مطالبے میں کوئی ٹکراؤ ہے؟ اگر کوئی شاعر یا ناول نگار اس مطالبے کی اطاعت کرے تو کیا وہ اپنے جذباتی تاثرات پیدا کرنے کی طاقت کو مقید و محدود یا ان کے دائرے کو تنگ پائے گا؟ بعض لوگ اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ادب اپنے وسیع ترین دائرے میں انسانی زندگی کی تصویر کشی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے اُسے انسانی فطرت کو پورے طور پر دکھانا چاہیے۔ اس کا اچھا اور بُرا پہلو' اس کے حیوانی و تاریک جذبات اور ساتھ ہی روشن و نرم و نازک کیفیات و احساسات' یہ سب کچھ ادب کو پیش کرنا چاہیے۔ آرٹ سارے عرصۂ زندگی پر مکمل آزادیٔ حرکت و عمل کا تقاضا کرتا ہے' اسے کوئی درس دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ جو کچھ اُسے نظر آتا ہے یا جو کچھ وہ تصور کر سکتا ہے اسے پیش کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس لیے اُسے اخلاق کی حدود کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے' شاعر' ناول نگار یا ڈراما نگار کو لکھتے وقت رُک کر یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے وہ اخلاقی و روحانی اصلاح کا باعث ہوگا یا نہیں۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو آرٹ کے امکانات کا دائرہ بری طرح سکڑ جائے گا [illegible] بہت سی ایسی چیزوں کی توصیف و ستائش کیا کرتے ہیں جو اچھی نہیں ہیں مثلاً ہم قوت و اقتدار کو بھی سراہتے ہیں [illegible] و جبر مال ہو یا بد باطن خبیث چنانچہ ہم نپولین کو بھی سر [illegible] اور

اشوک اعظم کو بھی تیمور کو بھی سراہتے ہیں اور اورنگ زیب کو بھی۔ اسی طرح ہم شدید مغلوب کن جذبے کو بھی قابلِ داد سمجھتے ہیں خواہ خود اپنے لیے اسے پسند نہ کریں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم مشہور عشاق کی داد دیتے ہیں جیسے مجنوں، فرہاد وغیرہ، اسی طرح ہم کلیوپیٹرا اور لیڈی میکبتھ کو بھی داد دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی توصیف و ستائش کے جذبات کو اپیل کرنا ادب میں جائز ہے۔ خواہ ایسا کرتے ہوئے اخلاق کی حدود کی خلاف ورزی ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ ادب اور آرٹ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ جس چیز کی وہ تصویر کشی کر رہا ہے اس کا اخلاقی اثر کیا مترتب ہوگا۔ اسے تو صرف اس بات سے غرض ہونی چاہیے کہ وہ انسانی کردار اور انسانی اعمال و افعال اور جذبات و احساسات کو پیش کرے اور پورے طور پر صداقت کے ساتھ پیش کرے۔

یہ سب باتیں یوں بظاہر ٹھیک معلوم ہوتی ہیں لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ادب جو انسانی زندگی اور کردار کی نقشہ کشی کرتا ہے تو اس کا کوئی مقصد کوئی غرض بھی ہوتی ہے، نقشہ کشی محض نقشہ کشی کے لیے نہیں ہوتی۔ ادب میں یہ مقصد ہے پڑھنے والوں کے جذبات و احساسات کو بیدار کرنا۔ اگر انسانی زندگی کے کسی پہلو کی نقشہ کشی سے صرف ناخوشگوار، گھناؤنے، نفرت انگیز، پست و ذلیل جذبات و احساسات ہی بیدار ہوتے ہیں تو ایسی نقشہ کشی خود ادب کے مقصد کے بھی منافی ہے اور اخلاقی قوانین کے بھی۔

لیکن یہ ماننے میں ہمیں تامل نہیں کہ بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جو ادب کی شرائط کو اچھی طرح پوری کرتی ہیں، حسن، طاقت اور صداقت کو پیش کرتی ہیں تکنیکی مہارت کا مظاہرہ کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا اخلاقی اثر مجموعی طور پر اچھا نہیں ہوتا کیونکہ وہ برائی کو اس انداز میں پیش کرتی ہیں کہ وہ دلکش اور موجبِ ترغیب ہو جاتی ہے۔ ایسی کتابیں ہمارے ضمیر یا نیکی بدی کی تمیز کو کند یا باطل کر دیتی ہیں، ہمارے عزم و حوصلے کو کمزور کر دیتی ہیں یا معاشرے کی اخلاقی صحت اچھی زندگی بسر کرنے کے جن قوانین پر منحصر ہے ان پر ہماری توجہ اور ہماری عزت کو گھٹا دیتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ناممکن ہے کہ بغیر اخلاقی قوانین کو پس پشت ڈالے بلند ترین ادبی اثرات حاصل کیے جائیں؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ اس قسم کا اخلاقی اثر ادبی قدر و قیمت کا جزو کبھی نہیں ہوتا۔ ایسی کتابیں اپنی اخلاقی کمی یا نقائص کی وجہ سے بلند پایہ نہیں ہوتیں بلکہ اُن کے باوجود بھی اچھا ادب کہلاتی ہیں اور اگر ان میں یہ کمیاں یا نقائص نہ ہوں تو اور بھی بلند پایہ اور پُرعظمت ہو جائیں۔ مثال کے طور پر شوق لکھنوی کی مثنویاں بہارِ عشق اور فریبِ عشق دیکھیے۔ ان مثنویوں میں زبان، روزمرّہ، محاورہ، بندش کی چستی، اودھ کے زوال پذیر معاشرے کی بھرپور نقشہ کشی جیسی خوبیاں ضرور موجود ہیں لیکن ان کا مجموعی اخلاقی اثر پڑھنے والوں پر اچھا نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ عظیم ادب میں شمار نہیں ہو سکتیں اور شمار ہوتی بھی نہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ شاعر یا ڈرامہ نویس یا ناول نگار کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ انسانی کردار اور اعمال و افعال کے پورے احاطے کی نقشہ کشی کرے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً اُسے یہ آزادی حاصل ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ یہ نقشہ کشی جائز ادبی اثرات پیدا کرنے کی غرض سے کرے۔ یہ آزادی اُسے عملی اخلاق کی خلاف ورزی کرنے کا حق نہیں دیتی۔ ایک مصنف کی کتاب خواہ نثر میں یا نظم میں ہر قسم کی بدی اور فسق و فجور کو پیش کرتے ہوئے بھی اخلاقی ہو سکتی ہے اور یہ نقشہ کشی اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل ہی نہ ہوگی اگر اخلاقی نہ ہو۔ ہر و لیتا کے نقاد اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ انسانی زندگی کی نقشہ کشی کی فضیلت کا ایک لازمہ یا ناگزیر شرط اس کی صداقت ہے یعنی انسانی فطرت کے قوانین سے مطابقت۔ اور آدمی کی اخلاقی فطرت کے حقائق بھی اتنے ہی واقعی اور اہم ہیں

جتنی دوسری حقیقتیں بلکہ ادب میں تو یہ زیادہ ہی اہم ہیں۔ انسانی کردار کی تہ میں اخلاقی وجدانات موجود ہوتے ہیں اور انسانی اعمال کی تہہ میں اخلاقی قوانین۔ فرض کی ادائیگی کا جذبہ عالمگیر اور مطلق و قائم بالذات ہے۔ اس کی خلاف ورزی سے لازماً ادراک کی بے حسی یا عزم و ارادے کی کمزوری، حوصلوں اور بلند مقاصد کی عدم بالیدگی اور انتشار پیدا ہوتا ہے جو آخر کار تباہی و بربادی پر منتج ہوتا ہے۔ یہ حقیقتیں ہیں۔ ضروری ہے کہ مصنف ان حقیقتوں کے ساتھ ہم آہنگ و مطابق ہو۔ اگر اس کا مشاہدہ و مطالعہ ان حقیقتوں کو توڑ مروڑ کر غلط پیش کرتا ہے یا ان کا انکار کرتا ہے تو وہ باطل ہے اور اگر اس کا مشاہدہ و مطالعہ ان حقیقتوں کو اس پر منکشف ہی نہیں کرتا ہے تو وہ سطحی ہے۔ جب کبھی ادب جرم و گناہ کی ماہیت اور اس کے نتائج سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو وہ بنیادی حقیقتوں کے غیر مطابق ہو جاتا ہے اور نہ صرف اخلاق کو صدمہ پہنچاتا ہے بلکہ آرٹ کو بھی۔ آرٹ کا تقاضا ہے صداقت، اور اخلاق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کوئی کتاب محض اس وجہ سے غیر اخلاقی نہیں ہو جاتی کہ اس میں جرم و گناہ کی تصویریں پیش کی گئی ہیں اور نہ اس وجہ سے اخلاقی بن جاتی ہے کہ اس میں اولیا یا نیک افراد کی شبیہ اتاری گئی ہے۔ اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کا فیصلہ کتاب کے مجموعی ادبی اثر کی بناء پر کیا جاتا ہے کہ اس کا اثر بدی یا جرم و گناہ کو دلکش اور مستحسن بنا کر قارئین کو مائل بہ شر کرنے والا ہے یا انہیں اس سے دور کرنے والا ہے۔ اگر کسی برائی کے مجسمے کو مصنف عمدگی سے پیش کرے تو اس پیشکش کی داد دی جا سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہوگا کہ آیا پڑھنے والا اس برائی کے مجسمے کی طرح بننے کے لیے نفسی و ذہنی طور پر مائل ہو جاتا ہے؟ اگر اس کے نفس و ذہن پر ایسا اثر مترتب ہوتا ہے جو اسے اس طرف مائل کرتا ہے تو یقیناً وہ کتاب غیر اخلاقی ہے۔

جو بحث سطور بالا میں کی گئی ہے اگر ٹھیک ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ اعلیٰ ترین ادبی تکمیل کے لیے صحت مند اخلاق کی پابندی کوئی مزاحمت نہیں پیدا کرتی بلکہ اس کے برعکس حقیقی معنوں میں عظیم ادب اخلاقی سلامت فہمی اور میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں اعلیٰ سنجیدگی کا مظہر حامل ہوتا ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے۔ وہ حزنیہ تمثیل جو بقول ارسطو رحم یا ترس اور خوف و دہشت کے جذبات کی معرفت تزکیۂ روح کرتی ہے، وہ رزمیہ نظم جو تاریخ یا سانحات کے وسیع اسٹیج پر انسانی عمل کی بلند ترین رسائیاں پیش کرتی ہے، وہ طربیہ تصنیف جو صحت مند اور دیرپا مسرت کے سرچشموں کو نمایاں کرتی ہے یا زندگی کی پُرفریب اور باطل چیزوں کو صحت بخش تضحیک کا نشانہ بناتی ہے، وہ افسانہ یا ناول جو مردوں اور عورتوں کی زندگی کی متحرک تصویر پیش کرتا اور واقعات و حوادث کی جاندار نقشہ کشی کرتا ہے۔ یہ سب ادبی تحریریں اگر انسانی فطرت کی عمیق ترین حقیقتوں کو نظر انداز کر دیں تو کیونکر مبنی بر صداقت قرار دی جا سکتی ہیں؟ اگر ان کے لکھنے والے ان حقیقتوں کی صحیح طور پر تحسین کرنے کی اخلاقی صلاحیت نہیں رکھتے تو وہ پھر کیونکر صادق ہو سکتی ہیں؟ ذہنی آسودگی اس آرٹ سے پیدا ہوتی ہے جس میں راستی و صداقت کی روح ہو۔ فن کی حیات راستی و صداقت ہے اور جو فن اخلاقی صداقت و راستی کے منافی ہے وہ اصل میں زندگی ہی کے منافی ہے۔ (ونچسٹر سے مستفاد)

عالمی ادب میں اقبال کا پیغام

عبد المغنی

ہر ادب اپنی ایک مخصوص فضا رکھتا ہے، جس کے پس منظر میں ہی اس کے تخلیقی نیز ردِ عمل آتے ہیں اور پورے طور پر سمجھے اور سمجھائے جا سکتے ہیں۔ کوئی پارۂ ادب اپنے معاشرے سے الگ ہو کر وجود پذیر یا قابلِ فہم نہیں ہو سکتا۔ تمام ادبی تخلیقات ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ کسی بھی ادب کا جب ایک سانچہ معین ہو جاتا ہے تو اس میں کئے جانے والے ہر تجربے کی ایک روایت ہوتی ہے، جس کے نقوش و اشارات ہی اس تجربے کی عمومی تشکیل کرتے ہیں۔ ادبیات لسانیات پر مبنی ہوتی ہیں، ایک زبان کے اپنے محاورات اور استعارات ہوتے ہیں، جو اس کے ادب کا تار و پود تیار کرتے ہیں۔ انسان کی دوسری سرگرمیوں کی طرح ادب بھی وقت اور مقام کی حدود کا فطری طور پر پابند ہے۔

اس عملی حقیقت کے باوجود عالمی اور آفاقی ادب کی گفت و گو موجودہ بین الاقوامی صدی میں عام ہو گئی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس گفتگو کی لَے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس صورتِ حال کا سبب واضح ہے انسانوں کے مختلف اقوام و ادوار میں تقسیم ہونے کے باوجود، انسانیت کا بنیادی تصور تو ایک ہی ہے۔ قدیم زمانے میں یہ بات اولادِ آدم اور بندگانِ خدا کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ اب حیاتیات و نفسیات کی تحقیقات کے علاوہ سائنسی انکشافات، صنعتی ایجادات اور سیاسی و معاشی حالات و واقعات نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی ہے۔ اس طرح یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ ملک اور دور کے پس منظر کے باوجود ادب کا ایک پہلو عالمی و آفاقی بھی ہے۔ ایک ادبی تخلیق کی خصوصیت جو بھی ہو، اس کے اندر ایک عمومیت بھی ہے یا ہو سکتی ہے۔ کسی ادبی نمونے کا پہلا تعلق تو یقیناً اس زبان کے مضمرات سے ہوگا جس میں وہ پیش کیا گیا ہے، لیکن دوسرے مرحلے پر اس کا رشتہ دوسری زبانوں سے بھی قائم ہو سکتا ہے۔ اگر یہ رشتہ نہیں ہوتا تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ممکن نہیں ہوتا۔

اب سوال یہ ہے کہ ادب کے خصوصی و عمومی اور مقامی و عالمی پہلوؤں کے درمیان تناسب و توازن کی صورت کیا ہوگی؟ اس کا کون سا حصہ محدود ہوگا اور کون سا آفاقی؟ یہ ادبی تنقید کا بہت ہی نازک اور پیچیدہ سوال ہے، اور اس میں بحث و نزاع کی کافی گنجائش ہے۔ اس سلسلے میں میں صرف اپنے مطالعے اور غور و فکر کے نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ معلوم ہے کہ ہر ادبی تخلیق مرکب ہوتی ہے دو اجزا سے۔ ایک مواد اور دوسرے ہیئت۔ جہاں تک ہیئت اور مواد کو الگ الگ اکائیوں میں بانٹ کر دیکھنے کا تعلق ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لسانی وسیلۂ اظہار کی تخصیص کے سبب ہیئت ایک بالکل مقامی اور محدود عنصر ہے، جب کہ مواد کے اندر عالمی و آفاقی ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ انسانی ذہن پورے عالم انسانیت کے لئے یکساں ہے، لیکن زبانیں مختلف اور متفرق ہوتی ہیں۔ ان کے تنوع میں فکر کی وحدت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ جدا جدا اسالیب کے درمیان موضوع مشترک ہو سکتا ہے۔ الفاظ کی رنگا رنگی میں معانی کی یکتائی پائی جا سکتی ہے۔

لیکن کیا مختلف ادبیات کے صرف مواد، موضوع، فکر اور معنی کا موازنہ کرکے ان کے باہمی اوصاف کا تعین کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ ادب جب مواد و ہئیت دونوں ہی اجزا سے مرکب ہے تو صرف ایک جز کو لے کر پورے مرکب پر کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ترجمے سے کسی تحریر کا صرف مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کی ادبی تعیین نہیں ہو سکتی۔ تنقید ادب کے مسلمہ اصول کے مطابق، ادب ایک ایسا تخلیقی مرکب ہے جس کے موضوع اور اسلوب کے درمیان ایک عضویاتی ارتباط ہوتا ہے۔ چناں چہ اس کے عناصر ترکیبی کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرکے دیکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی پوری حقیقت گرفت میں نہ آئے اور اس کی نوعیت و اصلیت کا ایک ناقص تصور ہمارے سامنے آئے۔ اس ناقص تصور سے ایک ادب پارے کی سالمیت ہی ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا اس صورت میں دوسرے ادب پاروں کے ساتھ اس کا موازنہ کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا۔

دوسری طرف، اگر کسی خاص ہئیت کو تنقید و تقابل کا معیار مان لیا جائے، تب بھی یہی خرابی لازم آئے گی۔ بلکہ ہر مواد کو معیار ماننے سے بھی زیادہ غلط اور ناقابلِ عمل صورت ہوگی۔ ہر ادب کی اپنی ایک ذہنیت ہوتی ہے جس کا ہی اظہار اس کے مختلف اصناف و اسالیب میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ذہنیت کو نظر انداز کرکے اس ادب کا کوئی مطالعہ نتیجہ خیز اور درست نہیں ہوگا۔ ایک زبان ایک خاص سماج میں پروان چڑھتی ہے اور اس سماج کے مختلف اداروں اور مسلمہ قدروں ہی کی مطابقت میں اس کے ادب کی ہئیتیں تشکیل پاتی ہیں۔ لہٰذا محض کسی ہئیت کو الگ سے لے کر اس کا موازنہ دوسرے ادب کی ہئیت سے کرنا ایک فعل عبث ہے۔

تب ادبیات عالم کے تقابلی مطالعے کا صحیح نہج کیا ہے؟ میرے خیال میں اس نہج کے دو بنیادی عوامل ہیں۔

۱۔ ہر ادبی تخلیق میں فکر و فن کا جو مرکب ہو اس کی مجموعی قدروں کا تعین کیا جائے۔ پھر مختلف ادبیات کی قدروں کے مجموعوں کا تقابلی مطالعہ کرکے ان کے باہمی اوصاف کی تشریح کی جائے۔ ایک زبان کا ادب پارہ اپنے عناصر ترکیبی کے جو نتائج پیش کرے ان کا موازنہ دوسری زبان کے ادب پارے کے عناصر ترکیبی کے نتائج سے کرکے ایک تقابلی میزان کل نکالنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس طرح مختلف ادبیات کا ایک کلی تناسب اور اس کی روشنی میں مختلف ادبی نمونوں کے مراتب کی نسبت معلوم ہو سکتی ہے۔

۲۔ لیکن عالمی ادبیات کے اس موازنے کا آخر معیار کیا ہوگا؟ جب تک ایک عمومی و اصولی معیار ایسا نہیں دریافت ہو جائے جس کا اطلاق آفاقی طور پر کیا جا سکے، کوئی موازنہ وہ تقابلی نتائج نہیں پیدا کر سکتا جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ یہ معیار متقابل ادبی تخلیقات کی اندرونی ترکیب کا تنقیدی تجزیہ کرکے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی ادبی تخلیق کی قدر و قیمت معین کرنے کے لیے ایک تنقیدی مطالعے کا بنیادی اصول کیا ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں بحثیں تو بہت کی جا سکتی ہیں اور کی جاتی رہی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جدید ادبی تنقید میں مواد و ہئیت کی عضویت کے تسلیم کر لیے جانے کے بعد اب یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہے کہ ایک ادیب جس نسبت سے اپنے مواد کو ہئیت میں ڈھالتا ہے وہی اس کے نمونۂ تخلیق کے وصف کی تعیین کا معیار بن سکتی ہے یعنی ہر ادیب کا ایک تخلیقی مسئلہ ہوتا ہے، جو اس کے ادب کے دونوں عناصر ترکیبی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک ادبی تخلیق کو دیکھ کر جو ضروری سوال اٹھتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ا : اس تخلیق کا موضوع کیا ہے؟

ب : اس موضوع کو کس اسلوب سے ادا کیا گیا ہے؟

ان معیاروں کا تعاقب کرتے ہوئے، سب سے پہلے تو تخلیق کے مواد کی نوعیت آشکار کی جائے گی، اس کے تمام مضمرات کا تجسس کر کے اس کی اہمیت واضح کی جائے گی، اور ساتھ ہی ہیئت کے مقابلے میں اس کی پیچیدگی کا سراغ لگایا جائے گا۔ اس کے بعد دیکھنا ہے گا کہ یہ مواد اپنی مخصوص نوعیت و اہمیت اور پیچیدگی کے ساتھ ایک خاص ہیئت میں کس طرح بروئے اظہار آیا، جو ہئیت اظہار کے لیے اختیار کی گئی وہ کہاں تک موزوں تھی اور کتنی مؤثر ثابت ہوئی۔

یہ معیار ادبی تخلیقات کے مستقل بالذات مطالعے کے لیے بھی اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا ان کے تقابلی مطالعے کے لئے، خواہ یہ تقابل ایک ہی زبان کی ادبیات کے درمیان ہو یا مختلف زبانوں کی ادبیات کے مابین، اس معیار کی یہ عمومیت اور ہمہ گیری، عالمی ادبیات کے تقابلی مطالعے کے لئے اس کی موزونی اور نتیجہ خیزی کی ایک اور دلیل ہے۔ یہ تنقید ادب کا سب سے جامع معیار ہے جس میں تجزیہ تقابل کی تمام شرطیں بہ درجۂ کمال پوری ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ادب کے آفاقی مطالعے کے لئے یہ ایک بہترین معیار ہے۔

اس اصولی مؤقف سے اقبال کا مقام عالمی ادب میں متعین کرنے کے لئے چند اجتماعی حقائق پر ایک نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اب تک ادب کے عالمی مطالعے کا انداز کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایک آفاقی معیار سے ادبیاتِ عالم کے مطالعے کی کوئی سنجیدہ اور باضابطہ کوشش اب تک نہیں ہوئی ہے۔ مشرقی ادبیات اور مغربی ادبیات کے درمیان کسی تنقیدی موازنے کی کوئی مثال میرے سامنے نہیں ہے۔ اس معاملے میں اہلِ مشرق بڑی مجبوریوں سے دوچار رہے اور نتیجۃً ان کی کوتاہیاں چند در چند ہیں۔ بین الاقوامی دورِ حاضر کی علمی و عملی سہولتیں ان کے نصیب میں بہت ہی کم آئیں۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن پر مغرب کی مرعوبیت ایسی طاری رہی کہ وہ مغربی ادبیات کے ساتھ اپنی ادبیات کا تقابل کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکے۔ تنقید کی بالیدگی بھی مشرق میں اتنی کم ہوئی کہ خود اس خطے کی زبانوں کی ادبیات کا کوئی تقابلی مطالعہ نہیں کیا جا سکا دوسری طرف اہلِ مغرب نے جدید علم و حکمت کے تمام اثاثوں اور دعوؤں کے باوجود اس سلسلے میں ایک یکسر غیر علمی اور غیر حکیمانہ روش اختیار کی۔ انہوں نے اپنے خطے کی زبانوں کی ادبیات کا تو ہر جہت سے مطالعہ کیا اور اپنی تنقیدوں کا انداز اکثر و بیشتر بین الاقوامی رکھا۔ اس کے علاوہ، ان میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے مشرقی زبانوں اور ان کے ادبوں کا بھی الگ الگ مطالعہ کیا لیکن مشرقی ادبیات کے متعلق ان مغربی مستشرقوں کا رویہ عام طور پر سرپرستانہ رہا، اور انہوں نے ان کے تقابلی مطالعے کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ سائنس اور صنعت کی طرح تہذیب اور ادب میں بھی اہلِ مغرب نے اہلِ مشرق کو اپنے سے بہت کمتر اور بالکل پس ماندہ تصور کیا اور مشرقی ادبیات کو اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ ان کا سنجیدہ تنقیدی مطالعہ کر کے ان کی عالمی قدر و قیمت تہذیبِ حاضر کے پس منظر میں واضح کریں اور مغربی ادبیات کے ساتھ ان کا موازنہ کر کے ان کے آفاقی مقام کی تعیین کریں چنانچہ مغرب کی ادبی تنقیدوں میں مشرقی ادبیات کے حوالے گویا مفقود ہیں۔

میں اس صورتِ حال کو اہلِ مغرب کی ادبی نو آبادیت اور سامراجیت پر محمول کرتا ہوں۔ بہر حال، یہ ادب کا ایک سیاسی اور سراسر غیر ادبی تصور ہے لیکن لطیفہ یہ ہے کہ اس تصور کے فروغ میں اہلِ مشرق نے بھی مغرب والوں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے جب سے میکالے کی نسل ایشیا میں پروان چڑھی ہے اس نے یہ تبلیغی مہم اپنے سر لے لی ہے کہ ہر جہت سے مشرقی ادبیات کو ناقص محض

قرار دیتے ہوئے اس کی تشکیل نو بالکل مغربی معیارِ ادب پر کر ڈالے۔ چنانچہ اس صدی کی دوسری چوتھائی سے جو ادبی تنقید میں مشرقی ادبیات میں شروع ہوئی ہیں ان کا نصف صدی کا کارنامہ یہی ہے کہ وہ مغربی ادبیات کے حوالوں سے بھری ہوئی ہیں اور ان میں مشرقی ادیبوں کا جو کچھ موازنہ مغربی ادیبوں کے ساتھ ہے وہ صرف یہ دکھانے کے لیے کہ مشرقی ادب میں وہ کیا کیا نقائص ہیں جن کو مغربی ادب کے معیار سے دور کیا جانا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ ادبی مطالعے کا یہ انداز کہ ایک قسم کے ادبی تصورات کو اصول موضوعہ تسلیم کر کے دوسری قسموں کے تمام ادبی تصورات پر حکم لگا دیا جائے اور پھر اسی اصول موضوعہ کے مطابق تمام ادبی نمونوں کی قدر و قیمت متعین کی جائے، کسی طرح عالمی ادب کا آفاقی معیار بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یہ تو بالکل مقامی، علاقائی اور محدود قسم کا تصور ہے، جو بجائے اوصاف و اقدار کے محض اغراض و مفادات پر مبنی ہے۔ لہٰذا ادب کے جس مرکب اور متناسب معیار کی نشان دہی ہیں نے ادبیات عالم کے تقابلی مطالعے کے صحیح نہج پر بحث کے دوران کی ہے اسی پر توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ اس کے مضمرات و عوامل بالکل اصولی اور آفاقی ہیں اور اس میں کوئی نقطۂ نظر پہلے سے طے شدہ نہیں ہے جس کو خواہ مخواہ عائد کرنا مقصود ہو، بلکہ وہ ایک یکسر عملی و تجربی معیار ہے جس میں تنقیدی تجربے اور تقابل ہی کے معروف و مسلم طریقوں سے موضوع مطالعہ کی حقیقت و اہمیت دریافت کرنی ہے۔ اگر انسانیت کی کوئی آفاقی قدریں ہیں تو ان کی تعیین عام انسانیت ہی کے معیار و منہاج پر کی جا سکتی ہے۔

اس آفاقی معیارِ ادب پر جب ہم اقبالؔ کی شاعری کو پرکھتے ہیں تو ہمیں اس کے اندر حسب ذیل دو نکتے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں:

۱۔ اقبالؔ کا فنی مسئلہ ان کی صف کے دوسرے تمام عالمی شعرأ کے مقابلے میں سب سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار تھا۔ اقبالؔ نے ایک ایسے دور میں شاعری کی جب سائنس اور صنعت کی ترقیات اور سیاسیات و معاشیات کی تحریکات نے پرانی دنیا کے پورے نظام کو تہ و بالا کر کے ایک نئی دنیا کے پیچ در پیچ اور رنگ برنگ مسائل کھڑے کر دیئے تھے، علوم و فنون کے سارے انداز بدل رہے تھے، اور انسانی ذہن نت نئی گتھیوں اور الجھنوں سے دو چار تھا: شعور کی گرہوں کے ساتھ ساتھ لاشعور کی تہیں بھی دریافت کی جا رہی تھیں۔ ان حالات و کیفیات سے اقبالؔ کو اپنی تعلیم و تربیت کے دوران براہ راست سابقہ پڑا انہی کے بقول وہ "اس آگ میں مثل خلیل" ڈالے گئے۔

اس کے علاوہ اقبالؔ نے عالم انسانیت کی "تشکیل جدید" کا ایک نہایت وسیع اور وزنی نصب العین بھی اختیار کر لیا، اور اپنی شاعری کو اس کی تعمیل کا ایک وسیلہ قرار دیا۔ پھر اپنے وقت کے دھاروں کے بالکل برخلاف انہوں نے اسلام جیسے انتہائی مرکب اور جامع نظریۂ حیات و کائنات کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس طرح ایک طرف اسلامی نظام زندگی کا احیأ اور دوسری طرف اس احیأ کے ذریعے انسانیت کی تشکیل جدید، تفکر کی دوہری مشقت اقبالؔ کے ذہن پر پڑی۔ اس مشقت میں بہت زیادہ اضافہ دو خاص واقعوں سے ہو گیا۔ ایک یہ کہ اقبالؔ اپنی تربیت کے لحاظ سے باضابطہ ایک فلسفی تھے، جس کے سبب علم و فکر کا ایک بارگراں ان کے دماغ پر تھا۔ دوسرے، ان کے ملک کی غلامی انھیں ایک سیاسی جدوجہد پر بھی ابھار رہی تھی، چنانچہ انھیں وکالت و قیادت کی عملی زحمتوں سے بھی گزرنا پڑا اور سیاست کے جھگڑوں سے نمٹنے کی ضرورت بھی لاحق ہوئی۔

۲۔ اپنی شخصیت اور اپنے زمانے کی یہ ساری پیچیدگیاں ہی وہ مواد تھیں جنھیں اقبالؔ کو ہیئت شاعری میں ڈھالنا تھا۔ یہ امر واقعہ

ہمارے سامنے ہے کہ اقبال کے اشعار شعریت کے کسی بھی معیار کے مطابق اعلیٰ قسم کے اشعار ہیں۔ اس لئے یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقبال اپنی فکر کو فن بنانے میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اپنے نصب العین کو ایک شعری وجود عطا کر دیا۔ ان کے تصورات استعارات میں ڈھل گئے، ان کی آواز نغمہ بن گئی۔ اس کارنامے سے اقبال کا فنی خلوص اور فکری رسوخ دونوں واضح ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے اپنے موضوع ذہنی کو ایک جاذب معروضیت بخشی اور اپنی شخصیت کو اپنے فن میں گم کر دیا۔ ان کے شاعرانہ احساسات کی سالمیت قابلِ رشک ہے۔ کلامِ اقبال میں مواد و ہیئت کی عضویت کمال درجے پر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی تخیل اپنے مختلف عناصر کے موزوں اسالیب اظہار خود تراشتی ہے، ان کے الفاظ ان کے معانی کے ساتھ بالکل پیوستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دقیق سے دقیق اور ثقیل سے ثقیل خیالات بھی شعری تخیل و ترنم کی ایمائیت و لطافت کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ اقبال کے نظامِ فکر ہی کی طرح ان کا اپنا ایک نظامِ اساطیر بھی ہے، جس کے استعارے، تلمیحیں اور کنائے اپنا ایک مخصوص رنگ و آہنگ رکھتے ہیں، اور ان کے اشارات و علامات نے احساسات و جذبات کی ایک خاص الخاص دنیا بسائی ہے۔ اس دنیا کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہاں شاعری کی صنعت نصب العین کی فطرت سے کامل طور پر ہم آہنگ ہے ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

اقبال کے سامنے جیسے اور جتنے فنی مسائل تھے ویسے اور اتنے ہی فنی وسائل انہوں نے ان کے حل کے لئے مہیا کئے۔ ان کا فن ان کی فکر کا روشن آئینہ ہے ؎

حسن آئینۂ حق، دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

ان حقائق کے پیشِ نظر، عالمی ادب میں اقبال کا مقام متعین کرنے کے لئے، سب سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ مشرقی ادبیات میں ان کی جگہ کیا ہے۔ مشرق میں جو زندہ زبانیں پائی جاتی ہیں ان سب کے مشاہیر شعراء کی صفِ اولیں میں سے ہم سب سے پہلے رومی، حافظ، سعدی اور خیام کا موازنہ اقبال کے ساتھ کرنا چاہیں گے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ تو بالکل واضح ہے کہ نہ صرف افکار کی گراں مایگی اور وسعت کے اعتبار سے بلکہ اصناف و اسالیب کی کثرت اور تنوع کے لحاظ سے بھی اقبال کی جامعیت کا مقابلہ ان میں کوئی ایک شاعر تنہا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا موازنے کی جہت یہی ہو سکے گی کہ اقبال کے کسی ایک ہی پہلو کا تقابل ان میں سے ہر ایک کی پوری شاعری سے الگ الگ کیا جائے۔ موازنے کی یہ جہت ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مجموعی طور پر فارسی کا کوئی ایک شاعر پورے اقبال کے برابر نہیں ٹھہرتا۔ اس کے بعد دیکھئے تو رومی کی مثنویات کا حجم جو بھی ہو، اقبال کی فارسی مثنویاں (اسرار و رموز وغیرہ) اور اردو مثنوی (ساقی نامہ) ملاکر، بہ اعتبار وصف رومی کی شاعری پر ایک وقیع اضافہ ہیں۔ "صوفیت" میں "پیرِ رومی" اور "مریدِ ہندی" کا رشتہ جو بھی ہو۔ شاعری میں معاملہ مختلف ہے۔ ایک تو تنقید میں شعراء کے اپنے بیانات پر انحصار نہیں کیا جا سکتا،

دوسرے شاعری کے بارے میں رومی کے متعلق اقبال کا کوئی بیان میرے علم میں نہیں، بہرحال فکر و فن کی مجموعی شعریت کا جو انداز کلام اقبال میں ہے وہ کلام رومی پر ایک تعدد زائد ہے۔ اقبال نے رومی کے بہترین عناصر کو جذب کر کے ان کے محاسن میں توسیع کرنے کے علاوہ کچھ نئے اوصاف کا اضافہ بھی کیا ہے۔

حافظ کے دیوان کا موازنہ اگر صرف "پیام مشرق" کے باب غزلیات "مے باقی" سے کر لیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ خود حافظ کی زمین پر اقبال کے تصرفات کیا کچھ ہیں۔ اس کے علاوہ "زبور عجم" اور "بال جبریل" کی غزلیں حافظ کی حدود تغزل سے ماورا آگے نکلی ہوئی ہیں۔ حافظ کے تغزل کی جتنی بھی خصوصیات بتائی جاتی ہیں وہ تو اقبال کی غزلوں میں بدرجہ اتم ہیں ہی، ان کے علاوہ شعریت کی جو نئی نئی تجلیں نئے نئے اشارے، تازہ بہ تازہ استعارے، لطیف سے لطیف کنائے اور خیال انگیز تلمیحیں ہیں وہ جدت طرازی تخیلات و تصورات اور نہایت وسیع احساسات وجذبات کا پیرایہ اظہار بن کر، غزلیات حافظ پر ایک اضافہ ہی تو ہیں۔ دیوان حافظ کی مے باقی غزلیات اقبال میں نہ صرف تازہ تر ہو گئی ہے۔ بلکہ اس کا نشہ دوآتشہ ہو گیا ہے۔

خیام کی رباعیات "پیام مشرق" کے حصہ رباعیات کے ساتھ ملا کر پڑھی جائیں تو یہ عجیب و غریب نکتہ دریافت ہوگا کہ اقبال کی سکر انگیزی میں خیام کی عیش کوشی سے زیادہ آب و تاب اور انبساط و نشاط ہے، رباعیات اقبال کے مسرت و بصیرت کے مرکب میں رباعیات خیام کے مسرت محض کے مفرد سے زیادہ زور اور اثر ہے۔ اقبال نے بصیرت کو مسرت بنایا ہے۔ جبکہ خیام نے مسرت کو بصیرت بنانے کی کوشش کی ہے، نتیجہ آسانی سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔

سعدی کا موازنہ شعریت میں اقبال کے ساتھ کرنا کوئی بہت موزوں کام نہیں ہے، اقبال کا تفوق اس معاملے میں ظاہر ہے۔ جہاں تک دانشوری کا تعلق ہے۔ اقبال کے اجتماعی تصورات سعدی کی شخصی اخلاقیات سے بہت ممتاز ہیں اور ان کی آفاقی اہمیت واضح تر۔

اردو شاعری میں میر و غالب نے روایت ارتقا کو جہاں تک پہنچایا تھا اقبال نے اس سے بہت آگے بڑھا دیا۔ میر کا فنی تجربہ تو بہت ابتدائی اور سادہ قسم کا تھا اور اس کی جو کچھ دل ربائی ہے وہ اس کی اسی معصومیت پر مبنی ہے۔ غالب کا تجربہ یقیناً بلوغت کی پیچیدگی رکھتا ہے لیکن اقبال نے اسی بالغانہ پیچیدگی کو درجۂ کمال پر پہنچایا اور غالب کے یہاں جو کچھ ناہمواریاں اور سطحیں رہ گئی تھیں ان کو بالکل دور کر کے نفاست بیان کا ایک انتہائی معیار قائم کیا۔ معانی کے تنوع اور تخیل کی وسعت میں تو اقبال کا موازنہ میر و غالب کے ساتھ کرنا ہی فضول ہے۔

سنسکرت کے کالی داس اور عربی کے امرأ القیس کا اقبال کے ساتھ موازنہ ویسا ہی ہوگا جیسے کسی تجربے کے آغاز کا تقابل اس کی ہیئت عروج کے ساتھ کیا جائے۔

یہاں میں ایک تنقیدی نکتہ پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ یہ کہ اقبال کی شاعری درحقیقت مشرقی ادبیات کی تمام شاعرانہ روایات کا نقطۂ عروج ہے۔ فارسی، سنسکرت اور عربی میں شاعری کے جتنے تجربات اقبال سے قبل ہو چکے تھے۔ ان سب کے بہترین احساسات و نقوش کو اپنے اندر سمیٹ اور سمو کر اقبال کے فن نے ارتقا کا ایک نیا مرحلہ طے کیا، جو اس وقت مشرقی شاعری کی منزل آخریں نظر آرہا ہے

اُردو زبان مشرق کی مذکورہ تینوں کلاسیکی زبانوں کی بہترین لسانی روایات کی اہم ترین نمائندہ ہے، اور اقبال کی اُردو شاعری نے بھی ان زبانوں کے تمام شعری وسائل کی ترکیب اور امتزاج کو اپنے اندر کر لیا ہے۔ اقبال کا فن مشرق میں اپنے پیش روؤں کے کارناموں کی توسیع اور تجدید کرتا ہے۔ اقبال کی شاعری ہی مشرقی ذہن کی بہترین نمائندہ ہے اور عالمی سطح پر اس کی آفاقی اہمیت کا پس منظر یہی ہے۔ اسی پس منظر میں اس شاعری نے وہ فکری و فنی قدریں ترتیب دی ہیں جو بین الاقوامی ادب کا ایک مثالی معیار پیش کرتی ہیں۔

ٹیگور کی شاعری اقبال کے مقابلے میں ٹھوس قدریں بہت کم رکھتی ہے۔ اتنی کم کہ اگر نوبل پرائز کی سیاسی سفارش نہیں ہوتی تو شاید اس مقابلے کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ٹیگور کا نغمہ صرف تھکے ہوئے ذہن کے لئے وقتی فرحت کا ایک سامان مہیا کرتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک متصوفانہ جذب کا حامل ہے، جب کہ اقبال کا نغمہ انسانی روح کے اندر وہ عرفان و انبساط پیدا کرتا ہے جس سے حیات کی تزئین و تنظیم کے ساتھ ساتھ کائنات کی تسخیر و تشکیل کا حوصلہ اور شعور بیدار ہوتا ہے۔ ٹیگور ہمارے ذہن کو سلاتے ہیں اور اقبال جگاتے ہیں۔ ٹیگور کا کلام کائنات کی حرکت کو ایک نقطے پر جامد دیکھنا چاہتا ہے اور زندگی کی الجھنوں سے گریزاں ہے، جب کہ اقبال کی شاعری ترقی پذیر وجود کا ساتھ دیتی اور الجھنوں کے حل میں اس کی رہ نمائی کرتی ہے۔ اقبال جدید ذہن کی پیچیدگیوں کو آئینہ دکھاتے ہیں، اس ترتیب کے ساتھ کہ قدیم ارتعاشات بھی جھلک اٹھتے ہیں، جب کہ ٹیگور صرف قدیم ذہن کا بہت ہی سادہ سا انعکاس کر پاتے ہیں۔ اقبال کے نقوش کلام میں جو وجاہت ہے ٹیگور اس سے بہرہ ور نہیں۔

اب عالمی سطح پر صرف تین شعرا ایسے ہیں جن کے ساتھ اقبال کا موازنہ کرنے سے ادبیات عالم میں اقبال کا مقام واضح ہو جائے گا۔ ایک اطالوی شاعر دانتے (۱۲۶۵ء - ۱۳۲۱ء) دوسرے انگریزی شاعر شیکسپیر (۱۵۶۴ء - ۱۶۱۶ء) تیسرے جرمن شاعر گیٹے (۱۷۴۹ء - ۱۸۳۲ء) یہ تینوں شعرا وہ ہیں جو نہ صرف مغربی ادبیات کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں، بلکہ اہل مغرب نے انہیں پوری دنیا کے بہترین و عظیم ترین شعرا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک ان تینوں کے درمیان ترتیب مدارج کا تعلق ہے اس میں اختلاف کیا جاتا ہے اور ٹھیک جس طرح عالمی سطح پر ان شعرا کی قدر افزائی میں یورپ والے بجائے اصولی و ادبی معیار کے ایک براعظمی و باہمی تعصب سے کام لیتے ہیں، اسی طرح براعظمی سطح پر ان کے درمیان ترتیب مدارج میں یورپ کے متعلقہ ممالک اور خطے قومی سیاست کی عصبیت اور علاقائی جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ بہرحال ہمیں اہل مغرب کی قومی و علاقائی سیاست و عصبیت سے کوئی مطلب نہیں۔ ہمارے مقصد کے مناسب بات یہی ہے کہ ہم نے گزشتہ سطور میں عالمی ادب کے آفاقی و اصولی معیار کی جو تعیین کی ہے اس کی روشنی میں اقبال کا موازنہ دانتے، شیکسپیر اور گیٹے کی شاعری سے کریں۔

تیرھویں، چودھویں صدی کی اطالوی میں دانتے نے جو شاعری کی کیا واقعی وہ شاعری کے اعتبار سے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی "ڈوائن کومیڈی" (طربیہ خداوندی) کے تخیل و تفکر کے لحاظ سے؟ کیا اطالوی زبان اور اس کی شاعرانہ روایت دانتے کے مفروضہ عظیم تخیل کی متحمل ہو سکتی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ دانتے کا فنی مسئلہ تو بہت معمولی تھا اس لئے کہ اپنے وقت اور اپنی ادبی و فکری روایات میں اس شاعر کو کسی خاص اور قابل ذکر پیچیدگی سے سابقہ درپیش نہیں تھا۔ لیکن لسانی وسائل کا ایک دشوار مسئلہ ضرور اس کے لئے سد راہ تھا۔ چنانچہ دانتے کے لئے شعری تجربے کی گنجائشیں بہت ہی محدود تھیں اور وہ شاعرانہ مہم کے طے کرنے میں بہت دور تک نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا دانتے کی

شاعری اپنی جگہ عظیم ہوتے ہوئے بھی لطافت، نفاست کے اس درجۂ کمال پر نہیں کہ آفاقی معیار سے اس کا موازنہ پورے طور پر اقبال کی شاعری کے ساتھ کیا جا سکے۔ ڈوائن کومیڈی ہی کی سطح پر جاوید نامہ ایک خالق تر تخلیق ہے۔

سولہویں سترھویں صدی کے انگریزی شاعر شیکسپئر سے اپنے تاثر کا اظہار اقبال نے اپنے ابتدائی دور کی ایک نظم "شیکسپئر" (بانگِ درا) میں کیا ہے اور اس کے حسنِ کلام کو "دلِ انسان" کا "آئینہ" بتایا ہے۔ لیکن پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کے اقبال کی شاعری شیکسپئر کی شاعری سے اسی طرح ایک درجہ آگے ہے جس طرح "پیرِ رومی" کی شاعری سے۔ بلاشبہ شیکسپئر کا خاص کارنامہ اس کے منظوم ڈرامے ہیں اور اس کے فن کا اصل جوہر انہی میں پوری طرح نمایاں ہوا ہے، جب کہ اقبال کے کلام میں اس صنفِ سخن کی کوئی اہمیت جاوید نامہ کی تمثیلی ہیئت اور بعض دوسری تمثیلی نظموں کے باوجود نہیں۔ لیکن ہم عالمی ادب کے آفاقی معیار کی تعیین کے سلسلے میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ محض ایک خاص ہیئت تقابلی مطالعے کا کوئی تنقیدی اصول نہیں بن سکتی۔ لہٰذا شیکسپئر اور اقبال کے موازنے میں کسی مخصوص ہیئت پر انحصار کرنے کے بجائے توجہ اس نکتے پر مرکوز کرنی پڑے گی کہ اعلیٰ شعریت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کیا نسبت قائم ہوتی ہے۔ شیکسپئر ڈراما نگاری کا یقیناً عظیم ترین ماہر ہے اور کردار نگاری میں اس کا جواب نہیں لیکن جوہرِ شاعری میں اقبال کا فن عظیم تر ہے۔ اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے میں ایک کسوٹی اہلِ نظر کے سامنے رکھتا ہوں۔ شیکسپئر کے ڈراموں سے شاعرانہ عناصر کو نکال کر یکجا کر دیا جائے۔ اس لئے کہ شاعری ڈرامے کا صرف ایک اسلوب ہے اور اس کی اصلیت ڈرامے کے ہیولے سے ماوراء ہے۔ اس کے بعد شیکسپئر کے سانیٹوں کو بھی ان شاعرانہ عناصر میں جوڑ کر، شیکسپئر کی صرف شعریت کا ایک مجموعہ تیار کر لیا جائے۔ اب اس مجموعے کا موازنہ اقبال کے تمام شاعرانہ عناصر کے مجموعے سے کیا جائے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس خالص شاعرانہ تقابل میں اقبال کا فن شیکسپئر سے عظیم تر ثابت ہوگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ شیکسپئر کے شاعرانہ عناصر کا حجم اور وزن اقبال کے عناصرِ شعری کے مقابلے میں بہت کم نکلے گا۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اگر مشہور انگریزی نقاد "میتھو آرنلڈ" کے مقولے "اعلیٰ سنجیدگی" کو معیار تسلیم کر کے، اقبال اور شیکسپئر کا موازنہ کیا جائے تو شیکسپئر کا سرمایۂ فن اقبال کے مقابلے میں اتنا قلیل ہوگا کہ دونوں کے درمیان تقابلی مطالعے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جا سکے گی۔

اٹھارہویں، انیسویں صدی کے جرمن شاعر، گیٹے، کا ذکر اقبال نے اپنے ابتدائی دور کی ایک نظم "مرزا غالب" (بانگِ درا) میں بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے علاوہ "پیامِ مشرق" کو گیٹے کے سلامِ مغرب کا جواب ہی کہا جاتا ہے۔ گیٹے کا سرمایۂ شاعری بھی وافر ہے اور شیکسپئر سے کچھ زیادہ ہے۔ بہرحال اگر گیٹے کی دوسری تخلیقات سے قطع نظر کر کے صرف اس کی شاعری پر توجہ مرکوز کی جائے تو اقبال کے مقابلے میں یہاں بھی معاملہ مجموعی طور پر وہی نظر آتا ہے جو شیکسپئر اور اقبال کے موازنے میں دیکھا جا چکا ہے۔ اقبال کے عناصرِ شاعری گیٹے سے زیادہ ہیں اور گیٹے کے جوہرِ شاعری میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اقبال کے یہاں بلند تر پیمانے پر نہیں پائی جاتی ہو، جب کہ علاوہ اقبال کی تمام اعلیٰ قدریں گیٹے کے یہاں پائی ہی نہیں جاتیں۔ رہی یہ بات کہ گیٹے کی شخصیت بڑی [illegible] ہمہ جہت اور قد آور تھی، تو ایشیا اس معاملے میں مغربی ادبیات کی کسی شخصیت کا پورے معنوں میں اقبال کے ساتھ موازنہ اگر ہو سکتا ہے تو وہ گیٹے ہی کی ایک شخصیت ہے۔ لیکن شخصیت کے لحاظ سے جو قد و قامت اقبال کا ہے۔ کیا گیٹے اس کے قریب بھی کہیں پھٹک سکتا ہے؟ اقبال کی شخصیت نے پورے دور کو پیامِ انقلاب دیا اور ان کے ذہن نے انسانی ارتقاء کے ایک نہایت نازک مرحلے پر عمیق ترین بصیرت کا ثبوت دیا، اور ان کی

فکر نے ایک وسیع الاثر تحریک کی رہنمائی کی، جب کہ گیٹے کے ذہن و فکر یورپی نظام اجتماعی کی روایتی حدود سے باہر نہیں نکل سکے۔ بجز ان شخصی ہنگاموں کے جو اس رومان زدہ شاعر نے معاشرتی اخلاق کی "زنجیروں" کو توڑ کر وقتاً فوقتاً بپا کیے۔ گیٹے کی شخصیت کا سفلہ پن اس کے مشہور ڈرامے "فاؤسٹ" کے واقعات و احساسات سے معلوم ہو جاتا ہے، خواہ اس کو اعتراف جرم کی ایک عبرت انگیز دستاویز ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ گیٹے کی شخصیت سالم نہیں تھی، اس کے احساسات منتشر تھے اور اس کے یہاں فنی معروضیت کا بھی کوئی مستقل معیار نہیں، جبکہ اقبال کی شخصیت کی سالمیت، جمعیت اور شاعرانہ معروضیت بالکل واضح ہے۔

دانتے، شیکسپیئر اور گیٹے پر اقبال کے شاعرانہ تفوق کے اسباب عالمی سطح سے مطالعہ کرنے کی صورت میں بہ آسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں نمایاں ترین تنقیدی نکات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اقبال کا انفرادی تجربہ ایک عظیم ترین فنی روایت کی بنیاد پر رونما ہوا۔ میں بتا چکا ہوں کہ اقبال کی شاعری مشرقی ادبیات کے بہترین عناصر کی جامع ہے۔ اس شاعری کو عربی، سنسکرت اور فارسی شاعروں کے صدیوں کے فنی تجربات ورثے میں ملے۔ اقبال سے پہلے مشرق کی ان کلاسکی زبانوں میں چند اہم ترین شعرا پیدا ہو چکے تھے، یہاں تک کہ اردو میں بھی کم از کم دو عظیم فن کاروں کی تخلیقات سامنے آ چکی تھیں۔ یہ بات دانتے، شیکسپیئر اور گیٹے کو اس پیمانے پر نصیب نہیں ہوئی تھی۔ دانتے تو گویا اطالوی میں پہلا اہم شاعر تھا۔ شیکسپیئر کے انگریزی متقدمین کے تجربات معمولی قسم کے تھے۔ یہی صورت حال جرمن میں گیٹے کو درپیش تھی۔ ان تینوں زبانوں میں مذکور تینوں شعرا کے پیشروؤں میں کسی ایسے شاعر کا نام نہیں لیا جا سکتا جو کسی تخلیقی عظمت کا حامل ہو۔ اطالوی اور انگریزی میں تو قصہ یہ ہے کہ دانتے اور شیکسپیئر تک ان زبانوں کی لسانی سلاست بھی مکمل نہیں ہوئی تھی اور ان کے اظہار و بیان کا ڈھانچہ زیر تشکیل تھا۔ ان فن کاروں کی استعمال کی ہوئی زبان میں متروکات کی کثرت اسی حقیقت کی دلیل ہے۔ جہاں تک ان مغربی زبانوں کے پس منظر میں یونانی اور لاطینی کی روایات کا تعلق ہے یہ بالکل واضح ہے کہ یورپ کی ان قدیم کلاسکی زبانوں میں شعری روایت کا وہ سرمایہ موجود نہیں جو عربی، فارسی اور سنسکرت میں ہے، خواہ دوسری اصناف ادب کی جو بھی ثروت ان کے اندر پائی جاتی ہو۔ اقبال سے پہلے عربی و فارسی شاعری کے وسائل بیان و اظہار کی بلاغت ان زبانوں کے صنائع و بدائع کے نہایت ترقی یافتہ نظام سے بھی عیاں ہے۔ مشرق کی کلاسیکی شاعری کی بالیدگی، پیچیدگی اور بلاغت و نفاست کا مقابلہ مغرب کی کلاسکی شاعری قطعاً نہیں کر سکتی۔

۲۔ تیرھویں صدی کے دانتے، سولھویں صدی کے شیکسپیئر اور اٹھارھویں صدی کے گیٹے کے مقابلے میں بیسویں صدی کے اقبال کے وسائل فن جتنے زیادہ تھے اتنے ہی وسائل فن بھی مہیا ہوئے۔ سائنس اور صنعت، سیاست اور معیشت کی ترقیات نے عصر حاضر کے ادب و شاعری کے سامنے جو مسائل کھڑے کر دیئے ہیں ان کا تصور بھی قبل کے ادوار میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ادبیات کی جو ترقیاں اقبال کے زمانے میں ہو چکی تھیں ان کا کوئی سراغ دانتے، شیکسپیئر، گیٹے کے زمانوں میں ظاہر ہے کہ نہیں ملتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بین الاقوامی ادب اور عالمی شاعری کا کوئی تخیل گیٹے، شیکسپیئر اور دانتے کے سامنے تھا ہی نہیں، یہ تو صرف اقبال ہی کو نصیب ہوا۔ چنانچہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں اقبال وہ تنہا شاعر ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اعلان کر کے ا[illegible] کو سامنے رکھ کر، ایک عالمی شاعری کا نمونہ مکمل تخلیق کیا۔ اس اعتبار سے فکر و فن، فلسفہ و شاعری دونوں میں اقبال نے مشرق و

مغربی تمام ہی ادبیات کی بہترین روایات اور عظیم ترین تجربات کو اپنی منفرد تخلیقات میں ترکیب دے کر ایک بہتر اور عظیم تر فن کاری کا ثبوت دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے شعر و ادب کو پیش آنے والے مشکل ترین مسائل کو اپنی فنی ریاضت اور فکری بو بخت کے بل پر موثر ترین وسائل شعری میں تبدیل کر دیا، اور اس طرح ادبی و شعری اظہار و بیان کے امکانات بے حد وسیع کر دیئے۔

جدید ترین احساسات اور دقیق ترین افکار کو نفیس ترین شاعری میں ڈھالنے کا جو کارنامہ اقبال نے انجام دیا ہے اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے انگریزی کے دو جدید شعرا ییٹس اور ایلیٹ کے ساتھ اقبال کا تقابلی مطالعہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ شعرا اقبال کے مقابلے میں کتنے کچے اور چھوٹے ہیں ییٹس تو دورِ جدید کے مسائل کی تاب ہی نہ لا سکا اور بالعموم اپنے وطن آئرلینڈ کے مرغ ناروں میں پناہ گیر رہا۔ چناں چہ اس کے فن پر حقیقی زندگی کی جو کچھ پرچھائیاں ہیں وہ سطحی اور مقامی سیاست تک محدود ہیں اور ان کی شعری قدر و قیمت بہت مشتبہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آفاقیت کی اس کی معدودے چند کوششیں بہت ہی مختصر اور ہلکی ہیں۔ دوسری طرف، ایلیٹ پر مسائل حیات بجلی بن کر گرے اور انہوں نے اس کے فن کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ چناں چہ اس کی شاعری اس کی مشہور ترین نظم کے عنوان کے مطابق ایک "خرابہ" ہے جس میں اس نے "تباہ شدہ ٹکڑوں کو فراہم" کرنے کی کوشش کی ہے اس معاملے میں ایلیٹ کی فنی الجھنوں کی انتہا یہ ہے کہ اپنی مذکورہ نظم کے اشارات کی ایک شرح اس کو لکھنی پڑی، اس کے باوجود یہ تخلیق اور اس کی دوسری تمام اہم تخلیقات ادب کے اکثر قارئین کے لئے "مسائل تصرف" ہیں جن کے اسرار و رموز سے لطف اہلِ ارادت ہی اپنی خوش عقیدگی کی بدولت لے سکتے ہیں ان دونوں کے برخلاف اقبال نے نہ صرف یہ کہ عصر حاضر کے تمام اہم اور بنیادی مسائل کو اپنی شاعری میں بالکل جذب کر لیا ہے، بلکہ ان سے وسائل فن بھی پیدا کئے ہیں۔ انہوں نے واقعات کو استعارات میں بدل دیا ہے اور حقائق کو علامات کی لطافت عطا کی ہے۔ تاریخ اقبال کی چابک دست فن کاری اور خلاق تخیل کے ہاتھوں تلمیح بن گئی ہے۔ انہوں نے زندگی کے ٹھوس عناصر کو اپنے فن کے رنگ و آہنگ میں ڈبو کر اساطیر بنا دیا ہے۔ اقبال کے کلام میں کائنات کی ہر ادا شاعرانہ تمثیل و ترنم کے ساتھ نقش پذیر ہوئی ہے۔ دورِ حاضر کے ادب و شاعری میں جامعیت کی کوشش ایلیٹ نے بھی کی، مگر اس کو شعریت کا روپ دینے میں کامیابی حاصل کی صرف اقبال نے اس کے علاوہ جس طرح اقبال کی شعریت بلند و لطیف ترین ہے اسی طرح ان کی جامعیت بھی بخلاف ایلیٹ کے، ہمہ گیر اور وسیع ترین ہے

اقبال کے پیشِ نظر شاعری کے ذریعے ایک نصب العین کی ترجمانی تھی۔ جب کہ دانتے، شیکسپیئر اور گیٹے کے سامنے اتنا سنجیدہ اور پیچیدہ کوئی تصور نہیں تھا۔ اس طرح بخلاف اپنے ہم صف دوسرے شعرا کے اقبال کے فن پر فکر کا دباؤ انتہائی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال کے باوجود، اقبال نے شاعرانہ ایمائیت کے جس کمال کا ثبوت دیا ہے وہ دنیا کے ادب میں ایک نادر اور بے نظیر واقعہ ہے بلا شبہ دانتے کے پاس بھی مسیحیت کا تصور تھا اور گوئٹے بھی کچھ افکار رکھتا تھا جن میں مسیحی قدریں بھی شامل تھیں، اور ان اقدار فکر کا سراغ شیکسپیئر کے تخیل میں بھی ملتا ہے، مگر نصب العین کی وہ محیط باضابطگی جو اقبال نے اسلامی نظریۂ کائنات اور نظام حیات کی صورت میں اختیار کی کسی دوسرے شاعر کے یہاں قطعاً نہیں پائی جاتی۔ عظیم ترین عالمی شعرا کی سطح سے ذرا نیچے اتر کر اگر ہم باضابطہ فکری و نظریاتی شاعری کا تجسس کریں تو ملٹن پر نگاہ پڑتی ہے، لیکن ملٹن کی شاعری شعریت کے اعتبار سے ایسی نہیں کہ اس کا موازنہ اقبال کے کلام کے ساتھ کیا جا سکے اس کے علاوہ مسیحی نصب العین کے باوصف، ملٹن کے تصور کی آفاقیت بہت ہی مشتبہ ہے، وہ عیسائیت کے اندرونی فرقہ وارانہ مناظروں

میں اس درجہ محو تھا کہ عالمِ انسانیت کو کوئی پیام دینے کے لئے اس کا ذہن فارغ نہیں تھا۔ چنانچہ ٹلسٹن کا مطمعِ نظر عالمِ مسیحیت سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کے برخلاف، مشرق اور ملّتِ اسلامیہ کے پس منظر کے باوجود، اقبال نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ ان کا مقصودِ نظر پوری انسانیت ہے اور اسلام کا اصولی تصور انہوں نے سراسر آفاقی سطح پر پیش کیا ہے۔ اسی لئے اقبال اسلام کو محض کسی ملت کے نسلی یا جغرافیائی مذہب کے طور پر نہیں، بلکہ ایک آفاقی فلسفے، ایک عالمی نظریے اور ایک انسانی دعوت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

"مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق"

بہر حال، اقبال نے زندگی کے ایک نصب العین کو شاعری کی حیثیت میں، اس کے تمام لوازم و عناصر کے ساتھ، نافذ کیا، اس طرح کہ نصب العین کی معمولی قطعیت شاعری کے تخلیقی عمل میں گرچہ برقرار رہی مگر اس نے ایک ایمائی پیرایہ اختیار کر لیا۔ یہ فکر اور فن کی مستقل بالذات ہستیوں کے درمیان ایک ازدواج کامل کی مثال تھی۔ یہ خلوصِ فن کا تخلیقی امتزاج تھا۔ اقبال کے متفکرانہ سوز اور شاعرانہ گداز نے مل کر ایک ایسی ہیئتِ اظہار اختیار کی جس کی کوئی نظیر عالمی ادب کی پوری تاریخ میں نمودار نہیں ہوئی ہے۔ اقبال کی شاعری درحقیقت مشرقی اور مغربی ادبیات کا، ایک آفاقی پیمانے پر، نقطۂ اتصال بھی ہے اور نقطۂ عروج بھی۔ شاید یہ واقعہ بیسویں صدی ہی میں رونما ہو سکتا تھا، اور اگر جدید تہذیب میں آفاقی نقطۂ نظر عمومی طور سے بروئے عمل آ جائے تو اب یہ واقعی ممکن ہے کہ پورے معنے میں عالمی ادب کی تخلیق ہو جس کی قدر و قیمت صحیح معنیٰ میں ایک بین الاقوامی معیارِ تنقید سے متعین کی جاسکے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

(اقبال)

"درِ دلکشا" کی تعارفی تقریب

صدارتی خطبہ، جسٹس انوار الحق

خواتین و حضرات! میرے لئے اس تقریب میں شرکت باعثِ مسرت و افتخار ہے۔
مسرت کی وجوہ تو کئی ہیں لیکن باعثِ فخر اس لئے کہ نہ میں شاعر، نہ ادیب، نہ نقاد ہاں ان حضرات کی کاوشوں کا مداح ہونے کا مجھے اعتراف ہے۔ میری ان کوتاہیوں کے باوصف مجھے اس فرض کے لئے منتخب کیا گیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض منظور الٰہی صاحب کی مروت و شفقت ہے، یا شاید وہ احترام اور لگاؤ جو میرے دل میں سالہا سال سے ان کے لئے اور ان کے خاندان کے متعدد افراد کے لئے رہا ہے لیکن یہ میری قیاس آرائی ہے۔ اصل وجہ تو منظور الٰہی ہی جانتے ہوں گے۔ لیکن جیسا کہ خود انہوں نے ایک مرتبہ اس مصرع کا سہارا لیا ہے:

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہو

میں اس قصے کو یہیں چھوڑتا ہوں۔

لیکن، خواتین و حضرات، یہ حقیقت ہے کہ اہلِ دانش اور اہلِ قلم حضرات کے اس تابناک اجتماع میں، اور خصوصاً ان تمام عالمانہ اور خیال افروز مقالوں اور تقاریر کے بعد جو آج اس محفل میں پڑھے گئے ہیں، میرے لئے یہ ایک نامناسب جسارت ہوگی کہ میں منظور کی کتاب کے محاسن پر کوئی تبصرہ کروں۔ ان کے اسلوبِ بیان کے متعلق کوئی رائے پیش کروں یا ان کے خیالات و جذبات کی گہرائی و پاکیزگی، ان کے احساسات کی شدت، ان کے تجربے کی وسعت و ارتقاء اور ان کی ذہنی، روحانی اور روحانی پروازوں کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ ان تمام پہلوؤں پر اردو ادب کے ماہرین اپنی آراء نہایت ہی دلپذیر اور مؤثر انداز میں پیش کر چکے ہیں۔ میں ان سے متفق ہوں کہ "درِ دلکشا" اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ تصور ہوگی۔ اسے سفرناموں میں جگہ دی جائے گی یا آپ بیتیوں میں۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے۔ بہرحال زندگی بھی تو ایک سفر ہے۔

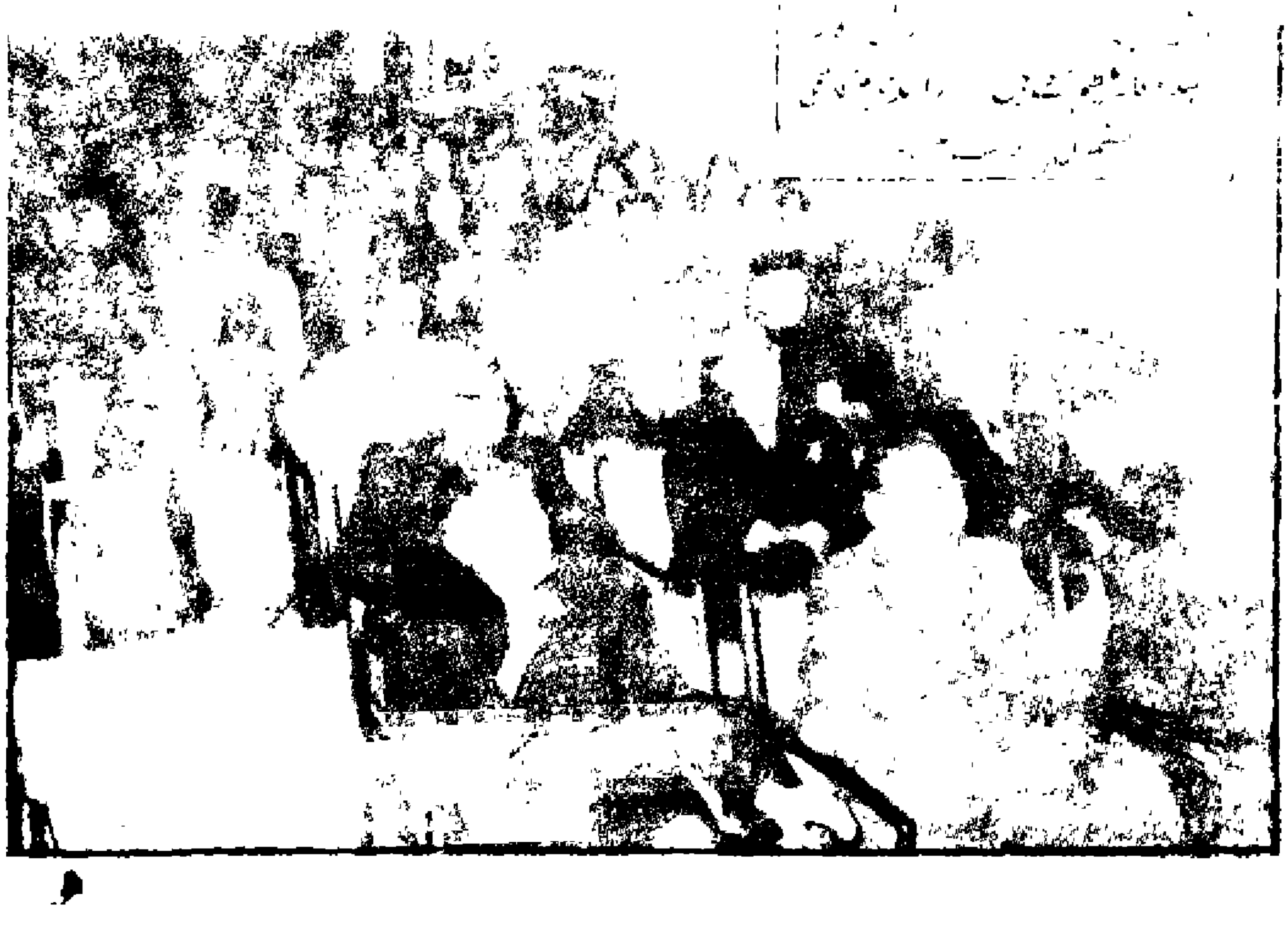
مجھے اپنی طرف سے محض چند غیر اہم اور شاید غیر متعلقہ باتوں کا اضافہ کرنا ہے۔

آج سے پینتیس سال پیشتر، جب میں نے پرانی انڈین سول سروس میں شمولیت کی، تو اکثر یہ اعتراض سننے میں آتا تھا کہ اس سروس کے ارکان نہ تو انڈین ہیں، نہ سول (یعنی خوش اخلاق) اور نہ سرونٹ (یعنی خادم) جو ارکان شکل و صورت سے بظاہر ہندوستانی نظر آتے تھے، انہیں نفرت یا حقارت سے "کالے صاحب" کے لقب سے نوازا جاتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے گئے لیکن اس ملک کے اور بہت سے لوگوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سول سروس پر اعتراضات جاری رہے۔ آج اس محفل میں کوئی موقع محل نہیں کہ ان وجوہات کا تجزیہ کیا جائے جن کے باعث یہ تاثر پاکستان کے قیام کے بعد بھی کئی حلقوں میں بدستور قائم رہا۔ بلکہ تقویت پکڑتا گیا، حتیٰ کہ وہ دن بھی آیا کہ حکومت نے سی۔ ایس۔ پی کو ہی ختم کر دیا، کہا جاتا ہے کہ اس انجام پر سوائے سی۔ ایس۔ پی حضرات اور ان کی بیگمات کے کسی نے بھی آنسو نہیں بہائے۔







منظور الٰہی نے خاکی وردی اتارنے کے بعد کم و بیش پچیس تیس برس اس سروس کے رکن کی حیثیت سے ملک و ملت کی تعمیر یا تخریب میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ملک کے مختلف صوبوں میں بے شمار اہم اور ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ اور ان تمام مراحل سے گذرے، ان تمام محرکات و عوامل سے دوچار ہوئے، جو روح کی بالیدگی اور ارتقا میں حائل ہوتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کو پست و پامال کرتے ہیں۔ ذہن میں رعونت اور تکبر، دل میں اقتدار و اختیارات کا احساس اور نشہ پیدا کر کے اپنے ہی ہم وطنوں کے لئے احترامِ آدمیت کے جذبے کو مجروح کرتے ہیں۔

لیکن حیرت ہے، بلکہ آفرین ہے اس مردِ مومن پر کہ ان حالات و تجربات سے گزرتے ہوئے بھی اس نے اپنی انسانیت، شرافت، انکساری، دیانت اور جذبات و عمل کی پاکیزگی کو برقرار رکھا۔ اختیارات و اقتدار کو خدمتِ خلق کا محض ایک ذریعہ سمجھا۔ اور حتی المقدور نادار، بے کس اور بے وسیلہ افراد کی امداد کو اپنا شیوہ بنایا۔ بلکہ اپنے زیرِ نگرانی انتظامیہ کو انصاف اور اصولوں کی راہ پر چلانے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ ان مقاصد کے حصول میں منظور صاحب کو اکثر مشکلات کا سامنا بھی ہوا۔ بااثر حضرات کی مخالفت بھی مول لینا پڑی۔ لیکن وہ اپنے اصولوں پر قائم رہے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں بھی رہے، ایک شریف النفس اور انصاف پسند افسر کے نام سے یاد کیے گئے۔ ان کے طریقہ کار اور حسنِ سلوک کا یہ ایک لازمی نتیجہ تھا کہ جلد ہی انھیں اپنے ہمعصروں میں احترام کا ایک خاص مقام حاصل ہو گیا۔ اور ہم میں سے جنھیں قریب سے منظور الٰہی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے دل میں منظور کے لئے احترام کے ساتھ محبت بھی شریک ہو گئی۔

اب جو مجھے منظور صاحب کی تازہ تصنیف دیکھنے کا موقع ملا۔ تو عجیب الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ آخر کار سول سروس کے ہی ایک مردِ مجاہد، جناب رستم کیانی مرحوم کی ایک حکایت یا ہدایت سے رہنمائی ملی اور یہ الجھن دور ہوئی۔ آپ بھی اس کی تفصیل سن لیجئے۔

غالباً ۱۹۶۰ کا ذکر ہے۔ سول سروس کے ایک بزرگ رکن کو مغربی پاکستان کی گورنری سے تبدیل کر کے وفاقی وزیر مقرر کیا گیا۔ چند نوجوان اور جونیئر افسر، جو ابھی تک اپنے ذاتی مسائل میں گھرے تھے، اس تبادلے سے بحث میں پڑ گئے لیکن یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ یہ ترقی تھی یا تنزلی، چنانچہ انہوں نے سول سروس ایسوسی ایشن کے صدر، جو اس وقت مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی تھے، کی طرف رجوع کیا۔ حسنِ اتفاق سے میں بھی اس وقت ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ نوجوان افسروں کی مشکل اور الجھن کی روئداد سن کر کیانی صاحب اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے، اور کہا کہ براہِ راست تو میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ البتہ اپنے گاؤں کے دو دوستوں کا قصہ سنا دیتا ہوں۔ شاید آپ کے لئے مفید ثابت ہو۔ دقیق مسائل کو سلجھانے کا کیانی مرحوم کا یہی انداز تھا!

کہنے لگے کہ دو نوجوان تھے، ان پڑھ اور جاہل، لیکن نیک اور مذہب کی طرف مائل۔ ایک کا نام تھا دوست علی، اور دوسرے کا علی دوست۔ گاؤں کے ملا کی زیرِ تربیت ان کا یہ پختہ ایمان تھا کہ حضرت علیؓ دنیا کی سب سے عظیم ہستی ہیں۔ لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک دن کوہاٹ سے ایک شہری مولوی گاؤں میں وعظ کے لئے آیا، اور اس نے شد و مد سے بیان کیا کہ رسول اللہؐ عظیم ترین انسان تھے اور حضرت علیؓ ان کے دستِ راست اور فدائی۔ ملا تو چلا گیا، لیکن دونوں دوستوں کو ایک ذہنی الجھن میں پھنسا گیا۔ وہ دن رات بحث کرتے اور جھگڑتے۔

ابھی یہ جھگڑا جاری تھا کہ پشاور سے ایک بڑا مولوی بھی گاؤں میں آ دھمکا۔ اس نے ایک نیا شوشہ چھوڑا، کہنے لگا اللہ تعالیٰ سب کائنات کا خالق ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ اور ان کے بعد حضرت علیؓ کا رتبہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نئی صورتِ حال سے سادہ لوح دوستوں کی پریشانی اور الجھن میں ناقابلِ برداشت حد تک اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ وہ کیانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن کا معمول تھا کہ تعطیلات کا اکثر و بیشتر حصہ اپنے گاؤں میں گزارتے۔ نوجوان دوستوں نے عرض کی ہماری رہنمائی فرمائیں ورنہ ہمارے جھگڑے کی نوبت

قتل تک پہنچے گی، آخر مذہب کا معاملہ ہے!

کیانی صاحب کہنے لگے کہ میں نے دیکھا دونوں صالح لیکن ناپختہ نوجوان ہیں۔ گاؤں کے مُلّا نے ان کے دلوں کی وسعت کو محدود کر دیا ہے۔ میں نے کہا حضرت علیؓ کی عظمت کو تو تم دونوں مانتے ہی ہو، اللہ اور رسولؐ کو بھی مانو اور اس جھگڑے میں نہ پڑو کہ ان تینوں میں سے کون کس سے بڑا ہے۔ تینوں تم سے یقیناً بڑے ہیں۔ وقت آنے پر تم ان کے درجات بھی سمجھ جاؤ گے۔

کہانی ختم کرتے ہوئے کیانی صاحب جونیئر افسروں سے مخاطب ہوئے "تم سب سے صوبائی گورنر اور وفاقی وزیر دونوں بڑے ہیں۔ تم اس جھگڑے میں کیوں پڑتے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔"

میں نہیں کہہ سکتا کہ نوجوان افسر اس جواب سے کہاں تک مطمئن ہوئے۔ بلکہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ کیانی صاحب کے گاؤں میں پیش آیا بھی، یا انہوں نے فی البدیہہ نکتہ سمجھانے کے لئے وضع کر لیا۔ لیکن آج مجھے اس جواب سے ضرور اطمینان ہوا ہے۔

سول سروس کے رُکن کی حیثیت سے تو میں منظور الٰہی کی شرافت اور عظمت کا قائل برسوں سے تھا، در دلکشا" کے مطالعے کے بعد یہ سوال ذہن میں ابھرا کہ کیا منظور بطور مفکر و ادیب زیادہ عظیم نہیں؟ کیا اس کے لطیف جذبات و احساسات، اس کا تبحر، سلیس اور جاذب اسلوب بیان اس کی منظر نگاری اس کی انسان دوستی، اُردو زبان اور نثر پر اس کی قدرت، اِس بات کی نشاندہی نہیں کرتی کہ آئندہ چل کر منظور کا نام بطور ادیب و مصنف زیادہ مقبول و مشہور ہوگا۔ اور لوگ ان کے انتظامی کارناموں کو ثانوی حیثیت دینے لگیں گے؟

جب سے دوست علی اور علی دوست کا قصہ یاد آیا ہے، میرے ذہن نے ان سوالوں پر بحث بند کر دی ہے۔ کیوں کہ دونوں حیثیتوں سے منظور عظیم ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ اسے ایک انتظامیہ افسر کی حیثیت سے سراہیں یا ایک ادیب و مصنف کا مقام دیں۔

آخر میں مجھے ایک اور بات کہنے کی اجازت دیجئے۔ منظور کی سرشت و ذہنی ارتقا میں جن عناصر نے نمایاں کردار ادا کیا ہے ان کی جھلک ان کی عملی زندگی، خیالات اور تحریروں میں صاف عیاں ہے۔ موزوں اور صالح والدین کا انتخاب تو ہمارے بس میں نہیں لیکن علامہ اقبال کی تعلیمات سے افادہ تحریکِ پاکستان کے محرکات کا مطالعہ اور اللہ اور رسولؐ کے احکامات کی پابندی تو کافی حد تک انفرادی اور اجتماعی کوشش سے ہماری مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔

اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر وہ شخص جو ان تجربات سے گزر رہا ہے اور انھیں بیان کرنے پر قادر ہے۔ بُخل یا کوتاہی سے کام نہ لے۔ اور اپنے مشاہدات و احساسات سے نئی پود کو روشناس کرائے۔ یہ درست ہے کہ بدلتے ہوئے حالات اور نظریات کے تقاضے بھی نئے اور مختلف ہوتے ہیں اور پھر "جنریشن گیپ" (GENERATION GAP) کا مسئلہ بھی ہے لیکن ان تغیرات کے باوجود انسانی زندگی اور مسائل میں ایک لافانی تسلسل بھی ہے جس کے باعث گزرے ہوئے واقعات اور ان سے متاثرہ افراد کا ردِعمل اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور اہلِ بصیرت کے لئے سچائی اور انصاف کے اصولوں پر چلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ منظور الٰہی صاحب اب اپنی صلاحیتیں اپنے طویل عرصہ ملازمت کے تجربات و مشاہدات کو بھی اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کے لئے بروئے کار لائیں گے اور جلد ہی ایک اور تعارفی تقریب کا اعلان کریں گے۔

خواتین و حضرات! امید ہے آپ سب مجھ سے متفق ہوں گے اگر میں یہ کہوں کہ آج کی محفل واقعی نہایت پُر مغز اور پُرلطف رہی۔ میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس کو رونق بخشی۔

درِ دلکشا

پروفیسر مرزا محمد منوّر

کتاب کھولیں تو ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؔ کا مشہور اور بھرپور شعر استقبال کرتا ہے اور کتاب کا نام بہ تسمیہ باوقار انداز میں سمجھا دیتا ہے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ای در دل کشا بچمن در آ

ورق الٹیں تو حضرتِ علامہ اقبالؔ کا پر انداز اور بے نیاز شعر سلام پیش کرتا ہے ؎

دل بکسے نباختہ، با دو جہاں نساختہ!!
من بحضور تو رسم روز شمار ایں چنیں

گویا دونوں شعروں کا استقبال اور سلام ان کے سلام اور استقبال کا سا ہے۔ جو سیدھے بھی جاتے ہیں اور دل بھی دہلا دیں —— یہ دونوں شعر انتباہ ہیں اور صاحب کتاب کے باب میں کڑی آگاہی بخشتے ہیں۔ وہ یہ کہ صاحب کتاب کی دنیا وہی نہیں جو خارج میں جلوہ گر ہے بلکہ ایسی ہی یا اس سے بھی حسین تر اور دلآویز تر دنیا اس کے سینے میں آباد ہے، نیز یہ کہ صاحب کتاب دنیا کے حساب میں الجھنے والا نہیں۔ مزید یہ کہ غم کا تحمل بھی کرے گا۔ خوشی بھی سہ جائے گا، عموماً دو جہ ہونے کے باوصف اس کا مادی رجحان اپنے عقیدے کے مرکز ہی کی جانب ہی رہے گا۔ ظاہر ہے ایسا شخص سیرگاہ کو شبستاں نہیں جان سکتا، ایسا شخص خدانخواستہ عاشق بھی ہو جائے تو اس کا عشق بالعموم سینے کے اندر ہی تپتا اور سینے کے اندر ہی جلتا ہے۔ اس چراغ کی لو باہر تشریف لائے کو وضعداری کے خلاف جانتی ہے یعنی صاحب کتاب کا نیاز بھی رکھ رکھاؤ اور وضع احتیاط سے بے نیاز نہ ہوگا۔

آگے کتاب کا متن شروع ہوتا ہے۔ عنوان ہے "عذر گناہ" یہاں نظیری نیشاپوری کا ایک شعر کسی بارعب حاجب دربار کا فرض ادا کر رہا ہے ؎

بزم خاص است ز در ونقطہ بدستور بیار!
معنی دور طلب کن، سخن دور بیار

صاحب درِ دلکشا، شیخ منظور الٰہی فرمائیں گے کہ یہ انتباہ انہوں نے اپنی ذات کو کیا تھا۔ یہ انتباہ دوسروں کے لئے نہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کا مضمون بہرحال موجود ہے۔ اور پھر یہ کہ جو شخص اپنے آپ کو انتباہ کرنے کا عادی ہو اس سے ہر دم متنبہ رہنا چاہیے ——

ہاں یہ بزم خاص ہے۔ یہاں علم و تحقیق، اور دانش و ذوق کے منار جلوہ بار ہیں۔ مجھ میں ہمت نہ تھی۔ شیخ صاحب کے حکم کی تعمیل میں چلا آیا۔ ورنہ اس محفل میں آکر کچھ عرض کرنے کی ہامی بھرنا پہاڑ کا سر پہ اٹھانا ہے یہ تو وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ والا معاملہ ہے

امابعد — میں نے ان تین اشعار کے انتباہ کے باوصف درِ دلکشا کو عام سفرناموں مضمونوں یا افسانوں کی طرح پڑھنا شروع کر دیا، چند ورق نکل گئے، احساس ہوا، نہیں بھائی، یہ عبارت اس طرح پڑھنے کی نہیں، یہاں تیرنا نہیں ڈوبنا ہوگا، یہ مطالعہ تفریح تو ہے ٹھہر ٹھہر کر کھاؤ اور ٹھہر ٹھہر کے ساتھ، حضرت وحشتؔ کلکتوی مرحوم کے بقول ؎

یہ نہ ہے شیخ جی اک سانس میں اسکو نہیں پیتے حضور آہستہ آہستہ، جناب آہستہ آہستہ

اور جب غور سے پڑھنا شروع کیا تو پہلی سطریں ہی خانۂ تحیر میں کھو گیا — سن لیجئے:-

"وقت اور حادثات ہماری شخصیت پر تعمیری اور تخریبی تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ہر لحظہ ہم کچھ کھوتے کچھ پاتے ہیں۔ لیکن جبلی طور پر بھی ہم بدل جاتے ہیں؛ شاید کہا جا سکے کہ ایک اہم حادثہ ہو جانے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے ...... وقت گزر جاتا ہے یا ہم خود گزر جاتے ہیں؟ — وہ شخص جسے میں جانتا تھا غبارِ کارواں میں کھو گیا، پھر اس خاک سے اک اور ہستی نے جنم لیا جو مجھ سے مکمل طور پر مختلف تھی۔ جیسے کوئی اجنبی ہو —"

ان سطور کو ایک سے زیادہ بار پڑھا — خاص طور پر یہ جملے "شاید یہ کہا جا سکے کہ ایک اہم حادثہ ہو جانے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے — وقت گزر جاتا ہے یا ہم خود گزر جاتے ہیں؟ — کتاب ہاتھ میں رہی اور رشتۂ خیال ہاتھ سے نکل گیا۔ کبھی حضرت علامہ کی Reconstruction کے یہ الفاظ لوحِ ذہن پر ابھرے:

we become by ceasing to be what we are — Life is a passage through a series of deaths —

اور کبھی ولیم جیمز کے کلمات جو ان کے مضمون Energies of Men کا حصہ ہیں ذہن کے صفحے پر مرتسم نظر آئے:

Religious crisis, love crisis, indignation crisis may awake in a very short time powers similar to those reached by years of patient Yoga-practice

آپ نے دیکھا کہ "درِ دلکشا" کے لفظاً سادہ فقرے معناً کتنے پُرکار اور خیال انگیز ہیں — تلقین یہ ہے کہ دل کا دروازہ کھولو اور کھلا رکھو جب بات بنے گی — آنکھوں سے بھی پڑھو، دل سے بھی، حق یہ ہے کہ میرا بڑا وقت صرف ہوا، تجسس اور سوچ کا نکھرا ہوا بھولا بھلا انداز کتاب کا عمومی مزاج ہے — چند سطریں دیکھئے:

"آرزو سے تہی دامن زندگی تسکینِ قلب کا باعث نہ ہوئی، ہو تی بھی کیسے، کسی خلش کے بغیر زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔" صفحہ ۱۸

"مسلسل رفاقت رُومان کا رنگ روغن لوٹ لیتی ہے۔" صفحہ ۱۵

"اے لمحۂ گریزاں ساکت ہو جا، مجھے اس مرقع کو اپنی ذات میں سمونے دے ازلی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے دے۔" صفحہ ۹

"قوسِ قزح ہو کہ انسانی مسرت اسے مقید کر لینا انسان کے بس کی بات نہیں۔" صفحہ ۱۰۲

" سمندری گرنش والی عورت ابھی خواب خرگوش میں تھی۔ نیند کی وجہ سے وہ خوب صورت مناظر سے محروم رہی۔ زندگی کا بھی یہی حال ہے ہم سوتے رہتے ہیں اور احساس زیاں تک نہیں ہوتا۔" صفحہ ۵۰

مطالعہ کتاب کے دوران میں جس چیز نے سب سے زیادہ مجھے متاثر کیا وہ صاحب کتاب کی قدرتِ اظہار ہے۔ نازک سے نازک منظر کو بھی اسی طرح پوری مہارت اور کامل اعتماد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس طرح کسی نفسیاتی اور جذباتی کیفیت کی نزاکت کو۔ وسعت ذخیرۂ الفاظ کی فراوانی اور طبیعت کی لطافت کے میسر نہیں آتا — پھر ذخیرۂ الفاظ وسعت مطالعہ بھی چاہتا ہے ذوق جستجو بھی اور ذہنی انہماک بھی — ورنہ بات نہیں بنتی۔ اپنا عالم تو یہ ہے کہ کوئی رنگ دیکھا یا آہنگ، پسند کیا بلکہ مسحور ہوئے اور جب چاہا کہ اس کیفیت کو قلمبند کر دیں تو عاجز۔ الفاظ نہیں ملتے — کبھی کہتے ہیں واہ اور ہائے ہیپ، کبھی کہتے ہیں سبحان اللہ اور بس۔ زبان بیان گنگ، لوت گویائی بھی دیدۂ حیراں — مثلاً مسجد قرطبہ کی توصیف کا ایک ننھا سا جزو ملاحظہ ہو وہی مسجد قرطبہ جس کے باب میں حضرت علامہ نے فرمایا تھا ؎

کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں!
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

یعنی مسجد قرطبہ کا جواب باہر نہیں۔ مومن کے قلب میں ہے — ہاں تو شیخ منظور الٰہی صاحب کی قدرت بیان ملاحظہ ہو۔

" سنگِ یشب، سنگِ موسیٰ، سنگ سرخ کے ستونوں کی طویل روشیں گھنے سایوں میں کھو جاتی ہیں۔ چار سو ایک حسین جھٹپٹا ہے۔ انجانے گوشوں سے چھنتی ہوئی روشنی منظر کو لطیف نورانی چادر اوڑھا دیتی ہے۔ ستونوں سے ابھرتی ہوئی دوسری محرابیں چھت کو سہارا دیئے ہیں۔ محرابوں پر قرمزی اور پیلی دھاریوں کی وہ فراوانی ہے کہ نظر پھسلتی چلی جاتی ہے اور ایک نکتے پر ٹھہرنے نہیں پاتی۔ اس سے عمق کا دلکش تاثر ملتا ہے۔" صفحہ ۲۶

اب الحمرا کے ایک ایوان کی تصویر کشی دیکھئے:

" سنہرے پھول کی طرح کھلتا ہوا۔ ہوادار گنبد جیسے بادل ساکت ہو جائیں یا رنگ یلغار کر آئیں — اور اوپر سنہری چھتری تن جائے۔ صحن جا میں کھجور کی شاخ ایسی سبک قوسیں ستونوں سے ابھر کر خیرہ کن رعنائی کا منظر پیش کرتی ہیں — دیوار پر سنہرا کام جیسے سورج کی شعاعیں طلاکاری میں ڈھل جائیں یا پتھر پر کروشیا اور سوزن کا باریک نمونہ —" صفحہ ۳۸

چند سطروں کے بعد الحمرا ہی کے ضمن میں لکھتے ہیں:

" الحمرا کے معمار عرب خیمے سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے ہوادار اور لطیف خیمہ گاڑنے کے لئے نیزوں کی بجائے ترشے ہوئے نازک ستون — وہ سنگ مرمر تراشتے رہے حتیٰ کہ ستون پھول کے شاخچے کی طرح نازک ہو گئے، شجر کی جگہ دیوار پر زر دوزی، ہم آہنگ رنگوں سے ہر چیز فضا میں تیرتی معلوم ہوتی ہے۔" صفحہ ۳۸

شیخ صاحب نے قرطبہ اور الحمرا کی سیر کرتے کرتے حضرت علامہ کی طرح حال کو ماضی سے پیوست کر دیا ہے یعنی وہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آمد، قیام، ترقی، علم پروری اور ہنر نوازی کی داستان کے چند ورق بھی الٹتے ہیں۔ وہ اوراق جو شوکت کے داستان سرا اور عبرت کے مورخ ہیں۔ شوکت مٹ گئی، عبرت باقی رہ گئی، شیخ صاحب خود بھی اداس ہو جاتے ہیں قاری کو بھی اداس کر دیتے ہیں۔ اور میں حضرت علامہ کے اشعار گنگنانے لگتا ہوں ؎

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے ۔۔۔ مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں!
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں ۔۔۔ خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں!
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن! ۔۔۔ تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

مگر بات ہو رہی تھی دیدِ دلکشا کے مصنف کے قادر اظہار ہونے کی۔ سوئٹزر لینڈ کے ایک منظر کی تصویر اور تاثیر ملاحظہ ہو۔

"دلکشی کے باوجود برف باری کا منظر افسردگی کا پہلو لئے تھا۔ شاید ہر خوبصورت منظر میں افسردگی کا شائبہ ضرور رہتا ہے ۔۔۔ دھنکی ہوئی روئی ایسے گالے ہماری جد و جہد سے بے خبر۔ ہمارے رنج و غم سے بے خبر دھیرے دھیرے زمین کی طرف آ رہے تھے جیسے فضا میں معلق ہوں۔ کوئی جلدی نہ ہو۔ ٹہنیاں پتوں سے یکسر عاری تھیں لیکن عریاں نہیں۔ برف کی دبیز تہ ان پر جم گئی تھی۔" صفحہ ۶۶

منظر سے اثر پذیری کی تاثیر کا نفاست ترجمان بیان دیکھیے:

"سر سبز ڈھلوانوں پر گھروندے یوں رکھے تھے جیسے لڑھک جائیں گے۔ درختوں کے جھنڈ میں گھری تنہا کاٹیج اپنی سندرتا میں گم تھی۔" صفحہ ۶۱

"اب سُود کی آنکھوں میں حسرت و درماندگی کی نمود تھی جیسے آغازِ خزاں میں سبز پتیوں پر زردی کی پہلی دھاری کھنڈ جائے۔" صفحہ ۶۱

"میکا ئیتھر کی صحت اچھی نہیں تھی۔ اس کے چہرے اور اعصاب پر تند جذباتی تجربوں کا اثر نمایاں تھا۔" صفحہ ۷۴

یہ آخری فقرہ کتنا لطیف اور کیسا غماز ہے۔ کیا اگر شیخ صاحب اس مفہوم کو "جوں کا توں" لکھ دیتے تو بیان زیادہ پُر اثر ہو جاتا؟ ع

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائیست

برہنہ نویسوں کو غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ خود برہنہ ہیں یا ان میں مضامین کے لئے مناسب الفاظ کی قبائیں تیار کرنے کی اہلیت نہیں! ۔۔۔

بہرحال کتاب کا سوانح کے بعد حاوی حصہ سیر ہے۔ ملک ملک کی سیر تمام کائنات اللہ کی کتاب بسیط ہے اور ہر مسلمان کو "سیروا فی الارض" کا فریضہ بقدر ہمت ادا کرنا چاہیے۔ اگر وہ مشاہدۂ کائنات کرتا ہے اور آنکھ کھول کر کرتا ہے تو سیر کا ہر لمحہ عبادت ہے۔ اس لئے کہ وہ نقش اور نقاش، قدرت اور قادر کے رشتے کا مطالعہ ہے ۔۔۔ پھر اپنا مقام بھی پہچانتا ہے اور اپنے خالق کا بھی ۔۔۔

مگر حق یہ ہے کہ کائنات کو جاننے کے لئے اور اس کے عجائبات کو پہچاننے کے لئے بھی جیسے اپنے اندر کوئی حوالہ موجود ہونا چاہیے اسی حوالے سے بات سمجھ میں آئے گی ورنہ نظر تیرتی ہوئی گزر جائے گی یہ سارے مناظر ۔۔۔ ملک ملک کے مناظر ۔۔۔ ہزاروں آدمی ہر روز دیکھتے ہیں مگر ہر ایک کے اندر ایسی اخاذ قوت نہیں ہوتی جو اپنی خاص شناخت اور اپنے معین رد عمل کی۔ روشنی میں اشیاء سے تاثیر پذیر

ہو اور پھر اس آئینہ تفصیل ہے — تفسیر باہر کے منظر کی باہر ہی باہر نہیں ہو جاتی پہلے وہ منظر دل میں نقش ہوتا ہے پھر باہر نکلتا ہے۔ اگر دل اس اہمیت سے خالی ہے تو باہر کچھ بھی نہیں۔ حضرت بیدل نے کیا خوب کہا ہے ؎

بہ جیب تست اگر خلوتے و انجمنے ست!
برون خویش کجا میروی جہاں خالیست

تکنا اور بات ہے۔ دیکھنا اور بات ہے۔ تکنا آنکھوں کے بے توجہ کھلے رہنے کا عمل ہے، دیکھنا توجہ کا طالب ہے۔ یہ دیکھنا یا PERCEPTION انفرادی بھی ہے اور ہر دیکھنے والے کے اندرونی حوالے کے مطابق اہم بھی ہے اور غیر اہم بھی — مولانا روم فرماتے ہیں ؎

طالب ہر چیز اے یار رشید   جز ہماں چیزے کہ می جوید نمید

صاحب "درِ دلکشا" کے بھی کچھ حوالے ہیں اور ان حوالوں کا بھی کوئی مرکزی حوالہ ہے — کتاب کے آغاز ہی میں یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ شیخ صاحب کی پرورش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو بڑا مذہبی گھرانہ تھا۔ جہاں بزرگوں کے دل اسلام کی محبت سے سرشار تھے اور وہ بزرگ از روئے عمل اپنے عقیدے کی محبت کا مجسمہ تھے۔ ملت اسلامیہ کی بہبود کے لئے وہ لوگ سرگرم کار رہتے تھے خصوصاً صاحب کتاب کے والد بزرگوار شیخ محبوب الٰہی صاحب۔ جو ہماری مرکزیہ مجلسِ اقبال کے جملہ ارکان کے مہربان بجاجان تھے — اُن بزرگ کی یاد میں لکھا ہوا "درِ دلکشا" کا مضمون "غروبِ عظمت" اس امر پر شاہد عادل ہے — ایسے ماحول میں پلنے والا شخص جہاں دین کو منافقت اور اخلاق کو تظاہر سے سروکار نہ ہو عموماً اپنے عقائد کے معاملے میں کچا نہیں ہوتا — چنانچہ اسلام، ملت۔ پاکستان اور پاکستان سے وابستہ جذبات ہمیں اس سیر میں بار بار جلوہ دکھاتے ہیں، صاحب کتاب کو دکھ ہے کہ اہلِ پاکستان اور خصوصاً نئی پود تحریک پاکستان کی فکری اساس کے شعور سے محروم ہو گئی ہے شیخ صاحب کو فلسطین، الجیریا، شرقِ اوسط وغیرہ کے مسلمانوں کی کیفیت سے بھی بھرپور دلچسپی ہے — ویسی ہی جیسی کسی بھی صاحب یقین مسلمان کو ہو سکتی ہے — شیخ صاحب یورپ، امریکہ، جاپان کے مختلف علاقوں اور شہروں کی سیر کرتے کرتے اپنے مرکز سے غافل نہیں ہو جاتے۔

پاکستان تو کہیں بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ انھیں ووشے میں مری کا خیال آتا ہے، سوئٹزرلینڈ کے ذکر میں مظفر آباد اور اسلام آباد کا رنگ بھر جاتا ہے۔ پورٹوریکو کے جزیرے میں مشرقی پاکستان کی یاد ستانے لگتی ہے۔ گجرات کے کسانوں کی ہمت اور نواحِ پشاور۔ ثمر فروش باغبانوں کی مثبت اہمیت کا دھیان آتا ہے۔ انھیں بھرپور یقین ہے کہ ان کی قوم کے افراد جوہر کی رُو سے اور پنہاں امکانات کے اعتبار سے دنیا کی کسی قوم سے کم نہیں، لہٰذا وہ صورت حالات کے باعث اداس تو ہو جاتے ہیں مایوس نہیں ہوتے — کوئی مومن مایوس ہوتا بھی کب ہے؟

سونار دیشں پر لکھا ہوا مضمون تصویر کشی، حسن بیان اور تاثیر کے لحاظ سے کسی بھی دوسرے مضمون سے کم نہیں الٹا کچھ زیادہ ہی دلجو ہے اس لئے کہ مشرقی پاکستان گویا وطن تھا — تھا ہی کیوں۔ قائدِ اعظم کے فرزندوں کے لئے وہ اب بھی اسی طرح مشرقی پاکستان ہے۔ ان کی طبیعت کا تجسس ہر ملک اور ہر علاقے میں اس بات کے درپے رہتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کے اجتماعی شعور سے آگاہ ہو۔ چنانچہ وہ ہر مقام پر کسی مرد یا کسی خاتون کو تقریب کے لئے ڈھونڈ لیتے ہیں۔

تبصرے

لکھنے والوں کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض لوگ اپنے لیے لکھتے ہیں، بعض محض علم کے لیے اور بعض دوسروں کے لیے!
یوں تو ہر علم و ادب کا کوئی نہ کوئی قاری ہوتا ہے اور اس طرح ہر عالم اور ادیب کسی نہ کسی سطح پر دوسروں کے لئے لکھ رہا ہوتا ہے۔ لیکن بعض بے غرض ادیب اور مصنف ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا مقصد افادہ ہوتا ہے۔ اپنی ذات کا . . . . یعنی اپنے اظہار علم یا ادعائے علم کا کوئی شائبہ درمیان میں نہیں ہوتا۔ وہ کچھ چاہتے ہیں تو یہی کہ علم کا ہر جوئندہ ان کی کاوش سے مستفید ہو۔

پروفیسر سلیم اختر نے جو دو کتابیں لکھی ہیں . . . . . (۱) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اور (۲) تنقیدی دبستان . . . ان کا مطمح نظر بھی یہی ہے۔ ان کتابوں کے ذریعے انہوں نے متعلقہ علم کو طالبان علم کے ہر طبقے تک پہنچانے کی کوشش کی ہے . . . . . بعض لوگوں کی نظر میں یہ کام آسان ہے لیکن میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جتنا یہ کام مشکل ہے اتنا کوئی اور کام نہیں . . . . . پرانی ضرب المثل کے مطابق دریا کو کوزے میں بند کر دینے سے زیادہ کون سی مہم مشکل ہو گی . . . . . اور یہ مدنظر رہے کہ یہ دریا بھی آج کل کے دریا ہیں کہ ان کے سرے کنارے کا کوئی پتہ نہیں چلتا . . . . عصر حاضر کے علوم . . . . علوم و فنون ادب . . . . . . بھلا ان کی کوئی انتہا ہے؟ اور پھر کوزے بھی ویسے نہیں رہے اب کوزے بھی پیچ در پیچ اور عجیب و غریب ہیں۔ تو کہہ یہ رہا ہوں کہ مختصر اور مجمل کتاب نگاری کا فن بے حد پیچیدہ اور مشکل ہے . . . . . اور میں بڑی ذمے داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ پروفیسر سلیم اختر اس مشکل سے نہایت خوش اسلوبی و کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

یہ مجمل کتاب مختصر مگر جامع ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے ایک بے رحم نکتہ چیں کی نظر سے پڑھا اور کوشش کی کہ اس کے کسی خلا کا سراغ لگاؤں۔ میں اس وقت یہ سطور، خود بھی بڑے تعجب کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ کتاب کے اتنے وسیع تاریخی احاطے میں مجھے ایسا کوئی خلا نہیں ملا جو قابل گرفت ہو۔

خلا سے میری مراد یہ ہے کہ ادبا کے اس وسیع تذکرے میں یہ بالکل ممکن تھا کہ کوئی اہم نام رہ جاتا . . . . . لیکن کم از کم مجھے ایسا اہم نام کوئی نہیں ملا جسے مصنف نے چھوڑ دیا ہو۔

معیار شناسی میں فرق مراتب کی بات جدا ہے . . . . . . یہ ہو سکتا ہے کہ مصنف کی رائے میں الف اور ب میں جو فرق ہے بعض قارئین کی رائے میں وہ نہ ہو۔ اس شخصی رائے کا ہر حال میں احترام کرنا چاہیے۔

سلیم اختر کا سب سے بڑی آزمائش معاصر ادب کے تعلق میں تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس آزمائش میں بھی پورا اترا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ سب لوگ اس سے خوش نہ ہوں گے مگر مصنف کا ضمیر مطمئن ہے اور راقم الحروف کا ذوق بھی مطمئن ہے کہ دانستہ کوئی زیادتی سرزد نہیں ہوئی۔

میں نے خود ایک زمانے میں اردو ادب کی ایک صدی پر مجمل سی کتاب لکھی تھی۔ کوشش یہ کی تھی کہ ہر لکھنے والے کا نام شامل ہو جائے مگر احتجاجی پوسٹ کارڈ پھر بھی موصول ہوئے تھے۔

میرے نزدیک اس مختصر ترین تاریخ ادب اردو کی دو خوبیاں ایسی ہیں جو اسے ایک ممتاز حیثیت دیتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اردو کے پورے ادب کے متعلق ناگزیر طور پر ضروری معلومات قاری کو مل جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور بعد از مطالعہ وہ اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اردو ادب کی تاریخ کو جانتا ہے۔

دوسری خوبی مصنف کی ذہنی غیر جانبداری ہے، ہر کسی کو معلوم ہے کہ اُردو کے آغاز اور گہوارہ اول سے متعلق متضاد نظریے موجود ہیں اور ان کے بارے میں یک گونہ نزاعات بھی برپا ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن سلیم اختر نے تاریخی سیاق و سباق کے حوالے سے اُردو کا پہلا گہوارہ سندھ کو قرار دیا ہے، پھر غزنی اور پشاور کے درمیان کے علاقے کو اس کے بعد پنجاب کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سلسلہ وار تاریخ کے ساتھ ساتھ باقی علاقوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بالکل مدلل اسلوب بحث ہے۔

اردو کا نام سب سے پہلے کس نے استعمال کیا۔ سب سے پہلے نثر کس نے لکھی؟ نظم کس نے لکھی۔ دیوان کس نے مرتب کیا؟ یہ سب متنازع فیہ مسائل ہیں۔

میرے نزدیک اردو میں شاعری کا پہلا مجموعہ پنجاب میں مرتب ہوا جو حضرت نوشہ گنج بخش کی کتاب گنج شریف کی صورت میں سید شرافت نوشاہی کی جمع و تدوین سے شائع ہو چکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا زمانہ سلیم شاہ سوری اور دور اکبری کے درمیان ہے جبکہ محمد قلی قطب شاہ کا دیوان (جو اب تک اولیں مجموعہ سمجھا جاتا ہے) چند سال بعد کی تصنیف ہے۔

بہرحال یہ مسائل تحقیق کے تابع ہیں اور ظاہر ہے کہ تحقیق کا قدم بڑھتا رہتا ہے اور تغیر اس کی تقدیر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اگر سلیم اختر کی کتاب کے بعد، کوئی اور دریافت سامنے آ جائے تو اس میں اسے قصور وار نہ ٹھہرایا جائے۔

میں جس کتاب پر تبصرہ کر رہا ہوں، نہایت مفید کتاب ہے۔ عام طلبہ کے لئے، میرے جیسے قارئین کے لیے اور سہل حوالے کے لیے بھی۔ میری سفارش ہے کہ جب وہ کتاب کو دوبارہ چھاپیں تو اشاریہ ضرور چھاپیں اس سے ہر کسی کو اپنا نام ڈھونڈنے میں آسانی ہو گی۔

تنقیدی دبستان

یہ مختصر کتاب تنقید کے مختلف طریقوں کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس میں تشریحی تنقید، تاریخی تنقید، عمرانی تنقید، رومانی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، سائنٹفک تنقید، مارکسی تنقید، نفسیاتی تنقید، تقابلی تنقید اور امریکہ کے تنقیدی دبستانوں کے خصائص مختصر مگر تشفی بخش

انداز میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ ان کے لیے پروفیسر سلیم اختر نے مستند ترین مآخذ سے استفادہ کر کے، ان کی تدوین میں اپنی ذہانت اور آگاہی سے تجزیاتی کام لیا ہے۔

میرے نزدیک اس کتاب کا مضمون "تنقید اور دبستان" خیال افروز اور فکر انگیز ہے . . . . اس میں شاید پہلی مرتبہ ادب میں دبستان کے مسئلے پر اطمینان بخش بحث سامنے آئی ہے۔

میں نے اس بحث میں خاص طور سے اس لئے دلچسپی لی ہے کہ آج کل ادب میں جبر اور منصوبہ بندی کا سوال سب کو پریشان کر رہا ہے۔

اب قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ اگر ادب میں پہلے سب سوچے سمجھے اور طے شدہ خیالات کا استعمال و اظہار جبر میں شامل ہے تو ادب میں دبستانوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کیونکہ یہ بھی تو بالآخر، چند طے شدہ اور رائج شدہ خیالات کی تکرار تک ہی پہنچاتے ہیں . . . . . ہو سکتا ہے کہ دبستانی تنظیم میں شعوری طور سے جبر شامل نہ ہو لیکن غیر شعوری طور سے جبر کا ایک پہلو اس میں ضرور موجود نظر آتا ہے۔

مقام مسرت ہے کہ سلیم اختر نے دبستان کی نوعیت، اس کے مفہوم، اس کی آزادیوں اور پابندیوں پر عمدہ تجزیاتی بحث کی ہے۔

مصنف نے اُردو تنقید کے مختلف مسلکوں کی بھی نشاندہی کی ہے اگرچہ۔ یہ بھی کہا ہے کہ اردو میں تنقید کے دبستان موجود نہیں البتہ مسلک اور رجحانات ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں کہ سلیم اختر کی یہ رائے غلط نہیں اردو میں دبستانوں کے نہ ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ اردو کا موجود ادب تقلیدی دور سے گزر رہا ہے نتیجتہً اس کی تنقید بھی تقلید کے راستے پر چل رہی ہے۔ جس دن اردو ادب، اپنے ماحول میں اپنی روحانی شخصیت کا نقش بٹھائے گا اسی دن یہاں بھی منفرد مسلک وجود میں آ جائیں گے۔ فی الحال تو سب کچھ مانگے تانگے کا ہے

تنقیدی دبستان، مجلات میں بڑا مقام رکھتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی قاری بھی اس کے مطالعہ سے فیض یاب ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

لکھنؤ کی تہذیبی میراث

مصنف: ڈاکٹر صفدر حسین - صفحات: ۲۳۶ - کتابت و طباعت: عمدہ - قیمت: بیس روپے۔ ناشر: بارگاہ ادب مظفر منزل۔ حیدر روڈ۔ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور۔ مبصر: میرزا ادیب۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ایک نسبتاً غیر معروف ناول "جام سرشار" انیسویں صدی کے لکھنؤ کی ایک ایسی ہستی کا افسانۂ حیات سناتا ہے جس کا تعلق نوابوں کے ایک روایتی خاندان سے ہے۔ یہ صاحب خود بھی نواب ہیں اور عام نوابوں کی طرح عیش پسند واقع

ہوئے ہیں۔ ان کے شب و روز خوشامدیوں کی محفل میں گزرتے ہیں۔ ایک ایسے ہی خوش نصیب شخص کے متعلق شاہ عالم ثانی نے کہا تھا

اب تو آرام سے گزرتی ہے   شب و آرام سے گزرتی ہے
بادہ و جام سے گزرتی ہے   عاقبت کی خبر خدا جانے

اس نواب کو اپنی ایک خواص سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اس سے نکاح پڑھوا لیتے ہیں۔ چونکہ نواب کی اب پہلی سی حالت نہیں رہی اور خواص کسی بازاری عورت کی بیٹی ہے۔ اس لئے وہ نواب کے محل سے نکل کر بازار کی رونق بن جاتی ہے۔ نواب کو جب اس حقیقت کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے قتل کر کے خود پانی میں ڈوب مرتے ہیں اور اس طرح یہ افسانہ اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ عیش پرست نواب نے اس عورت کو قتل کیوں کیا اس کا مقصد تو صرف عیش کرنا تھا۔ اسے کیا پڑی تھی کہ ایک بازاری عورت کے لئے اپنی جان گنواتا؟ یہ سوال بہت اہم ہے اور اس وجہ سے اہم ہے کہ نواب کا اقدام قتل یہ اپنے لکھنؤ کی اس تہذیب سے متاثر ہے جسے اودھ کے دورِ زوال کا پروردہ کہا جاتا ہے اور جس کا عینی شاہد اور سخت گیر نقاد افسانۂ آزاد اور جامِ سرشار کا مصنف رتن ناتھ سرشار بھی ہے۔

نواب جو لکھنوی تہذیب کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ انسانیت کے اس جوہر سے محروم نہیں جسے ہم اپنی زبان میں غیرت مندی کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اودھ کے اس عام ماحول میں سانس لے رہا ہے جس میں زندگی کی اعلیٰ قدریں پنپ نہیں سکتیں۔ اس کے باوجود وہ غیرت مند ہے جو اپنی منکوحہ کو بازاری جنس بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح یہ غیرت مندی جو انسانیت کا جوہر ہے، لکھنوی تہذیب کا ایک رخ بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ سرشار اودھ کی تہذیب کا عینی شاہد بھی ہے اور اس کا سخت گیر نقاد بھی۔ اس نے اس تہذیب کی تمام کمزوریوں کو چن چن کر بیان کر دیا ہے مگر اس تہذیب میں اپنی کچھ خوبیاں بھی تھیں اور ان خوبیوں سے نہ تو جامِ سرشار کا مصنف قطع نظر کر سکتا تھا اور نہ کوئی اور نقاد۔

یہ لکھنؤ جس کے ایک نواب نے غیرت مندی کا ثبوت دیا تھا رتن ناتھ سرشار کا لکھنؤ تھا۔ اس سے کافی مدت بعد جب اختر شیرانی کو دوسری یا تیسری مرتبہ لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تھا تو وہ ایک پوری نظم اس خطۂ ارض کے بارے میں کہنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اس خوبصورت نظم کا پہلا شعر ہے۔

بعد مدت کے نظر آیا دیارِ لکھنؤ
دل فدائے لکھنؤ، آنکھیں نثارِ لکھنؤ

ہمارے ان نقادوں کا ”عمومی“ طریقہ یا سخن“ یہ رہا ہے کہ وہ دلّی کی شان بڑھانے کے لئے لکھنؤ کی اخلاقی سطحیت کا رونا ضرور روتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دلّی کے مقابلے میں لکھنؤ ایک بازاری، مبتذل اور سطحی تہذیب کا علمبردار تھا۔ تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اودھ کی تہذیب عیش پرستیوں کے باوصف اپنے کچھ ایسے پہلوؤں کی رونمائی بھی کرتی تھی جو صاف اور شفاف تھے، جن کے اندر زندگی کا حسن بھی تھا اور زندگی کی گہرائی اور گیرائی بھی۔

سید عابد علی عابد مرحوم کا یہ قول نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دلی کا دورِ زوال لکھنؤ کے دورِ زوال سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ دونوں شہروں میں تہذیبی رنگ یکساں تھا اور ڈاکٹر سید صفدر حسین نے اپنی اس کتاب میں اسی لکھنؤ کی تہذیبی میراث کی نشاندہی کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تاریخی واقعات کی روشنی میں نوابانِ لکھنؤ کے لکھنؤ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش کے طفیل پرانے لکھنؤ کا پورا نقشہ ساری آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا ہے۔ اس کوشش میں انہوں نے سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے تاریخی حوالے سے لکھا ہے۔

انہوں نے اپنی تصنیف کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

پہلے حصے کا تعلق دلی کے زوال سے ہے — یہ بات اس بنا پر بہت اہم ہے کہ دلی کے زوال کے بعد ہی اودھ کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب دلی کے سخن ور اور اہلِ فن دلی سے نکل کر اودھ کے مختلف حصوں — بالخصوص فیض آباد اور لکھنؤ پہنچ جاتے ہیں۔

دوسرے حصے میں انہوں نے اودھ کی سیاسی تاریخ کے نہایت اہم واقعات قلم بند کئے ہیں۔

تیسرا باب بہت طویل ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے اودھ کی تہذیب کے ہر رخ، ہر پہلو اور ہر گوشے کی تفصیل بتادی ہے۔ اودھ کی تہذیب کے بنیادی عناصر کو سمجھنے کے لئے اس باب کا مطالعہ بہت ضروری ہے

آخری باب میں انہوں نے دلی اور لکھنؤ کے تمدنی اور تہذیبی مزاج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کا مطالعہ دونوں تہذیبوں کے فرق کو بڑی خوب صورتی سے واضح کرتا ہے۔

کتاب کے مصنف نے تیسرے باب کے آغاز میں تہذیب اور ثقافت کے موضوع پر گفتگو کی ہے اور واضح کیا ہے کہ ثقافت کے بنیادی عناصر کیا ہیں اور ان کی شیرازہ بندی سے کس طرح ایک خاص گروہ، جماعت یا قوم کی ثقافت تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ یہ بحث خاص طور پر فکر انگیز اور خیال افروز ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان بڑا سلجھا ہوا اور ایسا ہے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں واضح طور پر کہہ دیتے ہیں اور یہی ان کے طرزِ نگارش کی بڑی خوبی ہے۔

لکھنؤ کی تہذیبی میراث — ایک اہم تصنیف ہے اور ہمارے ادب میں ایک مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

"خیر البشرؐ کے حضور میں"

مرتب: ممتاز حسن، ناشر: ادارہ فروغِ اردو، لاہور۔ صفحات: ۲۸۸، قیمت: ۱۸ روپے۔ مبصر: سلیم اختر۔

اشعار کی مانند اگر اصناف کا بھی "آمد" اور "آورد" کے لحاظ سے جائزہ لیں تو بلا شبہ قصیدہ اور اس سے وابستہ گیرا اندازہ ہوتا

تعداد کا شعری سرمایہ پائیں گے لیکن قصیدہ اور مدح کی دوسری صورتوں جیسے نعت میں فرق اس سے ہو جاتا ہے کہ اول الذکر ادبی منفعت کے لئے ایک عام دنیا دار کے لئے لکھا جاتا ہے جو ۹۹ فی صد صورتوں میں قصیدہ میں بیان کی گئی کرداری صفات اور شخصی اوصاف سے تہی داماں ہوتا ہے اس لئے قصیدے کا تاثر ہمیشہ مبالغہ کا مرہونِ منت رہا ہے اس کے برعکس نعت کا محرک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، عقیدت اور احترام کے جذبات ہیں - وہ جذبات جن کی اساس خلوصِ نیت بنتا ہے اس لئے بہت کچھ کہہ کر بھی --- حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ——— کا احساس باقی رہ جاتا ہے جبکہ قصیدہ لکھنے والا غالب کی مانند باپ (امجد علی شاہ) کے لئے لکھتا ہے لیکن اس کے مرتے ہی بیٹے (واجد علی شاہ) کے نام کر دیتا ہے اور ڈھٹائی سے یہ کہتا ہے: "خدا نے بھی تو یہی کیا تھا" (ملاحظہ ہو مکتوب بنام: یوسف مرزا، ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء) لیکن وفورِ شوق میں قلم ڈبونے والے نعت خواں کے سامنے ایسا کوئی مقصد نہیں چنانچہ جگر مرادآبادی کے الفاظ میں وہ یوں کہہ سکتا ہے -

کچھ اور نہیں کام جگر مجھ کو کسی سے
کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ

"خیر البشر کے حضور میں" نعتوں کے انتخاب پر مشتمل ہے اور مرتب نے سہل انگاری سے بچتے ہوئے، قدیم اور کلاسیکی شعرا سے لے کر آج کے شاعر تک سب کے کلام کو کھنگالا ہے چنانچہ اس مجموعہ میں قدیم جدید اور ہندو مسلمان سبھی آنحضرت صلعم کو عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں موضوع کیونکہ ایک ہے اس لئے ترتیب بلحاظ اسماء ہے چنانچہ ایک نگاہ میں شعراء کے نام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے - نعت کا محرک جذبہ آنحضرت صلعم سے محبت اور عقیدت ہے اس لئے جہاں تک اس جذبہ کی صداقت اور نعت کی صورت میں اس کے اظہار کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے کسی ایک نعت گو کو دوسرے نعت گو پر فوقیت نہیں دی جا سکتی لیکن جہاں تک فن کا تعلق ہے تو اس معیار پر یقیناً پرکھ ہو سکتی ہے لیکن مرتب نے فن کے علاوہ ایک اور معیار بھی ملحوظ رکھا ہے اور وہ یوں ہے :-

"ایسے نعتیہ کلام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس میں خدا اور بندے کا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا - اس مجموعہ میں ان نعتوں کو جن کا تعلق یا تو کردارِ رسالت اور عظمتِ مرتبت کے اسوۂ حسنہ سے ہے یا ذاتِ رسالت سے گہری دل بستگی کا اظہار ہے - عام روایتی غزل نما نعتیں جو رسالت کو زیب نہیں دیتیں انھیں حتی الامکان منتخب نہیں کیا گیا ہے" (مقدمہ ص ۵۰)

ظاہر ہے یہ خاصا سخت معیار ہے اور اس لئے انتخاب بھی بے حد کڑا ہے چنانچہ ولی سے شروع کر کے آج کے شاعر تک عام اردو شاعری میں سے صرف ۱۴۴ نعتوں کا انتخاب کیا گیا ہے اس لئے کوئی نعت بھی فنی سقم سے عاری نظر نہ آئے گی - چند مثالوں سے اندازہ ہو جاتا ہے

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا (پنڈت ہری چند اختر)

چیخ اٹھنا چاہتی ہے غم سے گھبرا کر زمیں
رحمت للعالمیں یا رحمت للعالمیں! (ادیب سہارنپوری)

مجھے لکھنا ہے اک انسانیت کا باب تابندہ!
منور جس کے ہوں الفاظ مصرعے جس کے رخشندہ
مجھے اک محسنِ انسانیت کا ذکر کرنا ہے
مجھے رنگِ عقیدت فکر کے خاکے میں بھرنا ہے (جگن ناتھ آزاد)

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب (اقبال)

یہ محض چند مثالیں ہیں اس انداز کے اشعار کی کمی نہیں، کتاب آفسٹ پیپر پر نہایت اہتمام سے طبع کی گئی ہے ویسے تو ادارہ فروغِ اردو کا نام ہی حسنِ معیار کا ضامن ہے۔ مرتب نے ابتدا میں مفصل مقدمہ لکھا ہے جسے نعت کے فن پر ایک اہم مقالہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

"غزالاں تم تو واقف ہو....."

از: اداجعفری، ناشر: مکتبہ فنون لاہور۔ صفحات: ۱۷۵، قیمت: ۱۰ روپے، مبصر: سلیم اختر۔

تقسیم ملک کے فوراً بعد ترقی پسند ادب کی تحریک کے حوالہ سے جو شاعرات ابھریں ان میں سے اداجعفری اس بنا پر ممتاز ہیں کہ اب تک زندہ ہیں ورنہ اس ربع صدی نے تو بے شمار شعرا کو زندہ ہوتے ہوئے بھی درگور دیا ہے۔ ادا اس سے قبل دو اور شعری مجموعے بھی دے چکی ہیں "میں ساز ڈھونڈتی رہی" اور "شہر درد" اور اب یہ تیسرا مجموعہ "غزالاں تم تو واقف ہو....." اس لحاظ سے بے حد اہم مجموعہ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں ادا کا فن پختگی پا کر نہ صرف نکھرا اور ستھرا ہوا نظر آتا ہے بلکہ اس میں وہ جذباتی الیوں کی اس شاعری سے بہت آگے نکل آئی ہے جنہیں "شہر درد" کی اہم ترین خصوصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب اس کی ویژن میں پھیلاؤ آ چکا ہے جس کا احساس اس مجموعہ کی پہلی نظم "مسجدِ اقصیٰ" کے مطالعہ سے ہی ہو جاتا ہے۔ جو موضوع کی جذباتیت کی بنا پر ایک ایسی جذباتی نظم کی صورت اختیار کر سکتی تھی جس میں جذبات بے ساختہ یوں چھلک جاتے ہیں کہ پھر وہ اخبار کے سنڈے ایڈیشن کے قابل رہ جاتی ہے۔ مگر اداجعفری ماتم کے برعکس اسے بھی عزم سفر کے لئے تحریک بنانے کی داعی ہے چنانچہ اس کے بقول:-

"قافلے لٹتے ہی رہتے ہیں گزرگاہوں میں
لوٹنے والوں نے کیا عزم سفر بھی لوٹا؟
دجلہ خوں تو نئی بات نہیں ہے، یہ کہو
وہ سبو ڈوبا ہے، سفینہ ہے کہ ساحل ڈوبا

"کوئی آئینہ" ایک اور بہت اچھی نظم ہے اس میں بھی عزم و عمل کی تلقین ہے لیکن بانداز دگر — یہاں مسجد اقصیٰ کی مانند اشتعال انگیز انداز نہیں اپنایا گیا بلکہ لطیف کنایوں سے کام لیتے ہوئے یوں کہا ہے۔

جہاں قدسیوں کے جلے ہیں پر — وہیں ثبت ہے ترا نقش پا
تجھے کون آکے بتائے گا — تجھے کون یاد دلائے گا

کوئی آئینہ، کوئی آئینہ!

"کوئی آئینہ" کے فوراً بعد آنے والی نظم "سوادِ شب" میں بھی یہی خیال ہے لیکن رات اور اس سے وابستہ امیجز سے کام لیتے ہوئے ایک عجیب پُراسراری کیفیت ابھاری گئی ہے۔ نظم کے آخری دو اشعار شاعرہ کا پیغام بن جاتے ہیں!

اب کے تقدیر انھیں ہاتھوں سے زنجیر کرو
جانِ ہمکارو، کوئی چارہ کوئی تدبیر کرو
تیشۂ حرفِ شکایت سے کوئی رات کٹی؟
آج کی رات ہے تاریک، مسافت بھی کڑی!

مختلف اوقات اور جداگانہ موضوعات پر لکھی گئی ان تینوں نظموں کا بنیادی جذبہ ایک ہی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دیگر ناقدین کو اس مجموعے کی کس خصوصیت نے بطورِ خاص متاثر کیا ہوگا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو مجھے اداؔ کی بعض نظموں کے اس پہلو نے خصوصی طور سے متاثر کیا ہے اس لئے نہیں کہ عزم و عمل کی شاعری یا اس کی تلقین اردو شاعری میں طرح نو ہے ویسے بھی اقبال کے بعد اس انداز کی شاعری میں کوئی ایسی دلکشی نظر نہیں آتی لیکن اس مجموعے میں یہ انداز چونکاتا اور دل کو بھاتا ہے کہ گزشتہ دو دہائیوں سے ہم عصر شعرا نے دروں بینی، باطن پرستی، ذات کے خول اور تنہائی کی ٹوٹ پھوٹ کا جو CULT بنا لیا ہے اس کی بنا پر شاعری میں انسانیت یا زندہ نے اب اچھی خاصی پرورش کی صورت اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ ہم عصر شعرا کے اس تناظر میں اداؔ کا اندازِ سخن اور یہ طرزِ تخاطب بے حد اہم ہو جاتا ہے اور جب "کیوں؟" ایسی بلیغ نظم کا مطالعہ کریں تو اداؔ کا یہ مخصوص رجحان اپنی خلاقہ صورت اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ اس نظم کی روح اداؔ کی غزل کے ایک شعر میں یوں سمٹ آئی ہے:

جلوۂ تمنا ہے دار کی بلندی تک
جانے والے جا پہنچے فاصلہ ہی کتنا تھا

— اور اسی کو اداؔ جعفری کی شاعری کا موٹو قرار دیا جا سکتا ہے۔

خاک نشین

میرزا ادیب اُردو کے انتھک لکھنے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے گزشتہ چالیس سال میں بہت کچھ لکھا ہے اور مختلف اصناف میں لکھا ہے۔ انہیں کسی بھی منزل پر تھک کر بیٹھنا نہیں آتا۔ انہوں نے زمانۂ طالب علمی میں لکھنے کا آغاز کیا۔ اُس وقت وہ شعر کہتے تھے۔ اس کے بعد وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ صحرا نورد کے خطوط اور صحرا نورد کے رومان ان کے دو مجموعے ہیں جنہوں نے انہیں دنیائے ادب میں متعارف کرایا اور صرف متعارف ہی نہیں کرایا بلکہ ایک لازوال شہرت بخشی۔ اس کے بعد انہوں نے یکے بعد دیگرے افسانوں کے کئی مجموعے شائع کرائے اور صنفِ افسانہ میں کئی کامیاب اضافے کیے۔ پھر وہ ڈرامے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب تک ان کے متعدد یک بابی اور FULL LENGTH ڈرامے چھپ چکے ہیں۔ ڈرامے کی صنف میں ان کا کام اتنا وسیع ہے کہ مختلف لکھنے والوں نے آغا حشر کے بعد اردو ڈرامے میں انہیں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

خاک نشین میرزا ادیب کے ڈراموں کا تازہ مجموعہ ہے۔ ایک سو چوالیس صفحے کا یہ مجموعہ تین ڈراموں پر مشتمل ہے۔ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "میرزا صاحب اُردو زبان کے وہ واحد ادیب ہیں جنہوں نے برسوں سے صرف ڈرامے کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنا رکھا ہے۔ آج سے سینتیس[۳۷] سال پہلے انہوں نے ابتدا افسانہ نگاری سے کی تھی اور اس فن میں بھی انہوں نے وہ شہرت حاصل کی تھی کہ ان کی دو تصانیف 'صحرا نورد کے خطوط' اور 'صحرا نورد کے رومان' آج بھی اسی طرح مقبول و زندہ ہیں۔ اب یہی صورت ان کے ڈراموں کے ساتھ ہے۔"

"خاک نشین" ایسا مجموعہ ہے جس میں شامل کیے ہوئے تینوں ڈراموں میں ایک ربط اور ایک اشتراک نظر آتا ہے جس کے بارے میں تفصیل آخر میں آتی ہے۔ پہلے تینوں ڈراموں پر ایک ایک کر کے نہایت اختصار سے اظہارِ خیال کرتا ہوں۔

مجموعے کا پہلا ڈراما ——— اور نسبتاً طویل ڈراما "خاک نشین" ہے جس کا مرکزی کردار گاؤں کے سکول کا ایک مدرس ہے جس نے بچوں کی تربیت اور تعلیم کے لئے ایک سکول کھول رکھا ہے۔ وہ نجی اور ذاتی سکول ہے جس میں کسی سے فیس وغیرہ لینا تو ایک طرف رہا۔ ماسٹر صاحب غرباء کے بچوں کی کتابوں کاپیوں تک کی کفالت کرتے ہیں۔ مدرسہ ان کے لیے ایک آدرش اور ایک تربیت گاہ ہے جس کا واحد مقصد یہ ہے کہ غرباء کے بچے یہاں سے تعلیم حاصل کر کے بہتر زندگی گزار سکیں۔ ماسٹر صاحب بچوں کو انتہائی شفقت اور محبت سے پڑھاتے ہیں اور بچے بھی ان سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک بخوبی چلتا رہتا ہے تاآنکہ گاؤں کا چودھری اپنے باغ کی توسیع کے لیے مدرسے کی زمین کے حصول کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے اور ہر طرح سے مدرسے پر قبضہ کرنے پر کمربستہ ہو جاتا ہے لیکن غریب مدرس ترغیب، تحریص اور دباؤ سے بھی مدرسہ چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوتا۔ مدرسہ مدرس کا ایک آدرش ہے اور میرزا ادیب علامتی انداز میں یہ بتا رہے ہیں کہ انسان کو اچھا آدرش کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑنا چاہیے خواہ مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے کسی قسم

کامیاب ہو سکتا ہے۔

دوسرا ڈراما "اسیر نغمہ ساز" ایک مصور کے بارے میں ہے جسے ایک گونگی گداگر لڑکی کی آنکھوں میں ایسی لازوال چمک نظر آتی ہے جسے تصویر میں منتقل کرنا چاہتا ہے۔ اونچی سوسائٹی اور اس سوسائٹی کی چمک دمک اُسے اپنے آدرش سے بھٹکانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ اس تصویر کی چمک دمک کو ٹھکرا کر بالآخر ایک پُراسرار تعلیق سے مِلتی آنکھوں کی اس لازوال چمک کو کینوس پر منتقل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو کسی بھی تخلیق کار کی علامت ہو سکتا ہے۔ اس ڈرامے میں میرزا ادیب نے یہ سوال قاری کے سامنے رکھا ہے کہ فنکار کو اپنا آئیڈیل عزیز ہونا چاہیے یا مادی مفادات کا حصول؟ اور ظاہر ہے کہ میرزا ادیب "آئیڈیل" کے حصول کے حق میں ہیں۔

تیسرا ڈراما "تتلی" ایک غریب محلے سے متعلق ہے جو محض درس و تدریس سے لگن کی بدولت ایک امیر گھرانے کی بچی کے توسط سے طبقہ امراء میں پہنچتی ہے اور اس گھرانے کی بہو بننے والی ہوتی ہے لیکن اس گھرانے کے افراد کے ہاتھوں اپنے سابقہ غریب محسنوں کے ساتھ بدسلوکی دیکھ کر امیر گھرانے کو ترک کر کے انہیں غریب محسنوں کے ہاں لوٹ جاتی ہے۔ اس ڈرامے میں دو طبقات کے مزاجوں کا فرق دکھایا گیا ہے اور غریب طبقے کو "عزتِ نفس" کا احساس دلایا گیا ہے۔

تینوں ڈراموں میں جو چیز مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان کے مرکزی کردار بقول مصنف خاک نشین ہیں یعنی طبقہ غربا سے تعلق رکھتے ہیں۔ "خاک نشین" کا بکول ماسٹر، "اسیر نغمہ ساز" کا مصور اور "تتلی" کی حلیمہ بنیادی طور پر ایک جیسے کردار ہیں۔ تینوں افراد وہ ہیں جنہیں دنیا میں مادی آسائشیں نہیں ملیں۔ تینوں کو اپنے آدرش آسائشوں کے مقابلے میں بمراتب عزیز ہیں۔ تینوں کو اپنے فرائض اور اپنی صلاحیتوں کا احساس ہے اور وہ انہیں کسی قیمت پر بھی ذاتی منفعت کے لیے استعمال کرنے کو تیار نہیں۔ تینوں کا ٹکراؤ معاشرے کی مستحصل قوتوں سے ہوتا ہے اور وہ ان کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے۔ اس لحاظ سے تینوں ڈرامے ہمیں یہ پیغام دیتے ہیں کہ معاشرے کی بہبود کے لئے کام کرنے والوں کو سب سے زیادہ محبت اپنے آدرش کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اس آدرش کے حصول کے لئے اسے ہر مخالف قوت کے حربوں کو ناکام بنا دینا چاہیے اور کسی قیمت پر بھی اپنے مقصد سے دستبردار نہیں ہونا چاہیئے۔ ڈراما نگار کے خیال میں آدرش سے محبت کی یہ بے پناہ صلاحیت خاک نشینوں ہی میں مل سکتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تینوں کردار دراصل میرزا ادیب ہی کی شخصیت کے مختلف روپ ہیں۔

یہاں بعض کٹر قسم کے ترقی پسند حضرات یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ طبقہ غربا کو محض قناعت پسندی کا سبق دینا ترقی پسندی نہیں ہے۔ ترقی پسندی تو اس چیز کا نام ہے کہ مظلوموں کو ظالموں کے خلاف درس پیکار دیا جائے۔ میرے خیال میں ایک ایسے معاشرے میں جہاں ترقی پسندی تو اس چیز کا نام ہے کہ مظلوموں کو ظالموں کے خلاف درس پیکار دیا جائے۔ میرے خیال میں ایک ایسے معاشرے میں جہاں حرص و ہوس نے سب کے اچھوں کو اسیر کر لیا ہو "درس قناعت" بھی ترقی پسندی ہی کے ذیل میں آتا ہے۔ چند صدیاں پہلے جب صوفیا اور شعراء نے لوگوں کو "مال و دولت" کے حصول سے نفرت دلائی اور انہیں قناعت کا درس دے کر درباروں کے مضر اثرات سے محفوظ رکھا تو درحقیقت انہوں نے اپنے ماحول کے مطابق ایک عظیم ترقی پسندانہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ یہی کیفیت میرزا ادیب کے ان ڈراموں کی ہے جو راتوں رات رئیس بننے کے خواب دیکھنے والے افراد کے اس دور میں مادی منفعت کی بجائے آدرش کی محبت کا درس دیتے ہیں۔

ڈرامے کے فن پر میرزا ادیب کی گرفت قابلِ داد ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ ڈراما دراصل سٹیج کی چیز ہے۔ میرزا ادیب

کے ہوتا ہے بیج پر پھیلے جانے کے نقطۂ نظر سے بڑے موزوں ہیں۔ ان کو سٹیج کرنا آسان ہے۔ اس کے لیے بھی تھوڑی آرائش کی ضرورت نہیں۔ عناصر محدود ہیں اور ان میں کچھ چھوٹی اور سستی سی چیزیں پڑی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ جو خاک نشین مرکزی کرداروں کا مناسب پس منظر ہے۔ اسی لیے ان کے سٹیج پر پیش کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ڈرامے زمانی وقفے کے لحاظ سے مختصر ہیں اور محدود وقت میں انھیں دلچسپی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کرداروں کی تعداد کم ہے۔ مکالمے مختصر، چست اور سیدھے سادے ہیں جن کی ادائیگی آسان ہے مگر پُر زور ہیں۔

"خاک نشین" سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرزا ادیب کا فن مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ میرزا ادیب ان لوگوں میں نہیں جو دنیائے ادب میں وارد ہوتے ہی تحیر اور تعجب کرتے ہیں اور پھر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں ہیں جو مسلسل لکھتے ہیں، اچھا لکھتے ہیں اور اپنے فن کے ارتقا سے کبھی غفلت نہیں برتتے۔

(خواجہ محمد زکریا

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

مصنف: عبید اللہ علیم - ناشر: سیپ پبلیکیشنز، کراچی ۲ - قیمت: بارہ روپے - تبصرہ نگار: لطیف عارف -

عبید اللہ علیم اردو شاعری میں ایک ایسی آواز بن کر سامنے آئے ہیں کہ ہر سنجیدہ شاعری کا قاری متوجہ ہوا ہے۔ سحر خیز لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ علی الصبح ایک ستارہ نظر آتا ہے جو قامت میں دوسروں سے بڑا اور روشنی و تابناکی کے اعتبار سے بھی منفرد نظر آتا ہے۔ علیم ایسا ہی ایک درخشندہ ستارہ ہیں۔ انہوں نے نظم اور غزل میں خیالی اور جمالیاتی احساس کو یوں مقید کیا ہے کہ اُن کا قاری ایک خوشگوار تحیّر سے دوچار ہوتا ہے۔ مجموعے کا نام اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ علیم نے حسنِ "بت" کی پرستش کی اُس کو شاعری میں سمونے کے لیے کتنے بلند معیار کو سامنے رکھا ہوگا۔ اسی معیار نے اُن کی شاعری کو رنگ و آہنگ دیا ہے۔ اسی معیار نے صورت و معنی دیے ہیں اور اسی معیار نے آوازوں اور خطوط کو یکجا کیا ہے۔ یہ تمام خصوصیات جس طرح علیم کی شاعری میں جمع ہوئی ہیں اُن کے ہم عمر اور ہمعصر شعرا میں شاذ ہی ملیں گی۔

مجموعے کا نام ہماری توجہ اس بات پر مبذول کراتا ہے کہ وہ رومان پسند شاعر ہیں۔ ہر نظم اور ہر غزل میں عجیب اور بے نام تشنگی، محبوب سے قربت اور دوری شعلے کی مانند لو دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ علیم نے اپنے شدید داخلی جذبات و احساسات کی روشنی کو جس چیز سے جلا دی ہے وہ اُن کے داخلی کرب کا ردِ عمل ہے۔ اُن کی خارجی زندگی میں جو تلخی، تیزی و طراری ہے، وہ اُن کی شاعری میں مفقود ہے۔ اُن کے ہاں صرف اداسی نہیں بلکہ سرشاری کا احساس بھی ہے۔ اپنے محبوب سے جس نرمی سے دلنوازی کے وہ خواہاں ہیں وہ انھیں حاصل بھی ہے۔ وہ محبت کرنے والے انسانوں کے درمیان سوال "آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ" والے ڈرامے کا پہلو بے حد مناسب انداز میں سامنے آتا ہے۔

وہ چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زلفیں!

ان دو مصرعوں میں محبوب کا سراپا مکمل طور پر سمو دینا علیم ہی کا کام ہے۔ کسی انسان سے ملاقات پر سب سے پہلے ہماری آنکھیں چہرے، آنکھیں اور سایہ دار زلف ہی سے متعارف ہوتی ہیں۔ عام طور پر شعرا صنف بانہوں کا، نیم باز آنکھوں کا، دہکے ہوئے رخساروں کا اور عنابی لبوں

[illegible] کی صفتوں کا ذکر کرتے ہیں کہ حسن سامنے سے غائب ہوتے لگتا ہے اور ایک ایسی صورت کی تصویر ابھرتی ہے جو مجرد نہیں معلوم ہوتی بلکہ [illegible] معلوم ہونے لگتی ہے۔

لیکن تقیم کا انداز اچھوتا ہے وہ کہیں ہو نکلتا ہے۔ چاند حسن مکمل کی علامت ہے۔ اسی لیے انہوں نے چہرے کو چاند کہا۔ اسی طرح ستارہ [illegible] تابناکی کا کمیں ہے اور جب نگاہ گھنی سیاہ دراز زلفوں تک پہنچی تو تقیم ان دو مصرعوں سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ اس بات پر قادر نہیں ہیں۔ بلکہ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ حسن اس قدر مکمل ہے کہ دو مصرعوں کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ جو تصویر یا رنگ و آہنگ روشنی اور نور سے بنائی گئی ہے وہ مکمل ہے اور چاندنی کی طلسماتی فضا اس میں اس طرح شامل ہے کہ ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن محبت میں جو ہجر و غم اور گریز پلٹے آتے ہیں۔ حسین خوابوں کے تاج محل ٹوٹتے ہیں۔ شیش محل کرچی کرچی ہو جاتے ہیں اور جب حقیقت اور آئیڈیل آپس میں ٹکراتے ہیں تو وہ افسردگی پیدا ہوتی ہے جو زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ تصادم انھیں تلخ نہیں بنا دیتا، ان کو حیرت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن وہ اپنے زخموں سے کھیلنے کے لیے نیا عزم پیدا کرتے ہیں۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ تقیم کی شاعری میں کون سے عناصر ایسے ہیں جن پر ان کی شاعری کی عمارت کھڑی ہے۔ سب سے پہلے میں امیجز (IMAGES) کا ذکر کروں گا۔ شاعر اگر استعاروں پر قدرت رکھتا ہے تو یہ اس کی ذہانت کی دلیل ہے۔ یہ بات ہمیں ارسطو نے بتلائی تھی۔ بلکہ سچ کہ ارسطو کے بعد سب سے بڑا ناقد ہے۔ کہتا ہے کہ بڑا شاعر وہ ہے جو ایسے امیجز استعمال کرتا ہے جو ہماری توجہ کو فوراً اپنی طرف منعطف کر لیں۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ شدتِ احساس کے پیش نظر ان میں تبدیلی بھی کی جائے۔ جب تجربہ روح کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو امیج (IMAGE) تجسیم کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر الفاظ میں تصاویر کا نگار خانہ بناتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جب تخیل کا عمل دخل شروع ہوتا ہے اور شاعری میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ جدت پیدا ہوتی ہے جو شعر کو تاثیر دیتی ہے اور پھر جذبات احساسات بولنے لگتے ہیں۔ احساسات کو گویائی دینے کے لئے امیجز کی ضرورت پڑتی ہے اور شاعر کے اردگرد کا ماحول ہی نہیں ساری کائنات اس کی ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ امیجز کے ذریعے ہمیں دو باتوں کا پتہ چلتا ہے کہ شاعر کا ذہن کس طرح کام کر رہا ہے دوسرے یہ کہ اس کی نفسیاتی کیفیت کیا ہے۔ امیجز شاعر کے تجربے اور مشاہدے کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ یہ تصاویر دراصل ایک طرح کا انکشاف ہوتی ہیں اور ذہن میں تمام پیچیدہ عمل کو مرکزیت اور صفائی کے ساتھ مقید کر لیتی ہیں۔ اس طرح کہ ہر چیز آئینے کی مانند صاف و شفاف نظر آنے لگتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر شاعر امیجز کو استعمال ہی کیوں کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ داخلی حقیقت یعنی احساسات اور خارجی حقیقت یعنی اشیاء میں رابطہ اسی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاعر کسی جذبے کو محسوس کرتا ہے لیکن اس جذبے کی ترسیل امیجز کے ذریعے ہی ظاہر ہو سکتی ہے۔ تقیم نے بھی تصویر کشی کی ہے۔

چاند سا دل ہو، چاندنی سا گداز

ایک نظارہ ہوں آنسو سے گہر ہونے تک

بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اک شخص

نرم کونپل پہ شبنم کے موتی تال پر صبح کی گنگناہٹیں

خورشید بکف کوئی کہاں ہے

بوٹا بوٹا دھوپ جلا ہے، شجر شجر بے سایہ ہے

شب کو چاند ہی اچھا نہ دن کو مہر اچھا

خواب بن کر تو برستا ہے شبنم شبنم

صفحۂ دہر پر کرب کی خونچکاں آیتیں ثبت ہیں

اداس یادوں کی مضمحل رات بیت بھی جا

رات مہتاب اور صبح گلاب

یہ تصویریں ہمارے تمام حواس کو متاثر کرتی ہیں۔

دوسرا عنصر جو علیم کی شاعری میں اہم ہے وہ موسیقیاتی احساس ہے۔ علیم کبھی کبھی تو مختلف آوازوں کو یکجا کرتے ہیں جیسے مختلف ساز ایک ساتھ بجائے جائیں اور وہ ایک سے ایک نغمہ، ایک دھن پیدا کرتے ہیں یا پھر وہ رنگوں کے امتزاج سے نقوش ابھارتے ہیں۔ جب کسی جذبے کی تجسیم کی جاتی ہے تو اُس کے صرف ایک ہی معنی ہیں کہ پارے کو قید کر دیا گیا ہے۔ اور ایسی کیفیت جو سیماب صفت ہو الفاظ میں قید کر دینا معمولی مرصع کاری نہیں ہے۔ پھر علیم تو ایسی مختلف تصاویر بناتے ہیں کہ ہر تصویر مختلف حواس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ اُن کی شعوری کوشش نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی شاعری کا آہنگ ہی ایسا ہے۔ اُن کا تو کمال صرف یہ ہے کہ تمام تصاویر کو متعلق کرتے ہیں اور ترتیب یوں قائم ہو جاتی ہے کہ نظم ایک زنجیر معلوم ہوتی ہے۔ اگر زنجیر کی ایک کڑی کو بھی الگ کیا گیا۔ تو ساری زنجیر بکھر جائے گی۔

مرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

یہ میرا چہرہ! یہ میری آنکھیں

بجھے ہوئے سے چراغ جیسے

جو پھر سے جلنے کے منتظر ہیں

(چاند چہرہ ستارہ آنکھیں)

بیتے شہر کی سچائی میں مچل رہے ہیں پران
لہروں لہروں گاتی جائے جیسے مست پَوَن
دیکھو ساون کا آیا
اپنے آنگن گانا آیا

(گیت)

اُداس یادوں کی سمل رات بیت بھی جا
کہ میری آنکھوں میں اب لہو ہے نہ خواب کوئی
میں سب دیے طاقِ آرزو کے بجھا چکا ہوں

(مرثیہ)

علیم نے اپنے تخلیقی تخیل سے بڑی ہی خوبصورت تراکیب تراشی ہیں۔ طاقِ آرزو، سپنے شہر کی سچائی، خونچکاں باتیں، ریگِ دستِ قلم، زخموں کا سیمیا، آئینوں کے باطن، خورشید بکف، دھوپ بے ہنراں، جراتِ رسائی، ظرفِ کبریائی، گدائے کوئے سخن، اتاب بے نوائی ان تراکیب میں ایسا پیچ ہے جو مصرعوں میں انہیں استعمال کیا گیا ہے وہ اس قدر معنی خیز ہیں کہ یوں احساس ہوتا ہے کہ اگر یہ تراکیب نہ تراشی گئی ہوتیں تو مصرع بے معنی ہو جاتا۔ ان تراکیب نے جو دلکشی پیدا کی ہے وہ سیاق و سباق کا ماحصل ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علیم کسی خیال کو کسی احساس کو مجسم کر ڈالتے ہیں کہ قاری اس تجسیم کو نہ صرف یہ کہ محسوس کرے بلکہ دیدۂ بینا سے دیکھ لے۔

وہ خواب خواب فضائے طرب نہیں آتی

زندگی کی اسے کڑی دھوپ بچالے مجھ کو

تیرے پیار میں رسوا ہو کر جائیں کہاں دیوانے لوگ

ابھی نہ کوئی پیمبر، نہ ہیں کوئی اوتار

باہر باہر چپ سادھے رکھ، اندر اندر ہنستی جا

ایسے مصرعے پڑھ کر فراق صاحب یاد آتے ہیں۔ بڑے شاعر اور ادیب کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ شاعری اور ادب پر یوں چھایا جاتا ہے جیسے ساون کے موسم میں بادل آسمان پر چادر سی تان دیتے ہیں۔ فراق صاحب نے یہ کارنامہ شاعری میں اور نثر میں یہ کارنامہ رشید احمد صدیقی صاحب نے کیا ہے۔ کوئی اچھا شعر کہنے والا اس دور میں فراق صاحب کے اثر سے آزاد نہیں۔ اسی طرح اچھی نثر لکھنے والوں کو رشید صاحب کی گرفت سے رہائی نہیں۔ مختار مسعود اور مشتاق یوسفی دونوں نے اپنے لئے نئی راہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر خود سے

دیکھیے تو ان دونوں نثر نگاروں کی تحریروں میں بین السطور رشید احمد صدیقی صاحب جھانکتے ہوئے مسکراتے نظر آتے ہیں ۔

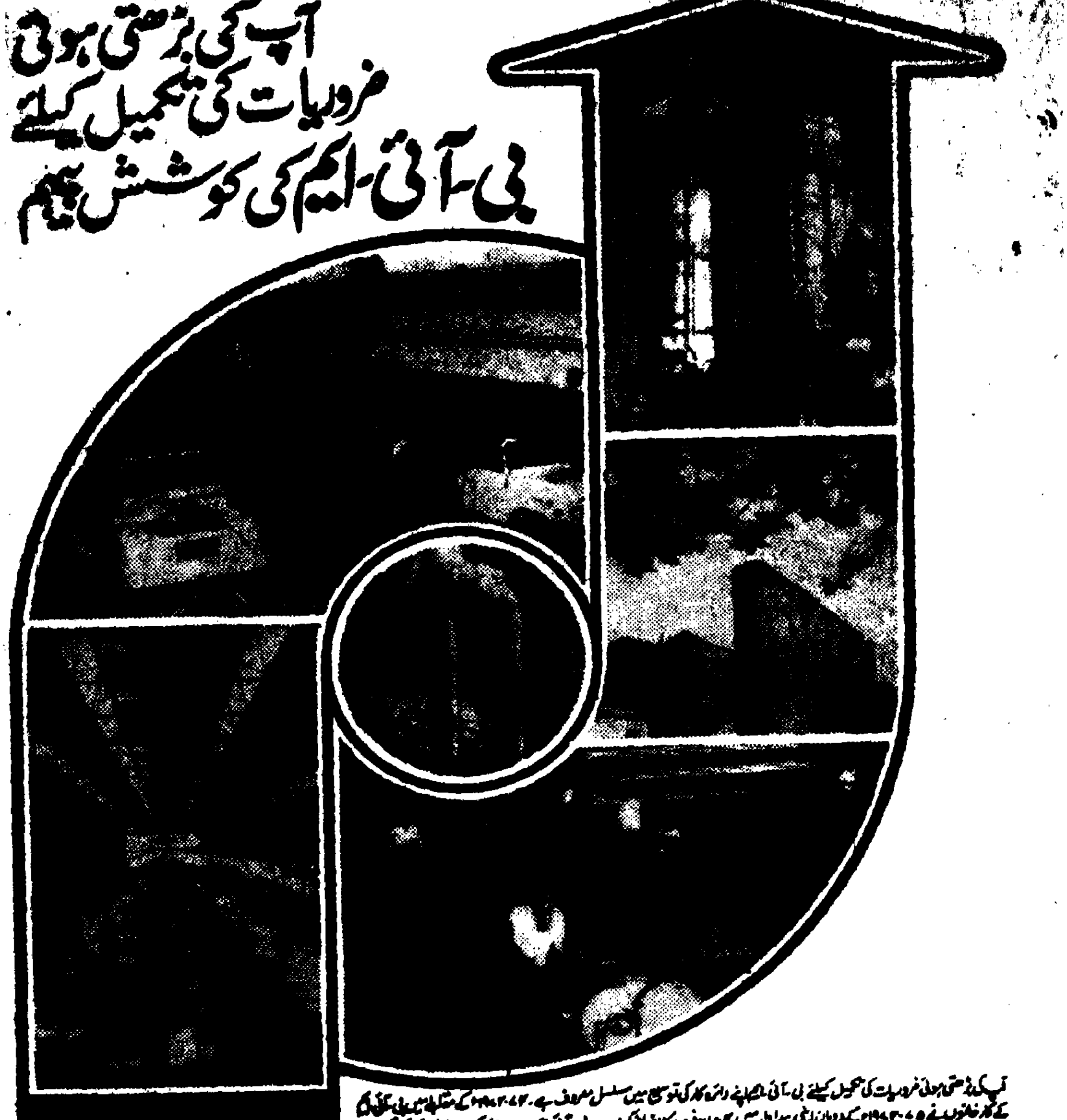
میں یہ عرض کر رہا تھا کہ علیم ہی نہیں اس دور کے ہر اچھے شاعر پر فراق صاحب کا اثر پایا جاتا ہے ۔ علیم کی نظم "دیوی" اس کی بہترین مثال ہے۔ میں اب تک اس بات پر زور دیتا رہا ہوں کہ علیم الفاظ سے تصویر بناتے ہیں لیکن تصویر دیکھنا بھی تو ایک فن ہے ۔ جو لوگ محض تجرید کی تصاویر کو تصاویر سمجھتے ہیں ان سے مجھے کچھ نہیں کہنا ۔ اس دور میں صادقین نے برش اور رنگ، خطاطی اور دائروں کے ذریعے نئے معنی دیے اب ہر شخص اگر غالب یا صادقین کو سمجھ لے تو پھر یہ دونوں بڑے فن کار خود اپنی نظر میں گر جائیں گے ۔ اسی طرح علیم نے الفاظ کے ذریعے جو تصاویر بنائی ہیں وہ "دیدۂ بینا" چاہتی ہیں ۔ مجھے تو یوں معلوم ہوا کہ جیسے علیم میر کی زبان میں یہ کہہ رہے ہوں " بر عوام کار ندارم "۔

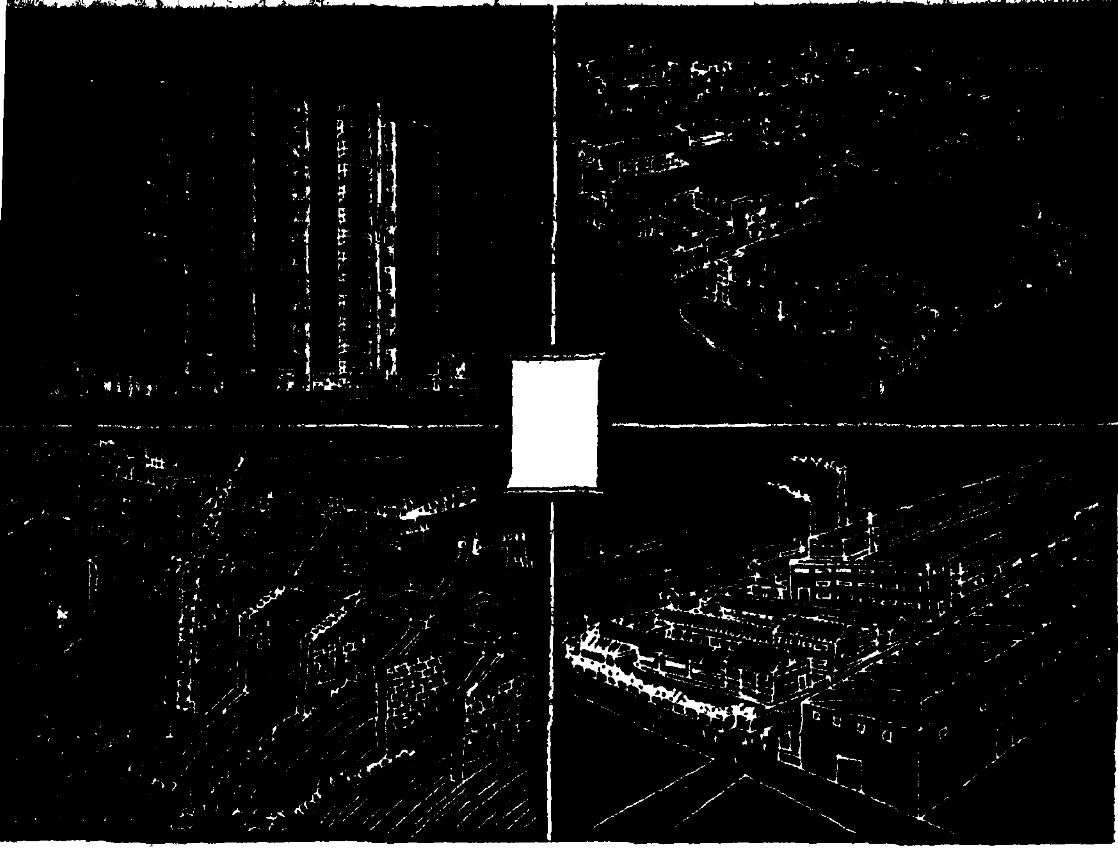
علیم کی شاعری کو سمجھنے کے لیے یہی نہیں کہ ان سے یاری کرنی پڑتی ہے بلکہ میرے خیال میں ان الفاظ سے بھی یاری کرنا ضروری ہے جو تصاویر بناتے ہیں کہ الفاظ خود بھی تصویر کا ایک حصہ ہوتے ہیں اگر الفاظ سے یاری نہ کی گئی تو اس کا امکان ہے کہ تصویر کا کوئی نہ کوئی حصہ مخفی رہ جائے گا ۔

ایک اور بات جو میرے نزدیک علیم کی شاعری میں اہم ہے وہ موسیقی ہے ۔ کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ مگر بات اتنی سی نہیں ۔ علیم تو جہاں تصویر بناتے ہیں اسے گویائی بھی دیتے ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مترنم گویائی بخشتے ہیں ۔ وہ مختلف آوازوں کو یوں یکجا کرتے ہیں جیسے باکمال موسیقار مختلف سازوں سے بیک وقت کسی نغمے کو پیدا کرتے ہوں انگریزی زبان کا شاعر W. B. YEATS یہ کہتا ہے کہ انسان کی شخصیت کے ان گنت زاویے ہیں ۔ ان میں ہم آہنگی اور توازن موسیقی ہی سے قائم کیا جا سکتا ہے کہ کائنات میں موسیقی کا ایک مکمل نظام موجود ہے اور جب تک ان دونوں میں توازن اور ہم آہنگی نہ ہو موسیقی ممکن نہیں ۔ جب سے انسان کی تاریخ ملتی ہے خلفشار بھی اس تاریخ کا ایک حصہ ہے ۔ انسان نزاع سے آج تک رہائی حاصل نہیں کر سکا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس نزاع کی قید سے انسان کو کبھی رہائی ملے گی بھی نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نزاع اور خلفشار پر قابو پانے کی کوشش انسان نے ہمیشہ کی ہے ۔ علیم کے مزاج میں (اور میں ان کے شعری مزاج کی بات کر رہا ہوں ۔ ان کے شخصی مزاج کی بات ان کا سوانح نگار کرے گا) اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ علیم اس بات پر قادر ہیں کہ الفاظ سے تصاویر بناتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ان سے موسیقی کا کام لیتے ہیں ؂

لوگ اپنے دل کی بات ڈھونڈتے ہیں نغموں میں

آپ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کیلئے بی آئی ایم کی کوشش پیہم

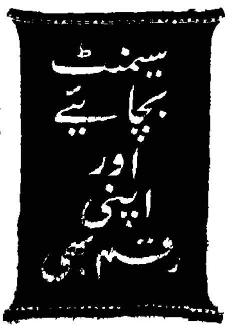




ہر طرف تعمیر ہی تعمیر ... اور سیمنٹ کی بے تحاشہ مانگ

[illegible] حکومت کی [illegible] سماجی اور اقتصادی پالیسیوں کی بدولت سرکاری اور نجی [illegible] شعبوں میں تعمیر و ترقی کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ کراچی اسٹیل ملز اور پورٹ قاسم [illegible] اور متعدد ہند بل، کیمیائی کھاد کے کارخانے سیمنٹ فیکٹریاں، بھاری انجینئرنگ کے کارخانے اور کیمیکل پلانٹ بڑی تیزی کے ساتھ تکمیل کے مراحل [illegible] ہیں۔ ملک میں اس وقت تقریباً ۲۰ لاکھ مکانوں کی کمی ہے جسے [illegible] حکومت نے لاکھوں پلاٹ الاٹ کئے ہیں۔ مالیاتی اداروں کو مکانوں کی تعمیر کے لئے قرضہ دینے کی ہدایت کی ہے اور کم لاگت کے مکان نیز بڑے شہروں میں کئی منزلہ عمارتوں کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کے لئے تعمیرات کو باقاعدہ صنعت کی حیثیت دے دی ہے۔

شہری [illegible] تعمیرات کی کثرت کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں میں سیمنٹ کا استعمال [illegible] سیمنٹ کی مانگ میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ [illegible] سیمنٹ کارپوریشن [illegible] پاکستان نے ۱۹۷۷–۷۸ء کی ۲۸ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن کی پیداوار کے مقابلے میں ۱۹۷۴–۷۵ء میں ۳۲ لاکھ ۶۸ ہزار ٹن سیمنٹ تیار کیا [illegible] سیمنٹ کے کارخانے رات دن کام کر کے اپنی گنجائش کی ۹۵ فیصد کی حد تک پہنچ چکے ہیں لیکن پیداوار اور مانگ میں اب بھی بہت فرق ہے [illegible] ۱۹۷۸ میں اس وقت دور ہوگا جب سیمنٹ کے موجودہ زیر تعمیر کارخانے کام شروع کر دیں گے۔ [illegible] ۱۹۶۸ کے بعد سیمنٹ کی [illegible] کی طرف سابقہ حکومتوں نے توجہ نہیں دی۔ اس کا [illegible] بھگتنا پڑ رہا ہے چنانچہ آج تعمیرات کی لاگت کم کرنے [illegible] سیمنٹ [illegible] ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ



- ماہرانہ مشورہ [illegible]
- تعمیر میں [illegible]
- سیمنٹ [illegible] کا مناسب [illegible]

ضرورت سے زیادہ سیمنٹ کا استعمال [illegible]